تفسیر

سُورۃ النّسآء

390 نمبر

جس کی تالیف میں تفسیر ابن کثیر، حقانی، المنار، المراغی
فی ظلال القرآن، فوائد القرآن (از حضرت شیخ الہند مولانا
محمود الحسن) تفسیر ماجدی اور تفہیم القرآن کو مدنظر رکھا گیا ہے

مؤلفہ

پروفیسر میاں منظور احمد

ایم اے علوم اسلامیہ (گولڈ میڈلسٹ)، ایم اے عربی (گولڈ میڈلسٹ)

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

علمی کتاب خانہ: کبیر سٹریٹ، اردو بازار لاہور

ھدیہ ۷۵ روپے

Marfat.com

83803

بنام جہاندار جان آفریں
حکیم سخن بر زبان آفریں

احقر : میاں منظور احمد

Marfat.com

فہرست

تقریب وتمہید	آیت ۲۹، ۲۸
التزوج والسوانح	آیت ۲۹، ۳۰
نام اور وجہ تسمیہ	آیت ۳۱
تعداد آیات	آیت ۳۲
زمانۂ نزول	آیت ۳۳
خلاصۂ مضامین	آیت ۳۴، ۳۵
اسلامی معاشرہ (سورہ نساء کی روشنی میں)	آیت ۳۶، ۳۹
	آیت ۴۰، ۴۲
آیت ۱	آیت ۴۳
آیت ۲، ۴	آیت ۴۴، ۴۶
آیت ۵، ۶	آیت ۴۷
آیت ۷، ۱۰	آیت ۴۷، ۵۰
آیت ۱۱، ۱۲	آیت ۵۱، ۵۵
آیت ۱۳، ۱۴	آیت ۵۶، ۵۷
آیت ۱۵، ۱۶	آیت ۵۸، ۵۹
آیت ۱۷، ۱۸	آیت ۶۰، ۶۳
آیت ۱۹، ۲۱	آیت ۶۴، ۶۵
آیت ۲۲، ۲۳	آیت ۶۶، ۶۸
آیت ۲۴، ۲۵	آیت ۶۹، ۷۰
	آیت ۷۱، ۷۳

Marfat.com

آیت ۷۴، ۷۶
آیت ۷۷، ۷۹
آیت ۸۰، ۸۲
آیت ۸۳
آیت ۸۴
آیت ۸۵، ۸۷
آیت ۸۸، ۹۱
آیت ۹۲، ۹۳
آیت ۹۴
آیت ۹۵، ۹۶
آیت ۹۷، ۱۰۰
آیت ۱۰۱، ۱۰۳
آیت ۱۰۴
آیت ۱۰۵، ۱۱۳
آیت ۱۱۴، ۱۱۵
آیت ۱۱۶، ۱۲۲
آیت ۱۲۳، ۱۲۶
آیت ۱۲۷
آیت ۱۲۸، ۱۳۰
آیت ۱۳۱، ۱۳۴
آیت ۱۳۵، ۱۳۶
آیت ۱۳۷، ۱۴۱
آیت ۱۴۲، ۱۴۳
آیت ۱۴۴، ۱۴۷
آیت ۱۴۸، ۱۴۹
آیت ۱۵۰، ۱۵۲
آیت ۱۵۳، ۱۵۹
آیت ۱۶۰، ۱۶۲
آیت ۱۶۲، ۱۶۶
آیت ۱۶۷، ۱۷۰
آیت ۱۷۱، ۱۷۳
آیت ۱۷۴، ۱۷۵
آیت ۱۷۶

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تقریب تمہید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ بسورۃ المائدہ تا سورۃ التوبہ کا عام فہم تفسیر و ترجمہ گزشتہ تقریباً ڈیڑھ سال سے علمی کتاب خانہ سے شائع ہو کر طلباء و اساتذہ میں یکساں مقبول و معروف چلا آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے میری اس کوشش ناتمام کو مقام قبولیت عامہ عطا فرمایا دعا ہے کہ وہ ذات کریم اس سلسلے کو میری مغفرت ذنوب کا سبب بھی گردانے۔

پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد نے ۱۹۷۱ء اور مابعد کے نصاب سے سورۃ اعراف تا سورۃ توبہ کو خارج کر دیا ہے اور ان کی بجائے سورۃ نساء کو ایم اے علوم اسلامیہ کے نصاب میں داخل کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مطالعہ کے لئے تجویز کردہ تفاسیر میں تفہیم القرآن اور تفسیر ماجدی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ تفسیر سورۃ نساء جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اسے جدید نصاب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ حسب معمول تفسیر آیات اور دیگر علمی و تفسیری مباحث کے ضمن میں تمام یا اکثر تجویز شدہ تفاسیر کے اقتباسات ایک حسین ترتیب سے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ تکرار سے اجتناب کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ فوائد القرآن میں سورۃ البقرہ اور سورۃ نساء کے تفسیری حواشی چونکہ حضرت استاذ الاستاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے مرتب کردہ ہی تھے اور انہیں حضرت الاستاذ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے غالباً از راہ ادب و احترام ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ لہٰذا اس کتاب میں وہی تفسیری نوٹ دیئے جا رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہند کی تحریر میں ایک گونہ اختصار ہوتا ہے لیکن علم دین کے مختلف شعبوں (حدیث، تفسیر، کلام، فقہ و اصول وغیرہ) میں ان کا عظیم درجہ مسلم ہے ہاں! زبان و بیان کا وہ چٹخارہ جو حضرت الاستاذ کی تحریر میں ہے وہ بوجوہ حضرت شیخ الہند کی تحریر میں تقریباً نایاب ہے۔ ع وَلِكُلِّ قَوْمٍ فِيمَا يَعْشَقُونَ مَذَاهِبُ۔

تفسیر ماجدی اور تفہیم القرآن کے بعض اقتباسات جو دوسری تفاسیر میں نہیں تھے۔ انہیں میں نے بتمام و کمال سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن جہاں مضامین ایک جیسے تھے۔ وہاں میں نے بالعموم فوائد القرآن کو اساس بنا کر باقی تفاسیر کا صرف حوالہ دے دیا ہے بعض مقامات پر حسب ضرورت اس کے خلاف بھی کیا ہے اور اسے عموماً ساتھ ساتھ واضح بھی کر دیا ہے۔

اپنی طرف سے میں نے بہت کم لکھا ہے۔ صرف ان بزرگوں کے علوم و معارف کو ایک ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔ تفسیر المنار کے اقتباسات کے لئے میں نے بالعموم تفسیر المراغی پر اعتماد کیا ہے کیونکہ المراغی کی

Marfat.com

حیثیت النار کے ایک بہترین خلاصے کے علاوہ ایک مختصر اور مفید تفسیر کی بھی ہے۔ بعض مقامات پر آپکو صرف النار ہی کا حوالہ نظر آئے گا۔ ان مقامات کو یا تو المراغی نے لیا نہیں یا بہت اختصار سے بیان کیا ہے۔

فی ظلال القرآن کا آخری (تیسرا) ایڈیشن زیر مطالعہ رہا ہے اس میں پہلے ایڈیشنوں کی نسبت بہت سی ترامیم اور اضافے پائے جاتے ہیں۔ سید قطب کی نگارشات کو میں نے ہر موقع پر آخر میں بطور حرف آخر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ جو یونیورسٹی کی تجویز کردہ ہیں میں نے دیگر مواد سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً ترجمان القرآن۔ اس لئے کتاب صرف اب ایم اے کے طلبہ کے لئے نہیں بلکہ دیگر قارئین کے لئے بھی انشاء اللہ تعالیٰ یکساں مفید ثابت ہوگی۔ اللہ کرے میری یہ کوشش مفید ثابت ہو

میاں منظور احمد

التراجم والتواریخ

۱۔ قرآن فہمی
۲۔ حدیث
عمدہ ابن کثیر ۳۔ اسرائیلی روایات

تفسیر ابن کثیر:۔ امام حافظ عماد الدین ابو الفدا اسمٰعیل دمشقی کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔ اقوال محققین اہل علم کے نزدیک یہ تفسیر بہت سے فوائد و خصوصیات کی حامل ہے جن سے دوسری تفاسیر بالعموم مجموعی حیثیت سے خالی ہوتی ہیں۔ یہ کتاب نہ زیادہ مجمل ہے نہ مفصل۔ بلکہ بالکل حد اعتدال میں ہے۔ علامہ ابن کثیر عموماً قرآن کی تفسیر پہلے خود قرآن سے کرتے ہیں، پھر احادیث مع سند و حوالہ بیان کرتے ہیں اور ان پر کلام کرتے ہیں اور اسرائیلی روایات کی نشاندہی اور رد بھی کرتے جاتے ہیں۔ پھر اقوال صحابہؓ و تابعینؒ بیان کرتے ہیں۔ کہیں کہیں صرفی و نحوی مسائل، علم قرأت و تجوید اور بلاغت و معانی پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔

گزشتہ تقریباً ساڑھے چھ صدیوں سے عالم اسلام میں اس تفسیر کو قبول عام حاصل ہے۔ فقہی مسائل بہت کم بیان کرتے ہیں اور نقل مذاہب میں پوری پوری دیانتداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ کلامی مسائل پر بھی بعض جگہ مناسب گفتگو کر کے مسلک اہل سنت کی تائید کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تفسیر ابن کثیر کی جلالتِ قدر کے بہت معترف تھے اور اپنے شاگردوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ احقر کے ایک خط کے جواب میں حضرت نے تفسیر ابن کثیر اور روح المعانی کے مطالعہ کی تاکید فرمائی تھی۔ فوائد القرآن میں جا بجا ابن کثیر کے حوالے ملتے ہیں۔

علامہ حافظ ابن کثیر کی ولادت ۷۰۱ھ میں بمقام مجدل ہوئی جو ملک شام کے مشہور قصبہ بصریٰ کے مضافات میں واقع تھا۔ ان کا اصلی نام اسمٰعیل کنیت ابو الفدا لقب عماد الدین اور عرف ابن کثیر ہے۔

Marfat.com

بچپن میں یتیم ہوگئے اور اپنے برادر بزرگ کے زیر سایہ پرورش و تعلیم کے مراحل طے کئے۔ علم حدیث میں ان کے اساتذہ میں امام حافظ ابن تیمیہؒ، علامہ حافظ ذہبی، حافظ جمال الدینؒ مزی۔ علامہ ابن الرضی اور حافظ ابن سویدیؒ کے نام مشہور ہیں۔ حافظ جمال الدینؒ بن یوسف المزی کی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوا۔

علامہ ابن کثیرؒ تمام علوم متداولہ بالخصوص حدیث، فقہ، تفسیر، لغت و عربیت اور علم تاریخ میں امام ہوئے۔ ان کے علم و فضل، حافظہ، فہم و فراست اور علمی دیانت کے سب علماء امت قائل ہیں۔ علامہ حافظ بن حجر، حافظ جلال الدین سیوطیؒ اور علامہ زاہد الکوثریؒ نے کھلا اس کا اعتراف کیا ہے۔

ان کا سن وفات ۷۷۴ھ ہے دمشق میں اپنے نامور استاد حافظ ابن تیمیہؒ کے پہلو میں مقبرۂ صوفیہ میں دفن ہوئے۔

علامہ حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر قرآن اور تاریخ و سیرت کی مشہور کتاب "البدایہ والنہایہ" کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں کم و بیش ڈیڑھ درجن مفید کتابیں تصنیف فرمائیں۔

تفسیر حقانی: کتاب کا اصل نام "فتح المنان تفسیر القرآن" اور عرف عام میں تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے اس تفسیر میں خود بقول مؤلف روایت و درایت دونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ مطالب قرآنی کو اردو زبان میں واضح کرنے کے لئے آیات کا شانِ نزول، احکام کی آیات میں مجتہدین کے دلائل اور اختلافات، وجہ اعراب اور ترکیب نحوی، تاویل میں وجوہ ترجیح کا بیان، معانی و بلاغتِ قرآن کا بیان، احادیث صحیحہ میں حوالہ، تفسیر القرآن بالقرآن۔ ربط آیات مخالفین اسلام بالخصوص ملحدین و نصاریٰ کا کافی رد بیان کیا گیا ہے۔

اصل تفسیر سے پہلے ایک نہایت مبسوط مفید مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں اصولِ تفسیر، جمع و ترتیب قرآن، علم تفسیر پر اصولی بحث، کتب سابقہ پر تنقد و تبصرہ اور ان کی تحریف و تبدیل کے دلائل، محکم و متشابہ، احکام قرأت، سبب نزول، شرح غریب، حذف و ابدال، ناسخ و منسوخ، اعجاز القرآن، اسرار عبادات، مفاہیم و علوم قرآن، توحید و نبوت اور معاد جیسے اہم مسائل پر فاضلانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔

مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی (وفات ۱۹۰۰ء) متحدہ ہندوستان کے علمائے متاخرین میں بلند پایہ عالم گزرے ہیں۔ ان کی کتاب کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت عامہ اور شہرت تامہ عطا فرمائی ہے مصنف ایک متبحر اور ربانی عالم ہیں۔

تفسیر المنار: علامہ سید رشیدؒ رضا دولادت ۱۲ جمادی الاول ۱۲۸۲ھ و وفات ۲۳ جمادی الاول ۱۳۵۴ھ، ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء) نے اپنے استاد مرشدی مفتی محمد عبدہ کے اس تفسیری خطبوں کو جو انہوں نے علامہ سید جمال الدین افغانی کے تعلیمی و تفسیری جلسوں میں دیئے تھے، قلمبند کرایا تھا۔ بڑی محنت

Marfat.com

اور جدوجہد سے بہت سے مفید اضافوں کے ساتھ اپنے رسالہ المنار میں شائع کیا۔ بعد میں یہ مستقل تفسیر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ مکمل نہ ہو سکا۔ اور غالباً بارہ پاروں کی تفسیر کے بعد منقطع ہو گیا۔

اس کتاب میں قدیم تفاسیر سے ہٹ کر قرآن پاک کو جدید زمانے کے تقاضوں اور جدید علوم و فنون کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ مستشرقین یورپ کے اٹھائے ہوئے فتنوں اور شکوک و شبہات کا مفصل و شافی رد کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے احساس کمتری کو دور کرنے اور انہیں جھنجھوڑنے کی از حد کوشش کی گئی ہے۔ اسرائیلی روایات کا خوب رد کیا گیا ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن والسنۃ کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ کلامی مسائل کے بیان سے حتی الوسیع گریز کیا گیا ہے لیکن جہاں کہیں ایسے مسائل آئے ہیں۔ انہیں محدثین سلف کے اصول پر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر کچھ فقہی مسائل کا بیان آگیا ہے ان کے بیان میں مصنف محدثین کے آزاد مسلک کے قائل ہیں۔

بلاغت و معانی اور صرف و نحو کے ضروری مسائل بھی موقع بہ موقع بیان کئے ہیں۔ بالخصوص الفاظ و محاوراتِ قرآنی کی تشریح اشتقاق میں نہایت قیمتی تحقیقی مواد پیش کرتے ہیں۔

علامہ سید رشید رضا ان علماء اسلام میں سے ہیں جنہوں نے ماضی قریب میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی تعلیمی اور اقتصادی بیداری کے لیے ان تھک کام کیا۔ وہ ایک واسطہ (مفتی محمد عبدہٗ مصری) سے علامہ جلیل سید جمال الدین افغانی کے شاگرد ہیں اور ان کی تحریک نشاۃ اسلام (اتحاد اسلامی) کے پرجوش مبلغ ہیں۔

وہ قدیم و جدید علوم کا ایک حسین امتزاج ہیں۔ جدید فلسفہ و سائنس اور علم ریاضی پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ لبنان کے پہاڑی علاقے میں ان کا خاندان سیادت و نجابت میں عوامی کا سرجمع تھا۔ تکمیل علوم کے بعد انہیں سرکاری ملازمت کی پیشکش کی گئی لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور ترک وطن کر کے قاہرہ میں پہنچ کر آزاد صحافت و تنقید کو اپنا پیشہ و مشغل بنا لیا۔

علامہ سید رشید رضا تفسیر قرآن کے علاوہ سولہ اور مفید کتابوں کے بھی مصنف ہیں۔ عالم اسلام کی بیداری میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ غیرت اسلامی اور شجاعت و حق گوئی ان کے خاص وصف تھے عالم اسلام کی تمام اصلاحی و انقلابی تحریکیں ان سے بہت متاثر ہوئیں۔

تفسیر المراغی: مؤلفہ علامہ احمد مصطفےٰ المراغی (پروفیسر علوم شرعیہ و لغت عربی دارالسلام کالج قاہرہ) اس تفسیر میں مؤلف نے ایجاز و اختصار کے ساتھ تفسیر القرآن، تشریح مفردات، اسباب نزول مضامین آیات کا خلاصہ اور تفسیری روایات کی تنقید و تمحیص کا التزام کیا ہے احادیث صرف وہ لاتے ہیں۔ جو ان کے نزدیک درجہ صحت کو پہنچ چکی ہوں۔ اسرائیلی روایات کو نہ صرف ترک کر دیتے ہیں بلکہ ان پر نقد و تبصرہ کر کے ان کا رد بھی کرتے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر النار کے شائع شدہ (۱۲) اجزاء سے علامہ المراغی نے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ بلکہ تفسیر المراغی بالکل النار کا اقتباس ہی معلوم ہوتی ہے۔ دیگر فوائد اس پر مستزاد ہیں۔ جزء ۱۳ سے آخر قرآن تک النار کے ماسوا دیگر مشہور و متداول اور معتبر تفاسیر ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ شروع سے تصنیف و تالیف کی جو روش اختیار کر لی تھی آخر تک اس کی پابندی کی ہے۔

تفسیر المراغی کو پیش نظر رکھنے سے ہماری غرض ایک طرف تو یہ تھی کہ یہ تفسیر النار کا تقریباً خلاصہ ہے۔ اور دوسری طرف اس کے اختصار و جامعیت اور صحت و نقل و اقتباس سے استفادہ پیش نظر تھا۔ چنانچہ آپ کو جابجا اس کے حوالہ جات نظر آئیں گے۔

علامہ احمد مصطفیٰ المراغی کے متعلق افسوس ہے کہ کوئی سوانحی مواد مہیا نہیں ہو سکا۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس کی تلاش کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا لازم ہے کہ "علامہ المراغی" اور "شیخ مراغی" بہت سے علماء اور مشہور ادباء کہلاتے ہیں۔ اکثر کا نام محمد بن مصطفیٰ المراغی یا محمد مصطفیٰ المراغی ہے۔ مثلاً الازہر کے سابق ریکٹر بھی علامہ المراغی تھے مگر وہ محمد بن مصطفیٰ المراغی تھے اور تفسیر المراغی کے مولف احمد مصطفیٰ المراغی ہیں۔

فی ظلال القرآن: مصر کے مایہ ناز ادیب، شاعر، ماہر تعلیم اور صحافی سید قطب رحمہ اللہ کی تصنیف ہے جسے مرحوم نے جیل کی تنہائیوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس تفسیر میں مرحوم نے پرانا تفسیری ڈھنگ کافی حد تک بدل ڈالا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ تفسیر نہیں حقیقت میں فصاحت و بلاغت اور ادب و انشا کا شہ پارہ اور اسلامی دعوت کا ایک ابلتا ہوا لاوا ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں تفسیری مباحث بھی تمام و کمال موجود ہیں۔ سید مرحوم نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے یہ تفسیر لکھ کر عالم اسلام پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔

اس کتاب میں جدید دور کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور وہ اجتماعی معاشی، سیاسی اور معاشرتی مسائل جو نئے ذہن کو پریشان کرتے ہیں۔ سید مرحوم نے ان کو موقع بہ موقع بیان کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ بالخصوص یہودی و عیسائی و مستشرقین اور اشتراکی مصنفین نے اسلام پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کے مفصل اور شافی جواب دیئے گئے ہیں۔

میرا خیال ناقص یہ ہے کہ دنیا کی مشہور زبانوں میں اس کا ترجمہ کرنا اشد ضروری ہے اور یہ یقیناً ایک عظیم اسلامی خدمت ہوگی۔

کتاب کو پڑھ کر سید مرحوم کے حیرت انگیز تبحر علمی، عجیب و غریب حافظہ اور خداداد طرز ادا کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ جدید علوم کی شاید ہی کوئی شاخ ہوگی۔ جس پر مرحوم کی نظر نہ ہو۔ وہ تفسیر کے صفحات میں سائنس کی مختلف شاخوں، فلسفۂ قدیمہ و جدیدہ، علم الحیات اور اس کی مختلف اقسام، ریاضی

Marfat.com

تاریخ وجغرافیہ، علم السیاست، اقتصادیات، عمرانیات غرض علوم وفنون کی ہر شاخ سے استدلال کرتے اور علوم ومعارف کے موتی بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔

ان کا طرز تحریر موجودہ عالم عرب کے ہر ادیب سے زیادہ موثر اور زور دار ہے عربیت کا ذوق رکھنے والا کتاب کو دیکھ کر عش عش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ضلع اسیوط کے موشا نامی گاؤں کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے انہیں والدین کی شدید آرزو کے مطابق قرآن مجید بچپن میں ہی حفظ کرا دیا گیا۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں دارالعلوم قاہرہ سے بی اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی اور اسی کالج میں پروفیسر ہو گئے پھر انہیں انسپکٹر مدارس مقرر کیا گیا اور جدید طریقہ تعلیم وتربیت کے مطالعہ کے لئے امریکہ بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ کئی کالجوں میں کچھ عرصہ کام کرتے رہے انہوں نے مغربی مادی تہذیب کا بالکل قریب سے مطالعہ کیا پھر وہ انگلستان، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ بھی گئے۔

۱۹۴۸ء میں وہ مصر کی مشہور اسلام پسند جماعت "الاخوان المسلمون" سے منسلک ہو گئے اور جماعت کے اہم ترین عہدوں پر فائز رہے۔ اب ان کی ساری ادیبانہ سرگرمیاں تحریک اسلامی کے لئے وقف ہو گئیں ۱۹۵۴ء میں "اخوان" خلاف قانون قرار دی گئی اور ہزارہا لوگوں کے ساتھ سید قطب بھی گرفتار ہو گئے۔ انہیں جیل میں انتہائی صبر آزما تکالیف پہنچائی گئیں مگر انہوں نے صبر وثبات سے وہ سب برداشت کر لیں۔ ۱۹۶۴ء میں دس سال قید کاٹ کر وہ جیل سے رہا ہوئے۔ اسی قید میں انہوں نے "فی ظلال القرآن" کی تکمیل کی۔

ایک سال بعد ۱۹۶۵ء میں وہ پھر دوبارہ حکومت مصر کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے۔ یہ گرفتاری غالباً کمیونسٹوں کے ایماء پر مصر کی موجودہ "سوشلسٹ عرب" حکومت نے کی۔ جیل میں انہیں ناقابل بیان اور زہرہ گداز تکالیف دی گئیں ان کا سارا خاندان مبتلائے تعذیب کیا گیا حتیٰ کہ خواتین پر بھی تشدد کیا گیا۔ فوجی ٹریبونل کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوا جس نے ۱۹۶۶ء میں انہیں دو اور ساتھیوں سمیت سزائے موت سنائی اور سارے عالم اسلام بلکہ دنیا بھر کے احتجاج کے باوجود ۲۵ اگست ۱۹۶۶ء کو انہیں پھانسی دے دی گئی۔ آخر وقت تک انہوں نے جس صبر وثبات اور جرأت و بسالت کا مظاہرہ کیا اس نے انہیں زندہ جاوید کر دیا۔

"فی ظلال القرآن" کے علاوہ سید مرحوم کی تقریباً دو درجن کتب اور بھی ہیں جن میں العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام، ہمالگیر اور لازوال شہرت کی مالک ہے کئی زبانوں میں اس کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔ اردو میں اسلام کا نظام عدل کے نام سے چھپا ہے۔

فوائد القرآن:۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی پیدائش بریلی میں ۱۸۵۱ء میں ہوئی جہاں آپ کے

Marfat.com

والد ملازم تھے۔ آپ مدرسہ عربی دیوبند و دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ کتب صحاح ستہ آپ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے میرٹھ اور دہلی میں پڑھیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہی آپ کا تقرر مدرسہ دیوبند میں بطور نائب مدرس ہو چکا تھا۔ فراغت تعلیم کے بعد مستقل مدرس ہو گئے اور ایک برائے نام مشاہرے پر کام کرتے رہے۔ ۱۳۰۵ھ سے ۱۳۳۶ھ تک بطور صدر مدرس کام کیا۔ ہند و پاکستان کے علاوہ سارے عالم اسلام میں آپ کے بے شمار شاگرد تھے جن میں بعض اپنے وقت کے امام کہلائے مثلاً علامہ سید انور شاہؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ وغیرہم۔

آپ کا ذکر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بسلسلہ "تحریک ریشمی رومال" بہت مشہور ہے اور حکومت نے ہر ایک کو باغی قرار دیا۔ ترکوں کی حمایت اور جنگ عظیم اول میں انگریزوں کی مخالفت کے "جرم" میں آپکو حجاز سے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا اور زہرہ گداز تکالیف پہنچائی گئیں لیکن آپ اپنے موقف سے ایک انچ نہ ہٹے۔ اسی قید و بند کے دوران میں آپ نے ترجمہ و تفسیر قرآن کا کام کیا۔ ترجمہ مکمل ہو گیا۔ لیکن تفسیر صرف سورۃ البقرہ و نساء کی لکھ سکے تھے کہ رہا کر دیئے گئے۔ صحت کے جواب دے جانے اور جلد سانحہ وفات کے باعث تکمیل تفسیر کی نوبت نہ آئی اور ان کے بعد ان کے مایہ ناز شاگرد شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فوائد القرآن کی تکمیل کی۔

۸ جون ۱۹۲۰ء کو آپ کی رہائی ہوئی اور ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں اپنے مرید خاص ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں وفات پائی۔ آپ کی وفات کا صدمہ پاک و ہند کے علاوہ سارے عالم اسلام بالخصوص ترکی میں شدت سے محسوس کیا گیا۔ قبر دیوبند میں مولانا نانوتویؒ کی قبر کے پاس ہے۔ ؎

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق!

تفہیم القرآن: تفہیم القرآن کے مصنف، پاکستان اور عالم اسلام کے عظیم زندہ مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پیدائش ۲۹ ستمبر ۱۹۰۳ء کو حیدرآباد دکن میں ہوئی جہاں آپ کے والد سید احمد حسین مودودی ایڈووکیٹ تھے۔ سید صاحب کا سلسلہ نسب سید قطب الدینؒ مودود چشتی سے ملتا ہے۔ انکی تعلیم و تربیت والد کے زیر سایہ گھر پر ہی ہوئی جہاں مختلف علوم و فنون اور زبانوں کے استاد انہیں پڑھاتے تھے۔ انہیں مطالعہ اور لکھنے کا شوق ابتدائی عمر سے ہی تھا۔ چنانچہ بہت چھوٹی عمر میں کئی اعلیٰ پایہ کی کتابیں لکھیں اور متحدہ ہندوستان کے مشہور رسائل و اخبارات کو ایڈٹ کیا۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنا مشہور رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا جو قلیل بندشی وقفوں کے باوجود تا حال جاری ہے۔ سید صاحب کے قلم سے زمانہ حال کے نازک مسائل پر ایک عظیم لٹریچر تیار ہوا ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ تفہیم القرآن ان کی تصنیفات میں سے ایک ہے اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں زیر طبع ہے اس تفسیر کا سلسلہ بلاتین قرآن ترجمان القرآن میں بھی شائع ہو رہا ہے اور اب قریب اختتام ہے۔

Marfat.com

تفہیم القرآن میں مصنف نے انہی کے بقول، ترجمہ کی بجائے ترجمانی کا التزام کیا ہے۔ جابجا مفید تفسیری نوٹ ہیں جو کہیں مفصل اور کہیں مختصر ہیں۔ وہ اپنے تفسیری، کلامی یا فقہی خیالات وآراء میں ایک حد تک آزاد رہے ہیں لیکن کہیں بھی اہل سنت کے مسلک سے باہر نہیں جاتے ان کے سیاسی یا فقہی و تاریخی خیالات سے اختلافات کے باوجود انہیں موجودہ عالم اسلام کا عظیم مفکر و مصنف اور عالم مانے بغیر چارہ نہیں۔ جدید سائنس اور فلسفہ تادیت کے پیدا کردہ مسائل میں انہوں نے مسلمانوں کی بے نظیر خدمات سرانجام دے کر صحیح راہنمائی کی راہیں کھولی ہیں۔

تفسیر ماجدی: پاکستان و ہند کا کوئی پڑھا لکھا شخص مولانا عبدالماجد دریابادی سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک صاحب طرز انشاء پرداز، پرانے سیاسی لیڈر اور فلسفہ و دیگر علوم جدیدہ کے ماہر کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ شروع شروع میں ان کے فلسفیانہ مقالات کی دھوم رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ تشکیک و الحاد کی وادی میں سرگرداں تھے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہوئی اور وہ اس گرداب سے کندن بن کر نکلے اور اب اسلام کے جانثاروں کی صف کے ہندی سرخیل ہیں۔ انہوں نے خلافت سے لے کر مسلم لیگ تک کی سیاسی تحریکوں میں بھی کام کیا ہے لکھنؤ سے ان کے جرائد و رسائل صدق اور سچ کے نام سے نکلتے رہے ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ و تفسیر بھی لکھی ہے۔ اردو ترجمہ تفسیر اسی انگریزی تفسیر و ترجمہ کا چربہ بلکہ تلخیص و اقتباس ہے۔ تاج کمپنی لاہور نے اسے حال ہی میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ تفسیری حواشی سے مولانا کی بالغ نظری، وسعت مطالعہ، قدیم و جدید علوم کی مہارت اسلامی درد و احساس اُبلا پڑتا ہے۔ ہر پڑھے لکھے مسلمان کو اس نعمتِ عظمیٰ کے مطالعہ سے سعادت دارین حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے۔

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

تفسیر سُورۃ النسآء

نام اور وجہ تسمیہ

اس سورۃ کا نام سورۃ النساء (عورتوں کی سورت) ہے چونکہ اس میں عورتوں کے بہت سے احکام بیان ہوئے ہیں اور کئی مرتبہ النساء کا لفظ آیا ہے لہٰذا اس کا نام سورۃ النساء رکھا گیا۔

تعداد آیات

کوفی قرأت کے مطابق اس سورت کی ایک سو چھہتر آیات، شامی قراء کے نزدیک ۱۷۵ آیات اور حجازی قراء کے نزدیک ۱۷۰ آیات ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ (وقف آیات میں) اختلافات ہے۔ عدد آیات کا یہ اختلاف فقط وقف کا ہی اختلاف ہوتا ہے۔ بعض قاری ایک جگہ وقف آیت بتاتے ہیں اور بعض وقف آیت کے علاوہ کوئی اور وقف تجویز کرتے ہیں۔ ورنہ قرآن پاک کے الفاظ و فقرات بلکہ حروف تک میں اتفاق ہے اور دنیا میں فقط یہی ایک کتاب ہے جس کا حرف حرف بلکہ اعراب تک محفوظ ہیں مزید تفصیل کے لئے ہماری دوسری تفاسیر (از تفسیر سورۃ المائدہ تا تفسیر سورہ التوبہ) ملاحظہ فرمایئے۔ ہمارے ہاں کے مصاحف چونکہ بالعموم کوفی قرآء کی قرأت کیمطابق طبع ہوئے ہیں لہٰذا ان سب میں اس سورہ کی آیات کی تعداد ۱۷۶ درج کی گئی ہے۔

زمانہ نزول

یہ سورہ ساری کی ساری مدنی ہے جیسا کہ اس کی صراحت صحیح بخاری میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ سے وارد ہوئی ہے۔ امام قرطبیؒ نے اس سورت کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ایک آیت کا استثناء کیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (الآیۃ)

امام قرطبیؒ کا ارشاد ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں غزوہ فتح مکہ کے موقع پر اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ بعض اصحاب کا یہ خیال تھا کہ کعبۃ اللہ کی کلید عثمان بن طلحہ سے لے کر کسی اور شخص کے سپرد کر دی جائے۔ لیکن ابن مردویہ وغیرہ کی روایات میں صراحت موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس آیت سے استدلال فرما کر کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ کو واپس کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہو۔ بالفرض اگر امام قرطبیؒ کے قول کے مطابق اس آیت کا نزول فتح مکہ کے زمانہ میں بھی مانا جائے تب بھی اس کے مدنی ہونے پر حرف نہیں آتا، کیونکہ مدنی سے مراد وہ آیات و سور ہیں جو ہجرت مدنیہ کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ حضور کی زندگی کا یہ حصہ مدنی کہلاتا ہے۔ اس حصہ میں کوئی آیت یا

Marfat.com

سورت اگر مدینہ سے باہر حتیٰ کہ مکہ میں بھی اتری ہو تو بھی وہ مدنی ہی کہلائے گی۔ اسی بناء پر علماء تفسیر نے امام قرطبیؒ کے اس قول کو قبول نہیں کیا اور بعض نے اسے وہم قرار دیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ مدنی زندگی میں اس سورت کا نزول کس سنہ میں ہوا تھا، سو دلائل و قرائن اور روایات حدیث و تفسیر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت ۳ھ سے لے کر ۸ھ تک نازل ہوتی رہی تھی۔ نزول قرآن کے سلسلے میں یہ یاد رکھنا لازم ہے کہ اکثر کئی سورتوں کا نزول جاری رہتا تھا، کبھی کسی سورت کی آیت یا آیات اترتیں اور پھر کسی اور کی اور یہ سب سورتیں بیک وقت کھلی رہتیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتا دیا کرتے کہ اب فلاں سورت مکمل ہو گئی ہے کئی کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی پوری سورت بھی اتر آتی، جیسا کہ سورۃ الانعام کے متعلق احادیث میں وارد ہوا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے ہماری تفسیر سورۃ الانعام)

ترتیب و نزول میں اس سورت کا عدد ۹۲ بیان کیا گیا ہے اور اس کا نزول سورۃ الممتحنہ کے بعد بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ ترتیب بھی اکثر اعتباری اور بطور اندازہ ہوتی ہے، کیونکہ یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ سورۃ الممتحنہ اس سورت سے پہلے ساری نازل ہو چکی تھی۔ اصل چیز جو دلائل سے ثابت ہے یہی ہے کہ سورت کا اکثر حصہ ہجرت کے بعد ۳ھ میں غزوہ احد کے بعد نازل ہوا تھا، کچھ آیات ۶ھ میں اور بعض ۸ھ میں اتری تھیں۔ واللہ علم بالصواب۔

مضامین کا اجمالی خاکہ سورہ نساء کے مضامین کو اجمالاً ان بنیادی موضوعات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ظاہر و باطن میں تقویٰ خداوندی کا حکم۔
۲۔ ساری نسل انسانی کا ایک اصل (آدمؑ و حواؑ) سے پیدا ہونا۔
۳۔ یتیموں سے حسن سلوک کے احکام۔
۴۔ خاندانی زندگی کے احکام اور قرابت و مصاہرت کی اہمیت۔
۵۔ مالی احکام، میراث اور نکاح کے احکام، محرمات نکاح اور حقوق الزوجین۔
۶۔ جہاد و قتال کے احکام۔
۷۔ اہل کتاب پر اتمام حجت۔
۸۔ منافقین کے بعض احکام۔

خلاصۂ مضامین | پہلی پینتیس آیات میں یہ مضامین وارد ہوئے ہیں۔

---

۱ تفسیر المراغی

Marfat.com

تقویٰ[1] کا حکم، اہل وعیال اور خاندانی زندگی کے احکام، یتامیٰ اور خواتین کے مالی وادبی احکام، میراث کے احکام، عورتوں کی میراث کا خصوصی ذکر، بے حیائی کی سزا، جن عورتوں سے نکاح حرام اور جن سے حلال ہے ان کا خصوصی بیان، معاشرتی زندگی کے بعض خاص احکام، حقوق الزوجین۔ ان احکام کے دوران میں تقویٰ واطاعت خدا اور رسولؐ کا حکم بھی دیا گیا ہے کیونکہ نیک اعمال کی بنیاد وہی ہے۔

آیت ۲۶ سے ۴۲ تک یہ مضامین ہیں۔

اہل کتاب بالخصوص یہود پر اتمام حجت، شرک سے نہی، والدین، رشتہ داروں، ہمسایوں اور یتامیٰ ومساکین سے حسن سلوک کے احکام، بخل کی برائی کا بیان، ریاکاری کی شناعت کا ذکر، انفاق مال کی فضیلت، کفر وعصیان کا رد، حق کو چھپانے کا وبال۔

آیت ۴۳ سے ۵۹ تک کے مضامین یہ ہیں۔

یتیم کے احکام، نشہ کی حالت میں نماز کے احکام، یہودیوں کے دینی واخلاقی احوال اور ان سے عبرت پذیری کا حکم، اسلامی حکومت کی بنیاد امانت پر ہے۔ عدل وانصاف کا حکم اور اطاعتِ خداوندی کے احکام، اطاعت کے ضوابط وقوانین، اولوالامر کی اطاعت اور اس کی حدود۔

آیت ۶۰ سے آیت ۱۰۳ تک کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے۔

منافقین کے اخلاق واحوال، منافقین سے معاملہ کرنے کا طریقہ بالخصوص قتال کے وقت، ہجرت و امان اور قتال کے کچھ احکام، قتلِ عمد اور قتلِ خطا کے احکام، صلوٰۃ الخوف کا حکم، صلوٰۃ السفر کا حکم، اطاعت خدا اور رسولؐ کی تاکید۔

آیت ۱۰۴ سے آیت ۱۲۵ تک کے مضامین یہ ہیں۔

دشمنانِ اسلام کا تعاقب کرنے کا حکم، اطاعت رسولؐ کی اہمیت اور اس کی حدود وقیود، شرک و ضلالت کا رد، نجات آخرت کا انحصار ایمان پر ہے، فضائل اسلام کا بیان۔ ملتِ ابراہیمؑ اسلام ہے کہ خود ساختہ یہودیت ونصرانیت۔

آیت ۱۲۶ تا آیت ۱۳۶ کا خلاصہ یہ ہے۔

عورتوں اور یتامیٰ اور بچوں کے بعض احکام، عورتوں سے عدل وانصاف کا حکم اور ان کی نافرمانی کے احکام، اصلاح زوجین، حق کی گواہی دینا، عدل وانصاف کے احکام، صحیح ایمان کی تعریف، ضلالت کی روی سے تنفیر۔

آیت ۱۳۷ تا آیت ۱۴۶ کے مضامین یہ ہیں۔

---

[1] یہ مضمون تفسیر المنار، المراغی، فی ظلال القرآن اور تفہیم القرآن سے ماخوذ ہے۔

Marfat.com

منافقین کے احوال، موالات کے احکام۔
آیت ۱۴۷ تا آیت ۱۷۱ کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے۔
اہل کتاب کے احوال اور ایمان و کفر کی بحث، عقائد و ایمانیات میں تفریق کرنا مومنوں کا طریقہ نہیں۔ یہود کی مخالفت حق اور قتل انبیاء کا بیان، ان کی عہد شکنی اور پیغمبروں پر بہتان کا بیان، ان کے ظلم و کفر کے نتائج دنیوی و اخروی۔
آیت ۱۶۲ تا آیت ۱۷۰ کے مضامین یہ ہیں۔
رسالت محمدیہ کی حقانیت کے دلائل و شواہد، آپ کی رسالت کا آفاقی و دائمی ہونا۔
آیت ۱۷۰ تا آیت ۱۷۶ کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے۔
نصاریٰ پر اتمام حجت، تثلیث کا رد، توحید کا اثبات، رسالت محمدیہ کا اثبات اور اس کی دعوت کا عام ہونا۔ کتاب اللہ کو مضبوط تھامنے کا حکم اور اس کی جزا، صراط مستقیم اور سعادتِ دارین۔

سورۂ نساء طول کے لحاظ سے البقرہ کے بعد قرآن کی طویل ترین سورت ہے۔ مدنی طویل سورتوں میں جو احکام و آداب بیان ہوئے ہیں ان کے لحاظ سے یہ سورت اپنے فوائد و احکام اور دلائل و براہین کے لحاظ سے عظیم ترین سورت ہے۔

اسلامی معاشرہ سورت النساء کی روشنی میں[1]

سورت النساء اس جدوجہد کا نقشہ کھینچتی ہے جو اسلام نے امت مسلمہ کے بنانے، سنوارنے اور اس کی تربیت کرنے میں صرف کی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کیوں کر برپا ہوا تھا اسے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے بچانے کے لئے کون سی تدابیر کرنا پڑی تھیں اور قرآن نے اس جدید معاشرے اور جدید امت کو بنانے اور سنوارنے میں کیا کردار ادا کیا تھا؟ اس نئی جماعت کا کائنات انسانی سے کیا رابطہ تھا اور دوسرے انسانوں کا اس سے کیسا سلوک تھا؟

قرآن کی ہر سورت کا ایک امتیازی وصف بھی ہوتا ہے جو اس میں مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بیان ہونے والے باقی تمام مضامین اسی ایک محور کے گرد گھومتے ہیں، سورت النساء ہمیں ایک اسلامی معاشرہ قائم کرتی ہوئی اور جاہلیت سے یہ جدوجہد کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے وہ جاہلیت کے تمام اثرات اور علامات کو نکال پھینکنا چاہتی ہے تاکہ یہ نئی جماعت ـــــ امت مسلمہ ـــــ ہر حیثیت سے کفار و مشرکین سے ممتاز ہو جائے اور اس کی خاص شخصیت نکھر کر سامنے آجائے۔ اس سلسلے میں اسے مشرکین کے علاوہ اہل کتاب بالخصوص یہود سے شدید معرکہ درپیش تھا۔ ان اعدائے دین نے

---

[1] سید قطب شہیدؒ فی ظلال القرآن

Marfat.com

اپنے مکروفن اور دھوکہ فریب کے تمام ہتھیار آزمانا شروع کر دیئے تھے۔ منافقین کی جماعت کی ان سے سازباز تھی جس کے باعث ان کی سازشیں اور وسیسہ کاریاں مسلم جماعت کے اندر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر کمزور ایمان کے مسلمان بھی تھے جو بہت جلد اعدائے دین کی سازشوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ ان متعدد محاذوں پر ہمیں النسار لڑتی اور اسلامی جماعت کا دفاع کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

عرب میں برپا ہونے والی یہ امت مسلمہ اپنے عقائد و تصورات، عقل و فکر، اخلاق و اجتماع اور سیاست و اقتصاد وغیرہ ہر چیز میں جاہلیت سے پوری طرح ممتاز تھی اس امتیاز کو پورا کرنا، قائم رکھنا، قدم بہ قدم آگے بڑھانا اور نئے جماعت میں داخل ہونے والوں کو اس میں پوری طرح جذب کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا جو قرآن نے سرانجام دیا۔ جماعت کی معاشرتی ضروریات کی کفالت زیادہ تر سورہ النسار نے فرمائی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں یتیموں ـــــ بالخصوص مونث یتامیٰ ـــــ کا حال نہایت ابتر تھا، کمزوروں عورتوں اور بچوں پر ظلم و جبر ہوتا تھا۔ بالعموم عورتوں کو میراث کا حق دار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مرنے والوں کا ترکہ وہ مرد لے لیتے تھے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل ہوتے تھے۔ کمزور بچے اور عورتیں اس سے محروم رہتی تھیں۔ سورۃ النسار نے ان کمزوروں کی طرف توجہ کی اور ان کو ان کے انسانی جائز حقوق دلوائے۔ گھریلو زندگی کی اصلاح کی۔ مرد کے ظلم کا راستہ بند کیا۔ عورت کو اس کا فطری مقام دلوایا۔ گھریلو زندگی کے عادلانہ قوانین و ضوابط مقرر کئے۔ خاندانی زندگی کے ڈھیلے پرزوں کو کسا اور مضبوط بنیادوں پر ایک متوازن معاشرہ قائم کیا۔

اسی طرح ہمسایوں، مساکین اور قرابت داروں کے حقوق و فرائض متعین کئے۔ حرام خوری کے تمام راستے بند کر دیئے۔ غصب، سود خواری، بددیانتی، لوٹ مار اور حق تلفی کا قلع قمع کیا۔ ظلم و ستم سے روک کر عدل و انصاف کا حکم دیا۔

وقت کی ضروریات کے پیش نظر سورۃ النسار جہاد و قتال کے احکام سے بھی خاموش نہیں رہی۔ اسی طرح اس نے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا حکم بار بار دیا ہے اور اولوالامر کی اطاعت کے حدود متعین کئے ہیں۔ قیادت و امامت اور فرد و جماعت کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ ہجرت کے احکام دیئے اور اسلامی جماعت کے باہمی تکافل و ولایت کے حدود کی طرف اشارے کئے ہیں۔

Marfat.com

سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بیحد رحم فرمانیوالا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ

اے انسانو ڈرو اپنے رب سے جس نے

① وحدتِ انسانیت

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ

تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور پیدا کیا

مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا

اسی سے اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت سے

② قطع رحمی کی ممانعت

كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ

مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطے

تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

سے تم آپس میں سوال کرتے ہو اور رشتہ داریوں سے خبردار رہو۔ بیشک اللہ

كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

تم پر نگہبان ہے

Marfat.com

شرح الفاظ

لہ النَّاسُ :۔ انسانی جنس کا نام ہے۔ اس کا واحد انسان ہے۔ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ یعنی تم آپس میں خدا کا نام لے کر اور اس کا واسطہ دے کر سوال کرتے ہو۔ وَالْاَرْحَامَ یعنی رشتہ داروں کے حقوق کو ضائع کرنے سے خوف کرو کیونکہ وہ بہت نازک ہیں۔ رَقِیْبًا کا لغوی معنی ہے کسی بلند جگہ سے نیچے جھانکنے والا اور مراد اس سے حافظ و نگران ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عدم سے وجود بخشا۔ اس کی تربیت فرمائی اور اپنے جود و کرم سے اسے بے شمار نعمتیں بخشیں۔ چونکہ آئندہ معاشرتی احکام اور باہمی تعاون و تناصر کے احکام آنے والے ہیں لہٰذا سورت کی ابتدا میں ہی دو باتوں کا حکم دے دیا گیا۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو۔ خصوصاً باہمی معاملات میں خوف خدا کو ہر وقت پیش نظر رکھو اور دوسری یہ کہ اچھی طرح جان رکھو کہ تم سب آپس میں رشتہ دار ہو۔ ایک مرد و عورت کی اولاد ہو، آپس میں جس طرح خدا کا نام لے کر حقوق یا رحم طلب کرتے ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بھی ڈرو۔ رشتہ داروں کے معاملہ میں تفریط نہ ہونے پائے ورنہ دنیوی معاملات بگڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مصلحۃً رشتے اور دور و نزدیک کے تعلقات قائم رکھے ہیں تاکہ باہمی تعارف "تآزر" ہوتا رہے۔ اس آیت میں ایمان کے رابطے اور رشتہ داری کے روابط کی نگرانی کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ آیت سب انسانوں کا رب ایک، خالق ایک ان کی اصل ایک اور ابتدائی خاندان ایک قرار دیتی ہے۔ اس میں "نفس" کے لفظ نے وحدتِ انسانیت کا پیغام دیا اور سب کے اسی ایک نسل کے پیدا ہونے کے بعد نسل انسانی کی باہمی حاجات و ضروریات میں ایک خاندان کو معاشرہ کی بنیاد ٹھہرایا ہے۔ یہ دو چیزیں دل میں پروردگار کا تقویٰ اور رشتے کی رعایت کو ابھارتی ہیں۔ پھر اس عظیم اصل پر پہلے تو ایک خاندان ہیں اور پھر پوری انسانی وحدت میں باہمی رحم و کفالت اور شفقت و ہمدردی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ سورت میں وارد ہونے والی تمام تنظیمیں اور احکام اسی ایک اصل پر مبنی اور اسی کی شرح و تفصیل ہیں۔

لہ تفسیر المراغی جلد ۴ ص ۱۷۰ سے تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۷۴، ۱۷۵، تفسیر المنار جلد ۴ فوائد القرآن صفحہ ۹۸، تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۱۹

سے فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۳۱، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۷۷۔

Marfat.com

قرآن مجید انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے مخاطب بناتا ہے اور اس کی انسانیت کے علاوہ کسی اور چیز کو تفریق و امتیاز کا سبب نہیں ٹھہراتا یہ ایک فطری تعلیم ہے۔ جاہلیت قدیم ہو یا جدید اس نے ہمیشہ اس سے انحراف کیا ہے۔ اصل تہذیب اسی کا نام ہے مگر جاہلیت ہمیشہ اس کے خلاف رہی ہے۔ قرآن نے ایک طرف تو انسان کی پیدائش سے خالق و مالک اور ربی کے وجود پر استدلال کیا ہے اور دوسری طرف انسان کی اصل کے ایک ہونے سے "وحدت انسانیت" پر زور دیا ہے۔ وحدت نوع انسانی کا یہ سبق اپنے عملی اور دور رس نتائج کے لحاظ سے کتنا اہم ہے۔ آخری حد اعلیٰ ہر گورے اور ہر کالے کے، ہر وحشی اور ہر مہذب کے، ہر ہندی اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے ایک ہی ہیں اور وہ آدم ہیں۔ یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورث اعلیٰ کوئی اور تھے اور فلاں نسل کے کوئی اور۔ اور نہ یہ کہ برہمن ذات والے برہما جی کے منہ سے پیدا ہوتے اور کشتری نسل والے ان کے سینہ سے اور ویش جاتی والے ان کے پیٹ سے اور شودر والے ان کی ٹانگوں سے، اصلاً انسان انسان سب ایک ہیں۔

ہندو نظریہ

اس آیت نے انسان کے مخلوق ہونے کا اعلان کیا ہے۔ ہر وہ نظریہ جو اس کے خلاف ہو وہ باطل ہے اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ ابتداءً نوع انسانی کی تخلیق ایک فرد سے ہوئی ہے۔ جسے قرآن نے دوسرے مقام پر آدمؑ کا نام دیا ہے۔ خلق منھا زوجھا کا مطلب ابن کثیر، حقانی اور عام اہل تفسیر نے یہ بیان کیا ہے کہ حوا کو آدم کی پسلی سے نکالا گیا۔ لیکن یہ تورات کا بیان ہے کتاب و سنت اس صراحت سے خاموش ہیں۔ بخاری میں جو عورت کا ٹیڑھی پسلی (من ضلع اعوج) سے پیدا ہونا مذکور ہے۔ اس سے تورات کے بیان کی صداقت پر استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے مراد محض بطور محاورہ و تشبیہ عورت کا عدم ثبات اور بے استقلالی ہے۔ قرآن کہتا ہے خلق الانسان من عجل: یعنی اس سے انسان کی جلد بازی کا اظہار مقصود ہے نہ یہ کہ انسان کسی ایسی چیز سے بنایا گیا ہے جس کا نام عجل تھا۔ علماء نے یہاں منھا سے مراد من جنسھا لیا ہے۔ ابو مسلم اصفہانی کہتے ہیں کہ اس کی نظیر کئی آیات ہیں۔ مثلاً خلق لکم من انفسکم ازواجا (الایۃ) لقد جاءکم رسول من انفسکم الخ اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم

پس جس طرح ان آیات میں نفس سے مراد جنس ہے اس طرح سورہ نساء کی آیت میں بھی ہے۔ جن لوگوں نے حوا کا آدم کی پسلی سے نکلنا تسلیم کیا ہے۔ ان کا استدلال اس آیت سے نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اس قسم کی دوسری آیات کا بھی اسی قسم کا معنی لینا پڑے گا۔ بخاری کی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ: المرأۃ کالضلع الخ "عورت پسلی کی مانند ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں بھی اس قسم کے الفاظ

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۷۷، تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۱۹، تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷، تفسیر المنار ج ۴

Marfat.com

بولے گئے ہیں ان سے مراد تشبیہ واستعارہ ہے۔نہ یہ کہ موجودہ تورات کے بیان کی تصدیق۔اس آیت سے خدا کا واسطہ دے کر کسی سے وفائے عہد اور حقوق ومراعات طلب کرانے کا جواز نکلتا ہے۔نیز قرابت کی اہمیت اور اس کا تمام انسانی رشتوں کی جڑ ہونا ثابت ہوتا ہے اسی لئے احادیث میں رشتہ (رحم) کی بہت ہی اہمیت وتاکید وارد ہوئی ہے۔قطع رحم کو حرام اور صلہ رحمی کو واجب ٹھہرا دیا گیا ہے۔

انسان کی اصل ایک ہے، لیکن افراد انسانی میں سے دو فرد بھی شکل وصورت، فطرت وطبیعت اخلاق وادب، شعور وادراک اور ذہنی وقلبی بلکہ جسمانی استعداد کے لحاظ سے پوری طرح آپس میں نہیں مل سکتے۔اس حقیقت کو دیکھ کر خالق کائنات کے علم وحکمت، قدرت وتدبیر اور توحید ذاتی وصفاتی پر ایمان لانا پڑتا ہے اس خالق برحق کے سوا اور کون ہے جو یہ سب کچھ کر سکتا تھا؟

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪

اور دے ڈالو یتیموں کو ان کے مال اور بدل نہ لو برے مال کو اچھے مال سے

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ

اور مت کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ یقیناً یہ بڑا

حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا

وبال ہے۔ اور اگر ڈرتے ہو کہ یتیم لڑکیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو

مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

نکاح کر لو ان عورتوں سے جو تمہیں اچھی لگیں دو دو تین تین اور چار چار،

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ

پھر اگر تم ڈرو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو ایک سے ہی نکاح کرو یا لونڈی جو تمہارا اپنا

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِهِنَّ

مال ہے۔اس میں امید ہے کہ تم ایک ہی طرف نہ جھک پڑو گے۔اور دے دو عورتوں کو ان کے مہر خوشی

ف فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۳۵

Marfat.com

نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا

سے پھر اگر وہ تم کو اس میں سے کچھ اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو اسے

فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝

مزیدار خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔

شرح الفاظ

اَلْيَتٰمٰى: یتیم کی جمع ہے۔ لغت میں یتیم اسے کہتے ہیں جس کا باپ مر چکا ہو لیکن عرف میں اس کا نابالغ ہونا بھی شرط ہے۔ پس بے باپ کا لڑکا بالغ ہو کر یتیم نہیں کہلائے گا۔ اَلْخَبِيْث سے مراد حرام اور اَلطَّيِّب سے حلال ہے۔ حُوْبًا كَبِيْرًا کا معنی ہے اِثْمًا عَظِيْمًا یعنی بڑا گناہ۔ اَلْقِسْط حصہ، قَسَطَ کا معنی ہے ظلم کیا۔ قرآن کہتا ہے۔ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا اور اَقْسَطَ کا معنی ہے عدل کیا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ مَا طَابَ لَكُمْ یعنی جن کی طرف دل راغب ہو۔ مَثْنٰى کا معنی ہے دو دو، ثُلٰثَ کا معنی ہے تین تین اور رُبٰعَ کا معنی ہے چار چار، اور دہرا عدد ہر فرد کے لئے اجازت کا اظہار کر رہا ہے۔ اس سے تعداد کا دگنا ہونا مراد نہیں۔ بعض جہلا نے اس سے ۹ (۲+۳+۴) یا ۱۸ تک (۴+۶+۸) کی اجازت نکالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے لوگ زبان عرب سے قابل رحم حد تک بے علم ہیں۔ اَلَّا تَعُوْلُوْا، عَوْل کا معنی ہے جور اور ایک طرف ناجائز جھکاؤ۔

صَدُقٰتِهِنَّ: حق مہر، صدقہ کی جمع ہے۔ نِحْلَةً بطور عطیہ وصبہ، خوش دلی سے برضا و رغبت مطلب یہ ہے کہ حق مہر واجب ہے اسے خوشی سے ادا کر دو۔ یہ نہیں کہ دل چاہا تو دے دیا ورنہ نہیں۔

هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا: هنی کا معنی ہے لذیذ اور مزے دار، مرئی کا معنی ہے جو ہضم ہو جائے اور اچھی غذا ثابت ہو یعنی خوشگوار۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے اسی لئے ترجمہ کیا ہے "رچتا پچتا"۔

ان آیات سے احکام معاشرت کا بیان شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہاں اصولاً تین احکام ارشاد ہوئے ہیں:-

83803

لہ تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۷۸

Marfat.com

(ا) یتامیٰ کا مال ان کے حوالے کر دینے کا حکم۔
(ب) تعدد ازواج کی اجازت اور عدل و مساوات کا حکم، نیز یہ کہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا واجب ہے۔
(ج) حق مہر کی ادائیگی کا وجوب اور اس کی معافی کے احکام۔ تعداد آیات کے اختلاف کی ایک مثال الا تعولوا کا وقف ہے بعض قراء کے نزدیک یہاں وقف آیت نہیں اور اکثر کے نزدیک وقف آیت ہے۔

آیت[1] ۲ میں تین حکم دیئے گئے ہیں:

(۱) یتیموں کے مال انہیں دے دو، یعنی جب وہ بچے ہیں تو ان کا مال انہیں پر خرچ کرو اور جب بالغ ہو جائیں تو ان کا حق ٹھیک ٹھیک انہیں دے دو، اس کے لئے ان کی طرف سے مطالبہ بھی شرط نہیں۔ بلوغ اور سمجھ دار ہونے سے قبل ان کا مال انہیں نہ دیا جائے۔ قرآن نے دوسری جگہ خود صراحت کر دی ہے۔ فَاِنْ آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ الخ

(۲) حلال کو چھوڑ کر حرام میں مت پڑو۔ یتیموں کا اچھا مال لے کر اس کے بدلے انہیں اپنا ردی مال مت دے دو۔ ان کی کوئی اچھی چیز نکال کر اپنے مال میں شامل مت کرو اور اپنی کوئی گھٹیا چیز ان کے مال میں مت ملا دو۔

(۳) یتامیٰ کے مال کو اپنے مال میں ملا کر مت کھا جاؤ۔ یعنی ان کا حصہ اپنے حصہ میں شامل کرنے کی غرض سے باہم خلط ملط مت کرو۔ اگر نیت نیک ہو اور خوف خدا کو پیش نظر رکھا جائے تو خلط ملط میں حرج نہیں ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرۃ) ان آیات کا خطاب یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے یتیموں کا مسئلہ ہر قوم میں اہم اور نازک رہا ہے۔ غیر مسلم بھی مانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے قرآن کے ذریعہ سے یتیموں کے حقوق کا بہترین تحفظ کر دیا ہے۔

آیت[2] ۳: مثنیٰ و ثلث و رباع کی تفسیر میں تین مشہور قول ہیں: -

(۱) ام المومنین عائشہؓ اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۰ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۷۷، تفسیر ابن کثیر پ ۴ صفحہ ۷۴، تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۱۶۴ تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۳۲۲، ۳۳۸ تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۷۹،

[2] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۰، ۳۲۱، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۷۸ (صرف پہلی تفسیر)

Marfat.com

ہیں ہوتی تھیں ان کے مال اور ان کے حسن وجمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سرپرست اور ٹھکانہ تو ہے نہیں جس طرح ہم چاہیں گے انہیں دبا کر رکھیں گے۔ وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ان سے ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں دنیا میں موجود ہیں۔ ان میں سے جو پسند آئیں ان کے ساتھ نکاح کر لو۔ اسی سورت کے انیسویں رکوع کی پہلی آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے (علامہ ابن کثیر نے حضرت عائشہ کی یہ روایت بحوالہ بخاری بیان فرمائی ہے۔ مولف)

(۲) حضرت ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد عکرمہؒ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا اور جب اس کثرت ازدواج سے اخراجات بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے بھتیجوں، بھائیوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لئے چار کی حد مقرر کر دی۔ اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لیکر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

(۳) سعیدؓ بن جبیر، قتادہؒ اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے اہل جاہلیت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے لیکن عورتوں کے معاملہ میں ان کے ذہن عدل وانصاف کے تصور سے خالی تھے، جتنی چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر ان کے ساتھ ظلم وجور سے پیش آتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اول تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو، اور اس چار کی حد میں بھی اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ ان تینوں تفسیروں کے متحمل ہیں اور عجب نہیں کہ تینوں مفہوم مراد ہوں۔ نیز اسکا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف (اور حسن وسلوک) نہیں کر سکتے تو ان عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں (مولف عرض کرتا ہے کہ یہی معنی اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم یتیم لڑکیوں کی ویسے خبر گیری نہیں کر سکتے تو ان سے نکاح کر لو تاکہ وہ تمہاری بیویاں بن کر مساویانہ حقوق کی مالک بن جائیں۔ حضرت شیخ الہند نے فوائد القرآن صفحہ ۹۹ میں گذشتہ تین تفاسیر میں سے پہلی کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح صاحب تفسیر المراغی اور علامہ رشید رضا صاحب تفسیر المنار نے بھی اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔ معلوم ہوا کہ عامۂ مفسرین اور علماء کا یہی قول مختار ہے)

Marfat.com

یہ تو تھی اس آیت کی تفسیر بلحاظ یتامیٰ، اب جہاں تک تعداد کا تعلق ہے سو اہل عرب کہتے ہیں کہ: اِقْسَمُوْا اَلْفَ درھم کلذا مثنیٰ وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۔ تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ہزار درہم اس طور پر بانٹو کہ ہر ایک کو دو، یا ہر ایک کو تین یا ہر ایک کو چار درہم آئیں۔ پس اجازت ہر ایماندار کو حسب ضرورت ایک سے لے کر چار تک بیویوں کی ہے بقول ابن کثیرؒ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور اہل سنت کا یہی قول ہے، اور بہت سی صحیح احادیث اس کی صریحاً تائید و توثیق کرتی ہیں۔[1] اس کے خلاف کہنے والوں کا قول اجماع امت سے مردود و ناقابل التفات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم دو یا زیادہ بیویوں میں عدل و انصاف نہ کر سکنے کا خوف رکھتے ہو تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔ یہ عدل نہ کر سکنے کا خوف ظن اور شک سے ثابت ہوگا۔ پس جس شخص کے لئے دوسری یا اس سے بھی زیادہ بیویوں کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ ہے جسے اپنے آپ پر عدل و انصاف کر سکنے کا بھروسہ ہو اور اس بارے میں شک میں مبتلا نہ ہو۔ لیکن اس ضمن میں فیصلہ کن رائے خود صاحب معاملہ کی ہی ہو سکتی ہے۔ ذٰلِکَ کا اشارہ ایک کو اختیار کرنے یا لونڈی پر اکتفاء کرنے کی طرف ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک بیوی پر اکتفا کرنا یا اس کے ساتھ ساتھ لونڈی سے بھی تمتع کر لینا جور و ظلم نہ کرنے کے قریب تر ہے۔ اس حکم کی تشریع کا باعث ظلم و ستم سے بعید ہونا ہے اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ دوسری کی اجازت میں عدل شرط ہے اور عدل و انصاف کی کوشش کرنا واجب ہے۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ پورا پورا عدل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً دل کا طبعی میلان کسی کے بس میں نہیں۔ پس اپنی طرف سے تو پوری کوشش کرے اور دلی رغبت کے لئے وہ معذور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل کا تعلق ان چیزوں سے ہی ہے جو انسان کی طاقت و وسعت میں داخل ہیں۔ مثلاً مکان، لباس اور اخراجات میں برابری رکھنا اور قلبی میلان چونکہ وسعت سے خارج ہے لہذا انسان اس کا مکلف نہیں۔ احادیث سے ثابت ہے کہ آخر عمر میں حضورؐ کا میلان دوسری ازواج مطہرات کی نسبت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف زیادہ تھا، لیکن دوسری بیویوں کی اجازت و رضا کے بغیر عائشہؓ کو کسی خصوصیت سے نہ نوازتے تھے، اور دعا فرمایا کرتے تھے کہ:-

اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تَؤَاخِذْنِیْ فِیْمَا لَا اَمْلِکُ:-

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۸۰، تفسیر ابن کثیر پ ۴ صفحہ ۷۵، فوائد القرآن صفحہ ۹۹

[2] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۸۰، ۱۸۴، تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۳۳۸، ۳۷۸ تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۱۶۵، ۱۶۷ (مفہوم و مطلب)

Marfat.com

"اے اللہ جہاں تک میری استطاعت ہے یہ میرا عدل و انصاف اور تقسیم ہے۔ مگر جو چیز میری استطاعت سے باہر ہے اس میں مجھ سے مواخذہ نہ فرما۔" استطاعت سے باہر چیز" سے مراد دل کا میلان اور طبعی رغبت ہے۔

بوقت ضرورت تعدد ازواج کی بہت سی حکمتیں ہیں۔ دراصل سعادت زوجیت اسی میں ہے کہ ایک شخص ایک ہی نکاح کرے اور آخر تک اسی پر اکتفا کرے۔ بہتر یہی ہے کہ لوگوں کو یہی تعلیم تربیت دی جائے کہ بلا ضرورت شرعیہ دوسرا نکاح نہ کریں۔ کیونکہ اس میں بعض دفعہ بہت سے مفاسد ہوتے ہیں لیکن اسلام چونکہ دین فطرت ہے۔ لہذا اس نے تعدد ازواج کی بھی حسب ضرورت گنجائش رکھی ہے زوجین کی زندگی سے کئی ایسے معاملات متعلق ہیں جن کی مصلحت کا تقاضا تعدد نکاح ہی ہو سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کئی دفعہ امت کی مصلحت و ضرورت اسی میں ہوتی ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح کئے جائیں۔ پس ایسے وقت میں تعدد ازواج کی اہمیت و لزوم سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل اس معاملے میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے۔ تعدد نکاح کی اصل حیثیت فقط یہی ہے کہ وہ حلال و مباح ہے، نہ تو فرض واجب ہے نہ حرام و مکروہ۔ اس حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو بہت سی الجھنوں سے از خود چھٹکارا مل جاتا ہے حلال و مباح سے مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ چیز جس کا یہ حکم ہے ضرورت و مصلحت کے تحت استعمال کی جا سکتی ہیں۔ مولف)

وہ استثنائی صورتیں اور مصالح جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اس قسم کی ہو سکتی ہیں۔

(۱) مرد اولاد کا طالب ہے، مگر پہلی بیوی بانجھ ہے۔ اس صورت میں زوجین کی مصلحت یہی ہے کہ یہ بیوی بھی اس خاوند کے ہاں رہے اور وہ دوسری بیوی سے بھی نکاح کر لے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ یہ شخص امیر، سردار اور صاحب ثروت بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسے اولاد کی بہت خواہش اور ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) عورت بڑی عمر کی ہو چکی ہے اور اس سے اولاد نہیں، یا ہے تو سہی مگر خاوند دوسری بیوی کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور وہ اس دوسری بیوی کو نان و نفقہ دینے اور زیادہ اولاد کی پرورش اور تربیت پر قادر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اسے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے کا حکم دینا ظلم و جور ہوگا اور اس کا نتیجہ بالفاظ دیگر یہ ہوگا کہ اسے بدکاری اور خیانت کی رغبت ہوگی۔

(۳) مرد غیر معمولی طور پر طاقت ور اور صحت مند ہے اور دیانت داری سے محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک بیوی پر قانع نہیں رہ سکتا۔ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ عورت کا مزاج مرد کے بالکل برعکس ہوتا ہے یا اس کے ماہواری ایام مہینے کا بہت سا حصہ لے جاتے ہیں۔ پس مرد کے

Marfat.com

سامنے اس صورت میں دو راستے کھلے ہیں۔

(ا) یا تو وہ دوسری عورت سے نکاح کرے۔

ب) اور یا بدکاری کر کے دین، مال اور صحت کو تباہ کرے۔

دوسری صورت پہلی عورت کے لئے موت سے آنے سے بھی زیادہ ضرر رساں ہوتی ہے۔ پس اسلام نے بشرط عدل پہلی صورت کو جائز رکھا ہے (کیوں کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کا تو روادار بے شک ہے۔ مگر زنا و سفاح کا ہرگز روادار نہیں۔ تہذیب مغرب نے اس کے بالکل برعکس صورت کو اختیار کیا ہے جو سراسر خلاف فطرت اور جاہلیت ہے۔ یعنی نکاح تو ایک سے ہی ہو مگر بدکاری پر کوئی قدغن نہیں۔ دراصل یہ "تعصب اور "ایک ایک" کی پکار محض عیسائی ذہن کی پیداوار ہے۔ تہذیب جدید نے اسے اپنا کر بعض اور مقاصد حاصل کئے ہیں۔ مثلاً بدکاری کی کھلی چھٹی وغیرہ مگر اسلام میں عصمت، طہارت اور غیرت کا جو مقام ہے اس کے پیش نظر وہ اس کا ہرگز روادار نہیں ہو سکتا تھا جن لوگوں نے اس سلسلے میں اسلام کو ہدف اعتراض بنایا ہے وہ متعصب اور کوتاہ نظر ہیں۔ مؤلف)

(۴) بعض دفعہ خاص خاص حالات کی بنا پر کسی قوم میں عورتوں کی کثرت ہو جاتی ہے جیسا کہ جنگوں کے بعد عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ پس ان حالات میں عورت کی عفت و عصمت سخت خطرے میں ہوتی ہے۔ اگر بدکاری کی اجازت دی جائے تو قومی اخلاق بگڑتے اور حرامی بچوں کی کثرت ہو جاتی ہے۔ ایسے بچے ماں کے لئے بھی بدبختی کا باعث ہوتے ہیں یہ "بے باپ کے بچے" معاشرتی نظام کی جڑیں کھود ڈالتے ہیں۔ ایسی مائیں بھی حالت حمل، حالت پیدائش اور مدت رضاعت میں بدبختی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ کارخانوں، تعلیم گاہوں اور منڈیوں وغیرہ میں مرد و عورت کا کھلا میل جول بالعموم بدکاری، بے آبروئی، بدنامی اور بدبختی کا باعث بنتا ہے اس سے عورتوں پر بدقسمتی اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ یہی باعث ہے کہ بعض یورپین عورتوں نے علی الاعلان اعتراف کیا ہے کہ اس اخلاقی بے قیدی کا علاج سوائے تعدد ازدواج کے کچھ اور نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ آوارگی اور بے راہ روی خود عورتوں کی مصلحت و عزت کے بھی خلاف ہے۔ ایک یورپین لیڈی کا قول ہے کہ:

"ہماری سوسائٹی میں اغوا اور بے حیائی کی وارداتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور اس مصیبت کا کھوج لگانے والے بہت کم ہیں۔ میں ان آوارہ مزاج لڑکیوں کو دیکھتی ہوں تو میرا دل ان کے غم و الم میں پھٹ جاتا ہے لیکن افسوس میں ان کے لئے

Marfat.com

کچھ کر نہیں سکتی۔ صرف غم اندوہ سے کیا فائدہ؟ اگر میری مانند سب لوگ صرف غم واندوہ کا اظہار کر کے ہی رہ جائیں تو کیا حاصل ہوگا؟ ضرورت ایسے عمل کی ہے۔ جو اس صورت حالات کو بدل سکے۔ علاج وہی ہے جو مسٹر ٹامس نے بتایا ہے کہ مردوں کو تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے۔ اس طرح ہماری بے شمار آوارہ اور بے راہ رو لڑکیوں کو گھریلو زندگی کی راحت مل سکے گی۔

اس صورت حال کا واحد سبب یورپ والوں کا لوگوں کو زبردستی ایک سے زیادہ بیوی سے نکاح کرنے سے روکنا ہے۔ اس چیز نے ہماری بہت سی عورتوں کو بے راہ رو گمراہ اور آوارہ کر دیا ہے اور وہ مردوں جیسے اعمال و مکاسب کرنے پر مجبور ہیں۔ جب تک یہ ناروا پابندی رہے گی۔ شر و فساد پھیلتا رہے گا۔ وہ کون سا اندازہ اور شمار کرنے کا طریقہ ہے جو نکاح کرنے والے مردوں کی بدکاری کی اولاد کو گن سکے؟ یہ حرامی اولاد سماج پر بوجھ بن چکی ہے اور معاشرے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اگر دوسرا نکاح ممنوع نہ ہوتا تو حالات یہ نہ ہوتے۔ ان بچوں اور ان کی ماؤں کی بدبختی کا کیا ٹھکانہ ہے؟ اس کا علاج تعدد ازدواج ہی ہو سکتا ہے"۔

ایک دوسری انگریز عورت مس اینی روز نے ایک مشہور رسالے میں لکھا ہے۔

"اگر ہماری لڑکیاں گھروں میں نوکرانیاں یا نوکرانیوں کی مانند بن کر رہیں تو یہ چیز ان کے لئے اور معاشرے کے لئے بھی کارخانوں اور منڈیوں میں ملازمت کرنے اور مزدوری سے ہزار درجے بہتر ہے۔ یہ لڑکیاں تو آج کل ایسے رذائل میں مبتلا ہو جاتی ہیں جو زندگی بھر ان کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں اور ان سے چھٹکارے کی صورت نہیں ملتی"۔

"کاش ہمارے ملک کے حالات بھی مسلمانوں کے ممالک جیسے ہوتے جن میں حیاء پاکیزگی اور عفت و عصمت پائی جاتی ہے۔ ملازم عورتیں بلکہ لونڈیاں تک بہترین زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور گھر کی اولاد کی مانند کام کاج کرتی ہیں اور ان کی عزت و آبرو کو کوئی نہیں چھوتا۔ یورپی ممالک کے لئے یہ بات باعث عار ہے کہ انہوں نے اپنی عورتوں کو مردوں سے کھلے بندوں خلط ملط کرنے کی اجازت دے کر ذلت و کمینگی کی انتہا کو پہنچا دیا ہے"۔

"ہم کیوں ایسا نہیں کرتے کہ عورت کو محض وہی کام کرنے کی اجازت دیں جو اس کی فطرت کے موافق ہے تاکہ وہ مردوں کے کام چھوڑ دے اور گھر کو سنبھال کر اسے درست کرے۔ مردوں کے معاملات کو انہی پر چھوڑ دے کیونکہ عورت کی لطافت و طہارت کا یہی تقاضا ہے اور اسی میں اس کی سعادت ہے"۔

Marfat.com

[1] مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۔ میں واؤ عطف کا نہیں بلکہ تخییر کے لئے ہے اور اَوْ کا ہم معنی ہے۔ وَ کا یہ استعمال تو قواعد نحو اور لغت کے مطابق ہے اور خود اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ مثلاً اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی (سباء ع۵) اُولِیْ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (فاطر) بعض اہل زیغ نے ۲+۳+۴ کو جوڑ کر آیت سے استدلال ۹ بیویوں کے جواز کا کیا ہے اور بعض ظالموں نے تو اس تعداد کو ۱۸ تک پہنچا دیا ہے۔ یہ سراسر جہل و زیغ ہے۔ جہل زبان عرب سے بھی اور جہل سنت رسولؐ سے بھی وَ ھٰذَا کُلُّہٗ جھل باللِّسَانِ وَ السُّنَّۃِ وَ مخالفۃ لاجماع الاُمَّۃ اگر نو ہی تعداد منظور تھی تو صاف ہی کیوں نہ ارشاد ہو گیا، اس قدر گھوم پھر کر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ تعدد ازواج کی اجازت ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی مغرب زدہ مسلمان کو شرمانے اور اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ مرد کے قویٰ اور جسمانی ساخت و ترکیب ہی اس نوعیت کی ہے کہ یہ کثرت عورتوں میں ایک بیوی اس کی طبعی خواہش کی تشفی کے لئے کافی نہیں ہوتی مرد و عورت کے جہاں تک اتحاد و تناسل کا تعلق ہے مرد کا عمل چند منٹ میں ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مرد پر جسمانی حیثیت سے کوئی ذمہ داری ہی نہیں۔ برخلاف اس کے عورت کے لئے اس دو منٹی حمل کے نتائج کا سلسلہ دنوں اور ہفتوں نہیں حمل اور رضاعت کی مدت ملا کر ڈھائی سال تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر حمل کے بغیر بھی ہر جوان تندرست عورت کے لئے ہر مہینہ ایک ایک ہفتہ کی معذوری ایک امر طبعی ہے اور وہ قانونی نظام کامل نہیں ناقص ہے جو مرد کی طبعی ضرورتوں کی طرف سے آنکھیں بند کرے اور عورت کی طبعی معذوریوں کا لحاظ کر کے مرد کے لئے کوئی سہولت جائز نہ رکھے۔ پھر یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین حیاتیات کی شہادتیں اس تجربہ و مشاہدہ کی تائید میں ہیں کہ طبعی ضرورت سے قطع نظر مرد کی شہوانی جبلت تنوع پسند بھی ہے۔ اس لئے جو شریعت اس کی جبلت کی کوئی رعایت اپنے نظام میں نہیں رکھتی، وہ اور کچھ بھی ہو، بہرحال خدائی اور مطابق فطرت نہیں کہی جا سکتی۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ جب سے ساتھ دیتی ہے داعیان توحید نے اس دستور کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر عمل کر کے اسے اور زیادہ قوت پہنچا دی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ میں سے کسی کے ہاں بھی یکزوجی کی سند نہیں ملتی۔ بلکہ بعض کی حرم سرا تو کثرت تعداد کے لئے مشہور ہے۔ قدیم ہندوستان میں اکابر ہنود کی بابت بھی روائتیں وحدت کی نہیں، تعدد ہی کی ہیں اور یورپ اور امریکہ میں آج رسم نکاح کو درمیان میں لائے بغیر

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۷۸ [2] تفسیر ابن کثیر ج۲ صفحہ ۷۵

Marfat.com

جو اندھیر کھلے بندوں ہو رہا ہے اس کی نقل و حکایت کی بھی گنجائش ان صفحات میں کہاں سے لائی جائے۔ اسلام نے ایک طرف تو یک زوجی کی قید اڑا کر تعدد کو سندِ جواز دے دی اور دوسری طرف اس کی مناسب حد بندیاں بھی کئی کئی طرح سے کر دیں اور یہی اس کی حکمت کا کمال رہا۔

اس آیت میں عدل سے مراد ادائے حقوق واجبہ میں عدل و مساوات ہے جو انسان کے قصد و اختیار کے اندر کی چیز ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہر ایک بیوی کو بقدر امکان اور بلحاظ اس کے ذوق و حالات کے راحت پہنچائی جائے فقہاء نے عدل بین الازواج کو فرض قرار دیا ہے لیکن خود عدل کی تفسیر عدم ظلم سے کی ہے کہ کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اگر کوئی شوہر ظلم و بے انصافی کے ساتھ دو یا زائد بیویاں رکھے تو اس پر ظلم و زیادتی کا گناہ برابر ہوتا رہے گا لیکن یہ نہیں کہ دوسری بیوی یا بیویوں سے نکاح ہی منعقد نہ ہو۔ ظلم و جور قانونی انعقادِ نکاح سے مانع نہیں۔

اس[1] بات پر فقہائے امت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی رُو سے تعدد ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ طائف کا رئیس غیلانؓ جب اسلام لایا تو اس کی نو بیویاں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لے اور باقی چھوڑ دے اسی طرح ایک دوسرے شخص (نوفلؓ بن معاویہ) کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپؐ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک چھوڑ دو (ابن کثیرؒ نے ان دو کے علاوہ بھی کئی احادیث بیان کی ہیں پارہ ۴ صفحہ ۷۵، ۷۶، اردو ترجمہ)

نیز یہ آیت تعدد ازواج کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ دیتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ اللہ کے ساتھ دغا بازی کرتا ہے۔ اسلامی حکومت کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو ان کی دادرسی کریں۔

بعض لوگ اہل مغرب کی مسیحیت زدہ رائے سے مغلوب و مرعوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد تعدد ازواج کے طریقے کو (جو مغربی نقطہ نظر سے فی الاصل بُرا طریقہ ہے) مٹا دینا تھا۔ مگر چونکہ یہ طریقہ بہت زیادہ رواج پا چکا ہے اس لئے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض ذہنی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعدد ازواج کا فی نفسہٖ برائی ہونا ناقابل تسلیم ہے کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز تمدنی اور اخلاقی ضرورت بن جاتی ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے۔ حصارِ نکاح سے باہر صنفی

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۱

Marfat.com

بدامنی پھیلانے لگتے ہیں جس کے نقصانات تمدن واخلاق کے لئے اس سے بہت زیادہ ہیں جو تعدد ازدواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے ان لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں۔ تاہم جن لوگوں کے نزدیک تعدد ازواج فی نفسہٖ ایک برائی ہے۔ ان کو یہ اختیار تو ضرور حاصل ہے کہ چاہیں تو قرآن کے برخلاف اس کی مذمت کریں اور اسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں لیکن یہ حق انہیں نہیں پہنچتا کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن کی طرف منسوب کریں۔ کیونکہ قرآن نے صریح الفاظ میں اس کی اجازت دی ہے اور اشارۃً و کنایۃً بھی اس کی مذمت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ فی الواقع وہ اسے مسدود کرنا چاہتا تھا۔

تعدد ازواج میں جو رخصت دی گئی ہے اس میں عدل وانصاف کی پابندی موجود ہے۔ اللہ تعالےٰ جو خالق کائنات ہے وہ انسان کی فطرت وطبیعت اور مصلحت کو سب سے زیادہ اور سب سے بہتر جانتا ہے جو لوگ جہالت اور کور بینی سے اس کے خلاف محض خواہشات نفس، تعصب اور ہوا و ہوس سے جدت اور ضروریاتِ زمانہ کا لحاظ کرنے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں وہ بالفاظ دیگر گویا یہ کہتے ہیں کہ فطرتِ انسانی کو وہ خالق سے بھی بڑھ کر اور بہتر سمجھتے ہیں! ان کے اس دعویٰ میں جہالت وتعصب کے علاوہ بے ادبی اور کفر وضلالت کی بھی آمیزش ہے۔ ان کوتاہ بینوں کی نگاہِ تنگ ان واقعات و حالات سے بھی اندھی ہے۔ جن میں یہ پابندی لگائی گئی اور وہ انسانی فطرت سے بھی ناواقف ہیں۔

احادیث سے غیلانؓ بن سلمہ ثقفیؓ، عمیرہؓ الاسدی، نوفلؓ بن معاویہ دیلمیؓ کی بوقت اسلام بالترتیب دس، آٹھ اور پانچ بیویوں کا ہونا ثابت ہے۔ حضورؐ نے چار کو رکھنے کی اجازت دی اور باقی کو آزاد کر دینے کا حکم دیا۔ اس ربط میں اگر اس حکم کو دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ اسلام نے تعدد ازواج کو محدود اور شرط عدل وانصاف کے ساتھ مشروط کر دیا ہے گویا اسلام کھلی آزادی دینے نہیں بلکہ ایک بے قید آزادی کو محدود کرنے کا حکم لے کر آیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام نے چار کی اجازت بھی کیوں دی؟ کیوں نہ سرے سے تعدد ازواج ہی کو ممنوع کر دیا؟ تو اس کا جواب بڑا واضح اور صاف ہے۔ اسلام ایک فطرتی دین ہے وہ انسانی حاجات وضروریات کا لحاظ کرتا ہے۔ وہ ایک مثبت نظام ہے جس کا تعلق اس واقعاتی اور عملی زندگی سے ہے۔ اس نے انسان کی بدلتی ہوئی ضروریات، مختلف زمانوں اور ممالک میں پیش آنے والے واقعی حالات کا لحاظ رکھا ہے کیونکہ وہ ایک عملی اور واقعاتی مثبت نظام ہے وہ فرضی صورتیں پیش نظر نہیں رکھتا بلکہ انسان کی واقعی زندگی کے پیش نظر اسے احکام دیتا ہے۔ اس کے احکام محض نظریاتی اور انکل پچو نہیں، نہ وہ کوئی دقیق فلسفیانہ نظام زندگی تجویز کرتا ہے جس پر لوگ تو عمل پیرا تو

لہ فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۴۰، ۲۴۷

Marfat.com

نہ ہوسکیں محض دور سے ہی دیکھ کر اسے ایک "مثالی نظام" کہہ دیا کریں! وہ محض تمناؤں اور خوابوں کی دنیا پر یقین نہیں رکھتا بلکہ انسان کی دنیوی اور عملی زندگی کے لئے ناقابل عمل متوازن اور لچک دار احکام دیتا ہے۔ اس نظام میں فطرت انسانی کے ساتھ ساتھ عفت و عصمت اور طہارت و پاکیزگی کا بھی بہت زیادہ لحاظ ہے۔ وہ معاشرے کی پاکیزگی اور شرم و غیرت کا لحاظ رکھتا ہے وہ ایسے احکام نہیں دیتا جو صرف کاغذ پر لکھے رہیں اور انسانی زندگی خفیہ یا اعلانیہ ان کے خلاف عمل پیرا رہے۔ اسلامی نظام زندگی کے یہ اصولی خصائص ہیں جن کا لحاظ احکام و شرائع اور ضوابط و قوانین میں رکھا گیا ہے۔

تاریخ کی شہادت ہے اور اب بھی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کئی معاشروں میں قابل نکاح جوان عورتوں کی تعداد اس قسم کے مردوں سے زیادہ ہوتی ہے، زیادتی کی یہ حد چار اور ایک کی نسبت سے کبھی بڑھنے نہیں پائی بلکہ اس کے اندر رہتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بار بار پیش آنے والی حقیقت کا علاج کیوں کر کیا جائے؟ اس حقیقت کی موجودگی سے تو انکار ممکن نہیں، پس کیا اس کا علاج فقط یہ ہے کہ ہم کندھے جھٹک دیا کریں؟ یا یہ کہ اسے اپنا علاج خود تجویز کرنے کو چھوڑ دیا جائے؟ محض کندھے ہلا دینے سے تو کسی مشکل کا علاج نہیں ہوسکتا اسی طرح معاشرے کو خود بخود اس کا علاج تجویز کرنے کے لئے چھوڑ دینا بھی کوئی عقل مندی نہیں۔ یہ تو احترام نفس اور احترام انسانیت کے خلاف ہے۔ پس لازماً اس کا علاج کسی نظام کے ماتحت کرنا ہوگا۔ اور اس کے تجویز کئے ہوئے علاج کو عملاً بھی نافذ کرنا ضروری ہے۔ یہاں پہنچ کر تین قسم کے احتمال ہمارے سامنے آتے ہیں:

(۱) یہ کہ ہر نکاح کے قابل مرد کا صرف ایک عورت سے ہو اور باقی جوان و قابل زوجیت عورتوں کو بلا نکاح چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس طرح چاہیں زندگی بسر کریں۔

(۲) یہ کہ ہر مرد نکاح تو صرف ایک ہی عورت سے کرے مگر اس کے بعد خفیہ یا علانیہ بدکاری کرتا پھرے اور اس طرح معاشرے میں ایک فساد اور انتشار پھیل جائے۔

(۳) یہ کہ سب یا بعض قابل نکاح مرد ایک عورت سے زیادہ جوان عورتوں سے باضابطہ شرعی نکاح کریں۔ اس طرح تعدد ازدواج تو لازماً واقع ہوگا مگر بدکاری اور فحاشی نہیں پھیلے گی۔

ان میں سے پہلا احتمال فطرت کے بھی خلاف ہے اور اس میں بہت سی شریف عورتوں پر ایسا بوجھ پڑ جانے کا قوی امکان ہے۔ جسے وہ کسی صورت میں بھی برداشت نہ کر سکیں گی۔ یہ حقیقت ان بلند بانگ دعوے داروں کے شور و غل سے باطل نہیں ہوسکتی جو کہتے پھرتے ہیں کہ عورت اگر عمل و کسب میں مرد سے بے نیاز ہو تو اسے مرد کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ لوگ بالکل سطحی ہیں اور فطرت انسانی سے بے خبر ہیں۔ مسئلہ اتنا سطحی نہیں کیونکہ ہزار ملازمت اور ہزار کسب بھی عورت کو اس کی فطری حاجات سے بے نیاز

Marfat.com

نہیں کر سکتے۔ عورت کے کچھ اور بھی جسمانی، طبعی، روحانی اور عقلی مطالبات ہیں۔ وہ فطرۃً مرد کا جوڑا بنائی گئی ہے۔ اس میں شفقت و دل سوزی اور انس و محبت کا گہرا احساس رکھا گیا ہے۔ مرد کو اگر عمل و کسب حاصل ہو جائے تو وہ عورت کی احتیاج سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہی حال عورت کا بھی ہے وجہ یہ ہے کہ انہیں ایک ہی جان سے ایک ہی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے۔

دوسرا احتمال اسلام کے پاکیزہ اخلاق اور اسلامی معاشرے کی عفت و عصمت کے برخلاف ہے، نہ صرف یہ بلکہ وہ عورت کی عزتِ نفس انسانی شرف و کرامت اور نسوانی شرم و حیاء کے بھی خلاف ہے جو لوگ ایامذاروں کی سوسائٹی میں بے حیائی اور بدکاری کو پھیلانے سے دریغ نہیں کرتے۔ وہی لوگ ہیں جو خدا سے بڑھ کر عالم ہونے کا گمان رکھتے ہیں اور اس کے پاکیزہ نظام شرع پر دست درازی کرتے ہیں۔ اس دین کے بعض منافق یا کافر دشمن انہیں اس پر ابھارتے اور جرأت دلانا چاہتے ہیں۔

اب صرف تیسرا احتمال باقی ہے اور اسلام نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ وہ اس کو ایک مقید رخصت سمجھتا ہے جو پیش آمدہ مشکلات کا علاج ہے اسی علاج کو وہ انسانی فطرت، اس کے شرف و کرامت اور دنیا کے واقعی عملی حالات کے لئے انسب جانتا ہے۔ اسی سے انسانی اخلاق کا بچاؤ ہو سکتا ہے اور اسی سے معاشرہ اپنے فطری توازن پر قائم رہ سکتا ہے۔

پھر قدیم و جدید انسانی معاشروں میں ایک اور حقیقت بھی ہے جس سے انکار یا تجاہل عارفانہ ممکن نہیں ہے۔ وہ یہ کہ مرد کی جسمانی و جنسی قوت ستر سال تک اور بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکتی ہے۔ درآنحالیکہ اس کے بالمقابل عورت کی یہ قوت تقریباً پچاس سال تک یا اس کے لگ بھگ قائم رہتی ہے پس اوسطاً مرد کی زندگی میں بیس سال ایسے ہیں جن کے تقاضوں کا جواب عورت کی زندگی میں موجود نہیں ہے۔ پس مرد کی زندگی کے ان بیس طویل سالوں کو مہمل چھوڑ دینا قرینِ مصلحت و انصاف نہیں، عدل و انصاف اور فطرتی مساوات کے اصول کا لازمی تقاضا ہے کہ ایسا قانون بنایا جائے جس سے اس فرق کے تقاضے بطریق احسن پورے کئے جا سکیں۔ یہ قانون ہر فرد کو تو تعدد ازواج پر مجبور نہ کرے مگر جہاں ضرورت داعی ہو اور معاشرے کے دوسرے لازمی اصول نہ ٹوٹیں (مثلاً عدل و انصاف اور اخلاق و حیاء) وہاں حاجت مند افراد کو تعدد کی اجازت دے دے چنانچہ اسلام نے اسی قسم کا قانون پیش کیا ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی ایک واقعی اور عملی حقیقت ہے کہ بعض دفعہ مرد وظیفہ زوجیت کی ادائیگی کا طالب ہوتا ہے۔ مگر عورت کسی جسمانی عارضے، یا عمر کے تقاضے یا بیماری کے باعث اس وظیفہ کی نہ صرف حاجت مند نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات اس سے اباء کرتی ہے اور اسے نقصان دہ جانتی ہے اس کے بعد زوجین طلاق وغیرہ سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتے بلکہ علاقۂ زوجیت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں (معاشرے

Marfat.com

کے دباؤ کے باعث اولاد کی وجہ سے باقدیم تعلقات کے پیش نظر، پس اب پھر وہی سوال پیدا ہوگا جو اس سے قبل پیدا ہوا تھا کہ اس صورت حالات پر محض کندھے ہلا دیئے جائیں اور زوجین کو دیوار سے ٹکرانے کے لئے چھوڑ دیا جائے یا سہگل انکاری سے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں؟ ظاہر ہے کہ یہ تو کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم پھر اپنے آپ کو تین احتمالات کے سامنے پاتے ہیں۔

(۱) یہ کہ ہم مرد پر جبر کریں اور اسے قانون اور حکومت کے زور سے اپنی فطری حاجات کو پورا کرنے سے روک دیں، اور اس سے کہیں کہ: اے شخص دوسرا نکاح ایک گناہ ہے جو نہ تو تیرے لائق ہے نہ تیری بیوی کے حق اور اس کی عزت کے لئے مناسب ہے۔

(۲) یہ کہ ہم اس مرد کو خفیہ یا علانیہ بدکاری کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔

(۳) یہ کہ اس مرد کے حسب حال ضرورت کے ماتحت اس کے لئے تعدد کو جائز ٹھہرائیں مگر پہلی بیوی کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیں۔

یہاں پھر پہلا احتمال فطرت کے خلاف اور مرد کی طاقت سے بڑھ کر ہے۔ علاوہ ازیں اس مرد کی ذاتی حالت کے بھی خلاف ہے۔ جب ہم اسے قانون اور حکومت کی طاقت سے محروم کریں گے تو وہ گھریلو زندگی سے نفرت کرنے لگے گا کیونکہ وہ محسوس کرے گا کہ یہی بندھن اس کی آزادی اور فطری حاجات کی راہ میں حائل ہے۔ وہ اس دنیا کو جہنم سمجھنے لگے گا۔ یہ چیز اسلام کے یکسر خلاف ہے جو گھر کو امن و سکون کا مقام ٹھہراتا اور عورت کو سراسر انس و محبت اور مرد کا لباس قرار دیتا ہے۔

دوسرا احتمال اسلام کے اخلاقی قوانین کے خلاف ہے اور وہ اسے انسانی ترقی اور شرف و کرامت کے خلاف ٹھہراتا ہے۔ اس نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے جبکہ یہ صورت صریحاً حیوانیت ہے۔ اس میں وہ طہارت اور تزکیہ مفقود ہے جو اسلام کا مقصد رفیع ہے۔

اب لے دے کر صرف تیسرا احتمال باقی ہے جو انسانی فطرت و شرف کے مطابق ہے۔ اس میں ایک طرف تو مرد کی فطری حاجت کا تحفظ ہے اور دوسری طرف پہلی بیوی کے جائز حقوق کی سلامتی بھی پائی جاتی ہے اس میں زوجین کے اخلاق اور پاکیزگی کی رعایت بھی موجود ہے اور اس صورت میں وہ حسب سابق میاں بیوی کی حیثیت سے رہ بھی سکتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس بعض دفعہ عورت بانجھ ہوتی ہے لیکن مرد کو بقائے نسل اور اولاد کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ اس صورت میں اس کے سامنے صرف دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔

(۱) پہلا یہ کہ وہ پہلی بیوی کو طلاق دے کر کسی اور عورت سے شادی کرے تاکہ بقائے نسل کا سامان ہو سکے۔

Marfat.com

(ب) دوسرا یہ کہ اس بیوی کی موجودگی میں کسی اور سے شادی کرے اور پہلی بیوی کے حقوق زوجیت کو بھی حسب سابق پورا کرتا رہے۔

اب اس صورت میں جو شخص پہلا راستہ اختیار کرے یا دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دے، سو عورتوں میں سے ننانوے اس پر لعنت کریں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں پہلی بیوی کا مستقبل بالکل تاریک ہو جاتا ہے کوئی دوسرا شخص مشکل سے ہی اس سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوگا اور پہلے سے وہ بذریعہ طلاق الگ ہو چکی ہوگی! اس کے خلاف بارہا ایسا ہوتا ہے کہ دوسری بیوی کی اولاد سے اس پہلی بیوی کو بھی انس و محبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سوت کو بخوشی برداشت کر لیتی ہے بلکہ بعض دفعہ تو بانجھ عورت خود خاوند کو دوسری شادی کی اجازت بلکہ مشورہ دیتی ہے اور اپنے زیر اہتمام دوسرے نکاح کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

اس بحث سے ثابت ہو گیا کہ اسلام نے بعض ضروریات کے ماتحت نکاح ثانی کو عدل و انصاف کی شرط کے ساتھ مباح کیا ہے اور یہ ایک فطری اور واقعاتی ضرورت ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک تعدد ازدواج فی نفسہٖ مطلوب و مقصود نہیں بلکہ یہ ایک فطری اور معاشرتی ضرورت ہے ورنہ بدکاری اور اباحیت کے دروازے کھلیں گے اور حیوانیت کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

اب اگر کوئی شخص یا بعض اشخاص اس رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور اسے اپنی سفلی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنالیں تو قصور ان کا ہے نہ کہ اسلام کا۔ یہ لوگ غیر مسلم معاشروں کی تقلید اور نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ اسلام کی۔ یہ اس رذالت تک اسلام کو چھوڑ کر پہنچے ہیں۔ انہوں نے اسلام کی پاکیزہ روح کو نہیں پایا۔ وہ ایسے معاشروں میں رہتے ہیں جہاں اسلام حاکم نہیں ہے یہ اسلام کے پیرو نہیں بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کے بندے ہیں ان کا علاج اسلام کا قانون اور اس کی پاک شریعت ہے۔

گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے تعدد ازدواج کو ایجاد نہیں کیا بلکہ محدود کیا ہے۔ اس کا حکم نہیں دیا بلکہ بعض شرطیں لگا کر اس کی اجازت دی ہے اور اس کی یہ رخصت انسانی معاشرت، معاشرتی حالات و واقعات اور ضروریات کے عین مطابق ہے۔ اس کی بعض مصلحتیں اوپر بیان ہوئی ہیں عین ممکن ہے کہ گردش دوراں کئی اور مصلحتیں ثابت کر دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کی حکمت و مصلحت

بیک وقت چار تک کی اجازت اور اس کے بعد پابندی کا حکم امت کے لئے ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سورۂ احزاب کی آیات ۵۰ —— ۵۲ کی رو سے اس حکم سے

Marfat.com

مستثنیٰ تھی۔ اس استثنا کی بہت سی مصلحتیں تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ازواج النبیؐ بروے نصِ قرآنی وَازْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ مومنوں کی مائیں تھیں۔ اگر حضورؐ ازواج میں سے کسی کو طلاق دے دیتے تو کوئی دوسرا شخص ان سے نکاح نہیں کر سکتا تھا۔ بروئے آیت قرآنی وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا (الاحزاب ۵۳) اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو ازواج مطہرات کے چھوڑنے سے منع فرما دیا تھا۔ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ (الاحزاب ۵۲) بالفرض اگر حضورؐ کو ان میں سے بعض کو طلاق دینے کی اجازت ہوتی تو چونکہ ان کا نکاح کسی اور سے ہو ہی نہ سکتا تھا، لہٰذا بہت سی معاشرتی الجھنیں پیدا ہونے کا قوی اندیشہ موجود تھا۔ اب ایک سوال رہ گیا کہ ان احکام کے نزول سے قبل حضورؐ نے اتنے نکاح کیے کیوں؟ سو ان کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل حقائق کو پیش نظر رکھنا واجب ہے۔

(۱) حضورؐ کے تمام نکاح بجز سوائے عائشہ صدیقہؓ کے، بیوہ عورتوں سے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض دو دو خاوندوں سے بیوہ ہو چکی تھیں (مثلاً خدیجہ الکبریٰؓ) بعض بوقتِ نکاح تقریباً بوڑھی ہو چکی تھیں (مثلاً حضرت سودہؓ) پس ان کے نکاح میں محض تلذذ و تعیش ہرگز پیش نظر نہ تھا۔ جیسا کہ بعض اعدائے اسلام کا خیال ہے۔ حیرت ہے کہ حضورؐ کے زمانے کے شدید دشمنوں نے تو آپؐ کے کردار اور اخلاق پر انگلی نہ رکھی بلکہ دشمنی کے باوجود عمر بھر آپ کے اخلاق اور دیانت و امانت و عفت و عصمت کے معترف رہے مگر جدید دنیا کے اعدائے رسولؐ کو یہ دور کی سوجھی ہے کہ آفتاب پر خاک ڈالنا چاہتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل ایک غیر مسلم نے "رنگیلا رسولؐ" نامی ایک رسوائے زمانہ زہریلی کتاب بھی شائع کی تھی اور وہ علم الدین شہیدؒ نامی ایک باعزت نوجوان کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا تھا۔ اسی طرح مشتشرق گروہ ملحد اور کمیونسٹ بھی اس آفتاب عالمتاب پر دھول ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

(۲) آپؐ نے زیادہ نکاح کر کے نکاح بیوگان کا رواج ڈالا اور صنف نازک پر وہ احسان فرمایا جس کے شکریئے سے وہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

(۳) کئی بیوگان سے محض ان کی اولاد (یتامیٰ) کی پرورش کی مصلحت کے پیش نظر نکاح کیا (مثلاً ام سلمہؓ)

(۴) کئی نکاح آپؐ نے محض مختلف قبائل اور سرداروں سے رشتہ داری قائم کر کے تبلیغ اسلام کی راہ ہموار کرنے کے لئے ابوسفیانؓ کی بیٹی ام حبیبہؓ کا نکاح اس کی ایک مثال ہے۔

(۵) حضرت زینبؓ سے نکاح محض ایک رسم بد کو عملاً دور کرنے کے لئے کیا، زمانہ جاہلیت میں متبنیٰ کو حقیقی بیٹے کی مانند سمجھتے تھے اور اس کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح کو معیوب جانتے تھے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو آپؐ کے متبنیٰ زیدؓ بن حارثہ کی مطلقہ زینبؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کا حکم دے کر اس رسم کو موقوف کرا دیا۔

(۶) بعض خواتین ایسی تھیں جو کسی مقتول سردار کی بیوی یا بیٹی تھیں (مثلاً حضرت صفیہؓ) اور انکا نکاح رسم زمانہ کے لحاظ سے سوائے سربراہ مملکت کے کسی سے نہ ہو سکتا تھا۔ پس آپؐ نے اس مصلحت سے ان سے نکاح فرمایا۔

(۷) آپؐ نے تعدد ازواج کے ذریعہ سے اپنے پیروؤں کو عورتوں کا احترام و کرام بھی سکھایا اور ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل و مساوات کو بھی عملاً واضح فرمایا۔

(۸) آپؐ کی ازواج امت کی عورتوں میں اور آپؐ میں مسائل دین سیکھنے سکھانے کا واسطہ و ذریعہ تھیں۔ طہارت و نجاست کے بہت سے احکام صرف عورتوں ہی کی معرفت معلوم ہو سکتے تھے۔ لہذا آپؐ نے تبلیغ مسائل دین کی خاطر کثرت سے نکاح کئے۔ یہ مقصد صرف ایک یا دو تین عورتوں کے ذریعہ سے حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔

(۹) آپؐ کا تعدد ازواج عام لوگوں یا ملوک امراء کی مانند ہرگز نہ تھا۔ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ عیش پسند اور لذت پرست لوگ نت نئی نویلی کنواری عورتوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اس کے برخلاف آپؐ کے سارے نکاح (ایک کے سوا) بوڑھی، نیم بوڑھی اور بیوہ خواتین سے ہوئے[1]

اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ : اس کا لفظی معنی ہے "یا وہ جن کے مالک تمہارے داہنے ہاتھ ہیں"۔ محاورہ میں اس سے مراد شرعی مملوک، غلام اور کنیزیں ہوتے ہیں جن کا اب مدت دراز سے دنیا کے اکثر ممالک میں کہیں وجود نہیں۔ اسیران جنگ کا معاملہ ہمیشہ ایک اہم و دشوار معاملہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ جو مرد اور عورتیں شکست خوردہ غنیم کے ہاں سے گرفتار ہو کر آئیں۔ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ انہیں کہاں اور کیسے رکھا جائے؟ کسی نے اس کا حل جبری مزدوری FORCED LABOUR یا بیگار کو نکالا۔ کسی نے کچھ اور۔ ہماری شریعت نے حکم یہ دیا کہ بجائے اس کے کہ ایک بڑی آبادی کا بار حکومت STATE پر ڈالا جائے اس تعداد کو افراد میں تقسیم کیا جائے اور ہر فرد اس نو وارد کو اپنے خاندان کا ایک جز بنا لے۔ اس سے کام ہر طرح کا یقیناً لے، لیکن اس کے آرام کا بھی ہر طرح لحاظ رکھے۔ اور ان میں جو عورتیں ہوں ان سے ہم بستری کا حق بھی حاصل رہے اس کا فیصلہ ہو کر آنا یہ خود اعلان نکاح کا قائم مقام ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید ایجاب و قبول اور شاہدین کی ضرورت نہیں۔ اور یہ

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۸۳، ۱۸۴، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۶۷

[2] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۷۸

Marfat.com

لوگ آسان شرائط پر اپنی آزادی ہر وقت خرید سکتے ہیں (شرائط کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی) بلکہ ان کے آزاد کرنے کی فضیلتیں اور اس کے لئے طرح طرح کی ترغیبات خود قرآن مجید ہی میں درج ہیں اور حدیث میں تو اور زائد ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے صاف سیدھے، شریفانہ، حکیمانہ قانون سے شرمانے اور اسے غیروں سے چھپانے کی تجدد زدہ مسلمان ضرورت محسوس کرتے ہیں شاید اس لئے کہ ان کا ذہن معاً انگریزی کے لفظ SLAVE اور ان ساری سختیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس لفظ کے تخیل کے ساتھ وابستہ ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہاں تو غلاموں اور غلام زادوں نے بارہا بادشاہتیں کی ہیں اور امراء تو ان میں کثرت سے ہوئے ہیں اور دینی حیثیت سے بڑے بڑے علماء، فقہاء و ائمہ حتیٰ تابعین ہی کے زمانہ سے پیدا ہونے لگے تھے کنیز کے حقوق بیوی سے کمتر ہوتے ہیں، اس لئے ان کا ادا کرنا بھی قدرۃً سہل تر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بار بھی برداشت نہ کر سکو تو پھر لونڈی سے نکاح کر لو جیسا کہ تفصیل اس کی آگے رکوع ۴ میں آرہی ہے یا یہ کہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کی ہمتیں ضرورت ہو اور آزاد خاندانی بیویوں کے درمیان عدل رکھنا تمہارے لئے مشکل ہو تو لونڈیوں کی طرف رجوع کرو کیونکہ ان کی وجہ سے تم پر ذمہ داریوں کا بار نسبتاً کم پڑے گا۔

لونڈیوں کے احکام آیت نمبر ۲۴ کی تفسیر میں دیکھے جائیں جو آگے پانچویں پارہ کی ابتداء میں آرہی ہے۔

آیت ۴: یعنی عورت خود مطالبہ کرے یا نہ کرے، اس کی طرف سے کوئی دوسرا مطالبہ کرنے والا ہو یا نہ ہو، تمہارا اپنا فرض ہے کہ جس عورت سے نکاح کرو اس کا مہر خوش دلی سے ادا کر دو۔ عورت اگر مہر کی کوئی مقدار خوشی سے معاف کر دے، یا وصول کر کے پھر خاوند کو واپس ہبہ کر دے تو اب تمہیں اس کے کھانے کا پورا اختیار حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ اور قاضی شریحؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو پورا مہر یا اسکا کوئی حصہ معاف کر دیا ہو اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر کو اس کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کا مطالبہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے پورا مہر یا اس کا کوئی حصہ چھوڑنا نہیں چاہتی

صدقاتِ نحل: صداق یا مہر شریعت اسلامی میں بیوی کی وہ قیمت نہیں جو شوہر اس کے اولیاء کو

تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۲ فوائد القرآن صفحہ ۱۰۰ تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۲ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۷۹

Marfat.com

دے کر ان سے بیوی حاصل کرتا ہے بلکہ حق مہر بطور ایک نذرانہ کے ہے۔ جو شوہر بہ غرض اکرام و اعزاز براہ راست بیوی کو پیش کرنا اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے۔ آتوا النساء فرما کر گویا یوں ارشاد ہوا ہے کہ یہ رقم مہر اپنی بیویوں کو دو نہ کہ ان کے اولیاء و والدین کو۔ مہر کی اہمیت اور ادائے مہر کی تاکید شریعت میں بالکل ظاہر ہے۔ گو افسوس ہے کہ امت کا عمل اس کے برعکس ہے۔ مہر کو ایک وہمی اور فرضی چیز سمجھ رکھا ہے۔

اگر بیوی خوشدلی سے اجازت دے دے تو اس کے بعد تم بلا تکلف مہر کو اپنے کام میں لا سکتے ہو۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ سے واضح ہے کہ بیویوں کی طرف سے یہ ابراء بغیر کسی جبر اور دباؤ کے اور شوہر سے کسی مکر و فریب کے بغیر ہونا چاہیئے۔ مہر اگر کسی جبر یا مکر سے معاف کرایا گیا ہے تو قاضی و عدالت کے ہاں سے جو بھی فیصلہ ہو جائے اللہ معاف نہیں سمجھا جائے گا۔ عورت کی طرف سے معافی پورے مہر کی بھی ہو سکتی ہے اس کے کسی جز کی بھی۔ بیوی اگر شوہر سے مہر وصول کر کے پھر اسے واپس کر دے تو اسے ہبہ کہیں گے۔ اور اگر لئے بغیر پہلے ہی معاف کر دے تو اس کا نام اصطلاح فقہ میں ابراء ہے اور شرعاً دونوں صورتیں بالکل درست ہیں۔

اس آیت کا خطاب مردوں سے ہے۔ ارشاد ہوا کہ جن عورتوں سے تم عقد نکاح کرتے ہو انہیں ان کے مہر بخوشی دے دو تاکہ یہ اس مودت و انس اور محبت کی دلیل بن سکے جس کا زوجین میں پایا جانا اشد ضروری ہے۔ انہیں باہم مل کر زندگی گذارنا ہے۔ لہذا مرد سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اپنی رفیق سفر اور شریک حیات سے کوئی حیف، دریغ، ظلم و جور یا بخل و کنجوسی اختیار کرے گا۔ بلکہ لوگوں کا عرف تو یہ ہے کہ حق مہر کے علاوہ بھی بہت سے ہدیے اور تحفے کپڑوں، زیوروں اور کھانے پینے کی چیزوں کی صورت میں بیوی کو پیش کرتے ہیں، یہ اس کی علامت ہوتی ہے کہ مرد کو اپنی شریک حیات کا احترام و اکرام ملحوظ خاطر ہے، اور وہ اس کے لئے قربانی پر آمادہ ہے۔

آیت سے یہ بھی پتہ چلا کہ جب تک عورت کی رضا اور دلی خوشنودی کا پتہ نہ چل جائے۔ مرد کو اس کے مال میں سے کچھ بھی خرچ کرنا اور کھانا جائز نہیں۔ اگر عورت نے ازراہ خوف و خجالت مہر معاف کر دیا تو یہ کوئی معافی نہیں، اور جو چیز پوری آمادگی کے بغیر لی گئی ہو اس کا استعمال مرد کے لئے جائز نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا۔ مرد کا فرض ہے کہ اپنے شرف و کرامت کو سونے چاندی سے زیادہ عزیز رکھے۔ حق مہر کوئی مال تجارت نہیں جسے حیلے بہانے سے کم کروانے یا رعایت کی کوشش کی جائے

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۸۴، تفسیر المنار جلد ۴

Marfat.com

ابن ابی حاتمؒ اور ابن جریر طبریؒ نے حضرت ابو صالحؒ سے روایت کی ہے کہ لوگ اپنی بیٹیوں کا حق مہر خود لے لیتے تھے، اس آیت کی رو سے ایسا کرنے سے صریحاً منع فرما دیا گیا ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ

اور مت پکڑا دو بے عقلوں کو اپنے وہ مال جن کو بنایا ہے اللہ نے

لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ

تمہارے لئے گزران کا سبب اور انہیں ان میں سے کھلاتے اور پہناتے رہو

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى

اور کہو ان سے بات معقول اور سدھاتے رہو یتیموں کو

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ

جب تک پہنچیں وہ نکاح کی عمر کو پھر اگر

اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ

دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالے کرو ان کے مال ان کے

وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ

اور مت کھا جاؤ ان مالوں کو ضرورت سے زیادہ اور جلدی سے پہلے کہ وہ

يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ

بڑے نہ ہو جائیں۔ اور جو حاجت مند نہ ہو تو وہ ان سے بچتا رہے

وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ

اور جو کوئی محتاج ہو تو وہ کھائے دستور کے موافق۔

[1] تفسیر ابن کثیر پ۴ صفحہ ۷۷ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا

پھر جب حوالہ کرو ان کو ان کے مال تو گواہ کر لو

عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

ان پر اور اللہ کافی ہے حساب لینے کو۔

شرح الفاظ

السُّفَهَآءَ سفیہ کی جمع ہے، سفیہ سے مراد وہ شخص ہے جو فضول خرچ ہو یا مال کو بے جا ضائع کرے۔ اس کا مادہ سفہ ہے جس کا معنیٰ اضطراب ہے، زمان سفیہ سے مراد وہ وقت ہے جس میں بہت اضطراب ہو، ثوب سفیہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے، جس کی بنائی ردی ہو، پھر اس کا استعمال مالی تدبیر میں عقل کے نقصان پر ہونے لگا اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ قِيٰمًا: باعث قیام یعنی مال سے تمہارے معاشی معاملات استوار ہوتے ہیں اور وہ تم سے فقر کو دور کرتا ہے۔ امام راغب اصفہانی[1] فرماتے ہیں کہ قیام اور قوام اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز قائم ہو اور اس کا ثبات حاصل ہو جیسے عماد جس پر اعتماد کیا جائے اور سناد جس پر سہارا لگایا جائے۔ وَارْزُقُوْهُمْ یعنی انہیں عطا کرو، دے دو، قَوْلًا مَّعْرُوْفًا اچھی بات جس سے نفوس درست ہوں اور دل انہیں مانوس جانیں۔ مثلاً ناقص العقل آدمی کو آہستہ سے یہ سمجھانا کہ یہ تمہارا ہی مال ہے، کسی اور کو نہیں تمہیں ہی ملنے والا ہے، لہٰذا اسے ضائع کرنے کے درپے مت ہو اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا: یعنی تم دیکھو کہ وہ مال میں احسن طریقے سے تصرف کر سکتے ہیں۔ اِسْرَافًا مال تصرف میں حد سے تجاوز کرنا۔ بِدَارًا کسی چیز کی طرف جلدی کرنا، اسی سے مبادرت کا لفظ بنا ہے اور دونوں کا معنیٰ ایک ہے۔ فَلْيَسْتَعْفِفْ یعنی وہ عفت و پاکیزگی اختیار کرے۔ عفت کا معنیٰ ہے نامناسب خواہشات کو ترک کر دینا۔ حَسِيْبًا رقیب، نگران، حساب لینے والا، محاسبہ کرنے والا۔

گذشتہ آیات میں سے دوسری میں یتامیٰ کو ان کے مال دینے اور چوتھی میں عورتوں کو حق مہر کی ادائیگی کر دینے کا حکم گذر چکا ہے۔ زیر تفسیر آیات میں مال کی سپردگی کی شرط یہ بتائی گئی ہے کہ جسے

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۸۵

Marfat.com

مال دیا جا رہا ہے۔ وہ سفیہ نہ ہو، ہاں متولّی اور وارث و خاوند کا فرض ہے کہ جب تک مال اس کے پاس رہے وہ مال کے اصلی مالکوں کو دستور شرع کے موافق کھلاتا پلاتا اور لباس دیتا رہے اور اچھی طرح انہیں سمجھاتا بھی رہے۔ حتیٰ کہ ان کے حالات درست ہو جائیں۔ پس جب معاملات میں ان کا رشد و صلاحیت ثابت ہو جائے تو مال ان کے سپرد کر دیا جائے۔ متولّی اس مال میں فضول خرچی نہیں کر سکتا بلکہ اگر وہ غنی ہے تو بالکل بچ کر رہے اور اگر حاجت مند ہے تو خوفِ خدا کے ساتھ موافق دستور و حکم شریعت اس میں سے کچھ استعمال کر سکتا ہے، اور اسے بطورِ حقِ خدمت شمار کیا جائے گا نہ کہ بطور اجرت و مزدوری۔

اُن آیات میں مال کو انسانوں کے لئے سبب قیام معیشت اور متاع گزران فرمایا گیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ ایسی مفید اور قیمتی چیز کو بے سمجھ لڑکوں کے ہاتھ میں نہ دو، مبادا وہ اسے ضائع کر ڈالیں۔ مال کو بچانا اور اندیشہ ہلاکت سے محفوظ رکھنا مقصود شرع ہے جب تک یتیم کو کاروبار میں نفع نقصان کا ہوش نہ آجائے۔ اس وقت تک ان کا مال متولّی کے قبضہ میں رہے گا۔ اور وہ انہیں اس میں سے کھلاتا پلاتا رہے گا اور ان کی تسلی و تشفی کرتا رہے گا کہ مال تمہارا ہے جب تم اس کے قابل ہو گئے تو لے لینا۔ بلوغ کے وقت تک یتیم کو سدھانا اور آزمانا ضروری ہے۔ بعد از بلوغ جب ان میں انتظام کا سلیقہ اور حفاظت کا ہوش پایا جائے تو مال ان کے سپرد کر دو۔ سدھانے اور آزمانے کی عمدہ صورت یہ ہے کہ معمولی کم قیمت چیزوں میں ان سے خرید و فروخت کرائی جائے اور ان کی تربیت کی جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ نابالغ کی بیع و شراء ولی کی اجازت پر موقوف ہے اگر وہ جائز رکھے تو روا ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مال یتیم میں ضرورت سے زائد اخراجات کرنا ناجائز ہے اور اس خوف سے کہ یہ بڑا ہو کر مال کا خود مالک و متصرف ہو جائے گا، خرچ کرنے میں جلدی کرنا بھی حرام ہے۔

سُفَهَاءَ سے مراد وہ یتیم ہیں جو عمر کے اعتبار سے بالغ ہو چکے ہیں۔ لیکن مال کو خرچ کرنے کا سلیقہ و انتظام پیدا نہیں ہوا (تفسیر مدارک)، سفہ و سفاہت سے یہاں کسی معصیت یا اخلاقی جرم کی طرف اشارہ کرنا نہیں، بلکہ محض ان لوگوں کی انتظامی قابلیت کا اظہار مقصود ہے (روح المعانی و احکام القرآن للجصاص)، اَمْوَالَكُمُ اس لئے فرمایا کہ وہ مال یتیموں کی ملک ہے لیکن فی الحال ان کے سرپرستوں کی ولایت میں ہے (جلالین ـ بیضاوی) لَكُمُ کی ضمیر سے مراد عام انسانیت ہے یعنی مال جو انسان کے لئے مایۂ زندگی ہے اور اس کے اوپر انسان کی حیاتِ مادی

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۰

[2] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۷۹

Marfat.com

ومعاشرتی کا دار ومدار ہے (مدارک وروح المعانی) مطلب یہ ہے کہ مال اللہ کی بڑی نعمت ہے اور بڑی قدر کی چیز ہے ابھی اسے نافہم یتیموں کے ہاتھ میں نہ دے دو کہ وہ اس کی قدر ومرتبہ سے ناواقف ہیں۔ وہ ناقدری سے اسے اڑا دیں گے۔ فقہا نے اس آیت سے حفظ مال اور اسے ضائع نہ کرنے کے وجوب پر بھی استدلال کیا ہے (احکام القرآن للجصاصؒ) آگے فرمایا ہے کہ اس مال سے یتیموں کی ضرورتیں پوری کرتے رہو۔ ان کی راحت وآسائش کے سامان کرتے رہو۔ اور بجائے ان کے ہاتھ میں جائیداد دینے کے ان سے تسلی کی باتیں کرتے رہو۔ یہیں سے فقہا نے نالائق اولاد اور بیوی کے نان ونفقہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے (جصاصؒ)

یتیم کے بالغ ہوجانے پر بشرط رشد (سلیقہ وانتظامی قابلیت) اس کا مال اس کے حوالے کردو۔ یہاں دیکھنے کی چیز صرف یتیم کی انتظامی صلاحیت ہے نہ کہ عبادت وتقویٰ، پس رشد سے مراد سلیقہ مندی اور انتظامی قابلیت ہے اور یہ لفظ تقویٰ وہدایت کے عام معنی میں نہیں آیا (کشاف، راغب مدارک جصاصؒ) بلوغت کے بعد بھی اگر یتیم میں رشد نہ پایا جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ۲۵ سال کی عمر عمر میں بہرحال اس کا مال اسے دے دیا جائے لیکن فاتر العقل کے احکام الگ ہیں (جصاصؒ)

وہ دلی یتیم جو غنی ہے اسے کوئی قیس یا آزپیم وغیرہ مال یتیم سے لینا جائز نہیں اور وہ یتیم کی خدمت محض فی سبیل اللہ کرے۔ جو حاجت مند ہے وہ بقدر حاجت لے سکتا ہے۔ مگر یہ بطور اجرت نہ ہوگا کیونکہ نگرانی تو ولی کے فرائض میں ہے اور ادائے فرض پر اجرت جائز نہیں۔ بلکہ یہ رقم الگ خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی ایک مد ہے (احکام القرآن للجصاصؒ)

آیت[۵] وسیع معنی کی حامل ہے۔ اس میں امت کو یہ جامع ہدایت فرمائی گئی کہ مال جو ذریعہ قیام زندگی ہے، وہ بہرحال ایسے نادان لوگوں کے اختیار وتصرف میں نہ رہنا چاہیے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کرکے نظام تمدن ومعیشت اور بالآخر نظام اخلاق کو خراب کردیں۔ حقوق ملکیت جو کسی شخص کو اپنے املاک پر حاصل ہیں اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ اگر وہ ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور ان کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کردے تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ کئے جاسکیں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریات زندگی کا تعلق ہے وہ تو ضرور پوری ہونی چاہئیں۔ لیکن جہاں تک مالکانہ حقوق کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ استعمال اخلاق وتمدن اور اجتماعی معیشت کے لئے صریحاً مضر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیمانے پر ہر صاحب مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالہ کررہا ہے وہ اس کے استعمال کی صلاحیت

تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۲، ۳۲۳، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۶۸

Marfat.com

رکھتا ہے یا نہیں۔ اور بڑے پیمانے پر اسلامی حکومت کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیئے کہ جو لوگ اپنے مال پر مالکانہ تصرف کے خود اہل نہ ہوں، یا جو لوگ اپنی دولت کو بُرے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں، ان کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے لے اور ان کی ضروریات زندگی کا بندوبست کر دے۔

آیت ۶ کے لفظ اٰنَ یَّکْبَرُوْا سے امام اعظمؒ نے یہ سمجھا ہے کہ بلوغت کے بعد بھی اگر یتیم میں صلاحیت کار اور رشد نہ پایا جائے تو ۲۵ سال کی عمر میں بہرحال اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ صاحبینؒ اور امام شافعیؒ کی رائے میں بہرحال رشد کا لحاظ ضروری ہے پس اگر بلوغت کے بعد بھی یتیم میں رشد نہیں پایا جاتا تو ان آئمہ کی رائے کے مطابق مناسب یہ ہوگا کہ قاضی شرع اس کے معاملات کی نگرانی کا خود کوئی انتظام کر دے۔

آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ کم عقل بے وقوف لوگوں کو ان کے اپنے مال میں تصرف سے روک دیا جائے۔ مثلاً نابالغ بچہ، مجنون و دیوانہ، کم عقل آدمی اور بے دین شخص جو اپنے مال کو بُری طرح لٹا رہا ہو۔ اسی طرح وہ شخص جس پر قرض بہت زیادہ چڑھ گیا ہو کہ وہ اسے اپنے مال سے ادا ہی نہیں کر سکتا۔ اگر قرض خواہ حاکم وقت سے درخواست کریں تو حاکم اس کے سارے مال کو اپنے قبضے میں لے لے گا اور اسے بے دخل کر دے گا۔ اس آیت سے بظاہر تو مراد یتیم ہیں مگر ابن عباسؓ ابن مسعودؓ، ابوہریرہؓ، ابن عیینہؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، مجاہدؒ، عکرمہؒ اور قتادہؒ کے نزدیک اس کے حکم میں بچے، عورتیں اور خادم سب داخل ہیں

اس سے اوپر دوسری آیت میں لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ کے الفاظ گذر چکے ہیں جن سے یتامیٰ کے اموال کا اولیائے یتامیٰ کے احوال سے الگ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن زیر تفسیر آیات میں وَلَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَکُمُ فرما کر ان کے مالوں کو متولیوں کے اموال قرار دے کر ان پر پابندی لگانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں سے یہ واضح ہیں۔

(۱) گو مال اولیاء کی ولایت و نگرانی میں ہے مگر ضائع ہو جائے تو ان کے لئے واجب ہے کہ یتامیٰ پر اپنے اموال صرف کریں۔ پس ان اموال کا ضائع ہونا گویا اولیاء کے اموال کا ضائع ہونا ہے اس لئے سفہاء کے اموال کو اولیاء کا مال قرار دیا گیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۷۷

[2] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۸۶، تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۳۷۸، ۳۹۹ تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۵۲

Marfat.com

(۲) امت کا نفع و نقصان ایک ہے عوامی فلاح و نگاہ ایک اسلامی فریضہ ہے۔ اس لحاظ سے ایک کا مال سب کا مال ہے ایک کی مصلحت سب کی مصلحت ہے اور مالی منافع میں سب شریک ہیں۔ اس حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ اموال کی مالک دراصل امت و جماعت ہے اور یتامیٰ اور ان کے مورث دادیا، اس مال کی ملکیت صرف اس لئے رکھتے ہیں کہ اسے بڑھائیں اور مفید کاموں میں لگائیں۔ اس طرح مال کا نفع صرف ان کو ہی نہیں بلکہ ساری جماعت کو بھی حاصل ہوگا۔ لیکن یہ یاد رکھیئے کہ ذاتی و شخصی ملکیت بہرحال قائم ہے اور اس کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔

علاوہ ازیں ان آیات میں مال کی اہمیت، اسے بچانے اور محفوظ رکھنے کی اہمیت اور اسراف و تبذیر کی مذمت بھی واضح ہے۔ مال کا ایسے ہاتھوں میں ہونا لازم ہے جو اسراف و تبذیر سے مبرا ہوں اسلام نے اسراف و تبذیر اور بخل و تقتیر کے درمیان اقتصاد کی راہ اعتدال پسند کی ہے۔ ارشاد قرآنی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ خدا کے بندے وہ ہیں جو انفاق میں اسراف و بخل اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال و ثابت قدمی کی راہ پر چلتے ہیں۔" زیر تفسیر آیات کا قیام اور اس آیت کا قوام دونوں قابل غور ہیں۔ مسند احمد میں عبداللہ بن مسعود کی روایت سے حضورؐ کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ، (جو اقتصاد و اعتدال اختیار کرے وہ محتاج و زیر بار نہیں ہوتا) طبرانی و بیہقی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اَلْاِقْتِصَادُ فِی النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ وَالتَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ وَحُسْنُ الْعَقْلِ نِصْفُ الْعِلْمِ (خرچ میں اعتدال نصف معیشت ہے اور لوگوں کا محبوب بننا نصف عقل ہے اور خوب سمجھنا نصف علم ہے۔)

کتاب و سنت کے ان واضح سنہری احکام کی موجودگی میں مسلمانوں کا موجودہ طرز عمل سمجھ سے بالاتر ہے۔ کاش کہ وہ محض نام کے لئے اسلام کی طرف منسوب نہ ہوں بلکہ اس کے احکام کو بھی مدنظر رکھیں۔ مالی امور میں افراط و تفریط ہی مسلمانوں کو بہت سی مشکلات اور ذلتوں کا باعث ہے۔ اسلام نے مال کی جہاں مذمت کی ہے اس سے مراد وہ مال ہے جسے ناجائز طریقے سے کمایا یا ناجائز طور پر صرف کیا جائے۔ نیز یہ مذمت آخرت کی ترغیب اور عمل پر ابھارنے کے لئے وارد ہوئی ہے۔ مطلق مال کو خیر، فضل اللہ، قیام اور قوام وغیرہ کے عظیم الفاظ سے یاد فرمایا گیا ہے۔ مال کے بغیر کون سی نیکی ہو سکتی ہے؟ سلطنت کا کون سا کام چل سکتا ہے؟ بلکہ آج تو مال کی اہمیت اس قدر

Marfat.com

بڑھ گئی ہے کہ اتنی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مال کے بغیر افراد و اقوام ذلیل و خوار اور دوسروں کے دست نگر ہو جاتے ہیں۔ مفلس اقوام غلامی اور ذلت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مغرب و مشرق نے مسلمانوں کو جن فتنوں میں جکڑا ہے ان میں سے مال کی زنجیر نہایت خوف ناک اور نتائج کے لحاظ سے اندوہ ناک ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ

مردوں کا بھی حصّے ہے۔ اس میں جو چھوڑیں والدین اور رشتہ دار

وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ

اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝٧ وَإِذَا حَضَرَ

تھوڑا ہو یا زیادہ ہو حصہ مقرر شدہ ہے اور جب حاضر

الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِينُ

ہوں تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور محتاج

فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝٨

تو ان کو کچھ کھلا دو اس میں سے اور کہہ دو ان کو بات معقول

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ

اور ڈرنا چاہیئے ان لوگوں کو کہ اگر وہ چھوڑیں اپنے پیچھے

ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ

اولاد کمزور تو ان پر اندیشہ کریں کہ ان کا بھی یہی حال ہوگا۔ پس

لْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝٩ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ

انہیں خدا سے ڈرنا اور سیدھی بات کہنا چاہیئے۔ بلاشبہ جو لوگ کھا جاتے ہیں

Marfat.com

اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ

یتیموں کا مال ظلم سے تو یقیناً وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے

نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰ ع ۱۲

ہیں اور وہ عنقریب دہکتی آگ میں داخل ہوں گے

شرح الفاظ

نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا: حصّہ اور اٹل حصہ جس کا ادا کرنا اور حصہ داروں کا اسے لینا لابدّی امر ہے۔ وَلْيَخْشَ خَشْيَةَ اس خوف کو کہتے ہیں جو محل امن میں ہو، یعنی واقعی اور عملی تو نہ ہو مگر اس کا وقوع متوقع اور ممکن ہو۔ سَدِيْدًا[۲]۔ عدل، وصواب، صحیح بات، سداد کا معنیٰ ہے۔ سرحد پر مورچہ بندی کرنا، ٹوٹے ہوئے شیشے کو جوڑنا، کسی شکست وریخت کو درست کرنا، سداد کا معنی کفایت وغنا بھی ہے سَيَصْلَوْنَ: صَلْيٌ مصدر کا معنیٰ ہے، گوشت کو بھوننا، ہاتھ کو آگ سے تاپنا۔ اِصْلَاءٌ اور تَصْلِيَةٌ کا معنی ہے جلانا، بھسم کر ڈالنا سَعِيْرًا: مشتعل آگ بھڑکتی آگ۔

ان آیات میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ مالِ موروث میں مرد اور عورتیں سب حصہ دار ہیں۔ حصوں کی کمی بیشی اور مختلف ہونا امر دیگر ہے، لیکن اصولاً سب وارث مال میں حقدار ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں اور بچوں کو وراثت نہیں ملتی تھی۔ ہاں بہت کم مثالیں اس کے خلاف بھی موجود ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وارث وہی ہو سکتا ہے جو نیزہ بازی کر سکے اور غنیمت لا سکے۔ نیز گھوڑے پر سوار ہو کر دفاع کا فریضہ انجام دے سکے۔ ان آیات میں یتامیٰ سے نرم کلام کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ کیوں کہ یتیم کا احساس بہت نازک اور تیز ہوتا ہے۔ ذرا سی بات (بالخصوص اپنے مرحوم والدین کے نامناسب ذکر) پر رنج والم کا شکار ہو جاتا ہے۔ افسوس بہت سے لوگ یتیموں کو ذلت و حقارت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یتامیٰ پر شفقت کرنے اور ان سے

---

[۲] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲، فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۵۲، ۲۵۴، تفسیر ابن کثیر پارہ ۴ صفحہ ۸۰، فوائد القرآن صفحہ ۱۰۰، تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۱۶۹۔

Marfat.com

حسن دسلوک کا حکم دیا ہے، اولاد سب کی برابر ہے۔ اگر ایک کی یتیم ہوگئی ہے تو اس پر سختی نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ دوسروں کو بھی اس سے دوچار کر سکتا ہے۔ یتامیٰ کا مال کھانے اور ظلم وستم پر یہاں نہایت شدید وعید سنائی گئی ہے۔ ان آیات کے شانِ نزول میں احادیث میں آیا ہے کہ اوس بن ثابتؓ انصاری ایک بیوی اور تین بیٹیاں چھوڑ کر فوت ہوگئے۔ جاہلیت کے رواج کے مطابق متوفی کے چچازاد بھائیوں، سویدؓ اور عرفطہؓ نے اس کے سارے مال پر قبضہ کر لیا۔ مرحوم کی بیوی ام کحلہؓ حضورؐ کی خدمت میں شکایت لے کر حاضر ہوئی۔ حضورؐ کے استفسار پر سویدؓ اور عرفطہؓ نے جاہلیت کے رواج کا ذکر کیا تو یہ آیات اتر آئیں۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ اوسؓ کا مال اس کی بیوی اور بیٹیوں کو بھی ملے گا۔ لیکن چونکہ مقداریں معین نہیں کی گئیں۔ لہٰذا تم اس مال سے فی الحال دست بردار ہو جاؤ۔ پھر آیت یوصیکم اللہ نازل ہوئی تو اس کے مطابق حضورؐ نے بیوی کو ۱/۸، بیٹیوں کو ۲/۳ دلا دیا۔ اور باقی چچازادوں کو مل گیا۔

اسلام نے تقسیم وراثت میں فطری قرابت اور قرابت کے قرب وبعد کا بھی لحاظ رکھا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق ایک خاندان اور برادری کے افراد میں تکافل کی ذمہ داری پائی جاتی ہے اور یہیں سے یہ کفالت پھیل کر عام انسانی کفالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مشہور قاعدہ ہے کہ الغنم بالغرم (منافع ذمہ داری کے لحاظ سے ہے) پس قرابت دار چونکہ حاجت کے وقت باہمی کفالت وذمہ داری کے مکلف ٹھہرائے گئے ہیں اور قتل وجرح کے معاملات میں ضامن بنائے گئے ہیں، پس عدل وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ وہ باہم وارث بھی ہوں اور وراثت کا حصہ تضامن وتکافل کے پیش نظر کم وبیش ہوتا رہے! اسلامی حقوق وفرائض کے راز کو سمجھنے کے لئے اس راز کو جاننا لازم ہے۔ اسلامی وراثت میں یہی قاعدہ وقانون کارفرما ہے۔

آیت[1] میں دو قانونی حکم واضح طور پر دیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ میراث صرف مردوں ہی کا حصہ نہیں ہے۔ بلکہ عورتیں بھی اس کی حقدار ہیں۔ دوسرے یہ کہ میراث ہر حال میں تقسیم ہونی چاہیئے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو۔ حتیٰ کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس ٹکڑوں میں تقسیم ہونا چاہیئے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک وارث دوسروں سے ان کا حصہ خرید لے۔ علاوہ بریں وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال واملاک پر جاری ہوگا۔ خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ زرعی ہوں یا صنعتی یا کسی اور صنف مال میں شمار ہوتے ہوں اور خواہ وہ مورث کی خود پیدا کردہ ہو یا جدی جائیداد ہو مرتب)

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۶

Marfat.com

وارثت کی تقسیم مورث کی رائے اور اختیار پر موقوف نہیں، حصوں کی ہر تقسیم اور ترکہ کا ہر استحقاق شریعت الٰہیہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔ یہ نہیں کہ جب کوئی روشن خیال چاہے اٹھے اور اس قانون میں قطع و برید کر کے رکھ دے۔ حق میراث مردوں اور عورتوں دونوں کو پہنچتا ہے۔ اس میں رد ہو گیا ان مذہبوں کا جنہوں نے عورت کو محض اس کے عورت ہونے کی بنا پر حق وارثت سے محروم رکھا ہے۔ ہندوؤں کی طرح جاہلیت عرب میں بھی عورتوں کا کوئی حصہ نہ تھا (اسی طرح دیگر قوانین کا بھی حال ہے مثلاً مغربی قوانین مرتب)

اسلام[1] نے چودہ صدی قبل عورت کا بھی وارثت میں حصہ مقرر کر کے یہ بتا دیا تھا کہ اس کی نگاہ میں اصل قیمت انسان کی انسانیت کی ہے۔ وہ جاہلیت (قدیمہ وجدیدہ) کی مانند افراد کی قوت کار اور ان کی جنگی قابلیت کی بنا پر وارثت نہیں دیتا بلکہ ان کے انسان ہونے کی بنا پر دیتا ہے علاوہ ازیں اس کے پیش نظر خاندانی اور مسلم معاشرے میں کفالت کا اصول ہے جس کی بنا پر وہ نزدیک و دور کے رشتہ داروں کو کم و بیش حصہ عطا کرتا ہے۔

اور چونکہ اسلامی نظام وراثت میں بعض رشتہ دار دوسروں کو محجوب کر دیتے ہیں (بعض دفعہ ایک کی موجودگی میں دوسرا محروم ہو جاتا ہے یا اس کا حصہ بالکل کم ہو جاتا ہے) لہٰذا لازماً ایسے قرابت دار پائے جا سکتے ہیں جو دوسرے زیادہ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی کی وجہ سے حصہ نہیں پا سکے۔ لہٰذا آیت ۸ میں ایسے لوگوں کی دل جوئی اور خوشنودی خاطر کی غرض سے تقسیم وارثت کے وقت ان کا ایک غیر محدود حصہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ جب وہ تقسیم کے موقع پر حاضر ہوں تو انہیں بھی کچھ دیدیا جاوے تاکہ احساس محرومی کی وجہ سے شکستہ خاطر نہ ہوں اور ان کی محرومی خاندانی روابط اور قلبی احساسات پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ اس آیت کے حکم کو بعض لوگوں نے آئندہ آیت میراث **يُوصِيكُمُ اللّٰهُ** کی بنا پر منسوخ الحکم کہا ہے لیکن ایسا کہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ پھر اکثر مفسرین اور آئمہ فقہ نے اس کے حکم کو استحبابی قرار دیا ہے (فوائد القرآن صفحہ ۱۰۰، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۰، تفسیر حقانی صفحہ ۱۶۹، تفسیر ابن کثیر صفحہ ۸۱، پارہ ۴، تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۵۔ مرتب) اور کچھ حضرات اسے وجوبی حکم ٹھہراتے ہیں، ہمارا رجحان اسی دوسری طرف ہے! (ابن کثیر وغیرہ نے ان حضرات کے یہ نام لکھے ہیں: ابن مسعودؓ، ابو موسیٰؓ، عبدالرحمان بن ابی بکرؓ، مجاہدؒ، ابوالعالیہؒ، شعبیؒ، حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، سعید بن جبیرؒ، مکحول دمشقیؒ، ابراہیم نخعیؒ۔ سعید بن المسیبؒ نے ابن عباسؓ کی پیروی میں فرمایا ہے کہ اگر مورث کی وصیت

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۰

[2] فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۵۶۔

Marfat.com

کے مطابق ایسا ہو تو پھر واجب ہے ورنہ مستحب، چاروں ائمہ فقہ کا یہی مسلک ہے)

آیت ۹ کا خطاب اولیائے یتیم کی طرف ہے، مطلب یہ ہے کہ یتامیٰ کے حسب مصلحت یعنی ان کی تعلیم، تادیب، تسلی، دل جوئی ہر پہلو کا لحاظ رہے علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ اولیاء کی طرف سے "قول سدید" یہ ہے کہ وہ یتامیٰ کو اذیت نہ دیں اور ان سے اسی طرح بات چیت کریں جس طرح بہتر ادب اور اظہار خوشنودگی کے لئے اپنی سگی اولاد سے کرتے ہیں اور وہ بات صحیح اور سچی ہو جس میں کوئی پہلو شر و فساد اور اتلاف حقوق کا نہ نکلتا ہو۔ آیت ۱۰ کا مضمون یہ ہے کہ خیانت غصب، بددیانتی ہر صورت میں بری ہیں مگر یتامیٰ کے مال میں ان کا وقوع قبیح تر ہے، یتامیٰ کا مال کھا جانے سے مراد یہ ہے کہ یتیم کا مال کسی طریقہ سے بھی بے جا صرف میں نہ لایا جائے۔ صرف کھانا ہی مراد نہیں۔ اردو محاورہ میں بھی "روپیہ کھا جانا" ایسے موقع پر بڑے وسیع معنیٰ میں آتا ہے۔ امام ابوبکر الجصاصؒ نے لکھا ہے کہ کھانے کا ذکر بالخصوص اس لئے ہوا کہ اموال سے زیادہ تر نفع اسی مد میں اٹھایا جاتا ہے **اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا** کا مطلب یہ ہے کہ اس حرام خوری کا انجام دوزخ کی آگ ہے چنانچہ آیت کے آخر میں اس کی وضاحت بھی فرما دی گئی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جنگ احد کے بعد حضرت سعد بن ربیعؓ کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لئے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ! یا رسول اللہؐ! یہ سعدؓ کی بچیاں ہیں جو آپؐ کے ساتھ جنگ احد میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں ان کے چچا نے ان کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لئے ایک حبہ تک نہیں چھوڑا۔ اب بھلا ان بچیوں سے کون نکاح کرے گا؟ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ

حکم دیتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں کہ ایک مرد کا حصہ برابر ہے دو عورتوں کے

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ

پھر اگر صرف عورتیں ہی ہوں دو سے زیادہ تو ان کے لئے ہے دو تہائی اس مال سے جو چھوڑا مرا اور

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۰، تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۹۳، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۶۹، فوائد القرآن

سہ تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۷

Marfat.com

كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ

اگر ایک ہی ہو تو اس کے لئے آدھا ہے اور میت کے والدین کو ہر ایک کے لئے

مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ

ان دونوں سے چھٹا حصہ ہے اس مال سے جو چھوڑ مرا اگر میت کے اولاد ہے۔ اور اگر

لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ

اس کے اولاد نہیں اور اس کے وارث والدین ہیں تو اس کی ماں کا تیسرا حصہ ہے

فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ

پھر اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے۔ چھٹا حصہ بعد

وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ

وصیت کے جو کر مرا تھا یا بعد ادائے قرض کے تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم

لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ

نہیں جانتے کہ کون نفع پہنچائے تم کو زیادہ حصہ مقرر کیا ہوا

اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۱ وَلَكُمْ نِصْفُ

اللہ کا ہے، بے شک اللہ خبردار ہے حکمت والا ہے۔ اور تمہارا ہے آدھا

مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ

مال جو کہ چھوڑ مریں تمہاری عورتیں اگر نہ ہو ان کے اولاد اور اگر

كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ

ان کے اولاد ہے تو تمہارے واسطے ہے چوتھائی اس میں سے جو چھوڑ مریں بعد

Marfat.com

وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا

وصیت کے جو کر گئیں یا بعد قرض کے اور عورتوں کے لئے چوتھائی مال ہے

تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ

اس میں سے جو چھوڑ مرو تم اگر نہ ہو تمہارے اولاد اور اگر تمہارے اولاد ہے

فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا

تو ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو تم نے چھوڑا بعد وصیت کے جو تم کر مرو

اَوْ دَيْنٍ ۗ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ

یا قرض کے اور اگر وہ مرد کہ جس کی میراث ہے، باپ بیٹا کچھ نہیں رکھتا

وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ

یا ایسی ہی عورت ہو اور اس میت کے ایک بھائی یا بہن ہے تو ان دونوں میں سے ہر ایک

فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ

کا چھٹا حصہ ہے اور اگر زیادہ ہوں اس سے تو وہ شریک ہیں تہائی میں

فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ

بعد وصیت کے جو ہو چکی ہے یا قرض کے بعد جب اوروں کا

مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

نقصان نہ کیا ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کا۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا تحمل کرنے والا ہے

شرح الفاظ

یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ اِیْصَاءً مصدر کا معنی ہے وصیت کرنا، یہاں اس سے مراد امر و حکم اور

Marfat.com

نصیبت ہے۔ الذَّکَر کا معنی ہے مذکر اور اس کے بالمقابل اُنثیٰ ہے یعنی مونث۔ حَظّ کا معنیٰ ہے حصہ ثُلُثٌ ⅓ کو ثُلُثَانِ ⅔ کو نصف ½ کو سُدس ⅙ کو اَلرُّبُعُ ¼ کو الثُّمُن ⅛ کو کہتے ہیں یہ اعداد سب کسری اعداد کہلاتے ہیں اور وراثت میں ان کا اکثر استعمال ہوتا ہے وَاحِدٌ، وَاحِدَۃٌ اس کا مونث ہے) کا معنیٰ ہے ایک اِثنانِ کا معنیٰ ہے دو اِثنَتَانِ اس کا مونث ہے۔ وَلَدٌ کا معنیٰ ہے بیٹا یا بیٹی (اولاد) وَرِثَہٗ اس کا وارث ہوا۔ اَبَوَاہُ اس کے والدین۔ اَخُوَۃٌ، اَخٌ (بھائی) کی جمع ہے اس کے بالمقابل اَخَوَاتٌ، اُخْتٌ (بہن) کی جمع ہے۔ بھائی بہنیں سب ہوں تو بھی اِخْوَۃٌ کہلائیں گے۔ آبَاءٌ اَبٌ (باپ) کی جمع ہے۔ اس کے بالمقابل اُمَّھَاتٌ اُمٌّ (ماں) کی جمع ہے۔ اَبْنَاءٌ اِبْنٌ (بیٹا) کی جمع ہے۔ اور اس کے بالمقابل بَنَاتٌ بِنْتٌ کی جمع ہے لَا تَدْرُوْنَ تم نہیں جانتے۔ فَرِیْضَۃً ٹھہرایا ہوا مقرر کردہ عَلِیْمٌ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور حَکِیْمٌ بھی صفت خداوندی ہے۔ پورا دانا، صاحب حکمت اَزْوَاجٌ زَوْجٌ کی جمع ہے، اس کا معنیٰ ہے جوڑا۔ اور یہاں مراد ہے بیویاں۔ دَیْنٌ قرض، اس میں ہر قسم کا قرض داخل ہے۔ مثلاً حق مہر اگر ادا نہیں کیا تھا تو وہ بھی بذمہ میت ہے جو اس کے مال کے ⅓ سے ادا ہوگا کَلَالَۃٌ جس کے والدین اور اولاد زندہ نہ ہو۔ غَیْرَ مُضَارٍّ نقصان نہ دیا ہو۔ یعنی وصیت کے اجراء اور قرض کی ادائیگی میں میت کے حق اور کسی وارث یا قرض خواہ کو یا جس کے لئے وصیت ہے اس کو نقصان نہ دیا جائے گا۔ حلیم بُردبارہ حلم والا۔

[1] آیت ۱۲ میں مجملاً جو قاعدہ توریث بیان ہوا ہے ان آیات میں اس کی تفصیل آگئی ہے۔ ان احکام کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب (اور دیگر تمام ادیان و رسوم) کے قواعد وراثت کو باطل کر دیا ہے اور اسلام کا نظام وارثت جو عدل و توازن اور فطرتی لچک پر مبنی ہے۔ اسے نافذ فرما دیا ہے

زمانہ جاہلیت میں وراثت کے اسباب تین تھے۔

(۱) نسب، لیکن اس کے ذریعہ سے وراثت صرف مردوں کا حق تھا۔ عورتوں اور بچوں کو یکسر محروم رکھا جاتا تھا) ہاں بعض استثنائی صورتیں بھی ملتی ہیں،

(۲) تبنیٰ یعنی کسی کی اولاد کو اپنی اولاد ٹھہرانا ایسی اولاد (ذکور) کو وراثت ملتی تھی۔

(۳) حلف و عہد یعنی کوئی شخص دوسرے سے عہد کر لیتا کہ تو میرے خون اور وراثت میں شریک ہے اور تمام مالی معاملات میں ہم ساجھی ہیں تو ان میں سے جو پہلے مر جاتا دوسرا اس کا وارث

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۹۴، ۱۹۵، تفسیر خانی جلد ۳ صفحہ ۱۷

Marfat.com

ہوتا (یعنی مقررہ شدہ اور طے کردہ شرائط کے مطابق)

اسلام نے وراثت کے پہلے سبب یعنی نسب کو قائم رکھا۔ مگر اس میں یہ ترمیم کر دی کہ سب وارث (مرد، عورتیں اور بچے) مرنے والے کی وراثت میں شریک ہیں، جیسا کہ اوپر آیت ۷ میں گذرا ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ (الایۃ)

اسی طرح تیسرے سبب (عہد و حلف اور ولاء) کو بھی قائم رکھا گیا۔ بلکہ اس کے قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے گئے۔ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (الایۃ) لیکن یہ توارث بالعہد اس صورت میں ہے جبکہ نسبی وارث موجود نہ ہوں۔

اب رہا دوسرا سبب یعنی تبنّی (متبنّیٰ بنانا) تو اس کی وجہ سے بوراثت کا فائدہ نحالے اسلام نے باطل قرار دیدیا ہے۔ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ (الایۃ) پھر اسلام نے نسبی و عہدی وراثت پر دو اور چیزوں کا اضافہ کیا۔

(۱) ہجرت: یعنی مہاجر صرف مہاجر کا وارث ہوتا تھا۔ اگرچہ ان میں باہم کوئی خونی رشتہ نہ ہوتا بلکہ ان میں مودّت و مخالطت پائی جاتی۔ کوئی غیر مہاجر اس کا وارث نہ ہوتا۔ اگرچہ وہ اس کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوتا۔ لیکن جب مکہ فتح ہوگیا اور سارا عرب دارالاسلام بن گیا تو یہ ضرورت جاتی رہی۔ اب بھی اختلاف دارین فقہائے اسلام کے نزدیک وارث سے محرومیت کا سبب ہے۔ یعنی جب مورث دارالاسلام میں فوت ہو تو اس کے وہ نسبتی وارث جو دارالکفر یا دارالحرب کے باشندے ہوں، اس کے وارث نہیں ہو سکتے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ بعض ترمیمات اور اضافوں سمیت یہ حکم اب بھی باقی ہے۔

(۲) مواخات: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو یثرب کے معاشرے کا حصہ بنانے کے لئے مواخات (بھائی چارہ) کا سلسلہ قائم فرمایا تھا۔ جن دو آدمیوں کو حضورؐ اس سلسلے میں منسلک فرماتے وہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ پھر یہ حکم (اور اسی طرح ہجرت والا بھی بڑی حد تک) اس آیت سے منسوخ ہوگیا۔ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ الایۃ۔ اس نسخ کی وجہ یہ تھی کہ اب اسکی ضرورت باقی نہ رہی تھی، اور جس مقصد کے لئے یہ حکم نافذ ہوا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ ہاں! اسلام مواخات و اخوتِ اسلامی کا عام معنوں میں ہمیشہ کے لئے حکم دیتا ہے۔

پھر احکام فرائض کے نزول کے بعد معاملہ یہاں پر آ ٹھہرا کہ وراثت کے اسباب تین ہیں۔

(۱) نسب

Marfat.com

(ب) ولاء

(ج) نکاح

امام احمدؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت جابرؓ سے ان آیات کے نزول کے سبب میں وہ روایت بیان کی ہے جو اوپر ہم بحوالہ تفہیم القرآن بیان کر آئے ہیں۔ سعدؓ بن الربیع جنگ احد میں شہید ہو گئے تھے اور ان کے مال اور املاک پر ان کے بھائی نے قبضہ کر لیا تھا۔ سعدؓ کی بیوہ اپنی یتیم لڑکیوں کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور لڑکیوں کے چچا کی زیادتی کی شکایت کی حضورؐ نے تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ اس فیصلے کا خود فیصلہ فرمائیں گے۔ چنانچہ یوصیکم اللہ والی آیتیں نازل ہوئیں۔ حضورؐ نے سعدؓ کے بھائی کو بلا کر فرمایا کہ کل مال کا ۲/۳ سعدؓ کی بیٹیوں کو دے دو۔ ۱/۸ سعدؓ کی بیوی کا۔ ہے اور جو باقی بچے وہ تمہارا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں تقسیم ہونے والی سب سے پہلی میراث یہی تھی (یعنی ان آیات کے موافق!)

اسلام کے نظام توریث کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے والدین کو اولاد کی توریث کی وصیت فرمائی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ رحیم وکریم اور عادل ومحسن ہے۔ جتنے والدین اپنی اولاد کے لئے ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکم وامر صرف اللہ کا ہے اور فیصلہ صرف اسی کا قابل نفاذ ہے، اسی چیز کا نام دین ہے اور اس سورت میں اس کی تفصیل مناسب انداز میں فرمائی گئی ہے۔ احکام وراثت میں سورۂ انساء میں تین آیات وارد ہوئی ہیں۔ دو تو اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں یعنی گیارہویں اور بارہویں آیات اور تیسری آیت سورت کے خاتمہ میں آئی ہے۔ آیت ۱۱ میں اصول وفروع کی وراثت کا بیان ہے۔ آیت ۱۲ میں زوجین اور کلالہ کی وراثت کا ذکر ہے۔ اور سورت کے آخر میں آنے والی آیت میں بھی کلالہ کے بعض حالات کا ذکر فرما کر اس کے بیان وراثت کی تکمیل کی گئی ہے۔

ان تین آیات میں علم فرائض کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں۔ ان اصول کی کچھ تفریعات وتفاصیل تو سنت میں صراحتاً وارد ہوئی ہیں اور کچھ میں فقہاء امت نے ان اصول کے مطابق تطبیق وقیاس اور اجتہاد کر کے اس علم (علم المیراث) کو مکمل کر دیا ہے (یہ علم بھی اسلام کی خصوصیات میں سے ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب، کوئی الہامی ضابطہ، کوئی قانون اتنا کامل اور سہل نہیں جتنا اسلام کا علم المیراث ہے۔ مرتب)

ترکہؓ کی تقسیم اجتماعی ومعاشرتی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کی عادلانہ تقسیم

لہ فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۸۵، ۲۵۹، تفسیر ابن کثیر پ ۴ صفحہ ۸۲، ۸۳ (مجملاً)

سے تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱۔

Marfat.com

پر معاشرہ کی فلاح و بہبود کا بہت کچھ مدار ہے اور وہ نام نہاد آسمانی کتابیں دنیا کے ہدایت نامہ کی حیثیت سے کامل نہیں ناقص ہیں جو ایسے اہم مسئلہ کی تفصیلات سے خالی ہوں۔ دنیا کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی شریعتیں ایسی ہیں جن میں لڑکی کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں اور عرب جاہلیت میں بھی ترکہ کے حصہ دار صرف مرد، اور مردوں میں بھی بالغ اور قابل جنگ مرد تھے۔ ایسے قانون کا ظالمانہ اور خلاف فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے، لیکن اب اس کے ردِ عمل کے طور پر بعض حلقوں سے جو یہ صدا اٹھی ہے کہ مرد و عورت کا حصہ مساوی ہونا چاہیئے۔ یہ دوسری بے اعتدالی اور افراط کی جگہ تفریط ہے۔ عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضویاتی فرائض نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت نسل کے ساتھ ساتھ اس پر فکر معاش کی ذمہ داریاں بھی ڈال دی جائیں۔ قدرت نے اور اس لئے صحیح اور سچی شریعت نے اس کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے۔ گھر اور خاندان کا خرچ چلانا اس کے سر رکھا ہے۔ اس لئے یہ ظلم نہیں عین عدل ہے کہ ترکہ میں اسے حصہ بھی بڑا ملے۔ پھر ہر شادی شدہ عورت کو حصول میراث کے موقع پر دو حصے حاصل رہتے ہیں، ایک ادھر میکہ میں باپ کے ترکہ میں سے حصہ، دوسرا ادھر سسرال میں شوہر کے ترکہ میں سے حصہ، اس طرح صوری اور ظاہری طور پر بھی عورت گھاٹے میں نہیں رہتی۔

احقر مؤلف عرض کرتا ہے کہ میراث کے مسائل میں بہت کم فقہی اختلاف ہے اور اس فرعی و تفصیلی اختلاف کا محل فقہ و فرائض کی کتابیں ہیں۔ یہاں چوں کہ ان آیات کی تفسیر پیش نظر ہے لہذا ہم اپنے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے فوائد القرآن کو بنیاد بنا کر آیات زیر تفسیر پر مختصر کلام کریں گے۔ تمہیدی گفتگو مختلف تفاسیر کے حوالہ سے اوپر گذر چکی ہے۔ مسائل میراث کی حد تک تقریباً تمام تفاسیر کا مفہوم ایک ہی ہے۔ لہذا ہم تفہیم القرآن تفسیر ماجدی، تفسیر المنار، تفسیر ابن کثیر، تفسیر حقانی، فی ظلال القرآن اور تفسیر المراغی کی عبارتوں کے نقل کرنے سے گریز کریں گے۔ محترم قارئین سمجھ لیں کہ یہاں بیان ہونے والے مضامین ان سب کتابوں کا ماحصل ہیں۔ ہاں اگر کوئی مزید فائدہ یا مفید نکتہ بیان کرنا مد نظر ہوا تو ان کتابوں سے بھی نقل کیا جائے گا۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ التوفیق [1] یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی أَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَیَیْنِ - اقارب میں سب سے پہلے اولاد کے حصہ کا بیان فرمایا کہ اگر کسی میت کی اولاد مذکر و مونث دونوں ہوں تو ان کو میراث دینے کا وعدہ یہ ہے کہ ایک بیٹا دو بیٹیوں کے برابر حصہ پائے گا۔ مثلاً اگر ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوں تو نصف مال بیٹے کا اور نصف دونوں بیٹیوں کا ہوگا۔

---

[1] فوائد القرآن از حضرت شیخ الہند صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲

Marfat.com

اور اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوگی تو ۲/۳ بیٹے کا اور ۱/۳ بیٹی کا ہوگا۔

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؛ یعنی اگر کسی میت نے اولاد میں صرف بیٹیاں ہی چھوڑیں بیٹا نہیں چھوڑا تو وہ اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کو ۲/۳ ملے گا۔ اور اگر صرف ایک ہی بیٹی چھوڑی تو اسے نصف مال ملے گا۔ فَوْقَ اثْنَتَيْنِ میں دو اور دو سے زیادہ سب کا حکم آگیا۔ یہی حکم آیت کے پہلے حصے سے بھی نکلتا ہے۔ اور پھر یہی حکم سورت کے آخر میں کلالہ والی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ سنت نے اس کی مزید تشریح کر دی ہے۔ تفصیل حدیث و فقہ اور فرائض کی کتابوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

اب تک آیت سے اولاد کی وراثت کی دو صورتیں معلوم ہو گئیں۔

(۱) مذکر و مونث دونوں طرح کی اولاد ہو تو مذکر کا حصہ مونث سے دگنا ہوگا۔

(۲) صرف مونث اولاد ہو تو ایک کی صورت میں اس کا ۱/۲ اور زیادہ کا حصہ ۲/۳ ہے۔

اب صرف ایک صورت باقی ہے کہ صرف نرینہ اولاد ہو، بیٹی کوئی نہ ہو۔ تو اس کا حکم یہ ہے کہ صرف بیٹا خواہ ایک ہو یا زیادہ، سارے مال کا وارث ہوگا۔

صرف مونث اولاد کی صورت میں جو کچھ ان سے بچے گا۔ وہ دوسرے وارثوں کا حق ہے (حسب قواعد شرع جن کی تفصیل فقہ میں ہے) لیکن اگر اور کوئی وارث نہ ہو تو یقیناً بھی انہی مونث کو دے دیا جائے گا۔ لیکن یہ صورت بہت کم پیش آتی ہے۔ کوئی نہ کوئی اور رشتہ دار نکل ہی آتا ہے

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ، اب ماں باپ کی میراث کی تین صورتیں بیان فرماتے ہیں۔ پہلی صورت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر میت کی اولاد ہو تو میت کے والدین کو ترکہ میں سے ہر ایک کو ۱/۶ ملے گا۔

فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ؛ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کی اولاد کچھ نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو اس کی ماں کو ۱/۳ ملے گا۔ یعنی باقی ۲/۳ اس کے باپ کو ملے گا۔

فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ ؛ تیسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں، خواہ حقیقی ہوں یا صرف باپ کی طرف سے یا صرف ماں کی طرف سے، اور میت کی اولاد بالکل موجود نہیں تو اب اس کی ماں کو ۱/۶ ملے گا۔ یعنی باقی ۵/۶ سب اس کے باپ کو ملے گا اور اگر صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ماں کو ۱/۲ اور باپ

Marfat.com

کو ۱/۴ ملے گا جیسا کہ اوپر والی دوسری صورت میں تھا۔ بھائی بہن کو کچھ نہ ملے گا۔

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؛ یعنی جس قدر وارثوں کے حصے گذر چکے یہ سب میت کی وصیت اور اس کے قرض کو جدا کر لینے کے بعد وارثوں کو دیئے جائیں گے۔ اور وارثوں کا مال وہی ہوگا جو مقدار وصیت و قرض کے نکال لینے کے بعد باقی رہے گا اور ۱/۲، ۱/۳، ۲/۳، ۱/۶، ۵/۶ وغیرہ اسی مقدار کا مراد ہے نہ کہ سارے مال کا۔ باقاعدہ تقسیم میراث یہ ہے کہ میت کا مال پہلے اس کے کفن اور دفن میں لگایا جائے جو اس سے بچے وہ اس کے قرض میں دیا جائے۔ (اگر کچھ قرض موجود ہے) پھر جو باقی رہے اس کو میت کی وصیت میں ۱/۳ تک صرف کیا جائے (اس سے زیادہ مقدار کی وصیت باطل ہے ۱/۳ میں جاری ہوگی) اس کے بعد جو باقی رہے وہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے۔ وصیت کا ذکر گو قرض سے پہلے ہے مگر سنت اور اجماع امت سے ادائیگی میں قرض وصیت پر مقدم ہے اور اس پر بے شمار دلائل شرع قائم ہیں جن کی تفصیل کتب حدیث و فقہ فرائض میں موجود ہے۔

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ ..... عَلِيْمًا حَكِيْمًا ؛ اس آیت میں دو میراث بیان فرمائیں۔ اولاد کی اور ماں باپ کی۔ اب فرماتے ہیں چونکہ یہ بات تم کو معلوم نہیں کہ کس سے تم کو نفع پہنچے گا۔ اس لئے تم کو اس میں دخل نہ دینا چاہیئے۔ جو کچھ کسی کا حق اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے اس کی پابندی کرو کہ اس کو تمام چیزوں کی خبر بھی ہے اور وہ بڑا حکمت والا بھی ہے۔

نذکر کا حصہ مونث سے دگنا رکھنے کی یہ حکمت ہے کہ مذکر پر اپنے خرچ کے علاوہ بیوی بچوں کے اخراجات کا بوجھ بھی ہوتا ہے اور عورت اگر شادی شدہ نہیں تو اس پر صرف اپنی ذمہ داری ہے اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں اس کا نان و نفقہ اس کے خاوند کے ذمہ ہوتا ہے۔ پس یہ عدل و توازن حقوق کا عین فطری تقاضا ہے جسے ملحوظ رکھ کر یہ حکم دیا گیا ہے۔

اولاد کے عموم میں کچھ اور لوگ بھی داخل ہیں۔ جن کے مختصر احکام یہ ہیں۔

(۱) کافر لیکن سنت نے واضح فرما دیا ہے کہ اختلاف دین وراثت پانے سے مانع ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔ لَا يَتَوَارَثُ اَهْلُ مِلَّتَيْنِ۔

(۲) جس نے عمداً والدین میں سے کسی کو قتل کر دیا ہو وہ سنت و اجماع امت سے خارج از وراثت ہے۔

(۳) غلام کا وراثت نہ پا سکنا بھی اجماع سے ثابت ہوا ہے کیونکہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا اگر اسے ترکہ ملے گا تو اسکا مالک آقا ہو جائے گا نہ کہ وہ، پس بالفعل گویا وارث آقا ہوگا۔

Marfat.com

(۴) حدیث صحیح: نَحْنُ مَعْشَرُ الْاَنْبِیَآءِ لَا نُوْرَثُ کے مطابق پیغمبر میراث سے مستثنیٰ ہیں ان کا ترکہ نہیں بٹتا بلکہ وہ مصالح عامہ پر خرچ ہوتا ہے۔ (یعنی اگر کوئی ترکہ ہو تو!)

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ اولاد کی موجودگی میں والدین کا حصہ مساوی ہے یہ تقسیم اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا کی شرع نے ان دونوں کا برابر احترام واجب کیا ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ والدین کا حصہ میراث میں میت کی اولاد سے کم ہے درآنحالیکہ ان کا حق اولاد سے بڑھ کر ہے۔ اس کا راز کیا ہے؟ اس کا باعث یہ ہے کہ اغلب احوال میں انہیں مال کی اسقدر حاجت نہیں ہوتی جتنی کہ اولاد کو ہوتی ہے۔ اس کا سبب یا تو ان کی بڑی عمر ہوتی ہے یا انکا مالدار ہونا یا بعض ایسے بیٹوں کا زندہ ہونا جو ان پر خرچ کرتے اور ان کی خدمت بجالاتے ہیں۔ ان کے برخلاف اولاد بالعموم چھوٹی ہوتی ہے۔ جو کسب پر قادر نہیں ہوتی اور اگر بڑی ہو تو اس پر گوناگوں ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے مثلاً اپنا نکاح، بیوی بچوں کا خرچ اور تربیت اولاد وغیرہ۔

والدین کی چار حالتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) یہ کہ میت کی اولاد بھی زندہ ہو اور والدین بھی، اس صورت میں والدین میں سے ہر ایک کا حصہ ۱/۶ ہوگا۔ باقی اولاد کا حق ہے۔

(۲) یہ کہ میت کی اولاد کوئی نہ ہو تو والدہ کا ۱/۳ ہوگا، ۲/۳ باپ کو ملے گا۔

(۳) والدین کے ساتھ میت کے بھائی بہن بھی موجود ہوں (یعنی ایک سے زیادہ) تو ماں کا حصہ ۱/۶ ہوگا اور باقی ۵/۶ باپ کا ہوگا۔ صرف ایک بھائی یا بہن کی صورت میں ماں کا ۱/۳ اور باپ کا حصہ ۲/۳ ہوگا۔ بہن بھائی کو کچھ نہ ملے گا۔

(۴) چوتھی صورت جو آیت میں بیان نہیں کی گئی یہ ہے کہ میت کے والدین بھی موجود ہوں اور بیوی یا خاوند بھی زندہ ہو۔ اس صورت میں جمہور صحابہؓ کا مذہب یہ ہے کہ خاوند اپنا نصف یا بیوی اپنا ۱/۴ لے لے گی اور باقی والدین کا ہے۔ ۱/۳ ماں کا اور ۲/۳ باپ کا۔ عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ خاوند یا بیوی اپنا حصہ یعنی نصف ۱/۲ لیں گے۔ ماں کو کل ترکے کا ۱/۳ ملے گا اور جو باقی بچے گا وہ باپ کا ہوگا۔ تفصیل مسئلہ فقہ و فرائض میں ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ میراث میں زوجیت کے حقوق والدین کے حقوق پر مقدم ہیں کیونکہ اوپر گذرا ہے کہ وہ دونوں زوجین کا حصہ نکالنے کے بعد باقی میں شریک ہوں گے اس کا راز یہ ہے کہ زوجیت کا تعلق بنوت کے تعلق سے زیادہ سخت اور زیادہ قوی ہے کیونکہ زوجین اکٹھے یوں زندگی بسر کرتے ہیں گویا کہ ان میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کو پورا کرتا

Marfat.com

ہے اور وہ دونوں یک جان و دو قالب ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا نصف ہے۔ اس لحاظ سے وہ والدین کے رشتہ سے بالکل جداگانہ نوعیت کا رشتہ رکھتے ہیں اور معیشت کے حقوق ان کے اندر زیادہ مؤکد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے خاوند کے ذمہ پہلا فریضہ جو مقرر فرمایا ہے وہ عورت کا حق ہے حتیٰ کہ اگر خاوند کے پاس صرف دو چیاتیاں ہوں تو وہ ایک خود لے گا اور دوسری بیوی کو دے گا کسی اور کو نہیں۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ : اس آیت میں اب زوجین کی میراث کو بیان فرمایا جاتا ہے کہ مرد کو اس کی بیوی کے مال میں سے نصف مال ملیگا بشرطیکہ عورت کے کچھ اولاد نہ ہو۔ اور اگر عورت کے اولاد ہے خواہ ایک ہی بیٹا یا بیٹی ہو اور خواہ اسی خاوند سے ہو یا کسی اور مرد سے تو مرد کو عورت کے ترکہ میں سے ¼ ملے گا۔ یہ تقسیم قرض کی ادائیگی اور وصیت کے پورا کرنے کے بعد ہوگی۔ اور باقی اولاد کا حق ہے حسب بیان سابق۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ : عورت کو اس کے خاوند کے مال میں سے ¼ مال ملے گا اور اگر مرد کی اولاد کچھ نہ ہو۔ اور اگر مرد کے اولاد ہے خواہ اسی عورت سے یا دوسری عورت سے تو بیوی کو ⅛ ملے گا۔ خاوند کے اس مال میں جو وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد بچے گا۔ مال کی ہر قسم میں سے نقد ہو یا جنس۔ اسلحہ ہو یا زیور، جائیداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ، حویلی ہو یا باغ۔ یہی حکم ہے۔ باقی رہا عورت کا مہر سو وہ میراث سے جدا ہے اور قرض میں داخل ہے۔ عورت کی میراث کی یہ کل دو صورتیں ہوئیں۔ جیسا کہ مرد کی میراث میں بھی یہی دو صورتیں تھیں۔ پھر بیوی ایک ہو یا زیادہ ہو۔ ان کا حصہ یہی ¼ یا ⅛ ہے جو آیت میں مذکور ہوا۔ زیادہ کی صورت میں وہ سب اس میں برابر کے شریک ہوں گے۔

ان آیات میں وصیت اور قرض کا بار بار ذکر آیا ہے جو ان کی تاکید و اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ وصیت کا ذکر قرض پر اس لئے مقدم کیا گیا ہے کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے کے حق میں ضروری نہیں۔ اور اس کی ادائیگی بھی بالعموم وارثوں پر شاق نہیں گذرتی۔ مگر وصیت کا معاملہ حسب ضرورت شرعیہ مورث پر ضروری ہے اور یہ اکثر وارثوں پر شاق بھی گذرتی ہے۔ حکم کے اعتبار سے سنت و اجماع امت سے قرض کی ادائیگی وصیت پر مقدم ہے۔ آدمی کو اپنی جائیداد

Marfat.com

کے ۱/۳ حصہ تک وصیت کا اختیار بھی دیا گیا ہے اس سے زیادہ کا نہیں اور وصیت کا قاعدہ اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ قانون وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصہ نہیں پہنچتا ان میں سے جس کو یا جن کو مورث مدد کا حقدار جانے ان کے لئے اپنی جائیداد سے حصہ مقرر کر دے۔ مثلاً اگر کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے یا کوئی بھائی بہن بھاوج بھتیجا بھانجا یا کوئی اور قرابت دار ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے تو اس کے حق میں وصیت کے ذریعہ سے حصہ مقرر کیا جا سکتا ہے اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے مستحقین کے لئے یا کسی رفاہ عامہ کے کام پر صرف کرنے کے لئے وصیت کی جا سکتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی کل ملکیت میں سے ۲/۳ یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے جس میں سے شریعت کے نامزد کردہ وارثوں کو مقررہ حصہ ملے گا اور ۱/۳ یا اس سے کچھ کم کو خود اس مورث کی سوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملہ میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کرنے کی وصیت کر دے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں ظلم کرے یعنی بالفاظ دیگر اپنے اختیار تمیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے جس سے کسی کے جائز حقوق متاثر ہوتے ہوں تو اس کے لئے یہ چارہ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضامندی سے اس کی اصلاح کر لیں یا قاضیٔ شرع سے مداخلت کی درخواست کریں اور وہ وصیت کو درست کر دے۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ : یہاں سے اخیافی بھائی بہن کی میراث کا ذکر ہے جو کہ صرف ماں میں شریک ہوں۔ سو جاننا چاہیئے کہ باپ اور بیٹے کے ہوتے تو بھائی اور بہن کو کچھ نہیں پہنچتا۔ ہاں اگر باپ اور بیٹا نہ ہوگا تو بہن اور بھائی کو میراث ملے گی۔ بھائی اور بہن تین طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) سگے جو ماں باپ دونوں میں شریک ہیں اور جن کو عینی کہتے ہیں۔

(۲) وہ سوتیلے جو صرف باپ میں شریک ہیں اور جن کو علاتی کہتے ہیں۔ اور

(۳) وہ سوتیلے جو صرف ماں میں شریک ہوں اور جن کو اخیافی کہتے ہیں۔ اس آیت میں قسم اخیر کا ذکر ہے۔ چنانچہ متعدد صحابہؓ کی قرأت میں یہاں وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ مِّنَ الْاُمِّ کا کلمہ صریح طور پر موجود ہے اور اس مسئلہ پر سب امت کا اجماع ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس میت کے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ماں باپ، بیٹا بیٹی کچھ موجود نہ ہو۔ اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن اخیافی ہو تو اسے ۱/۶ حصہ ملے گا اور مرد و عورت یعنی اخیافی بھائی

Marfat.com

بہن کا حصہ برابر ہے کمی بیشی نہیں۔ باقی رہے دو قسم کے بھائی بہن یعنی عینی اور علاتی سو ان دونوں قسموں کا حکم مثل اولاد کے ہے بشرطیکہ میت کے باپ بیٹا کچھ نہ ہو۔ مقدم عینی ہے وہ ہو تو پھر علاتی۔ اسی صورت کے اخیر میں ان دونوں کی میراث کا ذکر آئے گا۔

فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ

اگر اخیافی بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو ان سب کو ۱/۳ مال میراث میں ملے گا۔ اور پہلی صورت میں ۱/۲ اور دوسری میں ۲/۳ جو دیا جائے گا تو وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد جو باقی رہے گا۔ اس میں سے اس تناسب سے دیا جائے گا اور وصیت میراث پر مقدم ہوگی جبکہ اس سے اوروں کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ اور نقصان کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت ہو۔

(۲) یہ کہ جس وارث کو میراث میں سے حصہ ملنے والا ہے۔ اس کے کچھ وصیت بھی کی گئی ہو۔

یہ دو صورتیں درست نہیں۔ البتہ سب وارث اس کو بخوشی قبول کرلیں تو خیر ورنہ یہ وصیتیں مردود ہیں۔ وصیت کی اہمیت و اہتمام کی خاطر اسے بار بار بیان فرمایا گیا ہے اور غَيْرَ مُضَآرٍّ کی قید ہر جگہ جہاں بھی وصیت ہو معتبر ہوگی۔

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۭ : ان دو لمبی آیتوں میں جو میراثیں بیان کی گئی ہیں وہ پانچ ہیں۔

ذوی الفروض

(۱) اولاد

(۲) والدین

(۳) خاوند

(۴) بیوی

(۵) اخیافی بھائی بہن

ان پانچوں کو ذوی الفروض یعنی حصہ دار کہتے ہیں۔ ان کی میراث کے بیان کے بعد بطور تاکید فرما دیا گیا کہ یہ اللہ کا حکم ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔ اللہ کو ماننے والے اور نافرمان سب معلوم ہیں۔ اس کی سزا میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ حلیم (بردبار) بھی ہے مگر اس کا علم کامل ہے۔ کوئی نافرمان اس سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ سزا میں تاخیر سے کوئی دھوکے میں نہ رہے۔

ذوی الفروض کے علاوہ کچھ اور وارث بھی ہیں جن کو عصبہ کہتے ہیں۔ جن کے لئے کوئی حصہ مثل نصف ثلث وغیرہ کے مقرر نہیں ہے۔ بلکہ ذوی الفروض سے جو بچ رہے وہ ان کو ملے گا۔

Marfat.com

اور جب ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا مال عصبہ کا ہے۔ لیکن جب ذوی الفروض سے نہ بچے تو عصبہ کو کچھ نہیں ملتا۔ عصبہ اصل میں تو وہ ہے جو مرد ہو، عورت نہ ہو۔ اور اس کے اور میت کے درمیان عورت کا واسطہ بھی نہ ہو۔ اور اس کے چار درجے ہیں۔

۱ - اول درجہ میں بیٹا اور پوتا ہے

۲ - دوسرے درجہ میں باپ اور دادا

۳ - تیسرے درجہ میں بھائی اور بھتیجا۔ اور

۴ - چوتھے درجہ میں چچا اور چچا کا بیٹا یا اس کا پوتا۔

اگر کئی شخص ہوں تو جو میت سے قریب ہو۔ وہ مقدم ہوگا جیسے پوتے سے بیٹا، بھتیجے سے بھائی مقدم ہے۔ پھر سوتیلے سے سگا مقدم ہے اور ان چاروں کے سوا اولاد میں اور بھائیوں میں مرد کے ساتھ عورت بھی عصبہ ہوتی ہے۔ یعنی بیٹے کے ساتھ بیٹی اور بھائی کے ساتھ بہن بھی عصبہ ہوگی۔ مگر یہ (عورتیں) عصبہ اصلی نہیں بلکہ غیر اصلی ہیں۔ اور اولاد اور بھائیوں کے سوا عورت عصبہ نہ ہوگی۔ مثلاً چچا کا بیٹا عصبہ ہے مگر اس کے ساتھ ہو کر چچا زاد بہن عصبہ نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ بالا ہر دو قسم یعنی ذوی الفروض اور عصبہ کے علاوہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وارث کی تیسری قسم ذوی الارحام ہیں۔ یعنی ایسے قرابت دار کہ ان میں اور میت میں عورت کا واسطہ ہو اور وہ نہ تو عصبہ ہو نہ ذوی الفروض ہوں۔ جیسے نواسا، نانا، بھانجا، ماموں، خالہ اور پھوپھی اور ان کی اولاد جب ذوی الفروض اور عصبہ کوئی نہ ہو تو میت کی میراث ذوی الارحام کو ملے گی۔ تفصیل فقہ و فرائض میں ہے۔

وصیت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں۔ اور قرض میں ضرر رسانی یہ ہے کہ محض حقداروں کو محروم کرنے کے لئے آدمی خواہ مخواہ اپنے اوپر ایسے قرض کا اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ لیا ہو، یا کوئی اور ایسی چال چلے جس سے مقصود یہ ہو کہ حقدار میراث سے محروم ہو جائیں اس قسم کے ضرار کو گناہ کبیرہ فرمایا گیا ہے اور احادیث میں اس پر بڑی وعیدیں آئی ہیں۔ یہ ضرار اور حق تلفی ہر حال میں گناہ ہے مگر خاص طور پر کلالہ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اسکا ذکر فرمایا ہے کیونکہ جس شخص کے نہ اولاد ہو نہ والدین، وہ عموماً اپنی جائیداد کو تلف کر دینے کا رجحان رکھتا ہے اور نسبتاً دور کے رشتہ داروں کو حصہ پانے سے محروم کرنے کی خواہش رکھتا ہے

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

یہ حدیں باندھی ہوئی اللہ کی ہیں اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور اس کے رسولؐ کے

Marfat.com

يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اس کو داخل کرے گا۔ جنتوں میں جن کے نیچے جاری ہیں نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑬ وَمَنْ

وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہی ہے بڑی کامیابی اور جو کوئی

يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ

نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور نکل جائے اس کی حدود سے ڈالے گا

نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ⑭ ع ۲

اس کو آگ میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس میں اور اس کے لئے رسوا کن سزا ہے

شرح الفاظ

حُدُوْدُ اللّٰہ: اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں جو ایمان و کفر اور اطاعت و نافرمانی کا فرق واضح کرتی ہیں جن کے اندر رہنا تقاضائے ایمان ہے اور جن سے تجاوز کرنا کفر و نافرمانی کہلاتا ہے الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ حدود کی پابندی کرنے والا اور مطیع چونکہ عین مقصد تخلیق انسانی کو پورا کرتا ہے۔ لہذا وہ بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ دنیا میں صحیح رویہ اختیار کرتا اور آخرت میں سرخرو ہو جاتا ہے۔ دونوں جہان کی کامیابی ہی "فوز عظیم" ہے۔ يَعْصِ: اطاعت کے مقابلہ میں عصیان کا لفظ بطور مقابلہ دونوں کی حقیقت کو واضح کر رہا ہے۔ يَتَعَدَّ: تعدّی مصدر بمعنی تجاوز حد سے نکل جانا، فطری پابندی کو توڑ دینا تعدی کہلاتا ہے۔ خَالِدًا اگر عصیان و تعدّی بطور انکار و کفر ہو تو جہنم کی ہمیشگی واضح ہے اور اگر بطور گناہ ہو۔ دل سے انکار نہ ہو تو خلود سے مراد لمبا عرصہ رہنا ہے۔ مُّهِيْنٌ اہانت مصدر، رسوا کرنا۔ ذلیل کر دینا۔

کسی[1] چیز کی حدود سے مراد وہ اطراف ہیں جو اسے دوسری چیزوں سے جدا اور ممتاز کرتی

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۲۰۲، ۲۰۴، تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۴۲۷، ۴۲۴ فوائد القرآن صفحہ ۱۰۳ تفسیر ابن کثیر پ ۴ صفحہ ۸۹، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۲

Marfat.com

ہیں جیسے گھر کی حدود۔ شرائع و قوانین الٰہیہ کو حدود کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے ان کی پابندی کا حکم دیا ہے اور ان کے ترک سے روکا ہے پس اطاعت کا مدار یہ ہے کہ کوئی شخص ان حدود کے دائرہ کے اندر رہے اور عصیان کا مدار ان سے تجاوز پر ہے۔ تلک کا مشار الیہ وہ تمام احکام ہیں جو شروع صورت سے یہاں تک بیان ہوئے ہیں مثلاً اموال یتامیٰ کا بیان، ازواج کے احکام اور میراث کے ضوابط و قواعد۔

اللہ کی اطاعت سے مراد ان احکام و ضوابط کو ماننا اور ان پر عمل پیرا ہونا ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس پر بیان کئے ہیں۔ اطاعت رسولؐ کا معنی ہے اس دین اور ضابطے کی پابندی کرنا جو آپؐ نے خدا کی طرف سے پیش فرمایا ہے۔ پس رسولؐ کی اطاعت بعینہٖ خدا کی اطاعت ہے آگے اسی سورت میں آرہا ہے: وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ——— جس نے رسولؐ کی اطاعت کی سو اسی نے خدا کی اطاعت کی"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ ہمیں وہی حکم دیتے ہیں جو اللہ نے آپؐ کو بذریعہ وحی بتائے ہیں اور ان میں ہمارے لئے دنیا و آخرت کے فوائد و منافع ہیں۔ اللہ کی اطاعت کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے علم و عقل کی بنا پر وحی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور دین کی ہدایت کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ کسی زمانے میں بھی محض عقل کسی قوم و ملت کی ہدایت و ترقی کے لئے کافی نہ تھی اور عقل کی راہنمائی کے لئے دین کی ہدایت ہمیشہ سے لازم رہی ہے۔ ہر تمدن و تہذیب کی بنیاد رسولوں کی ہدایت کا اتباع اور ان کے طریقے کی پیروی رہا ہے۔ مادی ارتقاء معنوی و روحانی ارتقاء کا نتیجہ اور اس کے ماتحت ہے۔ اور وہ تمام آداب و فضائل جن پر تہذیبوں اور تمدنوں کی بنیاد رہی ہے وہ سب دین کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں محض علم و عقل کی پیروی کافی نہیں ہے۔

آیت ۱۳ میں جہاں اہل جنت کا بیان ہے۔ خالدین کا لفظ بصیغہ جمع آیا ہے لیکن آیت ۱۴ میں جہاں اہل نار کا ذکر ہے۔ خالداً کا لفظ بصیغہ مفرد آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل جنت مل جل کر باہم انس و محبت سے شاد کام ہوں گے مگر اہل نار میں سے ہر ایک عذاب میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرے گا اور اجتماع کی لذت و انس سے محروم ہوگا۔ حدود اللہ سے تجاوز جو خلود فی النار کا موجب ہے وہ کفر و شرک ہے جس کا لازمہ یہ ہے کہ گناہ پر اصرار ہو اور توبہ کی توفیق نہ ملے۔

گناہ کرنے والا دو حال سے خالی نہیں ہوتا۔

(۱) یہ کہ اسے گناہ پر ابھارنے والی چیز نفسانیت کا غلبہ ہو، وہ شہوت یا غضب میں اندھا ہو جائے اور امر خداوندی اس کے ذہن سے غیر حاضر ہو جائے ایسا شخص گناہ کرتا ہے۔

Marfat.com

مگر اس کا دل وعید سے غائب ہوتا ہے، وہ وعید کو یا تو بالکل یاد نہیں کرتا یا اس کی ایک دھندلی سی یاد اس کے دل میں ہوتی ہے۔ گویا غالب آجانے والے نفسانی باعث کی ظلمت کے پردے میں ایک کمزور سا نور چمکتا ہے، مگر پھر زائل ہو جاتا اور چھپ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب غفلت یا خواہش نفسانی ساکن و ساکت ہو جائے اور وہ شخص نہی کو یاد کرے اور وعید کا خیال تازہ ہو جائے تو وہ شرمندہ ہو کر تائب ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو شدید ملامت کرتا ہے۔ ایسا شخص نجات کے لائق ہے۔ کیونکہ اس میں اصرار نہیں پایا گیا اور جنت کی طرف مسارعت کرنے والوں میں داخل ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

(۲) یہ کہ آدمی گناہ کا ارتکاب جرأت و ارادہ کاملہ سے کرے، وہ اس کی حرمت کو جانتا ہو مگر اسے اطاعت پر ترجیح دے رہا ہو۔ نہی اور وعید کا یاد کرنا اسے گناہ سے باز نہ رکھے۔ یہی وہ شخص ہے جس کا گناہ اس کا احاطہ کر چکا ہوتا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت پر ترجیح دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص دراصل پیغمبرؐ کے صدق اور اس کے قوانین و ضوابط کے آگے سرفگندہ نہیں ہوتا۔ عصیان پر اصرار کرنا اور خوف و ندامت سے یکسر خالی ہو جانا ایمان کے تقاضے کے بالکل خلاف ہے۔ یہی کیفیت کفر کہلاتی ہے۔

عذاب مہین سے مراد روحانی سزا ہے، کیونکہ جہنم کی سزا دو قسم کی ہوگی۔

(۱) جسمانی سزا، جس سے سزا پانے والے کا بدن الم محسوس کرے گا۔ اور

(۲) روحانی عذاب، جو اسے اس حیثیت سے متالم کرے گا کہ اس سے اس کا انسانی شرف و اکرام متاثر ہوگا۔ اور وہ اہانت اور ذلت و رسوائی سے دکھ پائے گا۔

آیت[1] ۱۴ ایک بڑی خوفناک آیت ہے جس میں ان لوگوں کے لئے ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قانون وراثت کو تبدیل کریں۔ یا ان دوسری قانونی حدوں کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اسوقت سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔ اس قانونِ وراثت کے معاملہ میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں۔

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۳۰، ۳۳۱۔

Marfat.com

وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں کہیں عورتوں کو مستقل طور پر میراث سے بالکل محروم کر دیا گیا۔ کہیں صرف بڑے بیٹے کو میراث کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ کہیں سرے سے میراث کی تقسیم ہی کے طریقے کو چھوڑ کر مشترک خاندانی جائیداد کا طریقہ اختیار کر لیا گیا۔ کہیں عورتوں اور مردوں کا حصہ برابر کر دیا گیا اور اب ان پرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت یہ ہے کہ بعض مسلمان ریاستیں اہل مغرب کی تقلید میں "وفات ٹیکس" اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ میت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے جس کا حصہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے ہیں! حالانکہ اسلامی اصول پر اگر میت کا ترکہ کسی صورت میں حکومت کو پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مرنے والے کا کوئی قریب و بعید رشتہ دار موجود نہ ہو اور اس کا چھوڑا ہوا مال تمام اشیاء متروکہ (جن کا کوئی بھی دعوے دار نہ ہو!) کی طرح داخل بیت المال ہو جائے۔ یا پھر حکومت اس صورت میں کوئی حصہ پا سکتی ہے کہ مرنے والا اپنی وصیت میں اس کے لئے کوئی حصہ مقرر کر جائے۔ (اسلامی قانون میں اس قسم کے لاوارث شخص کی میراث کا حقدار بیت المال کو اس لئے ٹھہرایا گیا ہے کہ ہر بے دست و پا محتاج، اندھے، بیکار، آفت زدہ اور گرے پڑے شخص کے جائز اخراجات اور بنیادی ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری بھی حکومت پر ڈالی گئی ہے۔ اس بارے میں واضح اور صریح احادیث و فقہی ضوابط موجود ہیں۔ مولف)

ان دو آیات کے مضمون کا تعلق دراصل دین حق کے ایک بنیادی اصول کے ساتھ ہے۔[1] وہ اصول یہ ہے کہ اس کائنات ارضی میں الوہیت کس کی ہے؟ اور انسانوں کا رب کون ہے؟ انہی دو سوالات کے جواب پر دین کا معاملہ مبنی ہے۔ اگر الوہیت و ربوبیت کو صرف اللہ کے لئے مانا جائے اور ان میں اس کا کوئی شریک قرار نہ دیا جائے تو یہی اسلام اور یہی دین الٰہی ہے۔ اور اگر خدا کی الوہیت و ربوبیت میں کسی اور کو بھی شریک گردانا جائے تو یہی شرک اور یہی واضح کفر ہے۔ پہلی صورت میں بندوں کی اطاعت و عبودیت اور اس کے قوانین و ضوابط کا اتباع صرف خدا کے لئے ہوتا ہے۔ دین و قانون، ضابطہ و شریعت اور میزان و قیم فقط اللہ کی ہے۔ کسی اور کے لئے نہ انفراداً نہ اجتماعاً یہ حق ثابت ہے۔ اس کے برخلاف جو کچھ ہے وہ شرک و کفر اور انکار و انحراف ہے۔

کسی انسان یا جماعت یا قوم یا ریئس یا حکومت یا نام نہاد دینی پیشوا کی ایسی اطاعت جس کا مبلغ خدا اور رسولؐ کا حکم و فیصلہ نہ ہو، اسلام کے نزدیک شرک و کفر اور شدید معصیت ہے

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۶۸، ۲۷۱

Marfat.com

جب کسی اور کو حکم و فیصلہ اور ضابطہ و قانون کا اختیار دیا گیا تو دین و ایمان اور اسلام و شرع کی نفی ہو گئی۔ پوری شریعت ایک وحدت ہے۔ اگر اس کے ایک جزء کی بھی ایسی معصیت ہو جس کا اوپر ذکر کیا گیا تو گویا ساری شریعت کی نفی ہو گئی۔ زندگی کے جس معاملے میں بھی غیر اللہ کو حاکم و قانون سار مانا گیا اسی میں شرک و کفر آ داخل ہوا۔ قرآن میں بے شمار دوسری تصریحات کی مانند ان دو آیات کا مضمون بھی یہی ہے۔

جہاں تک اسلامی نظام وراثت کا تعلق ہے، وہ ایک کامل و متوازن اور فطری نظام ہے۔ جاہلیت جدید ہو یا قدیم، اس نے ایسا کامل و متوازن اور فطرتِ انسانی کے موافق نظام ساری تاریخ انسانی میں کبھی پیش نہیں کیا گیا۔

اس نظام کی خصوصیات کا موازنہ دوسرے کسی بھی نظام سے کرو۔ ثابت ہو جائے گا کہ۔

(۱) اس نظام میں خاندانی کفالت کی روح کارفرما ہے، عصبات اور ذوی الفروض کے مقرر شدہ حصے اور مختلف حالات میں ان کی کمی بیشی بالکل فطرتی ہے اور اس کی تہ میں تکافل کی روح کام کرتی ہے۔

(۲) اس نظام میں مساواتِ انسانی کی روح کارفرما ہے اور اس میں عورتوں اور بچوں کو انکا پورا فطرتی اور معاشرتی حق دے دیا گیا ہے۔

(۳) یہ نظام فطرتِ انسانی کا لحاظ رکھ کر ذریت و اولاد کو وراثت میں مقدم رکھتا ہے، کیونکہ نشوونما اور انسانی ارتقاء اور پھیلاؤ کا تقاضا یہی ہے کہ آنے والی نسل کو سب پر مقدم رکھا جائے۔ اگر دوسروں کو بھی محروم نہ کیا جائے اور ان کے حقوق بھی ادا کئے جائیں۔

(۴) یہ نظام انسانوں میں یہ رغبت پیدا کرتا ہے کہ کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے اپنے پیچھے رہنے والے وارثوں، عورتوں اور بچوں، بوڑھوں کے لئے چھوڑ جائے۔ تاکہ وہ سردار خاندان کی وفات کے بعد اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ پائیں۔ یہ نظام مورث کے دل میں جدوجہد کا شوق اور کفایت شعاری کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔

(۵) اس نظام وراثت نے ارتکاز دولت کو روکنے کا کافی انتظام کر دیا ہے ہر مرنے والے کی دولت دُور دُور نزدیک پھیل جاتی ہے اور چند ہاتھوں میں رہ کر باعث مصیبت نہیں بنتی۔ دولت کی گردش اور پھیلاؤ بھی اسلامی مقاصد معیشت میں داخل ہے۔

Marfat.com

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے

فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ

تو گواہ لاؤ ان پر چار مرد اپنے میں سے پھر اگر وہ گواہی دیں تو بند

فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اٹھالے ان کو موت یا مقرر کردے اللہ ان کے لئے کوئی راہ

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَ

اور جو دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو ان کو ایذا دو پھر اگر وہ

اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان کا خیال چھوڑ دو بیشک اللہ توبہ قبول کرنیوالا مہربان ہے

تشریح الفاظ

اَلْفَاحِشَةَ: بے حیائی اور بدکاری۔ فَاسْتَشْهِدُوْا: پس گواہ طلب کرو۔ فَاَمْسِكُوْهُنَّ سو انہیں روک رکھو۔ سَبِیْلًا "راہ۔ اس آیت میں کسی آئندہ حکم کا انتظار دلایا ہے چنانچہ اس سلسلے میں فیصلہ کن حکم سورہ نور میں اترا تو حضورؐ نے اس آیت کے حوالہ سے اسے لوگوں کے سامنے پیش فرمایا تھا۔ فَاٰذُوْهُمَا پس ان دونوں کو سزا دو۔ لیکن اس کی مقدار بعد میں سورہ نور میں اتری تھی۔ اس وقت تک معمولی مار پیٹ سے کام لیا جاتا تھا۔ اَصْلَحَا وہ اپنی اصلاح کرلیں۔ اپنا رویہ درست کر لیں اور نیک ہو جائیں۔ اب بھی جب تک شرعی شہادت نہ بہم پہنچے یہی حکم ہے۔ فَاَعْرِضُوْا پس منہ پھیر لو، درگزر کرو۔ جانے دو۔

اس سے قبل اوپر کی آیات میں عورتوں کے ساتھ احسان کا حکم، معروف کے ساتھ ان سے گذارہ کرنے کے احکام، ان کے اموال کی حفاظت کرنا اور ان کی اجازت کے بغیر ان میں سے کچھ نہ لینا وغیرہ گذر چکے ہیں۔ ان آیات میں ان کی طرف سے بدکاری و بے حیائی کی صورت کے احکام

لہ تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵

Marfat.com

بیان فرمائے گئے ہیں۔ یہ بھی فی الحقیقت ان کے ساتھ احسان ہی ہے کیونکہ دنیا میں احسان کبھی تو ثواب سے ہوتا ہے اور کبھی زجر و عقاب اور سزا سے تاکہ گنہگار اس گناہ سے باز آجائے جو اسے ہلاکت میں گرانے کا باعث بنتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کے احکام و قوانین کی بناء عدل و انصاف پر اور افراط و تفریط کو چھوڑ کر راہِ عدل و توسط اختیار کرنے پر رکھی گئی ہے۔ زنا قبیح ترین گنہگاری ہے۔ بالخصوص جب عورتوں کی طرف سے ہو تو اس کا معاملہ شدید تر ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر فریفتہ ہونے اور لوگوں کے ان کی وجہ سے بدکاری میں مبتلا ہو جانے کے خطرات زیادہ تر ہیں اور خود انہیں بھی یہ چیز مردوں کی نسبت زیادہ خطرات و مہالک میں گرا دیتی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ اس کی وجہ سے زنا کی اولاد کو وارث بنانا پڑتا ہے اور انہیں اپنے اصل آباء کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز بہت خطرناک اور معاشرے کے حق میں نقصان دہ ہوتی ہے۔

[1] عورتوں کی تادیب و سیاست ضروری امر ہے اور ان پر کس قسم کی تعدی اور ظلم بھی کیا جاتے اہل جاہلیت کے یہاں عورتوں کی بابت دونوں باتوں میں بے اعتدالیاں پائی جاتی تھیں۔ ان آیات میں تادیب کے متعلق حکم ہے کہ اگر کسی کی زوجہ کا مرتکب زنا ہونا معلوم ہو تو اس کے لئے چار گواہ مسلمانوں میں سے عاقل و بالغ اور آزاد قائم ہونے چاہئیں (یعنی مرد، کیوں کہ حدود میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں رکھی گئی۔ اور اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں) اگر چار آدمی گواہی دیں تو اس عورت کو گھر میں مقید رکھنا چاہیے۔ گھر سے باہر جانا اور کسی سے ملنا انتظاماً روک دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ عورت مر جائے یا اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی حکم اور سزا مقرر فرما دے۔ اس وقت تک زانیہ کے لئے کوئی حد (سزا) مقرر نہیں فرمائی بلکہ اس کا وعدہ کیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد سورہ نور میں اس کی حد نازل فرما دی کہ باکرہ (کنواری) کے لئے سو کوڑے اور ثیبہ (شادی شدہ) کے واسطے سنگ ساری ہے۔ یہ آیت ۱۵ کا مضمون ہے۔

آیت ۱۶ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ دو شخص، خواہ ایک مرد اور ایک عورت ہو۔ خواہ دونوں مرد ہوں۔ اگر فعل بد کریں تو ان کی سزا مجملاً ایذا دینا ہے۔ یعنی زبان سے یا ہاتھ سے بقدر مناسب ان کو تنبیہ و تادیب کرنے کا حکم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک زنا اور لواطت دونوں کا یہی حکم تھا کہ حاکم اور قاضی کے نزدیک زجر و عبرت کے لئے جتنی سزا اور شتم و ضرب مناسب ہو تو اتنی سزا دی جائے۔ اس کے بعد حسب وعدہ جب حدِ زنا نازل ہوئی تو لواطت کے لئے کوئی جدا

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۲

Marfat.com

بیان نہ فرمائی۔ لہذا اس میں علماء کا اختلاف رہا کہ لواطت کی بھی وہی حد ہے جو زنا کے لئے بیان ہوئی یا لواطت کی وہی سزا ہے جو پہلے تھی؟ یا اس کی سزا تلوار سے قتل کرنا یا کسی دوسرے طریقے سے مار ڈالنا ہے؟ اس آیت کو بہت سے علماء نے زنا پر محمول کیا ہے اور بعض نے لواطت پر، اور بعض نے اس کے حکم میں دونوں کو شامل رکھا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انہیں تا حکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیت دی جائے یعنی مار پیٹا جائے۔ سخت و سست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔

زنا کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا، بعد میں سورہ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد عورت دونوں کے لئے ایک ہی حکم دیا گیا (کہ اگر وہ بن بیاہے ہوں یا جو بھی ان میں سے ایسا ہو) انہیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اہل عرب چوں کہ اس وقت کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہتے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے، اس لئے یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی اگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی ایک قانون تعزیرات بنا کر دفعتہً ان پر نافذ کر دیا جاتا اللہ تعالیٰ نے ان کو رفتہ رفتہ تعزیری قوانین کا خوگر بنانے کے لئے پہلے زنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں۔ پھر بتدریج زنا، قذف اور سرقہ کی حدیں مقرر کی اور آخر کار اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصل قانون بنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں نافذ تھا۔

لواطت کی سزا کو اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد اور مرد کے ناجائز تعلق پر کیا سزا دی جائے جو صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی یہ نہ سمجھا کہ سورہ نساء کی اس آیت میں یہ حکم موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی زندگی کیلئے قانون و اخلاق کی شاہراہ بناتا ہے اور انہی مسائل سے بحث کرتا ہے جو شاہراہ پر پیش آتے ہیں رہی گلیاں اور پگڈنڈیاں، تو ان کی طرف توجہ کرنا اور ان پر پیش آنے والے ضمنی مسائل سے بحث کرنا شاہانہ کلام کے لیے گز موزوں نہیں تھا۔

شادی شدہ برائیوں کے لئے سنتِ صحیحہ سے رجم کا حکم ثابت شدہ ہے بلکہ بعض احادیث کی بنا پر کچھ علماء ایسے زانی کے لئے سو کوڑے اور رجم (پتھراؤ) دونوں سزائیں تجویز کرتے ہیں۔ مگر جمہور کا قول یہی ہے کہ ایسے زانی کی سزا صرف رجم ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں جن لوگوں کو

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۱، ۳۲۲ [2] تفسیر ابن کثیر پ ۴ صفحہ ۹۰

Marfat.com

رجم کیا گیا تھا (مثلاً ماعز اسلمی وغیرہ) انہیں صرف یہی ایک سزا ملی تھی نہ کہ کوڑے اور رجم دونوں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک یہ ہے کہ ان دونوں سزاؤں کو جمع کیا جائے اور ان کی دلیل مسلم کی ایک حدیث ہے۔ رہی لواطت، سو اس کے بارے میں دلائل مختلف ہیں۔ بعض اخبار و احادیث سے اس کا حکم بھی زنا جیسا ہے اور بعض سے قتل تک ثابت ہوتا ہے[1] اور مجتہدین کے اس مسئلہ میں اختلاف کا باعث بھی یہی سمجھ میں آتا ہے۔ واللہ اعلم (مولف)

[2] کنوارے زانیوں کی سزا میں بعض احادیث میں جو سو کوڑوں کے ساتھ جلا وطنی کا ذکر بھی آیا ہے، یہ بطور تعزیر ہے تاکہ بدکاری کے اسباب کم سے کم رہ جائیں اور یہ پھیلنے نہ پائے۔ زنا کی سزا نہایت شدید مقرر کی گئی ہے کیونکہ اس سے اخلاقِ عامہ کے علاوہ آئندہ نسلوں پر بھی اثر پڑتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی چوں کہ یہ انسانی جان کا معاملہ ہے۔ لہٰذا اس کی گواہی بہت کڑی رکھی گئی۔ اس فعل بد میں چوں کہ دو فریق شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کے لحاظ سے دو دو گواہ رکھے گئے جو کل چار ہو گئے۔ دو ایک آدمیوں کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن تھا مگر چار ثقہ آدمیوں کا جو ایک جماعت کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسا کرنا عادتاً خلافِ واقعہ بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ مرد کی مرد سے بدکاری کے لئے تعزیر ہے جو حاکم شرح اور قاضی کے اجتہاد پر موقوف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے مگر امام شافعیؒ کے نزدیک لواطت کی سزا زنا کی مانند ہے۔ عورت کے عورت سے ملوث ہونے کی سزا میں بھی اسی قسم کا اختلاف ہے اور یہ مسئلہ بھی اجتہادی ہے۔ بدکاری کی یہ شدید سزائیں اسلام کے خصائص میں سے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اخلاق طہارت اور پاکیزگی کو کتنی اہمیت دیتا ہے، اور شرک کی مانند ان کی جڑیں اکھاڑ دینا چاہتا ہے جن قوموں میں یہ چیزیں فیشن میں داخل ہوں اور لازمہ تہذیب و ثقافت سمجھی جائیں، ان کی بدقسمتی پر رونے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ مادیت کے غلبے اور تہذیبِ مغرب اور الحاد نے مسلمانوں کو بھی کھوکھلا کر دیا ہے اور وہ غیرت و حیاء کی ان صفات سے بہت حد تک عاری ہو رہے ہیں جو ان کی خصوصیت شمار ہوتی تھیں۔

[2] امام زہریؒ کا ارشاد ہے کہ حضورؐ کی سنت و خلفائے راشدین کے طریقے سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ حدود میں صرف مردوں کی شہادت لی جائے گی۔ عورتوں کی گواہی ان میں معتبر نہیں ہوگی۔ امام زہریؒ کے اس قول سے حدود کی گواہی کی شدت معلوم ہو گئی۔ اس میں

---

[1] تفسیر عثمانی جلد ۳ صفحہ ۱۷۵

[2] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۲۰۵، ۲۰۶۔ تفسیر المنار جلد ۴، صفحہ ۴۳۴، ۴۴۰

Marfat.com

حکمت یہ ہے کہ عورتوں کو بدکاری، جرائم اور سزا و تہذیب کے مواقع سے دور رکھا جانا ضروری ہے تاکہ وہ ہمیشہ قبیح باتوں سے بے خبر رہیں، نہ ان میں غور و فکر کریں اور نہ ان کے مرتکب ہونیوالے افراد سے خلا ملا رکھ سکیں۔

ان آیات سے یہ حکم بھی نکلا کہ صرف شرعی ضرورت و حاجت کے موقعہ پر ہی عورتیں اپنے گھروں سے نکل سکتی ہیں۔ لیکن محض وہمی اور ظنی چیزوں کی بناء پر خواہ مخواہ ان پر غلط یا بندی لگانا بھی درست نہیں ہے۔ ان آیات کا حکم موقت (ایک خاص وقت تک) تھا۔ پھر سورۂ نور کی آیتوں نے ان کی وضاحت کی اور حدیث نے اس وضاحت کو صریحاً بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورہ نور کی آیت میں رجم کا ذکر نہیں اسے سنت و حدیث نے بطور تخصیص آیت بیان کر دیا ہے (متقدمین کی اصطلاح میں اسے نسخ کہا جاتا تھا) ابتداء اسلام میں زنا کی سزا تعزیر کے طور پر تھی اور اس کی حد بندی امت کے سپرد تھی لیکن سورۂ نور نے اس کی مقدار و کیفیت کو بیان کر دیا ہے اور حدیث و سنت نے اس کی توضیح کر دی ہے۔

اسلام کے پیش نظر مسلم معاشرے کو جاہلیت کے فواحش و قبائح اور ان کے اثرات سے پاک صاف کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے خاندانی زندگی کو ان برائیوں سے پاک کیا جو جاہلیت میں رائج تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اس ظلم و عدوان کا بھی تدارک کیا جو اس زمانے میں عورتوں پر روا رکھا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے تدریجی طریقہ اختیار فرمایا اور پہلے یہ حکم دیا کہ بدکار عورتوں کو معاشرے سے الگ کر دیا جائے اور بدکار مردوں کو اذیت و تذلیل کے حربوں سے فواحش سے روکا جائے اور بعد میں حدود کی توضیح کی گئی اور حد زنا، حد قذف اور رجم وغیرہ کا نفاذ ہوا، تاکہ مسلم معاشرہ ان تاریک برائیوں سے پاک ہو جائے اور آئندہ اس کی حفاظت و نگرانی کا بندوبست ہو سکے۔ ہر حد اور ہر تعزیر میں ظلم و عدوان اور محض ظن و شبہ کی بنا پر دھر پکڑنے سے منع فرما دیا گیا۔ اور ایسا نصاب شہادت رکھا گیا جس سے ظلم کا مداوا ہو سکے۔

زنا کی حرمت کو مکی سورتوں میں سے الاسراء، المومنون اور المعارج میں صراحۃً بیان فرما دیا گیا تھا۔ لیکن اس فاحشہ کو جڑ سے نکال دینے کے لئے قانون سازی اس وقت تک ممکن نہ تھی۔ جب تک اسلام کے پاس ایک ریاست و حکومت نہ ہوتی۔ چنانچہ مدینہ میں جب یہ ریاست وجود میں آگئی تو فطری ترتیب کے مطابق اس سلسلے میں حدود نازل کی گئیں۔ اسلام ایک عملی و واقعی دین ہے اسے معلوم تھا کہ برائی کے خاتمہ کے لئے فقط نواہی اور توجیہات کافی نہیں بلکہ قوانین و ضوابط کی بھی

لہ فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۷۲، ۲۷۷

Marfat.com

شدید ضرورت ہے۔ اس فطری تدریج سے جہاں ایک طرف اسلام کا فطرتی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کے احکام و اوامر اور نواہی کے لئے حکومت و دولت اور سلطنت و قانون کی بھی کتنی ضرورت ہے۔ جب دین حق عملی زندگی کا ضابطہ ہے تو ضوابط و قوانین اور اقتدار و تسلط کے بغیر اس کا نفاذ کیوں کر ممکن ہے؟۔

[1] زنا کی سزا میں اوّل تو نصاب شہادت دگنا ہے۔ یعنی جہاں مسلمان مرد یا عورت کی عزت کا سوال ہے وہاں گواہوں کی تعداد دو کے بجائے چار ہونا چاہیئے، اور پھر یہ چاروں:

(۱) مسلم ہوں، غیر مسلم نہ ہوں۔

(۲) آزاد ہوں، غلام نہ ہوں۔

(۳) عاقل ہوں، فاتر العقل نہ ہوں۔

(۴) بالغ ہوں، نابالغ نہ ہوں۔

(۵) گواہی چشم دید دیں، سماعی یا قیاسی شہادت کا یہاں دخل نہیں۔

بہت سی قومیں اپنے کو مہذب کہلانے والی آج بھی موجود ہیں جن کے ہاں حرامکاری جب تک کہ جبراً نہ ہو! سرے سے قابل تعزیر ہی نہیں۔ بہت سی قوموں میں حرام کاری صرف شادی کے بعد ہے۔ بن بیاہوں یا بن بیاہیوں کے لئے یہ کوئی جرم ہی نہیں۔ قرآن ان سارے غلط اور گمراہ کن نظریات کی تردید کرتا ہے کوئی بھی جوڑا اس کا مرتکب ہو۔ وہ قابل سزا ہے۔

جن جرائم کی حد شرعی مقرر ہے۔ ان میں اجرائے حد سے قبل توبہ کافی نہیں۔ جب مجرم سزا بھی بھگت چکا اور اب تائب بھی ہے تو اس پر مزید لعن طعن اور ملامت وغیرہ جائز نہیں ہے۔ اجرائے حد سے قبل توبہ کافی نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی شخص کے خلاف کوئی حد شرعی شہادت سے ثابت ہو جائے تو یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتا کہ میں نے سچی توبہ کر لی ہے لیکن جس کے خلاف شرعی شہادت بہم نہ پہنچے تو اس کا معاملہ یقیناً عالم الغیب ہی کے سپرد ہے چاہے تو اس کی سچی توبہ سے معاف کر دے، ورنہ سزا دے کر معاف فرمائے۔ واللہ اعلم۔

لیکن یہ حکم ان معاملات کا ہے جن کا تعلق حقوق العباد سے نہ ہو۔ جہاں حقوق العباد متلف ہوئے ہوں وہاں بندوں سے معافی مانگنا یا ان کے حقوق ادا کر کے انہیں راضی کرنا بھی ضروری ہے۔ عام دلائل شرعیہ سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ مؤلف)

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۳

Marfat.com

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ

بے شک توبہ قبول کرنا اللہ کو ضرور تو ان کا ہے جو کرتے ہیں برا کام

بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ

نادانی سے پھر توبہ کرتے ہیں جلدی سے سوان کو

يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

اللہ معاف کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ

اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کئے جاتے ہیں برے کام

حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ

یہاں تک کہ جب سامنے آجائے ان میں سے کسی کے موت تو کہنے لگا میں

تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ

توبہ کرتا ہوں اب اور نہ ایسوں کی توبہ جو کہ مرتے ہیں حالت

كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

کفر میں۔ ان کے لئے تو ہم نے تیار کیا ہے عذاب دردناک

شرح الفاظ

التَّوبۃ: اس لفظ کا معنی ہے رجوع کرنا، لوٹنا، باز آجانا۔ اور شرعی معنی میں کچھ شرائط معتبر ہیں جو ان آیات میں اور کتاب وسنت کے دوسرے مقامات پر بیان فرمائے گئے ہیں۔ السّوء برائی، احکام دین کی نافرمانی مِن قَرِیب: یعنی علاماتِ موت کے ظہور سے پیشتر، غرغرہ سے پہلے

Marfat.com

پہلے اَعْتَدْنَا ہم نے تیار کیا، ہم نے مقرر کر دیا ہے۔

آیت ۱۶ میں اللہ تعالیٰ کے تواب و رحیم ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ زیر تفسیر آیات میں توبہ کا وقت، اس کی شرط قبولیت اور اس کی تعجیل کا ذکر بیان فرمایا گیا ہے۔ مبادا موت آجائے اور گنہگار نافرمانی پر مصر ہو تو اس وقت توبہ کا کوئی نفع نہ ہوگا۔ یہ آیتیں گذشتہ آیات کے لفظ اصلاح فی العمل کی شرح کرتی ہے۔

[1] آیت ۱۷، یعنی توبہ تو بے شک ایسی چیز ہے کہ زنا اور لواطت جیسے سنگین جرم بھی اس سے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔ جیسا کہ آیت سابقہ سے معلوم ہوا۔ لیکن اس کا بھی لحاظ ضرور رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے فضل سے توبہ کا ذمہ لے لیا ہے وہ اصل میں ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو ناواقفیت اور نادانی سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر لیتے ہیں۔ مگر جب اپنی خرابی پر متنبہ اور مطلع ہوتے ہیں تو جبھی نادم ہوتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں۔ سو ایسوں کی خطائیں اللہ ضرور معاف فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے کہ کس نے نادانی سے گناہ کیا۔ اور کس نے اخلاص سے توبہ کی۔ اور وہ حکمت والا ہے۔ جس کی توبہ کا قبول کرنا موافق حکمت ہوتا ہے۔ اس سے قبول فرما لیتا ہے۔

جہالت اور قریب ان دونوں قیدوں سے معلوم ہو گیا کہ جو شخص گناہ کرے نادانی سے اور تنبیہ کے بعد جلدی سے توبہ کرے تو بقاعدہ عدل و حکمت اس کی توبہ مقبول ہونا ضروری ہے اور جس نے جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ اللہ کی نافرمانی پر جرأت کی یا اطلاع کے بعد اس نے توبہ میں تاخیر کی اور پہلی ہی حالت پر قائم رہا تو بقاعدہ عدل و انصاف اس کی خطا اصل میں معافی کے قابل نہیں اس کا قبول کر لینا محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ وہ اپنے فضل سے ان دونوں کی توبہ کو بھی قبول فرما لیتا ہے۔ یہ اس کا فضل و احسان ہے۔ مگر ذمہ داری صرف پہلی صورت میں ہے۔ باقی میں نہیں۔

آیت ۱۸: یعنی ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برابر گناہ کیے جاتے ہیں اور باز نہیں آتے۔ یہاں تک کہ جب موت ہی نظر آگئی تو اس وقت کہنے لگے کہ اب ہم توبہ کرتے ہیں۔ اور نہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے جو کفر پر مر جائیں اور اس کے بعد عذابِ اُخروی کو دیکھ کر کہنے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۳، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۴ (خلاصہ) تفسیر حقانی (مفہوم) جلد ۲ صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶، تفسیر ابن کثیر پ ۴ صفحہ ۹۱ (خلاصہ) تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۲۳، ۳۲۴ (خلاصہ)

Marfat.com

لگیں کہ اب ہم توبہ کرتے ہیں۔ [illegible]

جاننا چاہیئے کہ یہ دونوں آیتیں جو دربارہ قبول و عدم قبول توبہ یہاں وارد ہیں۔ ہم نے ان کا جو مطلب بیان کیا ہے۔ یہ بعض اکابر محققین کی تحقیق کے موافق ہے اور اس میں یہ خوبی ہے کہ قید جہالت اور لفظ قریب دونوں اپنے ظاہری معنوں پر قائم رہے اور علی اللہ کے معنی بھی سہولت سے بن گئے اور اس موقعہ پر قبول و عدم قبول توبہ کے ذکر فرمانے سے جو مقصد ہے کہ توبہ یونہی بہر صورت قبول نہیں ہوتی بلکہ اس کی چند صورتیں ہیں اور ان کی مقبولیت میں باہم فرق ہے۔ تاکہ کوئی توبہ کے اعتماد پر گناہوں پر دلیر نہ ہو جائے۔ یہ مقصد بھی اسی تفسیر سے بخوبی حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر بالعموم مفسرین حضرات نے جو ان آیتوں کا مطلب ارشاد فرمایا ہے تو قید جہالت کو احترازی اور شرطی نہیں لیتے بلکہ قید واقعی لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ گناہ ہمیشہ جہل اور حماقت سے ہی سرزد ہوتا ہے اور قریب کا معنی یہ لیتے ہیں کہ حضور موت سے پہلے جس قدر وقت ہے وہ قریب ہی ہے کیونکہ دنیا کی زندگی قلیل ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا توبہ قبول فرمانے کا وعدہ ان سے ہے جو کہ سفاہت اور عدم انجام بینی سے گناہ کر لیتے ہیں۔ اور پھر موت کے آنے سے پہلے تائب ہو جاتے ہیں اور جو لوگ موت کا مشاہدہ کر چکے اور نزع کی حالت کو پہنچ چکے یا جو لوگ کہ کفر پر مر چکے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ اس تقریر کے موافق توبہ کرنے والوں کی وہ دو صورتیں بین بین جو تقریر اوّل میں مذکور ہوئیں شق اول یعنی توبہ قبول ہونے کے اندر شمار ہوں گی جب موت کا یقین ہو چکے اور دوسرا عالم نظر آنے لگے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں اور عالم آخرت کو دیکھنے سے پہلے کی توبہ البتہ قبول ہوتی ہے۔ اتنا فرق ہے کہ حسب تقریر اول پہلی صورت میں تو توبہ کا قبول ہو جانا قاعدہ عدل و حکمت کے موافق ہوتا ہے اور دوسری صورتوں میں قبول توبہ محض فضل خداوندی سے ہوتا ہے۔

اسلام کا خدا محدود مفید قسم کا خدا نہیں کہ مغفرت ذنوب پر قادر ہی نہ ہو۔ بلکہ کائنات میں گویا مشین کی طرح ایک قانون مکافات عمل کی حکومت ہے اور خدا نعوذ باللہ بیٹھا ہوا منہ دیکھ رہا ہے یا اگر مغفرت پر قادر ہے تو جب بھی کفارہ کا محتاج ہے۔ ہندومت اور مسیحیت وغیرہ تمام باطل ادیان کی تردید آیت سے ہو گئی۔

اہل حق کے نزدیک اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں وہ فاعل و مختار ہے۔ مگر اس نے بر تقاضائے عدل و حکمت اور فضل و کرم سے پختہ وعدہ کر رکھا ہے کہ سچے تائبوں کی توبہ ضرور ہی قبول ہوگی علی اللہ کا یہی معنی ہے۔

توبہ کے معنی پلٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنی رکھتا

Marfat.com

ہے کہ ایک غلام جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا۔ اب اپنے کئے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرمانبرداری کی طرف پلٹ آیا ہے اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنیٰ رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظرِ عنایت جو پھر گئی تھی وہ از سرِ نو اس کی طرف منعطف ہو گئی۔

علمائے حق نے توبہ کرنے والوں کے کئی طبقے بیان کئے ہیں:[1]

(۱) وہ لوگ جو سلیم الفطرت ہیں اور ان میں نیکی کی استعداد قوی و عظیم ہے۔ ایسے لوگ جب کسی برائی میں گرفتار ہو جائیں تو بہت جلد عبرت و موعظت کی راہ پر پلٹ آتے ہیں، اظہارِ ندامت کرتے ہیں اور آئندہ کو فضائل پر عمل کرتے اور رذائل سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ اعلیٰ درجے کے تواب ہیں۔

(۲) وہ جو لوگ جن میں خواہشاتِ نفس کا داعیہ بہت قوی اور راسخ ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ اپنے نفسیاتی دواعی کا اتباع کرنے لگتے ہیں، معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں تو نیک جذبات اور صحیح خواطر ان سے لڑتے رہتے ہیں۔ نفس لوامہ ان کے نفس امارہ پر غالب آجاتا ہے نیکی برائی پر غلبہ پالیتی ہے اور اسے مقہور و مفتوح کر لیتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کے بعد وہ گناہوں کے ارتکاب سے باز آجاتے ہیں اور ان کے نفوس مطمئن ہو جاتے ہیں۔

(۳) وہ جو مجاہدہ و ریاضت سے کبائر و فواحش کے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔ ان سے صغائر و آثام (چھوٹے گناہ) سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ان کے قلوب و نفوس میں ہر وقت ایک جنگ برپا رہتی ہے پاکیزہ خیالات اور خواطرِ الٰہیہ جو ایمان کا لشکر ہیں۔ ان میں اور صغائر کے ارتکاب میں برابر لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ یہ لوگ کبائر سے مجتنب ہیں اور صغائر کی معافی کے امیدوار و حقدار ہیں۔

(۴) وہ جو گناہ کا ارتکاب کر گزرتے ہیں اور پھر تائب ہو جاتے ہیں پھر نفس و شیطان کے غلبے سے برائی کا ارتکاب کرتے ہیں اور پھر ندامت و استغفار اور توبہ سے پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں۔ یہی سلسلہ ان میں قائم و جاری رہتا ہے مگر وہ توبہ ضرور کر لیتے ہیں۔ توابین کا یہ ادنیٰ طبقہ ہے۔ یہ لوگ فانی کو باقی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن چونکہ دل میں نیکی موجود ہے اور اندرونی زجر و توبیخ سے ہر وقت گناہوں سے پلٹتے اور تائب رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کی مغفرت کی بھی امید ہے۔ اگر نیکی کا لشکر بدی پر غالب آگیا تو ان کی توبہ صحیح اور کامل

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۲۰۸، ۲۱۱، تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۴۴۰، ۴۵۲

Marfat.com

ہو جاتی ہے ورنہ خیر و شر کے لشکروں میں کشمکش جاری رہتی ہے اور اگر خدانخواستہ برائی کا لشکر غلبہ پالے تو وہ شر پر اصرار کر کے ہلاکت میں گر جاتے ہیں۔

صحیح توبہ جب بھی ہو خدا کے ہاں مقبول ہے جب تک عالم آخرت کا مشاہدہ نہ ہو جائے اور "غرغرہ" کی حالت طاری نہ ہو جائے۔ ہاں فوری توبہ اور اتفاقی گناہ پر ندامت و استغفار سے قبول توبہ کا پختہ وعدہ ہے اور اصرار سے ہلاکت کا خطرہ قوی ہے۔ ہاں اگر اس کے بعد بھی توبہ صحیح ہو جائے تو خدا کے فضل و کرم سے بخشش کی امید قوی ہے۔ کفر پر موت سے بخشش کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور اسی طرح ایمان کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب پر اصرار ہو اور موت سے قبل توبہ نہ ہو تو عذاب و سزا یقینی ہے۔ یوں اگر اللہ معاف کر دے تو اسے کون روک سکتا ہے؟ لیکن ہوتا اکثر یہی ہے کہ اصرار و تمادی سے توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔

مومن جب بھی خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ جاہل ہو کر ہی کرتا ہے۔ حماقت و جہالت اس پر غلبہ شہوت یا غضب کی تیزی کے باعث غلبہ پالیتی ہے۔ اس کا فعل جہالت کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کا قول نقل فرمایا ہے: وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا کہ: فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ اس کا راز یہ ہے کہ نافرمانی کرنے والا اگر ثواب و عذاب کے علم کو صحیح طور پر استعمال کرے تو معصیت پر اقدام نہیں کر سکتا۔ گویا وہ بوقت ارتکاب خدا کی و عبد کی حقیقت سے جاہل و بے خبر ہی ہوتا ہے۔ اس کے دل میں عفو و مغفرت کا احتمال ہوتا ہے یا وہ شفاعت کے غلط مفہوم پر تکیہ کر کے گناہ پر جری ہوتا ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر قریب سے مراد وہ زمانہ ہے جب کہ گنہگار کی شہوت کا جوش یا غضب کی تیزی ساکن ہو جاتی ہے وہ اپنے علم و عقل کی طرف لوٹ آتا ہے اور دین کے تقاضے کی طرف رجوع کرتا ہے جو شخص قوی الایمان ہو وہ گناہ کا ارتکاب کسی فوری خواہش یا فوری غضب کی وجہ سے ہی کرتا ہے پھر اس برائی سے باز آجاتا اور سچی توبہ کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے السوء کا لفظ بصیغہ واحد استعمال فرمایا ہے اس کے برخلاف جن کی توبہ قبول نہیں اس کے لئے السیئات کا لفظ بصیغہ جمع لایا گیا ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ توبہ انہی کی قبول ہوتی ہے جو کبھی گناہ کر بیٹھیں تو اس پر اصرار نہیں کرتے بلکہ جلدی توبہ کر لیتے ہیں اس لئے گناہ کی ظلمت ان کے دلوں پر نہیں چھا جاتی۔ نہ گناہ ان پر محیط ہوتا ہے۔

توبہ وہی مقبول ہے جو نصوح (خالص اور بے لاگ) ہو۔ صرف زبان کی کچھ حرکات و اذکار

Marfat.com

اور صدقات و کفرات ہی کافی نہیں جب کہ ان کے ساتھ گناہوں پر اصرار بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے توبہ اور اصلاح عمل دونوں کو جمع فرمادیا ہے۔

پچھلی امتوں کی ہلاکت کا باعث یہی ہوا تھا کہ انہوں نے شرعی تکالیف کو بوجھل جانا، احکام خداوندی سے فسق اختیار کرلیا۔ ہوائے نفس کی پیروی کی اور دین کو محض جنتر منتر اور زبان و بدن کی چند کھوکھلی حرکات تک محدود رکھا۔ ان سے نہ تو ان کے اخلاق مہذب ہوئے۔ نہ اعمال کی اصلاح ہوئی اور نہ ان کے نفوس اتباع شہوات سے باز آئے بہت سے مسلمانوں نے بھی انہی کی پیروی کو شعار بنا رکھا ہے اور قدم بہ قدم انہی کی پیروی کر رہے ہیں۔

گناہوں پر اصرار کرنے سے توبہ کی توفیق نہ ملنے کا خطرہ قوی ہو جاتا ہے۔ آدمی گناہوں میں اندھا دھند منہمک ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ موت آجاتی ہے اور توبہ کی مہلت ختم ہو جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ نفوس پر برائی کی ظلمت کا احاطہ ہو چکتا ہے اور نیکی کے صدور کا موقع محل باقی نہیں رہتا۔ ہاں! اگر کسی کو موت سے پہلے صحیح توبہ کی توفیق مل جائے اور اس کا حال ایسا ہو جائے کہ اگر زندگی ملتی تو ضرور اپنی اصلاح کرلیتا اور بدی کی طرف نہ لوٹتا تو ایسے شخص کی توبہ کی قبولیت رحمت و فضل الٰہی سے ہو جاتی ہے مگر اصرار سے اس کا موقع کم ہی ملتا ہے۔

اصولی طور پر[1] توبہ کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔

(۱) توبۂ ندامت، جو دل کی گہرائی سے ہو اور آئندہ کی اصلاح کا پختہ ارادہ اس میں شامل ہو۔

(۲) توبۂ اضطرار، جو علامات موت کے طاری ہونے پر کی جائے۔ یہ اس وقت ہوتی ہے جبکہ گناہ کے ارتکاب کا موقع ہی نہیں رہتا۔

پہلی توبہ قبول ہے، اور دوسری مردود۔ تمام دلائل شرع کا یہی خلاصہ ہے۔

دین حق نے گناہ کی سزا و عقوبت کو نہایت شدت سے پیش کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ توبہ کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے۔ اس سے خدائی دین کا توازن و اعتدال ثابت ہوتا ہے اور جبلت انسانی میں اس کے احکام کے وہ اثرات مرتب ہوتے ہیں جو کسی اور دین و مذہب سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۸۰، ۲۸۱

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ

اے ایمان والو حلال نہیں تم کو کہ

تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ

میراث میں لے لو عورتوں کو زبردستی اور نہ روکے رکھو ان کو اس

لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ

واسطے کہ لے لو ان سے کچھ دیا ہوا مگر یہ کہ کریں

بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ

وہ بے حیائی کھلی اور گزران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا

پھر اگر وہ تم کو نہ بھائیں تو شاید کہ تم کو پسند نہ آئے

شَيْـــًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝۱۹ وَاِنْ

ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبی اور اگر

اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ

بدلنا چاہو ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا

اور دے چکے ہو ایک کو بہت سا مال تو مت پھیر لو

مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۲۰

اس میں سے کچھ۔ کیا لینا چاہتے ہو اس کو ناحق اور صریح گناہ سے

Marfat.com

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى

اور کیونکر اس کو لے سکتے ہو اور پہنچ چکا ہے

بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ

تم میں کا ایک دوسرے تک اور لے چکیں وہ

مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

عورتیں تم سے عہد پختہ

شرح الفاظ

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ: عضل کا معنیٰ ہے تنگ کرنا اور سختی کرنا، یہیں سے اَلدَّاءُ الْعُضَال کا لفظ نکلا ہے جس کا معنیٰ ہے لاعلاج بیماری۔ فَاحِشَةٌ وہ بُرا فعل جس کی قباحت شدید ہے مُبَيِّنَةٍ یعنی ظاہر اور واضح عَاشِرُوْهُنَّ ان سے گذر بسر کرو، معاشرت مصدر ہے۔ بالمعروف معروف وہ چیز ہے جس سے طبائع مالوف و مانوس ہوں اور شرع اور عرف و مروءۃ اسے برا نہ جانے بُهْتَانًا ایسا جھوٹ جو اس شخص کو مبہوت کر دے۔ اور حیرانی سے خاموش کر دے جس پر باندھا گیا ہو۔ اِثْمًا: حرام۔ اَفْضٰى اِفضاء سے مراد یہاں زوجین کے خاص تعلقات ہیں جن سے وہ ایک دوسرے کے ستر پر مطلع ہو جاتے ہیں اور گویا شے واحد بن جاتے ہیں۔ مِيْثَاقًا غَلِيْظًا وہ عہد جو زوجین کو نہایت قوی رابطے میں منسلک کر دیتا ہے۔

اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یتامیٰ سے سلوک کرنے اور ان کے اموال کے معاملے میں جاہلیت کی عادتوں سے منع فرمایا ہے۔ اب زیر تفسیر آیات میں عورتوں کے ساتھ معاملہ کرنے اور ان کے مالوں کے بارے میں اہل جاہلیت کی رسوم و عادات سے منع فرمایا ہے۔ اہل جاہلیت عورتوں کو حقیر جانتے تھے اور انہیں بے جان گھریلو ساز و سامان کی مانند سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ مرنے والے کے رشتہ دار جس طرح اس کی جائیداد کے وارث ہوتے تھے اسی طرح اس کی ازواج کو میراث میں بانٹ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس عمل و فعل کو حرام ٹھہرایا ہے۔ امام بخاریؒ اور ابوداؤدؒ نے اپنی کتاب میں یہ روایت درج کی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص مر جاتا تھا تو اس کے وارث اس کی بیوی کے بھی مستحق ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی اسے رکھنا چاہتا تو اس سے نکاح کر

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۱۲

Marfat.com

لیتا تھا۔ ورنہ اس کا کہیں نکاح کروا دیتے تھے۔ لیکن اگر ایسا نہ کرنا چاہتے تو نکاح نہ کرواتے تھے۔ گویا عورت کے قرابت داروں سے بھی ان کا حق فائق ہوتا تھا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور ابن المنذر نے عکرمہؓ سے روایت کی ہے کہ ان آیات کا شان نزول یہ واقعہ ہے۔ قبیلہ اوس میں سے معنؓ بن عاصمؓ انصاری کی بیٹی کبیشہؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر حاضر ہوئی۔ اس کا خاوند ابوقیس بن الاسلت فوت ہو گیا تھا اور مرحوم خاوند کا بیٹا اپنے باپ کی بیوہ کو حسب رواج جاہلیت تنگ کرتا تھا۔ کبیشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گذارش کی کہ یا رسول اللہ نہ تو میں اپنے خاوند کی وارث ہو سکی۔ اور نہ مجھے اس امر کی اجازت دی گئی کہ از خود نکاح ہی کر لوں۔ پس اس بات پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

[1] آیت ۱۹: اہل جاہلیت طرح طرح سے عورتوں پر ظلم و تعدی کیا کرتے تھے۔ ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی عورت کو میت کا سوتیلا بیٹا یا بھائی یا کوئی وارث لے لیتا۔ پھر چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا یا بغیر نکاح ہی اپنے گھر میں رکھتا یا کسی دوسرے سے نکاح کر کے اس کا کل مہر یا بعض لے لیتا یا ساری عمر اس کو اپنی قید میں رکھتا اور اس کے مال کا وارث بنتا۔ اس کی بابت یہ آیت اتری جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی مر جائے تو اس کی بیوہ اپنے نکاح کی خود مختار ہے۔ میت کے بھائی یا کسی اور وارث کو یہ اختیار نہیں کہ زبردستی اسے اپنے نکاح میں لے لے۔ نہ وارث عورت کو نکاح سے روک سکتے ہیں کہ وہ مجبور ہو کر خاوند کے ورثہ سے جو کچھ اس کو ملا تھا اسے پھیر دے یا اس کا کچھ حصہ واپس کر دے۔ ہاں اگر صریح بدچلنی کریں تو ان کو البتہ روکنا چاہیئے۔ عورتوں کے ساتھ گفتگو اور معاملات میں اخلاق اور سلوک سے معاملہ رکھو۔ جاہلیت میں جیسا ذلت اور سختی کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اس کو چھوڑ دو۔ پھر اگر تم کو کسی عورت کی کوئی خو اور عادت خوش نہ آئے۔ تو صبر کرو، شاید اس میں کوئی خوبی بھی ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی دینی یا دنیوی بڑی منفعت رکھ دے۔ سو تم کو تحمل کرنا چاہیئے اور بدخو کے ساتھ بدخوئی نہ کرنی چاہیئے۔

عورتوں کے زبردستی وارث بن جانے کے بارے میں عرب جاہلیت جیسا کہ دستور یونانی تمدن اور رومی تمدن میں بھی رہ چکا ہے۔ مرد یا تو اپنے مورث کی بیوی سے خود نکاح کر لیتا تھا یا اسے دوسروں کے نکاح میں دے دیتا تھا۔ عرب جاہلیت میں عورتوں کے مال پر

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۴، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۴، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۷۶، تفسیر ابن کثیر پ ۴ صفحہ ۹۲، ۹۳، تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۴۵۲، ۴۶۳۔

Marfat.com

ناجائز قبضہ کی بھی تین صورتیں رائج تھیں ایک یہ کہ عورت کا جو حق میراث میں نکل رہا ہوتا۔ اسے خود لے لیتے اور عورت کو نہ دیتے۔ اسلام نے اس سے روک دیا۔ دوسرے یہ کہ اسے نکاح نہ کرنے دیا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ مر جاتی اور اس کے مال پر قبضہ کر لیا جاتا۔ تیسرے یہ کہ خاوند اپنی بیوی کو بلاوجہ کچھ مال دینے پر مجبور کر دیتا اور کہتا کہ جب تک ایسا نہ کرو گی تمہیں نہ چھوڑا جائیگا دنیا بداخلاقی اور بدعملی کی کتنی مختلف صورتوں میں مبتلا تھی اور اسلام نے آکر کن کن چیزوں کی اصلاح کی ہے۔

ایک دستور جاہلیت میں یہ بھی تھا کہ مال دار بیوہ کو وارث اس خیال سے کہیں نکاح نہ کرنے دیتے کہ یہ اپنا مال ساتھ لے جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ مجبور و محبوس بیوہ اس کے گھر میں اپنی جان دے دیتی یا پھر اسے مال و متاع حوالہ کر کے اپنی جان چھڑاتی۔ پس بیوہ کو مجبوراً نکاح نہ کرنے دینا تاکہ اس سے کچھ مال وصول کیا جائے۔ یا خاوند کا بیوی کو کچھ مال دینے پر مجبور کرنا، یا طلاق کے بعد بھی عورت کو کچھ مال لئے بغیر نہ چھوڑنا۔ یہ سب صورتیں حرام ہو گئیں۔ ہاں اگر عورت بدکاری کرے یا شوہر کی شرمانا فرمان ہو تو اسے روکنا جائز ہے۔

جزئیات بیان کرنے کرنے قرآن نے حسب عادت یہاں ایک اصولی مسئلہ بیان کر دیا ہے اور وہ ہے عورتوں کے ساتھ "حسن معاشرت" کا مسئلہ۔ یہ حسن معاشرت کا مرکزی، بنیادی اور کلیدی حکم سہاگنوں، بیواؤں اور طلاقوں سب کے معاملہ میں واجب العمل ہے۔ یہ ہدایت اس مذہب کی ہے جو کتنے ہی کور چشم مسیحیوں، آریوں وغیرہ کے نزدیک عورت کے حق میں ظالمانہ ہے! کَرِهْتُمُوهُنَّ میں وہ کراہت مراد ہے جو طبعی طور پر یا خواہ مخواہ ہو نہ کہ کوئی ایسا قابل شکایت امر جس کے اندر عورت کا ارادی قصور شامل ہو۔ مرد کے لئے یہ خیال کر ہو سکتا ہے کہ اس عورت کے اندر کوئی خیر ہو، بہت تسکین و تسلی کا حامل ہے جس سے اس کی شکایت رفع ہو سکتی ہے ہر قسم کا دینوی و اخروی، آجل و عاجل خیر اس میں داخل ہے۔ اور فقط خیر نہیں بلکہ خیراً کثیراً کا لفظ ہے جو بہت بھلائی کو ثابت کرتا ہے۔

[1] اگر عورت خوبصورت نہ ہو یا اس میں کوئی اور ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔ حتی الامکان اسے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوبصورت نہیں ہوتی مگر اس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو ازدواجی زندگی میں حسن صورت سے

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۳۴، ۳۳۵۔

Marfat.com

زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر اسے اپنی ان خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداء محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس کے حسن سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ازدواجی زندگی کی ابتداء میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات وصفات کو بروئے کار آنے کا موقعہ دے تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی برائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی ازدواجی تعلق کو قطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔ طلاق بالکل آخری چارہ کار ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیئے۔

[1] عربی جاہلیت بھی اپنے اردگرد کی تمام جاہلیتوں کی مانند عورتوں سے بہت برا سلوک روا رکھتی تھی۔ وہ اس کے انسانی حقوق کو پہچاننے سے انکار کرتی تھی، اسے مرد سے بہرنوع گھٹیا قرار دیتی تھی اور اس کے ساتھ انسانی سلوک نہیں بلکہ عام مال ومتاع جیسا سلوک روا رکھتی تھی۔ یہ سب ان کے ہاں اس حال میں ہوتا تھا کہ وہ عورت سے حیوانی خواہشات بھی پوری کرتے تھے اور پھر اسے نفوس کے لئے فتنہ اور طبائع کے لئے ہیجان کا سبب بنا کر چھوڑ دیتے تھے۔ گویا ان کے ہاں عورت محض ایک کھلونا تھی جس سے کچھ دیر دل بہلا کر اسے پرے پھینک دینے میں کوئی عار اور کوئی حرج محسوس نہ کیا جاتا تھا۔ اسلام نے آکر عورت سے یہ تمام ظلم و تعدی رفع کی اور اسے خاندان میں اسکا فطری متوازن مقام عطا کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ مرد و عورت کو ایک ہی جنس سے پیدا کیا گیا ہے۔ دونوں کی اصل ایک ہے۔ دونوں کا خالق و مالک ایک ہے۔ عورت کی تخلیق میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ اسلام نے ازدواجی رشتے کو محترم و مقدس قرار دیا۔ عورت کو جانور کے مقام سے اٹھا کر قابل حرمت مقام پر بٹھایا۔ اسے انسانی عزت و احترام، محبت و مودت اور عطف و جمال کا مستحق قرار دیا۔ اس کے ساتھ خاندانی و معاشرتی روابط کو وابستہ کیا اور ایسے معاشرتی احکام پیش کئے کہ رشتۂ زوجیت پہلے ہی صدمہ سے ٹوٹ پھوٹ کر نہ رہ جائے بلکہ ایک دائمی اور مضبوط رشتہ بنے۔ اسلام نے عورت پر جبر و تشدد اور ظلم و جفا کے تمام رواجوں کو یکسر باطل کر دیا اور معاشرے میں اس کا اصلی اور فطری مقام پیدا کیا۔ جاہلیت کی وہ تمام رسمیں جن سے عورت کی عزت پر حرف آتا ہے اس نے یک قلم موقوف کر دیں۔ عورت کو حریتِ فکر اور حریتِ عمل کا فطرتی مقام بخشا۔ مردوں پر فرض قرار دیا کہ عورتوں سے حسنِ سلوک کریں اور حتی الامکان عدل و انصاف بلکہ رواداری اور فیاضی سے کام لیں۔ گھریلو زندگی کا امن و سکون، دلوں کا اطمینان، معاشرہ کا امن و امان اور آئندہ نسلوں کی صحیح تربیت انہی احکام

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳

Marfat.com

پر موقوف ہے۔ رشتۂ زوجیت کا دوام اور مضبوطی صرف ایمانی تعلق، باہمی اعتماد اور انسانی شرافت و عظمت کے احساس پر مبنی ہے۔ محض برائے نام "محبت و عشق" اور آج کل کا رواجی عشق اور محبت کی شادی اس امن و سکون کی بنیاد ہرگز نہیں بن سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اس آیت ۱۹ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ محض جسمانی تلذذ کا داعیہ دم بدم تغیر پذیر ہوتا ہے اس پر خاندانی زندگی کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ حیوانی محبت کا احساس ایک متغیر اور انقلاب پذیر احساس ہے آج ہے تو کل نہیں۔ معاشرہ کی بنیاد کسی اعلیٰ تر حقیقت پر ہونی چاہیئے اور وہ ہے ایمانی رابطہ، خوف خدا اور رواداری کا صحیح اسلامی جذبہ!

[1] عورت جب صریح بدکاری میں مبتلا ہو (محض ظن و تخمین اور شبہ نہ ہو) خاوند کی واضح نافرمانی کرے اور اسلامی معاشرت کے اصول کو توڑ دے۔ پھر تادیب و سیاست بھی کارگر نہ ہو یا اس سے سرقہ وغیرہ فحش امور کا ارتکاب ہوتا ثابت ہو جائے تو مرد کو اسے روکنے اور حق مہر وغیرہ کی عدم ادائیگی کی اجازت ہے کیونکہ اس صورت میں فحاشی عورت کی طرف سے ہوئی ہے۔ فاحشہ کے ساتھ مبینہ کی شرط بھی لگائی گئی ہے تاکہ عورت پر محض بدظنی، کسی معمولی گستاخی یا شبہ وغیرہ کی بناء پر ظلم و ستم کا امکان نہ رہے۔ واضح طور پر فحش و بدکاری کی صورت میں اسے تنگ کرنے، روکنے اور مال کی واپسی کی اجازت میں یہ راز ہے کہ یہ عورت اس شخص کے مال سے ناجائز گلچرے نہ اڑاتی پھرے اور دوسروں سے عیش و عشرت کرنے کے لئے اس کے مال و متاع کو استعمال نہ کر سکے۔ یہ اجازت گویا عورت کے لئے ایک مستقل رکاوٹ ہے تاکہ وہ بیوفائی کا خیال تک دل میں نہ لا سکے۔

عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کا مطلب یہ ہے کہ تم عورتوں سے حکم شرع کے مطابق حسن معاشرت رکھو اور وہ تمہارے ساتھ رکھیں۔ زوجین میں سے ہر فریق دوسرے کے لئے باعث سرور و مودت ہو۔ دونوں مل کر دنیوی و اخروی صلاح و سعادت میں کوشاں رہیں۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے۔

خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ؛ یعنی ازواجی زندگی کے تین مقاصد ہیں۔

(ا) سکون باہمی۔

(ب) مودت و الفت۔ اور

(ج) رحمت۔

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۱۲۳، تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۴۴۰، ۴۵۲

Marfat.com

مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ناپسندیدگی کی صورت میں فوراً عورتوں سے قطع تعلق نہ کریں۔ کیونکہ اگر وہ بدصورتی کی وجہ سے ایسا کریں گے تو اس میں ان عورتوں کا کوئی اختیاری نقص و عیب نہیں ہے۔ اگر ان کی کسی اخلاقی کوتاہی کی وجہ سے ایسا کریں گے تو نقص و کوتاہی سے پاک کون ہو سکتا ہے؟ معصوم تو صرف پیغمبر ہی ہوتے ہیں اور اگر ان کے سلوک، خدمت اور انتظامی قابلیت سے ناخوش ہو کر ایسا کریں گے تو فوراً ایسا کرنے سے یہ کوتاہیاں تو دور نہ ہوں گی۔ اس کیلئے کچھ وقت درکار ہے۔ عین ممکن ہے کہ صبر و تحمل سے کام لیں تو یہی عورتیں جو ناپسند ہیں بہت خیر و برکت کا سبب بن جائیں۔ مثلاً:

(۱) ان سے بہترین اولاد پیدا ہو، جو باپ کا نام روشن کر دے۔
(۲) صبر و تحمل سے عورت کے جوہر کھل جائیں۔ اس سے مرد کو معاشرتی سکون اور معاشی اطمینان میسر ہو جائے۔ ایسی عورت بالعموم زیادہ خدمت گذار اور زیادہ باوفا ہوتی ہے۔

صبر و تحمل کی یہ ہدایت صرف معاشرتی زندگی میں نہیں بلکہ ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں ایک سنہری ہدایت ہے۔ جہاد و قتال جو ایک اعلیٰ ترین عبادت ہے۔ طبعاً وہ بھی ناپسند ہے اور قرآن نے اس کے لئے بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

"ہو سکتا ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ درحقیقت شر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ اصل میں تمہارے لئے خیر و فلاح کا موجب ہو۔"

لہ آیت ۲۰، ۲۱: اسلام سے پہلے یہ بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی چاہتا کہ پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے نکاح کرے تو پہلی عورت پر تہمت لگاتا اور مختلف طریقوں سے اس پر زیادتی اور سختی کرتا کہ وہ مجبور ہو کر مہر واپس کر دے اور یہ مال نئے نکاح کے لئے کام آئے۔ ان آیات میں اس کی ممانعت کر دی گئی اور حکم دیا گیا کہ اگر پہلی عورت سے گذر بسر نہیں ہو سکتی۔ اور اسے چھوڑنا ہی ہے تو اسے صرف مہر ہی نہیں بلکہ اور بھی جو بہت سا مال تم اگر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس مت لو۔ کیا تم بہتان باندھ کر اور صریح ظلم کر کے پہلی زوجہ سے وہ مال لینا چاہتے ہو؟ یہ ہرگز جائز نہیں ہے۔
تم اس مال کو کیوں کر واپس لینا چاہتے ہو۔ جب کہ نکاح کے بعد آپس میں مل چکے ہو اور

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۰۴، تفسیر ابن کثیر پارہ ۴ صفحہ ۹۴، ۹۵
تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۳۵، تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۱۷۲، ۱۷۷
تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۵

Marfat.com

صحبت کی نوبت آچکی ہے؟ اس صورت میں تو کل مہر دینا واجب ہو چکا ہے۔ اب تم دے کر کس طرح واپس لیتے ہو؟ اگر دیا نہیں تھا تو اسے دبا کیوں کر سکتے ہو؟ اب تم بجز اس کے کہ عورت ہی اپنی خوشی سے معاف کر دے اور کوئی صورت خلاصی کی نہیں ہو سکتی۔ عورتوں نے تو تم سے بہت مضبوط اور گاڑھا اقرار لے لیا ہے جس کی وجہ سے وہ تمہارے قبضہ و تصرف میں آچکیں اور تم ان سے پوری طرح منتفع ہو چکے نہیں تو تم کو ان پر تصرف کا کیا اختیار تھا؟ اب اس قدر تکمیل اور قبضہ کامل اور تصرف تام کے بعد عورتوں کے مہر کو واپس لینا یا دبا بیٹھنا کیسے ہو سکتا ہے؟

معلوم رہے کہ صرف مجامعت سے ہی نہیں بلکہ خلوتِ صحیحہ سے بھی پورا مہر واجب الادا ہو جاتا ہے۔ ہاں! اگر جماع یا خلوتِ صحیحہ کی نوبت بھی نہیں آئی تو طلاق کی صورت میں مقررشدہ مہر کا نصف واجب ہو جائے گا۔ اگر مہر مقرر ہی نہ ہوا تھا تو مہر مثل دینا پڑے گا۔

"میثاقاً غلیظاً": سے مراد یا تو نکاح کا شرعی معاہدہ ہے یا وہ قول و قرار ہے، جو مرد بحالت رضاء و خوشنودی عورت سے کرتا ہے اور باہمی صحبت ان دونوں کا بڑا ثبوت ہے احادیث میں وارد ہے کہ تم عورتوں کو اللہ کی امانت سے اپنے قبضہ میں لیتے ہو اور خدا کے حکم سے انہیں اپنے اوپر حلال کرتے ہو اس سے مراد خطبۂ نکاح اور ایجاب و قبول بھی ہو سکتا ہے۔

چونکہ ان آیات میں بیان فرمودہ صورت میں فرار و نشوز مرد کی طرف سے ہے، عورت نے نہ تو کوئی بے حیائی کی، نہ اس سے کوئی ایسا فعل اور سرزد ہوا جس سے مہر کا روک لینا روا ہوتا۔ اس لئے مرد کے لئے جائز نہیں کہ مہر کی ادائیگی سے کترانے یا دے کر پھر واپس لینے کی کوشش کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد اس عورت کو بدل کر دوسری سے اگر شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی اپنی مصلحت اور غرض ہے اس بے چاری کا تو کوئی قصور نہیں۔ مرد کو اس کا پسند نہ آنا اس کے قبضہ میں نہ تھا نہ اسے کسی جرم کی وجہ سے چھوڑا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں مرد کے لئے کیوں کر جائز ہو گا کہ حق مہر کو روک لے یا ادا کر کے واپس لے لے؟ واضح رہے کہ مہر کا روکنا یا واپس کر لینا صرف اسی صورت میں ناجائز نہیں کہ مرد اب اسے چھوڑنا چاہتا ہے اس کا ذکر اس لئے فرمایا گیا کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ مہر کی واپسی یا اس کا روک لینا اسی وقت پیش آتا ہے جب پہلی بیوی کو طلاق دی جا رہی ہو یا دے دی گئی ہو۔ ورنہ اگر یہ شخص اس عورت کو چھوڑ کر اب کسی سے بھی نکاح نہیں کرنا چاہتا بلکہ مجردانہ زندگی بسر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تب بھی مہر کو روکنا یا ادا کرنا جائز نہ ہو گا۔

لہ تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۲۱۵، ۲۱۶، تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۴۵۲ - ۴۶۳

Marfat.com

دو انسانوں میں بڑے سے بڑا اور مضبوط سے مضبوط تر رشتہ جو ممکن ہے وہ زوجین کا باہمی اختلاط ہے۔ اس سے قوی تر رابطے کا تصور ممکن نہیں ہے کیوں کہ ان دونوں کا وجود یوں ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور یک جان و قالب ہیں۔ اس قدر قوی رابطہ قائم ہو چکنے کے بعد مظلوم اور ضعیف عورت سے مال چھین لینا تنگ دلی، کم ظرفی اور کمینگی کی انتہا ہے، حالانکہ یہ شخص تو اس کے بعد بھی مال کمانے کی مقدرت و استطاعت رکھتا ہے۔ لیکن کیا معلوم کہ وہ بے چاری کس حال میں زندگی کے دن پورے کرے گی۔

ان آیات میں "قنطار" کا لفظ بولا گیا ہے جس سے مہر کا زیادہ سے زیادہ رکھنا جائز ثابت ہوتا ہے۔ شریعت نے مہر کی حد بندی نہیں کی۔ اور اسے ہر شخص کے ذاتی احوال پر چھوڑ دیا ہے۔ ہاں! حضورؐ کی احادیث میں مہر کو کم رکھنے کی ترغیب وارد ہوئی ہے (مسند احمد، حاکم، بیہقی)، اس آیت میں "قنطار" کا لفظ بطور تاکید و مبالغہ اور بطور فرض وارد ہے۔ لیکن اگر کسی کو زیادہ مہر ادا کر سکنے کی توفیق ہے تو وہ زیادہ بھی رکھ سکتا ہے۔ واقعات و حالات یہ بتاتے ہیں کہ زیادہ حق مہر کی رسم سے کئی عورتیں نکاح سے ہی محروم رہ جاتی ہیں۔ جس سے بدکاری اور فساد پھیلتا ہے اور آخر کار اس کا نقصان عورتوں ہی کے حصے میں آتا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ محض مہر کی کثرت کے لالچ میں ایک اچھی سلیقہ شعار اور عاقل و فاضل عورت کا نکاح کسی ایسے شخص سے ہو جاتا ہے جو کسی طرح بھی اس کے لائق نہیں ہوتا اور اس کی قابلیت محض اس کا مال ہوتا ہے۔ یہ عورت کی دینوی زندگی کی بربادی اور فتنہ و فساد کا موجب ہوتا ہے۔ افسوس! بہت سی غلط رسمیں اور انکی اندھا دھند پابندی کئی زندگیوں کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین عمر الفاروقؓ نے زیادہ مہر باندھنے پر پابندی لگانے کا ارادہ کیا تھا، یہ محض ان کا تقویٰ و ورع تھا کہ ایک عورت کے اس آیت کو یاد دلانے پر یہ ارادہ ترک کر دیا تھا، ورنہ ان کا یہ ارادہ خلاف شرع نہ تھا اور اس کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ ہر شخص کے حالات الگ الگ ہوتے ہیں۔ اگر پابندی عائد کر ہی دی جاتی تو بعض وہ لوگ جو واقعی زیادہ مہر ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ انہیں بھی قانون کی پابندی میں کم مہر رکھنا پڑتا ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ

اور نکاح میں نہ لاؤ جن عورتوں کو نکاح میں لائے تمہارے

Marfat.com

النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً

باپ مگر جو پہلے ہو چکا بیشک یہ بے حیائی ہے

وَّمَقْتًا ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ

اور غضب کا کام ہے اور برا چلن ہے۔ حرام ہوئی ہیں تم پر

اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَ

تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور

عَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَ

پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور

بَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ

بھانجیاں اور جن ماؤں نے تم کو دودھ پلایا

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ

اور تمہاری دودھ کی بہنیں اور تمہاری

نِسَاۗىِٕكُمْ وَرَبَاۗىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ

عورتوں کی مائیں اور بیٹیاں جو تمہاری پروردش

مِّنْ نِّسَاۗىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ

میں ہیں، جن کو جنا ہے۔ تمہاری ان عورتوں نے جن سے

لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ

تم نے صحبت کی اور اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی تو تم پر اس نکاح

Marfat.com

عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ

ہیں کوئی گناہ نہیں اور عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو بیٹے کہ تمہاری

اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ

پشت سے ہیں اور یہ کہ اکٹھا کرو دو بہنوں کو

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا

مگر جو پہلے ہو چکا بیشک اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

مہربان ہے

شرح الفاظ

[1] سَلَفَ: گزر چکا، پہلے ہو چکا۔ فَاحِشَةً: نہایت قبیح فعل۔ مَقْتًا: خدا کی نگاہ میں ناراضگی کا باعث اور سلیم الطبع لوگوں کے نزدیک مبغوض و حقیر فعل۔ وَسَاءَ سَبِيْلًا: اور بُرا راستہ ہے، یعنی زمانہ جاہلیت کی رسم و رواج نہایت بُری تھی اور اس پر چلنے والے بھی بہت بُرے تھے وہ جوں جوں اس راہ پر چلے جاتے قباحت میں بڑھتے جاتے اور منزلِ امن و سلامتی سے دور ہوتے چلے جاتے۔ جُنَاحَ: گناہ، تنگی اور حرج۔

پچھلی آیات میں یتامیٰ کا نکاح، حلال عورتوں کی تعداد اور شرائط، طلاق کے بعض احکام اور مہر کی ادائیگی کی تاکید کے ساتھ ساتھ عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم بھی گذر چکا ہے۔ زیر تفسیر آیات میں ان عورتوں کا بیان ہے جن سے نکاح حرام ہے۔

[2] اہل جاہلیت اپنی سوتیلی ماں اور بعض دیگر محرمات سے بھی نکاح کر لیتے تھے جس کا تذکرہ اوپر گذرا ہے۔ ان آیات میں اس کی ممانعت کی جاتی ہے کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو۔ ان سے نکاح مت کرو۔ یہ بے حیائی اور اللہ کے غضب اور نفرت کرنے کی

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۲۱۸

[2] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶، تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۱۷۷، ۱۷۹، تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۳۶، ۳۳۹

Marfat.com

بات ہے اور بہت بڑا طریقہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی سمجھ دار لوگ اس کو مذموم سمجھتے تھے اور اس نکاح کو "نکاح مقت" اور اس نکاح سے جو اولاد پیدا ہوتی۔ اسے "مقتی" کہتے تھے۔ سو ایسے نکاح جو ہو چکے سو ہو چکے آئندہ کو ہرگز ایسا نہ ہو یہ مضمون آیت ۲۲ کا ہے۔

باپ کی منکوحہ کا جو حکم ہے اس میں دادا، نانا اور اوپر والے تمام آبا و اجداد کی منکوحہ بھی داخل ہے۔

سوتیلی ماں کی حرمت بیان فرما کر آیت ۲۳ میں ان تمام عورتوں کا ذکر فرماتے ہیں جن سے نکاح جائز نہیں۔ وہ عورتیں چند اقسام کی ہیں۔

(ا) اوّل ان کو بیان کیا جاتا ہے جو نسبی تعلق کی وجہ سے حرام ہیں اور وہ سات ہیں۔

(۱) ماں

(۲) بیٹی

(۳) بہن

(۴) پھوپھی

(۵) خالہ

(۶) بھتیجی اور

(۷) بھانجی

ان میں سے کسی کے ساتھ کسی کو نکاح کرنا جائز نہیں۔ ماں کے حکم میں نانی دادی اوپر تک سب داخل ہیں۔ ایسے ہی بیٹی میں پوتی اور نواسی نیچے تک سب داخل ہیں۔ بہن میں عینی (سگی)، علاتی (باپ کی طرف سے)، اور اخیافی (صرف ماں کی طرف سے) سب داخل ہیں۔ پھوپھی میں باپ، دادا اور اوپر تک کی پشتوں کی بہن سگی ہو یا سوتیلی۔ سب آگئیں اور خالہ میں ماں، نانی، پڑنانی (اوپر تک) کی بہن تینوں اقسام کی داخل ہے۔ بھتیجی میں تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد اور اولاد در اولاد سب داخل ہیں۔ اور بھانجی میں تینوں قسم کی بہنوں کی اولاد اور اولاد در اولاد نیچے تک سب داخل ہیں۔

(ب) دوسری قسم محرمات رضاعی کی ہے اور وہ دو ہیں۔

(۱) ماں اور

(۲) بہن

اور اس میں اشارہ ہے کہ ساتوں رشتے جو نسب میں بیان ہوئے وہ رضاعت میں بھی حرام ہیں۔ یعنی رضاعی بیٹی اور پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی یہ سب بھی حرام ہیں۔

Marfat.com

چنانچہ احادیث میں صراحتہً یہ حکم موجود ہے۔

(ج) تیسری قسم محرماتِ مصاہرہ کی ہے۔ یعنی علاقۂ نکاح کی وجہ سے جن عورتوں سے نکاح حرام ہوتا ہے۔ اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں:

اوّل: وہ کہ جن سے ہمیشہ کو نکاح حرام ہے۔ اور وہ زوجہ کی ماں اور زوجہ کی بیٹی ہے کہ جس سے یہ خاوند صحبت کر چکا ہو لیکن اگر بلا صحبت کسی عورت کو طلاق دے دی جائے تو اس کی بیٹی سے نکاح ہو سکتا ہے۔ اور بیٹوں کی عورتیں ہیں اور ان میں نیچے تک پوتوں اور نواسوں کی عورتیں داخل ہیں کہ ان سے کبھی نکاح درست نہیں ہو سکتا۔

دوسری قسم وہ ہے کہ ان سے ہمیشہ کے لئے نکاح کی ممانعت نہیں بلکہ جب تک کوئی عورت تمہارے نکاح میں ہے اس وقت اس عورت کی ان قرابت والی عورتوں سے نکاح کی ممانعت ہے۔ جب اس عورت کو طلاق دے دی یا وہ مر گئی تو اس کی قرابت والیوں سے نکاح درست ہو جائے گا اور وہ زوجہ کی بہن ہے کہ زوجہ کی موجودگی میں تو اس سے نکاح نہیں ہو سکتا اور بعد میں درست ہے اور یہی حکم ہے زوجہ کی پھوپھی، خالہ بھتیجی اور بھانجی کا بھی۔

مِنْ اَصْلَابِکُمْ کی قید سے منہ بولے بیٹے اور رے پالک بیٹے خارج ہیں مگر رضاعی رشتے اوپر حرام ہو چکے ہیں لہٰذا وہ اس سے خارج نہیں۔ فِیْ حُجُوْرِکُمْ کی قید سے یہ غرض نہیں کہ اگر ایسی لڑکیاں تمہاری پرورش میں نہ ہوں تو ان سے نکاح جائز ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی لڑکیاں عموماً تمہاری گود میں پلتی ہیں۔ گویا تمہاری بیٹیاں ہی ہیں۔ لہٰذا ان سے نکاح بہرحال حرام ہے۔

۱۲ آیت ۲۲ میں اللہ تعالیٰ نے باپ کی منکوحہ کی حرمت کا بیان فرمایا ہے اور اسے دیگر محرمات (آیت ۲۳) کے ساتھ بیان نہیں فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اس کا بہت رواج تھا۔ اس کی قباحت و مذمت شدید ترین الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے کہ اسے فاحشہ قرار دیا گیا ہے۔ پھر اسے سخت مبغوض اور ناپسند فرمایا گیا ہے اور سَاءَ سَبِیْلًا: فرما کر اس کے طبعاً و عرفاً ناجائز و حرام ہونے کو واضح فرمایا گیا ہے۔ ابن سعد نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کوئی شخص بیوی چھوڑ مرتا تو اس سے نکاح کا سب

---

۱۲ تفسیر المراغی جلد ۴ صفحہ ۲۱۸، ۲۲۳، تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۴۶۳، ۴۸۱، تفسیر ابن کثیر پ ۴ صفحہ ۹۵، ۱۰۰

Marfat.com

سے زیادہ مستحق اس مرنے والے کا بیٹا شمار ہوتا تھا۔ یعنی اگر وہ اس کی حقیقی ماں نہ ہوتی تو چاہے وہ خود نکاح کر لیتا یا کسی اور سے اپنی مرضی سے کرا دیتا تھا جب قضائے الٰہی سے قیس بن الاسلت فوت ہو گئے تو ان کا بیٹا محصن اٹھا اور باپ کی منکوحہ سے بلا جھجک شادی کر لی، نہ تو اسے کچھ مہر دیا نہ اس کے خاوند کی میراث سے اسے کچھ حصہ دیا۔ وہ خدا کی بندی جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور ساری صورت حال بیان کر دی۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ فی الحال تم واپس جاؤ۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرے معاملے میں کوئی حکم نازل فرمائے گا۔ پس یہ آیات وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ اور ایک گذشتہ آیت لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا اسی قصے میں نازل ہوئی۔ آیت ۲۲ میں نکاح سے مراد جیسا کہ عبداللہ بن عباس نے فرمایا۔ فقط عقد نکاح ہے۔ قربت اس میں شرط نہیں۔ چنانچہ ابن جریر طبریؒ اور بیہقیؒ نے ابن عباس سے یہ الفاظ روایت کئے ہیں کہ:

"ہر وہ عورت جس سے تیرے باپ نے نکاح کیا۔ چاہے اس سے صحبت کی یا نہیں کی۔ وہ تجھ پر حرام ہو گئی"۔ اور آباء سے مراد بالاجماع اجداد بھی ہیں۔

امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ قبح کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) عقلی

(۲) شرعی اور

(۳) عادی (یعنی عرفی)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منکوحہ سے نکاح کرنے کو ان تینوں اقسام سے موصوف فرمایا ہے۔ فاحشۃ کے لفظ سے قبح عقلی کی طرف اشارہ ہے مَقْتًا سے قبح شرعی کی طرف اور ساءَ سَبِيْلًا سے تیسری قسم یعنی قبح عرفی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نسب کے لحاظ سے چھ اقسام کی عورتیں حرام ہیں۔

(۱) اصول جن کی طرف اُمَّهٰتُكُمْ کا لفظ رہنمائی کرتا ہے۔

(۲) فروع جو بناتُكُمْ سے بیان فرمائی گئی ہیں۔

(۳) حواشی قریبہ جو اَخَوٰتُكُمْ سے واضح فرمائی گئی ہیں۔

(۴، ۵) حواشیٔ بعیدہ (باپ اور ماں دونوں کی طرف سے) جن کی طرف عَمّٰتُكُمْ وخالاتُكُمْ کے الفاظ راہنمائی فرماتے ہیں۔

(۶) حواشیٔ بعیدہ (بہن بھائی دونوں کی طرف سے) جن کی طرف الفاظ بَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ ہدایت فرماتے ہیں۔

Marfat.com

رضاعت کو اللہ تعالیٰ نے نسب کی مانند قرار دیا ہے۔ اور رضاعی ماں کو اُمّ اور رضاعی بہن کو اُخت فرما کر یہ بتا دیا ہے کہ رضاعت کی حرمت بھی نسب کی حرمت جیسی ہے۔ سنت نے اس کو واضح کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب گذارش کی گئی کہ آپؐ اپنے چچا حمزہؓ کی بیٹی سے نکاح کر لیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ میرے لئے حلال نہیں کیونکہ حمزہؓ میرے رضاعی بھائی بھی تھے۔ پس وہ میری رضاعی بہن ہے اور فرمایا کہ جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں وہ رضاعت کے سبب بھی حرام ہیں۔ یہ ایک متفق الیہ حدیث ہے جسے ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے۔ اہل اسلام ہر قرن اور ہر دور میں عمل پیرا رہے ہیں اور انہوں نے رضاعی ماں کے خاوند کو رضیع (دودھ پینے والے) کا باپ قرار دیا ہے۔ رضیع پر اس شخص کے اصول و فروع حرام ہیں۔ گو وہ اس مرضعہ (دودھ پلانے والی ماں) کے علاوہ دوسری ازواج سے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرضعہ کا دودھ اسی مرد کی صحبت و حمل کے باعث اترا تھا اور اس سے اس رضیع نے پرورش پائی۔ امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ:

"ایک شخص کی دو لونڈیاں ہیں۔ ایک لونڈی نے ایک لڑکی کو دودھ پلایا اور دوسری نے ایک لڑکے کو۔ پس کیا اس لڑکی اور لڑکے کا باہم نکاح درست ہے؟"

ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ نہیں، نکاح ناجائز ہے کیوں کہ دونوں لونڈیوں کے دودھ کا باعث ایک ہی مرد ہے یعنی وہی مرد ان دونوں کا باپ ٹھہرا پس یہ دونوں باہم بہن بھائی ہوئے لہٰذا نکاح حرام ہے۔

دودھ پلوانے یا پلانے کے معاملے میں لوگ بہت غفلت و تساہل کا شکار ہو گئے ہیں۔ حالاں کہ اس کا معاملہ بہت نازک اور اہم ہے۔ لہٰذا دودھ کے تمام رشتوں کا قطعی علم ہونا ضروری ہے۔ تاکہ حرام رشتوں کی پہچان رہے اور غفلت میں کہیں فعل حرام اور نکاح حرام کا ارتکاب نہ ہو جائے۔ نیز رضاعت کے باعث نکاح کے علاوہ دوسرے حقوق بھی لازم ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کے ظاہر سے رضاعت کی قلیل و کثیر مدت و مقدار ایک ہی جیسی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، امام حسن بصریؒ اور امام زہریؒ کا مسلک یہی ہے اور فقہا میں سے ابو حنیفہؒ و مالکؒ کا یہی مسلک ہے۔ تفصیل فقہ و اصول سے معلوم کی جا سکتی ہے۔

رضاعت سے حرمت کا تعلق رضاعت کی عمر اور مدت کے اندر ہی ہو سکتا ہے جو دو سال ہے ارشاد الٰہی ہے: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔

Marfat.com

(بقرہ) حضرت عمر فاروقؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کا یہی مسلک ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، احمد بن حنبلؒ، ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور محمدؒ بن الحسن نے اسی کو اختیار کیا ہے" تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

محرمات مصاہرت (رشتہ نکاح) کے سلسلے میں امہات نسائکم کا ارشاد جو فرمایا گیا ہے اس کی تشریح میں جمہور یہ صحابہؓ و تابعینؒ اور فقہائے اربعہ کا مسلک یہ ہے کہ جب کسی عورت سے عقد نکاح ہو جائے تو اس عورت کی ماں ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے۔ اس حرمت میں مقاربت (صحبت) شرط نہیں ہے۔ حنیفہ نے زنا کو بھی (بلکہ اس کے بعض مقدمات مثلاً شہوت سے مس کرنا اور بوسہ وغیرہ کو بھی) حرمت مصاہرت کا باعث قرار دیا ہے جس سے اس عورت کے اصول و فروع اس شخص پر حرام ہو جاتے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی ماں کو شہوت سے ہاتھ لگا دے تو بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے۔ دوسرے بہت سے آئمہ نے اس مسئلہ میں حنفیہ سے اختلاف کیا ہے جس کی نوعیت و تفصیل کا یہ مقام نہیں ہے۔

فقہ کے مذاہب اربعہ اس بات پر متفق ہیں کہ دو بہنوں کو کسی صورت میں بھی اکٹھا نہیں رکھا جا سکتا، نہ نکاح سے جمع ہو سکتی ہیں نہ ملک یمین سے (لونڈیاں ہو کر) نہ اس طرح کہ ایک سے نکاح ہو اور دوسری لونڈی ہو۔ پھر جس طرح جمع بین الاختین حرام ہے، اسی طرح ایک عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو اکٹھا رکھنا بھی حرام ہے۔ حدیث میں اس کی علت قطع رحمی فرمائی گئی ہے اور قاعدہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ ہر دو عورتیں کہ جن میں سے ایک کو اگر مرد فرض کریں تو ان کا باہم نکاح شرعاً حرام ہو۔ انہیں ایک شخص بیک وقت نہیں رکھ سکتا۔

قرآن مجید نے یہاں ایک مفصل فہرست دے کر بتا دیا کہ ان عورتوں سے مطلقاً یا فلاں فلاں صورتوں میں نکاح حرام ہے اور یہ فہرست محرمات قرآن مجید کی کاملیت کے دلائل میں سے ایک قوی دلیل ہے۔ موجودہ انجیل اور خدا معلوم کتنی نام نہاد آسمانی کتابوں میں تعلیم کا یہ درس سرے سے سادہ موجود ہے!

جمہور علماء کا مذہب ہے کہ ان آیات کی رو سے کسی عورت کی لڑکی تو صرف اس عورت سے عقد نکاح کرنے سے اس نامحرم مرد پر حرام نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس سے مباشرت نہ ہو۔ ہاں! کسی عورت کی ماں صرف اس عورت کے کسی سے نکاح ہو جانے سے اس نامحرم پر

تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۶

تفسیر ابن کثیر پارہ ۴ صفحہ ۹۷

Marfat.com

ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتی ہے۔ اُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ اور فَإِنْ لَّمْ تَكُونُوا دَخَلْتُم بِهِنَّ کے الفاظ سے واضح طور پر یہی ثابت ہوتا ہے، چاروں آئمہ فقہ، سائول فقہائے حجاز اور جمہور علمائے خلف وسلف کا یہی مذہب ہے اور اس اجماع کے خلاف ہرگز جائز نہیں۔ امام ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے احادیث کی روشنی میں اس پر نہایت مفید اور مفصل بحث فرمائی ہے جس کا لکھنا باعث طوالت ہوگا۔

[1] الّا ما قد سلف، تمدنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے بالعموم قرآن مجید میں یہ بات ضرور فرمائی جاتی ہے کہ "جو ہو چکا سو ہو چکا" اس کے دو مطلب ہیں۔

پہلا: یہ کہ بے علمی اور نادانی کے زمانے میں جو غلطیاں تم لوگ کرتے رہے ہو۔ ان پر گرفت نہیں کی جائے گی۔ بشرطیکہ اب حکم آجانے کے بعد اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لو جو کام غلط ہیں انہیں چھوڑ دو۔

دوسرا: مطلب یہ ہے کہ زمانۂ سابق کے کسی طریقے کو اب اگر حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ تو اس سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں ہے کہ پچھلے قانون یا رسم ورواج کے مطابق جو کام پہلے کئے جا چکے ہیں ان کو کالعدم اور ان سے پیدا شدہ نتائج کو ناجائز اور عائد شدہ ذمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیلی ماں سے نکاح کو آج حرام کیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کئے تھے ان کی اولاد حرامی قرار دی جا رہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں سے ان کا حق وراثت ساقط کیا جا رہا ہے۔ اس طرح اگر لین دین کے کسی طریقے کو حرام کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے جتنے معاملات اس طریقے پر ہوئے ہیں۔ انہیں بھی کالعدم ٹھہرا دیا گیا ہے اور اب وہ سب دولت جو اس طریقے سے کسی نے کمائی ہو۔ اس سے واپس لی جائے گی۔

[2] خداوند تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ ممکن نہیں نہ ان کا ادراک ہمارے لئے ضروری ہے۔ کیوں کہ مومن کے لئے بس یہی بات کافی ہے کہ شرع الٰہی نے فلاں فلاں حکم دیا ہے خالق کائنات نے ضرور ایسا کسی حکمت ومصلحت سے ہی کیا ہوگا۔ تاہم بعض دفعہ فضلِ خداوندی

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۳۵، ۳۳۶

[2] فی ظلال القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۸۶، ۲۹۳

Marfat.com

سے بندوں پر اس کے احکام کی کچھ حکمتیں کھل بھی جاتی ہیں۔ پس باپ کی منکوحہ کی حرمت کی بظاہر تین حکمتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) یہ کہ باپ کی منکوحہ ماں کی مانند اور اس کے قائم مقام ہے۔

(۲) یہ کہ اگر بیٹا باپ کی منکوحہ سے نکاح کرے تو وہ اپنے خیال میں اس کا شریک و ہم سر بن جائے گا۔ اور فطرتاً و طبعاً ایسا ہوتا ہے کہ خاوند اپنی بیوی کے پہلے خاوند کو اکثر ناپسند کرتا ہے۔ پس اس صورت میں بیٹا باپ کو ناپسند کرے گا اور اس سے حسد و بغض رکھے گا۔

(۳) یہ کہ اگر یہ نکاح حرام نہ ٹھہرایا جاتا تو باپ کی منکوحہ کو مال میراث قرار دے لیا جاتا۔ جیسا کہ جاہلیت میں ایسا ہی ہوتا تھا اور یہ چیز خلافِ انسانیت اور خلاف احترام آدمیت ہے تمام اقوام و ملل میں، خواہ وہ مہذب ہوں یا وحشی، محارم کا تصور موجود ہے۔ پھر مختلف اقوام میں اسبابِ تحریم مختلف ہوئے ہیں۔ اسی طرح محارم کے طبقات میں بھی کافی اختلاف پایا گیا ہے۔ وحشی اور بدوی تہذیبوں میں حرمت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مگر ترقی یافتہ اور مہذب قوموں میں یہ دائرہ تنگ ہوتا گیا ہے۔ اسلام نے تحریم کی دو قسمیں ٹھہرائی ہیں۔

(۱) تحریم ابدی، اور

(۲) تحریم موقت (عارضی)

پھر اسباب تحریم میں سے اس کے نزدیک تین سبب معتبر ہیں۔

(۱) نسب

(۲) رضاعت، اور

(۳) مصاہرت

اس نے باقی تمام قیود و اسباب کو بغور ٹھہرا دیا ہے۔ گو ایسی قیود و اسباب بعض دوسری انسانی تہذیبوں اور معاشروں میں اب تک موجود ہیں (مثلاً ہندو معاشرہ وغیرہ) یہ قیود و اسباب انسانی اجناس اور رنگ و قومیت کے اختلاف پر مبنی تھے۔ اسی طرح بعض تہذیبوں میں (مثلاً رومی، یونانی، ایرانی، مصری اور ہندی تہذیبیں (مولف) ایک ہی وطن میں مختلف طبقات کے اختلاف کا تصور بھی موجود تھا اور ہے۔ (اسلام نے ان غیر فطری اور غیر انسانی پابندیوں کو باطل قرار دیا اور صرف فطری پابندیاں باقی رکھیں مولف)

Marfat.com

ضابطۂ تحریم مختصراً یہ ہے :

(ا) نسبی و قرابتی محرمات جن کے چار طبقے ہیں۔
(۱) آدمی کے اصول اوپر تک
(۲) آدمی کے فروع نیچے تک
(۳) والدین کے فروع نیچے تک
(۴) اجداد کے پہلے فروع یعنی پھوپھی، خالہ اور باپ کی پھوپھی، دادا کی پھوپھی، ماں کی پھوپھی اور دادا کی پھوپھی۔ جن فروع میں اجداد نہ آئیں وہ حرام نہیں مثلاً چچاؤں، پھوپھیوں، ماموں اور خالاؤں کی اولاد۔

(ب) محرمات مصاہرت پانچ ہیں۔
(۱) بیوی کے اصول اوپر تک
(۲) بیوی کے فروع نیچے تک (بشرطیکہ بیوی سے مباشرت ہو چکی ہو)
(۳) باپ دادا (اوپر تک) کی بیویاں
(۴) بیٹوں کی بیویاں نیچے تک
(۵) بیوی کی بہن (جب تک بیوی نکاح میں یا عدت میں ہے۔ پس یہ عارضی حرمت ہے)

(ج) رضاعت کی حرمت تو محارم پر مشتمل ہے۔
(۱) رضاعی ماں اور اس کے اصول
(۲) رضاعی بیٹی (جسے آدمی کی بیوی نے دودھ پلایا) اور اس کے فروع۔
(۳) رضاعی بہن
(۴) رضاعی خالہ اور پھوپھی (رضاعی پھوپھی سے مراد رضاعی ماں کے خاندان کی بہن ہے)
(۵) بیوی کی رضاعی ماں اور اس کے سارے اصول (یہ حرمت مجرد عقد نکاح سے ہی قائم ہو جائے گی جیسا کہ نسب میں بھی ایسا ہی ہے)
(۶) بیوی کی رضاعی بیٹی اور اس کے سارے فروع (اس حرمت کا تعلق مباشرت سے ہے)
(۷) بیوی کے رضاعی باپ دادا کی بیوی اوپر تک
(۸) رضاعی بیٹے کی بیوی (بیٹے کے فروع کی بیویوں کا بھی یہی حکم ہے)

Marfat.com

(۹) عورت اور اس کی رضاعی بہن، پھوپھی یا خالہ (عورت کے کسی اور رضاعی محرم) کے درمیان جمع کرنا۔

اسلامی قانون نے محرمات کا ذکر تو فرمایا۔ ہے مگر نص قرآنی نے کوئی خاص یا عام علت و سببِ تحریم بیان نہیں فرمایا۔ ہم استنباط اور اندازے سے مزاج شرع کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل علتیں بیان کر سکتے ہیں، ان میں سے بعض عام ہیں، بعض کسی ایک نوع محارم کے ساتھ خاص اور کچھ محارم کے درمیان مشترک ہیں۔

(۱) قریبی رشتہ داروں اور محارم کے درمیان اگر نکاح باہمی کو جائز ٹھہرایا جاتا تو رفتار زمانہ کے ساتھ آئندہ نسلیں کمزور اور بیمار پیدا ہونے لگتیں۔ کیونکہ وراثتی ضعف کی استعداد آئندہ نسل میں اکثر منتقل ہو جاتی ہیں۔ پس حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ ہر آنے والی نسل کے لئے نیا اور تازہ خون باہم ملتا رہے اور وراثتی ضعف برگ و بار نہ لا سکے۔ محارم کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں میں یہ ضعف کم سے کم تر ہو چکا ہوتا ہے۔ لہذا ان میں نکاح کو جائز ٹھہرایا گیا۔

(۲) محارم کے بعض طبقات مثلاً ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی (نسبی ہوں یا رضاعی) اور ساس اور لے پالک بیٹی، اسلام چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ آدمی کا تعلق رعایت، مہربانی اور احترام و توقیر کا ہو۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ بعض دفعہ نکاح کے بعد طلاق اور جدائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ پس ان سے نکاح کو حرام ٹھہرا دیا گیا تاکہ عاطفہ و رعایت اور احترام و توقیر کے جذبات مخدوش نہ ہو جائیں۔

(۳) محارم کے بعض طبقات ایسے ہیں جن میں بنوت و اخوت کے تعلقات و احساسات پائے جانا لازم ہیں۔ نکاح کے جواز کی صورت میں ان کا مخدوش ہو جانا اغلب تھا۔ لہذا اسے حرام ٹھہرا دیا گیا مثلاً لے پالک بیٹیاں، دو بہنوں کا اجتماع، ساس باپ کی منکوحہ، ان میں سے پہلے رشتے میں باپ بیٹی کا تعلق ہے۔ دوسرے میں بہن کا، اور تیسرے چوتھے میں ماں بیٹے کا۔ علاوہ ازیں جواز نکاح کی صورت میں لے پالک بیٹی کی ماں اپنی بیٹی سے خلوص، بہن کا بہن سے، بیوی کا اپنی ماں سے قائم نہ رہ سکتا۔ بلکہ ان میں رقابت اور حسد و بغض کے شدید جذبات پیدا ہو جاتے اسی طرح اگر باپ کی زوجہ سے (بعد از طلاق) نکاح کا جواز ہوتا تو باپ بیٹے میں رقابت

لہ نیز دیکھئے تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۱۸۱

Marfat.com

بھڑک اٹھتی، اور معاشرہ اضطراب و اختلاف کی نذر ہو جاتا۔ اگر باپ کی بیوہ سے نکاح جائز ہوتا پھر بھی مرحوم باپ کے خلاف رقیبانہ جذبات پیدا ہو جاتے اور اولاد و والد کا نازک ترین رشتہ سخت مجروح ہوتا۔ یہی حال بیٹوں کی منکوحہ عورتوں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام جو معاشرتی امن کا علمبردار ہے اس اضطراب و قطع رحم کا روادار نہ ہوا اور یہ رشتے حرام ٹھہرا دیئے۔

(۴) نکاح کا رشتہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ اس کے سبب سے خاندانی حدود کو وسیع تر کیا جاتا رہے اور اس رشتے کو قرابت کے رابطے سے بھی پرے تک پھیلا دیا جائے یہی وجہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں، (محارم) کے درمیان اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی قرابت کی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ پس ان لوگوں میں نکاح کی کوئی حکمت نہ تھی۔ لہٰذا اس کی نفی کر دی گئی اور رشتہ داروں میں سے صرف ان سے نکاح جائز رکھا گیا جن کا تعلق بعید ہے۔ اتنا بعید کہ اگر نکاح سے اس کی تجدید نہ کی جائے تو وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔

اور آخر میں ہم کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں سب سے بڑی حکمت خود حکم خداوندی ہے۔ تحلیل و تحریم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس کے احکام کو مان لینا اور اس کے قوانین و ضوابط کے آگے گردن جھکا دینا اسلام ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے جاہلیت ہے۔ تحلیل و تحریم کا تعلق مسئلہ الوہیت سے ہے اور یہ اسلام کا پہلا اصول اساسی ہے۔ دین کا مفہوم یہی ہے کہ حکم و امر صرف اللہ کا مانا جائے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ	مِنَ النِّسَآءِ	اِلَّا مَا مَلَكَتْ	
اور خاوند والی	عورتوں	مگر جن کے مالک ہو جائیں تمہارے	
اَيْمَانُكُمْ	كِتٰبَ اللّٰهِ	عَلَيْكُمْ	وَاُحِلَّ
ہاتھ حکم ہوا	اللہ	کا تم پر	اور حلال ہیں
لَكُمْ	مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ	اَنْ تَبْتَغُوْا	بِاَمْوَالِكُمْ
تم کو	سب عورتیں ان کے سوا	بشرطیکہ طلب کرو	ان کو اپنے مال

Marfat.com

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ

کے بدلے قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو پھر جن کو کام میں لائے

بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ

تم ان عورتوں میں سے تو ان کو دو ان کے حق جو مقرر ہوئے

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ

اور گناہ نہیں تم کو اس بات میں جو تم آپس کی رضا سے

بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

مقرر کئے پیچھے بے شک اللہ ہے۔ خبردار حکمت والا

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ

اور جو کوئی نہ رکھے تم میں مقدور اس کا کہ

يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ

نکاح میں لائے بیبیاں ایماندار سو وہ نکاح کرے

اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ

ان سے جو تمہارے ہاتھ کا مال ہیں جو کہ تمہارے آپس کی لونڈیاں ہیں مومن

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ

اور اللہ کو خوب معلوم ہے تمہارا ایمان، تم آپس میں ایک ہو

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ

سو ان سے نکاح کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور دو انہیں

Marfat.com

اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ

ان کے مہر موافق دستور کے) قید میں آنے والیاں ہوں

مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ

مستی نکالنے والیاں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں پھر جب

اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ

وہ قید نکاح میں آچکیں تو اگر کریں بے حیائی کا کام تو ان پر

نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ

آدھی سزا ہے بیبیوں کی سزا سے

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا

یہ اس کے واسطے ہے جو کو تم میں ڈر ہے تکلیف میں پڑنے سے اور صبر کرو

خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

تو بہتر ہے تمہارے لئے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

شرح الفاظ

المُحْصَنٰتُ[1]: اس کا واحد مُحْصَنَةٌ ہے۔ حصن وحصانہ کا معنیٰ ہے عفت، عفیف عورت کو حاصن، حاصنہ اور حصان کہتے ہیں: اِحْصَان کا معنیٰ ہے قلعہ بند کرنا، محفوظ کرنا، نکاح میں لانا یا کسی عورت کا کسی مرد کے نکاح میں دے دینا مُحْصَنَہ کا معنیٰ ہے شادی شدہ عورت۔ آیت ۲۴ میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کبھی کبھی محصنہ

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۵۷

Marfat.com

کا لفظ آزاد عورت (بالمقابل لونڈی) کے معنیٰ میں بھی آتا ہے جیسا کہ آیت ۲۵ میں آیا ہے۔ قرآن کی بعض اور آیات میں (سورۃ المائدہ) یہی لفظ عفیف و پاک باز عورت کے معنیٰ میں بھی آیا ہے۔ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ : یعنی وہ عورتیں جو دینی جہاد و قتال میں قید ہو کر آئیں۔ اور ان کے خاوند دارالحرب میں ہوں تو ان کا پہلا نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ حاملہ ہوں تو وضع حمل کے بعد ورنہ ایک حیض آچکنے کے بعد بحالتِ طہر ان سے استمتاع جائز ہو جاتا ہے۔ اِحصان : کا معنیٰ یہاں عفت و پاکبازی ہے۔ مُسافحین زنا کرنے والے۔ اسْتَمْتَعْتُمْ تم نے تمتع حاصل کیا، فائدہ اٹھایا۔ اُجُوْرَهُنَّ : اجر کی جمع ہے اصل میں اجر کا معنیٰ ہے وہ جزاء یا بدلہ جو کسی عمل یا چیز یا منفعت کے مقابلے میں دیا جاتا ہے۔ یہاں مراد حق مہر ہے۔ فَرِيْضَةً مقرر شدہ، ٹھہرایا ہوا، محدود مقدر۔ لَا جُنَاحَ کوئی گناہ، تنگی اور حرج نہیں۔ يَسْتَطِعْ : استطاعت کا معنیٰ ہے کسی چیز کا تمہارے بس اور طاقت میں ہونا کہ تم اسے باسانی کر سکو۔ طَوْلًا غنیٰ۔ مالی گنجائش، مرغوب چیز کو حاصل کرنے کی قدرت؛ فَتَيَاتِكُمُ تمہاری لونڈیاں۔ مسافحات بدکار عورتیں اور مُحْصَنَات کا لفظ اس کے مقابل میں عفیف عورتوں کے معنیٰ میں بولا گیا ہے۔ اخدان، خِدْن کی جمع ہے پوشیدہ یار (مذکر و مونث) عورت کا خدن وہ ہے جس سے وہ پوشیدہ ناجائز تعلق رکھے اور ویسے عام لوگوں سے بدکاری نہ کرے۔ بِفَاحِشَةٍ قبیح یعنی زناء المُحْصَنَات کا لفظ آیت کے آخر میں آزاد عورتوں کے لئے آیا ہے۔ العذاب شرعی حد یعنی سو کوڑے پس اس کا نصف پچاس ہوئے۔ لونڈی پر رجم نہیں ہے کیونکہ اس کی تنصیف ممکن نہیں۔ العنت جہد و مشقت۔

یہ دونوں آیات پچھلی آیت کا تتمہ ہیں۔ ان میں بعض اور محرمات کا بیان، مہر کی ادائیگی کا وجوب، لونڈیوں کے نکاح کا حکم اور بدکاری کے وقت ان کی سزا کا بیان ہے۔

قرآن کے اجزاء کی تقسیم میں (برائے تسہیل تلاوت و حفظ) الفاظ و آیات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نہ کہ معنیٰ کا۔ اگر معنیٰ کا لحاظ ہوتا تو پانچواں جزو آیت ۲۹ سے شروع کیا جاتا۔ جس سے ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔

[1] آیت ۲۴ میں ان عورتوں کی حرمت بیان فرمائی ہے۔ جو کسی کے نکاح میں ہوں۔ یعنی جو عورت کسی کے نکاح میں ہو اس کا نکاح اور کسی سے نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶

Marfat.com

بذریعہ طلاق و وفات خاوند سے جدا نہ ہو جائے اور عدت طلاق یا عدتِ وفات پوری نہ کرلے اس وقت تک کوئی دوسرا اس سے نکاح نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر کوئی عورت خاوند والی تمہاری ملک میں آجائے تو وہ اس حکمِ حرمت سے مستثنیٰ ہے اور وہ تم پر حلال ہے۔ گو اس کا خاوند زندہ ہے اور اس نے طلاق بھی اس کو نہیں دی۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ کافر مرد اور کافر عورت میں باہم نکاح ہوا اور مسلمان دارالحرب پر چڑھائی کرکے اس عورت کو قید کرکے دارالاسلام میں لے آئیں۔ تو وہ عورت جس مسلمان کو ملے گی اس کو حلال ہے۔ گو اس کا خاوند دارالحرب میں زندہ موجود ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی۔

جن عورتوں کی حرمت بیان ہو چکی۔ ان کے سوا سب حلال ہیں۔ مگر چار شرطوں کے ساتھ:

(۱) یہ کہ طلب کرو یعنی زبان سے ایجاب و قبول دونوں طرف سے ہو جائے۔

(۲) یہ کہ مال یعنی مہر دینا قبول کرو۔

(۳) یہ کہ ان عورتوں کو قید زوجیت میں لانا اور اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو صرف مستی نکالنا اور شہوت رانی مقصود نہ ہو۔ جیسا کہ زنا میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ کے لئے اس کے لئے اس کی زوجہ ہو جائے، چھوڑے بغیر کبھی نہ چھوٹے۔ مطلب یہ کہ کوئی مدت مقرر نہ ہو۔ اس سے متعہ کی حرمت بھی معلوم ہو گئی جس پر اہل حق کا اجماع ہے۔

(۴) یہ کہ (جو دوسری آیتوں میں مذکور ہے) مخفی طور پر دوستی نہ ہو، یعنی کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس معاملہ کے گواہ ہوں۔ اگر بدون دو گواہوں کے ایجاب و قبول ہوگا تو وہ نکاح درست نہ ہوگا بلکہ زنا سمجھا جائے گا۔

جس عورت سے نکاح کرلیا اور اس کے بعد زوج نے اس سے کسی مدت متعین قلیل یا طویل تک نفع بھی حاصل کرلیا۔ کم سے کم یہ کہ ایک ہی دفعہ مباشرت یا خلوت صحیحہ کی نوبت آئی۔ تو اب اس عورت کا پورا مہر دینا لازم ہے، بدون عورت کے بخشے کسی طرح چھوٹ نہیں سکتا۔ البتہ جب تک عورت بالکل کام میں نہ آئے اور خاوند طلاق دے دے تو مقرر شدہ مہر کا نصف دینا پڑے گا۔ اور اگر عورت نے انتفاع سے پہلے کوئی ایسی بات کی کہ نکاح ٹوٹ گیا۔ تو خاوند کے ذمہ سے سب مہر اتر جائے گا کچھ دینا نہ پڑے گا۔

اگر زوجین مہر مقرر کرلینے کے بعد کسی بات پر راضی ہو جائیں۔ مثلاً عورت اپنی خوشی سے مقرر شدہ مہر سے کچھ کم کردے یا مرد اپنی رضا سے مقررہ مہر سے کچھ زیادہ دے دے۔ تو وہ اس کے مختار ہیں۔ اس میں کچھ گناہ نہیں یہ نہیں کہ خاوند تعداد مقررہ سے کم کردے یا

Marfat.com

عورت اس سے کچھ زیادہ لے۔ اگر ایسا کریں گے تو ناجائز ہے۔ اس معاملے میں رضائے باہمی شرط ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور ہر طرح کے نفع و نقصان کو خوب جانتا ہے۔ اور جو حکم فرماتا ہے۔ وہ سراسر حکمت آمیز ہوتا ہے اس کی متابعت میں تمہارے لئے دارین کی اور بہبودی ہے اور مخالفت میں سراسر نقصان اور خرابی ہے۔

Marfat.com

اس آیت میں عقد نکاح کو قید (پابندی، قلعہ بندی، محفوظ ہو جانا، مؤلف) سے تعبیر کرنے سے یہ اشارہ نکلا کہ ازدواج محافظ عفت و عصمت ہے۔ (ابن قتیبہ، راغب، روح المعانی)

نظامِ خانگی کی درستی پہ ساری ہیئت اجتماعی کی درستی کا انحصار ہے اور نظام خانگی کا ایک بڑا اہم جزیہ یہ ہے۔ کہ عقد نکاح کس کس کے ساتھ جائز ہے۔ اور کس کس کے ساتھ ناجائز ضروری تھا کہ اس کے اصول و قواعد قرآن مجید میں ہی محفوظ کر دیئے جاتے۔ کتاب اللہ علیکم کے الفاظ تاکید و اظہار اہمیت کے لئے ہیں۔ حدیث و سنت سے جن دوسری عورتوں کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً بعض رضاعی رشتے، یہ سب کنائیۃً قرآن کی ان آیات میں آگئے۔ حدیث نے صرف انہیں کھول کر بیان کیا ہے۔

مقصود نکاح فرد و جماعت دونوں کے نزدیک یہ ہے کہ زوجین نکاح کے ذریعہ سے پاک و منزہ، باعفت زندگی مستقل طور پر بسر کریں گے۔ مقصود حیوانات کی طرح تمام تر ایک مادی شہوت یا جنسی تقاضا کا پورا کرنا نہیں ہونا چاہئے۔ بیوی کے ساتھ مستقل خاندانی زندگی گذارنا نباہ کرنے کا ارادہ اور اس کی وقعت و محبت کسی درجہ میں تو ہو۔ اس آیت میں مال سے مراد مہر یا ملک یمین کی قیمت ہے۔ فقہاء نے اسی سے استدلال کیا ہے۔ کہ مہر نکاح کا لازمی جزء ہے گو اس کی مقدار و تعدد معین نہ کی جائے (مدارک) مہر کی بار بار تاکید سے ظاہر ہے کہ شریعت اسلامی کو عورتوں کے حقوق کا کس درجہ خیال ہے۔ جہاں تک صرف خرچ کا تعلق ہے۔ وہ نکاح اور سفاح (زنا) دونوں میں مشترک ہے۔ فرق یہ ہے کہ نکاح سے زندگی انسانوں کی طرح مقید و پابند ہو جاتی ہے۔ اور سفاح میں انسان جانوروں کی طرح چھوٹا ہوا رہتا ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت سے متعہ کی حرمت نکلتی ہے۔ متعہ ایک قسم کا نکاح زمانۂ جاہلیت میں تھا جس میں مرد و عورت کو کسی مقدارِ معین کے مال سے ایک مدت معین تک بطور زوجین رہنے کی اجازت تھی، ایجاب و قبول اس میں بھی شرط ہے۔ اس کو رنڈی بازی کہنا فضول ہے جمہور امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ نکاح (متعہ) فتح خیبر یا فتح مکہ میں عارضی طور پہ جائز ہوا تھا پھر حضور علیہ السلام نے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا۔ متفق علیہ حدیث میں جناب علیؓ سے روایت ہے۔ کہ حضورؐ نے خیبر کے روز گھریلو گدھوں کے گوشت اور متعہ سے منع فرما دیا تھا۔ علاوہ ازیں قرآن کی آیت میں ہے۔

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۷

سہ تفسیر حقانی ج ۲ صفحہ ۱۸۱ تفسیر ابن کثیر پ ۵ صفحہ ۲۰۳

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۔

اس آیت سے بھی صرف منکوحہ بیوی اور شرعی کنیز کا جواز نکلتا ہے۔ اور ان کے سوا کو عدوان فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ شروع میں متعہ کو حالتِ اضطرار میں جائز کہتے تھے مگر پھر انہوں کے بھی جمہور کے قول کی طرف رجوع کر کے اپنا پہلا مسلک ترک کر دیا تھا لہٰذا اس میں کسی کے لئے کوئی دلیل نہ رہی۔ جن اور بزرگوں سے جواز نقل کیا جاتا ہے۔ وہ ثابت نہیں ہو سکا۔

فقہاءؒ میں اس بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ کہ کافر میاں بیوی دونوں دارالحرب سے گرفتار ہو کر آئیں تو ان کا کیا حکم ہے؟ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں۔ کہ ان کا نکاح باقی رہے گا۔ دوسرے حضرات میں سے امام مالکؒ و شافعیؒ کا مسلک یہ ہے۔ کہ ان کا نکاح بھی باقی نہ رہے گا۔

لونڈیوں کے تمتع کے معاملہ میں چونکہ بہت سی غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں۔ لہٰذا حسب ذیل مسائل کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

۱۔ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں ان کو پکڑتے ہی ہر سپاہی ان کے ساتھ مباشرت کر لینے کا مجاز نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانون یہ ہے۔ کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالہ کر دی جائیں گی۔ حکومت کو اختیار ہے۔ کہ چاہے ان کو رہا کر دے، چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا مبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں۔ اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے ایک سپاہی صرف اس عورت سے ہی تمتع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی ملک میں دی گئی ہو۔

۲۔ جو عورت اسطرح کسی کی ملک میں دی جائے اس کے ساتھ بھی اسوقت تک مباشرت نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اسے ایک مرتبہ ایامِ ماہواری نہ آجائیں۔ اور یہ اطمینان نہ ہو لے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے مباشرت کرنا حرام ہے۔ اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضع حمل سے پہلے بھی مباشرت ناجائز ہے۔

۳۔ جنگ سے پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو بہر حال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی۔ تو جن کے حصہ میں وہ آئیں ان سے تمتع کر سکتے ہیں (بعض علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ ہمارے استاد الاستاد حضرت شیخ الہندؒ نے بھی فوائد القرآن میں اختلاف کرنے والوں کا ساتھ دیا ہے۔ (مؤلف)

سلہ تفہیم القرآن ج ص ۲۳۶-۲۴۱

Marfat.com

۴۔ جو عورت جس شخص کے حصّہ میں دی گئی ہو صرف وہی اس کے ساتھ تمتع کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے اس عورت سے جو اولاد ہو گی۔ وہ اس شخص کی جائز اولاد سمجھی جائے گی جس کی ملک میں ہے۔ اس اولاد کے قانونی حقوق وہی ہیں۔ جو شریعت میں صُلبی (سگی) اولاد کے لئے مقرر ہیں۔ صاحبِ اولاد ہو جانے کے بعد وہ عورت فروخت نہ کی جا سکے گی۔ اور مالک کے مرتے ہی وہ اپنے آپ آزاد ہو جائے گی۔

۵۔ جو عورت اسطرح کسی شخص کی ملک میں آئی ہو اسے اگر اس کا مالک کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے دے تو پھر مالک کو اس سے دوسری تمام خدمات لینے کا حق تو رہتا ہے۔ لیکن شہوانی تعلق کا حق باقی نہیں رہتا۔

۶۔ جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے۔ اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔ لیکن اس معاملہ میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں تھا۔ کہ مال دار لوگ بے شمار لونڈیاں خرید خرید کر جمع کر لیں اور اپنے گھر کو عیاشی کا گھر بنا لیں۔ بلکہ درحقیقت اس معاملہ میں عدم تعیّن کی وجہ جنگی حالات کا عدم تعیّن ہے۔

۷۔ ملکیت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابلِ انتقال ہیں جو کسی شخص کو از رُوئے قانون کسی اسیرِ جنگ پر حکومت نے عطا کئے ہوں۔

۸۔ حکومت کی طرف سے حقوقِ ملک کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا وہ خواہ مخواہ لونڈی سے تمتع میں کراہت محسوس کرے۔

۹۔ اسیرانِ جنگ میں سے کسی عورت کو کسی شخص کی ملکیت میں دے دینے کے بعد پھر حکومت اسے واپس لینے کی مجاز نہیں رہتی، بالکل اسی طرح جیسے کسی عورت کا ولی اس کے نکاح میں دے چکنے کے بعد پھر واپس لینے کا حق دار نہیں رہتا۔

۱۰۔ اگر کوئی فوجی کمانڈر محض وقتی اور عارضی طور پر اپنے سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے شہوانی پیاس بجھا لینے کی اجازت دے دے اور محض کچھ مدت کے لئے انہیں فوج میں تقسیم کر دے تو یہ اسلامی قانون کی رُو سے ایک ناجائز فعل ہے۔ اس میں اور زنا میں کوئی فرق نہیں اور زنا اسلام میں قانونی جرم ہے۔

شرعی[1] قیدی بنانے کے لئے شرعی جہاد و قتال کی ضرورت ہے۔ اس مسئلہ کی حکمت یہ ہے کہ جنگوں میں

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۵-۸، تفسیر المنار ج ۵ ص ۲-۲۸۔

Marfat.com

اغلباً یہی ہوتا ہے۔ کہ قیدی عورتوں کے خاوند قتل ہو جائیں یا فرار ہو جائیں۔ فرار کی صورت میں ظاہر ہے۔ کہ وہ دارالاسلام میں تو نہیں لوٹیں گے۔ اور یہ ضروری ہے۔ کہ قیدی عورتوں کی کفالت کی جائے اور انہیں فسق و فجور سے روکا جائے تاکہ معاشرہ گندہ نہ ہو جائے۔ اگر کفالت کا انتظام نہ کیا جائے گا۔ تو ان عورتوں کے حق میں شدید بدبختی کا باعث بنے گا۔ پس اسلام نے اُن کی اور معاشرے کی مصلحت کے لئے انہیں کنیزیں بنا لینے کی اجازت دے دی ہے۔ یاد رہے کہ قیدی بنانا تو بعض دفعہ مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے۔ مگر ان عورتوں کو شرعی کنیزیں بنانا نہ تو فرض واجب ہے نہ حرام بلکہ بعض دفعہ تو خود ان عورتوں کے حق میں یہی صورت بہتر ہوتی ہے۔ کہ انہیں لونڈیاں بنایا جائے۔ مثلاً لڑائی میں ایک محدود قبیلے کے سارے ہی مرد قتل ہو جائیں تو ان عورتوں کیلئے دارالاسلام میں کنیز بن کر رہنا ہی بہتر اور اوفق ہوگا۔ لیکن جنگ اگر شرعی جہاد نہ ہو تو کنیزیں بنانے کا سوال خارج از بحث ہوگا۔

لفظ احصان قرآن میں چار معانی کے لئے آیا ہے۔

۱۔ نکاح ۔(وَالْمُحْصَنٰتُ)

۲۔ عفّت (مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ)

۳۔ حرّیت (وَمَنْ لَّمْ ..... الْمُحْصَنٰتِ)

۴۔ اسلام (فَاِذَا اُحْصِنَّ یعنی اَسْلَمْنَ)

نکاح چونکہ صنفی انار کی آزاد شہوت رانی اور حیوانیّت سے روکتا ہے۔ لہٰذا اسے اِحصان کہا گیا ہے۔ کیوں کہ اگر ہر مرد کو ہر عورت اور ہر عورت کو ہر مرد سے صنفی تعلقات کی کھلی آزادی دے دی جاتی تو خاندانی، معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی زندگی تلپٹ ہو کر رہ جاتی، کیوں کہ فریقین کا ملاپ محض جسمانی لذّت اور شہوانی جذبات کی تسکین کے لئے رہ جاتا اور وہ کسی باہمی ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ مصلحتِ انسانی و فطری کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہر مونث کو ایک معیّن مرد کے لئے مخصوص کیا جائے تاکہ وہ مل کر خاندانی زندگی وجود میں لائیں۔ اور تربیت اولاد کے لئے باہم تعاون و مشارکت کریں۔ جب یہ اعلےٰ تر مقصد منتفی ہو جائے تو فریقین میں سوائے لذّت پرستی اور صنفی بے قیدی کے کوئی رابطہ نہیں رہ جاتا۔ اس کا نتیجہ قوموں کی تباہی ہوتا ہے۔ جس میں آج کل مغربی ممالک گرفتار ہیں۔ ان میں زنا و سفاح کی کثرت ہے۔ نکاح کم ہے کم تر ہو رہے ہیں آئندہ نسلیں بیمار، کمزور، غیر ذمہ دار اور گستاخ ہو رہی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض قوموں کی آبادی اس قدر کم ہو گئی کہ انہیں مٹ جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے دوسری قوموں کے معاہدوں کا سہارا لیا ہے۔

Marfat.com

اس زمانے میں سوڈان، سعودی عرب اور جہاں کسی علاقوں میں جس غلامی کا رواج ہے۔ یہ قطعاً غیر شرعی ہے۔ کیوں کہ یہ لڑکیاں آزاد مسلم والدین کی بیٹیاں تھیں۔ جنہیں بردہ فروشوں نے اٹھا کر بیچ ڈالا۔ اسلام اس صورت احوال سے قطعاً بری الذمہ ہے۔ کیوں کہ اس نے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی۔

نکاح متعہ کی حرمت و منسوخی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ نکاح بنیۃ الطلاق کو ممنوع ٹھہرایا جاتا۔ مگر چوں کہ اس کا دار و مدار ناکح کی نیت پر ہے۔ (جو کسی کو معلوم نہیں ورنہ وہ متعہ ہو جاتا) لہذا فقہاء نے اسے قانوناً جائز قرار دیا بشرطیکہ عقد نکاح میں اس کا اظہار نہ ہو۔ لیکن اس نیت کے چھپانے کو دھوکا، فریب اور جعل سازی قرار دیا گیا ہے۔ کیوں کہ نکاح انسانی روابط میں سے عظیم ترین ہے۔ اس میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ شہوانی چراگاہوں میں گھومنے پھرنے اور چرنے کی مانند ہے۔ اور اس کا نتیجہ بغض و حسد اور عداوت کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اور اس سے لوگوں کا باہمی اعتماد مجروح ہو کر اضطراب و بے اعتمادی پھیلتی ہے۔ نکاح کا اصل مقصد تو ایک صالح گھر کی تاسیس اور کامیاب زندگی گزارنا ہے جو اس صورت میں مفقود ہے۔

اس[1] آیت پاک کا حکم یہ ہے۔ کہ تمدنی و خاندانی معاملات کی تنظیم کی جائے اور اسے فطری مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اور ازدواجی زندگی میں جو چیزیں اس کے اعلیٰ مقاصد کے خلاف ہیں ان کا دفعیہ کیا جائے۔ نیز خاندانی زندگی اور سارے معاشرے کو بے حیائی اور بدکاری کے پھیلنے سے بچا کر رکھا جائے تاکہ حرمتیں نہ ٹوٹیں اور عائلی روابط کمزور نہ ہو جائیں۔ عائلی اور تمدنی زندگی کا ربط و ضبط اسلام میں اس ایمان پر موقوف ہے۔ کہ یہ سارے احکام و ضوابط اللہ معبود برحق اور حاکم علی الاطلاق کی طرف سے صادر ہوئے ہیں۔ جتنا یہ ایمان مضبوط ہوگا اسی قدر یہ باہمی روابط بھی پختہ ہوں گے۔ ایمان و عمل کی پہلی اساس ہی مسئلہ الوہیت و حاکمیت ہے۔

اسلام نسب کی طہارت کا قائل ہے۔ ہر وہ چیز جو اس طہارت میں اثر انداز ہو یا جس میں اختلاط انساب کا شائبہ پایا جائے وہ حرام ہے۔ اسی طرح اسلام جنسی اختلاط کی نار کی اور حیوانی ازدواج کے سخت خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس نے ہر قسم کی فاحشہ، بے حیائی اور مرد و زن کے بے قید اختلاط سے روکا ہے۔ انسان کی فطرت اس کی انسانیت کے احترام اور صالح تمدن و عائلیت کے لئے ضروری ہے۔ کہ صنفی نار کی کو روکا جائے، ایک عورت کو ایک معین مرد کے لئے خاص کر دیا جائے ضمیر کا اطمینان، گھر کا امن و سلامتی اور معاشرے کا امن اسی پر موقوف ہے۔

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۲۰۲-۲۰۳

Marfat.com

یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے۔ کہ انسان کا بچہ حیوانات کے بچوں کی نسبت غور و پرداخت، تعلیم و تربیت، حفظ و امان کے لئے زیادہ طویل عرصے اور زیادہ محنت و مشقت اور شفقت و رعایت کا محتاج ہے۔ جانور تو جنسی اختلاط کر کے اکثر الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے بچے بہت تھوڑے عرصے میں پل جاتے ہیں۔ مگر انسانی نسل ایک طویل مدت کی محتاج ہے۔ یہ مقصد سوائے عائلی زندگی کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جسمیں عورت اور مرد کا دائمی تعلق سکون و اطمینان اور آئندہ نسلوں کی پرورش کا ضامن ہے۔ یہ پرورش اس امر کی شدید محتاج ہے۔ کہ زوجین کے حقوق و فرائض متعین ہوں اور ان کی ادائیگی فریقین پر واجب ٹھہرائی جائے۔ پس پرورش نسل کا وظیفہ فطرت کی طرف سے معاشرے کی طرف سے اور سب سے بڑھ کر دین کے احکام کے ماتحت خدا کی طرف سے لازم ٹھہرا دیا گیا معلوم ہوا کہ زوجین کا تعلق محض شہوانی نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ و ارفع ہے۔ شہوت کو تو محض اس مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ازدواجی زندگی کے مفصل قوانین بیان کئے ہیں۔ ازدواجی زندگی تمدن و تہذیب کی اوّلین بنیاد ہے۔ اس لئے اسے بہت ہی پختہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ کیوں کہ بنیاد کمزور ہو تو عمارت کمزور تر ہوتی ہے۔

وہ زبانیں جو خاندانی زندگی کے خلاف ہرزہ سرا ہوتی ہیں، محض واہی تباہی بکنے والی ہیں۔ وہ قلم جو آزاد صنفی تعلقات اور شہوانی آوارگی کے حق میں چلتے ہیں، دراصل ان کی تگ و دو انسانیت کے خلاف ہے۔ وہ اس بنیاد کو ڈھانا چاہتے ہیں۔ جس پر انسانی روابط کا عظیم قلعہ کھڑا ہے۔ وہ مصنف جو حیوانی ازدواج کے نظریئے کی اشاعت کرتے ہیں وہ خود اپنے خلاف، اپنے ماں باپ اور خاندان کے خلاف اور ساری تہذیب انسانی کے خلاف سازش کرنے کے مجرم ہیں۔ وہ یہودی ہیں یا صیہونیت کے زہر سے متاثر ہیں۔ جو کائنات کے ہر ضابطے اور قاعدے کی اینٹ اکھاڑ پھینکنے اور انسانیت سے اپنی نکبت و ذلت کا انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ خبیث لوگ ہر عورت کے کان میں بدکاری کی کانا پھوسی کرتے ہیں۔ حرام کاری کو مقدس فعل گردانتے ہیں حرام اولاد پر فخر کرتے ہیں۔ اور یوں انسان کو اس کی انسانیت کے مقام سے گرا کر حیوانوں سے بھی بدتر مقام تک لے جاتے ہیں۔ مسلم ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے خطرناک دشمن پروپیگنڈے منطق و فلسفہ اور علم و فن کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اہل اسلام کو شرم و حیاء اور عفت و طہارت کے حلقوں سے نکل آنے اور ذلت و نکبت کے انتہائی پست مقام تک گر جانے پر ابھارتے ہیں۔ ان کا ہدف اسلامی عقائد، اخلاق، جماعتی و عائلی زندگی اور آزادی و عزت سب کچھ ہے۔ مگر معاملہ اس سے آگے چلتا ہے۔ اسطرح نہ صرف مسلمانوں کی زندگی اضطراب کا شکار ہوگی۔ بلکہ ساری انسانیت کا شرف و مجد مٹ جائیگا۔ آئندہ نسلیں اپنے پہلوں پر لعنت کریں گی۔ انسان کو انسان

Marfat.com

پھاڑ کھائے گا۔ کوئی اخلاق و مروت، کوئی شرافت اور کوئی باہمی ہمدردی باقی نہ رہے گی۔

اب جہاں تک مسئلہ غلامی کا تعلق ہے۔ اسلام اسے کوئی فرض و واجب قرار نہیں دیتا بات صرف اتنی ہے۔ کہ اسلام اس مسئلہ میں اپنے دشمنوں سے وہی سلوک کرتا ہے۔ جو وہ اسلام کے ماننے والوں سے روا رکھتے ہیں۔ بلکہ غلاموں سے سلوک کرنے اور اُن کی انسانیت کا احترام کرنے میں دنیا کے تمام رائج قوانین سے زیادہ رواداری اور فیاضی کا ثبوت دیتا ہے۔ ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ کیوں کہ غلامی اس دور میں ایک بین الاقوامی مسلّم قانون کی مانند تھی، اسلام یک طرفہ طور پر اسے باطل قرار نہیں دے سکتا تھا ورنہ نتیجہ یہ نکلتا کہ دشمنوں کے قیدی تو رہا ہو جایا کرتے اور مسلمان قیدی غلام بنا لیے جاتے، اس سے ایک طرف تو مسلم معاشرے میں اضطراب و انتشار پھیلتا اور دوسری طرف دشمن اور بھی دلیر ہو جاتے اور وہ پہلے سے بھی بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کو بلا کھٹکے نقصان پہنچاتے رہتے۔ کیوں کہ اُنہیں یہ یقین ہوتا کہ قید ہو جانے کی صورت میں اُن کی آزادی تو یقینی ہے۔ مگر مسلمانوں کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ اس دور میں قیدیوں اور پھر غلاموں اور کنیزوں کا ہونا ناگزیر تھا۔ اگر اسلام ان کے صرف کھانے پینے کا انتظام کر کے انہیں مسلم سوسائٹی میں داخل کر لیتا تو یہ معاملہ نہایت خطرناک ہوتا کیوں کہ انسان کی فطری حاجات صرف کھانا پینا ہی نہیں کچھ اور بھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ قیدی عورتیں بدکاری کا موجب بنتیں اور عوامی اخلاق کو خراب کرتی پھرتیں۔ پھر حالتِ کفر میں ان سے مسلمانوں کا نکاح بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ جو فطری اور مصلحت قومی کے مطابق تھا۔ اور وہ یہ کہ انہیں مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے اور ملکِ یمین کے باعث ان سے مباشرت حلال کر دی جائے۔ اس مسئلے پر اسلام کے خلاف زبان کھولنے والے ذرا اپنے دامن کی طرف تو دیکھیں کہ اس پر بدعہدی ظلم و ستم، بدکاری، بداخلاقی، زیردست آزاری اور دنیا کو ایک غلاموں کا وسیع باڑا بنا دینے کے کتنے بدنما اور بدبُودار داغ موجود ہیں! مؤلف)

جن محارم کا اوپر بیان ہوا ہے۔ وہ زیادہ تر دورِ جاہلیت میں بھی محرم ہی سمجھی جاتی تھیں، سوائے باپ کی منکوحہ کے اور دو بہنوں کے جمع کرنے کے، گو جاہلیت میں بھی باپ کی منکوحہ کو اپنے نکاح میں لے آنا ناپسند سمجھا جاتا تھا۔ اور ایسے نکاح کو مقیت کہا جاتا تھا لیکن قرآن نے جب ان سب محارم کی حرمت کو بیان کیا تو فرمایا۔ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اسلام میں حلت و حرمت کا اختیار فقط اللہ کو ہے۔ قانون ساز محرِّم اور محلِّل وہی ہے۔ اور اس مسئلہ کا تعلق اصل میں الوہیت و حاکمیت کے ساتھ ہے۔ چوں کہ الٰہ اور حاکمِ مطلق صرف وہی ہے۔ لہٰذا قانون سازی بھی صرف اُس کے سپرد ہے۔ اقتدار و سلطنت صرف

Marfat.com

اُسی کی ہے۔ باقی سب بندے ہیں۔ جن معاملات میں اللہ و رسولؐ کی واضح ہدایت موجود ہے، ان کے سوا باقی معاملات میں بھی "اجتہاد" کی اجازت باذنِ الٰہی ہے، جسے رسولؐ کے جانشین اسلامی ہدایت کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ پس تشریع (قانون سازی) کا یہ حصّہ بھی بالواسطہ خدا ہی کے اذن و شرع سے ہوا۔

اس آیت نے اسلامی نکاح اور ملکِ یمین کے علاوہ مرد و عورت کے تعلقِ زوجیّت کی ہر صورت کو باطل قرار دے دیا ہے۔ بخاری میں اُمّ المومنین عائشہؓ کی ایک حدیث میں جاہلیت کے چار نکاحوں کا واضح اور مفصل ذکر آیا ہے۔ ایک تو یہی جائز اسلامی نکاح ہے۔ دوسرا نکاح استبضاع (نیوگ) تھا۔ کہ اولاد کی خاطر یا اعلےٰ قسم کی اولاد کی خاطر عورت اپنے خاوند کی اجازت سے دوسروں سے بدکاری کراتی تھی۔ تیسری صورت عام فاحشہ اور بدکاری کی تھی۔ اس میں وہ عورت اولاد کو جس زانی سے چاہے منسوب کر دیتی اور اس کا خرچ اس پر پڑتا تھا۔ چوتھی صورت بھی پیشہ ور بدکاری کی تھی۔ اولاد کے بعد قیافہ شناس جس مرد کی طرف اسے منسوب کر دیتا وہ اسی سے منسوب ہو جاتی تھی۔ اسلام نے پہلی صورت کے علاوہ تمام صورتوں کو حرام قرار دے دیا ہے۔ جائز نکاح کو اسلام احصان کہتا ہے۔ جس میں حفاظت و صیانت، حمایت و رعایت اور طہارت و نظافت کا مفہوم ہے۔ اس کے علاوہ دوسری سورتیں سفاح ہیں، جس کا معنیٰ ہے۔ مادّۂ حیات کو ناجائز طور پر ضائع کرنا۔ احصان میں ذمّہ داری کا احساس ہے۔ اور سفاح میں محض لذت و آوارگی کا تصور اسلام پاک ہے۔ لہٰذا صرف پاکیزگی کو پسند کرتا ہے۔

آیت ۲۵:۔ جس کو اس بات کا مقدور نہ ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے اور اس کے مہر اور نفقہ کا تحمّل کر سکے تو بہتر ہے کہ ایسا شخص آپس میں کسی کی مسلمان لونڈی سے نکاح کر لے۔ کہ اس کا مہر کم ہوتا ہے۔ اور نفقہ میں بھی یہ سہولت ہے۔ کہ اگر مالک نے اس کو اپنے یہاں رکھا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ (یعنی بغرض خدمت) تو خاوند اس کے نفقہ سے فارغ البال رہے گا اور اگر زوج کے حوالہ کر دیا تو بھی آزاد عورت کی نسبت نفقہ میں تخفیف ضرور رہے گی۔

جس کو آزاد عورت سے نکاح کرنے کی مقدرت ہو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک حرام ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے۔ ایسے ہی صحّتِ نکاح کے لئے لونڈی کا مسلمان ہونا اکثر علماء کے نزدیک ضروری ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے ہاں افضل ہے۔ لیکن اگر یہودی و نصرانی لونڈی سے نکاح کر لے تو بھی ان کے نزدیک جائز ہے۔ اگر کسی کے

سلہ فوائد القرآن ص ۱۰۵-۱۰۶ تفسیر ماجدی ص ۱۸۶-۱۸۸ تفسیر حقانی ج ۲ ص ۱۷۸ تفسیر ابن کثیرؒ ص ۴-۹

Marfat.com

نکاح میں آزاد عورت سے تو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا سب کے نزدیک حرام ہے۔
وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ..... مِنْ بَعْضٍ ۱ اللہ تعالیٰ کو تم سب کے ایمان کی اصل کیفیت معلوم ہے۔ تم کو تو ظاہر پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ بعض لونڈیوں کا ایمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک بعض آزاد عورتوں سے بہتر اور افضل ہو سکتا ہے۔ تو اب حیثیت ایمانی سے لونڈی کے ساتھ نکاح کر لینے میں قباحت اور انکار نہ ہونا چاہیئے۔ اور آپس میں تم سب ایک ہو، ایک اصل سے پیدا ہوئے ہو۔ ایک دین میں شریک ہو، پھر لونڈیوں سے نکاح کرنے کو کیوں معیوب اور باعث عار سمجھتے ہو؟ اس کلام سے لونڈیوں کے نکاح کی طرف توجہ دلانا اور ان سے نفرت کو دُور کرنا مطلوب ہے۔

پس مناسب ہے کہ حسب بیان بالا اُن لونڈیوں سے نکاح کر لیا کرو۔ ان کے مالکوں سے اجازت لے کر اور قاعدہ و دستور کے موافق ان کا مہر دیا کرو، جبکہ وہ خوشی سے قید نکاح میں آئیں۔ مستی نکالنے والیاں اور چھپی اور مخفی یاری کرنے والیاں ہرگز نہ ہوں۔ یعنی زنانہ ہو کہ اس میں مہر ہرگز لازم نہ ہو سکے گا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ زنا میں مہر لازم نہیں ہوتا۔ (یعنی اس فعل کی حرمت و شناعت کے باوجود۔ مؤلف) اور نکاح کے لئے گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

جو آزاد مرد یا عورت نکاح سے فائدہ اٹھا چکے یعنی مجامعت کی نوبت آچکی ہو اور پھر وہ زنا کرے تو وہ سنگسار کیا جائے گا۔ اور اگر اس کا ابھی نکاح نہیں ہوا۔ بلکہ اس سے پہلے ہی زنا کیا تو اس کے لئے سو کوڑوں کا حکم ہے۔ اور لونڈی غلام کے لئے قبل نکاح اور بعد نکاح ہر حالت میں صرف پچاس کوڑے ہیں زیادہ نہیں (کیوں کہ رجم کی تو تنصیف ممکن ہی نہیں لہٰذا ان کے حق میں صرف جلد کی نصف سزا ہے! مولف)

لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ.... یعنی لونڈیوں سے نکاح کرنے کا ارشاد اور استحسان اس کے حق میں ہے۔ جو کوئی شخص تم میں ڈرتا ہو مشقت یعنی زنا میں مبتلا ہونے سے، اور اگر تم صبر کرو اور باندیوں سے نکاح نہ کرو تو بہت اچھا ہے۔ تمہارے حق میں کیونکہ اولاد آزاد ہوگی ہاں جس کو صبر و تحمل میں کھٹکا ہو تو اس سے بہتر ہے۔ کہ ایسی حالت میں کسی کی لونڈی سے نکاح کرے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بخشنے والا اور ان پر رحیم ہے

مُسَافِحَاتٍ سے مراد ہیں کھلی ہوئی اور عام کسبیاں اور مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ سے مراد ہیں۔ وہ جن کا کوئی ایک آدھ متعین آشنا ہوتا تھا۔ دنیائے حسن میں بیسواؤں کی دو قسمیں تقریباً ہر جگہ قائم رہی ہیں۔ ایک کھلی ہوئی کسبیاں دوسرے عام خانگیاں۔ جاہلیت عرب کے تمدن میں بھی یہی تفریق قائم تھی۔ (تفسیر کبیر)

Marfat.com

نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ[1] : سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے۔ جس سے خوارج اور ان دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ اگر آزاد شادی شدہ عورت کیلئے شریعت اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے۔ تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے۔ جو لونڈی کو دی جائے؟ لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیل قاطع ہے۔ کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ محصنات (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، ایک "شادی شدہ عورتیں" جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے "خاندانی عورتیں" جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں آیت زیر بحث میں محصنات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لئے دوسرے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ نہ کہ پہلے معنیٰ میں جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لئے محصنات کا لفظ پہلے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جب انہیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (اُحْصِنَّ) تب ان کے لئے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے۔ جو مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بناء پر وہ شادی کے بغیر بھی محصنہ رہ سکتی ہے۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے اس کے لئے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے۔ جن کی ملک میں وہ تھی اور نہ اُسے معاشرے میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اسے جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے

نیز یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں جس سزا کا ذکر ہے۔ وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لئے ہے جن کے مقابلہ میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ محصنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیوں کہ وہ دُہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن ان کے لئے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا، لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے مگر پیغمبرؐ کے ذہن رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۴۲-۲۴۳،

Marfat.com

اس[1] آیت میں محصنات کا معنیٰ آزاد عورتیں ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں لونڈیوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اہل عرب کے نزدیک آزادی احصان کا داعیہ اور سبب ہوتی تھی، جیسے کہ بدکاری لونڈیوں کیا کرتی تھیں (بلکہ قرآن و سنت اور تاریخ سے تو ثابت ہے کہ ان کے مالک نفع کی غرض سے ان سے یہ کاروبار کراتے تھے۔ مؤلف یہی بات ہے۔ کہ ہند نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور تعجب کہا تھا کہ کیا کوئی آزاد عورت بھی بدکاری کر سکتی ہے؟ (یہ سوال اس وقت کیا تھا۔ جبکہ فتح مکہ میں حضورؐ نے تو مسلم عورتوں سے بیعت لی تھی۔ اور حسب قاعدہ و معمول ان سے شرک، زنا، چوری، غیبت، بہتان وغیرہ سے باز رہنے کا عہد لیا تھا۔ مؤلف) قرآن نے لونڈیوں کو فتیات کے لفظ سے پکارا ہے۔ تاکہ ان کی عزت افزائی ہو اور لوگ انہیں عبد اور امۃ (غلام اور لونڈی) کہہ کر نہ پکاریں۔ بخاری میں حضورؐ سے اس کی ممانعت صراحۃً وارد ہوئی ہے۔

بدکاری خفیہ ہو یا علانیہ، اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں خفیہ زنا (یعنی چھپی یاری) کو معیوب جانتے تھے اور علانیہ زنا کو بالعموم شرفاء میں برا ہی سمجھا جاتا تھا۔ لونڈیوں میں سے کسبیاں اپنے مکانوں پر سرخ جھنڈے پہچان اور شہرت کے لئے لگایا کرتی تھیں۔ آجکل بازارِ حسن کو جو REDLIGHTAREA کہا جاتا ہے۔ شائد یہ تصور وہیں سے آیا ہو۔ مؤلف) سوڈان وغیرہ میں اب تک اسی کا رواج ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جاہلیت والوں کے خیال باطل کو رد کرتے ہوئے ہر قسم کی بدکاری سے منع فرما دیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔

اسلام نے ناگزیر حالات میں غلامی کی اجازت دے کر بھی لونڈیوں کے انسانی شرف و منزلت اور طہارت و عفت کو محفوظ کرنے کا انتظام کیا ہے۔ لونڈی سے یا تو اس کا مالک متمتع ہو سکتا ہے۔ (اگر کسی سے اس کا نکاح نہ ہو چکا ہو) اور یا پھر وہ شخص اس سے تعلقات زوجیت رکھ سکتا ہے جس کا اس سے حسب ضابطہ نکاح ہوا۔ اس نکاح کے لئے بھی مہر کی شرط رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ آیت سے واضح ہے۔ اب ایک طرف یہ تعلیم رکھو اور دوسری طرف آج کی مہذب قوموں کے کارنامے دیکھو (جو آزادی اور تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں۔ اور اسلام پر گندگی اچھالنے سے کبھی دریغ نہیں کرتیں۔ مؤلف) کہ مفتوح علاقوں کی عورتوں سے کیسا وحشیانہ سلوک روا رکھتی ہیں۔ فاتح قوموں کا لشکر جس ملک میں کچھ دیر ٹھہر جاتا ہے۔ تو اپنے پیچھے بداخلاقی کے قصے

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۸-۱۲، تفسیر المنار ج ۵ ص ۲-۲۸
[2] فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۲۲-۲۶

Marfat.com

مظلوموں کی دلدوز آہیں۔ اور آنے والی نسلوں کا خلط ملط چھوڑ جاتا ہے۔ جاپان کی مثال سامنے ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں رہنے والی امریکی فوجوں کے باعث آئندہ نسل نیم امریکی نیم جاپانی پیدا ہو رہی ہے۔ (مولف)

رومی قانون میں اشراف کی سزا کم اور ارزال کی کئی گناہ زیادہ اور ظالمانہ ہوتی تھی۔ ہندوستان میں منو کے قانون نے برہمن کو سزا سے بری کر دیا تھا۔ اور اچھوت کو جانوروں سے بدتر درجہ دیا تھا۔ یہودی بھی چور کو اگر وہ شریف ہوتا تو چھوڑ دیتے تھے مگر عوام پر شدید سزا نافذ کرتے تھے۔ اسلام نے ان سب کے برخلاف فطرت اور انسان کی واقعی زندگی کے پیش نظر غلام کی سزا نصف رکھی اور آزاد کی پوری سزا مقرر کی۔ کیوں کہ عدل و انصاف کا تقاضا یہی تھا۔ آج کل بھی بعض مہذب ممالک میں سفید اور کالے کی سزا میں وہی غیر فطری بے انصافی موجود ہے۔ جو قدیم جاہلیت میں پائی جاتی تھی۔

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ

اللہ چاہتا ہے۔ کہ بیان کر دے تمہارے واسطے اور چلائے تم کو پہلوں کی راہ پر اور

مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾

معاف کرے تم کو اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ

اور اللہ چاہتا ہے۔ کہ تم پر متوجہ ہو، اور چاہتے ہیں، وہ لوگ جو لگے ہوئے

يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾

ہیں، اپنے مزوں کے پیچھے کہ تم ہو جاؤ راہ راست سے بہت دور

يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾

اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے اور بنا ہے۔ انسان کمزور۔

Marfat.com

شرح الفاظ

لِيُبَيِّنَ: تَبْيِيْنٌ کا معنیٰ ہے کھول کر بیان کرنا۔ يَهْدِيَكُمْ ہدایت کا معنیٰ ہے۔ رہنمائی کرنا۔ سُنَنَ: سُنَّة کی جمع ہے طریقے، راستے، احوال۔ الشهوات: خواہشات نفسانی۔ مَيْلًا: جھک جانا افراط و تفریط۔ يُخَفِّفَ: تخفیف کا معنیٰ ہے بوجھ ہلکا کرنا۔

[1] قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے۔ کہ وہ صرف احکام ہی بیان نہیں کرتا بلکہ ان کی مناسب علتیں اور اسباب بھی بیان کر دیتا ہے۔ تاکہ اہل ایمان کو دلوں کی ٹھنڈک اور اطمینان حاصل ہو اور وہ ان احکام پر اندھا دھند نہیں بلکہ علیٰ وجہ البصیرت عمل کریں اور سعادت دارین سے سرفراز ہوں چنانچہ ان آیات میں سابقہ احکام کے عِلَل و اسباب بیان فرمائے گئے۔ لیکن وہ ایسے سادہ طریقے سے پیش کئے گئے ہیں۔ کہ ہر کہ دمہ ان سے یکساں فائدہ اٹھائے اور وہ ایک فلسفی سے لیکر عام دیہاتی تک کی سمجھ میں آسکیں۔ آسمانی کتابوں میں علت و سبب کا بیان اور اس قسم کا عام فہم طرز بیان صرف قرآن کی خصوصیت ہے۔

[2] اللہ تعالیٰ کا ان احکام کے ارشاد سے مطلب یہی ہے۔ کہ تمہیں حلال و حرام کا حال معلوم ہو جائے اور تم کو پہلے انبیاء کا راستہ نصیب ہو جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ اور وہ تمہاری مغفرت کریں۔ اسے تمہارے مصالح اور تمام حالات کا پورا علم ہے۔ اور اس کے ہر حکم اور ہر تدبیر میں حکمت ہے۔ تو اب اگر اس کے حکم کی اطاعت نہ کرو گے۔ تو ہدایت سے محروم اور پہلوں کے بھی مخالف اور اللہ کی رحمت و مغفرت سے محروم رہو گے۔ گزشتہ احکام یعنی زنا لواطت کی حرمت، محارم کا بیان، مہر کی ادائیگی اور حقوق الزوجین اور بعض سزائیں چونکہ بعض طبائع پر گراں تھیں لہٰذا ان تین آیات میں ان کی مزید تاکید فرما دی گئی ہے۔

یہ مختلف قیدیں جو پہلے گزریں ان سے مطلوب تم پر رحمت فرمانا ہے۔ اس لئے اللہ نے ان قیدوں کی نسبت حکم فرمایا اور جو لوگ اپنی شہوتوں پر فریفتہ ہیں۔ وہ البتہ یہی چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستے سے دور جا پڑو اور گمراہ ہو جاؤ۔ یعنی انہی کی طرح تم بھی شہوات کے پیچھے پڑ جاؤ۔

انسان کو اللہ نے ضعیف بنایا ہے۔ اس کو خوب معلوم ہے کہ یہ اپنی شہوات و مرغوبات سے

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۱۲
[2] فوائد القرآن ص ۱۰۶، تفسیر ماجدی ص ۱۸۸-۱۸۹، تفسیر حقانی ص ۱۸۳ ج ۲، تفسیر ابن کثیر ج ۵ ص ۱۰،

Marfat.com

کہاں تک صبر کر سکتا ہے۔ تو اس لئے ہر حکم میں تخفیف کا بھی لحاظ فرمایا گیا ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ انسان کے حق جو مفید دیکھا وہ اُس کے ذمہ لگا دیا سہل ہو یا دشوار۔ مثلاً عورتوں اور شہوت سے صبر کرنا آدمی کو بہت دشوار تھا۔ اس لئے اس کی خواہش کو پورا کرنے کیلئے اللہ نے جائز طریقے تبلا دیئے تاکہ ان سے وہ اپنا مطلب پورا کر سکے یہ نہیں کہ تقاضائے شہوت سے بالکل روک دیا گیا ہو حق تعالےٰ نے اپنی رحمت سے شریعت میں تنگی نہیں رکھی تاکہ کوئی حلال کو چھوڑ دے اور حرام کی طرف دوڑ دے۔ خلاصہ ان آیتوں کا یہ نکلا کہ نفس کو شہوات سے بچانا اور ان تمام قیدوں کا پابند ہونا جو عورتوں کے بارے میں مذکور ہوئیں ہرگز دشوار امر نہیں اور ان کی پابندی نہایت ضروری اور سراسر مفید ہے۔

انسان جسم اور ارادہ کے لحاظ سے کمزور ہے، چنانچہ شریعت کے سارے احکام میں اس کی سہولتوں کا لحاظ رکھ لیا گیا ہے۔ جتنے بھی احکام شرعی ہیں سب انسان کے ضعفِ جسمانی وضعف ارادی کی رعایت سے ہیں۔

مجوس، یہود، عیسائی، مشرکین وملاحدہ میں بڑی آزادی ہے۔ خدا تمہارے لئے آسانی کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ انسان جبلّی طور پر خواہش کے ساتھ مقابلہ کرنے میں نہایت کمزور ہے۔ بہت سے لوگ دیو شہوت کے مقابلہ میں ذرا بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ انسان کے لئے جس طرح شتر بے مہار ہو کر لذات وشہوات میں آزادانہ کام جوئی وکامرانی کرنا بلا قید حلال وحرام اور پاک وناپاک بہائم جیسی زندگی ہے۔ جیسا کہ یورپ کی قوموں میں یورپی مذہب سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح مباح اور جائز اشیاء کو بھی از خود اپنے اوپر حرام کر کے معیشت کے دائرہ کو تنگ کر لینا ہے، جیسا کہ ہنود میں برہمنوں نے کر رکھا ہے۔ ان کے چچا، ماموں، خالہ، پھوپھی کی بیٹی سے نکاح ممنوع غیر کا ہاتھ لگ جانے سے کھانا، پینا ناپاک، بغیر نہائے خونی سردی ہو یا گرمی، جنابت ہو یا نہ ہو، کھانا پینا ممنوع۔ یہ کام حضراتِ انبیاء کا ہے۔ کہ ہر چیز کی علت وحرمت کا روحانی وجسمانی نتیجہ وہی سمجھ سکتے ہیں۔ جن قوموں نے یہ اوروں کے سپرد کیا وہ گمراہ ہو گئیں۔ اسلام نے یہ خدمت حضراتِ انبیاء بالخصوص جناب خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص رکھی۔ اس لئے وہ افراط وتفریط سے پاک رہا۔ مگر افسوس دوسروں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی ہزاروں بے جا تشریعی عقیدے اور رسم ورواج آ گئے۔ اور وہ بھی تعزیہ پرستی، قبر پرستی، فال اور ٹوٹکوں کی پابندی کرنے لگے ہیں۔

انسانی کمزوری کے پیش نظر ہی شبِ معراج میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰؑ کے مشورہ سے بار بار اصرار والتجا کر کے ۵۰ نمازیں معاف کرائی تھیں۔ اور صرف پانچ باقی رہ گئی تھیں۔

Marfat.com

سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ : یہ معاشرت، اخلاق اور تمدّن کے قوانین وہ ہیں جن پر قدیم زمانہ سے ہر دور میں انبیاء اور ان کے صالح پیرو عمل کرتے چلے آئے ہیں اور یہ اللہ کی عنایت و مہربانی ہے کہ وہ تمہیں جاہلیت کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقۂ زندگی کی طرف تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔

شرائع اور تکالیف شرعیہ اگرچہ لوگوں کے اجتماعی احوال اور زمانوں کے اختلاف سے مختلف ہوتی رہی ہیں۔ لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۔ مگر وہ انسانوں کی مصالح عامہ کی رعایت میں متفق رہی ہیں۔ کیونکہ تمام آسمانی ادیان و شرائع کی روح اللہ کی توحید و عبادت اور اس کے سامنے سرافگندگی رہی ہے۔ عبادات کی تفاصیل و صور مختلف ہو سکتی ہیں۔ مگر نتیجہ سب کا ایک ہے۔ یعنی تزکیۂ نفس، تہذیب اخلاق اور اعمال و معاملات کی درستی۔

بندوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ رحم اور فضل و کرم ہے کہ صرف وہی چیزیں حرام کی گئی ہیں۔ جن کی اباحت میں بہت بڑا مفسدہ اور عظیم ضرر تھا۔ مثلاً زنا۔ جب کبھی دین کی گرفت کمزور ہوئی تو زنا پھیل جاتا رہا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ اس کا پہلا سبب مردوں کی عورتوں پر زیادتی رہی ہے۔ وہی ہمیشہ انہیں برباد کرتے رہے ہیں اور مال و دولت کا لالچ دے کر بدکاری پر آمادہ کرتے رہے ہیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ کہ آدمی اپنی عورت پر پابندی لگائے، اسے حجاب میں رکھے مگر دوسروں کی عورتوں اور بیٹیوں کو برباد کرنے کے حیلے تلاش کرے اور انہیں فحاشی و عریانی پر اُبھارے۔ افسوس انسان کتنا جاہل و مغرور ہے۔

اس دور میں تو فسق و فجور اتنا بڑھ گیا ہے۔ کہ اب لوگ اسے فیشن ہی نہیں بلکہ دانائی سمجھنے لگے ہیں ان کی غیرت مردہ ہو گئی ہے۔ اور انہوں نے عورتوں کے سارے بند کھول دیئے ہیں اب وہ عورتیں خود بھی کسی پابندی کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ ازدواجی زندگی کے روابط ڈھیلے ہو کر اب ٹوٹ رہے ہیں گھروں کی سعادت کو گھن کھا گیا ہے۔ رذالت نے گھروں اور خاندانوں میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ حالت تو یہ ہو گئی ہے کہ لوگوں کو آئندہ نسل پر بھروسہ نہیں رہا کہ آیا وہ واقعی ان کی بھی ہے یا نہیں! امراض بڑھ گئے ہیں۔ اور جسمانی و روحانی خباثتیں پھیل گئی ہیں۔

امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: قرآن کی آٹھ آیتیں ایسی ہیں۔ جو اس امت کے لئے ساری کائنات سے بہتر ہیں۔ تین آیتیں تو یہ جو اس

لہ تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴، سہ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۱۴، ۱۵، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۲۸، ۳۵،

Marfat.com

وقت زیر تفسیر ہیں۔ چوتھی آیت :۔ وَاِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ : پانچویں آیت :اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ :چھٹی آیت : وَمَنْ يَّفْعَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ ساتویں آیت :اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۔ آٹھویں آیت: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۔"

اُن آیات میں صراحۃً انسانی ضعف کا لحاظ کر کے احکام میں تخفیف کا اعلان فرمایا ہے اس تخفیف کو ہم اسلامی قانون کے ہر حکم اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں ضوابط و قوانین میں کارفرما دیکھتے ہیں۔ اس کی واضح مثال گذشتہ خاندانی اور ازدواجی احکام ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے لوگوں کا خیال ہے۔ خدائی قانون کی پابندی بالخصوص جنسی زندگی کے احکام میں مشکل ہے۔ مگر شہوت پرستوں کا ساتھ دینا اور خواہشات کی غلامی آسان اور باعث راحت ہے۔ یہ سراسر وہم و گمان بلکہ دھوکہ فریب ہے۔ ہر قسم کی پابندیوں کو توڑ کر نکل جانا اور لذت پرستی بظاہر بڑی خوشنما اور دلکش چیز نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ نہایت مشکل، بہت بڑا بوجھ اور فرد و اجتماع کے لئے باعثِ عذاب ہے۔ یہ عذاب صرف آخرت سے مخصوص نہیں بلکہ اس دنیوی زندگی میں بھی ملتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت نام نہاد "آزاد معاشروں" کے حالات سے مل سکتا ہے۔

مٹنے والی تہذیبوں میں سے جس کا بھی عمیق مطالعہ کریں، آزاد جنسی تعلقات اور حیوانی شہوات ہی ان کی بربادی کا سب سے بڑا باعث ہوئے تھے۔ یونانی تہذیب ہو یا رومی، مصری تمدن ہو یا ایرانی ان سب کی تباہی اسی عفریتِ شہوت کے ہاتھوں ہوئی۔ مسلمان بھی دورِ زوال میں شہوات کی غلامی کے باعث ہی سیاسی، معاشی، علمی و عملی اور جنگی لحاظ سے کمزور ہو گئے تھے۔ موجودہ تہذیب کی جڑوں میں بھی یہی گھن لگا ہوا ہے۔ جو امید واثق ہے کہ ایک دن اس عظیم و مہیب عمارت کو دھڑام سے نیچے گرا دے گا۔ فرانس میں اس تباہی کے آثار واضح تر ہیں۔ جن کے باعث وہ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے سامنے فوراً گھٹنے ٹیک گیا تھا۔ اب یہی آثار و علامات برطانیہ و امریکہ میں نظر آنے لگے ہیں۔ (شیر برطانیہ تو اب عمر کے آخری دنوں میں ہے۔ مگر امریکہ بھی زناکاری اور شراب خوری کی گرفت میں ہے۔ اس کی فوج دنیا کے کسی میدانِ جنگ میں شجاعت اور جذبے سے نہیں لڑ سکتی۔ محض سائنس کی ایجادات سے لڑتی ہے۔ عورت اور نشہ امریکی سپاہی کی کمزوری ہے۔

فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۳۰، ۲۸

Marfat.com

حد یہ ہے کہ چاند پہ سب سے پہلے قدم رکھنے والے امریکی نیل آرمسٹرانگ نے وہاں جاکر بھی اگر کسی چیز کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ درختِ زرتھی! زدقؔ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ:

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی! مؤلف)

فرانس کی شہوت رانیوں کے نتائج بالکل واضح ہیں۔ ۱۸۷۰ء سے لے کر اب تک کسی جنگ میں اس نے فتح نہیں پائی، ہر جگہ اور ہر موقع پہ منہ کی کھائی ہے۔ عوام و خواص کے ذہنی و جسمانی قویٰ زنگ خوردہ ہیں، اعصاب کمزور ہیں، خطرناک بیماریوں کی بھرمار ہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء سے آج تک برابر فوجیوں کی صحت کا معیار برابر قانوناً گھٹایا جارہا ہے۔ کیونکہ عملاً کوئی مطلوب معیار قائم رہ ہی نہیں سکتا۔ صحت منداور مضبوط جوان روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ صرف یہی ایک چیز پیش نظر رکھیں تو اسے بھی فرانسیسی قوم کی معاشرتی و اخلاقی حالت کا بیرومیٹر بنایا جاسکتا ہے۔ خدا جانے معاملہ کہاں جاکر تھمنے والا ہے۔ مشہور فرانسیسی ڈاکٹروں کا قول ہے کہ ان کے ملک میں آتشک سوزاک جیسے امراض سے مرنے والوں کی تعداد تیس ہزار سالانہ ہے۔ ایک ہزار میں سے صرف سات یا آٹھ افراد نکاح کرتے ہیں۔ باقی کا گذارہ بدکاری اور عیش پرستی پر ہے۔ ان نکاح کرنے والوں میں بھی کثرت ان کی ہے۔ جو اپنی نکاح سے قبل پیدا شدہ حرامی اولاد کو بدنامی اور نفرت و حقارت کے داغ سے بچانا اور بعض قانونی تقاضے پورے کرنا چاہتے ہیں۔ فرانس کے مزدوروں میں یہ بات عام ہے کہ نکاح سے پہلے عورت مرد سے یہ پختہ عہد لیتی ہے۔ کہ اس کی پہلی حرامی اولاد کو بھی یہ مرد اپنی قانونی اولاد مان لے گا! پھر بعض دفعہ نکاح کے بعد زوجین کی ملاقات تک نہیں ہوتی اور وہ الگ الگ عیش کرتے رہتے ہیں۔ نکاح محض ایک قانونی آڑ اور حربہ ہے۔

پیرس کے ایک مشہور کالج کے پرنسپل کا قول ہے۔ کہ یہاں عام جوان نکاح اس لئے کرتے ہیں تاکہ جس فاحشہ عورت سے وہ اب تک ناجائز تعلقات رکھے ہوئے تھے۔ اور اب اتنے عرصے کے بعد وہ تعلقات بند نہیں سکتے اسے نکاح میں لے آتے ہیں۔ تاکہ گھر میں وہی سلسلہ جاری رکھ سکیں جو پہلے باہر جاری تھا۔

کم و بیش سویڈن کا بھی یہی حال ہے۔ کہ خاندانی نظام بکھر چکا ہے۔ اور نوبت یہاں تک آپہنچی ہے۔ کہ بعض مفکرین کے قول کے مطابق وہاں حلال زادوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، نکاح کی رسم کم سے کم تر ہو چکی ہے۔ اور حرامی بچوں کی تعداد "معاشرتی و معاشی مسائل" میں سے ہے، بیس فی صدی قابل نکاح مرد عورتیں کبھی بھی شادی نہیں کرتے نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں ۱۸۷۰ء میں غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد ۱ فی صدی تھی جو بڑھ کر ۱۹۲۰ء میں ۱۶ فی صد ہو گئی۔ بعد کے اعداد و شمار نہیں مل سکے۔ خدا جانے اب کیا حال ہوگا؟

Marfat.com

اعداد و شمار بتاتے ہیں، کہ مرد عموماً سویڈن میں ۱۸ سال کی عمر میں اور عورتیں ۱۵ سال کی عمر میں جنسی لذت چکھ چکے ہوتے ہیں اکیس سال کی عمر تک ۲۵ فیصدی بالغ مرد عورتیں جنسی تعلقات میں ماہر ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان ناجائز تعلقات میں سے ۷ فی صدی کورٹ شپ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ۳۵ فی صدی عام دوستیوں کا نتیجہ۔ پھر ۸۵ فی صدی کیس "اتفاقی عبوری دوستی" کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بلیس سال کی عمر سے پہلے پہلے ۲ فی صدی عورتیں خاوند والی ہوتی ہیں، ۲۷ فی صدی کورٹ شپ سے لذت آشنا ہوتی ہیں اور ۶۴ فیصدی "اتفاقی عبوری دوستی" کا شکار ہو چکتی ہیں۔

سویڈن کی تحقیقاتی انجمنوں کے بیان کے مطابق وہاں کی ۸۰ فیصدی عورتیں نکاح سے قبل جنسی تعلقات کا پورا تجربہ کر چکی ہوتی ہیں۔ اور ۲۰ فیصد ہمیشہ بے نکاح رہتی ہیں! اب وہاں لمبی عمر تک کنوارا رہنے اور کافی دیر سے نکاح کرنے کا رجحان ترقی پر ہے۔ بعض دفعہ کورٹ شپ کی مدت بہت طویل ہو جاتی ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر حرامی بچوں کی کثرت ہو رہی ہے۔ پھر ہر چھ سات نکاح میں سے ایک کا نتیجہ طلاق ہوتا ہے اور یہ تناسب ——— روز بروز بڑھ رہا ہے، ۶۰ فیصدی نکاح محض ناجائز حمل کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اور چونکہ طلاق کے بعد فریقین پر کوئی ذمہ داری نہیں رہتی (حرامی بچے حکومت پالتی ہے۔) لہٰذا اکثر طلاق ہو جاتی ہے۔

سکنڈے نیویا کے ممالک میں زنا اور شراب کی کثرت ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا باعث (الحاد) اشتراکی پروپیگنڈہ اور مذہب سے انحراف ہے۔ ۱۵ اور ۱۷ سال کے درمیان شراب خوری اور بدکاری کے واقعات عام ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دس فی صدی نوجوان جنون کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور دیگر تمام امراض کے مقابلہ میں ۵۰ فی صدی کیس جنون کے ہیں۔

امریکہ میں بھی حالت اس سے بہتر نہیں مگر ابھی یہ قوم بُرے نتائج سے غافل ہے۔ تو نظر آرہا ہے کہ عنقریب یہ بھی ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ میں فوجی راز دشمنوں کے ہاتھوں فروخت کرنے والے اکثر جنسی عواطف کا شکار ہو کر ایسا کرتے ہیں امریکہ کی بعض ریاستوں میں زناکاری کے الزام اور ثبوت کے بغیر طلاق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ چیز بھی زنا کی کثرت کا باعث ہے۔ چند سال پہلے امریکی پولیس نے وکیلوں اور ڈاکٹروں کی ایک خاصی جماعت کو اس الزام میں گرفتار کیا تھا۔ کہ وہ طلاق کے طالبوں کو زنا کروا کے چھٹکارے کی صورت پیدا کرنے کے مجرم تھے۔

اور یہ بات تو ڈھکی چھپی نہیں کہ امریکہ کی کئی انجمنیں صرف یہ کام کرتی ہیں۔ کہ بھاگ جانے والے خاوندوں یا بیویوں کا پتہ چلانے میں مدد دیں۔ کیونکہ کسی جوڑے کو معلوم نہیں ہوتا کہ دوسرا فریق کب کسی عاشق یا معشوق کے ساتھ فرار ہو جائے گا۔ اور اس چیز نے گھروں کے سکون کو برباد کر رکھا ہے۔

Marfat.com

ایک مرتبہ امریکہ کے ایک صدر نے کہا تھا کہ امریکہ کے ہر سات جوانوں میں سے چھ بداخلاقی اور جسمانی کمزوری کے باعث فوجی خدمت کے قابل نہیں ہوتے۔

ایک امریکی رسالے نے تقریباً ۲۵ سال قبل لکھا تھا کہ!

"آج کل دنیا میں تین شیطانی عوامل ایسے ہیں جن کی تثلیث نے ہماری دنیا کو گھیر رکھا ہے۔ ان میں سے پہلا فحش لٹریچر ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد سے بدکاریوں کو بڑھا رہا ہے۔ دوسرا سبب سینما کی فلم ہے جو لوگوں میں صرف شہوت رانی کے جذبات ابھارتی ہے۔ تیسرا سبب عورتوں کی عریانی، چست لباس، کثرت سے نشہ اور سگریٹ کی عادت اور مردوں سے کھلا میل جول ہے۔ ان کا نتیجہ عیسائیت اور تہذیب حاضر کی تباہی ہے۔ اگر ہم باز نہ آئے تو ہمارا حشر بھی رومیوں جیسا ہوگا۔ یا ان دوسری قوموں جیسا جنہیں شہوت و لذت نے مٹا کر رکھ دیا تھا۔

آج امریکہ میں بھنگ، چرس، گانجا اور کوکین کا نشہ عام ہو رہا ہے۔ برطانیہ میں بدکاری کے علانیہ واقعات دن کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ نوعمری کا زنا عام ہے۔ امریکہ میں ۹۰ فیصدی لوگ مہلک اور خطرناک امراض کا شکار ہیں۔"

یہ تہذیب نو کی "اخلاقی فتوحات" کی ایک ہلکی سی تصویر ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی بدقسمت انسان یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ اسلام کے معاشرتی و عائلی احکام شدید ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ

اے ایمان والو نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے ناحق

بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً

مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ

خوشی سے اور نہ خون کرو آپس میں

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ

بیشک اللہ تم پر مہربان ہے اور جو کوئی یہ کام

Marfat.com

ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ

کرے تعدی اور ظلم سے تو ہم اس کو ڈالیں گے

نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾

آگ میں اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

شرح الفاظ

بِالْبَاطِلِ :۔ اس میں ہر ناجائز معاملہ مثلاً غصب، سرقہ، فریب، سود وغیرہ داخل ہے۔ تَرَاضٍ : باہمی رضامندی جو برابر کی سطح پر ہو اور جس میں کسی کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھایا گیا ہو جیسا کہ سود میں ہوتا ہے۔ عُدْوَانًا :۔ تعدّی کرنا، حدود الٰہی سے تجاوز کرنا اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنا ظُلْمًا : حق تلفی کرنا۔ نُصْلِيْهِ : اِصْلَاءٌ کا معنیٰ ہے۔ آگ میں ڈالنا، تلنا، بھوننا۔

گذشتہ مالی، وراثتی اور معاشرتی احکام کے بعد ان آیات میں باہمی تعامل کا ایک عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ جسکا تعلق روزمرہ کی کاروباری زندگی سے ہے۔ اور جو معاشرہ کے امن وسلامتی کا ضامن ہے۔

مطلب[1] یہ ہے کہ کسی کو کسی کا مال ناحق کھا لینا مثلاً جھوٹ بول کر یا دغابازی سے یا چوری سے ہرگز درست نہیں۔ ہاں اگر سوداگری یعنی آپس میں تم خرید و فروخت کرو باہمی رضامندی سے تو اس میں تو کچھ حرج نہیں، اس مال کو کھالو، اس کا خلاصہ وہی نکلا کہ جائز طریقے سے لینے کی ممانعت نہیں جو مال کو ترک کرنا تم پر دشوار ہو اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے۔ کہ بلاوجہ کسی کے مال وجان میں تصرف کرنے کو منع فرما دیا اور تم پر ایسے احکام بھیجے جن میں سراسر تمہارے لئے بہبودی اور خیریت ہے۔

اور جو ظلم وزیادتی سے باز نہ آئے گا بلکہ ناحق دوسروں کا مال کھائے گا یا ظلماً کسی کو قتل کر ڈالے گا تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور ایسے ظالموں کو آگ میں ڈال دینا اللہ تعالیٰ کو دشوار نہیں، بالکل سہل اور آسان ہے۔ تو اب کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ہم تو مسلمان ہیں دوزخ میں کیسے جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مالک ومختار ہے۔ اس کو عدل وانصاف سے کون سی چیز روک سکتی ہے؟

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۶، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۹، تفسیر ابن کثیر پ۵ صفحہ ۱۰، ۱۲، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۸۴

Marfat.com

لا تقتلوا انفسکم : اس کا دوسرا معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ خودکشی نہ کرو (مدارک بیضاوی)
بعض مذاہب میں خودکشی خود ایک عبادت رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ جاپانیوں میں بعض قدیم ہندی مذہبوں میں اور اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ باہم حرام خوری کر کے اور احکام شرع کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ (ابن کثیر)
آیت ۳۰ کی وعید ان لوگوں کے لئے ہے۔ جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی اتفاقی طور پر یا بطور خطائے اختیاری کے نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ کر رہے ہیں۔
"باطل طریقوں" سے مراد وہ تمام طریقے ہیں۔ جو خلافِ حق ہوں اور "شرعاً و اخلاقاً" ناجائز ہوں۔ "لین دین" سے مراد یہ ہے۔ کہ آپس میں مفاد و منافع کا تبادلہ ہونا چاہیئے۔ جسطرح تجارت صنعت و حرفت وغیرہ میں ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کی ضروریات فراہم کرنے کے لئے محنت کرتا ہے۔ اور دوسرا اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ "آپس کی رضامندی" سے مراد یہ ہے کہ لین دین نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ فریب و دغا سے۔ رشوت اور سود میں بظاہر رضامندی نظر آتی ہے۔ مگر فی الواقع وہ رضامندی مجبورانہ ہوتی ہے۔ نیز وہ دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جوئے میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے۔ مگر درحقیقت جوئے میں حصہ لینے والا ہر شخص اس غلط امید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی۔ ہارنے کے ارادے سے کوئی بھی راضی نہیں ہوتا۔ جہل اور فریب کے کاروبار (مثلاً لاٹری وغیرہ) میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے۔ مگر وہ اس غلط فہمی کی بناء پر ہوتی ہے۔ کہ اندر جہل و فریب نہیں ہے۔ ورنہ اس میں کوئی نہ پھنسے۔
ان آیات[1] سے اسلام کے مالی معاملات میں چند قواعد کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو یہ ہیں:
(۱)۔ اموالکم : کے لفظ سے پتہ چلا کہ انفرادی ملکیت کے حق کے باوجود حق و مصالح میں ساری امتِ مسلمہ باہم متکافل ہے۔ یعنی ایک کا مال گویا سب کا مال ہے۔ لہٰذا اگر ایک نے دوسرے کے مال پر دست درازی کی تو گویا سب پر ظلم کیا اور اضطراب کی راہ کھول دی۔ فرد کا مال اور اس کے حقوق محفوظ ہیں۔ اور اس کی ملکیت مسلّم ہے، مگر اسلام نے مالداروں پر امت کی عام مصلحت کیلئے بہت سے فرائض رکھے ہیں۔ یہ فرائض زیادہ مال والوں پر زیادہ ہیں اور کم مال والوں پر کم ہیں۔ ان حقوق و فرائض کے ساتھ ساتھ وہ نیکی، احسان اور صدقہ کی ہر وقت تلقین کرتا ہے۔ اس کے معاشی احکام

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۴۵۔
[2] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۱۶، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۳۸، ۴۶،

Marfat.com

کی اگر پابندی ہو تو بلادِ اسلام میں کوئی بھوکا، ننگا، مجبور و مضطر نظر نہ آئے۔ کیونکہ اسلام سب لوگوں کی حقیقی و بنیادی ضروریات کو پورا کرنا فرض قرار دیتا ہے۔ اس میں مسلم و غیر مسلم کا بھی فرق نہیں۔

مال داروں کے مال کا ایک معین حصّہ تو بیت المال میں جمع ہوتا ہے۔ تاکہ اجتماعی ضروریات پر خرچ ہو، لیکن اس کے علاوہ بھی اسلام نے بذل و انفاق کی ترغیب دی ہے، اور بخل و امساک کو مبغوض و مکروہ ٹھہرایا ہے۔ سخاوت، مروت اور رحمت کے جذبات کو ابھارا ہے۔ یہی باعث ہے کہ دار الاسلام میں مقیم ہر فرد محسوس کرتا ہے کہ امت کا مال اسی کا مال ہے۔ اور وہ حسب ضرورت ہر وقت اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(۲) اسلام نے حاجت مندوں کے لئے یہ روا نہیں رکھا کہ مالداروں سے ان کے اذن کے بغیر کچھ لے لیں، مبادا امت کے افراد میں سستی اور آوارگی پھیل جائے، اموال کی حرمت جاتی رہے۔ انتشار و اضطراب برپا ہو جائے، اور کاروبار ٹھپ ہو جائیں۔ کیونکہ اس کا نتیجہ اخلاق و آداب میں فساد اور بدنظمی کی صورت میں نکلے گا۔

اسلام کے معاشی و معاشرتی اصول متوازن ہیں اور ان کی بنیاد امن و سلامتی پر ہے اگر مسلمان ان پر عمل کریں تو طبقاتی جنگ اور باہمی نفرت و حسد اور بغض سے محفوظ رہیں بلکہ دوسروں کے لئے بہتر نمونہ بن جائیں۔

(۳) حلال تجارت کا مدار فریقین کی رضامندی پر ہے لہٰذا دھوکا، فریب، جھوٹ، ملمع سازی حرام ہے۔

(۴) دنیاوی معاملات فانی ہیں۔ ان میں الجھ کر اعلیٰ و ارفع مقاصد حیات سے غافل ہو جانا عقلمندی نہیں۔

(۵) تجارت اور کاروبار کی اکثر اقسام میں باطل کی آمیزش ممکن ہے۔ لہٰذا اس میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر فریب اور ملمع سازی نہ ہو بلکہ مال کی صفائی، آرائش، تاجر کی خوش خلقی اور بہتر سلوک سے گاہک اس کی طرف متوجہ ہوں تو یہ معاملہ جائز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ گاہک کو ایک جگہ سے کم قیمت پر سودا مل سکتا ہو مگر ایک تاجر اپنی دانائی اور حسنِ سلوک سے متاثر کر کے اس سے کچھ مزید نفع لے رہا ہو (بشرطیکہ فریب اور جھوٹ نہ ہو) تو یہ بھی جائز ہوگا۔ کیونکہ اگر اس کی بھی اجازت نہ ہوتی تو تجارت بند ہو جاتی اور کاروبار میں حرج واقع ہوتا جو مقاصد اسلام کے بالکل خلاف ہے۔

اِلّا ان تکون تجارۃً : یہاں الّا کا استثنا بقاعدہ نحو استثنائے منقطع

لہ فی ظلال القرآن جلدہ صفحہ ۴۱۔

Marfat.com

ہے۔ مطلب یہ ہے کہ: ولکن اذا کان تجارۃً: یعنی باہمی رضامندی سے جو تجارت ہے۔ وہ اس اوپر کے حکم سے خارج ہے۔ تجارت اور سود میں واضح فرق ہے۔ تجارت سے غرض اشیاء کی خرید و فروخت اور کاروبار کا فروغ ہے۔ اس میں نفع و نقصان دونوں کی توقع برابر ہے۔ سود سے غرض خالص سرمایہ داری ہے۔ تاکہ چند آدمیوں کا مال بلا عوض بڑھے۔ اس میں ایک فریق (سود خوار) کا نفع ہی نفع ہے۔ اور دوسرے فریق (گاہک) کا سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ پہلی چیز انسانی معاملات کے لئے ناگزیر ہے۔ اور دوسری انسانیت پر ایک بوجھ، اس بوجھ نے سوائے خباثت اور فتنہ و فساد کے انسان کو کچھ نہیں دیا۔ اور یہ بس کی گانٹھ ہے اسے جتنی جلدی ختم کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ

اگر تم بچتے رہو گے ان چیزوں سے جو گناہوں میں بڑی ہیں، تو ہم معاف کر دیں گے

سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

تم سے چھوٹے گناہ تمہارے اور داخل کریں گے۔ تم کو عزت کے مقام میں۔

شرحِ الفاظ

تجتنبوا: اجتناب کا معنیٰ ہے۔ کسی چیز کو ایک جانب چھوڑ دینا۔ کبائر: کبیرہ کی جمع ہے۔ جس کا معنیٰ ہے۔ عظیم معصیت۔ سیئاتکم: سیئۃ کی جمع ہے۔ یعنی وہ فعل جو کرنے والے کو جلد یا بدیر برا لگے۔ یہاں کبائر کے مقابلہ کی وجہ سے اس سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ نکفر: ہم بخش دیں گے۔ مُدْخَلًا کریمًا: باعزت و تکریم جگہ یعنی جنت۔

اوپر کی آیات میں باطل طریقے سے لوگوں کے مال کھانے اور قتلِ نفس سے منع فرمایا گیا ہے۔ حقوق العباد میں یہ دونوں سب سے بڑے گناہ ہیں۔ کیوں کہ ان سے مال و جان کی حرمت ٹوٹتی ہے۔ اس آیت میں تمام کبائر سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ ان کا ضرر بہت بڑا ہے اور وہ اپنے کرنے والے کے ضعف ایمان کی دلیل ہیں۔

اس آیت میں گناہوں سے بچنے کی ترغیب اور بچنے پر وعدہ مغفرت اور جنت کی [1]

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۶

Marfat.com

اور طمع دلائی جاتی ہے۔ تاکہ اس کو معلوم کرکے ہر آدمی گناہوں سے احتراز کرنے کی کوشش کرے۔ اور معلوم ہو جائے کہ جو کبیرہ گناہ مثلاً کسی کا مال غصب کرنا، یا سرقہ کرنا یا کسی کو ظلماً قتل کرنا سے بچ گیا جن کا ذکر ابھی گذرا تو اس کے وہ تمام صغیرہ گناہ بخشے جائیں گے۔ جن کا مرتکب بغرض تحصیل و تکمیل سرقہ و قتل ہوا تھا۔ اس آیت میں چند باتیں بحث طلب ہیں۔ مگر اصل سب کی یہی ہے کہ آیت کا اصلی اور عمدہ مطلب معلوم ہو جائے، جس سے تمام امور کا جان لینا سہل ہو جائے۔ سو معتزلہ اور ان کے موافقین نے سرسری طور پر اس آیت کا یہ مضمون سمجھ لیا کہ اگر کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو گے یعنی کبیرہ گناہ ایک بھی نہ کرو گے۔ تو پھر محض صغیرہ گو کتنے ہی ہوں ضرور معاف کر دیئے جائیں گے۔ اور اگر صغیرہ کے ساتھ کبیرہ اچانک یا اتفاقاً ایک یا دو بھی شامل ہو گیا تو اب معافی ممکن نہیں۔ بلکہ سب کبائر و صغائر کی سزا ضرور ہو گی۔ اور اہل سنت فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں اللہ تعالےٰ کو معافی اور مواخذہ کا اختیار بدستور ثابت و حاصل ہے۔ اوّل صورت میں معافی کا لازم ہونا اور دوسری صورت میں مواخذہ کو واجب سمجھنا معتزلہ کی کم فہمی و بدفہمی ہے۔ اور اس آیت کے ظاہری الفاظ اور سرسری مضمون سے جو معتزلہ کا مذہب راجح نظر آتا ہے۔ اس کا جواب کسی نے تو یہ دیا کہ شرط کے جاتے رہنے سے مشروط کا منتفی ہو جانا کوئی ضروری امر ہرگز نہیں۔ کسی نے یہ کہا کہ لفظ کبائر سے جو آیت میں مذکور ہے اکبر الکبائر یعنی شرک مراد لے لیا جائے اور لفظ کبائر کے جمع لانے کی وجہ شرک کے اقسام و انواع کے متعدد ہونے کو قرار دیا۔ اور اسی کے ذیل میں چند اور باتیں بھی زیر بحث آئیں مگر ہم ان سب امور کو نظر انداز کرکے صرف اس آیت کے تحقیقی اور عمدہ معنے ایسے بیان کئے دیتے ہیں۔ جو نصوص اور عقل کے مطابق اور قواعد و ارشادِ محققین کے موافق ہوں۔ اور بشرط فہم و انصاف معنی مذکور کے بعد تمام ضمنی باتیں خود بخود حل ہو جائیں۔ اور خلاف معتزلہ خود بخود مضمحل ہو کر معتزلہ کے عدم تدبر اور کم فہمی پر حجت قوی ہو جائے۔ اور اہل حق کو اس کے ابطال و تردید کی طرف توجہ فرمانے کی حاجت ہی نہ رہے سو غور سے سنیئے: یہ امر تو ظاہر ہے۔ کہ اس آیت میں جو اجتناب کبائر اور تکفیر صغائر کا بیان ہے۔ اور سورۂ نجم کی آیت الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم: ان ہر دو جگہ ارشاد الٰہی کا مدعا ایک ہے۔ صرف لفظوں میں تھوڑا فرق ہے۔ تو اب جو مطلب ایک آیت کا ہو گا۔ وہی دوسری کا ہو گا بخاری وغیرہ میں سورہ نجم والی آیت کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد صاف موجود ہے

قال ما رایت شیئاً اشبہ باللمم مما قال ابو ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ کتب علی ابن ادم حظہ من الزنا ادرک ذلک لا محالہ

Marfat.com

فزنا العین النظر وزنا اللسان المنطق والنفس تمنّی وتشھی والفرج یصدق ذلک ویکذّبہ

بشرطِ فہم اس حدیث سے ہر دو آیات مذکورہ کا واقعی اور تحقیقی مطلب معلوم ہوگیا۔ اور حضرت ابن عباسؓ حبر الامت لسان القرآن کے فرمانے سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لمم اور سیئات کا معنی ایک ہے۔ اور اس حدیث میں بیان کردہ معنیٰ سے بہتر وہ کہیں اور نہیں ہو سکتا تو اب اسی مطلب کے مقابلہ میں کوئی دوسری تقریر اس آیت کی مضمون کے متعلق کیوں کر قابل ترجیح ہو سکتی ہے؟ بالخصوص معتزلہ کی ہرزہ سرائی کیوں کر لائق التفات اور قابل جواب سمجھی جا سکتی ہے؟ واقعی حدیث مذکور کا مطلب اور حضرت ابن عباسؓ نے جو بات اس سے نکالی وہ ایسی عجیب اور قابل قبول تحقیق ہے۔ کہ جس سے مضمون ہر دو آیات کا خوب محقق ہو جاتا ہے۔ اور معتزلہ کے خرافات کی گنجائش اور اہل حق کو اس کے جواب کی اور تردید کی ضرورت بھی نہیں رہتی اور ذیل وضمنی اقوال واختلاف بھی بہت خوبی سے طے ہو گئے۔ چنانچہ اہل فہم بادنیٰ تأمل سمجھ سکتے ہیں۔ بفرض توضیح حدیث ہم بھی اس کا خلاصہ عرض کئے دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت سورۂ نجم میں جو لفظ لمم فرمایا گیا ہے۔ جس کی معافی کا وعدہ کیا ہے۔ اس کی تعیین اور تحقیق کے لیے حدیث ابی ہریرہؓ سے بہتر ہم کو کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے ذمہ پر جو زنا کا حصہ مقرر فرما دیا ہے وہ ضرور اس کو مل کر رہے گا۔ سو فعل زنا میں آنکھ کا حصہ دیکھنا ہے۔ ——— اور زبان کا حصہ یہ ہے کہ اس سے وہ باتیں کی جائیں جو فعل زنا کے لئے مقدمات واسباب ہوں۔ اور نفس کا حصہ یہ ہے کہ زنا کی تمنا اور اس کی خواہش کرے۔ لیکن فعل زنا کا ثابت ہونا اور واقع ہونا نہ ہونا دراصل شرمگاہ پر موقوف ہے۔ یعنی اگر فرج (شرم گاہ سے) زنا کا صدور ہو گیا تو آنکھ، زبان، دل سب کا زانی ہونا محقق ہو گیا اور اگر باوجود جملہ اسباب وذرائع صرف فرج سے فعل کا تحقق نہ ہوا بلکہ زنا سے توبہ اور اجتناب نصیب ہو گیا۔ تو اب تمام وسائل زنا جو کہ فی نفسہٖ مباح تھے فقط زنا کی تبعیت کے باعث زنا قرار دیئے گئے تھے وہ سب کے سب لائق مغفرت ہو گئے۔ یعنی ان کا زنا ہونا باطل ہو گیا اور ان کا قلب ماہیت ہو کر بجائے زنا عبادت بن گئی۔ کیونکہ فی نفسہٖ تو وہ افعال نہ معصیت تھے نہ عبادت، بلکہ مباح تھے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ زنا کا وسیلہ بنتے تھے۔ معصیت میں داخل ہو گئے تھے۔ جب وہ زنا کے لئے وسیلہ نہ رہے بلکہ زنا ہی بوجہ اجتناب معلوم ہو چکا تو اب ان وسائل کا زنا کے ذیل میں شمار ہونا اور ان کو معصیت قرار دینا انصاف کے صریح خلاف ہے۔ مثلاً ایک شخص مسجد میں پہنچا چوری کے خیال سے، مگر وہاں جا کر عین موقعہ پر تنبہ پیش آیا اور

Marfat.com

چوری سے توبہ کی اور رات بھر اللہ کے واسطے نماز پڑھتا رہا تو ظاہر ہے۔ کہ جو رفتار سرقہ کا ذریعہ نظر آتا تھا۔ وہ اب توبہ اور نماز کا ذریعہ بن گیا۔ تو اس حدیث ابوہریرہؓ کو سن کر عبداللہ بن عباسؓ سمجھ گئے۔ کہ لمم وہ باتیں ہیں۔ جو دراصل گناہ نہیں مگر گناہ کا سبب ہو کر گناہ بن جاتی ہیں۔ تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ وہ لوگ جو بڑے گناہ اور کھلے گناہ سے تو بچتے ہیں ہاں صدور کی نوبت آجاتی ہے۔ مگر بڑے اور اصل گناہ کے صدور سے پہلے ہی وہ اپنے قصور سے تائب اور مجتنب ہو جاتے ہیں۔ تو اب ابن عباسؓ نے جیسے حدیث ابوہریرہؓ سے آیت سورۂ نجم کا مطلب سمجھ لیا ہم کو چاہیئے کہ وہی معنی حسب ارشاد ابن عباسؓ ہم آیت سورہ نساء کے لیں بے تکلف سمجھ لیں جس کے بعد بحمداللہ نہ ہم کو اس کی ضرورت ہوگی کہ اس آیت کی توضیح میں گناہ کبیرہ اور صغیرہ کی مختلف تفسیریں نقل کریں۔ اور نہ معتزلہ کے استدلال کے جواب کا فکر ہوگا۔ اور تکفیر سیئات کی وجہ اور دخول جنت کا سبب بھی آسانی سے حسب قواعد معلوم ہو جائے گا۔ اور اجتناب کے معنی بھی ظاہر ہو جائینگے۔ اور چھوٹی چھوٹی باتیں انشاء اللہ بشرط تدبر خود طے ہو جائیں گی۔ خلاصہ اس آیت نساء کا (اور آیت النجم کا بھی) حسب ارشاد حدیث و بیان ابن عباسؓ یہ ہوا کہ جو لوگ ان گناہوں سے رکیں گے اور ان کے ارتکاب سے نفس کو ہٹاتے رہیں گے جو گناہ کہ گناہوں کے سلسلہ میں بڑے اور مقصود سمجھے جاتے ہیں تو اس اجتناب اور رک جانے کی وجہ سے ان کے وہ برے کام جو انہوں نے کسی بڑے گناہ کے حصول کی طمع میں کئے ہیں۔ معاف کر دیئے جائیں گے اور حسب ارشاد واما من خاف مقام ربہ و نھی النفس عن الھوٰی فان الجنۃ ھی المأوٰی وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ سلسلہ زنا کے صغائر کسی دوسرے سلسلہ کے بڑے گناہ مثلاً شرابخوری نہ کرنے سے فرد گزاشت ہو جائیں گے یا شرابخوری کی وجہ سے ان کا مواخذہ لازم و واجب ہو جائے گا۔ واللہ اعلم۔

یہ قانون الٰہی ہے جس کا تکرار قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے۔ اور ایک جگہ اسے بالکل کلی اور عمومی طور پر یوں بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ (بلاشبہ نیکیاں گناہوں کو لے جاتی ہیں) اس قسم کی آیتوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ بڑے بڑے اولیاء و اتقیاء میں بھی معصوم کوئی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ان کی کثرت طاعات پر نظر مرحمت کر کے ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرما دیتا اور ان سے درگذر کرتا ہے۔ عصمت انبیاء کا مسئلہ اس ضمن میں نہیں آتا بلکہ ایک دوسرے قانون سے ثابت ہے۔ کبیرہ گناہ کی تعریف میں مشہور تابعی محدث سفیان ثوریؒ کا قول یہ نقل

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۹

Marfat.com

ہوا ہے۔ کہ کبیرہ بندوں کے اتلافِ حقوق کا نام ہے۔ اور صغیرہ صرف اللہ کے اتلافِ حقوق کا (معالم) اس ہیچمدان کے خیال میں کبیرہ وہ عمل ہے جس کی ممانعت صراحت سے قرآن مجید میں آچکی ہو، اور اس کا معصیت ہونا کسی دقیق استنباط یا دلالتِ خفی کا محتاج نہ ہو۔ یا کم از کم یہ کہ حدیث صحیح میں اس کی ممانعت صراحت اور تاکید کے ساتھ آچکی ہو۔ ممتاز صحابہؓ کے نزدیک کچھ ایسا ہی پایا جاتا ہے۔

معالم میں علیؓ المرتضیٰ سے اور ابن جریر میں ابن عباسؓ سے منقول ہے۔ کہ ہر وہ فعل و عمل جس کی سزا جہنم یا غضب الٰہی یا لعنت یا عذاب بیان فرمائی گئی ہے۔ وہ کبیرہ ہے۔ مفسر تھانوی نے فرمایا ہے کہ کبیرہ پر عتاب کے ساتھ فضل کا احتمال اور صغیرہ پر غلو کے ساتھ عتاب کا احتمال اہل حق کا خاص مذہب ہے۔ برخلاف معتزلہ کے کہ ان کے ہاں صغائر واجب المغفرت ہیں۔ اور کبائر غیر مغفورہ (کمافی المدارک)

کتاب و سنت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تین چیزیں ہیں۔ جو کسی گناہ کو بڑا (کبیرہ) بناتی ہیں :-

ا۔ حق تلفی خواہ کسی کی بھی ہو (خدا، والدین، عام انسان یا خود اپنا نفس) پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہو اسی قدر اس کی حق تلفی کبیرہ ہوگی۔ کبیرہ کو ظلم بھی کہا گیا ہے۔ اور شرک ظلم عظیم ہے۔ (کیونکہ خدا کی حق تلفی ہے۔)

ب۔ خدا سے بے خوفی اور استکبار، قصداً اس کے امر و نہی کو توڑنا، جتنا بے خوفی اور استکبار میں کوئی شدید ہوگا۔ اتنا ہی گناہ بھی بڑا ہو جائے گا۔

ج۔ بندے اور خدا یا بندے اور بندے کے باہمی روابط کو توڑنا جس کی درستی و وصل و استحکام مطلوب ہے۔ اور اس پر امن و درستی کا مدار ہے۔ جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے۔ اس کا توڑنا اتنی ہی شدت سے گناہ کبیرہ ہے۔ مثلاً بدکاری بجائے خود فساد اور بگاڑ کا سرچشمہ اور نظامِ تمدن کو خراب کرنے کا باعث ہے۔ مگر اس میں بھی کئی مراتب و مدارج ہیں۔ شادی شدہ کا زنا غیر شادی شدہ سے زیادہ شدید ہے۔ منکوحہ عورت سے بدکاری غیر منکوحہ کی نسبت شدید تر ہے۔ ہمسایہ کے ہاں بدکاری دوسروں سے زیادہ بری ہے۔ محرمات سے بدکاری دوسروں سے شدید تر ہے۔ مسجد میں اگر بدکاری ہو تو عام جگہوں کی نسبت شدید تر ہے۔ پس اسطرح کبیرہ میں بھی شدت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

کبیرہ گناہوں کی تفصیل احادیث میں آئی ہے۔ وہ یہ ہیں: شرک، قتلِ ناحق، جادو کرنا،

---

[1] تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۳۴۶، ۳۴۷

[2] تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۱۲، ۱۸،

Marfat.com

سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدانِ جہاد و قتال سے بھاگ جانا اور پاکباز عورتوں پر تہم
لگانا۔ ہجرت کر کے پھر دار الکفر کو لوٹ جانا، والدین سے بدسلوکی، کعبۃ اللہ کی حرمت
جھوٹ بولنا یا جھوٹی گواہی دینا، فقر و فاقہ کے خوف سے قتلِ اولاد کرنا، پڑوسن سے بدک
کرنا، شراب خوری، حرام خوری، جھوٹی قسم کھانا، کسی کو ماں کی گالی دینا، مسلمان پر لعنت کرنا، ت
صلوٰۃ، بلا عذر دو نمازیں جمع کرنا، خدا کی رحمت سے ناامیدی اور اس کے غضب سے بے خ
ہونا، کسی کو وصیت کے ذریعہ نقصان پہنچانا، دھوکا دینا، خیانت کرنا اور علمائے اہل تحقیق
ضابطہ اس کا یہ بیان کیا ہے۔ کہ ہر وہ کام جس پر شرعاً حد آتی ہو۔ جس پر کتاب و سنت میں بے د
اور بددیانتی کا لفظ آجائے، جسے حرام کہہ کر پکارا گیا ہو۔ فریضہ کا ترک کرنا جس پر عذاب جہن
سزا کا بیان ہو جس پر لعنت جیسے الفاظ آئے ہوں جنہیں کفر یا مہلک فرمایا گیا ہو، یہ سب کبیرہ گن

احادیث میں حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع و محل کبائر کی تعداد کم و بیش فرمائی گئی ہے
شخص نے ابن عباسؓ سے کہا کہ کبائر سات ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ وہ تو ستر سے زیادہ قریب
کیونکہ اصرار کرنے سے صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔ اور توبہ و استغفار سے کبیرہ بھی معاف ہو جا
ہے۔ ہر وہ گناہ جسے غضب کی شدت یا خواہش کے بھڑکاؤ کی حالت میں کیا جائے مگر اصل
و ایمان سلامت ہو، خدا کا خوف موجود ہو اور حرام کو حلال نہ جانا جائے وہ ان سیئات میں
ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔ کیوں کہ اگر نفس پر وہ طاری ہونے والا زبردست
نہ ہوتا تو وہ شخص اس فعل کا ارتکاب نہ کرتا، کیوں کہ وہ دین کو خدانخواستہ بنگاہِ حقارت نہیں دیک
نہ اس کے احکام کو معمولی سمجھتا ہے۔ پھر وہ ارتکاب کے بعد نادم ہوتا ہے۔ اور شدت الم سے
تائب ہو جاتا ہے۔ اس کی توبہ پختہ ہوتی ہے۔ اور عزم صمیم ہوتا ہے۔ کہ آئندہ ایسا نہ کروں گ
اس حالت میں وہ مغفرت و تکفیر کا حقدار ہے۔

اور ہر وہ گناہ جس کے ارتکاب کا باعث احکام سے لاپرواہی، نواہی سے عمداً غفلت
چاہے وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ اصرار و بلند آہنگی اور تکبر کے باعث کبیرہ ہو جائے گا مثلاً ڈنڈی
مارنے کی عادت (چاہے معمولی سی ہو) اور مسلمانوں کی عیب چینی اور ان کی طعنہ گوئی کی، عادت بھ
کبیرہ گناہ ہے۔

اسلام نہایت فطری اور آسان دین ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اخلاص کے س

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۲۱، ۲۲ تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۴۶، ۵۶
[2] فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۴۳، ۴۴۔

Marfat.com

خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس کی رضا و طاعات میں حسبِ مقدور کوشاں رہے۔ پھر بھی اگر کوئی کوتاہی اور قصور سرزد ہو جائے تو آخر انسان ضعیف ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل و کرم اور رحمت سے ڈھانپ لیتا ہے۔ مقدور بھر کوشش کی نشانی یہ ہے۔ کہ خدا کی منع کی ہوئی چیزوں میں سے کبائر سے اجتناب کیا جائے۔ کبائر کی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں ہے، احوال و ظروف سے صغائر کبائر ہو جاتے ہیں اور احادیث میں حالات و ظروف اور حاجات و ضروریات کا لحاظ کر کے بعض کبائر کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى

اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ نے تم میں سے ایک

بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ

کو دوسرے پر مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو

نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَاسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

حصہ ہے اپنی کمائی سے اور مانگو اللہ سے اس کا فضل

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

بے شک اللہ کو ہر چیز معلوم ہے۔

شرحِ الفاظ

لَا تَتَمَنَّوْا : تمنّی کا معنی ہے۔ کسی مرغوب اور پسندیدہ امر کو حاصل کرنے کی خواہش دل و جان سے اسی طرح دل میں جو ممکن و ناممکن امور کے خیالات آتے ہیں۔ وہ بھی تمنّی کہلاتے ہیں، نصیبٌ: حصّہ، قسمت۔ اِكْتَسَبُوْا : اکتساب کا معنیٰ ہے۔ محنت سے کمانا، حاصل کرنا اور اس کا تعلق ممکنات سے ہے جو حیز وسعت و طاقت سے خارج ہے۔ اس کا مکلّف کسی کو نہیں بنایا گیا
فَضْلِهٖ اس کا احسان اور کثیر انعامات۔
باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانا اور قتل کرنا، جن سے گذشتہ آیات میں روکا گیا ہے،

Marfat.com

ان کا تعلق افعالِ جوارح و اعمال اعضاء سے ہے۔ ان سے روکنے کی غرض یہ ہے۔ کہ ظاہری گناہوں سے پاکیزگی حاصل ہو جائے اس آیت میں بعض اعمالِ قلب مثلاً جھوٹی آرزو، حسد و بغض اور گناہوں کا خیال دل میں پکانا، سے منع فرما دیا گیا۔ تاکہ باطن بھی ظاہر کے مطابق پاک صاف ہو جائے۔ غلط آرزو بعض دفعہ برائیوں پر ابھارتی ہے۔ پس اس سے منع کرنا بھی لازم تھا۔

حق تعالیٰ کو جو کسی کو کسی امر میں شرافت و فضیلت اور اختصاص و امتیاز عنایت فرمائے تو تم اس کی ہوس اور حرص مت کرو کیوں کہ یہ بھی گویا ایسا ہی ہے۔ کہ کسی کے خاص مال اور جان میں بلا وجہ دست اندازی کیجائے جس کی حرمت ابھی گذر چکی۔ اور نیز اس سے باہم تحاسد و تباغض پیدا ہوتا ہے۔ اور حکمتِ الٰہی کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔ بعض عورتوں نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا سبب ہے کہ ہر جگہ حق تعالیٰ مردوں کو خطاب فرماتا ہے۔ اور ان کو حکم کرتا ہے۔ عورتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا اور میراث میں مرد کو دہرا حصّہ دیا جاتا ہے، اس آیت میں ان سب کا جواب ہو گیا۔

فرمایا گیا ہے۔ کہ مردوں اور عورتوں کے لئے حصّہ مقرر ہے۔ جیسا کچھ وہ کام کرتے ہیں خلاصہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ اس میں ہرگز کمی نہیں کی جاتی جو کسی کو شکایت کا موقع ملے۔ ہاں! یہ بات دوسری ہے۔ کہ وہ اپنی حکمت اور رحمت کے مطابق کسی کو خاص بڑائی اور فضیلت عنایت فرمائے۔ اس کی حرص اور شکایت کرنی بے جا ہوس ہے البتہ اپنے عمل کے معاوضہ سے اور زیادہ ثواب و انعام مانگو تو بہتر اور مناسب ہے اس میں کچھ خرابی نہیں ثواب جو فضل کا طالب ہو اس کو لازم ہے کہ عمل کے ذریعہ سے طلب کرے۔ حسد اور تمنّی سے فضل کا طالب نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا پورا علم ہے۔ ہر ایک کے درجے اور اس کے استحقاق کو خوب جانتا ہے۔ اور ہر ایک کے مناسب شان اس سے معاملہ کرتا ہے۔ جو جس کو فضیلت عطا کرتا ہے۔ سراسر علم اور حکمت کے مطابق کرتا ہے، کوئی اپنی لاعلمی کی وجہ سے کیوں اس میں خلجان کرے؟

آیت[۲] میں وہ فضائل مراد ہیں۔ جو طبعی و وہبی طور پر ہوں اور بلا دخل کسی عمل و کسب کے ہوں۔ مثلاً مردوں کو جو فطری فضیلت عورتوں پر حاصل ہے، دنیا میں کوئی حسین و جمیل ہے۔ کوئی خوش آواز ہے۔ کسی کے قوائے جسمانی بہت مضبوط ہیں۔ اس قسم کے وہبی و طبعی فضائل کو قربِ حق میں مطلق دخل نہیں۔ آیت میں تعلیم یہ ہے۔ کہ ان چیزوں کی بناء پر ایک دوسرے پر رشک

---

[۱] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷ [۲] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۸۹، ۱۹۰

Marfat.com

کرنا، ایک دوسرے کی جگہ پہ ہونے کی حسرت و تمنا کرنا درست نہیں، قربِ حق میں دخل صرف عمل و اکتساب کو ہے۔ شانِ نزول کی روایتوں میں آیا ہے۔ کہ کچھ عورتوں نے اپنے احساس کم تری کی بناء پہ مردوں پہ رشک کا اظہار کیا تھا۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ نجات و مغفرت اور قربِ حق کا مدار تو اپنے اعمالِ ارادی و اختیاری پہ ہے اور اس لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل یکساں ہے۔ عورتوں کے لئے بھی قانونِ حسنِ عمل وہی ہے، جو مردوں کے لئے ہے اور اس لئے انہیں مردوں پہ رشک کا کوئی محل نہیں۔ یہ فرق تو محض تکوینی مصلحتوں سے رکھ دیئے گئے ہیں۔ تفسیر مدارک میں ہے۔ کہ یہ تفصیل خدا کی تقسیم سے ہے جو حکمت و تدبیر اور بندوں کے احوال کے حقیقی علم کی وجہ سے رکھی گئی ہے۔

لیکن یہ واضح فرما دیا گیا کہ ہمارے ہاں یہ نہ ہوگا کہ مرد کا اجر مرد ہونے کی بناء پہ کچھ بڑھ جائے، اور عورت کا اجر اس کے عورت ہونے کی بناء پہ کچھ گھٹ جائے۔ مرد بحیثیت مرد اللہ کے ہاں مقرب تر اور نجات کا مستحق تر نہیں ہے۔ اور عورت اپنی جنس کی بناء پہ ہرگز کسی اجر و قرب سے محروم نہ رہے گی۔ جیسا کہ بعض دوسرے مذاہب نے قرار دے رکھا ہے۔ اس میں تعلیم ہے کہ عورت اپنا احساسِ کمتری دور کرے اور سمجھے کہ مکلف مخلوق کی حیثیت سے وہ اور مرد دونوں بالکل ایک سطح پہ ہیں، اور حصولِ نجات و قربِ حق میں وہ مرد سے ذرا بھی فروتر نہیں، ہندوؤں نے اپنی منوسمرتی کے اوراق میں اور کیتھولک کلیسا نے صدیوں تک اپنی کونسلوں میں جو فیصلے عورت کی پستی اور پست فطرتی کے کئے ہیں۔ یہ آیت ان سب کی تردید کر رہی ہے۔ اور اکتساب سے دونوں جگہ مراد اعمالِ خیر کا کسب ہے۔

رشک و تمنا سے اور دعاؤں سے طلب کرنے والی اصل چیز وہبی اور طبعی نعمتیں نہیں بلکہ توفیقِ حسنِ عمل ہے (اس لئے فرمایا ہے کہ خدا سے اس کے فضل کی طلب کرو) اللہ تعالیٰ ہر چیز سے چوں کہ بخوبی واقف ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے اس علم کامل کے مطابق ہر مخلوق کو صلاحیت و استعداد بخشی اور وہی ہر ایک کے فردِ عمل سے پوری طرح مطلع بھی ہے۔

اس[1] آیت میں ایک بڑی اہم اخلاقی ہدایت دی گئی ہے، جسے اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو اجتماعی زندگی میں انسانوں کو بڑا امن نصیب ہو جائے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے۔ بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں سے فرق رکھے ہیں۔ مثلاً شکل و صورت، آواز، طاقت و ضعف، اعضاء کی سلامتی یا نقص، جسمانی و ذہنی قوتوں کا تفاوت، ذاتی حالات،

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۴۷، ۳۴۸

Marfat.com

ماحول اور ذرائع وغیرہ۔ اسی فرق و امتیاز پہ انسانی زندگی کی ساری گوناگونی قائم ہے۔ اور یہ عین مقتضائے حکمت ہے، جہاں اس فرق کو اس کے فطری حدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے۔ وہیں ایک نوعیت کا فساد رونما ہو جاتا ہے، اور جہاں سرے سے اس فرق ہی کو مٹا دینے کے لئے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہاں ایک دوسری نوعیت کا فساد برپا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جہاں کسی کو کسی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں بڑھا ہوا دیکھے، بے چین ہو جائے یہی اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت اور کشاکش کی جڑ ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا۔ اسے پھر وہ ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس کے ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا سو اس کی تمنا نہ کرو، البتہ اللہ سے فضل کی دعا کرو، وہ جس فضل کو اپنے علم و حکمت سے تمہارے لئے مناسب سمجھے گا عطا فرما دے گا۔ مردوں اور عورتوں میں سے جس کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے۔ اس کو استعمال کر کے جو جتنی اور جیسی برائی یا بھلائی کمائے گا اسی کے مطابق یا بالفاظ دیگر اسی کے جنس سے اللہ کے ہاں حصہ پائے گا۔

امام ابن کثیرؒ نے بعض احادیث بیان کر کے آیت کی تفسیر میں یہ ثابت کیا ہے۔ کہ کسبی چیزوں میں حسد و بغض حرام ہے اور وہبی و فطری چیزوں میں رشک بے فائدہ اور ناجائز ہے ہاں کسبی چیزوں میں (بشرطیکہ نیک ہوں) رشک جائز ہے کیونکہ احادیث میں علم اور انفاق مال پر رشک کرنے کو سراہا گیا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ کسبی و اختیاری چیزوں میں بھی یہ تمنا جائز نہیں کہ فلاں کا مال یا علم مجھے مل جائے، بلکہ یہ آرزو کرے کہ اس جیسا فضل خداوندی مجھ پر بھی ہوتا کہ میں بھی اسے نیکی میں صرف کروں (کیونکہ دوسرے سے زوال نعمت کی تمنا حسد ہے جو حرام ہے۔ مؤلف) اور وہبی و فطری فضائل میں جب رشک فضول ٹھہرا تو حسد تو بدرجہ اولیٰ حرام ہوگا۔ کیونکہ کسی کے حسد سے دوسرے کی فطری و وہبی فضیلت کو تو زوال ہونے سے رہا۔

اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں میں سے ہر جنس کو کچھ اعمال کا مکلف گردانا ہے پس

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ۵ صفحہ ۱۸، ۱۹، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۸۵ (خلاصہ)
[2] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۲۲، ۲۴ تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۵۶، ۶۲،

Marfat.com

ان اعمال میں سے جو مردوں سے مخصوص ہیں، ان میں مردوں کا حصّہ ہے اور وہی بشرطِ تعمیل اسے پائیں گے۔ عورتیں ان کے ساتھ ان میں شریک نہیں اور جو اعمال عورتوں سے خاص ہیں۔ وہ انہی کے عمل سے تعلق رکھتے ہیں مردوں کا اس میں کوئی حصّہ نہیں۔ ان میں سے جو چیزیں دوسری نوع سے خاص ہیں۔ کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس کی آرزو کرے اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہوا کہ عورتوں کو گھریلو معاملات بچوں کی پیدائش و تربیت اور اندرونی زندگی کی اصلاح و تزیین کے ساتھ مخصوص کرے اور مردوں کو اس نے سخت اعمال اور مشقت و جدوجہد طلب افعال سے مخصوص کر دیا ہے۔ دونوں انواع کا فرض ہے کہ اپنا اپنا فریضہ اچھی طرح سرانجام دیں اور خلوص سے اپنے اپنے دائرہ عمل کے اندر کام کریں۔

پھر مرد عورت دونوں کا فرض ہے۔ کہ جو کام ان کے متعلق کر دیا گیا ہے۔ اس کی انجام دہی میں اللہ سے قوت و اعانت طلب کریں اور جو دوسروں کا دائرہ عمل ہے، اس کی تمنا نہ کریں۔ آیت کی نہی میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں۔ جو خلقی و فطری امور میں داخل ہیں مثلاً عقل و جمال وغیرہ۔ کیوں کہ ان کی آرزو یکسر بے فائدہ ہے۔ مگر جو چیزیں انسان کی قدرت و اختیار میں داخل ہیں۔ یعنی امورِ کسبیہ، وہ نہی میں داخل نہیں۔ حسد تو بہر حال حرام ہے۔ مگر دوسروں کی کامیابی اور نیک عملی کو دیکھ کر ان سے سبق سیکھنا، اس کے حصول کی جدوجہد کرنا اور اپنے لئے ویسی ہی بہتری یا اس سے بھی اعلےٰ کی تمنا کرنا محمود ہے، خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ہم اپنی نظر اور فکر و عمل کو ان چیزوں کی طرف متوجہ کریں جو ہمارے کسب و اختیار میں داخل ہیں اور جو چیز ہماری استطاعت سے باہر ہے۔ اس کی طرف توجہ نہ کریں، کیونکہ فضیلت کسبی اعمال پر مبنی ہے۔ اپنے کسب و عمل کے بغیر کسی چیز کی تمنا و آرزو فضول ہے،

ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام مقاصد میں اپنی قوتیں اور مواہب پر اعتماد رکھے، جدوجہد کرے اور ساتھ ہی فضلِ خداوندی کا بھی طالب رہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کسی مقصد و مطلب کا حصول ممکن نہیں۔ بعض چیزوں سے نادانی کے باعث اور بعض سے عاجزی کے باعث آدمی محروم رہتا ہے۔ ان میں محنت کے ساتھ دعا کا سہارا لازم ہے۔ مثلاً کسان زراعت کرتا ہے، میدانِ عمل میں سننِ خداوندی کا اتباع کر کے جدوجہد کرتا ہے۔ اور اپنا کام کر کے نتیجہ خدا پر چھوڑ دیتا ہے۔ کھیتی کو اگانا، اور حوادث و آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنا اسی کے ہاتھ میں ہے۔

سیّد قطب شہید آیت کی نہی کو خلقی و وہبی وسائل سے مخصوص نہیں مانتے بلکہ اسے

لہ فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۴۷، ۵۲

Marfat.com

عام قرار دیتے ہیں۔ مگر تمنّی سے مراد حسد و بغض، حسرت و جلن، احساسِ محرومی اور شدید حرص و ہوس لیتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ کہ ان چیزوں کا نتیجہ خدا سے بدظنی، اس کی تقسیم کی عدالت سے بدظنی و بے اعتمادی نکلتا ہے۔ اور دل کا امن اور چین زائل ہو کر قلق و اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ فرماتے ہیں۔ کہ آیت اپنی ہئی میں عام ہونے کے باوجود یہاں اپنے شانِ نزول اور ربط و سیاق کے لحاظ سے عورتوں اور مردوں کے باہمی تفاضل کے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں میں کچھ خصائص رکھے ہیں۔ عورت بے شک خالدؓ نہیں بن سکتی۔ مگر ہزار مرد مل کر بھی وہ کام سرانجام نہیں دے سکتے جو عورت دے سکتی ہے۔ وہ خالدؓ و طارقؓ جننی اور ان کی تربیت کر لی ہے۔ اس کی یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو مردوں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ علےٰ ہذا القیاس کوئی عورت پیغمبر تو نہیں بنی مگر وہ پیغمبروں کی ماں ضرور ہے۔ پھر مردوں میں سے وہ کون سا ہے جو خدیجہؓ و عائشہؓ کے مقام کو پا سکے۔ ہر ایک نوع کا اپنا اپنا دائرہ عمل ہے۔ مرد کا یہ کام نہیں کہ عورت کو حقیر جانے، نہ عورت کو جائز ہے کہ مرد پہ بڑائی جتائے۔ یا اپنا مقام چھوڑ کر اس کی تمنا کرنے لگے۔

اس آیت نے عورت کو انفرادی ملکیت کا حق دے کر اسے قانونی و معاشرتی لحاظ سے مرد کے برابر کر دیا ہے۔ کسی قدیم یا جدید جاہلیت نے عورت کا یہ حق خندہ پیشانی سے تسلیم نہیں کیا۔ بعض جدید جاہلیتیں وراثت کا حق عورت سے چھین کر سب سے بڑی مذکر اولاد سے خاص کرتی ہیں۔ بعض نے عورت کے مالی معاملات کو ولی یا خاوند کی رضا و اذن پر موقوف رکھا ہے۔ اسلام نے عورت کا یہ حق خود بخود بغیر کسی مطالبے اسٹرائیک، شور و غوغا یا تنظیم بندی کے دے دیا ہے۔ اس میں پارلیمنٹ کے قانون کی بھی ضرورت نہیں، اس نے اس معاملے میں انسانی اکرام کو ملحوظ رکھا ہے۔

اسی طرح اسلام نے مرد و عورت کو قانون، شہری حقوق اور معاشرت میں برابر کر دیا ہے مغربی ممالک میں عورت کا نام تک گم ہے۔ شادی سے پہلے وہ باپ کے نام سے (مس فلاں) پکاری جاتی ہے۔ اور شادی کے بعد خاوند کے نام سے (مسز فلاں) اسلام نے اس کی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اس کا اپنا نام قائم رکھا۔ اسے ملکیت اور معاملہ کی اجازت دی، وہ بیع و شراء، ہبہ و وصیت اور رہن وغیرہ میں مرد کی طرح خود مختار ہے، جدید تہذیب نے ابھی تک عورت کو یہ مقام کہیں بھی نہیں دیا۔ عورت کی آزادی کا یہ حقیقی پہلو جدید تہذیب کی نگاہ سے تاحال اوجھل ہے۔ ہاں مردوں نے اپنی ہوس کاری کے لئے عورت کو عریاں مزدور کر دیا ہے۔ اور اس کا نام "آزادی" رکھ دیا ہے۔ کاش عورت اپنی اس جدید مظلومیت کو سمجھ سکے۔

Marfat.com

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ

اور ہر کسی کے لئے ہم نے مقرر کر دیئے ہیں وارث اس مال کے

الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ

جو چھوڑ دیں ماں باپ اور قرابت والے۔ اور جن سے معاہدہ

عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ

ہوا تمہارا تو ان کو دے دو ان کا حصہ

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ ع ۵

بے شک اللہ کے رو برو ہے ہر چیز

شرح الفاظ

مَوَالِيَ: مولیٰ کی جمع ہے۔ جس کے بہت سے معانی ہیں۔ مثلاً آزاد کنندہ، آزاد شدہ غلام، حلیف، ابن عم اور عصبہ و وارث، ہر معنیٰ عبارت کے ربط اور سیاق و سباق سے متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں موالی سے مراد وارث ہیں یعنی ایسے لوگ جنہیں ترکہ پر غلبہ و استیلا کا حق پہنچتا ہے۔ گویا یہاں اس لفظ میں ولایت سے مراد قرابت اور استحقاق وراثت کا قرب مراد ہے،

مِمَّا تَرَكَ: یعنی وہ مالِ متروکہ کے وارث ٹھہرائے گئے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ: اس لفظ سے مراد یہاں ازواج (جوڑے، خاوند بیوی دونوں) ہیں کیوں کہ عقد نکاح کے باعث دونوں کو باہم حق وراثت پہنچتا ہے۔ اور بالعموم اس عقد کے بغیر وہ باہم وارث نہیں ہوتے۔ اَيْمَانُكُمْ کا لفظ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ عقود (بیع و شراء و عہد وغیرہ) میں متعارف یہ ہے کہ بات پختہ ہو جائے تو باہم دائیں ہاتھ سے مصافحہ کیا کرتے ہیں۔

پچھلی آیت میں حصولِ ثروت کا ایک عام طریقہ یعنی کسبِ مال بیان ہوا تھا۔ اس آیت میں ثروت کی ایک نوع یعنی وراثت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ہر وارث کا جس قدر حصہ شرع الٰہی نے بیان فرما دیا ہے وہ اسی پر مطمئن رہے۔ دوسروں کے حصے کا لالچ نہ کرے۔ (جیسا کہ پچھلی آیت میں غلط تمناؤں اور بے فضول آرزوؤں

Marfat.com

سے روکا گیا ہے)

[1] پس آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ جسطرح ہم نے مردوں اور عورتوں کے لئے کام کے دائرے کسب کار کے حلقے اور فطری مواہب مقرر کر دیئے ہیں۔ جن میں انہیں ایک دوسرے پر حسد و بغض حرام ہے۔ اسی طرح ہم نے ان کے وراثت میں بھی حصّے مقرر کر دیئے ہیں تاکہ توازنِ معاشرت قائم رہے اور جسطرح ہر مرد و عورت دوسروں کے وارث ہوتے ہیں، اسی طرح دوسرے وارث ان کی وراثت بھی حاصل کرتے ہیں اور وہ یہ لوگ ہیں۔

۱۔ والدین۔
۲۔ قرابت دار (جن کے حصوں کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔)
۳۔ زوجین جو باہم عقدِ نکاح میں وابستہ ہیں۔

پس ان میں سے ہر ایک کو ان کا مقدر شدہ حصّہ دے دو۔ اللہ تعالیٰ ترکہ اور دوسرے معاملات میں تمہارے تصرفات کو دیکھ رہا ہے۔ پس تمہیں ایک دوسرے کا مال کھا جانے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا، بہر حال جو حصّہ کسی کا مقرر ہے۔ وہ اسے دیدیا جائے۔

[2] مرد ہو یا عورت ہر ایک کے لئے تم میں سے اے مسلمانو! ہم نے وارث مقرر کر دیئے اس مال کے جس کو چھوڑ کر مریں والدین اور قرابت والے، کسی کو اس سے محروم نہیں رکھا اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہے۔ ان کو ان کا حصّہ ضرور پہنچا دو۔ اللہ تعالیٰ کو تمام امور کا علم ہے۔ کہ وارثوں کا کیا حصّہ ہونا چاہیئے۔ اور جن سے معاہدہ ہوا ہے۔ ان کو کیا ملنا چاہیئے اور ہمارے ان احکام کو کون بجالاتا ہے، اور کون ان کی نافرمانی کرتا ہے۔ اکثر لوگ حضرتؐ کے ساتھ اکیلے اکیلے مسلمان ہو گئے تھے اور ان کا سب کنبہ اور تمام اقرباء کافر چلے آتے تھے تو اس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دو مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی کر دیا تھا۔ وہی دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے۔ جب ان کے اقرباء بھی مسلمان

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۲۵، ۲۴، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۶۲، ۶۶ (طبع ثالث)
[2] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۷، تفسیر ابن کثیر پارہ ۵ صفحہ ۱۹، ۲۰ تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۴۸۔

Marfat.com

ہو گئے تو تب یہ آیت اتری۔ کہ میراث تو اقربا اور رشتہ داروں ہی کا حق ہے۔ اب رہ گئے وہ منہ بولے بھائی تو ان کے لئے میراث نہیں ہاں زندگی میں ان کے ساتھ سلوک ہے۔ مرتے وقت کچھ وصیت کر دے تو مناسب ہے۔ مگر میراث کا کوئی حصہ نہیں (اس تفسیر کی بناء پر برخلاف تفسیر سابق کے، آیت میں بیان شدہ عقد سے مراد عقد مواخات ہے نہ کہ عقد نکاح، اور نصیب سے مراد زندگی میں حسن سلوک اور بوقتِ مرگ وصیت ہے نہ کہ وراثت کا حصہ۔ مؤلف)

قانون میراث کے ذریعہ سے وارثوں کی تفصیل اسی سورت میں چند رکوع قبل گذر چکی، تقسیم ترکہ کی کچھ عارضی صورتیں آغازِ اسلام ہی میں بتا دی گئی تھیں۔ وہ مکمل قانون میراث کے نازل ہونے کے بعد اب قدرۃً منسوخ ہو گئیں۔

اَلَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ: یہ لوگ اصطلاح میں موالی الموالات کہلاتے ہیں۔ عرب قدیم میں دستور تھا۔ کہ دو شخص باہم قول و قرار کر کے ایک دوسرے کے اس طرح دوست اور مددگار ہو جاتے کہ اگر ایک پر دیت لازم آئے تو دوسرا اسے ادا کرے اور ایک کی وفات پر دوسرا اس کی میراث پائے۔ اسی عہد کو عقدِ موالات ہیں۔ شریعت نے شروع شروع میں اس دستور کو تھوڑی سی ترمیم کے بعد قائم رکھا اور انصار و مہاجرین میں مواخات قائم کر کے باہم میراث جاری کرا دی۔ پھر اس عہد والے حصہ کو بھی متعین کیا۔ پھر جب سورت احزاب کی یہ آیت نازل ہوئی، وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ۔ تو سب وارثوں کے حصے متعین ہو گئے۔ اور اب اس کے لئے گنجائش نہ رہی۔ لیکن جس کا کوئی وارث نہ ہو علم میراث میں بیان شدہ تفصیل کے مطابق اب بھی موالی الموالات اس کا وارث ہو سکتا ہے۔ شرائط و تفاصیل کے لئے دیکھئے کتب میراث۔ مؤلف)

وارثوں کی ولاثت اور ان کے حصے اوپر گذر چکے ہیں۔ اسلامی قانون وراثت نے مال کے ارتکاز سے روک دیا ہے۔ اس کی وجہ سے مال کسی خاندان یا گھر یا فرد میں مرتکز نہیں رہ سکتا بلکہ گردش میں رہتا ہے۔ اس آیت میں وہ عقود مراالات بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں اسلام نے ترمیم و اضافہ اور حک و تصفیہ کر کے انہیں متوازن و متناسب کر دیا تھا۔ ان کی کئی صورتیں تھیں۔ جن کے باعث بعض دفعہ مال غیر اقرباء کو مل جاتا تھا۔

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۰، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶۔
سہ فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۵۲، ۵۴۔

Marfat.com

(ا) عقدِ ولائے عتق : اس عقد سے غلام اپنی آزادی کے بعد اپنے آزاد کرنے والے کے خاندان کا فرد بن جاتا ہے۔ آزاد کنندہ اس کی دیت ادا کرتا تھا اور اس کی موت پر اگر اس کے عصبات موجود نہ ہوں تو اس کا وارث بھی ہو جاتا تھا۔

(ب) عقدِ موالات :- یہ ایک ایسا نظام ہے جس سے مثلاً ایک غیر عربی شخص (جبکہ اس کے اقارب میں سے کوئی اس کا وارث نہ ہو تو) ایک عربی آدمی سے عقدِ موالات قائم کر سکتا ہے۔ اس عقد سے وہ اس عربی کا مولےٰ الموالات بن جاتا ہے اور اس کے خاندان کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ اس دیت برقت جنایت وہ شخص ادا کرتا ہے۔ جس سے یہ عقد ہوا ہو اور اس کی موت پر وہ اس کا وارث ہوتا ہے۔

(ج) زمانہ جاہلیت میں دو شخص باہم عقدِ موالات کر لیتے تھے کہ وہ باہم وارث ہوں گے۔ اسلام نے ان عقود کا تصفیہ کیا ہے۔ بالخصوص تیسرے اور چوتھے کا۔ اور بتایا ہے کہ وراثت کا سبب تو صرف قرابت ہے۔ ہاں اس نے ان عقود کو باطل بھی نہیں کیا بلکہ زندگی میں انہیں جاری رکھا ہے۔ اور بعد از موت اگر کوئی اور وارث نہ ہو تو انہیں وراثت بھی دلے دی ہے۔

امام احمدؒ اور مسلمؒ نے ایک حدیث روایت کی ہے۔ کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اسلام میں کوئی حلف نہیں، ہاں زمانۂ جاہلیت میں جو حلف تھی اسلام نے اسے برقرار رکھا ہے۔ بلکہ اس کی تاکید کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عقدِ موالات کی حلف اب نئے سرے سے تو منعقد نہیں ہو گی مگر سابق حلف برقرار رہے، مالی معاملات میں اسلام نے یسر و تیسیر کا معاملہ اختیار کیا ہے۔ تاکہ لوگ مشکلات میں نہ پڑ جائیں۔

Men are in charge of women, because Allah

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ

has made the one to excell the other and

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس لئے کہ اللہ نے بڑائی دی ان کو ایک دوسرے

because they spend of their property

بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ

پر اور اس لئے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال۔ پس جو عورتیں

قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ

نیک ہیں سو وہ تابعدار ہیں نگرانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے اور

So the good women are the obedient, guarding
in secret that which Allah hath guarded.

Marfat.com

As for those from whom you fear rebellion, admonish them & banish them to beds apart, and scourge them. Then if they obey you, seek not a way against them. Lo! Allah is ever High, Exalted, Great.

تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي

جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور

الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ

مارو پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر الزام کی

سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ

راہ۔ بے شک اللہ ہے سب سے اوپر بڑا۔ اور اگر تم ڈرو کہ وہ

بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ

دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں سے اور ایک

اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ

منصف عورت والوں سے۔ اگر یہ دونوں درستی چاہیں گے تو اللہ ان دونوں میں

اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

موافقت کرے گا۔ بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے

شرح الفاظ

[1] قَوَّامُوْنَ : قَوَّام اور قَيِّمٌ ہم معنیٰ لفظ ہیں۔ ان کا معنیٰ ہے۔ مہتمم، ناظم، مدبر حاکم، نگران، منتظم، محاسب اور محافظ۔ مرد میں فضیلت کا باعث دو چیزیں ہیں۔

(ا) فطری اور وہ مرد کے مزاج کی قوت اور اس کی خلقت میں فطری کمال ہے۔ قوت عقل اور معاملات کی ابتداء و انتہا میں صحتِ نظر اس کے ماتحت ہے۔

(ب) کسبی، یعنی مال و دولت کمانے اور معاملات میں تصرف کرنے پر اس کی قدرت۔ یہی سبب

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۲۶۔

Marfat.com

ہے، کہ مردوں کو عورتوں پر انفاقِ مال اور گھروں کی ریاست کے انتظام کا مکلف بنایا گیا ہے۔ قَانِتَاتٌ : قنوت کا معنیٰ ہے۔ سکون اور خدا اور رسولؐ اور ازواج کی اطاعت، حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ یعنی وہ عورتیں۔ جو ان چیزوں اور معاملات کی حفاظت کرتی ہیں۔ جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ اور ان باتوں کو چھپائے رکھتی ہیں۔ جو صرف انہی سے خلوت میں کہی جاسکتی ہیں۔ تَخَافُونَ یعنی تمہیں گمان ہو، خوف بمعنی ظنّ ہے۔ نُشُوزَهُنَّ نشوز کا معنیٰ ہے۔ ارتفاع۔ جب زمین اپنے ماحول سے کچھ بلندی ہو تو کہتے ہیں۔ نَشَزَتِ الْاَرْضُ اور نشوز سے مراد یہاں خاوند کی معصیت اور اس پر ترفع ہے۔ فَلَا تَبْغُوا : بغی کا معنیٰ ہے، ظلم اور حد سے تجاوز کرنا۔ شقاق : وہ مخالفت جو اختلاف کرنے والوں کو ایک دوسرے کی انتہاء (شق) پر کر دیتی ہے۔ شِق کا معنیٰ ہے۔ جانب۔ اور اس کے خوف سے مراد ہے۔ اس کے اسباب کے ظہور کا حاصل ہونا۔ حَكَمًا۔ وہ شخص جو خصومت کرنے والوں میں حکم اور فیصلے کا حق رکھتا ہو۔ بعث۔ کا معنیٰ ہے بھیجنا، مقرر کرنا، تاکہ وہ زوجین سے مل کر ان کی شکایت معلوم کرے، اور ان میں اصلاح کرنے کی تدابیر پر غور و فکر کر سکے، حکم مقرر کرنے کا یہ حکم اسلام کی شورائی و جمہوری روح کے عین مطابق ہے۔

پچھلی آیات میں مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کی فطری فضیلتوں کی تمنّا سے روکا گیا ہے۔ اور حکم دیا گیا ہے کہ وارثوں کو ان کے مقرر کردہ حصّے دے دیئے جائیں۔ ان آیات میں اسباب فضیلت کا بیان ہے۔

پہلی آیتوں میں مذکور تھا کہ مردوں اور عورتوں کے حقوق کی پوری رعایت فرمائی گئی ہے۔ اگر رعایت حقوق میں فرق ہوتا تو عورتوں کو شکایت کا موقع ہوتا۔ اب اس آیت میں مرد اور عورت کے درجہ کو بتلاتے ہیں، کہ مرد کا درجہ بڑھا ہوا ہے عورت کے درجہ سے۔ اس لئے فرقِ مراتب کے باعث جو احکام میں فرق ہوگا۔ وہ سراسر حکمت اور قابل رعایت ہوگا۔ اس میں مرد اور عورت بقاعدۂ حکمت ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ عورتوں کو اس کی خواہش کرنی بالکل بے جا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں پر اللہ تعالےٰ نے مردوں کو حاکم و نگران بنایا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔

اوّل :۔ بڑی اور ذاتی وجہ تو یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اصل سے بعضوں کو بعضوں پر یعنی مردوں کو عورتوں پر علم و عمل میں کہ جن دونوں پر کمالات کا مدار ہے فضیلت عطا فرمائی ہے۔

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۰۷

Marfat.com

جس کی تشریح احادیث میں موجود ہے۔

دوم:۔ کسبی ہے، یعنی یہ کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور مہر و خوراک اور پوشاک اور جملہ ضروریات کا تکفل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی حکم برداری کرنی چاہیئے۔ حدیث میں ہے۔ کہ ایک صحابیہ نے اپنے خاوند کی بہت نافرمانی کی۔ آخر مرد نے اسے ایک طمانچہ مارا۔ عورت نے اپنے باپ سے شکایت کی۔ عدت کے باپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آکر احوال ظاہر کئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خاوند سے بدلہ لو۔ اتنے میں یہ آیت اتری۔ اس پر آپ صلے اللہ علیہ آلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے کچھ چاہا اور اللہ تعالےٰ نے کچھ اور چاہا۔ اور جو کچھ اللہ نے چاہا وہی خیر ہے،

فَالصّٰلِحٰتُ: یعنی جو عورتیں نیک ہیں وہ مردوں کی فرماں برداری کرتی ہیں۔ اور اللہ کے حکم کے موافق خاوند کی پیٹھ پیچھے اس کی رضا کے موافق اپنے نفس اور خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ ان چیزوں میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتیں۔

واللّٰتی تخافون ..... : اگر عورت خاوند سے بدخوئی کرے تو پہلا درجہ تو یہ ہے۔ کہ مرد اس کو زبانی فہمائش کرے اور سمجھائے۔ اگر نہ مانے تو دوسرا درجہ یہ ہے۔ کہ جدا سوئے لیکن اسی گھر میں اس پر بھی نہ مانے تو آخری درجہ یہ ہے۔ کہ اس کو مارے بھی، پر نہ ایسا کہ جس کا نشان باقی رہے یا ہڈی ٹوٹے ہر تقصیر کا ایک درجہ ہے۔ اس کے موافق تادیب اور تنبیہ کی اجازت ہے۔ جس کے تین درجے ترتیب وار آیت میں مذکور ہیں۔ اور مارنا پیٹنا آخر کا درجہ ہے، سرسری قصور پر نہ مارے، ہاں قصور زیادہ ہو تو پھر مارنے میں حرج نہیں۔ جس قدر مناسب ہو مارے پیٹے مگر اس کا لحاظ رہے کہ ہڈی نہ ٹوٹے اور نہ ایسا زخم پہنچائے۔ کہ جس کا نشان باقی رہ جائے۔

(۱) فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ: یعنی وہ عورتیں تمہاری نصیحت یا علیحدگی یا ضرب و تادیب کے بعد اگر بدخوئی اور نافرمانی سے باز آجائیں اور بظاہر مطیع ہو جائیں تو تم بھی بس کر جاؤ اور ان کے قصوروں کی تشہیر مت کرو اور خواہ مخواہ ان کے ملزم بنانے میں خدا سے ڈرو۔ یقیناً اللہ تم سب سے غالب اور سب پر حاکم ہے۔ نہ عورتوں کے معاملہ میں خواہ مخواہ کی بدگمانی سے کام لو اور نہ تھوڑے قصور پر آخری سزا دینے لگو۔ بلکہ ہر قصور کی ایک حد ہے۔ اور مارنا اخیر کا درجہ ہے۔

(۲) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ ..... : اے مسلمانو! اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ خاوند اور بیوی میں مخالفت اور ضد ہے اور وہ اپنے نزاع کو خود نہ سلجھا سکیں گے تو تم کو چاہیئے

Marfat.com

کہ ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے اقارب میں سے مقرر کر کے بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو، کیوں کہ اقارب کو ان کے حالات بھی زیادہ معلوم ہوں گے۔ اور ان سے خیر خواہی کی بھی زیادہ امید ہے۔ یہ دونوں منصف احوال کی تحقیق کریں گے۔ اور جس کا جتنا قصور دیکھیں گے اس کو سمجھا کر باہم موافقت کرا دیں گے۔ اگر یہ دونوں منصف اصلاح احوال کی کوشش و قصد کریں گے تو اللہ اُنکے حُسن نیت اور حُسن سعی سے زوجین میں موافقت کرا دے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم و اطلاع ہے۔ رفع نزاع اور حصولِ اتفاق کے اسباب اور کیفیات اسکو خوب معلوم ہیں۔ اس لئے اس کی بتائی ہوئی تدبیر سے نزاعِ زوجین کے رفع ہونے میں دشواری نہ ہوگی۔ انشاء اللہ۔

اوپر گزر چکا ہے۔ کہ قرب حق اور حسنِ عمل کے لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل مساوی ہے۔ تمام عبادات جسطرح اور جس پیمانہ پر مرد کی قبول ہو سکتی ہیں، وہی ساری راہیں عورت کے لئے بھی کھلی ہوئی ہیں۔ اب یہاں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ مرد و زن کی یہ مساوات دنیوی معاملات میں اور انتظامی حیثیت سے قائم، نہیں (انتظامی لحاظ سے بہر حال ان میں سے ایک کو ہی منتظم و نگران بنایا جا سکتا ہے۔ ورنہ معاشرت درست نہ رہ سکتی۔ مؤلف) باپ اور بیٹے دونوں بندہ ہونے کے لحاظ سے بالکل مساوی ہیں۔ خدا کے نزدیک قبولیت اعمال کے لحاظ سے دونوں بالکل مساوی ہیں۔ لیکن دنیا میں شریعت ہی کا حکم ہے کہ باپ افسر ہو کر رہے۔ اور بیٹا ماتحت ہو کر، باپ حکم دے اور بیٹا حکم مانے، اس لئے یہاں بتایا جا رہا ہے کہ معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر غلبہ و فوقیت حاصل ہے۔ امام ابن عربی فرماتے ہیں۔ کہ عورت اور مرد حقوق میں مساوی ہیں۔ مگر انتظامی لحاظ سے مرد کو ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔ قرآن کی دوسری آیت میں ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ"... یہاں قوّام کا معنیٰ یہ ہے کہ مرد عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے اور ان پر احکام نافذ کرنے والے ہیں (تاج۔ لسان۔ ابن جریرؒ، تفسیر کبیر۔ الجصاصؒ۔ معالم) بائبل نے عورتوں سے تحقیر و تذلیل کا رویہ روا رکھا ہے منوسمرتی نے عورت کا مقام ہیچ قرار دیا ہے۔ اور کلیسا کی کونسلوں نے عورت کو نہایت حقیر و ذلیل درجہ میں رکھا تھا۔ قرآن عورت کی تذلیل و تحقیر کا بالکل روادار نہیں مگر ساتھ ہی اسے قدیم و جدید جاہلیت کی زن پرستی سے

سلہ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۰ (۱) برتر ہونے کی حیثیت سے (۲) فضیلت اعمال کی حیثیت سے } مساوی (۳) مالیت (۴) وراثت (۵) تمدنی و سیاسی

Marfat.com

بھی ہمدردی نہیں۔ وہ عورت کو ٹھیک وہی مرتبہ و مقام دیتا ہے۔ جو نظامِ کائنات میں فاطرِ کائنات نے اسے دے رکھا ہے۔ عورتیں بندۂ خدا اور مکلف مخلوق ہونے کے لحاظ سے مرد کے مساوی ہیں لیکن دنیا کے انتظامی معاملات میں مرد کے ماتحت اور تابع ہیں۔ مرد کی افضلیت دہری ہے۔ ایک تو جسمانی دماغی قوٰی میں برتری۔ دوسری قانونی و معاشرتی کہ عورت خرچ میں مرد کی دست نگر ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی۔ کہ قرآنی نظام کی رو سے کمانا یا کسب و معاش کرنا اور بیوی کے خرچ کا بار اٹھانا مردوں کے ذمہ ہے۔

اس آیت میں مومنات، صالحات کی یہ علامت ارشاد ہو رہی ہے۔ کہ وہ شوہر کی غیبت میں اس کی عزت و ناموس اور مال و جائداد کی نگہداشت کرنے والی ہوتی ہیں۔ فرنگیت زدہ اور فیشن زدہ عورتوں کو اس معیار سے سبق سیکھنا لازم ہے۔ نشوز کے معنی جو لغت اور تفسیر و حدیث سے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق اس سے مراد یہ ہے۔ کہ جب پُر مسرت ازدواجی زندگی کے بجائے تصادم اور بغاوت شروع ہو جائے (ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ، معالم) شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی ترجمے بھی خوف کا معنی یہاں علم سے کرتے ہیں۔

ہجر کا معنی تو یہی ہے۔ کہ ہم بستری ترک کر دو مگر حصاص رحمۃ اللہ اور ابن العربی رحمۃ اللہ کے بیان کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ رحمۃ اللہ، ضحاک رحمۃ اللہ اور سدی رحمۃ اللہ نے اس سے مراد ترکِ کلام بھی لیا ہے۔ اور ضرب سے مراد ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ نے معمولی ہلکی چوٹ لی ہے۔ کیوں کہ اس سے غرض اصلاح ہے نہ کہ قتل یا توہین۔ بحر المحیط میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے۔ کہ مسواک جیسی چیز سے مارا جائے۔ قرآن مجید کا خطاب کسی ایک طبقے، قوم یا تمدن سے نہیں بلکہ اس کے مخاطب عرب و عجم، چینی اور حبشی، انگریز اور ہندی، رومی اور جاپانی، اعلےٰ و ادنیٰ، شریف و رذیل، عالم و عامی، فہم اور کودن، چمار اور چوہڑے، نائی اور دھوبی، شہری اور دیہاتی، نیک بخت اور بد باطن، ہر طبقہ، ہر سطح اور ہر ذہنیت کے لوگ پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک ہر زمانہ اور ہر دور والے ہیں۔ اس کے احکام اور مسائل میں ہر انسانی ضرورت اور ہر بشری ماحول کا لحاظ کر لیا گیا ہے۔ اور یہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے معاشرے اور طبقے ایسے ہیں۔ جہاں عورت کے لئے جسمانی سزائیں عام ہیں۔ ظاہر ہے کہ علاج کی یہ صورت انہی طبقوں کے لئے ہے۔ پھر اتنی اجازت بھی بالکل آخری علاج کے طور پر اور ضرورت کے موقع پر ہی ہے۔ ورنہ سیاق کلام تو نرمی ہی کا اقتضاء کرتا ہے (جمل تفسیر کبیر) اور پہلی تدبیر کے کارگر ہونے پر دوسری یا تیسری، اسی طرح دوسری کے کارگر ہو جانے پر تیسری ہرگز جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر مارنا مباح ہے۔ مگر اس کا ترک افضل ہے۔ (تفسیر کبیر) بعض یورپ زدہ لوگوں کے

Marfat.com

نزدیک جو قرآن میں اس حکم کی موجودگی مضر ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ اُلٹا یہ تو دلیل ہے۔ قرآن کے ہر طبقہ، ہر مزاج اور ہر سطح انسانی کے لئے مفید ہونے کی۔ یورپ میں بیویوں کو پیٹنے کا کئی جگہ دستور رہا ہے۔ (دیکھو ہماری تفسیر انگریزی)

اِنْ خِفْتُمْ کا خطاب عام امت سے ہے اور حکام اور ارباب اقتدار کو بدرجۂ اولیٰ (تفسیر کبیر، روح المعانی) افراد اور جماعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے افراد کے باہمی نزاع سے جماعت بے تعلق نہیں رہ سکتی کیونکہ افراد کی درستی پر ہی جماعت کی درستی کا مدار و انحصار ہے۔ رشتۂ ازدواج ایک بڑا نازک اور اہم ترین تعلق ہے۔ لہٰذا ذرا سے نزاع پر فوراً طلاق جائز نہیں بلکہ اصلاح کی تمام صورتیں اختیار کی جائیں۔ زوجین اگر حکام سے رجوع کریں۔ تو ان کے لئے اصلاح اور فیصلہ واجب ہے۔ اور دوسرے لوگوں کے لئے مستحب۔

اِنْ یُّرِیْدَا اور بینھما کی ضمیریں یا تو دونوں زوجین کی طرف لوٹتی ہیں یا پہلی ثالثوں کی طرف اور دوسری زوجین کی طرف۔ معنیٰ ہر صورت میں درست ہے (بیضاوی، مدارک)

اسلام نے انتظامی معاملات اور اقتدار اعلیٰ مرد ہی کے متعلق کیا ہے۔ اسی میں مصلحت ہے۔ اور یہی فطرت کے موافق ہے۔ ورنہ فتنہ و فساد کا خدشہ قوی تھا۔ چنانچہ نبوت مردوں ہی کو دی گئی اور امامت کبریٰ (خلافت) کے مستحق بھی مرد ہی ہیں۔ اسی طرح منصب قضاء اور سپہ سالاری افواج وغیرہ بھی مردوں ہی کے لائق ہیں۔ عورت پر سب سے بڑا حق مرد ہی کا رکھا گیا ہے۔ ورنہ معاشرت میں فتنہ و فساد پیدا ہونا لازم تھا۔ عورتوں سے حسن سلوک کرنے اور ان کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہنے کی تاکید بہت سی احادیث میں آئی ہے مسامحہ کی اہمیت کے پیش نظر حضورؐ نے اس کا ذکر بڑی شدّ و مد سے آخری حج کے خطبہ میں بھی فرمایا تھا اور قربِ وفات میں بھی۔ عورت کو خواہ مخواہ مارنا سخت ممنوع ہے۔

عورت کی طرف سے نافرمانی اور کجی کا علاج آیت ۳۴ میں بیان فرمایا ہے۔ لیکن اگر زوجین دونوں ایک دوسرے سے نالاں ہوں تو اس کا علاج آیت ۳۵ میں بتایا گیا ہے۔ شقاق بینھما کے لفظ اس کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ ثالثوں کے فیصلے کے متعلق کچھ فقہی اختلافات بھی ہیں جن کے بیان کا یہ محل نہیں امام ابن کثیرؒ نے ایک حد تک انہیں بیان کر دیا ہے۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ ثالث مرد اور عورت کی طرف سے مصالحت کے لئے بطور وکیل ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں مصالحت کا تو اختیار ہے فیصلہ طلاق کا نہیں۔ اس میں بھی اختلاف

تفسیر ابن کثیر پ۵ صفحہ ۲۱، ۲۴، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸

Marfat.com

ہے کہ آیا یہ دونوں ثالث از خود طلاق وارد کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اغلب یہی ہے۔ کہ اگر انہیں فریقین یہ اختیار دے دیں۔ تو کر سکتے، ورنہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

ان[1] آیات میں فضیلت سے مراد شرف و کرامت اور عزت نہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مرد کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں، جو عورت کو نہیں دیں، یا اس سے کم دی ہیں، اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوام ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرۃً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت و خبر گیری میں رہنا چاہیئے۔

عورت پر مرد کی اطاعت واجب ہے۔ مگر اس سے زیادہ اہم اور اقدم اپنے خالق کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شوہر خدا کی معصیت کا حکم دے یا خدا کے عائد کئے ہوئے کسی فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو اس کی اطاعت سے اس امر میں انکار کر دینا عورت کا فرض ہے۔ ورنہ بصورت اطاعت وہ گنہگار ہوگی۔ نفل کا حکم دوسرا ہے۔ مرد کی اطاعت میں نفل چھوڑ دینے چاہئیں۔ ورنہ عورت گنہگار ہوگی۔

اختلاف و نزاع کی صورت میں زوجین کو اپنے رشتہ داروں میں سے ثالث مقرر کر لینے کا اختیار ہے۔ اور برادری و خاندان کے بڑے لوگ بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ کہ اپنی صوابدید سے حکم مقرر کر دیں۔ اگر معاملہ عدالت میں ہے تو وہ بھی پہلے ثالث مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔ اگر عدالت ثالثوں کو فیصلے کے حاکمانہ اختیارات دے دے تو ان کا فیصلہ نافذ ہوگا ورنہ وہ صرف تجاویز پیش کریں۔ یا اپنی رپورٹ دیں۔

مرد[2] عورتوں پر نگران ہیں، یعنی یہ مردوں کی شان ہے کہ حمایت و رعایت کے سلسلے میں عورتوں پر نگران رہیں اور ان کی حفاظت کریں، جہاد کو مردوں پر فرض کیا ہے۔ نہ کہ عورتوں پر، یہ بھی اس مسئلہ کے تابع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جہاد و قتال حمایت و حفاظت کی ایک خاص ترین صورت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میراث میں مردوں کا حصہ زیادہ رکھا ہے، کیونکہ ان کے ذمہ عورتوں کا نفقہ ہے اور عورتوں پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔

مرد کی اس قوامیت نے اسے معاشرت و اقتدار دے دیا ہے۔ عورت اس کے دیئے ہوئے اختیار کو اس کی مرضی سے نافذ کرے گی، گھر کی حفاظت، اس سے مرد کی اجازت کے بغیر نہ نکلنا اگرچہ رشتہ داروں کی ملاقات کے لئے ہی ہو، اخراجات کا انتظام کرنا۔ یہ سب

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۲۴۹، ۲۵۰

[2] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۲۷، ۳۲، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۶۸، ۸۰

Marfat.com

کچھ مرد کی مرضی سے عورت کے ذمہ ہے۔ عورت کی عزت و ناموس کی حفاظت و رعایت، اس کا نان و نفقہ اور دیگر جائز مطالبات مرد کے ذمہ ہیں۔ حمل و ولادت اور تربیت اولاد عورت کے ذمہ ہے۔ گھریلو زندگی کو زیادہ سے زیادہ پرامن اور محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ تاکہ عورت اس میں اطمینان و امن سے وظائف حیات اور وظائف زوجیت پورے کر سکے۔

بہت سے فرنگ زدہ مسلمان اس امر کو حیرت ناک اور عظیم جانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے مرد کو تادیب و سیاست کی خاطر عورت کو مارنے کا اختیار دیا ہے، لیکن اس امر پر حیرت و افسوس ہے۔ کہ ایسے لوگ اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ عورت کج خلق اور گستاخ ہے۔ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ گھر میں اقتدار عورت کا ہونا چاہیئے حتیٰ کہ وہ اس کی ریاست و اختیار کو چیلنج کرے اور اسے اپنا ماتحت اور حقیر بنا کر رکھ دے؟ کیا اسطرح گھریلو زندگی قائم رہے گی؟ اگر ایسے مسلمانوں کو تعجب نہ لاحق ہو تو ہم ان کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ کہ جن "مہذب" لوگوں کی اقتدا کا انہیں فخر حاصل ہے (اہل مغرب) وہ بھی اپنی مہذب اور پڑھی لکھی بیویوں کو مارتے ہیں! بلکہ ان کے فلاسفروں، علماء و حکماء اور ملوک و امراء نے بھی یہ "تلخ فریضہ" سرانجام دیا ہے! پس یہ ایک معاشرتی ضرورت ہے، خاص طور پر اسلام میں اس کی گنجائش لازم تھی۔ جو کہ شہر، دیہات اور تمام انسانی اصناف و اقسام کا دین ہے۔ اس چیز کو برا کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب کہ فطرت و عقل، گھریلو زندگی کی اصلاح اور معاشرت کی فلاح کے لئے اس کا تقاضا کرتے ہیں؟ جب اخلاق بگڑ جائیں۔ جب مرد کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ رہے، اور جب عورت اس کے بغیر کج خلقی اور ٹیڑھے پن سے باز ہی نہ آئے تو اس میں کیا حرج ہے؟ ہاں! اسلام نے اس کے حدود مقرر کر دیئے ہیں۔ جن سے روگردانی جائز نہیں۔

جب اس کی ضرورت نہ ہو۔ گھریلو معاملات درست ہوں، عورتیں فرماں بردار اور نصیحت پذیر ہوں۔ یا پہلے اور دوسرے علاج سے ہی درست ہو جائیں تو ضرب و تادیب سے اجتناب واجب ہے۔ کیوں کہ مقصد اسلام یہ ہے کہ عورت سے نرمی کی جائے، اس پر ظلم و زیادتی نہ کی جائے، اسے اچھی طرح سے رکھا جائے اور اس کے تمام حقوق پورے کئے جائیں۔ اس بارے میں بے شمار احکام اسلام میں موجود ہیں۔ ضرب ایک آخری اور ناپسندیدہ علاج ہے، اور اس سے حتی الوسع پرہیز لازم ہے۔ کیونکہ جو قوم اپنی عورتوں کو ذلیل کر دے اس کی آئندہ نسل غلام پیدا ہوگی۔ کیوں کہ ان کی تربیت ہی ظلم و تشدد پر ہوگی۔ ان کی عزت نفس، خودی اور شجاعت مردہ ہو چکی ہوگی۔ یعنی ان میں نام کو بھی نہ ہوگی۔

آیت ۳۵ میں اصلاح و توفیق کا ذکر تو موجود ہے۔ مگر طلاق و تفریق کا ہرگز نہیں۔ کیوں

Marfat.com

کہ اسلام اسے بُرا جانتا ہے۔ اور خاندانی زندگی میں اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس نے طلاق کو "ابغض الحلال" قرار دیا ہے۔ مسلمان اگر اس حکم کی پابندی کرتے تو ان کے گھریلو معاملات میں بغض و عداوت کا گھُن نہ گھس آتا اور ان کے معاشرتی و قومی اخلاق و آداب اعلیٰ ترین معیار پر ہوتے۔ انسانی تعلقات میں سے زوجیت کا رشتہ نازک ترین اور اہم ترین ہے۔ اسلام اس رابطے کو قوی تر بنانا چاہتا ہے۔ یہ رشتہ مادّی بھی ہے۔ اور روحانی بھی۔ زوجین ایک دوسرے کی ہر کمزوری اور ہر خوبی سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس رشتے میں زبان اور کان پر نگرانی واجب ہے۔ وہم و گمان اور خلجان سے بچنا لازم ہے۔ ذرا ذرا سے معاملات میں نزاع ہوتا رہے تو زندگی اجیرن ہو جائے گی، غلطیوں اور کمزوریوں سے پاک کون ہے؟ باہمی معاملات میں حسن ظن اور رواداری بلکہ فیاضی سے کام لینا ضروری ہے۔

علمائے اجتماع کا قول ہے۔ کہ بہت کم جوڑے سعادتِ زوجیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہر جوڑے کی خواہش یہی ہوتی ہے۔ کہ یہ سعادت اسے حاصل ہو جائے۔ پس اس سلسلے میں سیدھا سا علاج یہ ہے۔ کہ عملی مودّت کو کافی سمجھا جائے اور آئندہ نسلوں کی تربیت ایسی کی جائے کہ مرد اور عورتیں حتی الوسع باہم احترام و اکرام کرنا سیکھیں۔ اور ازدواجی زندگی میں اس پر کاربند ہو جائیں گے۔

خالقِ کائنات نے زوجیت کو انسانی فطرت میں مرکوز رکھا ہے۔ جیسا کہ یہ ہر دوسری چیز کی بھی فطرت ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ .... : وہ یہ چاہتا ہے۔ کہ زوجین یک جان و دو قالب بن کر رہیں :-

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا.... : ان دونوں کی ملاقات نفسانی سکون، روحانی اطمینان، جسمانی راحت، ستر و احصان اور حفاظت و صیانت کا ذریعہ بنے۔ پھر اس سے انسانی نسل پھیلے اور حیات میں پھیلاؤ پیدا ہو۔

(۱) لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً -

(۲) هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ -

(۳) نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ -

(۴) قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا -

لہ فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۶۸/۵۵

Marfat.com

(۵) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔

اسلام کا معاشرتی نظام انہی اصول پہ قائم ہے۔

پھر انہی اصول کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اسلام میں عورت کو قابلِ عزت و اکرام قرار دیا گیا ہے۔ او عورت و مرد دونوں کو قربِ الٰہی اور اجر و ثواب میں برابر کا حقدار ٹھہرایا گیا ہے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ اسلام نے عورت کو مرد کی طرح ملکیت، وراثت، ہبہ، معاملات اور تمدنی شخصیت میں مرد کے بالکل مساوی بنا دیا ہے۔ حقیقت میں وہ مرد و عورت دونوں کو "نفسِ واحدہ" کے دو لازمی اور مساوی حصے قرار دیتا ہے۔ یہی چیز اس کی خاندانی زندگی میں کارفرما ہے۔ عائلی زندگی ایک ایسا ادارہ ہے۔ کہ مرد و عورت دونوں مل کر اسے چلاتے ہیں۔ اس کی بنیاد دونوں کی یکساں اہمیت و ضرورت پہ رکھی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ نور، سورۂ احزاب، سورۂ طلاق، سورۂ تحریم میں اسی خاندانی زندگی اور اس کی تنظیم پہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن نے کئی دیگر مقامات پر اس اہم تنظیم کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے احکام اور حقوق و فرائض بتائے ہیں قرآن کا پیش کردہ عائلی نظام ایک کامل اور مکمل اور دقیق تنظیم ہے۔ یہ انسانی تمدن کی پہلی بنیاد اور انسانی حقوق کی زنجیر کی پہلی اہم کڑی ہے۔ ہم پچھلے صفحات میں بتا چکے ہیں۔ کہ انسان کے فرزند کو اپنی پرورش اور زندگی گذارنے کے لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے۔ جو اس کی مادی و روحانی اور اخلاقی حفاظت و صیانت کا وظیفہ سرانجام دے سکے۔ اس کی تربیت کرے اور انسانی اجتماع کے لئے اسے اپنا حصہ بطریق احسن پورا کرنے کا ڈھنگ سکھائے یہی ادارہ اسلام کا عائلی نظام ہے۔ اس کے مقاصد یہ ہیں۔ کہ انسانی تعلقات کے قیام، بقاء و استقرار اور سکون و اطمینان کی ضمانت دی جائے۔ اس کی صورت اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ عورت کو اس کا فطری مقام دیا جائے، اسے تکریم و احترام مہیا کیا جائے۔ اس کے حقوق کی ادائیگی کا بندوبست کیا جائے اور اس کی انفرادی شخصیت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا جائے۔ گھر میں مرد و عورت کا مقام مشخص کیا جائے۔ دونوں کے حلقہ ہائے کار اور حقوق و فرائض متعین کئے جائیں اور حتی الوسع باہمی تصادم سے دونوں کو بچانے کا اہتمام کیا جائے۔ زیرِ تفسیر آیات نے اس سلسلے میں مرد و عورت دونوں کو حکم خدا و رسول کی طرف لوٹنے کا حکم دیا ہے۔ نہ کہ اپنی اپنی ہوا و خواہشات کی طرف۔ ان آیات میں واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ عائلی زندگی میں قوامیت مرد کے ہاتھ میں ہے، کیوں کہ وہی اس منصب کا اہل تھا اسی کو وہ خصائص دیئے گئے تھے۔ جن کی بناء پر وہ یہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکے۔ پھر ان آیات میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ عائلی زندگی کی بنیادوں کو ہلانے اور کھوکھلا کرنے والے

Marfat.com

امراض کا کب اور کیسے علاج کیا جائے۔ اور جب داخلی نہیں بلکہ خارجی طور پر اس اہم ادارے کے ٹوٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو کیا کیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں وہ مالی، صنعتی اور تجارتی ادارے جن کی اہمیت عائلی زندگی کے ادارے جیسی نہیں ہے ان میں بھی انتظام و انصرام اور اہم ترین ذمہ داریاں صرف اہل ترین افراد ہی کو سونپی جاتی ہیں۔ پھر بھلا خاندانی زندگی کا اہم ترین ادارہ کیوں کر مہمل چھوڑا جا سکتا تھا چنانچہ اسلام نے اس ادارے میں بھی جو رکن ادارہ جس کام کے لائق تھا وہ اسی کے سپرد کیا ہے۔

یہ بات تو فطری اور ہر عقل مند کے نزدیک مسلم ہے کہ حمل، وضع حمل، رضاعت اور تربیت اولاد کا کام صرف عورت ہی سرانجام دے سکتی ہے۔ یہ کام بہت اہم اور عظیم ہیں۔ یہ اتنے بڑے کام ہیں۔ کہ ان کی موجودگی میں عورت پر کوئی اور بوجھ بھی ڈال دینا صرف ظلم و ستم ہی کہلا سکتا ہے۔ یہ کام مرد کے بس کے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کے جسم، نفسانی قوتوں اور عقل و فکر میں تمام قابلیتیں رکھ دی ہیں۔ جن سے وہ بلا تکلف اور بلا مشقت یہ کام سرانجام دے سکتی اور دیتی ہے۔ پس یہ سراسر عدل و انصاف کا نظری تقاضا ہے۔ کہ نفسِ واحدہ کے دوسرے حصے (مرد) کے سپرد دوسرے فرائض کئے جائیں، مثلاً ضروریاتِ زندگی کا اہتمام، حمایت و حفاظت کا انصرام اور گھر کے باہر کی زندگی کے تمام دوسرے معاملات۔ چنانچہ مرد کی عقلی، جسمانی اور عصبی قوتیں اسی قسم کی بنائی گئیں۔ جو اس کے فرائض کی ادائیگی کے لئے ضروری تھیں۔

یہی راز ہے کہ عورت "صنف نازک" ہے۔ اس میں رقت و عطوفت، سرعت انفعال، مہربانی اور دردمندی رکھی گئی ہے۔ تاکہ وہ نسلِ انسانی کی پرورش اور نگہداشت کر سکے۔ یہ خصائص فطری اور گہرے ہیں۔ اور عورت انہیں بلا تکلف سرانجام دے سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مرد میں شدت و صلابت خشونت دیر سے متاثر ہونا، غیرت و حمیت اور فعلیت کی صفات رکھی گئی ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ اسے عورت اور بچوں کی حمایت و حفاظت اور عزت و حمیت کے لئے مرنے مارنے کے جذبات کی ضرورت تھی۔ انتظامِ معاش کی ضرورت تھی اور معاملاتِ حیات میں گہرے غور و فکر اور تدبر کی ضرورت تھی۔ پس یہ چیزیں تقاضائے فطرت و انصاف تھی کہ مرد کو قوام بنایا جائے اور تدبیرِ معاش اور تقسیم و انفاقِ مال کا کام اس کے سپرد کیا جائے۔ پس اس تفضیل فطری میں کوئی بے انصافی اور عورت پر کوئی ظلم و جبر نہیں۔ بلکہ یہ عین اس کے حق میں رحمت و فضلِ الٰہی ہے۔ اگر اس کے وظائف حیات کے ساتھ کچھ اور فرائض بھی اس پر ڈال دیئے جاتے، مثلاً انتظامی معاملات اور کسبِ معاش وغیرہ تو یہ البتہ ضرور

Marfat.com

ظلم وستم ہوتا۔

یہ ایک واضح اور فطری تقسیم کار ہے۔ جو اس کے خلاف کہتے یا سوچتے ہیں۔ وہ فطرت انسانی سے ناواقف ہیں یا جان بوجھ کر ناواقف بنتے ہیں۔ وہ عورت پر ظلم اور عدوان کے مرتکب ہیں۔ اسی جہالت وجاہلیت کا نتیجہ فساد کی صورت میں نکل رہا ہے۔ انسانی تہذیب کی ناکامی کا ایک بڑا باعث یہی ہے۔ جب بھی عورت کو اس کے فطری مقام سے ہٹایا گیا ہے۔ نتیجہ یہی نکلا ہے۔ جو آج نکل رہا ہے۔ شہوت پسند انسانوں کی آوارگی اور چند آوارہ مزاج عورتوں ——— نام نہاد خواتین ——— کا احساس کمتری وکہتری انسانوں کو جہنم میں گرانے کا باعث بن رہا ہے۔ گھریلو نظام کا بگڑ جانا دراصل انسانوں کے لئے ایک بڑی بدبختی کا سبب ہے۔

عائلی نظام کی یہی اہمیت ہے۔ جس کے سبب اسلام نے ان عورتوں کے لیے جو نافرمان ہوں، عائلی قوانین کی شکست وریخت کا سبب بنتی ہوں، اور معاشرے میں فساد کا باعث ہوتی ہوں۔ طرح طرح سے سمجھانے، ترک ملاقات کرکے راہ پر لانے بلکہ تادیب وسیاست تک سے دست کرنے کی اجازت دی ہے۔ جو لوگ صرف مار پیٹ کے لفظ سے ہی بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور اسلام پر زبان طعن دراز کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اسلام کی وہ تعلیم نہیں جو گھریلو زندگی کی عظیم وخطیر اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ علاج ان عورتوں کا ہے جو معاشرے کی شکست وریخت کا باعث ہیں اور یہ پہلا ہی علاج نہیں بلکہ تیسرا اور آخری علاج ہے۔ علاج بہرحال علاج ہے۔ وہ کوئی خوش گوار چیز نہیں ہوتی، مرض کے دفعیہ کی تدبیر ہوتی ہے۔ اور بس علاج بذات خود مقصود نہیں بلکہ بعض نقائص کو دور کرنے کا ایک ناگزیر اور ناخوشگوار ذریعہ ہے۔ پھر یہ عورت کا علاج نہیں بلکہ اس درجہ تک پہنچ جانے والی بہت ہی کم عورتیں ہوں گی۔ اسلام نے ضرب وزدوکوب کو کبھی پسندیدہ فعل نہیں جانا۔ مگر بعض دفعہ اس کے بغیر چارہ نہیں رہتا، اسلام کے احکام عورتوں سے حسن سلوک کے بارے میں واضح ہیں۔ احادیث میں ان کی تفصیل موجود ہے۔ خود قرآن نے حیات زوجیت کا مقصد مودت ورحمت قرار دیا ہے۔ مگر کبھی نہ کبھی بطور آخری علاج کے بعض عورتوں کے لئے "ضرب" کی ضرورت بھی ناگزیر اور واقعی وعملی ہے۔ پس اس کی گنجائش اگر بالکل نہ رکھی جاتی تو اسلام کے کامل اور فطری احکام پر نقص کا اعتراض آتا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ

اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو اور ماں باپ کے

اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں اور

Marfat.com

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ

ہمسایہ قرابت دار اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے

بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ

اور مسافر کے ساتھ اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴿۳۶﴾

بے شک اللہ کو پسند نہیں آتا اترانے والا اور بڑائی کرنے والا

نِ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ

جو بخل کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں لوگوں کو

بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ

بخل اور چھپاتے ہیں جو ان کو دیا اللہ نے اپنے

فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾

فضل سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لئے عذاب ذلت کا

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ

اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کے دکھانے کو اور

وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ قیامت کے دن پر

وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ

اور جن کا ساتھی ہو شیطان تو وہ بہت برا ساتھی

Marfat.com

قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا

ہے اور کیا نقصان تھا ان کا اگر ایمان لاتے

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا

اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور خرچ کرتے اللہ کے

رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

دیئے ہوئے میں سے اور اللہ کو ان کی خوب خبر ہے

شرح الفاظ

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ : خدا کی عبادت کا معنیٰ ہے۔ اس کے آگے خضوع و خشوع، قلب و جوارح سے پوشیدہ اور علانیہ اس کی تعظیم کا شعور و احساس پیدا کرنا اور اس کی وحدانیت کا اعتراف کر کے اس کے سامنے خلوص کا اظہار کرنا کیوں کہ کوئی عمل بھی اس کے بغیر قبول نہیں ہوتا۔ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا : والدین سے حسن سلوک کرنا، ان کی خدمت میں قائم رہ کر ان سے نیکی کا قصد کرنا، ان کے مطالب و ضروریات کو پورا کرنے کی سعی کرنا، بقدر استطاعت ان پر مال خرچ کرنا۔ اور ان سے کلام میں خشونت کو کام میں نہ لانا۔ ذِي الْقُرْبٰى : قرابت دار مثلاً بھائی، چچا، ماموں اور ان کی اولاد۔ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى : رشتہ دار، ہمسایہ، الْجَارِ الْجُنُبِ : اجنبی، ہمسایہ، الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ : رفیق سفر یا وہ شخص جو تم سے نفع کی امید میں تمہارے پاس آ پڑا ہو۔ ابن السَّبِيْلِ : مسافر یا مہمان۔ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ : تمہارے غلام اور لونڈیاں۔ مُخْتَالًا : مغرور و متکبر۔ فَخُوْرًا : فخر یلا، وہ شخص جو تکبر اور بڑائی جتانے کے لئے اپنی اچھائیاں گنوائے۔ اَعْتَدْنَا : ہم نے تیار کیا، مہیا کیا۔ مُهِيْنًا :

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۲۲۔

Marfat.com

رسوا کن، ذلیل کرنے والا۔ رِئَاءَ النَّاسِ : ریاکاری اور فخر کے طور پہ لوگوں کو دکھانا۔ قَرِیْنًا : ساتھی۔ دوست۔ مَاذَا عَلَیْهِمْ : ان کا کیا نقصان تھا۔؟

اوپر کی آیات میں گھریلو زندگی کے حقوق و فرائض بیان فرمائے گئے ہیں۔ ان کے بعد مناسب تھا کہ حقوق اللہ کا شعور بیدار کیا جاتا۔ لوگوں کے مختلف گروہوں سے حسنِ معاملہ کی تلقین کی جاتی۔ ضرورت و شدت کے اوقات میں انفاقِ مال اور عدم بخل کا حکم دیا جاتا اور نیکی میں خلوص پیدا کرنے کا حکم دیا جاتا۔ تاکہ لوگ محض خدا کے لیے نیکی کریں۔ نہ کہ حرص و لالچ اور ریاء و شہرت کی خاطر۔ کیونکہ ایسے اعمال کا خدا کے ہاں کوئی اجر و ثواب نہیں، نہ ان سے خدائی عقاب سے بچنے کی امید ہو سکتی ہے۔

عبادت[1] اور ہر نیک کام خدا پہ یقین کر کے اور ثوابِ آخرت کی توقع سے کرو۔ فخر و ریاء سے مال دنیا بھی شرک ہے گو کم درجہ کا ہے۔

ان آیات میں حکم ہوا ہے کہ ہر ایک کا حق درجہ بدرجہ تعلق کے موافق اور حاجتمندوں کے مناسب ادا کرو۔ سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ پھر ماں باپ کا، پھر درجہ بدرجہ سب واسطہ داروں اور حاجت مندوں کا۔ اور ہمسایہ قریب اور غیر قریب سے مراد قرب و بعد نسبی ہے یا قرب و بعد مکانی۔ پہلی صورت میں یہ مطلب ہوگا۔ کہ ہمسایہ قرابتی کا حق ہمسایہ اجنبی سے زیادہ ہے اور صورت ثانیہ کا مدعا یہ ہوگا۔ کہ پاس کے ہمسایہ کا حق بعید سے جو کہ فاصلہ سے رہتا ہے زیادہ ہے۔ اور پاس بیٹھنے والے میں رفیق سفر اور ہمیشہ کے اور کام کے شریک اور ایک آقا کے دو نوکر اور ایک استاد کے دو شاگرد اور دو دوست اور شاگرد اور مرید وغیرہ سب داخل ہیں۔ اور مسافر میں مہمان اور غیر مہمان دونوں آ گئے۔ اور مال مملوک مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ میں غلام لونڈی کے علاوہ مملوک چیزیں مثلاً حیوانات بھی شامل ہیں۔ آخر میں فرمادیا کہ جس کے مزاج میں تکبر اور خود پسندی ہوتی ہے، کہ کسی کو اپنے برابر نہ سمجھے، اپنے مال پہ مغرور اور عیش میں مشغول ہو، وہ ان حقوق کو ادا نہیں کرتا۔ سو اس سے احتراز رکھو اور حذر رہو۔

اللہ تعالیٰ خود پسندوں اور متکبروں کو پسند نہیں فرماتا۔ جو کہ بخل کرتے ہیں۔ اور اپنے مال اور علم کو (جو خداداد ہے) اور لوگوں سے چھپاتے ہیں۔ کسی کو نفع نہیں پہنچاتے اور قولاً و عملاً دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دلاتے ہیں۔ یہ آیت، ۲ یہودیوں کے بارہ میں نازل ہوئی جو فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں خود بھی بخل کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کو بھی روکنا چاہتے تھے۔

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۸

Marfat.com

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف تورات میں مذکور تھے۔ اور حقانیتِ اسلام کی جو آیات موجود تھیں ان کو چھپاتے تھے۔ سو مسلمانوں کو اس فعل سے اور ان لوگوں سے احتراز لازم ہے۔

اور وہ خود پسند، متکبر لوگ وہ ہیں۔ کہ اپنا مال دوسروں کو دکھانے کو خرچ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کے لئے خرچ کرتے ہیں تو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔ لیکن لوگوں کے دکھانے کو اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا نہ اللہ پہ ایمان ہے نہ قیامت کے دن پہ، کہ حصول رضائے حق تعالےٰ اور تحصیل ثواب اخروی ان کو مقصود ہو۔ اور اللہ کے ہاں پسندیدہ یہ ہے۔ کہ ان حقداروں کو دیا جائے جن کا ذکر اوپر ہو چکا۔ اور دینے میں اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کی توقع ہو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں جیسا بخل کرنا برا ہے ویسا ہی لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرنا برا ہے۔ اور ایسا کام وہی کرتے ہیں جن کا رفیق شیطان ہو جو ان کو ایسے کام پہ آمادہ کرتا ہے۔

ان کافروں کا کچھ نقصان نہ تھا۔ اگر کفر کے بجائے اللہ اور قیامت پہ ایمان لاتے اور بجائے بخل و ریا اللہ کی راہ میں مال کو خرچ کرتے بلکہ اس میں ان کا سراسر نفع تھا۔ مزہ تو اس میں ہے کہ جس کام کو وہ اختیار کر رہے ہیں۔ پہلی آیت میں اموالھم کا لفظ فرمایا تھا، اس آیت میں ممارزقھم اللہ فرمایا ہے۔ یعنی پہلی آیت میں مال کو ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اس میں خدا کی طرف۔ اس میں لطیف اشارہ ہے۔ کہ وہ لوگ اپنا مال سمجھ کر جس طرح جی چاہتا ہے خرچ کرتے ہیں۔ ان کو تو چاہئے تھا کہ اللہ کا مال سمجھ کر اس کے حکم کے موافق خرچ کرتے۔

حسنِ سلوک کی تاکید والدین سے لے کر غلاموں اور باندیوں تک معاشرہ کے ہر طبقہ کے ساتھ، اور پھر اس حکم کا عطف توحید و عبادتِ الٰہی پہ۔ دنیا کی کسی دوسری آسمانی کتاب میں اس بے نظیر تعلیم کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اہل حقوق کافر ہوں تب بھی احسان کا حکم ہے، البتہ مسلمان کا حق اسلام کی وجہ سے ان سے زائد ہے۔ پڑوسی تین قسم کے ہیں۔

(۱) وہ جن کے تہرے حق ثابت ہوں :-

(ا) حقِ جوار (ب) حقِ قرابت، اور

(ج) حقِ اسلام

یہ مسلمان رشتہ دار ہمسایہ ہے۔

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۸۸، تفسیر ابن کثیر ۲ صفحہ ۲۴، ۲۸،

Marfat.com

(۲) وہ جن کے دو ہر سے حق ثابت ہیں۔
(ا) حقِ جوار، اور (ب) حقِ اسلام
یہ مسلمان غیر رشتہ دار ہمسایہ ہے۔
(۳) وہ جن کا ایک ہی حق ثابت ہے۔

(ا) حقِ جوار

اور یہ غیر مسلم ہمسایہ ہے (ابونعیم، بزار) بعض مفسرین نے اس آیت سے ہی یہ تین قسم کے ہمسایہ نکالے ہیں۔ رفاقت و مصاحبت کم ہو یا زیادہ، عارضی ہو یا مستقل وہ الصاحب بالجنب میں داخل ہے۔ بیوی بھی اس میں داخل ہے۔

قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں اللہ سبحانہ نے اپنی عبادت کے حکم فوراً بعد والدین سے حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا قرابت داروں کی حق رسی کا حکم بھی کتاب و سنت میں بہت دفعہ آیا ہے۔ اس طرح ہمسایہ کے حقوق کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ اور عام لوگوں کے حقوق کے ساتھ ساتھ تیامیٰ و مساکین اور مسافروں کے حقوق کی بھی بہت تاکید ہے۔ اسلامی معاشرت اسی پر عمل کا نام ہے۔

بخل کے باعث قطع رحمی اور فسق و فجور وغیرہ۔ مہلک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ احادیث میں ان کی ممانعت میں آچکا ہے۔ اس کے برعکس سخاوت و جود و کرم اور سماحت کا حکم دیا گیا ہے۔ کفر کے مقابلہ میں شکر کی فضیلت کتاب و سنت میں آئی ہے، کفر سے مراد کفرانِ نعمت بھی ہے۔ اور کفر انکاری بھی۔ دونوں درجہ بدرجہ بڑے اور قابلِ مذمت ہیں۔

لہ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ .... اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے۔ مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اپنی حیثیت سے گر کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور اہل و عیال پر خرچ کرے، نہ بندگانِ خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصہ لے۔ لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بے چارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ کی سخت ناشکری ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اِذَا نَعَّمَ نِعْمَةً عَلٰى عَبْدٍ اَحَبَّ اَنْ يُّظْهِرَ اَثَرَهَا عَلَيْهِ۔ اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے۔ تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس

لہ تفہیم القرآن جلد ا صفحہ ۳۵۲۔

Marfat.com

بندے پر ظاہر ہو، یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن اور اس کی داد و دہش، ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا رہے۔

عبادت کا معنیٰ ہے۔ معروف اسباب سے، ماوراء غیبی تسلط و اقتدار کے سامنے جھکنا اس کی خیر کی امید رکھنا اور اس کی شر سے ڈرنا۔ ایسا تسلط سوائے اللہ تعالےٰ کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ پس کسی اور سے نہ خیر کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ نہ اس کے شر کا خوف۔ جو شخص یہ سمجھے کہ خدا کے علاوہ بھی کسی کا کوئی ایسا تسلط و اقتدار ہے، وہ مشرک ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات میں کسی اور کو شریک ٹھہرانے سے نہی فرما دی ہے۔ تو اس کے وجود سے انکار کرنا (کفر و الحاد) اور اس کی الوہیت کا انکار اس میں بدرجہ اولےٰ داخل ہے۔

اشراک باللہ کی مختلف اقسام ہیں۔

(۱) مشرکین عرب کی مانند بت پرستی کرنا انہیں اولیاء و شفعاء بنا کر ان کے توسل سے قرب الٰہی ڈھونڈھنا، انہیں حاجت روا جاننا، قرآن کی بہت سی آیات میں اس شرک کا رد وارد ہوا ہے۔ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفَىٰ۔

(۲) نصاریٰ جیسا شرک، کہ انہوں نے مسیحؑ کی پوجا کی، اسے خدا یا ابن اللہ یا خدائی کا تیسرا رکن ٹھہرایا اور اپنے علماء و مشائخ کو تحلیل و تحریم کا اختیار دے دیا۔ اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ۔

(۳) شرک کی قوی ترین قسم وہ ہے۔ جو دعا و شفاعت کے نام سے پھیلتی ہے۔ بلا سند غیروں کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان وسیلہ اور وسیط (درمیانی) "وچولا" بنا لیا جاتا ہے اس شرک کی موجودگی میں نماز روزہ یا کوئی اور عبادت کارگر نہیں۔ غیر اللہ کو پکارنا اور جاننا کہ "میری عرض اس کے آگے ہے، اور یہ خدا سے مانگ کر مجھے دے گا"۔ مثلاً اے شیخ العرب سید فلاں، اے شیخ بدوی، اے سیدی، ابراہیم دسوقی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب شرک ہے۔ جو افسوس مسلم قوم میں جو اصلاً موحد اور داعی توحید تھی، پھیل چکا ہے۔ ان آیات میں متکبر اور ریاکار دونوں کی مذمت وارد ہوئی ہے متکبر کے لئے مختال اور فخور دو لفظ آئے ہیں۔

(۱) مختال وہ ہے جس کی حرکات و سکنات سے تکبر ظاہر ہو۔

(۲) فخور وہ جس کے اقوال سے کبر کا اظہار ہو۔

اسی طرح بخیل کی مذمت بھی وارد ہوئی ہے۔ تکبر جس طرح کسی شخص کی ذات میں ہوتا

سلہ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۳۴، ۴۱، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۸۱، ۱۰۴۔

Marfat.com

ہے۔ اسی طرح مال ونسب میں بھی ہوتا ہے۔ ریاکار کا شر بخیل سے کم ہے۔ کیوں کہ ریاکار اپنا مال خرچ کرکے اس کے مقابلے میں اپنے فخر وعزور کو قبول کرنے پر لوگوں کو آمادہ کرتا ہے، گویا کہ وہ ان سے مدح وثنا اور تعظیم کا تقاضا کرکے اپنی نیکی کا عوض مانگتا ہے۔ مگر بخیل اس قدر نفرت وحقارت میں مبتلا ہے۔ کہ وہ نہ کچھ لوگوں پر خرچ کرتا ہے۔ نہ ان سے اپنے کسی حق یا عوض کا تقاضا کرتا ہے۔ بلکہ اس کا مال تو تجوری میں بند ہے اور وہ لوگوں کو اپنی تعظیم پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔

اور اگر بنظر دقیق دیکھا جائے تو ریاکار بھی بخیل ہے۔ کیونکہ وہ اپنا مال ایک مذموم غرض کی خاطر ان لوگوں پر خرچ کرتا ہے جن کا اس پر کوئی حق نہیں آتا۔ مگر حق داروں کے سلسلے میں بخل کرتا ہے۔ مثلاً بیوی، والدین، اولاد، خادم اور قرابت دار اور وہ اپنے انفاق سے عام یا خاص نفع کا قصد نہیں رکھتا۔ بلکہ صرف تعظیم ومدح کے مواقع تلاش کرتا ہے۔ بعض دفعہ اس کا انفاق مضر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی فسق یا فتنے میں مددگار بننا۔ پس یہ شخص ایک تاجر ہے جو لوگوں سے اپنی تعظیم خریدتا ہے۔ اور انہیں اپنی خدمت کے لئے مسخر ومطیع کرتا ہے۔

ریاکاروں کو غیر مومن فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ ان چیزوں کی توقع رکھتے ہیں۔ جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں مثلاً مدح وثناء، تعظیم اور بڑھا چڑھا کر ذکر کیا جانا۔ اور اللہ نے نیک عمل کی جو جزا مقرر کی ہے۔ اس پر انہیں بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ خدائی تقرب سے زیادہ بندوں کے تقرب کا خیال رکھتے ہیں۔ گویا ان کی نظروں میں اللہ تعالےٰ بندوں کی نسبت کم درجہ کا ہے۔ (معاذ اللہ) پس ایسے لوگوں کو خدا اور قیامت پر حقیقی ایمان رکھنے والا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ ان کا ایمان ایک قسم کا تخیل ہے۔ جس کی تائید میں ان کے دلوں میں کوئی اثر نہیں ہوتا اور ان کا نفس احکام الٰہی کا حقیقت میں مطیع وفرماں بردار نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ صرف اندھے مقلد ہیں۔ جو لوگوں سے کچھ باتیں سن کر بظاہر ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ اگر اللہ کی توحید اور جزاء وسزا پر ان کا مخلصانہ، حقیقی اور صحیح ایمان ہوتا تو ان کا کبھی یہ حال نہ ہوتا۔

[1] ان آیات کا سورت کے مجموعی اصولی مضمون اور اساسی موضوع سے گہرا تعلق ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں۔ کہ اس کا مرکزی وبنیادی موضوع اسلامی معاشرہ ہے۔ زیر تفسیر آیات میں اسلامی معاشرے کی تنظیم، اسے جاہلیت کے اثر سے چھڑانا، جدید اسلامی معاشرتی احکام کو نافذ کرنا

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۶۹، ۷۵

Marfat.com

اور اہل کتاب سے انہیں بچنے کی تلقین کرنا مدّنظر ہے، مدینہ کے یہود اسلامی جماعت میں سازشوں کا جال بچھاتے تھے۔ اس میں شر و فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس کی نشو و نما میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے تھے۔ اور ان کے باہمی تکافل و تعاون کی روح کو مُردہ کرنا چاہتے تھے۔

اسلامی معاشرہ کی پہلی بنیاد توحید خالص ہے۔ اسی سے اس کی زندگی پھوٹتی ہے اور وہی اس کے نظامِ حیات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے ان آیات میں پہلا حکم یہی دیا گیا ہے۔ پھر گذشتہ آیات میں عائلی زندگی کے کچھ احکام گذرے ہیں۔ مگر موجودہ آیات میں خاندان سے آگے گذر کر وسیع بنیادوں پر معاشرتی احکام دیئے گئے ہیں۔ ان احکام کو عبادت و توحید الٰہی کے امر اور شرک کی نہی سے شروع کیا گیا ہے۔ پھر والدین، قرابت داروں یتامیٰ و مساکین، ہمسایوں اور مسافروں سے احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام مجرّد ایک عقیدے کا نام نہیں بلکہ عقائد و اعمال، اخلاق و آداب، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکمرانی کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد بخل، فخر و غرور اور تکبر اور کتمانِ حق کی نہی کے ساتھ ساتھ ریاکاری کی مذمت و قباحت واضح فرمائی گئی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اسلامی احکام کا تعلق صرف عبادات سے ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر معاملے سے ہے۔

اسلام کے تمام اساسی تصورات، انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام احکام و نواہی ایک اصل سے پھوٹتے ہیں اور وہ ہے عقیدۂ توحید اسلام کے تمام احکام میں یہی روح جاری و ساری ہے۔ اسی سے معاشرتی زندگی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں معاشرتی احکام کے درمیان توحید و عبادت الٰہی کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلامی زندگی میں اقتصادی، سیاسی، اخلاقی، قومی اور بین الاقوامی ادارے اسی ایک بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔

ان آیات میں توحید کے بعد وسیع تر بنیاد معاشرتی احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ اور پھر مضمون کا رخ اخلاقیات کی طرف پھر گیا ہے۔ اخلاق اور معاشرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بخل، ریاکاری اور تکبر و غرور سے اجتماعی فساد پیدا ہوتا ہے۔ باہمی حقوق کی ادائیگی کے لئے ان سے اجتناب لازم ہے۔ یہ چیزیں کفر کے اخلاق ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں سماحت و سخاوت، اخلاص اور مودّت و رحمت کی بنیاد پہ مساوات اسلامی اخلاق کہلاتے ہیں۔ افراد جب تک اسلامی اخلاق سے رنگین نہ ہو چکے ہوں وہ اسلامی معاشرت کی ذمہ داریوں کو اٹھانے اور نبھانے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ یہی باعث ہے کہ ان آیات میں نہایت شدید الفاظ میں ان بُرے اخلاق کی مذمت و تقبیح فرمائی گئی ہے۔

Marfat.com

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَإِنْ تَكُ

بے شک اللہ کسی کا حق نہیں مارتا ایک ذرہ برابر اور اگر نیکی

حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ أَجْرًا

ہو تو اس کو دُگنا کر دیتا ہے اور دیتا ہے اپنے پاس سے بڑا

عَظِيمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ

ثواب - پھر کیا حال ہوگا جب بلائیں گے ہم ہر امت میں سے

وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴿۴۱﴾

احوال کہنے والا اور بلائیں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا

اس دن آرزو کریں گے وہ لوگ جو کافر ہوئے اور

الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْأَرْضُ ۚ وَلَا

رسولؐ کی نافرمانی کی تھی کہ برابر ہو جائیں زمین کے اور نہ

ع ۶ ۹ ۳ يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات۔

شرح الفاظ

مِثْقَالَ .... ہر وہ مقدار جس میں کوئی ثقل (بوجھ) ہو خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹی مقدار ہی کیوں نہ ہو۔ اصل لغت میں تو یہ معنیٰ تھا۔ پھر ایک خاص وزن پر مثقال کا اطلاق ہونے لگا۔ یہاں پہلا معنیٰ یعنی مقدار مراد ہے۔ ذَرَّةٍ چھوٹے چھوٹے اجسام مثلاً چیونٹی، چیونٹی کا سر

تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۴۱، ۴۲،

Marfat.com

رائی کا دانہ اور اندھیری کوٹھڑی کے اندر داخل ہونے والی سورج کی شعاعوں میں اڑنے والے چھوٹے چھوٹے ذرات، یہ سب ذرّہ کہلاتے ہیں۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے مروی ہے۔ کہ انہوں نے ذرّہ کی تفسیر کرتے ہوئے ہاتھ کو مٹی میں ڈالا اور پھر اٹھا کر پھونک ماری اور فرمایا۔ کہ ان تمام اڑنے والی چیزوں کو ذرّہ کہا جاتا ہے۔ لَا یَظْلِمُ ظلم کا معنیٰ نقص ہے، قرآن کہتا ہے۔ کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَیْئًا مِنْ لَّدُنْهُ اپنی طرف سے اپنے پاس سے۔ یُضٰعِفْهَا اسے دُگنا تگنا کریگا۔ عَصَوُا عِصیان سے انہوں نے نافرمانی کی۔ تُسَوّٰی۔ مصدر سے یعنی برابر کرنا۔ یہاں مراد ہے۔ بے نام ونشان کر دینا، کیونکہ جسے دفن کر کے زمین برابر کر دیں اُسکا نام ونشان جاتا رہتا ہے۔ حَدِیْثًا بات چیت، کلام۔

متکبرین کی صفات اور ان کی بدحالی اور سزا کے بیان کے بعد مزید تاکید وتشدید کے لئے فرمایا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کسی پر ظلم وزیادتی نہیں کرتا، نہ اس کے حق میں کمی کرتا ہے۔ بلکہ ہر ایک کو پورے صحیح تول سے جزاء وسزا دیتا ہے۔ نیکوکاروں کے لئے اس میں مزید نیکی کرنے کی ترغیب ہے اور انہیں عمل پر ابھارا گیا ہے۔ اس معنیٰ میں فرمایا ہے فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ۔

[1] اللہ تعالیٰ کسی کا حق ایک ذرہ کے برابر بھی ضائع نہیں فرماتا۔ سو ان کافروں کو جو عذاب ہوگا۔ عین انصاف اور ان کی بداعمالی کا بدلہ ہے۔ اور اگر ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہوگی۔ تو کئی گنا اس کا اجر دے گا۔ اور اپنی طرف سے ثواب عظیم بطور انعام واحسان کے عنایت کرے گا۔

ان کافروں کا حال کیسا بُرا ہوگا۔ جس وقت کہ بلائیں کے ہم ہر امت اور ہر قوم سے ان کے حالات بیان کرنے والا اور ان کے واقعی معاملات کو ظاہر کرنے والا۔ اس سے مراد ہر امت کا نبی اور ہر عہد کے صالح اور معتبر لوگ ہیں۔ کہ وہ قیامت کو نافرمانوں کی نافرمانی اور فرماں برداروں کی فرماں برداری بیان کریں گے۔ اور سب کے حالات کی گواہی دیں گے۔ اور آپؐ کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر یعنی آپؐ کی امت پر مثل دیگر انبیاء علیہم السلام کے احوال بتلانے والا اور گواہ بنا کر لائیں گے اور یہ بھی احتمال ہے۔ کہ هٰٓؤُلَآءِ کا اشارہ انبیائے کرام یا کفار، مذکورہ بالا کی طرف ہو۔ اول صورت میں جب انبیاء مراد ہوں۔ تو مطلب یہ ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیائے سابقین کی صداقت کی گواہی دیں گے۔ جب کہ ان کی امتیں ان کی تکذیب کریں گی اور دوسرے احتمال سے جب کہ کفار مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ انبیائے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹

Marfat.com

سابقین جیسا اپنی اپنی امت کے کفار و فساق کے کفر و فسق کی گواہی دیں گے، آپؐ بھی اپنے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ان سب کی بداعمالی پہ گواہ ہوں گے۔ جن سے ان کی خرابی اور برائی خوب ثابت ہوگی۔ اس دن کافر اور نافرمان لوگ اس بات کی تمنا کریں گے۔ کہ کاش ہم زمین میں ملا دیئے جاتے، اور مٹی میں مل کر نیست و نابود ہو جاتے۔ آج پیدا نہ ہوتے، اور ہم سے حساب کتاب نہ لیا جاتا۔ لیکن وہ لوگ اللہ سے کسی بات کا اخفا نہ کر سکیں گے۔ اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کی نیکی بلا اجر رہ جائے یا کوئی بدی کسی کے حساب میں خواہ مخواہ لکھ دی جائے۔ اللہ جو خالق مطلق، حاکم مطلق اور مالک مطلق ہے۔ اس کے کسی فعل پہ بھی ظلم کا اطلاق حقیقۃً کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتا۔ یہاں مراد تو یہ ہے۔ کہ وہ ظاہر میں یعنی مجازی معنوں میں بھی ظلم نہیں کرتا آیت میں دو پہلو اور بھی ہیں۔ ایک تو مشرک قوموں نے اپنے دیوی دیوتاؤں کو ظالم، ستمگر اور خونخوار مانا ہے۔ مثلاً کالی مائی، حق تعالیٰ کی تنزیہ اس قسم کی صفات سے کلیۃً ہو گئی۔ دوسرے جن آیتوں میں حق تعالیٰ کی قوت مطلقہ اور کامل اختیارات کا اثبات ہے۔ ان سے ممکن تھا کہ مسلمانوں کو بھی یہ خیال ہو جاتا کہ ہر طرح کا ظلم اس قادر مطلق کے لئے روا ہے، اس کی تردید بھی آیت سے ہو گئی۔ اسلام کا خدا نہ کوئی خونخوار دیوتا ہے۔ نہ ایسا معذور کہ کسی پہ کرم کرنا بھی چاہئے تو اپنی صفت عدل کو برقرار رکھنے کے لئے کسی اور پر اسے ظلم کرنا پڑے۔ اس آیت سے شرک اور مسیحی شرک دونوں کی تردید ہو گئی۔ کہ عدل کا پہلو برائی کرنے والوں کے لئے ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے زائد از استحقاق بلکہ بلا استحقاق بھی دے سکتا ہے۔ ہاں برائی کا بدلہ صرف اس کے مطابق ہوگا۔ کم تو ہو سکتا ہے زیادہ نہیں[1]

حدیث میں وارد ہے۔ کہ آیت ۴۱ پڑھ کر رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے آنسو مبارک جاری ہو جایا کرتے تھے۔ (ابن جریر) یہ احساس ذمہ داری اور خوف و خشیت کے غلبہ سے ہوتا تھا۔ اور اس میں ان بیدردوں اور ظالموں کے لئے نصیحت ہے۔ جو قرآن کو کلام محمدیؐ ٹھہراتے ہیں۔ کیا کوئی اپنے گھڑے ہوئے کلام سے بھی رو دیتا ہے۔

بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابیؓ بن کعب سے فرمایا اللہ تعالےٰ نے مجھے تم سے کچھ قرآن سننے کا حکم دیا ہے۔ ابیؓ نے پوچھا کہ کیا اللہ تعالےٰ نے میرا نام لیا ہے حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں! اس سے ابیؓ پہ ایک وجد کی سی حالت طاری ہو گئی۔ پھر انہوں نے یہی

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۲، ۱۹۳، [2] تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۰،

Marfat.com

آیتیں پڑھنی شروع کیں۔ جب یہاں تک نوبت پہنچی تو آنحضرتؐ قوم کی حالت کے خیال سے زار زار روئے اور فرمایا اے ابیؓ اب بس کر!

بخاری کی دوسری روایت میں یہ قصہ عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہوا ہے۔ اور کچھ اور صحابہ سے بعض اور روایات بھی ہیں۔ خلاصہ ان کا یہی ہے۔ کہ ان آیات کی تلاوت یا سماعت کے وقت حضورؐ پر ایک خاص قسم کا اثر طاری ہو جاتا تھا۔ اور میدان حشر کا نقشہ سامنے آجاتا تھا۔

ظلم کا وقوع اللہ تعالےٰ کی طرف سے نہیں ہوتا کیوں کہ ظلم کا معنیٰ نقص ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات رفیع بالکل منزّہ اور پاک صاف ہے۔ اس نے بندوں کو پیدا کر کے حس اور شعور بخشے ہیں۔ احکام دین اور آداب و اخلاق کی راہ واضح کی ہے۔ تاکہ جس ہدایت اور مصلح کو وہ فقط اپنی عقل و حس سے نہیں پا سکتے۔ اسے اس ہدایت سے حاصل کر لیں۔ پھر خیر و شر کی راہ واضح کر دی ہے۔ اور وعدہ و وعید سے اس کی تائید کر دی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی ضرر اٹھائے اور موذی اشیاء میں پڑ جائے تو وہ خود اپنے ہی اوپر ظلم کرتا ہے خداوند تعالیٰ ہر لحاظ سے ظلم سے بری ہے۔

اس کے ساتھ یہ خداوند تعالیٰ کا فضل و احسان اور رحمت ہے۔ کہ نیکی کا بدلہ بے پناہ اور بے حد و شمار دیتا ہے۔ فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً۔

آیت ۱۴۳ کی مانند یہ آیت بھی ہے: لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرۃ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ

اے ایمان والو! نزدیک نہ جاؤ نماز کے جس وقت کہ

اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا

تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو اور نہ

سلہ تفسیر ابن کثیر پ۵ صفحہ ۲۰، ۲۱ (مترجم اردو)

سلہ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۴۲، ۴۴ تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۱۰۴، ۱۱۲

Marfat.com

جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ

اس وقت کہ غسل کی حاجت ہو مگر راہ چلتے ہوتے یہاں تک کہ غسل کر

كُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ

لو۔ اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں یا آیا ہے کوئی شخص تم میں سے

مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً

جائے ضرور سے یا پاس گئے ہو تم عورتوں کے پھر نہ ملا تم کو پانی

فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ

تو ارادہ کرو زمین پاک کا پھر ملو اپنے منہ کو اور

اَیْدِیْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

ہاتھوں کو بے شک اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا۔

شرح الفاظ

سُکٰرٰی: سُکْرٌ سے سَاکِرٌ اور سَکِیْرٌ کی جمع ہے۔ اسی طرح سُکْرٰی بھی جمع ہے جُنُبًا: جُنُبٌ کی جمع ہے، جسے نہانے کی حاجت ہو گئی ہو۔ عَابِرِیْ سَبِیْلٍ: راستہ عبور کرنے والے یعنی مسافر۔ مَرْضٰی: مریض کی جمع ہے۔ اَلْغَائِطُ: پست زمین، نشیب، وادی، جس کا قصد رفع حاجت کے لیے جنگل، صحرا، دیہات اور بستیوں میں کیا جاتا ہے۔ لَامَسْتُمُ: ملامست سے مراد یہاں مطلق ہاتھ لگانا نہیں بلکہ مباشرت و مجامعت ہے۔ تَیَمَّمُوْا: قصد کرو صَعِیْدًا: سطح زمین طَیِّبًا: پاک وصاف۔ فَامْسَحُوْا: پونچھو، ہاتھوں سے چھولو۔ عَفُوًّا: عفو و درگزر کرنے والا۔ غَفُوْرًا: ڈھانپنے والا گناہوں کو بلا حساب بخش دینے والا۔

اوپر کی آیت میں فرمایا گیا ہے۔ کہ روزِ قیامت کے ہول سے وہی بچ سکیں گے۔ جو ایمان و عمل اور خدا و رسولؐ کی اطاعت سے ظاہری و باطنی طہارت حاصل کر چکے ہوں گے اس

لہ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۴۵، ۴۶

Marfat.com

آیت میں اس ظاہری و باطنی طہارت کو حاصل کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ خدا کے حضور مقام اُنس و محبت اور مناجات میں کھڑا ہو کر نماز ادا کرنا اندرونی و بیرونی طہارت کا سب سے بڑا باعث ہے اس سے عقلی و روحانی قوتیں کامل اور بلند ہوتی ہیں۔ دل میں خدا کی یاد کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ جسم ظاہری و باطنی خباثتوں اور نجاستوں سے صاف ہو جاتا ہے۔ جو لوگ یہاں اس طہارت و پاکیزگی سے اس کے حضور کھڑے ہوں گے۔ وہی اس ہولناک دن میں احکم الحاکمین کی عدالت میں باعزت جگہ پانے کے حق دار ہوں گے۔ نماز خداوند تعالیٰ کے جلال و کبریا اور عظمت و رفعت کو نمازی کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ گویا وہ اس وقت خدا کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔ اور جسے یہ طریقہ معلوم ہوگا۔ وہی آگے چل کر کھڑا ہونے کی ہمت پائے گا۔

شروع سورت سے یہاں تک حقوق العباد، معاشرتی احکام اور بعض اخلاق و آداب کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اب ان تمام احکام کے آخر میں مسلمانوں کو صریح خطاب فرما کر خاص نماز کی بابت کچھ احکام دیئے گئے ہیں۔ نماز سب عبادتوں میں اعلیٰ و افضل ہے اور شریعت میں جس قدر اس کا اہتمام فرمایا گیا ہے۔ اور اس کے ارکان، شرائط و آداب وغیرہ کو مفصل بتلایا گیا ہے۔ اتنا کسی اور عبادت کا اہتمام نہیں فرمایا گیا۔ یہاں دو باتوں کی تاکید فرمائی گئی ہے، جو نماز کے متعلقہ امور میں سب سے اہم اور نفس پر شاق ہیں۔ اور ارکان صلوٰۃ کی صحت و خوبی کے لئے بمنزلہ جسم اور جان ہیں۔ اوّل یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تاوقتیکہ جو منہ سے نکلے اسے سمجھ لو۔ اور جنابت کی حالت میں بھی نماز سے دور رہو۔ جہاں تک کہ غسل کر کے تمام بدن کو خوب پاک صاف کر لو۔ کیوں کہ نماز میں دو امر مہتم بالشان ہیں۔

(۱) حضورِ قلب اور خشوع (۲) طہارت اور نظافت

اور جملہ امور متعلقہ صلوٰۃ میں یہی دو امر نفس پر شاق بھی ہیں۔ نشہ حضور و خشوع کے منافی ہے۔ تو جنابت، طہارت و نظافت کے خلاف ہے بلکہ نشہ چوں کہ مثلِ نوم و غشی ناقض وضو ہے۔ تو اس لئے طہارت کے بھی مخالف ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ نماز کو پورے اہتمام سے ادا کرو۔ اور جملہ امورِ ظاہری و باطنی کا پورا خیال رکھو۔ تو یہ چیز نفس پر شاق گزرے۔ باقی اس خاص موقعہ پر اس تاکید اور تقیید فرمانے سے دو نفع معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ یہ کہ احکام کثیرہ مذکورہ بالا میں حق حقوق و معاملات باہمی اور عباداتِ جانی و مالی کا ذکر تھا۔ ان سب کے بجا لانے کے ساتھ بخل و ریا اور خود پسندی اور بڑائی سے بھی مجتنب

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۰۹، تفسیر ابن کثیر پارہ ۵ صفحہ ۳۲، ۴۰، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۰، ۱۹۲

Marfat.com

رہنا چوں کہ نفس پر شاق ہے اور سننے والوں کو خلجان کا موقع ہے۔ لہٰذا یہاں اس دشواری اور خلجان کا علاج بتانا منظور ہے یعنی نماز کو اس کے شرائط ظاہری و باطنی کے ساتھ ادا کروگے تو جملہ اوامر و نواہی مذکورہ کی تعمیل تم پر سہل ہو جائے گی۔ کیوں کہ نماز کی وجہ سے جملہ اوامر و عبادات میں سہولت و رغبت اور تمام منہیات و معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ دیگر آیات و احادیث میں مذکور ہے اور علمائے محققین نے تصریح فرمائی ہے۔

۲۔ یہ کہ احکام کثیرہ سابقہ کو سن کر بعید نہیں کہ کاہل اور کم ہمت اپنے آپ کو مجبور خیال کر کے ہمت ہار دیں اور اس کاہلی کا اثر نماز میں بھی ظاہر ہونے لگے۔ جس کے شرائط و آداب بہت کچھ ہیں اور جو ہر وقت موجود ہے، اس لئے نماز کا اہتمام مناسب ہوا۔ الحاصل جو کوئی اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام و التزام رکھے گا۔ اس کو دیگر جانی و مالی احکام میں بھی سہولت رہے گی، اور جو کوئی دیگر احکام میں کاہلی اور بے پرواہی کرتا ہے۔ اس سے اقامتِ صلوٰۃ میں بھی کوتاہی کرنا بعید نہیں۔

اس سے پہلی آیات میں کفار اہل کتاب کی دو خرابیوں کا بطور خاص ذکر فرمایا گیا تھا۔

(۱) اللہ پر ایمان نہ لانا، اور

(۲) اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا۔ بلکہ دکھاوے اور غرور و تکبر کی خاطر اپنا مال خرچ کرنا۔

اور ظاہر ہے کہ پہلی خرابی کا منشاء تو علم کا نقصان اور جہل کا غلبہ ہے، اور دوسری خرابی کی وجہ ہوائے نفسانی اور اپنی ذاتی خواہش ہے۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ گمراہی کے بڑے سبب دو ہیں

اوّل : جہل جس میں حق و باطل کی تمیز ہی نہیں ہوتی۔

دوم : خواہش و شہوت جس سے باوجود تمیز حق و باطل، حق کے موافق عمل نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ شہوت سے قوت ملکی کمزور ہو جاتی ہے اور قوت بہیمیہ قوی ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ ملائکہ سے بُعد اور شیاطین سے قرب ہے۔ جو بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔ تو اب اسی مناسبت سے حق تعالیٰ شانہ، نے مسلمانوں کو نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے اوّل منع فرمایا کہ یہ جہل کی حالت ہے۔ اس کے بعد جنابت میں نماز پڑھنے سے روکا کہ یہ حالت ملائکہ سے بعد اور شیاطین سے قرب کی حالت ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ جہاں جنبی ہوتا ہے۔ وہاں ملائکہ نہیں آتے۔ واللہ اعلم۔

اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! جب تم کو کفر اور ریا کی خرابی معلوم ہو چکی اور ان کے انسداد کی خوبی واضح ہو چکی تو اس سے نشہ اور جنابت کی حالت میں نماز پڑھنے

Marfat.com

کی خرابی کو بھی خوب سمجھ لو کہ ان کا منشاء بھی وہی ہے۔ جو کفر و ریاء کا منشا تھا، اس لئے نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جانا چاہیئے تاوقتیکہ تم کو اس قدر ہوش نہ آجائے کہ جو کچھ منہ سے کہو اسے سمجھ سکو۔ اور نہ حالتِ جنابت میں نماز کے قریب جانا چاہیئے۔ تاوقتیکہ غسل نہ کر لو۔ مگر حالتِ سفر میں جس کا حکم آگے مذکور ہے۔

یہ نشہ والا حکم اس وقت تک تھا۔ کہ نشہ ابھی حرام نہ ہوا تھا۔ لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی روایات میں منقول ہے کہ ایک جماعت صحابہؓ کی دعوت میں جمع تھی۔ چونکہ شراب اس وقت تک منع نہ ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے شراب پی تھی۔ مغرب کا وقت آگیا۔ تو سب اسی حالت میں نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ امام نے سورہ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ کی جگہ پہ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ بے ہوشی میں پڑھ دیا جس سے معنیٰ بالکل خلافِ حقیقت اور غلط ہو گئے۔ اس پہ یہ آیت نازل ہوئی۔ اب اگر نیند کے غلبہ یا بیماری کی وجہ سے کسی کا ایسا حال ہو جائے کہ اسے یہ تک خبر نہ ہو کہ میں نے کیا کہا تو ایسی حالت کی نماز بھی درست نہ ہو گی۔ جب ہوش میں آئے تو اس کی قضاء کرے۔

حالتِ جنابت میں نماز کا نہ پڑھنا تاوقتیکہ غسل نہ کرے، یہ حکم جب ہے کہ کوئی عذر نہ ہو۔ اور اگر کوئی ایسا عذر پیش آئے کہ پانی کے استعمال سے معذوری ہو۔ اور طہارت کا حاصل کرنا ضروری ہو تو ایسے وقت میں زمین سے تیمّم کر لینا کافی ہے۔ پانی کے استعمال سے معذوری کی تین صورتیں بتلائیں:

(۱) ایک بیماری کہ اس میں پانی کا استعمال ضرر دیتا ہے۔

(۲) یہ کہ سفر درپیش ہو اور پانی اتنا موجود ہے۔ کہ وضو کرے تو پیاس سے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے۔ دور تک پانی نہ ملے گا۔

(۳) یہ کہ پانی بالکل موجود ہی نہیں۔ اس پانی موجود نہ ہونے کی صورت میں دو صورتیں ہیں جن کو طہارت کے لئے ضروری فرمایا:

(ا) یہ کہ کوئی جائے ضرور سے فارغ ہو کر آیا۔ اور اس کو وضو کی حاجت ہے۔

(ب) دوسری یہ کہ عورت سے صحبت کی ہو تو اس کو غسل کی ضرورت ہے تیمّم دو طرح پر ہیں۔

(۱) پہلی دفعہ دونوں ہاتھ پاک زمین پہ مار کر منہ پہ مل لیں۔ اور

(۲) دوسری دفعہ پھر ایسا ہی کر کے کہنیوں سمیت پورے ہاتھوں کو مل لیں۔ مٹی پاک ہے اور بعض چیزوں کے لئے پانی کی مانند پاک کنندہ بھی ہے، مثلاً موزہ، آئینہ، تلوار وغیرہ اور جو نجاست زمین پر گر کر خاک ہو جاتی ہے۔ وہ بھی پاک ہو جائے گی۔ ہاتھ اور چہرہ

Marfat.com

پر ملنے سے تذلل بھی پورا ہے۔ اور عاجزی کی علامت ہے۔ جو گناہوں سے معافی مانگنے کی اعلےٰ صورت ہے۔ جب مٹی ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی نجاست کو باطل کرتی ہے تو اس لئے بوقتِ معذوری پانی کی قائم مقام ہو گئی۔ اس کے علاوہ مقتضائے آسانی و سہولت جس پر حکم تیمّم مبنی ہے۔ یہ ہے کہ پانی کی قائم مقام ایسی چیز کی جائے جو پانی سے زیادہ سہل الحصول ہو۔ سو زمین کا ایسا ہونا ظاہر ہے۔ کیوں کہ وہ سب جگہ موجود ہے لہٰذا خاک انسان کی اصل ہے۔ اور اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے میں گناہوں اور خرابیوں سے بچاؤ ہے۔ کافر بھی آرزو کریں گے۔ کہ کسی طرح خاک میں مل جائیں۔ جیسا کہ اوپر کی آیت میں گذرا ہے۔

ضرورت کے وقت تیمم کی اجازت، مٹی کو پانی کا قائم مقام قرار دینا اور احکام میں آسانیاں پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی شانِ عفو و مغفرت کو عملاً ثابت کر رہا ہے۔ نیز حکم آنے سے پہلے جو حالت نشہ میں نماز پڑھی گئی۔ اس کی مغفرت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ تاکہ کسی کے دل میں گذشتہ پر کوئی خلجان باقی نہ رہے۔

جنابت کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً انزال ہونا، عورت کو حیض آنا اور زوجین کا مباشرت کرنا خواہ بلا انزال ہی ہو۔ الصلوٰۃ سے مواضع صلوٰۃ (مسجدیں) بھی مراد لی گئی ہیں۔ (مدارک، قرطبی) جنبی کے لئے عند الضرورت مسجد سے گزرنے کا جواز ثابت کیا گیا ہے (قرطبی، مدارک)

ملامست جہاں جماع سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ قرآن میں مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ میں مس سے مراد خلوتِ صحیحہ اور مباشرت ہے۔ لمس کے یہی معنیٰ ابن عباسؓ، علیؓ، مجاہدؒ، طاؤسؒ، حسن بصریؒ اور سعیدؒ بن جبیر سے منقول ہیں۔ (معالم، ابن کثیر، روح المعانی)

تیمّم کے باب میں مٹی کے حکم میں ہر وہ چیز بھی داخل ہے جو اس کی جنس سے ہو مثلاً ریت، پتھر، چونا، کچی اینٹ، دیوار اور گرد وغیرہ (ہدایہ، درمختار، قرطبی) جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ مگر امام شافعیؒ کے نزدیک تیمّم صرف مٹی پر ہی جائز ہے۔

اس آیت میں نشہ کی حالت میں جو نماز سے پرہیز کا حکم ہے۔ یہ شراب کے متعلق دوسرا حکم ہے۔ پہلا حکم وہ تھا جو سورہ بقرہ (۲۷ ع) میں ہے کہ شراب بُری چیز ہے۔ اللہ کو پسند نہیں چنانچہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ مگر بہت سے لوگ اسے بدستور استعمال کر رہے تھے۔ (بوجہ صریح ممانعت نہ ہونے کے حتیٰ کہ بسا اوقات

---

[1] تفسیر ماجدی ۱۹۲، [2] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۵۴، ۳۵۶

Marfat.com

نشہ کی حالت میں ہی نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے تھے۔ غالباً[1] یہ کی ابتداء میں یہ دوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنی شراب نوشی کے اوقات بدل لئے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی۔ جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں نشہ کی ہی حالت میں نماز کا وقت نہ آجائے اس کے کچھ مدت بعد شراب کی قطعی حرمت کا وہ حکم آیا جو سورۂ مائدہ (۱۲ ع) میں ہے۔ ہر نشہ آور چیز کا وہی حکم ہے جو شراب کا ہے۔

تیمم پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اس سے کون سی طہارت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ آدمی میں طہارت کی حس اور نماز کا احترام قائم رکھنے کے لئے ایک اہم نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی مدت تک پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو، بہر حال اس کے اندر طہارت کا احساس برقرار رہے گا اور پاکیزگی کے جو قوانین شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں۔ ان کی پابندی وہ برابر کرتا رہے گا۔ اور اس کے ذہن سے قابل نماز ہونے کی حالت (طہارت) اور قابل نماز نہ ہونے کی حالت (حدث) کا فرق و امتیاز کبھی محو نہ ہو سکے گا۔

[1] یہ آیت تحریم خمر اور دیگر نشہ آور چیزوں کے استعمال کی حرمت کی تمہید ہے۔ قطعی تحریم بعد میں ہوئی تھی۔ اس کا بیان یہ ہے۔ کہ جو شخص حالت نشہ میں نماز کے قرب سے بچتا ہو۔ وہ دن کا اکثر حصہ اور رات کا پہلا حصہ تو ضروری نشہ آور چیز کے استعمال سے بچے گا۔ کیوں کہ پانچ نمازیں اس ساری مدت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس صورت میں نشہ کا وقت صرف ایک ہی رہ جاتا ہے۔ یعنی نماز عشاء سے لے کر وقت سحر تک کی مدت، اور اس وقت میں چونکہ سونا ہوتا ہے۔ لہٰذا شراب وغیرہ کا استعمال بہت کم ہو جائے گا۔ اور دن کا پہلا حصہ از فجر تا ظہر اکثر لوگوں کے لئے کاروبار اور کسب و عمل کا وقت تھا۔ اس وقت میں صرف وہی لوگ نشہ آور چیزیں استعمال کر سکتے تھے۔ جو نہایت سست و آوارہ مزاج اور بے کار رہتے تھے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بھی جو لوگ نشہ کرتے تھے۔ وہ صرف بعد عشاء شراب وغیرہ پیتے تھے تاکہ فجر سے پہلے پہلے نشہ کا اثر زائل ہو جائے۔

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ، حدیث میں ہے۔ کہ بعض انصار کے گھروں میں دروازے مسجد کے اندر کھلتے تھے پس وہ مجبور تھے۔ کہ حالت جنابت میں مسجد کو عبور کریں۔ لہٰذا اس آیت میں اس کی اجازت ہو گئی۔ پھر حضورؐ نے اپنی عمر مبارک کے آخری حصے میں ابوبکر صدیقؓ کے دروازے

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۴۶، ۵۰، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۱۰۴، ۱۱۲،

Marfat.com

کے سوا باقی سب لوگوں کے دروازے حکماً بند کروا دیئے تھے۔

غسل جنابت کی حکمت یہ ہے کہ جنابت سے بدن میں ہیجان پیدا ہوتا ہے پٹھے متحرک ہوتے ہیں اور سارا جسم اس سے متاثر ہوتا ہے۔ پس سارے بدن کے غسل کا حکم نہایت فطری اور متوازن ہے۔ کیونکہ جنابت کے ہیجان سے بدن میں ضعف و فتور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غسل اسے زائل کر دیتا ہے۔

آیت میں مرض سے مراد وہ امراض ہیں۔ جن کی موجودگی میں پانی کا استعمال مہلک یا مضر یا زیادتی مرض کا باعث ہو۔ جیسے جلدی امراض، چیچک وغیرہ اور زخم۔ روایات میں ہے کہ یہ آیات رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک سفر میں نازل ہوئی تھیں۔ جب کہ ام المومنین عائشہؓ کا ایک ہار گم ہو گیا تھا۔ اور حضورؐ سارے لشکر سمیت اس کی تلاش میں ٹھہر گئے تھے اور ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ پس یہ آیتِ تیمم نازل ہوئی تو اُسیدؓ بن حضیر انصاری حضرت عائشہؓ کے خیمہ کے پاس آکر کہنے لگے:

"اے آلِ ابی بکرؓ! تمہاری برکت کے کیا کہنے ہیں۔ اے عائشہؓ اللہ کی تجھ پر رحمت ہو، تم کسی مصیبت اور ناپسند امر میں بھی گرفتار ہو۔ تو اللہ تعالےٰ اسے سب مسلمانوں کے لئے باعثِ فراخی و وسعت بنا دیتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے عرب میں برپا ہونے والے پہلے مسلم معاشرے کی تربیت و اصلاح میں جو تدریجی حکمت اور امہال مدنظر رکھا تھا وہ اس آیت سے واضح ہے۔ قدیم و جدید ہر جاہلیت کی مانند شراب عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ ان کی تہذیب کا ایک نمایاں اور روشن نشان کہلاتا تھا۔ تہذیب مغرب کا لازمہ بھی مٹنے والی رومی، ایرانی اور مصری تہذیبوں کی مانند شراب نوشی ہے۔ جسے آج امریکہ اور دوسرے معاشروں میں برملا دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ لعنت اس قدر عام ہے کہ سویڈن اور امریکہ جیسی حکومتوں کے قانون اس کے سامنے بے بس ہیں۔ انہوں نے شراب خوری کے ضرر اور جرائم کی کثرت سے تنگ آکر اس پر پابندی لگا کر دیکھ لیا ہے۔ کہ وہ اس لعنت کے آگے ٹھہر نہیں سکتے۔ یہ اسلام کا ایک منفرد معجزہ ہے۔ کہ اس نے عرب جاہلیت سے شدید متاثر معاشرے میں اپنی ترغیب و ترہیب اور امہال و تدریج سے امتناع شراب خوری کا قانون نافذ کیا اور اس کی کامیابی میں کوئی پرلے درجے کا جاہل اور دل کا اندھا ہی شک و شبہ کر سکتا ہے۔

لہ فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۸۷، ۹۰

Marfat.com

عربوں میں شراب پانی کی مانند استعمال ہوتی تھی۔ شاعروں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے۔ اپنی شراب خوری کے واقعات تفصیل سے نظم کئے۔ لبید، عمرو بن قمیہ، امرؤالقیس، طرفہ ابن العبد، اعشیٰ، منخل لشکری وغیرہ نے اس کے گن گائے۔ اس معاشرے میں اسے کوئی مذموم یا مکروہ چیز تصور ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ شراب نوشی فخر مباہات کا سبب تھا۔ اسلام نے رفتہ رفتہ اس کی مضرت دلوں میں بٹھائی اور آخر کار اس کی حرمت کا قطعی اور دائمی حکم نازل فرمایا، اس حکم میں اسے پلید، شیطانی کام، عداوت و بغض کا سبب اور ذکر اللہ اور نماز سے روکنے والی چیز قرار دے کر اسے حرام قرار دے دیا۔ اس کام میں کوئی پروپیگنڈہ یا وعظ و پند، کوئی ظاہری قانونی جکڑ بندی اور کوئی مصنوعی طریقہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ ایمان کو ابھارا، مشاعرِ ایمان سے اپیل کی، ایمانی حس کو بیدار کر کے جب زمین تیار ہو گئی تو تحریم کا بیج اس میں پھینک دیا گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ شراب کو ہمیشہ کے لئے دلیس نکالا دیدیا گیا اور کسی کو اس پر افسوس نہ ہوا۔

شراب خوری، قمار بازی، لاٹری، سرعت رفتار کا جنون، سینما کا جنون، جنونِ محبت، مینڈھے لڑانے، بیل لڑانے اور کبوتر بازی وغیرہ کا جنون۔ یہ سب روحانی کھوکھلے پن کے مظاہر ہیں۔ جدید تہذیب ہو یا قدیم، ان کے پاس روحانی تسلی کا کوئی علاج نہیں، نہ وہ انسانی فطری طاقتوں کو درست اطراف میں صرف کرنے کے صحت مند طریقے پیش کر سکتی ہیں۔ یہ روحانی افلاس اور قلبی دیوالیہ پن ہے۔ ان جنونوں کا نتیجہ طبی جنون ہے۔ آج کل عام ہو رہا ہے۔ اس جنون کا باعث ایمان کا فقدان ہے۔ ایمان کی حس کی بیداری اس کا علاج ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب سے

يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا

خرید کرتے ہیں گمراہی اور چاہتے ہیں کہ تم بھی بہک جاؤ

السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى

راہ سے اور اللہ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو

Marfat.com

بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ

اور اللہ کافی ہے حمایتی اور اللہ کافی ہے مددگار بعضے لوگ

هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ

یہودی پھیرتے ہیں باتوں کو ان کے ٹھکانے سے اور کہتے ہیں ہم

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا

نے سنا اور نہ مانا اور کہتے ہیں کہ سن نہ سنایا جائیو اور کہتے ہیں

لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ

راعنا موڑ کر اپنی زبانوں کو اور عیب لگانے کو دین میں اور اگر

اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا

وہ کہتے ہم نے سنا اور مانا اور سن اور ہم پر نظر

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ

کرتو بہتر ہوتا ان کے حق میں اور درست لیکن لعنت کی ان

بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

پر اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم۔

شرح الفاظ

لہ اَلَمْ تَرَ: کیا تجھے علم نہیں، کیا تو نے دیکھا نہیں۔ نَصِيْبًا: حصہ۔ السَّبِيْل: راہ راست۔ وَلِيًّا: کارساز، متولی امور۔ نَصِيْرًا: معین و مددگار جو تم سے ان کا شر

لہ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۵۱،۵

Marfat.com

دفع کرے ۔ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا : یعنی یہودی ۔ غَیْرَ مُسْمَعٍ : اس کے دو معنی ہیں۔
(ا) تجھے کوئی ناپسندیدہ بات نہ سنائی جائے ۔
(ب) تیری بات غیر مقبول اور نہ سنی جانے کے لائق ہے ۔
رَاعِنَا : ہماری رعایت کرو، ہمارا انتظار کرو، ہمیں بات کرنے کی اجازت دو لیکن یہود اس سے ایک عبرانی کلمہ رَاعِیْنَا مراد لیتے تھے جو ایک گالی تھا ۔ لَیًّا موڑ کر، تحریف کرکے طَعْنًا فِی الدِّیْنِ : دین میں رد و قدح کی خاطر ۔ اَقْوَمَ : زیادہ مضبوط اور سیدھی بات، تقاضائے عدل و انصاف کے زیادہ مطابق ۔ اِلَّا قَلِیْلًا : یعنی لاشیٔ، غیر معتبر اور معدوم ۔

بعض احکام شرعیہ کے بیان کے بعد ان آیات میں بعض ان امتوں کا حال بیان فرمایا گیا ہے ۔ جنہوں نے اپنے دینی احکام کو ترک کیا، کتابوں میں تحریف کی ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دی ۔ اور راہ راست سے دور جا پڑے ۔ یہ بیان اس لئے لایا گیا ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ مسلمانو پر ثابت کر دے کہ گذشتہ احکام دینے والا ان کا نگران ہے ۔ جیسا کہ وہ امم سابقہ کا نگران تھا اگر انہوں نے احکام کی پابندی میں کوتاہی کی تو دنیوی و اخروی سزا سے دوچار ہو کر رہیں گے بس پچھلے ایمانداروں کا فرض ہے ۔ کہ گذشتہ وعدہ و وعید کو سن کر احکام کی صحیح اور سچی پابندی کریں ۔ یہی ان احکام سے غرض ہے ۔ کہ انہیں ظاہر و باطن دونوں طرح سے مانا جائے نہ کہ صرف ظاہری طور پر ۔ محض رسوم و ظواہر کی پابندی تو یہود و نصاریٰ میں بھی موجود تھی ۔ اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہے ۔ کہ ایمان دار صرف وضو، غسل، تیمم اور صلوٰۃ وغیرہ کے ظواہر کی ہی نہیں ۔ بلکہ ان کی روح کی بھی پابندی کریں ۔ اپنے دلوں کو پاک صاف کریں تاکہ وہ رضاء و اکرام الٰہی کا مقام قرار پا سکیں ۔

ان آیات میں یہود کے بعض قبائح اور ان کے مکر و فریب کا بیان ہے، اور ان کی ضلالت اور کفر پر خود ان کو اور نیز دوسروں کو مطلع کرنا مدنظر ہے ۔ تاکہ ان سے علیحدہ رہیں پیچھے بھی ان کے کچھ قبائح بیان ہوئے ہیں ۔ مگر بیچ میں ایک خاص مناسبت سے نشہ اور جنابت میں نماز سے ممانعت فرما کر پھر یہاں یہود کے قبائح بیان کئے جاتے ہیں
یہود کو کتاب سے کچھ حصّہ ملا ۔ یعنی لفظ پڑھنے کو ملے اور عمل کرنا جو اصل مقصود تھا ۔ وہ نہیں ملا ۔ اور وہ گمراہی خریدتے ہیں ۔ یعنی پیغمبر آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات و اوصاف کو دنیا کی عزت اور رشوت کی خاطر چھپاتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار کرتے

فوائد القرآن صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰، تفسیر ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۴۱

Marfat.com

ہیں ۔ اور چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی دین سے پھر کر گمراہ ہو جائیں ۔ اور اے مسلمانو! اللہ تعالےٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا ہے، تم ایسا ہرگز نہیں جانتے ہو، اللہ کے فرمانے پر اطمینان کرو اور ان سے بچو ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں نفع پہنچانے اور نقصان سے بچانے کے واسطے کافی ہے ۔ اس لئے دشمنوں سے اس قسم کا اندیشہ مت کرو اور اپنے دین پر قائم رہو

آیت ۴۶ میں کئی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں ۔

(ا) بعض یہودی خدا کے کلام میں لفظی و معنوی تحریف (ادل بدل اور ہیرا پھیری) کرتے ہیں،

(ب) جب رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم ان کو خدا کا کوئی حکم سناتے تو یہود جواب میں کہتے کہ ہم نے سن لیا ۔ مطلب یہ کہ قبول کر لیا، مگر آہستہ سے کہتے تھے کہ نہ مانا، یعنی ہم نے فقط کان سے سنا دل سے نہیں سنا ۔

(ج) اور یہود جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوتے تو کہتے ہیں کہ: "سن نہ سنایا جائیو" یعنی ایسی بات کہتے جس کے دو معنے ہوتے: ایک معنیٰ کے اعتبار سے دعا اور تعظیم ہوتی ۔ تو دوسرے معنی کی رو سے بددعا اور تحقیر ۔ چنانچہ یہ کلام بظاہر دعا خیر ہے ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ تو ہمیشہ غالب اور معزز رہے ۔ کوئی تجھ کو بُری اور خلاف بات نہ سنا سکے ۔ اور دل میں نیت یہ رکھتے کہ تو بہرا ہو جائے ۔

(د) وہ حضورؐ کی خدمت میں آکر آپؐ سے بوقتِ گفتگو راعنا کہتے ۔ اس لفظ کے حسب سابق دو معنی ہیں ۔

(۱) اچھے، اور (۲) بُرے

اچھے معنیٰ تو یہ کہ ہماری رعایت کرو اور ہم پہ شفقت کی نظر کرو کہ تمہارا مطلب سمجھ لیں اور جو پوچھنا ہو پوچھ سکیں ۔

بُرے معنی یہ کہ یہود کی عبرانی زبان میں یہ کلمہ تحقیر کا ہے ۔ یا زبان کو دبا کر راعینا کہتے یعنی تو ہمارا چرواہا ہے ۔ اور یہ محض ان کی شرارت اور خباثت تھی ۔ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے ۔ کہ حضرت موسیٰؑ اور دیگر پیغمبروں نے بھی بکریاں چرائی تھیں ۔

(ھ) یہود ان کلمات کو اپنے کلام میں رلا ملا کر ایسے انداز سے کہتے کہ سننے والے اچھے ہی معنوں پر حمل کرتے اور بُرے معنوں کی طرف دھیان بھی نہ جاتا، مگر وہ دل میں بُرے معنیٰ مراد لیتے اور پھر دین میں یہ عیب نکالتے کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب ضرور معلوم کر لیتا ۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب کو خوب کھول دیا ۔

Marfat.com

آیت کے آخر میں بطور ملامت وہدایت ارشاد ہوا ہے۔ کہ ان تینوں مذموم اقوال کی بجائے اچھے اقوال کہتے، یعنی عَصَیْنَا کی بجائے اَطَعْنَا کہتے اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ کی بجائے صرف سَمِعْنَا کہتے اور رَاعِنَا کے عوض اُنْظُرْنَا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا، اور یہ بات درست اور سیدھی ہوتی۔ اور اس بیہودگی اور شرارت کی گنجائش نہ رہتی جو کلماتِ سابقہ سے یہود برے معنی اپنے دل میں مراد لیا کرتے تھے۔ لیکن چوں کہ ان کے کفر وطغیان کے باعث اللہ تعالےٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ وہ ہدایت سے پرے ہٹ گئے ہیں اس لئے مفید اور سیدھی باتوں کو نہیں سمجھتے اور ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑا۔ یعنی تھوڑے سے آدمی ایمان لائے ہیں۔ جو ان شرارتوں اور خباثتوں سے مجتنب رہے، اور اس وجہ سے اللہ کی لعنت سے محفوظ رہے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔

[1] اَلَّذِیْنَ هَادُوْا : یہ وہ لوگ تھے جو نسلاً اسرائیلی نہیں تھے۔ بلکہ عرب تھے۔ لیکن یہود کی طویل صحبت سے متاثر ہو کر خود بھی یہود کے شعائر وعقائد اختیار کر کے رفتہ رفتہ ان میں جذب ہو چکے تھے۔ شرارت وخباثت میں یہ بھی نسلی یہود سے کچھ کم نہ تھے (معلوم رہے کہ یہودی مذہب ایک نسلی مذہب ہے)۔ دراصل یہ نام یعقوب کے فرزند یہود کی نسل پر بولا جاتا تھا۔ پھر مذہبی نام بن گیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہ کوئی تبلیغی مذہب نہیں ہے، اوروں کو اس میں کوئی کشش نظر نہیں آتی، نہ یہودی کسی کو اس میں داخل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ نسلی امتیاز میں اندھے ہو چکے ہیں۔ اپنے آپ کو برگزیدہ کہتے اور دوسروں کو بنگاہِ حقارت وعداوت دیکھتے ہیں (مؤلف)

[2] علمائے اہل کتاب کے متعلق قرآن نے اکثر یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:
"انہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے"
اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو انہوں نے کتابِ الٰہی کا ایک حصہ گم کر دیا تھا۔ پھر جو کچھ کتاب الٰہی میں ان کے پاس موجود تھا، اس کی روح اور مقصد ومدعا سے بھی وہ بیگانہ ہو چکے تھے۔ ان کی تمام دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جزئیات اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دین کی حقیقت سے ناآشنا اور دینداری کے جوہر سے خالی تھے۔ اگرچہ علمائے دین اور پیشوایان امت کہلاتے تھے۔

[3] یہود کی تحریف لفظی ومعنوی کا یہ عالم ہے۔ کہ تورات کے وہ مقامات جہاں اب تک

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۵۶، [2] تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۳،
[3] تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۳

Marfat.com

بھی جناب رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم اور مسیح علیہ السلام کی خبریں پائی جاتی ہیں، ان میں انہوں نے بہت کچھ اُلٹ پھیر کیا۔ اور عجیب وغریب معنے نکال کر دونوں رسولوں کا انکار کر دیا پھر نفسِ کتاب کا یہ حال ہے کہ اس کا ایک نسخہ بھی کسی منصف مزاج کے نزدیک لائق اعتبار نہ رہا۔ یہ مانا کہ حوادثِ دہر اور مخالف بادشاہوں کے حملوں نے اور حفظ کا دستور نہ ہونے کے باعث اور کاغذ وکتابت کی قلت رواج کے باعث بھی بائبل کے عہد عتیق وعہد جدید میں بہت کچھ الٹ پھیر ہوگیا تھا۔ مگر کاتبوں کی خود غرضیوں اور سہو نے بھی ہزاروں اختلاف پیدا کر دیئے (جن کی کچھ تفصیل مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اظہار الحق میں درج کی ہے۔ اس کے اُردو ترجمہ کا پہلا حصہ "بائبل سے قرآن تک" کراچی میں چھپ کر ملک میں شائع ہو چکا ہے۔ مؤلف)

لہ یَشْتَرُوْنَ الضَّلَالَةَ.... جسطرح کوئی گاہک اپنی پسندیدہ چیز کو بڑی رغبت سے خریدتا ہے اور اسے حاصل کر کے خوش ہوتا ہے۔ یہی حال ان اہل کتاب کا بھی ہے۔ کہ وہ باطل پرستی اور گمراہی پر بہت مطمئن اور خوش ہیں۔

نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ :۔ انہوں نے اپنی ساری کتاب کو حفظ وکتابت سے محفوظ نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ اہل اسلام میں قرآن وسنت کے محفوظ رکھنے کا رواج شروع سے چلا آرہا ہے۔ یہود کے پاس موسوی تورات کا ایک ہی نسخہ تھا۔ جو مفقود ہوگیا (اس کے مفقود ہونے کے دلائل پختہ ہیں۔ جن سے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتی۔ خود یہود ونصاریٰ کے اہل تحقیق کو یہ تسلیم ہے۔ پس جاہل اور متعصب پادریوں کا واویلا اور غلط پروپیگنڈہ محض فریب کاری ہے۔ مؤلف) پھر جو غلط سلط نسخے مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ ان پر انہوں نے عمل نہیں کیا۔ ان کے علماء ورؤساء نے بہت سے احکام اپنی طرف سے بڑھا دیئے، اور بہت سی رسومِ عبادت اختراع کیں جن کا موسوی تورات میں پتہ تک نہ تھا اور انہوں نے یہ سب کچھ ٹھنڈے پیٹوں ہضم کر لیا۔

یہود نے کئی الفاظ وعبارات ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیں اور تورات اور دیگر کتب انبیاء میں خلط ملط اور گڑبڑ کر دی۔ اس کا نام "کاتبینِ کتاب" نے اصلاح رکھا۔ اصل بات (خود انہی کی تصریح کے مطابق) یہ ہے۔ کہ اصل تورات کا نسخہ گم ہو جانے کے بعد اس کی

لہ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۵۱، ۵۴، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۴۴، ۴۶

Marfat.com

متعدد متفرق اور کم و بیش نقول اِدھر اُدھر سے اوراق کی شکل میں انہیں ملیں۔ انہوں نے یہ ملائیں اور ان میں ردّ بدل کر کے ایک کتاب گھڑ لی۔ اس میں خلط و تکرار کا باعث یہی نہ تھا اور بھی تھے۔ مگر یہاں ہم اسے بسلسلۂ "تحریف" بیان کر رہے ہیں۔ مفصل بحث شیخ معظم رحمت اللہ کیرانوی رحؒ کی کتاب میں دیکھئے۔

فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا : اس کا ایک معنیٰ تو یہ ہے۔ کہ ان میں سے بہت تھوڑے سے ایمان لاتے ہیں۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے۔ کہ ان کا ایمان محض زبانی، لفظی اور رسمی ہے جس کا خدا کے ہاں کوئی وزن و اعتبار نہیں ہے۔

ان آیات[1] میں اس خارجی و بیرونی معرکے کا بیان ہے۔ جو مسلم جماعت کو باہر کے دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ بالخصوص یہود و نصاریٰ سے۔ اس معرکے کا مفصل ذکر سورۂ البقرہ اور آل عمران میں فرمایا گیا ہے۔ کچھ ذکر اسی سورۂ نساء میں بھی گذرا ہے۔ لیکن مسلم معاشرے کو صرف یہی ایک معرکہ درپیش نہ تھا۔ بلکہ اس کی تمام اجتماعی، اقتصادی، عائلی اور اخلاقی تنظیمات دشمنانِ اسلام کے حملوں اور جاہلیت کے اثرات و بقاء سے متاثر ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کو ایسی تربیت دی جا رہی تھیں۔ کہ وہ ہر قسم کے اندرونی و بیرونی حملے سے اس جدید تہذیب و تمدن کا پورا دفاع کر سکیں۔ اور اسے متحرک و فعال بنا سکیں۔ اسلام نے اندرونی طور پر تو اپنے مخصوص عقائد و اعمال، مخصوص اخلاق و آداب اور مخصوص معاملات کو اسلامی معاشرے میں رائج کیا اور بیرونی طور پر جاہلیت اور یہود و نصاریٰ کے معاندانہ حملوں سے اسے بچانے کے مؤثر طریقے ارشاد فرمائے۔

پس اسلام نے مسلم جماعت کو جو اس معرکے میں جھونکا تھا تو صاف بتا دیا تھا۔ کہ یہ ایک ہمہ جہتی اور ہمہ وقتی معرکہ ہے۔ عقائد و مشاعر، احساسات و جذبات، جدید قیم و موازین اور اعمال و معاملات ہر لحاظ سے اور ہر طرف سے یہ ایک معرکہ تھا۔ اس وقت تک دشمن کی تعداد زیادہ تھی وہ مسلمانوں کے مرکز و قلب میں گھسا بیٹھا تھا۔ تجارت و زراعت اور کاروبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی ایک جماعت منافقین کے روپ میں خود اسلامی قلعے میں چھپی بیٹھی تھی، یہود اپنے نسلی تفوق اور علمی و مالی بڑائی کے قائل تھے۔ وہ اس نئی قوت کو دیکھ رہے تھے۔ جو انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ پس وہ ہر کوشش اس جدید قوت کو مٹانے، اس میں رخنہ ڈالنے، اس کے ماننے والوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۹۲، ۹۹

Marfat.com

ان میں عجیب و غریب انداز سے جھوٹا پروپیگنڈہ کر کے انہیں مایوس کرنے اور ان کے اتحاد و اتفاق کو توڑنے میں لگے رہتے تھے۔ اسلام نے آہستہ آہستہ قوت حاصل کی اور اپنے ماننے والوں کی قدم بہ قدم رہنمائی کر کے کم تعداد و معمولی سازوسامان ہونے کے باوجود جاہلیت کو پہلے مدینہ سے اور پھر جزیرۂ عرب سے نکال باہر کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جدید معاشرے کی روحی و اخلاقی اور اجتماعی تربیت ہی اس انداز سے ہوتی تھی۔ کہ وہ سربلند ہونے کو آیا تھا نہ سرنگوں ہونے کو، حکومت کرنے کو آیا تھا نہ کہ محکوم ہونے کو۔

دنیا کی ساری تاریخ میں اس ہمہ گیر انقلاب کی کوئی مثال نہیں ملتی، تاتاری حملوں اور ہٹلر کے عسکری اقدامات میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ فقط ایک فوجی انقلاب نہ تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ عقیدے، ثقافت اور تہذیب و تمدن کا انقلاب تھا؛ اس نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو عقائد و اعمال، عبادت و رسوم تقالید و عبادات حتیٰ کہ زبان کے لحاظ سے بھی یکسر بدل ڈالا۔ اس انقلاب نے دنیا کو ایک جدید انسان دیا تھا۔ جو اپنی انسانیت میں قدیم و جدید اور بعد میں آنیوالوں کے لئے مثال بن گیا۔ ۱۸۳

ان آیات میں یہود کی جو عداوت بیان ہوئی ہے، کاش! مسلمان اس سے سبق اور عبرت حاصل کریں۔ اس خبیث قوم سے مسلمانوں کا سب سے محبوب و محترم وجود مقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک محفوظ نہ رہے تو اور کون ہے جسے ان سے خیر کی توقع ہو سکتی ہے؟ ان کا مکر و فریب بے پناہ اور ان کی عداوت مسلّم ہے۔ (علاج اس کا کوئی عماد الدینؒ زنگی، کوئی نور الدینؒ زنگی اور کوئی صلاح الدینؒ ایوبی ہے! مولف)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا

اے کتاب والو! ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ

تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے اس سے پہلے کہ ہم

وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ

مٹا ڈالیں بہت سے چہروں کو پھر الٹ دیں ان کو پیٹھ کی طرف یا

Marfat.com

نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ

لعنت کریں ان پر جیسے ہم نے لعنت کی ہفتہ کے دن والوں پر اور اللہ

اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ (پ ۵ الرکوع ۱۱)

کا حکم ہو کر رہی رہتا ہے

شرح الفاظ

[1] اَلْكِتَاب : سے مراد اس آیت میں توراۃ ہے۔ نَطْمِسَ : طَمْسٌ کا معنیٰ ہے۔ کسی چیز کو مٹا کر یا مخفی کر کے اس کے اثر کو مٹا دینا، جیسے گھر کے آثار اور راستے کے نشانات مٹا دیئے جاتے ہیں۔ یا تو اسطرح کہ اس کا ملبہ وہاں سے منتقل کر دیا جائے اور یا اسطرح کہ ہوائیں اس کے نشان کو گم کر دیں۔ لفظ کا معنیٰ ازالہ اور اہلاک بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن نے موسیٰؑ کی دعا میں کہا ہے۔ اُطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ : اور سورہ یٰسین میں ہے نَطْمِسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ آنکھوں کا طمس یا تو ان کے نور کا ازالہ ہے یا ان کے ڈھیلے کا مٹا دینا۔ اور حلقہ سے برابر کر دینا ہے۔ وجہ سے مراد کبھی تو یہی معروف چہرہ ہوتا ہے اور کبھی نفس کا وجہ یعنی اس کی توجہ اور نصب العین ہوتا ہے۔ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ۔ اور مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ۔ اور اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا میں وجہ سے مراد توجہ اور مقصد و نصب العین ہے۔ اَدْبَار واحد دُبُر ہے یعنی پشت اور گدی۔ مَدّ کا معنیٰ پھیرنا ہے۔ اِرْتِدَاد کا معنی مادیات یا معانی و روحانیات میں پیچھے کو رجوع کرنا، اُلٹے پاؤں پھر جانا حسّی و مادی ارتداد تو یہ ہے کہ جنگ سے منہ پھیر لیا جائے اور فرار اختیار کیا جائے۔ اور معنوی ارتداد اس آیت میں مراد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى۔

نَلْعَنَهُمْ.... : انہیں ہلاک و برباد کریں جیسا کہ اصحاب سبت کو کیا تھا۔ اس مراد مسخ بھی ہے۔ جیسا کہ ابن جریرؒ نے حسن بصری رح سے روایت کیا ہے۔ کہ انہیں بندر اور سور بنا

پچھلی آیات میں یہود کی شرارتوں کا پردہ چاک کر کے اب اس آیت میں انہیں قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ دراصل قرآن کا تورات کے لئے مصدق ہونا اور تورات میں اسلام کی صداقت کے دلائل کا ہونا ہی ایمان کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر وہ ایمان نہ لائیں گے تو انہیں عذاب و نکال اور تباہی کی خبر دی گئی ہے۔

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۵۴، ۵۵

Marfat.com

[1] گذشتہ آیات میں یہود کی ضلالت اور قبائح کا ذکر فرما کر اب اس آیت میں ان کو خطاب کر کے ایمان لانے اور تصدیق قرآن کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور اس کی مخالفت سے ڈرایا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب قرآن پر ایمان لاؤ جس کے احکام تورات کے موافق اور اس کے مصدق ہیں۔ ایمان لاؤ قبل اس کے کہ ہم تمہارے چہروں کے نشانات مٹا ڈالیں یعنی آنکھ کان وغیرہ۔ مطلب یہ کہ تمہاری صورتیں بدل دی جائیں۔ پھر تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف اُلٹ دیں۔ یعنی چہرے کو مطموس اور ہموار کر کے پیچھے کی طرف اور گدی کو آگے کی طرف کر دیں۔ یا ہفتہ کے دن والوں کی طرح تم کو مسخ کر کے جانور بنا دیں۔ اصحاب سبت کا قصہ سورۂ اعراف میں مذکور ہے۔

قرآن جو تورات کی تصدیق کرتا ہے۔ تو یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس کے محرف اجزاء اس تصدیق سے باہر ہیں (تحریف کی تصدیق ابھی گذر چکی ہے اور ابھی کئی آیات میں اس کا واضح ذکر موجود ہے۔ مؤلف)

اس آیت کے ڈراوے سب عذابِ اخروی کے متعلق ہیں۔ لیکن وجوہ کے معنیٰ مجازاً سرداروں اور رئیسوں کے بھی آتے ہیں (کشاف، راغب) اس لئے فقرہ کے معنیٰ یہ ہوں گے۔ کہ ہم ان کے سرداروں کو ذلیل و خوار کر دیں۔ اور اسی طرح اس کے ساتھ والے فقرہ کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ہم ان کی وجاہت و اقبال کو سلب کر لیں اور ان پر ذلت و ادبار نازل کریں (کشاف، بیضاوی وغیرہ) ان سزاؤں کا ظہور تو آخرت میں ہوگا۔ اور من قبل ہمیشہ کسی واقعہ کے واقع ہو جانے پر ہی دلالت نہیں کرتا بلکہ صرف اس کے ہو سکنے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اور محلِ تہدید میں آتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں کتاب و سنت اور محاوراتِ زبان میں موجود ہیں۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے، کہ طمس و مسخ کی سزاؤں سے بچنے کے لئے قرآن اور صاحبِ قرآن کی تصدیق کرو۔

[2] عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائبل کے پرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ اُلجھن پیش آتی ہے۔ کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں؟ اور کیا واقعی قرآن ان سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جو ان میں درج ہیں؟ لیکن اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ تورات، بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان کے اندر مندرج ہے۔ (یعنی اصل تورات کے الفاظ و مطالب اور تعلیم پر بہت اضافے ہو چکے ہیں۔ اور اب معلوم نہیں ہو سکتا کہ کونسی

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۱۰، تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۵، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۴، ۱۹۵، تفسیر ابن کثیر پ ۵ صفحہ ۴۲،

[2] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۲۳۱

Marfat.com

چیز واقعی کلامِ خدا ہے۔ اور کون سا اضافہ ہے۔ یہی حال انجیل کا بھی ہے۔ مؤلف) اور انجیل نئے عہد نامے کی اناجیل اربعہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

دین کے اصول و ارکان اور رسولوں کے مقاصد بعثت توحید کا اثبات، شرک کا ردّ، فضائل کو اختیار کرنا، رذائل سے پرہیز اور خواہش کو ترک کرنا ہے۔ ان اصول میں ساری آسمانی کتابیں متفق ہیں۔ اختلاف صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ قرآنِ پاک نے اصول و ارکان دین کی تکمیل کی ہے۔ اور اس تکمیل کے لئے مناسب حک و اضافہ اور تفصیل و اجمال سے کام لیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مختلف پے در پے آنے والی حکومتوں کا رہنما اصل الاصول ایک رہا ہے۔ یعنی عدل و انصاف۔ مگر مکان و زمان اور اقوام و ملل کے اختلاف سے اس مقصد کو حاصل کرنے کے وسائل میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ جب کسی نئے حاکم کا مقصد میزان عدل ہی کی اقامت ہو تو پہلے حکام کی بعض چیزوں میں تبدیلی بُری نہیں ہوتی۔ اور اسے پہلوں کا مصدق ہی کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے داؤدؑ و سلیمانؑ اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی نبوت کی تصدیق کی۔ ان کی تعلیم کے برحق ہونے کا اقرار و اعلان کیا۔ اور ان کے مدعیانِ اتباع کو تعلیم کا بعض حصہ ضائع کر دینے اور بعض میں تحریف کرنے پر زجر و توبیخ فرمائی، اور اس تعلیم سے ہدایت نہ پانے اور اس پر عمل نہ کرنے پر ان لوگوں کو سخت و سست کہا اور بتایا کہ ان میں سے بعض نے تو ان بنیادوں کو ہی ڈھا دیا ہے۔ جن پر انبیاء کی تعلیم کی عمارت کھڑی تھی اور دین کے پہلے اصل یعنی توحید کو ترک کر کے اپنے احبار و رہبان اور عزیر علیہ السلام اور مسیح علیہ السلام کو خدا سے ورے رب بنا لیا ہے۔ حالانکہ انہیں صرف ایک الٰہ برحق کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔

"طمسِ وجوہ" کا معنیٰ یہ بھی ہے کہ تمہارے مقاصد کو پورا نہ ہونے دیا جائے۔ تم جو اسلام سے مکر و فریب اور کید و خداع کرنا چاہتے ہو اس میں ناکام رہو۔ تمہارے منہ پھیر دیئے جائیں۔ یعنی تمہیں ناکام و نامراد کر کے اسلام کو غالب و کامران کر دیا جائے۔ اور تم جو علم و فضل میں مشہور ہو اور لوگ تمہاری اس وجہ سے عزت و احترام کرتے ہیں۔ یہ سب ختم ہو جائے۔

بعض مفسرین نے "پشت پر پھیر دینے" کا حسی معنیٰ مراد لیا ہے۔ کہ ایک بار یہود کو شام و فلسطین سے جلا وطن کیا گیا تھا۔ پھر وقت آئے گا کہ انہیں اسی طرف دوبارہ جلا وطن کر دیا جائے گا۔

طمسِ وجوہ سے مراد یہ ہے۔ کہ ان کی انسانیت و آدمیت کے معالم و مظاہر کو مٹا دیا جائے۔

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۵۵، ۵۷، [2] فی ظلال القرآن جلد ۵

Marfat.com

اور پشت پر پھیر دینے سے مراد یہ ہے۔ کہ انہیں رجعت قہقری پہ آمادہ کر دیا جائے گا۔ ان سزاؤں سے مراد حسی و مادی بھی ہو سکتی ہیں۔ کہ انہیں بالکل بندر و خنزیر بنا دیا جائے۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ ان کے قلوب و نفوس سے ہدایت و بصیرت کی علامات و اثرات کو مٹا دیا جائے اور ان میں ضد و تعصب اور کفر و جاہلیت پوری طرح متمکن ہو جائے۔ بہر حال یہ دوسری چیز تو ظاہر ہے کہ واقع ہوئی اور ممکن ہے کہ اصحاب سبت کی مانند کسی وقت مادی سزا بھی مستحق ہو جائے۔ اس میں کوئی تعجب یا استحالہ نہیں ہے۔ کعب احبار اسی آیت کو پڑھ کر خوف دہشت سے کانپ اٹھے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا

بیشک اللہ نہیں بخشتا اس کو کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دیتا

دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ

ہے اس سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا

فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ

تو اس نے بڑا طوفان باندھا کیا تو نے نہ دیکھا ان

يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا

لوگوں کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں۔ مگر اللہ ہی پاکیزہ کرتا ہے جسے چاہے

يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى

اور ان پر ظلم نہ ہوگا تاگے برابر دیکھ کیسا باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ اور

اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ ع ۸

کافی ہے یہی گناہ صریح۔

Marfat.com

شرح الفاظ

اِفْتَرٰی: اس کا مادی فری ہے۔ بمعنی قطع۔ افتراء کا معنیٰ ہے جعل سازی کرنا، بہتان لگانا، از خود کوئی چیز گھڑ لینا۔ یُزَکُّوْنَ: تزکیہ کا معنیٰ ہے اپنی مدح وثنا، اپنے آپ کو پاک صاف قرار دینا، ایک اور موقعہ پہ ارشاد الٰہی ہے۔ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى؛ لَا يُظْلَمُوْنَ ظلم کا معنیٰ نقص ہے۔ فَتِيْلًا: کھجور کی گٹھلی میں کا دھاگا فتیل کہلاتا ہے۔ کسی حقیر و قلیل چیز کی مثال اس سے دی جاتی ہے۔ جیسا کہ ذرّہ کا لفظ بھی اس معنیٰ میں آتا ہے۔ اِثْمًا: بقول امام راغب اصفہانی اثم کا معنیٰ ہے وہ عمل جو اجر و ثواب سے دور رکھے یعنی وہ کام جو نیکی نہیں اور بعض دفعہ مصر اعمال و افعال اور اقوال پر بھی اِثْم کا لفظ بولا جاتا ہے۔

ان آیات میں فرمایا گیا ہے۔ کہ توبہ کے بغیر شرک ہرگز نہ بخشا جائے گا۔ اس سے کم تر گناہ کی بخشش خدا کی مشیّت و رحمت کے ماتحت ہے۔ چاہے تو کسی کو کسی مصلحت سے یا کسی اور عمل کے باعث یا شفاعت سے یا محض رحمت و فضل سے بخشدے۔ اوپر کی آیت میں بیان کردہ شدید سزاؤں کے ذکر کے بعد اس اعلان مغفرت کی سخت حاجت تھی۔ تاکہ پتہ چل جائے کہ اصل چیز جو ناقابل بخشش ہے۔ وہ صرف شرک ہے۔

ابن المنذر نے ابو مجلز رضؓ سے روایت کی ہے، کہ جب یہ آیت نازل ہوئی! قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا الخ تو حضورؐ نے اسے اپنے خطبہ میں منبر پہ تلاوت فرمایا۔ ایک آدمی اٹھا اور پوچھا کہ آیا شرک کی بخشش ہو سکتی ہے؟ حضورؐ خاموش رہے۔ اس نے دو یا تین مرتبہ یہی سوال دہرایا تو یہ زیر تفسیر آیت نازل ہوئی۔

مشرک کبھی نہیں بخشا جاتا بلکہ اس کی سزا دائمی ہے۔ البتہ شرک سے نیچے جو گناہ ہیں صغیرہ ہوں یا کبیرہ وہ سب قابل مغفرت ہیں۔ اللہ تعالےٰ جس کی مغفرت چاہے۔ اس کے صغیرہ و کبیرہ گناہ بخش دیتا ہے۔ کچھ عذاب دے کر یا بلا عذاب دیئے۔ اشارہ اس کی طرف ہے کہ یہود چونکہ کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ اس لئے مغفرت کی توقع نہ رکھیں۔

لیکن یہود باوجود اس قدر خرابیوں کے پھر بھی اپنے آپ کو پاک صاف اور مقدس کہتے

---

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۷

[2] فوائد القرآن صفحہ ۱۱۰، تفسیر ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۴۲، ۴۷

Marfat.com

ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو خدا کے بیٹے اور خدا کے پیارے تبلاتے ہیں۔ جو بالکل لغو بات ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اسے پاکیزہ اور مقدس کرتا ہے۔ یہود کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا اور ان جھوٹی شیخی کرنے والوں پر ادنیٰ سا بھی ظلم نہ ہوگا۔ یعنی یہ لوگ جس عذاب وخباثت میں گرفتار ہوں گے۔ وہ عین ان کے شرک وکفر اور گناہوں کا نتیجہ ہے۔ ان پر ناحق عذاب بالکل نہ ہوگا۔

یہودی جو گوسالہ پرست تھے۔ اور حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ انہوں نے جب پچھلی آیت اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ کو سنا تو کہنے لگے کہ ہم مشرک نہیں بلکہ ہم تو خدا کے خاص بندے اور پیغمبر زادے ہیں اور پیغمبری ہماری میراث ہے۔ اللہ تعالےٰ کو ان کی یہ شیخی پسند نہ آئی۔ اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت ۵۰ میں فرمایا کہ کیسی تعجب کی بات ہے۔ کہ یہ لوگ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں۔ اور باوجود ارتکاب کفر وشرک کے اپنے آپ کو اللہ کا دوست کہتے ہیں۔ اور اس کے ہاں مقبول ہونے کے مدعی ہیں۔ ایسی سخت تہمت صریح گنہگار ہونے کے لئے کافی ہے۔

شرک چونکہ آسمانی حکومت کی صریح بغاوت ہے۔ لہٰذا اسے چھوڑ کر باقی ہر معصیت کے لئے مغفرت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ جس کے حق میں مشیّتِ الٰہی ہوگی اسے معافی مل جائے گی۔ اس میں توبہ کی بھی شرط نہیں رکھی گئی (ابن جریر، مدارک)

آیت میں ردّ ہے خوارج وغیرہ ان فرقوں کا جو سمجھتے ہیں کہ ہر گناہ شرک ہے۔ اور ہر گناہ کی سزا عذابِ ابدی ہے۔ لِمَنْ یَّشَآءُ: میں مشیّت کا اطلاق بغیر کسی شرط وقید کے ہے، یہیں سے ردّ نکل آیا معتزلہ کا جو کہتے ہیں۔ کہ مغفرت ان کی ہوگی جو توبہ کرلیں نہ کہ ان کی جو توبہ نہ کریں لیکن توبہ کے بعد تو ظاہر ہے۔ کہ اہل کفر وشرک کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے۔

اللہ نے توحید وتقویٰ کو جو معیارِ فضیلت ومقبولیت رکھ دیا ہے۔ اسے چھوڑ چھاڑ کر لوگوں نے نسل وغیرہ کے طرح طرح کے معیار شرف وبزرگی گھڑ لئے ہیں۔ اور وہ ان بنیادوں پر اپنے آپ کو معظّم ومقدس سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ تمام تر حماقت وضلالت ہے۔ آیت کا اشارہ خاص طور پر یہود کی طرف ہے۔ جو اپنے آپ کو نسل انبیاء میں سے ہونے کی وجہ سے مقدس سمجھ رہے تھے۔ باقی ہندوستان میں برہمن چھتری وغیرہ اپنے آپ کو محض مقدس خاندانوں سے انتساب کی بناء پر مقدس سمجھنے والے، اپنے چندر بنسی اور سورج بنسی ہونے پر فخر کرنے والے یا جاپانیوں کی طرح اپنے کو دیوتاؤں کی نسل میں سے قرار دینے والے سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔ اور ہاں! کسی درجہ میں مسلمان پیرزادے، مخدوم زادے اور سیّد زادے وغیرہ ہم بھی۔

تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۵، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۵، ۱۹۶

Marfat.com

اُس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بس شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے۔ کہ شرک جس کو لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا۔ تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ حتیٰ کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے۔ مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ علمائے یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے۔ بلکہ ان کا سارا وقت ان جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا۔ جو ان کے فقیہوں نے استنباط اور تنبیط کر کے نکالے تھے۔ مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انہیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔

شرک[1] کی دو بڑی اقسام ہیں:

(ا) شرک فی الالوہیت، یعنی اسباب اور کائناتی سنن سے ماورا کسی تسلط و اقتدار کا غیر اللہ کے حق میں شعور و عقیدہ۔

(ب) وحی الٰہی کے سوا کسی اور طریقے سے تحلیل و تحریم کو اخذ کرنا اور بندوں کے احکام کو قوانین و ضوابط قرار دینا۔ یہی وہ شرک ہے۔ جس کی طرف قرآن پاک نے سورہ توبہ کی اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ الخ اور ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیث میں جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے۔ کہ ان کے احبار و رہبان کو ارباب بنانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ انہوں نے حلال و حرام میں ان کی غیر مشروط اطاعت و اتباع کیا تھا۔

الوہیت و ربوبیت میں شرک کئی صدیوں سے مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکا ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو مشرک فرمایا ہے۔ گویا کہ ارشاد ہو رہا ہے کہ تم کتابوں اور پیغمبروں کی طرف منسوب ہونے پر مغرور مت ہو جاؤ۔ حالانکہ تم نے دین کی بنیاد یعنی توحید کو شرک کر کے ڈھا دیا ہے۔ اور اللہ شرک کو کسی حال میں بھی نہیں بخشے گا۔

شرک کی عدم مغفرت میں حکمت یہ ہے۔ کہ دین کی اصل غرض تزکیۂ نفوس، تطہیر ارواح اور عقول کو ترقی دینا ہے۔ اور شرک ان سب باتوں کے منافی ہے۔ کیونکہ وہ عقول کی پستی

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۵۹، [2] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۵۸، ۶۱، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۱۴۳، ۱۴۶ (طبع ثالث)

Marfat.com

کی آخری حد ہے۔ وہ تمام رذائل و مفاسد جو افراد و جماعات کو فاسد کرتے ہیں، شرک ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ شرک کے ذریعہ سے ہی اپنے جیسوں کو یا اپنے سے بھی کم تر انسانوں جیوانوں بلکہ درختوں کو بھی تقدیس و خضوع کے مرتبہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ اعلیٰ ترین تسلط اور اقتدار ان کے ہاتھ میں ہی ہے اور انہیں راضی کر لینا اور ان کی اطاعت خدا کو راضی کرنا اور اس کی اطاعت ہے۔

توحید کی وجہ سے بندہ ارضی و سماوی چیزوں اور انسان و حیوان کی غلامی کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ اپنی حرّیت و اکرام کو پالیتا ہے۔ اور سوائے رب کائنات اور الٰہ برحق کے کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا۔

آیت کے مضمون کا خلاصہ گذشتہ بیان کی روشنی میں یہ ہوا کہ توحید پرستوں کی ارواح بلندیوں کی طرف ترقی پانے والی ہوتی ہیں۔ اور گناہ انہیں ان پستیوں میں نہیں گرا سکتے جن میں مشرکوں کی روحیں گری ہوئی ہوتی ہیں کیوں کہ مشرک چاہے کتنے اچھے اعمال کرے بہر حال اس کی روح غیر اللہ کی بندگی و خضوع کے باعث تاریک رہتی ہے۔ مومن چاہے کوئی گناہ کرے اس کی روح اتنی مظلم و تاریک نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے گناہ اس کی روح کو محیط نہیں ہوتے۔ اس کی خیر اس کی شر پر غالب آجاتی ہے۔ وہ وقفے وقفے سے خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور گناہوں پر نادم ہوتے رہتے ہیں۔ اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ .... پس وہ جلدی توبہ کر لیتے۔ اور برائیوں کو نیکیوں کے غلبہ سے مٹا دیتے ہیں۔ برائی کے اثرات کا مٹ جانا ہی غفران و مغفرت کہلاتا ہے۔

اس آیت میں شرک کو "اثم عظیم" فرمایا گیا ہے اور سورۂ لقمان کی آیت میں اسے "ظلم عظیم" فرمایا گیا ہے۔ اس گناہ کی عظمت دراصل اللہ کی عظمت کے پیش نظر ہے۔ وہ چونکہ سب سے بڑا ہے۔ لہٰذا اس کے بارے میں شرک کرنا عظیم ترین ظلم و اثم ٹھہرا۔

تزکیۂ نفس کا لفظ جو یہاں وارد ہے، اس سے مراد پاکیزگی کا ادّعا، خود پسندی، عجب و تکبّر اور اپنے آپ کو محض وہمی و خیالی فضائل کی بنا پر دوسروں سے اعلیٰ و افضل قرار دینا ہے۔ پاکیزگی کا دعویٰ کرنا چاہے وہ درست بھی کیوں نہ ہو۔ شرعاً مذموم ٹھہرایا گیا ہے۔ پھر غلط ادّعا کا حال تو اس سے بھی ہزار گنا بدتر ہے۔ اس ادّعا کا منشاء جہل و غرور ہے۔ اور اس کے بُرے اثرات میں سے قبولِ حق سے استکبار اور نصیحت نہ سن سکنا ہوتا ہے۔

ابن جریرؒ نے امام حسن بصریؒ سے روایت کی ہے۔ کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے

Marfat.com

میں اتری ہے۔ کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ: "ہم خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں۔" "جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی داخل نہ ہوگا" اور ہمیں دوزخ کی آگ صرف چند دن چھوئے گی۔ سدیؒ کی کی روایت کے مطابق یہود کہا کرتے تھے۔ کہ ہم اپنے بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی تورات سکھا دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ گنہگار نہیں ہوتے اور ہمارے گناہ بھی اپنے بیٹوں کی مانند لاشئی ہیں۔ اور ہم جو بدعملی دن کو کرتے ہیں۔ وہ رات کو مٹ جاتی ہے۔

اس آیت میں دو عبرتیں اور بھی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ اس کی شانِ عدل و رحمت کے خلاف ہے۔ مشرک و کافر کی نیکی بھی ضائع نہیں ہوتی۔ گو شرک کی وجہ سے اس کی کبھی نجات نہ ہوگی۔ مگر جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔ اس کے عذاب میں اس کی وجہ سے تخفیف ضرور ہو جائے گی۔ جسطرح اہل جنت کے کئی طبقات ہیں۔ اسی طرح اہل جہنم کے بھی بہت سے درجات ہیں۔

(ا) حاتم طائیؒ کا عذاب اس کے جود و سخا کے باعث ہلکا ہوگا۔

(ب) ابوطالب کا عذاب حضور علیہ السلام کی کفالت اور نصرت کے باعث کم ہوگا۔

(ج) ابولہب کا عذاب حضورؐ کی پیدائش کی خوش خبری کے باعث اپنی لونڈی ثوبیہ کو کر دینے کے باعث کچھ کم ہو جائے گا۔

(۲) دوسری عبرت اس میں یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو اہل کتاب کی مانند دیندار ہونے کے زعم میں گرفتار نہ ہونا چاہیئے، بڑے بڑے پاکیزگی کے دعوے نہ کرنے چاہئیں۔ اور دوسروں کو بنگاہِ حقارت نہ دیکھنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے انتظام میں کسی کی ناجائز رعایت نہیں کرتا۔ دنیا کے انتظامی معاملات میں مسلم و کافر اور یہودی و نصرانی سب سے ایک جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اور تو اور جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جو خاتم النبیین اور خلاصۂ کائنات ہیں ان کا بھی سر پھوٹا اور دانت شہید کیا گیا۔ جنگ اُحد میں آپؐ کے لشکر نے جو نافرمانی کی اس کے نتیجہ میں یہ سب کچھ ہوا۔ اور آپؐ ایک گڑھے میں زخمی ہو کر گر پڑے۔ مسلمانوں پر اپنے قائد کی اطاعت و اتباع واجب ہے۔ اور اس کی مخالفت سے پرہیز لازم۔ انہیں اپنی کتاب کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ اور ان دجالوں کا اتباع نہ کرنا چاہیئے جو انہیں کتاب پر عمل کرنے سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ اور خدا کی نازل کردہ ہدایت سے روگردان کرنے کی کوشش میں ہیں۔ مسلمانوں کا تنزل اور غلامی صرف بے عملی سے ہے۔ جب تک وہ ان دجال شعبدہ بازوں کے جال میں پھنسے رہیں گے کبھی قعرِ مذلت سے نہ نکلیں گے۔

Marfat.com

ام نہاد دینداری پر غرور، جنس و رنگ اور نسل پر فخر کرنا، اور تزکیہ نفس کا باطل دعویٰ قرآن کی رو سے بدترین اور واضح ترین گناہ ہے۔ خداوند تعالیٰ کسی کے لئے اپنے قوانین کو نہیں بدلتا۔ انسان جب تک خود اپنے کو نہ بدلے تبدیلی ناممکن ہے۔

[1] کتاب و سنت اور تاریخ کے دلائل سے ثابت ہے کہ رسالت محمدیہؐ کے عہد میں جزیرۂ عرب کے یہود مشرکانہ عقائد کے حامل تھے۔ اور توحید سے منحرف ہو چکے تھے۔ شرک چونکہ بندے اور خدا کا تعلق منقطع کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ مغفرت کی کوئی امید باقی نہیں رہتی، جس کی موت شرک پر ہوگی۔ حالاں کہ کائنات میں دلائل توحید بکھرے پڑے ہیں اور انبیاء کی کتب و ہدایات اس کو واضح کر رہی ہیں۔ تو ایسا شخص ہرگز مغفرت کا اہل نہیں ہے۔ جس جان میں خیر و صلاحیت کا کوئی عنصر بھی باقی ہو وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ شرک کے سوا ہر گناہ چاہے کتنا بڑا ہو وہ حد مغفرت میں داخل ہو سکتا ہے۔ بہت سی صحیح احادیث اس مضمون پہ صراحتہً روشنی ڈالتی ہیں۔ پھر یہ مغفرت چاہے توبہ سے ہو یا بلا توبہ، عذاب دے کر ہو یا رحمت و فضل سے۔ کئی صورتوں سے ہو سکتی ہے۔

یہود کا یہ دعویٰ کہ وہ خدا کی برگزیدہ قوم ہے۔ بہت پرانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو انہیں امانت و رسالت کیلئے چنا اور ان کے وقت میں تمام جہانوں پہ حکومت و ریاست امانت و نبوت سے فضیلت دی۔ مگر انہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ الٹے نسلی تفاخر اور قومی فخر و غرور میں مبتلا ہو گئے اور دنیا کے ہر گوشے میں ذلیل ہوئے۔ انہیں نے تحلیل و تحریم کا اختیار احبار و رہبان کو دے دیا۔ اور خدا کی شریعت میں غیروں کی دخل اندازی کو پسند کر لیا۔ بدکاری سازش، کذب و افترا، سود خواری اور حرام خوری ان کا وطیرہ بن گیا۔ اس سب کچھ کے باوجود وہ اپنے برگزیدہ قوم" ہونے کا ڈھنڈھورا پیٹتے رہے اور جنت کے وارث ہونے کے زعم باطل و مردود میں مبتلا رہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب کا جو

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۱۰۱، ۱۰۵

Marfat.com

يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ

مانتے ہیں بتوں کو اور شیطان کو اور کہتے ہیں کافروں کو

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

کہ یہ لوگ زیادہ راہ راست پر ہیں مسلمانوں سے

سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ

یہ وہی ہیں جن پر اللہ نے لعنت فرمائی اور جن پر

اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ

اللہ لعنت کرے تو ہرگز اس کا مددگار نہ پائے گا۔ کیا ان کا کچھ حصہ ہے

مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾

سلطنت میں پھر تو یہ نہ دیں گے لوگوں کو ایک تل برابر

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ

یا حسد کرتے ہیں لوگوں کا اس پر جو اللہ نے ان کو دیا ہے اپنے

فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ

فضل سے سو ہم نے دی ہے ابراہیم کے خاندان میں کتاب اور

الْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

علم اور ان کو دی ہے ہم نے بڑی سلطنت۔ پھر

Marfat.com

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ

ان میں سے کسی نے ان کو مانا اور کوئی اس سے ہٹا رہا اور

وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

کافی ہے دوزخ کی بھڑکتی آگ

شرح الفاظ

الجبت[1]: دراصل یہ لفظ الجبس ہے جس کا معنی ہے رذی۔ جس میں کوئی خیر و خوبی نہ پائی جائے، اور یہاں اس سے مراد اہل کتاب کے اوہام و خرافات اور دجل و خداع ہیں۔ الطاغوت: سخت سرکش اور نافرمان، جس کی عبادت اور جس پر ایمان لانا طغیان و سرکشی اور حق سے خروج کا باعث ہو۔ ہر مخلوق جس کی عبادت کی جائے۔ ہر رئیس جس کی اندھی تقلید کی جائے۔ اور ہر خواہش نفس جس کا اتباع کیا جائے۔ وہ طاغوت ہے۔ حضرت عمرؓ اور امام مجاہدؒ سے اس کا معنی شیطان منقول ہے۔ (غرض اس سے وہی ہے۔ جو اوپر بیان ہوئی۔ مؤلف) نقیرا: کھجور کی گٹھلی میں جو کھدی ہوئی جگہ نگیر کی مانند ہوتی ہے۔ اور اسی سے کھجور اگتی ہے۔ معمولی اور حقیر چیز میں وہ ضرب المثل ہے۔ اسی طرح قطمیر بھی بطور مبالغہ حقارت و قلت میں ضرب المثل ہے۔ اور وہ پتلا سا پردہ ہوتا ہے۔ جو گٹھلی اور چھلکے کے درمیان ہوتا ہے۔ یحسدون: حسد کا معنی ہے۔ نعمت والے سے جو اس کا حقدار ہے۔ اس کے زوال کی تمنا کرنا۔ الناس: سے مراد یہاں رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی ہیں۔ فضلہ: فضل سے یہاں مراد نبوت اور عزت دارین ہے۔ الکتاب: ظاہر شریعت کا علم۔ الحکمۃ: شریعت کے گہرے اسرار کا علم۔ ملکا عظیما: انبیائے بنی اسرائیل مثلاً داؤدؑ و سلیمانؑ کی سلطنت۔ صد عنہ: صد کا معنی اعراض ہے۔ اگر متعدی ہو تو اس کا معنی ہے۔ دوسروں کو کسی چیز سے روکنا اور باز رکھنا۔ سعیرا: بھڑکتی ہوئی اور شعلہ زن آگ۔

محمد بن اسحاق نے عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ کہ جنگ احزاب کو برپا کرنے والے اور قریش، بنو غطفان اور بنو قریظہ کو اسلام کے خلاف بھڑکانے والے یہ لوگ تھے۔ حیی ابن اخطب یہودی، سلام بن ابی الحقیق یہودی، ابو عمارہ، ہوزہ بن

[1] تفسیر المراغی جلد ۵ صـ ۶۲، ۶۳

Marfat.com

قیس اور باقی کچھ بنو قریظہ کے یہودی قبیلہ کے سردار تھے۔ پس جب یہ لوگ اپنے مذموم مقاصد کے لیے قریش کے پاس بصورتِ وفد آئے تو قریش نے آپس میں کہا کہ یہ لوگ یہود کے احبار (عالم) اور پہلی کتابوں کے عالم ہیں ان سے پوچھو کہ قریش کا دین بہتر ہے یا محمدؐ کا؟ سو لوگوں نے ان سے یہ سوال کیا تو وہ ازراہِ تعصب و عناد بولے کہ تمہارا دین بہتر ہے۔ اور تم لوگ (معاذ اللہ) محمدؐ اور اس کے ساتھ اعلیٰ و برتر ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (یعنی آیت ۵۱)

ممکن ہے۔ یہ آیات جنگِ احزاب کے دوران میں یا اس کے بعد اتری ہوں کیونکہ یہودیوں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا عہد توڑ ڈالا تھا اور مشرکین مکہ سے مل کر مسلمانوں کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سازش کی تھی۔ تاکہ مسلمان یہود پر غالب نہ آجائیں۔ یہی باعث ہے کہ انہوں نے ازراہِ عداوت و خباثت مشرکوں کے دین کو اسلام سے افضل قرار دیا تھا۔ یہی خبیث نعرہ اس وقت بلند کیا گیا۔ جب کہ احزاب کے لئے لشکر چڑھائے جا رہے تھے۔ اور نقارہ جنگ پہ چوٹ پڑ چکی تھی۔

آیت[1] ۵۱ میں یہود کی شرارت و خباثت کا اظہار ہے۔ قصہ یہ ہے کہ جب یہودیوں کو حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے عداوت بڑھی تو مشرکین مکہ سے ملے، ان سے متفق ہوئے اور ان کی خاطر داری کے لئے بتوں کی تعظیم کی اور کہا کہ تمہارا دین مسلمانوں سے بہتر ہے اور اس کی وجہ صرف حسد تھا۔ اس بات پر کہ نبوت اور دین کی ریاست ہمارے سوا دوسروں کو کیوں مل گئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ ان کو الزام دیتا ہے۔

آیت ۵۲: وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب ہو کر اغراض نفسانی کی وجہ سے بتوں کی تعظیم کی حالانکہ بت پرستی ان کے نزدیک بھی قطعاً ناجائز اور شرکِ محض تھی! مؤلف) اور طریقہ کفر کو طریقہ اسلام سے افضل بتایا۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور جس پر اللہ لعنت کرے اس کا دنیا و آخرت میں کوئی حامی و مددگار نہیں ہو سکتا سو اب انہوں نے اپنی اعانت کی طمع میں جو مشرکین مکہ سے موافقت کی یہ بالکل لغو ہے۔ چنانچہ دنیا میں یہود نے از حد ذلتیں اٹھائیں اور آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

آیت ۵۲: یہود اپنے خیال میں جانتے تھے۔ کہ پیغمبری اور دین کی سرداری ہی ہماری میراث ہے۔ اور صرف ہمیں کو لائق ہے اس لئے (بزعم باطل خود) عرب کے پیغمبرؐ کی متابعت سے عار سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ آخر کو حکومت اور بادشاہت ہم کو ہی پہنچے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۱۱، تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۶، ۱۹۷، تفسیر ابن کثیر پ ۵ صفحہ ۴۸، ۴۹ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

جائے گی، برائے چندے اوروں کو بھی مل جائے گی، تو مضائقہ نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مطلب آیت کا یہ ہے۔ کہ کیا یہود کا کچھ حصہ ہے۔ سلطنت میں؟ یعنی ہرگز نہیں۔ اگر یہ حاکم ہو جائیں تو لوگوں کو تل برابر بھی نہ دیں۔ (مسلمانوں کے نفاق باہمی، بدعملی اور دین سے انحراف کے باعث آج اسرائیل کی سلطنت میں اس آیت کا مصداق دیکھ لیجئے۔ جو ظلم و ستم یہود نے عرب مسلمانوں پر کئے ہیں۔ اور برابر کئے جا رہے ہیں، ان کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یہودیوں کی دو ہی حالتیں رہی ہیں۔

(ا) ظالم اور (ب) مظلوم

چنانچہ اب وہ ظالم ہیں اور نازیوں اور اشتراکیوں کے مظالم کو بھی مات کر رہے ہیں۔ اتنی سختیاں شاید سپین کے صلیبی عیسائیوں نے بھی مسلمانوں پر نہ کی ہونگی۔ جو وہ اس وقت مسلمانوں پر کر رہے ہیں۔ مؤلف)

آیت ۵۴: کیا یہود حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اور ان کے اصحاب پر اللہ کے فضل و انعام کو دیکھ کر حسد میں مرے جاتے ہیں؟ سو یہ تو بالکل ان کی بے ہودگی ہے کیوں کہ ہم نے حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے میں کتاب اور علم اور عظیم سلطنت عنائت کی ہے۔ پھر یہود آپؐ کی نبوت و سلطنت پر کیوں حسد کرتے ہیں؟ اب بھی تو نبوت و عزت حضرت ابراہیمؑ کے گھر ہی میں ہے۔

آیت ۵۵: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے میں خدائے تعالےٰ نے ہمیشہ سے بزرگی دی ہے، اور اب بھی بزرگی اسی گھرانے میں ہے۔ سو جو کوئی بلا وجہ محض حسد سے اس کو نہ مانے تو اس کو جلانے کے لئے دوزخ کی بھڑکتی آگ کافی ہے۔

لہ الْجِبْتُ وَالطَّاغُوْتُ: ویسے تو بقول امام راغبؒ ہر باطل معبود جبت ہے مگر خصوصیت کے ساتھ اس کا استعمال ساحروں اور کاہنوں کے لئے ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ ابن عباسؓ، ابن جبیرؓ اور ابوالعالیہؓ سے یہی معنیٰ معقول ہے (ابن جریر، قرطبی) یہودی میں جنتر منتر، عملیات، سحر، کہانت، نجوم وغیرہ علوم جبت کا ذوق ابتداء سے چلا آ رہا ہے۔ جیسا کہ سورہ البقر میں ہے: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ... پس عجب نہیں اس جبت کے لفظ سے ان کی اسی قومی خصلت کی طرف اشارہ مقصود ہو۔ طاغوت ہر وہ چیز جو انسان میں سرکشی

تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۷، تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۲۵۹،

Marfat.com

دعدد ان پیدا کرے (قرطبی) عجب نہیں کہ اس لفظ سے یہود کے رجحانِ مادیت اور ذوقِ مادہ پرستی کی طرف توجہ دلانا منظور ہو۔

[1] اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ : ملک سے مراد یا تو خدا کی حکومت ہے، یا دنیوی سلطنت و اقتدار۔ پہلی صورت میں معنیٰ یہ ہے۔ کہ اگر خدا کی حکومت کا کوئی حصّہ ان کے قبضہ میں ہوتا (جس کی بناء پر یہ فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کون برسرِ ہدایت ہے اور کون نہیں ہے!) تو ان کے ہاتھوں دوسروں کو پھوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوتی، کیوں کہ ان کے دل تو اتنے چھوٹے ہیں۔ کہ ان سے حق کا اعتراف تک نہیں ہو سکتا (بلکہ مشرکوں کو اہل اسلام پر ترجیح دیتے اور انہیں راہِ راست پر بتاتے ہیں۔ حالانکہ ایک طرف توحید خالص ہے اور دوسری طرف صریح بت پرستی جس کی مذمت میں بائبل بھری پڑی ہے۔ دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا۔ کہ اس میں دوسرے لوگ حصہ بٹانا چاہتے ہیں۔ اور یہ انہیں اس میں سے کچھ نہیں دینا چاہتے؟ یہاں تو محض اعتراف حق کا سوال درپیش ہے۔ اور میں بھی یہ بخل سے کام لے رہے ہیں۔

[2] وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا : عکرمہؓ نے روایت کی ہے کہ کعب بن اشرف یہودی مشرکین قریش کے ہاں گیا اور انہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھڑکایا اور کہا کہ تم اس پر حملہ کردو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ قریش بولے کہ تم بھی اہل کتاب ہو اور محمدؐ بھی کتاب والے ہیں، خدشہ ہے۔ کہ یہ کہیں تمہاری کوئی خفیہ سازش نہ ہو اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہاری بات مانیں تو ان دو بتوں کو سجدہ کرو اور ان پر ایمان لاؤ۔ اس دبوٹ نے ایسا ہی کیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ کیا ہم زیادہ ہدایت پر ہیں یا محمدؐ؟ ہم مہمانوں اور حاجیوں کے لئے بہترین اونٹ ذبح کرتے ہیں۔ لوگوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں حالانکہ محمدؐ نے قطع رحمی کی ہے۔ اور اپنے شہر سے نکل گیا ہے۔ کعب بولا کہ تم اس سے بہتر اور زیادہ ہدایت یافتہ ہو!

لَا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا : یہودی نہایت تنگ ظرف، لالچی، بخیل اور شدید متعصب ہیں، کسی غیر یہودی کو نفع پہنچانا تو رہا ایک طرف دوسروں کی نعمت سے جلتے ہیں۔ اگر انہیں حکومت مل جائے تو ادنےٰ اور حقیر سا نفع بھی کسی کو نہ پہنچائیں گے۔ جب ان کا حال یہ ہے تو لازماً انہیں اس بات کی شدید حرص تھی کہ اہل عرب میں سے کوئی نبی نہ اٹھے مبادا بنی اسرائیل

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۶۰،
[2] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۶۴، ۶۶، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۱۵۵، ۱۶۳

Marfat.com

س کے اور اس کے اصحاب کے مطیع ہونا پڑے۔ یہود کا ہمیشہ سے یہی حال رہا ہے اور
بھی یہی ہے۔ اگر فلسطین اور بیت المقدس میں ان کی حکومت قائم ہوگئی تو وہ مسلمانوں
عیسائیوں کو اس مقدس سرزمین سے نکال باہر کریں گے۔ اور انہیں ذرہ برابر بھلائی
پہنچنے دیں گے۔ (چنانچہ آج اس سرزمین میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ روزانہ خبریں آ رہی ہیں کہ
ایک طرف تو یہودی اپنی توسیعِ سلطنت کے لئے کوشاں ہیں۔ اور دوسری طرف غیر یہودی
یہودی کو اس کے آبائی مکانوں اور زمینوں سے جبراً بیدخل کرتے چلے جاتے ہیں، ان کے
ظالم سے مرد عورت، بچہ بوڑھا کوئی نہیں بچتا۔ مؤلف)

آیت میں اس بات کا نفیاً یا اثباتاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ کہ یہود کی سلطنت قائم ہو
یا نہیں۔ اس میں صرف اتنا بیان ہے۔ کہ اگر انہیں سلطنت ملے تو وہ یوں کریں گے!

فَمِنْهُمْ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ ... محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نبوت و اقتدار کا دیا جانا کوئی انوکھا اور عجیب واقعہ تو نہیں ہے۔ آپؐ سے قبل بھی پیغمبروں
یہ سب کچھ ملتا رہا ہے۔ پھر یہود کا حسد و بغض ناقابل فہم اور لغو ہے پچھلے پیغمبروں پر بھی
لوگ ایمان لاتے تھے۔ اور کچھ نہ لاتے تھے۔ پس پیغمبر الزمانؐ کی مخالفت اور آپؐ پر کچھ
لوں کا ایمان نہ لانا بعید نہیں۔ اس میں پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ یہود کے
جود و انکار اور اذیت پر دل شکستہ نہ ہوں۔

حق و باطل[1] کے معاملے میں یہود کا موقف ہمیشہ رہا ہے۔ کہ وہ نہایت طامع، لالچی
سازشی، نفس پرست، حسد و بغض سے جلے ہوئے رہے ہیں۔ وہ اہل حق کے پاس اپنی ان
خباثتوں کی پیاس نہیں بجھا سکتے، لہٰذا ہمیشہ باطل اور اہل باطل کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ ان
کا وزن ہمیشہ اسلام کے مقابلے میں کفر کے پلڑے میں اور اہل اسلام کے مقابلے میں
دشمنانِ اسلام کی جانب رہا ہے۔ اور اپنے وسیع مالی اور نشری وسائل سے جو ان کے ہاتھ میں
ہیں، ہمیشہ دنیا بھر میں ہر اسلامی تحریک کو مٹانے، اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور
اسے سرنگوں کر کے کفر کو بلند کرنے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ شروع میں انہوں نے مشرکین
قریش کا ساتھ دیا تھا۔ اور اب دنیا بھر کے مشرکوں، کافروں اور اشتراکیوں کا ساتھ دیکر اپنی
پرانی خباثت کا اظہار کر رہے ہیں۔

لیکن ابتداء میں تو انہوں نے علانیہ کفر و شرک اور مشرکوں کی مدح و ثناء کی تھی اب

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶

Marfat.com

مصلحت وقت کے پیش نظر ایسا نہیں کرتے بلکہ خفیہ سازش کرتے ہیں۔ حق اور اہل حق کا چہرہ بگاڑ کر پیش کرتے ہیں۔ تاکہ باطل کو حق پر اور باطل پرستوں کو اہل حق پر چڑھا لائیں بلکہ ان کی وسیع کاریوں سے یہ بھی بعید نہیں کہ کبھی کبھی بظاہر دشمنانِ اسلام کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن یہ ان کا خبیث اور شدید دجل وخداع اور مکر وفریب ہوتا ہے۔ جس سے محض مسلمانوں کو دھوکا دینا مدِ نظر ہوتا ہے۔

ایک چیز جس کو یہود نے کبھی نہیں چھوڑا وہ اہلِ حق اور اہل اسلام کی عداوت اور حسد و بغض ہے۔ ان کی ساری تاریخ اس سے پُر نظر آتی ہے۔ آج ملحدوں، مشرکوں اور صلیبی علیائیوں نے یہود کی مدد کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اس صورتِ حال کے مقابلہ کے لئے ضرورت فقط صحیح ایمان اور خالص نیت وعمل کی ہے، خدا کے وعدے برحق ہیں اور وہ آج بھی پورے ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اس کے اہل ہوں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ

بے شک جو لوگ منکر ہوئے ہماری آیتوں سے ان کو ہم ڈالیں گے آگ میں

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا

جس وقت جل جائے گی کھال ان کی بدل دیں گے ان کو اور کھال

غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا

تاکہ چکھتے رہیں عذاب بے شک اللہ ہے زبردست

حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

حکمت والا اور جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک

سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

البتہ ان کو ہم داخل کریں گے باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ز

رہا کریں گے ان میں ہمیشہ ان کے لئے وہاں عورتیں ہیں ستھری

Marfat.com

وَّنُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِيۡلًا ﴿۵۷﴾

اور ان کو ہم داخل کریں گے گھنی چھاؤں میں

شرحِ الفاظ

نُصۡلِيۡهِمۡ : ہم ان کو تلیں گے اور بھونیں گے۔ شَاةٌ مَصۡلِيَّةٌ اور شَاةٌ مَشۡوِيَّةٌ کا معنیٰ ایک ہی ہے۔ یعنی بھنی اور تلی ہوئی بکری نَضِجَتۡ : جل بھن کر کوئلہ ہو جائیں گے۔ نُضج کا معنیٰ اصل میں پکنا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ نَضِجَ التَّمۡرُ وَاللَّحۡمُ : یعنی پھل یا گوشت پک کر تیار ہو گیا۔ لِيَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ یعنی تاکہ عذاب کا مزہ انہیں ہمیشہ ملتا رہے۔ اور منقطع نہ ہو۔ جیسے تم صاحب عزت کو کہتے ہو۔ اَعَزَّكَ اللّٰهُ یعنی اللہ تیری عزت کو قائم و دائم رکھے۔ عَزِيۡزًا : قادر اور اپنے معاملات پہ پورا صاحبِ غلبہ و اختیار حَكِيۡمًا : جو حکمت اور صواب کے موافق سب چیزوں کی تدبیر کرتا ہے۔ مُطَهَّرَةٌ : تمام عیوب اور ظاہری و باطنی پلیدیوں سے مبرّا۔ ظِلًّا ظَلِيۡلًا : گھنا اور مسلسل سایہ جس میں کسی کو گرمی اور بادِ سموم کی آنچ نہ پہنچ سکے۔ ظلیل کا لفظ مبالغہ و تاکید کے لئے آیا ہے۔ جیسے لَيۡلٌ اَلۡيَلُ : سیاہ کالی رات، جنت کے سائے کو سورج کی گرمی اور دھوپ مکدّر نہیں کرے گی۔ کبھی کبھی ظلّ کے لفظ سے عزت و شان اور رفاہیت مراد ہوتی ہے۔ جیسے : اَلسُّلۡطَانُ ظِلُّ اللّٰهِ فِي الۡاَرۡضِ : اہل عرب انتہائی گرم علاقوں میں رہتے تھے۔ لہٰذا سایہ ان کے ہاں راحت کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اور ظلّ ان کے نزدیک دائمی نعمت کا اشارہ تھا۔ بِاٰيٰتِنَا : آیات سے مراد وہ دلائل ہیں جو اسلام کی حقانیت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ سب سے بڑی آیت (دلیل) قرآن مجید ہے۔ جو اوّل درجے کی آیت سب سے واضح نشانی اور سب سے زیادہ ظاہر و غالب دلیل ہے آیات سے کفر یا تو ان کے انکار سے ہوتا ہے یا ان میں غور و فکر کی طرف سے غفلت سے، یا از روئے عناد و حسد ان کی حقّانیت کے علم کے باوجود شکوک و شبہات پیدا کرنے سے ہوتا ہے خَالِدِيۡنَ خلود کا معنیٰ دوام ہے اور اَبَدًا کا لفظ اس کی تاکید کے لئے ہے۔

اوپر کی آیت میں رسولوں کی دعوت کے بارے میں دو فریق ہو جانے کا ذکر آیا ہے ایک ملنے والا اور دوسرا اعراض کرنے والا۔ ان آیات میں ہر دو کی اخروی جزا و سزا کا بیان ہے،[1] آیت ۵۶ : کافروں کے عذاب میں کمی نہ آنے کی غرض سے ان کی کھال کے جل جانے

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۱۲،

Marfat.com

کے وقت دوسری کھال بدل دی جائے گی۔ مطلب یہ کہ وہ ہمیشہ عذاب میں یکساں مبتلا رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً زبردست اور غالب ہے کافروں کو ایسی سزا دینے میں کوئی دقت اور دشواری نہیں۔ اور وہ حکمت والا ہے۔ کافروں کی یہ سزا عین حکمت کے موافق ہے۔

آیت ۵۷: مومن ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ اور ان کو عورتیں ایسی ملیں گی۔ جو حیض اور دیگر آلائشوں سے پاک ہوں گی اور ان کو گہری اور گنجان چھاؤں میں داخل کریں گے۔ جو آفتاب کی دھوپ سے بالکل محفوظ ہو گی۔

ارشاد یہ ہو رہا ہے۔ کہ یہ نہ سمجھنا کہ کھال جب جل جائے گی تو اس میں مزید الم کا احساس و ادراک ہی کہاں باقی رہے گا؟ نہیں بلکہ کھال کا احساس ہر دم تازہ رہے گا۔ اور جلد بے حس کبھی نہ ہونے پائے گی۔ آخرت میں خواصِ اشیاء کو دنیا کے خواص طبعی پر قیاس کرنا بوں بھی کمالِ بے دانشی ہے۔

[1] بعض علماء کہتے ہیں۔ کہ جنت کے گھنے اور دراز سایہ سے مراد خدا کی مہربانی اور دائمی عنایت ہے۔ جو اس کے تقرب اور روحانی جنت کی طرف اشارہ ہے۔

[2] ڈاکٹر عبدالعزیز اسمٰعیل پاشا نے اپنی کتاب "اسلام اور طبِ جدید" میں فرمایا ہے کہ: کافروں کی کھالوں کے بدلنے میں حکمت یہ ہے۔ کہ رنج و الم محسوس کرنے والے پٹھے کھال کے طبقے میں ہوتے ہیں۔ شریانوں، غدود اور داخلی اعضاء میں احساس کمزور ہوتا ہے، اس لئے ڈاکٹر جانتے ہیں۔ کہ وہ جلن جو کھال سے متجاوز نہ ہو سخت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بخلاف اُس شدید جلن کے جو کھال سے گذر کر شریانوں تک جا پہنچے، کیوں کہ وہ اپنی شدت اور خطرناکی کے باوجود زیادہ الم پیدا نہیں کرتی۔ پس اللہ تعالےٰ اس آیت میں فرما رہا ہے کہ جہنم کی آگ جب کفار کی جلد کو کھا جائے گی۔ جس میں کہ حساس پٹھے ہوتے ہیں۔ تو ہم از سرِ نو کھال پیدا کر دیں گے۔ تاکہ الم بلا انقطاع جاری رہے۔ اور وہ دردناک عذاب چکھتے رہیں۔ انسان کو اس امر کی حکمت طب نے بعد میں بتائی ہے۔ اور حکمتِ الٰہیہ اس سے باخبر تھی۔

عذاب کے لئے یہاں پر ذوق کا لفظ لایا گیا ہے۔ جس میں یہ اشارہ ہے کہ کفار کا احساسِ عذاب اسطرح ہو گا۔ جیسے کسی چیز کے چکھنے والے کو ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نقصان اور زوال جلد کے جلنے کے باعث نہ واقع ہو گا۔

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۷، [2] تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۱۹۷،
[3] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۶۷، ۶۹، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۱۶۲، ۱۶۸،

Marfat.com

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ

بیشک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ

اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے

اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا

بیشک اللہ نہیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بیشک اللہ ہے سننے والا دیکھنے

بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ

والا ۔ اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو

اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ

رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں ۔ پھر اگر

تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو لوٹاؤ طرف اللہ کے اور رسول

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

کے اگر تم یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ ع

یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا انجام

Marfat.com

شرح الفاظ

[1] اَلْاَمَانَۃُ : وہ چیز ہے۔ جسے اس کے مالک پہنچانے اور واپس کرنے کیلئے محفوظ رکھا جائے۔ سنبھالنے والے کو حفیظ، امین اور وَفِیٌ (وفادار) کہتے ہیں۔ اور جو الیسا نہ کرے وہ خائن کہلاتا ہے۔ اَلْعَدْلُ حق کو قریب ترین راستے سے اس کے مالک وصاحب تک پہنچانا۔ تَاْوِیْلاً : انجام وعاقبت کا بیان۔

پچھلی آیت میں ایمانداروں اور نیک اعمال کرنے والوں کا اجر عظیم بیان فرمایا تھا نیک اعمال میں سے بہت بڑے عمل ادائے امانت اور لوگوں میں عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔ لہٰذا ان آیات میں ان کا بیان فرمایا گیا ہے۔

[2] حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے۔ کہ فتح مکہ کے دن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے کنجی بردار عثمان بن طلحہ کو طلب فرمایا۔ جب وہ آگیا تو حضورؐ نے اس سے کعبہ کی کنجی طلب فرمائی۔ عثمانؓ نے کنجی دینے کے لئے ہاتھ پھیلایا تو عباسؓ بن عبدالمطلب نے کھڑے ہو کر کہا کہ یا رسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں یہ کنجی مجھے عنایت کر دیجئے تاکہ حاجیوں کو پانی پلانے اور چاہ زمزم کی تولیت کے ساتھ ساتھ یہ شرف بھی مجھے مل جائے۔ اس پر عثمان نے اپنا ہاتھ پھر کھینچ لیا۔ حضورؐ نے فرمایا اے عثمان کنجی دے دو! عثمان نے کہا کہ لیجئے یہ اللہ کی امانت ہے، حضورؐ نے کنجی لی، کعبۃ اللہ کو کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ جب باہر آئے تو کعبہ کا طواف فرمایا۔ اتنے میں جبریلؑ نازل ہوئے اور اللہ کی طرف سے عثمان بن طلحہ کو کنجی واپس کرنے کی ہدایت کی۔ حضورؐ نے اسے بلایا اور اور کنجی اسے واپس کر کے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا

آیت ۵۸ : یہود کی عادت تھی کہ امانت میں خیانت کرتے اور فصلِ خصومات میں رشوت وغیرہ کی وجہ سے کسی کی خاطر اور رعایت کر کے خلافِ حق حکم دیتے اس لئے مسلمانوں کو ان دونوں باتوں سے اس آیت میں روکا گیا۔ یعنی اللہ تعالےٰ جو تم کو ادائے امانت اور عدل کے موافق حکم دینے کا حکم فرمایا ہے۔ تو یہ تمہارے لئے سراسر مفید ہے۔ اور اللہ تمہاری کھلی اور چھپی اور موجودہ اور آئندہ باتوں سے خوب واقف ہے۔ تو اب تم کو ادائے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۱۲ تفسیر ابن کثیر پ ۵ صفحہ ۵۰، ۵۵

[2] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۶۹، تفسیر ابن کثیر پ ۵ صفحہ ۵۰۔

Marfat.com

امانت اور عدل مفید معلوم نہ ہو تو حکم الٰہی کے مقابلہ میں اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

آیت ۵۹ : پہلی آیت میں حکام کو عدل کا حکم دے کر اب اوروں کو حکام کی متابعت کا حکم دیا جاتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام کی اطاعت جبھی واجب ہوگی جب وہ حق کی اطاعت کریں گے، حاکم اسلام، خلیفہ سلطان یا اس کا صوبہ دار یا قاضی یا سردارِ لشکر جو کوئی کسی کام پہ مقرر ہو اس کے حکم کا ماننا ضروری ہے۔ جب تک کہ وہ خدا اور رسولؐ کے خلاف حکم نہ دیں، ایسی صورت میں ہرگز ان کا حکم نہ مانا جائے گا۔

فرمایا ہے کہ اگر تم میں اور اُولی الامر باہم اختلاف ہو جائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ و رسولؐ کے حکم کے مخالف ہے یا موافق۔ تو اس کو کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ اللہ کی طرف رجوع کر کے طے کر لیا کرو۔ کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ و رسولؐ کے حکم کے موافق ہے۔ یا مخالف، اور جو بات ثابت ہو جائے۔ اسی کو بالاتفاق مسلّم اور معمول بہ سمجھنا چاہیئے اور اختلاف کو دور کر دینا چاہیئے اگر تم کو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان ہے۔ تو ایسا ہی کرو کیوں کہ جس کو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان ہوگا۔ وہ ضرور اختلافات کی صورت میں اللہ اور رسولؐ کے حکم کی طرف رجوع کرے گا۔ اور ان کے حکم کی مخالفت سے ضرور بے حد ڈرے گا۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ جو اللہ اور رسولؐ کے حکم سے بھاگے گا وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ اس لئے اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں۔ ایک نے کہا چلو شرع کی طرف رجوع کریں۔ دوسرے نے کہا کہ میں شرع کو کچھ نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کوئی کام نہیں تو اس کو بیشک کافر کہیں گے۔

دنیوی و اخروی ہر دو اعتبار سے حکمِ شرع کی طرف رجوع کرنا ہی بہتر ہے اور یہی ایک مسلمان کا وطیرہ ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف کرنا تقاضائے اسلام نہیں۔ یہی ایمان و کفر میں امتیاز ہے۔[1]

اَمانات کے لفظ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سب آجاتے ہیں۔ (ابن کثیر، قرطبی)

اَطِیْعُوا اللّٰہَ : سے معلوم ہو گیا کہ مطاعِ اصلی اور حاکم حقیقی صرف اللہ تعالےٰ ہے۔

اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ : سے معلوم ہوا کہ پیغمبرؐ کی اطاعت بھی مستقل ہے۔ اور وہ مطاع مطلق اس اعتبار سے ہیں کہ اللہ کے احکام کے وہی پہنچانے والے اور وہ ہی ان کی شرح و تفصیل کرنے والے ہیں۔ اُولُوا الْاَمْرِ میں علماء و فقہائے امت اور امراء و حکام دونوں داخل ہیں۔ کیونکہ احکامِ شریعت کو بتانے اور نافذ کرنے والے یہ دونوں ہوتے ہیں۔ (مدارک، الجصاص) مگر یہ مستقل بالذات مطاع نہیں۔ بلکہ وہ مطاع صرف اس حیثیت

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸،

Marfat.com

سے ہیں کہ احکامِ شریعت کے نافذ کرنے والے یا بعض جزئیات میں ان کی شرح کرنے والے ہیں۔ اس حد کے آگے ان کی اطاعت نہیں۔ مِنْکُمْ کے لفظ کی موجودگی میں غیر مسلم حاکم اور غیر اسلامی حکومت کو اولوالامر کہنا جہالت و حماقت اور ظلم و بطالت ہے۔ اطاعت تو مسلم حاکم کی مشروط ہے اور ہر حالت میں جائز نہیں۔ چہ جائیکہ غیر مسلم کی!

اللہ کے حکم کی طرف مراجعت کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے۔ کہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے سے ہر وقت ممکن ہے۔ لیکن اِلَی الرَّسُوْلِ کی تعمیل کی کوئی صورت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بجز اس کے ممکن نہیں کہ دفتر حدیث و سنن کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس سے حدیث و سنت کی حجیت ثابت ہو گئی۔ اس تفریح نے یہ حقیقت اور کھول دی کہ حکام و علماء سے عوام کا اختلاف بالکل جائز ہے۔ آخری اپیل کتاب و سنت ہی کی عدالت میں ہونی چاہیئے۔ اور وہی ساری شریعت کا اصلی ماخذ ہے۔ یہیں سے اس فرقہ کا بھی رد نکل آیا جو رسولِ معصوم کے علاوہ مستقل ائمہ معصوم کا وجود تسلیم کرتا ہے ہر امام وقت اپنی ساری بزرگیوں کے باوجود بہر حال غیر معصوم ہے۔

"امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو"، یعنی تم ان برائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی۔ کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانہ میں امانتیں، یعنی ذمہ داری کے مناصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے ایسے لوگوں کو دینا شروع کر دیئے جو نااہل، کم ظرف، بد اخلاق، بد دیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُرے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔

بنی اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی روح سے خالی ہو گئے تھے وہ شخصی اور قومی اغراض کے لئے بلا تکلف ایمان کو نگل جاتے تھے۔ صریح ہٹ دھرمی برتتے تھے۔ انصاف کے گلے پر چھری پھیرنے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ ان کی بے انصافی کا تلخ تجربہ اس زمانہ میں خود مسلمانوں کو ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان کے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بتوں کو پوج رہے تھے۔ بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے، سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے

تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۶۲، ۳۶۶

Marfat.com

اور کعبہ کے گرد مادر زاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ یہ نام نہاد اہل کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے فریق پر ترجیح دیتے تھے۔ اور یہ کہتے ہوئے ذرا نہ شرماتے تھے۔ کہ مشرک مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے۔ کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی۔ بہر حال بات جب کہو انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔

آیت ۵۹ : اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ ہے۔ اس میں حسبِ ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے ہیں:۔

(۱) اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندۂ خدا ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہے اس کے بعد ہے۔ مسلمانوں کی انفرادی زندگی اور اجتماعی نظام دونوں کا مرکز و محور خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مدِ مقابل نہ ہوں بلکہ اس کے ماتحت اور تابع ہوں ورنہ ہر وہ حلقہ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو، یہی بات ہے جسے نبی کریم علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ (خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں)

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں بلکہ اطاعتِ خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسولؐ اس لئے مطاع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے۔ جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرائض پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اسی طریقہ سے کر سکتے ہیں۔ کہ رسولؐ کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعت خدا اور رسولؐ کی سند کے بغیر معتبر نہیں ہے۔ اور رسولؐ کی پیروی سے منہ موڑ لینا خدا کی بغاوت ہے۔ حدیث واضح کرتی ہے: (جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی) اور یہی بات قرآن میں بھی پوری وضاحت کے ساتھ آگے ثابت ہو گی۔

(۳) مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان "اولوالامر" کی اطاعت ہے۔ جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ اولوا الامر کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں۔ جو مسلمانوں

Marfat.com

کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں۔ خواہ وہ ذہنی و فکری راہنمائی کرنے والے علماء ہوں یا سیاسی راہنمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی و معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے۔ وہ اطاعت کا مستحق ہے۔ اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا اور رسولؐ کا متبع ہو۔ یہ دونوں شرطیں اس اطاعت کے لئے لازمی ہیں۔ اور یہ نہ صرف اس آیت مذکورہ میں صاف طور پر درج ہیں۔ بلکہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما دیا ہے مثلاً:

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ (متفق علیہ) مسلمان آدمی پر پسند اور ناپسند میں حکم سننا اور اطاعت کرنا واجب ہے، جب تک کہ اسے گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔ جب گناہ کا حکم ملے تو نہ سننا واجب ہے۔ نہ اطاعت کرنا۔ لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةٍ، اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ (متفق علیہ) خدا کی معصیت میں کوئی اطاعت نہیں اطاعت تو صرف نیکی میں ہے۔

يَكُونُ عَلَيْكُمْ اُمَرَاءُ تَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ فَمَنْ اَنْكَرَ فَقَدْ بَرِئَ وَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ سَلِمَ وَلٰكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ۔ فَقَالُوا اَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ قَالَ لَا مَا صَلَّوْا۔ تم پر کچھ لوگ حکمرانی کریں گے۔ جن کی کچھ باتیں اچھی اور کچھ بری ہوں گی۔ پس جس شخص نے معصیت پر اظہار ناراضی کر دیا وہ بری الذمہ ہو گیا۔ اور جس نے اسے ناپسند کیا وہ سلامت رہا۔ لیکن اسے پسند کرنے اور متابعت کرنے والا نہ بچے گا۔ لوگوں نے کہا کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ فرمایا نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔ اس حدیث میں قتال نہ کرنے کو نماز سے وابستہ فرمایا ہے۔ یعنی جب وہ لوگ نماز ترک کر دیں تو بس ان کے خلاف جدوجہد کرنا درست ہو گیا۔

شِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ۔ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذٰلِكَ؟ قَالَ لَا مَا اَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلٰوةَ مَا اَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلٰوةَ

(مسلم)

Marfat.com

فرمایا کہ تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جنہیں تم ناپسند کرو اور وہ تمہیں ناپسند کریں، تم ان پر لعنت کرو وہ تم پر لعنت کریں۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ کیا اس وقت ہم ان سے مقابلہ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، جب تک وہ تم میں نماز قائم کریں، جب تک وہ تم میں نماز قائم کرتے رہیں۔

اس حدیث نے اوپر والی حدیث کی شرط کو اور زیادہ واضح طور پر صاف کر دیا ہے۔ اوپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے۔ کہ نماز پڑھنے سے مراد اقامت صلوٰۃ ہے۔ یعنی دراصل اس کا مطلب مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود نماز کے پابند ہوں۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظام حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم اقامت الصلوٰۃ کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے۔ اور اسے الٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لئے جائز ہو جائے گی۔ اسی بات کو ایک اور حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور باتوں کے ساتھ ایک اس امر کا بھی ہم سے عہد لیا تھا۔ اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ کہ ہم اہل امر سے نزاع نہیں کریں گے۔ الّا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلم کھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے دلیل موجود ہو۔ (بخاری و مسلم)

(۴) چوتھی بات جو آیت زیر بحث میں ایک مستقل اور قطعی اصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے، یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسولؐ کا طریقہ بنیادی اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی۔ اس میں فیصلہ کے لئے قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا۔ اس کے سامنے سب سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اسطرح زندگی کے تمام معاملات و مسائل میں کتاب اللہ سنتِ رسول اللہ کو سند، مرجع اور آخری فیصلہ کن چیز تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے، جو اسے

Marfat.com

کافرانہ نظام سے متمیز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظامِ زندگی ہے۔

جن معاملات میں واضح احکام موجود نہیں مثلاً میونسپلٹی، ریلوے اور ڈاکخانہ کے قواعد وضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات تو ان میں مسلمان کو اجتہاد کی آزادی حاصل ہے اور یہ آزادئ عمل اس حجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی طرف سے آزادی عمل عطا کئے جانے کی دلیل ہے۔

[1] اللہ تعالیٰ نے وقائع کو دو قسم کا بنایا ہے۔

(ا) وہ جن کے احکام منصوص ہیں۔ (کتاب وسنت سے ثابت ہیں)

(ب) وہ جو کہ منصوص نہیں ہیں۔

پس پہلی قسم کے احکام میں تو اللہ ورسولؐ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ان کے نائب اولوالامر کی اطاعت کا بھی حکم اسی میں شامل ہے۔ غیر منصوص احکام میں خدا اور رسولؐ کی طرف رد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس اجتہاد شرعی اور قیاس کا حجت ہونا بھی اسی آیت سے نکل آیا اور اجماع کی حجت کے دلائل بھی کتاب وسنت میں بہت سے موجود ہیں۔

پھر جس طرح علمائے امت نے اپنے اتفاق سے صحاح ستہ کو اور ان میں سے بخاری ومسلم کو زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح فقہائے امت کے تقریباً اتفاق سے ائمہ اربعہ کا سب سے اعلیٰ وافضل ہونا ثابت ہوا ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک کی تقلید (مسائل فرعیہ میں) ایک انتظامی معاملہ ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ عوام میں اضطراب و انتشار پیدا نہ ہو۔ اور یوں تقلید سے کوئی بھی بری نہیں، کسی نے ابوحنیفہؒ، شافعیؒ کی تقلید کی تو کسی نے قاضی شوکانیؒ، حافظ ابن القیمؒ، حافظ ابن حزمؒ ظاہری کی۔ اصولاً سب مقلد ہی رہے۔

[2] امانت کی دو قسمیں ہیں۔

(ا) بندے کی امانت اپنے مالک ورب کے ساتھ، یعنی اس کے اوامر کی ادائیگی، اس کے نواہی سے پرہیز اور اپنے حواس ومشاعر اور جوارح کو اطاعتِ الٰہی میں لگانا اور معاصی سے بچنا۔ حدیث میں آیا ہے۔ کہ تمام گناہ خدا سے خیانت ہیں۔

---

[1] تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱،

[2] تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۷۰، ۷۴، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۱۶۸، ۲۲۲،

Marfat.com

(۲) بندے کی امانت لوگوں کے ساتھ یعنی حقوق العباد کی ادائیگی، کسی کو دھوکا نہ دینا، لوگوں کے بھید کی حفاظت کرنا اور ان کی امانتوں کو واپس کرنا وغیرہ، اس میں اہل وعیال قرابت داروں، حکام اور عوام کے سب حقوق داخل ہیں۔
امراء کا رعیت سے عدل اور علماء کا عوام سے عدل بھی اس میں داخل ہے۔ یعنی وہ ان کی صحیح رہنمائی کریں۔ ان کے عقائد و اعمال کو درست کریں۔ انہیں بدعات و شرکیات سے بچائیں۔ انہیں کسب حلال کی تلقین کریں، ان کے اخلاق و آداب میں اسلام کو داخل کریں۔ غرض وہ زبانی وعظ و نصیحت ہو یا قلمی تحریر یا اپنا عملی نمونہ ان سب میں لوگوں کے سامنے حق پیش کریں۔ ان کے ایمان کو مضبوط کریں۔ انہیں شر و رد آثام اور معاصی سے ڈرائیں اور ان سے بچنے کی تلقین کریں۔ احسان و خیر کی طرف توجہ دلائیں۔ عورت مرد کے بھید کو افشاء نہ کرے اور اسی طرح مرد بھی۔ بالخصوص اپنے ستر و حیا کے معاملات میں۔

(۳) انسان کی امانت اپنے نفس کے ساتھ۔ یعنی صرف وہی چیز اختیار کرنا جو دنیا و آخرت میں اصلح و انفع ہو۔ دنیوی و اخروی ضرر سے پرہیز کرنا، امراض اور وباؤں سے حتی الامکان پرہیز کرنا بوقتِ ضرورت طبیب سے مشورہ کرنا اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا اور بقدر ضرورت اصولِ صحت کا علم حاصل کرنا۔ اپنے آپ کو عذاب میں نہ ڈالنا، خودکشی نہ کرنا اور حسبِ ضرورت و مصلحت، لباس و غذا اور مکان کا بہم پہنچانا۔

عدل کا حکم اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس آیت میں دیا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی آیات میں اسے دہرایا ہے۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ۔ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا وَاَقْسِطُوْا۔ لوگوں میں فیصلہ و حکم کرنے کے کئی طریقے ہیں، مثلاً ولایتِ عامہ، قضاء، کسی خاص معاملے میں دو یا زیادہ اشخاص میں ثالث و حکم بننا۔ اور عدل کے ساتھ فیصلہ کئی امور کا محتاج ہے۔

(۱) مدعی کا دعویٰ اور مدعا علیہ کا جواب سمجھنا تاکہ تنازع کا موضوع اور فریقین کے دلائل معلوم ہو سکیں۔
(۲) حاکم کا جانبداری سے اور کسی ایک طرف جھکنے سے قطعی خالی ہونا۔
(۳) حاکم کا کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے واقف ہونا، تاکہ اس کے مطابق فیصلہ کر سکے،
(۴) ایسے لوگوں کو قاضی، ثالث اور حاکم بنانا جو اپنے فرائض ادا کرنے پر بخوبی قادر ہوں۔
اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو احکام و اقوال اور افعال و اخلاق سب میں عدل کا حکم دیا

Marfat.com

ہے۔ مثلاً: وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔

ان آیات میں اُولُوالامر سے مراد امراء، حکام، علماء، سپہ سالاران لشکر اور تمام رؤساء وزعماء (سردار اور لیڈر) ہیں جن کی طرف لوگ حاجات میں اور عام مصالح میں رجوع کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ کسی امر پر متفق ہوں تو ان کی اطاعت واجب ہے۔ بشرطیکہ وہ امین ہوں اور کتاب وسنت کے متواتر احکام کی مخالفت نہ کریں۔ اس معاملے میں ان کا آزادانہ بحث ومناظرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ کہ اختلاف واتفاق کی آزادی ہو۔

یہ تو حال تھا مصالحِ عامہ اور حاجات وضروریاتِ امت کا۔ جہاں تک عبادت کا تعلق ہے۔ اور اسی طرح دینی عقائد کا بھی سو اہل حل وعقد کا ان سے کوئی واسطہ ودخل نہیں، نہ ان میں کسی کی رائے کو دخل ہے، یہ صرف خدا اور رسولؐ سے ہی اخذ کئے جائیں گے۔ ہاں لوگ حسبِ مراتب ان کے فہم میں مختلف درجات پر ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے اہل حلّ وعقد جب کسی معاملے پر (مصالحِ امت میں سے) جمع ہو جائیں۔ اور اس معاملے میں خدا اور رسولؐ کی نص (وضاحت وصراحت) موجود نہیں ہے۔ اور وہ لوگ رائے دینے میں آزاد ہوں مجبور نہ ہوں، کسی کے دباؤ یا لالچ تلے نہ ہوں، تو ایسے امر میں ان کی اطاعت واجب ہے۔ اس کی مثال حضرت عمر فاروقؓ اعظم کا لوگوں کے مشورے سے دفاتر ودیوان بنانا اور بہت سے امور ایجاد کرنا ہے۔ جو پہلے نہ تھے، لوگوں نے ان کی رائے پر لبیک کہا اور فقہاء وعلماء نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

اس آیت میں حکومتِ اسلامیہ کے بارے میں اصولِ دین بتائے گئے ہیں جو چار ہیں،

(۱) قرآن کریم (۲) سنتِ نبویؐ

(۳) اولوالامر کا اجماع، یعنی اہل حل وعقد جن پر امت کو اعتماد ہے۔

(۴) متنازعہ امور کو کتاب وسنت کے معلوم وصریح احکام پر پیش کر کے راہنمائی حاصل کرنا۔

یہی چار امور مصادر شرع وقانون بھی ہیں۔ اولوالامر کا فرض ہے کہ ہر قسم کے علماء وحکماء کے ایک گروہ کو اس غرض کے لئے تیار رکھیں کہ ان کے سامنے جدید پیش آمدہ مسائل اور متنازعہ امور پیش کئے جائیں اور ان سے رہنمائی حاصل کی جا سکے۔ اسی کو آج کل پارلیمنٹ مجلس شوریٰ لیجسلیچر یا مجلسِ قانون ساز کہتے ہیں۔ دوسری جماعت ان احکام کو نافذ کرنے والی ہوتی ہے۔ جسے قوتِ نافذہ، قوتِ حاکمہ یا ایگزیکٹو کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی مجلس قانون ساز جب کتاب وسنت کی روشنی میں قانون بنائے گی۔ تو لوگوں پر ان کی قبولیت اور اطاعت واجب ہو گی کیونکہ یہ اصولِ شرع کے مطابق ہو گی۔

Marfat.com

[1] قرآن نے جو امت برپا کی تھی، جو انسان تخلیق کیا تھا۔ جو تمدن و حضارت اور تہذیب و ثقافت قائم کی تھی اور جو نظامِ حیات پیش کیا تھا۔ اس کی اساس اور بنیادیں ان آیات میں بتائی گئی ہے۔ اسلام کا نظامِ اطاعت یہاں واضح کیا گیا ہے۔ اطاعت کی حدود بیان کی گئی ہیں۔ اسلام کی نگاہ میں رسول صرف تبلیغ و اقناع کے لئے ہی نہیں آتے بلکہ قرآن نے امتِ مسلمہ سے فرمایا ہے کہ ان کی بعثت کی غرض صرف "اطاعت" ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

پھر وہ ان سے کہتا ہے کہ کوئی بھی ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک رسول کو حَکَم نہ مان لے اور اس کے فیصلے پر دل سے راضی نہ ہو جائے؛ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

اس کے ساتھ ہی اس نے کہا ہے کہ خدا کی شریعت کے سوا کسی اور سے فیصلہ چاہنا۔ (تحاکم) اَلَى الطَّاغُوْتِ ہے اور اس کے ساتھ ایمان کا دعویٰ کرنا کذب صریح ہے۔ (آیت ۶۰ جو آگے آ رہی ہے) خدا اور رسولؐ کی طرف تحاکم سے روکنا علامتِ نفاق ہے۔ (آیت ۶۱) اور ان زیرِ تفسیر آیات میں عدل و امانت کا حکم اور حدودِ اطاعت کا بیان فرمایا گیا ہے۔ اسلام میں الوہیت اور حاکمیت کا حق صرف اللہ کو پہنچتا ہے۔ رسول اس کا نمائندہ ہے اس لئے اس کی اطاعت فرض ہے۔ باقی ہر اطاعت ان کے ماتحت ہو گی۔ احبار و رہبان کی غیر مشروط اطاعت کو اسلام نے شرک قرار دیا ہے۔

امانات میں سے اوّلین امانت، امانتِ کبریٰ ہے۔ یعنی ہدایت و معرفت اور ایمان باللہ کی امانت ہے۔ انسان کے اپنے قصد و ارادہ اختیار و امتیاز کے ساتھ۔ پس ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس امانت کو ادا کرے، پھر دینِ حق کے لئے اپنے عقیدہ و عمل اور کردار و آداب سے شہادت ادا کرنے کی امانت ہے۔ اس کے بعد دوسروں کو اسلام و ایمان کی زبانی دعوت دینے کی امانت ہے۔ اس کے بعد اور بھی ہر قسم کی امانتیں اور حقوق و فرائض اس میں داخل ہیں

عدل کے سلسلے میں قرآن کا ارشاد ہے۔ کہ جب تم لوگوں کے درمیان (بَيْنَ النَّاسِ) فیصلہ کرو تو عدل سے کرو یعنی اسلام انسانوں کو بحیثیت انسان دیکھتا ہے۔ اس کی انسانیت

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۱۱۵، ۱۲۴،

Marfat.com

کا احترام کرنا سکھاتا ہے۔ اور ہر کافر و مومن اپنے پرائے، دوست دشمن سے عدل کا حکم دیتا ہے۔

عدل و امانت کا مقیاس و معیار اگلی آیت (۵۹) میں پیش کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میزانِ حق فقط خدا اور رسولؐ کی میزان ہے۔ اطاعت فی الاصول انہی کے لئے ہے۔ دوسروں کی اطاعت ان کے ماتحت ہے اور جن معاملات میں نص نہ ہو ان میں خدا و رسولؐ کے احکام و ہدایات کی طرف "رجوع" ہے۔ یعنی جدید پیش آمدہ قضایا اور معاملات کا حکم عام کلی مبادی سے حاصل کیا جائے گا۔ یہ ایک بالکل سیدھا سادا اور صاف اصول ہے۔ جس میں کوئی اینچ پینچ اور کوئی بھول بھلیاں نہیں۔ سیدھا اور واضح راستہ ہے۔ جسے ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

ہیں اُس پر جو اُترا تیری طرف اور جو اُترا تجھ سے پہلے

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ

چاہتے ہیں کہ فیصلہ لے جائیں شیطان کی طرف اور

وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ

حکم ہو چکا ہے ان کو کہ اُس کو نہ مانیں اور چاہتا ہے

الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰ وَاِذَا

شیطان کہ اُن کو بہکا کر دُور لے جا ڈالے اور جب

قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى

ان کو کہا جائے کہ آؤ اللہ کے حکم کی طرف جو اس نے اتارا اور آؤ

Marfat.com

الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ

رسولؐ کی طرف تو دیکھے تو منافقوں کو کہ ہٹتے ہیں تجھ سے

صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ

رُک کر۔ پھر کیا ہو کہ جب ان کو پہنچے مصیبت

بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ

اپنے ہاتھوں کے کئے ہوئے سے پھر آئیں تیرے پاس

يَحْلِفُوْنَ ۚ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ

قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی کہ ہم کو غرض نہ تھی مگر بھلائی اور

تَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ

ملاپ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو ان کے

قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾

دلوں میں ہے سو ان سے تغافل کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ انکے حق میں بات کام کی

لہ یَزْعُمُوْنَ اصل لغت میں زعم کا معنیٰ قول ہے چاہے حق ہو یا باطل پھر اس کا استعمال جھوٹ میں کثیر ہونے لگا۔ امام راغب کہتے ہیں۔ کہ زعم کا معنیٰ ہے ایسی بات کی حکایت کرنا جس کے جھوٹ ہونے کا گمان ہو۔ قرآن میں ہر جگہ زعم کرنے والوں کی مذمت ہی آئی ہے۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۔ قُلْ اِدْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ۔

الصَّعُوْدُ: كثير الطغيان يا خُوْ طُغيانٍ كثير۔ ضَلٰلًا بَعِيْدًا: ایسی ضلالت جس میں مبتلا ہونے والا حق سے بہت دور چلا گیا ہو۔ کیوں کہ اب اسے حق کا راستہ ہی نہیں مل سکتا صُدُوْدًا: جان بوجھ کر اعراض کرنا، یعنی یہ منافق جان بوجھ کر آپؐ کے فیصلے کو قبول کرنے سے اعراض کرتے ہیں اِحْسَانًا جھگڑنے والوں کے معاملہ میں

لہ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۴، ۵، ۷

Marfat.com

حسن سلوک اور ان پر احسان۔ تَوْفِیْقًا جھگڑنے والے فریقوں میں موافقت پیدا کرنا۔
فَاَعْرِضْ :ان کی طرف سے اپنا منہ پھیر لو۔ عِظْهُمْ ایسے طریقے سے انہیں بھلائی کی تذکیر کرو۔ کہ ان کے دل نرم ہو جائیں۔ قَوْلًا بَلِیْغًا ایسی بات جو ان کے دلوں میں اثر کرے اور گہرائی میں اتر جائے۔

پچھلی آیت میں اطاعت کا ضابطہ بیان فرما کر اب ان آیات میں منافقوں اور بیمار دل کے نام نہاد مسلمانوں کا حال بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رسولؐ کی غیر مشروط اطاعت نہیں کرتے اس کے فیصلے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ اوروں کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ طبرانی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ ابو برزہ الاسلمی ایک کاہن تھا جو یہودیوں میں فیصلے کیا کرتا تھا[۵] مسلمانوں کا ایک فریق بھی اس کے پاس جھگڑا لے کر گیا تو یہ آیتیں اتریں اور ابن جریرؒ نے شعبیؒ سے روایت کی ہے کہ ایک یہودی اور ایک منافق میں کوئی تنازع تھا، یہودی نے کہا کہ چلو کسی مسلمان سے یا رسولؐ خدا سے فیصلہ کرائیں دیکھوں کہ اسے معلوم تھا کہ حضورؐ کا فیصلہ برحق ہوتا ہے، رشوت نہیں لیتے، غیر جانبدارانہ اور عادلانہ فیصلہ کرتے ہیں، منافق نے اس سے اختلاف کیا پھر وہ دونوں جہینہ کے ایک کاہن پر متفق ہو گئے

آیت ۶۰: یہود فصل خصومات میں رعایت و رشوت کے عادی تھے، اس لئے جو لوگ جھوٹے، منافق اور خائن ہوتے، وہ اپنا معاملہ یہودیوں کے عالموں کے پاس لے جانا پسند کرتے کہ وہ ان کی خاطر جانب داری کریں گے۔ اور آپؐ کے پاس ایسے لوگ اپنا معاملہ لانا پسند نہ کرتے۔ کہ آپؐ حق کی رعایت کریں گے اور کسی کی اصلاً خاطر داری نہ کریں گے۔ سو مدینہ میں ایک یہودی اور ایک منافق (کہ ظاہر میں مسلمان تھا) کسی امر میں دونوں جھگڑ پڑے یہودی جو سچا تھا اس نے کہا کہ چل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور منافق جو جھوٹا تھا اس نے کہا کہ چل کعب بن اشرف (یہودی سردار) کے پاس، جو یہودیوں کا عالم بھی تھا۔ آخر وہ دونوں آپؐ کی خدمت میں جھگڑا لے کر آئے تو آپؐ نے مقدمہ سن کر یہودی کا حق ثابت فرمایا اور اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ منافق جو باہر نکلا تو کہنے لگا کہ اچھا حضرت عمرؓ کے پاس چلو، جو وہ فیصلہ کر دیں وہی منظور۔ اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ نہ ہوا، غالباً یہ سمجھا ہو گا کہ میں مدعی اسلام ہوں۔ اس لئے یہودی کے مقابلے میں میری رعایت کریں گے اور حضرت عمرؓ آپؐ کے حکم سے مدینہ میں جھگڑے فیصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ جب حضرت عمرؓ نے جھگڑا سنا اور یہودی کے بیان سے انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ قضیہ آپؐ کی خدمت میں جا چکا ہے اور آپؐ اس معاملہ میں یہودی کو

---

۵ فوائد القرآن ۱۱۲، ۱۱۳ تفسیر حقانی جلد ۲ صفحہ ۲۰۱، ۲۰۲ (مختصراً) تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۵۶، ۵۷، تفسیر ماجدی ۱۹۸، ۱۹۹

Marfat.com

سچا اور غالب کر چکے ہیں. تو حضرت عمرؓ نے اس منافق کو قتل کر دیا۔ اور فرمایا کہ جو کوئی ایسے قاضی کے فیصلے کو نہ مانے اس کا فیصلہ یہی ہے. اس کے وارث حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور حضرت عمرؓ پر قتل کا دعوے کیا اور قسمیں کھانے لگے کہ حضرت عمرؓ کے پاس تو صرف اس وجہ سے گئے تھے کہ شائد وہ اس معاملہ میں باہم صلح کرا دیں. یہ وجہ نہ تھی کہ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے انکار تھا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں ان
۲۱۷
میں اصل حقیقت ظاہر فرما دی گئی اور حضرت عمرؓ کا لقب فاروق فرمایا۔

آیت ۶۱ جب کسی جھگڑے میں منافقوں سے کہا جائے کہ اللہ نے جو حکم نازل فرمایا ہے اس کی طرف آؤ اور اس کے رسولؐ کے روبرو اپنے جھگڑے کو لاؤ تو ظاہر میں چونکہ مدعی اسلام ہیں۔ اس لئے صاف طور پر تو انکار نہیں کر سکتے. مگر آپؐ کے پاس آنے سے اور حکم الٰہی پر چلنے سے بچتے ہیں، اور رکتے ہیں کہ کسی ترکیب سے جان بچ جائے اور رسولؐ کو چھوڑ کر جہاں ہمارا جی چاہے اتنا جھگڑا لے جائیں۔

آیت ۶۲ یہ تو سب کچھ ہوا مگر منافق لوگ اس وقت کیا کریں گے جس وقت ان کو ان کے کرتوت کا عذاب پہنچنے لگے گا۔ یعنی فصل خصومات میں آپؐ کے پاس آنے سے جو رکتے ہیں اور بچتے ہیں. جب اس کا عذاب ان پر آنے لگے تو پھر یہ منافق اس وقت کیا کر سکتے ہیں؟ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ قسمیں کھاتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں آئیں. کہ ہم تو حضرت عمرؓ کی خدمت میں صرف اس لئے گئے تھے کہ شائد وہ باہم صلح اور ملاپ کرا دیں گے، رسولؐ کے ارشاد سے اعراض کرنا اور اس سے جان بچانا ہم کو ہرگز منظور نہ تھا۔

آیت ۶۳: اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان کی قسم اور معذرت کی تکذیب فرمائی کہ منافقین جو زبانی باتیں بنائیں جانے دو، اللہ تعالےٰ کو ان کے دل کی باتیں خوب معلوم ہیں یعنی وہ ان کے نفاق اور جھوٹ کو خوب جانتا ہے سو آپؐ بھی علم خداوندی پر بس کر کے منافقوں کی بات سے تغافل فرمائیے. اور ان کی بات کی پرواہ نہ کیجئے بلکہ ان کو نصیحت کرتے اور کام کی باتیں بتانے میں ہرگز کوتاہی نہ فرمائیں اور ان کی ہدایت سے مایوس نہ ہوں.

آیت ۶۰[1] میں طاغوت سے مراد صریحاً وہ حکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظام عدالت بھی طاغوت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو، لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۱۹۸ تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۶۷

Marfat.com

ہے کہ جو عدالت طاغوت کا حکم رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات کو فیصلہ کے لئے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں ملازم و ملزوم ہیں۔

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى۔

اور خدا اور طاغوت کے سامنے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے۔

پہلے منافقوں کی طرح آج بھی بہت سے منافقوں کا یہی حال ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر ورنہ بہر اس قانون، رواج، رسم اور بہر اس عدالت کے دامن میں جا پناہ لیں گے جس سے انہیں اپنے منشاء کے مطابق فیصلہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔

ہر وہ شخص جو دجالوں کاہنوں، عرافوں (سیانوں) فال اور رمل والوں شعبدہ بازوں اور کشف و ولایت کے دعویداروں کے پاس اپنے معاملات فیصلے کے لیئے لے جائے اُس کا بھی بعینہٖ یہی حکم ہے جو ان آیات میں منافقین مدینہ کا بیان ہوا ہے۔ اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے اوامر میں سے کوئی شخص اگر کسی امر کو رد کر دے تو وہ خارج از اسلام ہے۔ خواہ اس نے شک کی وجہ سے ایسا کیا ہو یا سرکشی و بغاوت کی خاطر اس وجہ سے صحابہؓ نے مانعین زکوٰۃ کے ارتداد کا حکم کیا تھا اور ان کے قتل اور ان کی اولاد کے قیدی بنائے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ: یہ ایک اسلوب بیان ہے۔ جو خیر یا شر میں بطور مبالغہ و تعظیم اختیار کیا جاتا ہے۔ حالت سرور و حزن میں اس کا استعمال عام ہے، مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ "میرے دل میں تمہارے لئے جو جذبات ہیں انہیں خدا ہی جانتا ہے" اس سے مراد اپنی محبت اور تعظیم کی یقین دہانی ہوتی ہے یعنی وہ اتنی کثیر اور قوی ہے کہ اسے صرف خدا ہی جانتا ہے۔ اسی طرح کسی مکار، دھوکا باز دشمن کے بارے میں کہتے ہیں۔ اس کے دل میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی جانتا ہے۔ یعنی اس کے دل میں خباثت، مکر اور دھوکا فریب اتنا زیادہ ہے جسے سوائے عالم الغیب کے کوئی نہیں جانتا۔

پس یہاں اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان منافقوں کے دلوں میں جو کفر و بغض اور مکر و کید اور مسلمانوں کے خلاف جذبات حسد و عداوت اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی مقدار کو سوائے اللہ عالم الغیب کے کوئی جاننے پر قادر نہیں ہے۔

لہ تفسیر المراغی ج ۵ ص ۷۶-۷۹، تفسیر المنار ج ۵ ص ۲۲۲، ۲۲۳

Marfat.com

آیت ۶۳ میں منافقوں کے بارے میں تین قسم کا معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

۱۔ ان سے اعراض کرنا اور تکریم و بشاشت سے ان کی طرف رُخ نہ کرنا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے دلوں میں قسم قسم کے خطرات پیدا ہوں گے اور بُرے انجام کا خوف ان کے دلوں پر چھا جائے گا۔ واقعی منافقوں کو اپنے اسبابِ کفر و نفاق کے بارے میں یقین نہ تھا، ہر وقت تردّد میں رہتے تھے ڈرا کرتے تھے کہ جانے کس وقت قرآن کی کسی سُورت میں ان کے دلی راز افشاء کر دیئے جائیں گے۔ اس اعراض کے باعث وہ وہم و گمان میں مبتلا رہتے تھے، ہر وقت اس خدشے میں رہتے تھے کہ شائد حضورؐ نے ہمارا دلی نفاق جان لیا ہے، شائد اب ہمارا مواخذہ ہونے والا ہے۔

۲۔ نصیحت و تذکیر جس سے ان کے دل نرم ہوں اور وعظ و زجران کے قلوب میں اثر انداز ہو۔

۳۔ قول بلیغ جو ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اُتر جائے، ان دلوں میں غم و الم کی گھٹائیں چھا جائیں وہ خوف محسوس کرنے لگیں کہ شائد عنقریب ہمارے قتل و استیصال کا حکم آنیوالا ہے۔ اور حضورؐ انہیں بتا دیں کہ دوسروں پر تمہارا پوشیدہ کفر و نفاق اور شر مخفی ہو تو ہو، مگر علیم و خبیر خدا سے ہرگز مخفی نہیں، صرف قتل و قتال سے تمہیں اس لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ کہ تم نے ایمان و اسلام کا اظہار کیا اور کفر و نفاق کو چھپایا ہے۔ اگر تمہارا بھید کھل جائے اور یہ رکاوٹ جاتی رہے تو تلوار کے سوا کوئی اور علاج نہیں ہے۔

اس آیت میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بلاغت و فصاحت کی شہادت موجود ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے وعظ و نصیحت اور قول بلیغ کا معاملہ آپؐ کی صوابدید پر اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ ہر مقام کے لئے الگ الگ کلام ہوتا ہے اور مخاطبوں کے فہم کے اختلاف سے کلام کی تاثیر میں فرق پڑ جاتا ہے۔ آیت میں آپؐ کے حق میں حکمت اور موقع محل دیکھ کر کلام کرنے کی شہادت بھی موجود ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے حق میں یوں بیان فرمایا ہے۔

وَ اٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔

قاضی عیاضؒ نے شفاء میں حضورؐ کی بلاغت کی تعریف میں لکھا ہے۔ رسُول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فصاحت لسان اور بلاغت قول میں بلند ترین محل پر فائز تھے۔ آپؐ کی یہ صفت کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔ آپؐ کو پُر مغز کلام دیا گیا تھا۔ اور بدائع حکمت سے نوازا گیا تھا۔ آپؐ عرب کی سب زبانوں اور مختلف لہجوں کو خوب جانتے

Marfat.com

تھے. ہر قوم سے اُس کی زبان میں خطاب فرماتے اور اس کے محاورات میں گفتگو کرتے تھے. حتیٰ کہ آپؐ کے بہت سے ساتھی کئی دفعہ آپؐ کی باتوں کی شرح و تفسیر آپؐ سے دریافت کرتے تھے (حالانکہ وہ خود عرب تھے) آپؐ کی گفتگو قریش، انصار، اہل حجاز اور اہل نجد سے اس قسم کی نہ ہوتی تھی جیسی کہ ذی المعشار ہمدانی، طہفہ نہدیؓ اشعث بنؓ قیس کندی اور وائل بنؓ حجر کندی کے ساتھ ہوتی تھی۔ اسی طرح حضرموت اور یمن کے سرداروں سے آپؐ کی بات چیت مختلف پیرائے اور لب و لہجے میں ہوا کرتی تھی۔

[1] ان آیات میں اسلامی نظام اطاعت اور تقاضائے الوہیت سے انحراف کرنے والوں کا بیان ہے. جن کا دعوےٰ تو اسلام کا تھا مگر دل میں کجی، اعمال میں انحراف اور ایمان میں ٹیڑھ کا مرض تھا۔ تحاکم الی الطاغوت کو یہاں ایمان سے خروج اور رسولؐ اللہ کے فیصلوں سے انحراف کو نفاق فرمایا گیا ہے۔ یہ اس زمانے ذکر ہے جبکہ اوائل ہجرت میں منافقین کا ڈنک تیز تھا اور انہیں یہود کی قوت کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ان آیات کا مضمون منافقوں پہ بھی صادق آتا ہے اور بعض ان یہود پر بھی جنہیں تورات کے موافق فیصلوں کے لئے بلایا جاتا تھا مگر اس پر دعویٰ ایمان کے باوجود منہ پھیر لیتے تھے۔ معاہدہ مدینہ کے باعث وہ اس بات کے پابند تھے کہ اہم قسم کے معاملات کا فیصلہ حضورؐ سے کرائیں مگر وہ اس سے انحراف کی صورتیں ڈھونڈھتے رہتے تھے: لیکن ان آیات میں مراد منافقین ہی کا گروہ ہے جیسا کہ خود قرآن نے صراحت فرمادی ہے۔

ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف میں یہ بات داخل ہے کہ آدمی اپنا فیصلہ خدا اور رسولؐ کے حکم سے کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایمان سے باہر اور اسلام سے منحرف ہے۔ خدا اور رسولؐ کے علاوہ جس کو بھی قاضی اور فیصل بنایا جائے اسے یہاں طاغوت فرمایا گیا ہے. کیونکہ اس کے فیصلے کی سند کتاب و سنّت نہیں ہے۔ جو ایمان کی پہلی شرط ہے. خدا اور رسولؐ کے خلاف فیصلہ کرنے والا باغی و طاغی ہے کیونکہ دراصل وہ خدا کے حقّ الوہیّت و ربوبیّت اور حقِ حاکمیّت کا مدعی ہے چاہے وہ ایمان و اسلام کا مدعی ہو اور چاہے کوئی اور ہو۔

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۱۲۴، ۱۲۵

Marfat.com

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم

اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ

مانیں اللہ کے فرمانے سے اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا آتے

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ

آپؐ کے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسولؐ بھی ان کے لیے بخشش مانگتا

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۶۴) فَلَا

تو البتہ اللہ "کو پاتے معاف کرنے والا مہربان۔ سو قسم ہے

وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ

آپؐ کے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپؐ

فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا

کو منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر

فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا

نہ پائیں اپنے جی میں تنگی آپؐ کے فیصلے سے اور قبول

تَسْلِيْمًا (۶۵)

کریں خوشی سے

شرح الفاظ

[1] بِاِذْنِ اللّٰهِ: اذن سے مراد یہاں اعلام ہے جو وحی الٰہی نے صاف بتا دیا اور

[1] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۷۹

Marfat.com

لوگوں کو کھول کر سُنا دیا ہے۔ جیسے اوپر گزرا ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ یعنی اپنے فعل پر نادم ہوں اور خدا کی مغفرت طلب کریں وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ یعنی اللہ سے اُن کی بخشش کی دعا کریں یُحَکِّمُوْکَ آپ کو حکم بنائیں اور معاملات آپکے سپرد کر دیں۔ شَجَرَ اختلاف ہوا اور معاملہ میں خلط ملط اور گڑبڑ ہو گئی۔ یہ لفظ شجر (درخت) کے گھنا ہونے سے ماخوذ ہے کیونکہ اُس کی شاخیں ایک دوسری میں گھس جاتی اور داخل ہو جاتی ہیں۔ حَرَجًا ضیق، تنگی، کراہت قَضَیْتَ بمعنی حَکَمْتَ یعنی آپؐ نے فیصلہ فرمایا تَسْلِیْمًا انقیاد و اذعان، جُھک جانا، مان لینا۔ خندہ پیشانی سے قبول کر لینا۔ ان آیات میں رسُولؐ کے استحقاقِ اطاعت کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ اور آپؐ کے فیصلوں سے انحراف کرنے منافقوں کی ذلّت و رسوائی اور خداوند تعالےٰ کی ان سے ناراضگی کا ذکر فرمایا ہے۔ کیونکہ وُہ لوگ آپؐ کے فیصلے پر راضی نہیں ہوئے۔ اور ان کے دلوں میں کھوٹ تھا۔

آیت[1] ۶۴ : اللہ تعالیٰ جس رسُول کو اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے سو اسی غرض کے لئے بھیجتا ہے کہ اللہ کے حکم کے موافق بندے ان کے کہنے کو مانیں۔ تو اب ضرور تھا۔ کہ یہ لوگ رُسول کے ارشاد کو پہلے ہی بدل وجان تسلیم کرتے۔ اور گناہ اور بُرا کرنے کے بعد بھی متنبّہ ہو جاتے، اللہ سے معافی چاہتے اور رُسول بھی ان کی معافی کی دُعا فرماتے تو پھر بھی حق تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرما لیتا۔ مگر انہوں نے تو یہ غضب کیا کہ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے، جو بعینہٖ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا، ٹلے اور پیچھے اور جب اس کا وبال ان پڑا تو اب بھی متنبّہ ہو کر نادم و تائب نہ ہوئے بلکہ لگے جھوٹی قسمیں کھانے اور تاویلیں گھڑنے پھر ایسوں کی مغفرت ہو تو کیوں کر ہو؟

آیت ۶۵ : منافق لوگ کس بیہودہ خیال میں ہیں اور کیسے بیہودہ حیلوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جب تک یہ لوگ آپؐ کو اے رسولؐ! اپنے تمام چھوٹے بڑے مالی و جانی نزاعات میں منصف و حاکم نہ جان لیں گے، اُس وقت تک ہرگز ان کو ایمان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اب جو کرنا ہو سوچ سمجھ کر کریں۔

رسُول[2] کو محض زبانی طور پر ماننے سے تو کچھ فائدہ نہیں ہوتا، اُس کی بعثت کی

---

[1] فوائد القرآن ص ۱۱۳، تفسیر حقانی ج ۳ ص ۲۰۲ ۲۰۳،
[2] تفسیر ماجدی ص ۱۹۹، تفسیر ابن کثیر پ ۵ ص ۵۸

Marfat.com

غرض ہی یہ ہے کہ اس کو حاکم اعلیٰ اور مقتدا تسلیم کیا جائے۔ باذن اللہ کی قید نے یہ بات صاف کر دی کہ مطاعِ حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ پیغمبر اس کے نائب کی حیثیت سے مُطاع ہوتا ہے۔

ان آیتوں نے یہ بھی صاف کر دیا کہ رسولؐ کی عدالت میں محض مقدمات لے آنا ہرگز ایمان کے لئے کافی نہیں۔ عقلی و اعتقادی حیثیت سے اس کے فیصلے پر اطمینان بھی ضروری ہے۔ ہاں اس کے بعد کوئی محض طبعی تنگی باقی رہ جائے تو غیر اختیاری ہونے کی بناء پر معاف ہو گی۔ آپؐ کی حیات مبارکہ میں تو آپؐ کا حکم بننا ظاہر ہی تھا، بعد وفات شریف آپؐ کی شریعت حکم بننے کے لئے کافی ہے۔ اس آیت سے پتہ چلا کہ جو کوئی رسولؐ کے کسی حکم میں شک و شبہ کرے یا اُسے ماننے سے انکار کر دے وہ دائرہ اسلام سے باہر ہے (الجصاص الرازی)

امام ابن کثیرؒ نے یہودی اور منافق کے جھگڑے اور حضرت عمر فاروقؓ کے منافق کی گردن اڑا دینے والا واقعہ ان آیاتِ کی شانِ نزول میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے بسند غریب نقل کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ کوئی شخص ایمانی حدود میں نہیں آسکتا جب تک تمام امور میں اللہ کے سچے رسولؐ کو سچا حاکم نہ مان لے۔ ہر ہر حکم، ہر ہر فیصلے، ہر ہر سنّت اور ہر ہر ارشاد میں اپنے جسم اور دل و جان کو یکسر آپؐ کے تابع نہ کر دے۔ (سنّت و حدیث میں مراتب و درجات کا فرق ضرور ہے جو دلائل سے ثابت ہے اسی طرح حدیث میں بحث اس بات کی ہوتی ہے کہ فلاں بات حضورؐ سے ثابت ہے یا نہیں، جب دلائل سے ثابت ہو جائے تو اب اس کے مرتبے کے مطابق اسے مانے بغیر اور گردن جھکائے بغیر چارہ نہیں۔ مؤلف) جب حضورؐ کا حکم وارشاد ثابت ہو چکا تو اب اس کے ماننے سے پس و پیش کرنا، کٹ حجتی کر کے اسے رد کرنا اسے ٹالنے کی کوشش کرنا، اس سے بچنے کے حیلے تلاش کرنا، ان کا ردّ کرنا وغیرہ صریح نفاق ہے۔

آیت[1] ۶۵ کا حکم صرف حضورؐ کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لئے ہے۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے آپؐ لائے ہیں۔ اور جس طریقہ پر (سنّت) اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے تحت آپؐ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن سند ہے۔ اور اس سند کو ماننے نہ ماننے پر ہی آدمی کے مومن ہونے نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں اسی بات کو حضورؐ نے یوں فرمایا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۶۹،

Marfat.com

لَا یُؤْمِنُ احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ: یعنی جبتک اپنی ہوا نے نفس کو بھی آپؐ کے حکم کے تحت نہ کر دیں مومن نہیں ہو سکتے۔

آیت ۶۴ میں خدا سے استغفار کرنے کو پیغمبرؐ کے استغفار کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پیغمبرؐ سے انحراف کرنے والوں کا گناہ صرف اپنے آپ پر ہی ظلم و تعدی نہ تھا بلکہ اس سے رسولؐ کو بھی اذیت پہنچی تھی کہ فقط آپؐ کے صاحب حق و امر ہونے کے باوجود انہوں نے آپؐ کے فیصلے سے اعراض کیا۔ پس خود استغفار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازم تھا کہ حضورؐ سے درگزر کراتے تب ان کی توبہ و ندامت مکمل ہو سکتی تھی۔ اور آپؐ کی رضاء کی علامت آپؐ کی ان کے حق میں دعاء تھی۔

اس آیت میں پیغمبرؐ کی اطاعت کے ترک کو ظلم فرمایا گیا ہے کیونکہ دنیا و آخرت میں لوگوں کے مصالح میں ہادیٔ برحق آپؐ ہیں۔ اور یہ ظلم اعتداء، بغاوت اور تحاکم الی الطاغوت وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس سے نفوس میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب توبہ کی شرائط پوری ہوں تو بفضلِ خدا مغفرت اور اور قبولِ توبہ حتمی ہے۔ اور استغفار اُس وقت مقبول ہے جب کہ بندہ نادم ہو کر صدق و اخلاص سے آئندہ کو باز رہنے کا عزم اور وعدہ کرے۔ صرف زبان کا استغفار بیکار ہے ؎

بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر (رومیؒ)

آیت ۶۵ میں ایمان صحیح کی تین شرائط بیان ہوئی ہیں۔

ا۔ ہر معاملے میں پیغمبرؐ کا حکم ماننا۔

ب پیغمبرؐ کے حکم سے دل تنگ نہ ہونا۔

ج۔ اس حکم کو خوش دلی سے تسلیم کرنا اور اس کے سامنے جھک جانا

اسی طرح آیت میں پیغمبرؐ کی عصمت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپؐ کا ہر حکم اور ہر فیصلہ برحق ہے۔ باطل پرستوں اور ملحدوں کے قول کے موافق پیغمبرؐ صرف

۱؎ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۸۳۰۸۰، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۲۳۲ ۲۱۰

۲؎ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۱۲۹-۱۳۰،

Marfat.com

ایک خالی خولی واعظ ہی نہیں، بلکہ وُہ ہماری واقعی اور عملی زندگی کا دستورالعمل اور ضابطۂ حیات پیش کرنے والا ہے۔ زندگی کی تمام تنظیمات و تشکیلات جب تک اس کے حکم کے مطابق نہ ہوں ہم مومن و مسلم ہرگز نہیں ہو سکتے۔ پیغمبر ایک اقتدار و تسلّط لیکر آتا ہے جس کو تسلیم کرنا اور جس کے سامنے بخوشی گردن جُھکانا ہی ایمان و اسلام ہے ان آیتوں میں یہی مضمون بیان ہوا ہے جو شخص اس کے خلاف جانے اور سمجھے وہ وہم و خرافات کا پیرو ہے، پیغمبرؐ کا پیرو ہرگز نہیں۔ صرف رسوم عبادت میں پیغمبرؐ کی بات مان لینا اور باقی زندگی کو کسی طاغوت کے حوالے کر دینا کفر تو ہے اسلام ہرگز نہیں۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کرو اپنی جانیں

اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا

یا چھوڑ نکلو اپنے گھر تو ایسا نہ کرتے مگر

قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ

تھوڑے ان میں سے اور اگر یہ لوگ کریں وہ جو ان کو نصیحت کی جاتی ہے

بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝ وَّ

تو البتہ ان کے حق میں بہتر ہو اور زیادہ ثابت قدم رکھنے والا دین میں اور

اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

اس وقت البتہ دیں ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب

وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝

اور چلائیں ان کو ہم سیدھی راہ پر

Marfat.com

شرح الفاظ

[1] کَتَبْنَا یعنی ہم فرض کر دیتے۔ مَا یُوْعَظُوْنَ بِهٖ یعنی خدا کے احکام اور اوامر و نواہی جن کے ساتھ ان کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی بیان ہوتی رہتی ہیں، عمل کرنے والوں کے لئے وعدہ اور اعراض کرنے والوں کے لئے وعید ہوتی ہے۔ یہ سب "وعظ" ہے۔ تَثْبِیْتًا تقویت، کسی چیز کو ثابت و راسخ کرنا۔

ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ لوگ اسلام میں کچے ہونے اور ایمان میں کمزور ہونے کے باعث حکم رسولؐ میں بہت قصور کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایمان کی قوت اور سچے اسلام کے تقاضے بھی بیان ہوئے ہیں، اور فرمایا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

[2] سب کی جانوں کا مالک چونکہ اللہ تعالےٰ ہے اس لئے اس کے حکم میں تو کسی کو جان سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ سو اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو کہیں اپنی جانوں کے ہلاک کر ڈالنے اور جلاوطن ہونے کا حکم فرما دیتا جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا تو بجانہ لاتے اُس حکم کو مگر صرف گنے چنے پکے اور سچے مسلمان یہ منافق اس حکم پر کیسے عمل کر سکتے تھے۔ اب ان کو سمجھنا چاہیئے کہ ان کو ہم نے جو حکم دے رکھے ہیں وہ محض ان کی نصیحت اور خیر خواہی کے ہیں۔ نہ جان کی ہلاکت کا حکم دیا گیا نہ جلاوطن ہونے کا۔ اگر انہی آسان اور سہل حکموں پر چلیں تو نفاق بالکل جاتا رہے اور خالص مومن ہو جائیں۔ مگر افسوس سمجھتے نہیں اور موجودہ حالت کو غنیمت نہیں جانتے کہ ذرا سی بات میں دنیا و آخرت دونوں درست ہو جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر المراغی ۵ ص ۸۲ [2] فوائد القرآن ص ۱۱۴،
[2] تفسیر ماجدی ص ۲۰۰

Marfat.com

ایک معنیٰ میں تو یہ دونوں حکم اب بھی موجود ہیں، یعنی جہاد و قتال اور ترکِ وطن یا ہجرت اپنے اپنے موقع پر اور شرائط کے پائے جانے پر اب بھی واجب ہیں یہاں مراد یہ ہے کہ اگر یہ احکام خود بھی مقصود بالذات ہوتے اور قتال و ہجرت ہر حال میں فرض ہوتے۔ جمع کی ضمیریں یا تو منافقوں کی طرف لوٹتی ہیں مگر بہتر یہ ہے کہ ان سے مراد تمام انسان ہی لئے جائیں۔ (تفسیر کبیر، ابن کثیر)

[1] ان آیات کو سن کر ایک صحابیؓ نے کہا تھا کہ اگر اللہ تعالےٰ ہمیں یہ حکم دیتا تو ہم اسے بھی کر گزرتے، لیکن اس کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں آزمائش سے بچا لیا۔ جب حضورؐ کو یہ بات پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ بے شک میری امت میں ایسے ایسے لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان مضبوط پہاڑوں سے بھی زیادہ قائم اور ثابت ہے (ابن ابی حاتم) دوسری احادیث میں ثابت بنؓ قیس، عبداللہ بنؓ مسعود اور عبداللہ بن رواحہ کا نام آیا ہے کہ عمل کرنے والوں میں یہ لوگ بھی ضرور ہوتے۔ یہ دراصل ان حضرات کے پختہ ایمان کی شہادت تھی۔

[2] یعنی جب ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کرنے میں ذرا سا نقصان یا تھوڑی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے تو ان سے کسی بڑی قربانی کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ اگر جان دینے یا گھر بار چھوڑنے کا مطالبہ ان سے کیا جائے تو یہ فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور ایمان و اطاعت کی بجائے کفر و نافرمانی کی راہ لیں گے۔

لیکن اگر یہ لوگ شک و تذبذب اور تردد کو چھوڑ کر یکسوئی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی پر قائم ہو جاتے اور ڈانواں ڈول نہ رہتے، تو ان کی زندگی تزلزل سے محفوظ ہو جاتی۔ ان کے خیالات، اخلاق اور معاملات سب کے سب ایک مستقل اور پائدار بنیاد پر قائم ہو جاتے اور یہ ان برکات سے بہرہ ور ہوتے جو ایک شاہ راہ مستقیم پر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے سے ہی حاصل ہوا کرتی ہے۔ جو شخص تذبذب اور تردد کی حالت میں متبلا ہو، کبھی اس راستے پر چلے

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۵ ص ۵۹
[2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۶۹-۳۷۰

Marfat.com

کبھی اس راستے پر، اور اسے اطمینان کسی راستہ کے صحیح ہونے پر بھی حاصل نہ ہو تو اس کی ساری زندگی نقش برآب کی طرح بسر ہوتی ہے اور رسعٰی لاحاصل بن کر رہ جاتی ہے۔

اگر یہ لوگ شک کو چھوڑ کر ایمان و یقین کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت کا فیصلہ کر لیتے تو اللہ کے فضل سے اُن کے سامنے سعی و عمل کا راستہ بالکل روشن ہو جاتا اور انہیں صاف نظر آجاتا کہ وہ اپنی قوتیں اور محنتیں کس راہ میں صرف کریں جس سے ان کا ہر قدم اپنی حقیقی منزلِ مقصود کی طرف اُٹھے۔

؎ صادق الایمان وہ شخص ہے جو خداوند تعالیٰ کے ہر حکم کو مانے چاہے آسان ہو چاہے مشکل، چاہے طبعًا پسندیدہ ہو چاہے ناپسند۔ اور چاہے وہ حکم خروج عن الدیار کا ہی ہو، یعنی جسم کے دار سے روح کو خارج کرنے کا حکم یا دیارِ وطن سے جسم کو نکالنے کا حکم۔ رہا منافق، سو وہ خدا کی عبادت اپنی شہوات و خواہشات نفس کے مطابق کرتا ہے۔ اگر حکم پسند ہو تو مطمئن ہے ورنہ منہ پھیر جاتا ہے اور خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق بن جاتا ہے۔

اعمالِ خیر سے ایمان کو ثابت قدمی اور مضبوطی میسّر آتی ہے کیوں کہ عامل کے نفس میں اخلاق و فضائل یا رذائل کا پیدا کرنا اعمال ہی کا کام ہے نیک اعمال وہم و خرافات کو نکال باہر کرتے ہیں۔ مثلاً مال کا انفاق ایمان کی علامات میں سے ہے اور اس سے خدا کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ مومنِ صادق ہی یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔ جو شخص دعویٰ ایمان کے ساتھ ساتھ مال خرچ کرنے سے جھجکتا ہے اس کے ایمان میں نقص اور ضعف پایا جاتا ہے۔ ایمان کے ساتھ بخل و امساک جمع نہیں ہو سکتے، افقر و املاق کا خوف ایمان کی جان کنی کے مترادف ہے۔ ایک نیکی دوسری کو دعوت دیتی ہے حتیٰ کہ نیک عملی آدمی کا شعار بن جاتی ہے۔

؎ دین کے احکام عام انسانوں کے لئے ہیں فطرۃً جن اعمال پر عمل پیرا ہونا عوام کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے اور صرف چند صاحب عزم و ہمت ہی ان پر عمل کر سکتے ہیں وہ احکام بالعموم نہیں دیئے گئے۔ دین کا ضابطہ صرف ان چند صاحب

؎ تفسیر المراغی ج ۵ ص ۸۳-۸۴، تفسیر المنار ج ۵ ص ؎ فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۱۳۱-۱۳۴

Marfat.com

عزیمت لوگوں کے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے ہے۔ دین میں سب لوگوں کی فطری صلاحیتوں اور کوتاہیوں کا لحاظ رکھا گیا ہے خودکشی کرنا اور گھر بار چھوڑ جانا ایسی پر مشقت تکالیف ہیں کہ اگر فرض کر دی جائیں تو عوام ان کو ادا نہ کر سکتے۔ پس انسانی اصلاح کیلئے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن پر سب بآسانی عمل کر سکیں۔ کیونکہ دین انسان کی واقعی اور عملی زندگی کے لئے آیا ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انسان ہر وقت رخصتوں کی تلاش میں رہے اور عزیمتوں پر عمل کرنے سے کنی کاٹتا رہے۔ نہیں بلکہ جب مصلحت کا تقاضا یہی ایسا ہو کہ رخصت پر عمل کرنا قرین انصاف و دیانت ہو اس وقت بے شک اس پر عمل کر لیا جائے، ورنہ عزیمت ہی بہتر ہے اور وہ عین فطرت انسانی کے موافق ہے صرف رخصتوں ہی کو جمع کرتے رہنا اور لوگوں کے لئے نام نہاد آسانیاں پیدا کرنا درست نہیں اس سے عمل کی روح پژمردہ ہو جاتی ہے اور آخر کار دین ایک مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ

اور جو حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول ؐ کا سو وہ

الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ

ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی اور

الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ

صدیق اور شہید اور نیک بخت ہیں اور اچھی

اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ

ہے ان کی رفاقت یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے

وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ ع ۱۱ ۹ ۶

اور اللہ کافی ہے جاننے والا

Marfat.com

شرح الفاظ

[1] الصِّدِّیق وہ شخص ہے جس پر صدق غالب ہو، اور جو اپنے عقیدہ وقول وعمل میں صادق وراست باز ہو، اِنَّہٗ کان صِدِّیْقًا نَّبِیًّا۔ الشہید، جو حجّت وبرہان سے اور بوقت ضرورت شمشیر وسنان سے دین کی صحت کی شہادت دیتا ہے۔ والصّالح جس کا نفس درست ہو جائے، عمل نیکوکار ہو جائے اور نیکیاں برائیوں پر غالب ہوں۔

ان آیات میں ان لوگوں کا ذکر فرما کر جو اطاعتِ الٰہی میں مثال ہیں لوگوں کو اطاعت پر ابھارا گیا ہے۔ اس کے فضائل وعواقب بیان کئے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ یہ چار مراتب بندگانِ خدا کے بلند ترین مراتب ہیں، ہمتوں کو ان کی طرف اٹھنا چاہیئے اور گردنیں ان کی طرف بلند ہونی چاہئیں۔

[2] نبی وہ ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی آئی یعنی فرشتہ ظاہر ہیں آکر پیغام کہہ جاتا رہا۔ اور صدّیق وہ کہ جو پیغام اور احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کو آئے اُن کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور بلا دلیل اس کی تصدیق کرے۔ اور شہید وہ ہیں کہ پیغمبروں کے حکم پر جان دینے کو حاضر ہیں۔ اور صالح و نیک بخت وہ ہیں کہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی ہے اور بُری باتوں سے اپنے نفس اور بدن کی اصلاح اور صفائی کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چار قسمیں مذکورہ جو اُمّت کے باقی افراد سے افضل ہیں ان کے ماسوا جو مسلمان ہیں اور درجہ میں ان کے برابر نہیں لیکن اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری میں مشغول ہیں، وہ لوگ بھی انہی کے شمار اور ذیل میں لئے جائیں گے۔ اور ان حضرات کی رفاقت بہت ہی خوبی اور فضیلت کی بات ہے۔ اس کو کوئی حقیر نہ سمجھے اس آیت میں اشارہ ہو گیا ہے کہ

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۸۴

[2] فوائد القرآن ص ۱۱۴، تفسیر ماجدی ص ۲۰۰،

Marfat.com

منافقین جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے وہ اس رفاقت اور معیت سے محروم ہیں راس آیت میں ان چار قسم کے حضرات کی معیت و رفاقت کا ذکر ہے، جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں ان کی راہ پر چلنے کی دعاء کا ذکر ہے کوئی باطل پرست اور کج فہم یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت سے کوئی نبی بن سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اُمّت کا اوّلین طبقہ بالاتفاق اطاعت خدا اور رسولؐ میں سب سے آگے تھا۔ نیز ان میں سے کئی حضرات میں صفاتِ نبوّت کی موجودگی کا احادیث میں بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً: لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیًّا لَکَانَ عُمَرُ۔ اور اَنْتَ مِنِّیْ مَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اِنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (بحقّ علیؓ بن ابی طالب بوقت روانگی لشکر تبوک) اور حدیث میں غزوۂ بدر کے قیدیوں کے متعلق مشورہ کے سلسلے میں حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو ابراہیمؑ و عیسیٰؑ سے اور حضرت عمر فاروقؓ کو نوحؑ اور موسیٰؑ سے صراحتہً تشبیہ دی (منہاج السنۃ) دوسری آیات قرآنیہ میں نبوت کے اختتام اور باقی تین مراتب کے جاری و باقی رہنے کا بھی وضاحتاً ذکر موجود ہے مثلاً: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ

(سورۂ عنکبوت)

اور اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ

اور ختم نبوّت کی آیات تیرہ سو کے قریب ہیں۔ اور یہ مسئلہ ہمیشہ سے اُمّت میں متفق علیہ چلا آیا ہے۔ سوائے چند احمقوں یا دجل و فریب کے ماتوں کے کوئی اس کے خلاف کا قائل نہیں ہوا۔ مؤلف۔

یہ رفاقت معنوی طور پر تو اس دنیا میں مگر حسّی اور مادّی طور پر کاملاً آخرت میں حاصل ہوگی۔ انسان چاہے کتنا عیش و آرام میں ہو جب تک ہم مذاق اور ہم مشرب یاران بزم نہ ہوں راحت و آسائش میں کمی محسوس کرتا ہے۔ پس اس آیت میں جنّت کی بہترین مادی و روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ پاکیزہ ترین ساتھیوں کی صحبت و رفاقت کی بشارت دی گئی ہے۔

لہ حضورؐ نے آخری وقت میں جو الرفیق الاعلیٰ کی طلب کی تھی اس سے بھی یہی مراد

لہ تفسیر ابن کثیر پ ۵ صـ ۶۱۰۶،

Marfat.com

ہے کہ وہ اس وقت عالم آخرت کے بہترین ساتھیوں کی رفاقت کا شوق ظاہر فرما رہے تھے اور مادی طور پر اس دنیا سے وہاں تشریف لے جانا چاہتے تھے۔ حضرت ام المومنین عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے آخری وقت میں فرمایا تھا کہ اے اللہ میں ان کی رفاقت چاہتا ہوں جن پر تیرا انعام ہوا یعنی نبی، صدیق، شہید اور نیکوکار۔ ابن جریرؒ نے اس آیت کے شانِ نزول میں جو حدیث نقل کی ہے وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ یہ رفاقت جنت کے بارے میں ہے (حافظ ابن کثیر نے اس موقع پر اور بھی کئی روایات نقل کی ہیں جن سے یہی مضمون واضح ہوتا ہے۔ مؤلف)

حضورؐ نے عبادات کے علاوہ معاملات کی صفائی کو بھی اس رفاقت کا سبب قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ سچا امانت دار تاجر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا (ترمذی) حدیث میں یہ بھی ہے۔ کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی اُس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرے، اس بات پر ایمان دار اتنے خوش ہوئے جتنے کسی اور بات پر کبھی خوش نہ ہوئے تھے۔ یہ حدیث صحاح و مسانید میں درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔

[1] وہ انسان خوش قسمت ہے جسے ایسے پاک لوگ دنیا میں رفاقت کے لئے میسّر آجائیں اور جس کا انجام آخرت میں بھی ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہو۔ کسی آدمی کے احساسات مُردہ ہو جائیں تو بات دوسری ہے ورنہ درحقیقت بدسیرت اور بد کردار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دنیا ہی میں ایک عذاب الیم ہے کجا کہ آخرت میں بھی آدمی انہی کے ساتھ اس انجام سے دوچار ہو جو ان کے لئے مقدّر ہے۔ اس لئے اللہ کے نیک بندوں کی ہمیشہ یہی تمنا رہی ہے کہ ان کو نیک لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو اور مر کر بھی وہ نیک ہی لوگوں کے ساتھ رہیں۔

[2] طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ام المومنین عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ آپؐ مجھے میری جان سے بھی بڑھ کر پیارے ہیں اور میں آپؐ کو اہل و عیال و اولاد سے بھی زیادہ چاہتا ہوں۔ میں گھر میں ہوتا ہوں اور آپؐ کو یاد کرتا ہوں تو اس وقت تک صبر نہیں آتا جب تک آکر آپ کو دیکھ نہ لوں۔ اور جب مجھے اپنی اور آپؐ کی موت یاد آتی

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۷۱ [2] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۵۵، تفسیر المنار ج ۵ ص ۲۴۳-۲۴۸

Marfat.com

تو مجھے یقین ہے کہ آپؐ تو جنّت میں دوسرے انبیاء کے ساتھ بلند رتبے پر فائز ہوں گے اور میں جنّت میں داخل ہوں گا تو آپؐ کو شائد دیکھ سکوں گا اس بات کا مجھے بہت خدشہ ہے۔ حضورؐ اس شخص کے سوال پر خاموش رہے حتیٰ کہ جبرئیلؑ یہ آیت مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ الخ لیکر اُترے ابن ابی حاتم نے مسروقؒ تابعی سے روایت کی ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب صحابہؓ کا آپؐ سے یہ سوال تھا کہ یارسولؐ اللہ ہمیں تو دنیا میں بھی آنجناب کی جدائی اور مفارقت گوارا نہیں مگر جب آپؐ ہم سے جُدا ہو جائیں گے تو آپؐ کا درجہ تو بہت بلند ہو گا ہم تو آپؐ کو شائد دیکھ بھی نہ سکیں گے! اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

کلبی کہتے ہیں کہ ثوبانؓ جو حضورؐ کا آزاد کردہ غلام تھا آپؐ سے شدید محبت رکھتا تھا اور اسے آپؐ کے بغیر صبر نہ آتا تھا۔ آخرت میں حضورؐ کو نہ دیکھ سکنے کے خوف سے اس کا جسم نڈھال ہو گیا تھا اور رنگ متغیّر ہو گیا تھا۔ اس نے جب حضورؐ سے اس کا ذکر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

شانِ نزول کی ان روایات کی تائید طبرانی کی اس روایت کردہ مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا حَشَرَهُ اللّٰهُ مَعَهُمْ (جو کسی قوم سے پیار کرے گا اللہ اُسے ان کے ساتھ اکٹھا کر دے گا) اور متفق علیہ حدیث ہے کہ اَلْمَرْءُ مَنْ اَحَبَّ (آدمی اپنے پیاروں کے ساتھ ہو گا) اور محبّت کی نشانی اطاعت ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ الآیۃ۔

[1] ہر وہ دل جس میں نیکی اور صلاحیت کا کوئی ذرّہ موجود ہے وہ تو اس آیت کو پڑھ کر ایک بے پناہ احساسِ مسرّت سے لبریز ہو جائے گا۔ اس بزرگ گروہ کا ساتھ نصیب ہو جانا واقعی بڑی سعادت ہے۔ انسان محض اپنے عقیدہ و عمل اور اطاعت سے یہ سعادت نہیں پا سکتا تھا، حقیقت میں یہ فضلِ خداوندی ہے جو لوگوں کو اس مرتبہ تک پہنچا دے گا۔

صحابۂ رسولؐ کا شوقِ رفاقت دیکھئے کہ وہ ایک لمحہ بھر حضورؐ کی جدائی پر صبر نہیں کر سکتے تھے پھر اگر آخرت میں انہیں یہ رفاقت نہ ملتی تو ان کا کیا حال ہوتا؟

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۱۳۴، ۱۳۵

Marfat.com

ابن جریرؒ نے اپنی سند سے سعیدؒ بن جبیر سے روایت کی ہے کہ انصار میں سے ایک شخص بحالتِ غمگینی حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کے غم و حزن کا سبب پوچھا تو وہ بولا یا رسولؐ اللہ میرا غم ایک چیز کے متعلق ہے جس میں میں نے غور و فکر کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ صبح و شام آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپؐ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ کل بعد وفات آپؐ کا مقام تو پیغمبروں کے ساتھ بہت بلند ہوگا۔ ہم آپؐ کو کیسے دیکھ سکیں گے؟ حضورؐ نے اسے کوئی جواب نہ دیا حتیٰ کہ جبرئیلؑ یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔

صحیح مسلم میں ربیعہؓ بن کعب الاسلمی سے روایت ہے کہ میں بعض دفعہ حضورؐ کے ہاں رات گزارتا تھا۔ ایک دفعہ رات کو میں نے آپؐ نے فرمایا کچھ مانگ لو میں نے کہا یا رسولؐ اللہ میں جنت میں آپؐ کی رفاقت کا طالب ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کچھ اور بھی مانگتے ہو؟ میں نے کہا کہ بس یہی آرزو ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ پھر کثرت سے نماز پڑھ کر میری مدد کرو (کہ) میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا اہل جان لوں اور شفاعت کر سکوں!)

غرض ان بزرگوں کی ارواح و قلوب کا مشغلہ بس یہی تھا کہ آخرت میں حضورؐ کی رفاقت مل جائے کیوں نہ ہو وہ دنیا میں اُس رفاقت کا مزا چکھ چکے تھے۔ ہر وہ دل جس کے اندر حضورؐ کی محبت ہے اس کی آرزو یہی ہوتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ

اے ایمان والو! لے لو اپنے ہتھیار

فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَ

پھر نکلو جدا جدا فوج ہو کر یا سب اکٹھے اور

اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ

بیشک بعض تم میں ایسے ہیں جو دیر لگا دیں گے پھر اگر تم کو کوئی

مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ

مصیبت پہنچے تو کہے کہ اللہ نے مجھ پر فضل کیا کہ میں

Marfat.com

اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝	وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ
نہ ہوا ان کے ساتھ	اور اگر تم کو پہنچا
فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ	
فضل اللہ کی طرف سے تو اس طرح کہنے لگے گا	
تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ	
کہ گویا نہ تھی تم میں اور اس میں کچھ دوستی اے کاش میں ہوتا	
مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾	
ان کے پاس تو پاتا بڑی مراد	

شرح الفاظ

[1] حِذْرَكُمْ: حِذر اور حَذر بروزن مثل اور مَثل، حفاظت کا سامان نگرانی و چوکیداری دشمن کے شر کا مقابلہ کرنے کی تیاری و استعداد۔ فَانْفِرُوْا: نفر کا معنیٰ ہے جنگ کی طرف نکلنا، بعض، دفعہ اس لفظ کا معنیٰ نفرت بھی آتا ہے جیسا کہ قرآن میں نفور کا لفظ بمعنیٰ نفرت آیا ہے۔ ثُبَاتٌ کی جمع ہے، الگ جماعت منفرد ٹولی لَيُبَطِّئَنَّ: تبطئہ: کا معنیٰ ہے دیر لگانا یا کسی اور کو تاخیر پر آمادہ کرنا۔ مادہ اس کا بطء کا لفظ ہے جس معنیٰ ہے تیز چلنے سے پیچھے رہ جانا، سُست رفتاری مُصِيْبَةٌ جیسے قتل شکست وغیرہ۔ شَهِيْدًا حاضر اور موجود۔ فَضْلٌ جیسے فتح اور غنیمت۔ اوپر کی آیات میں کئی تمدنی، سیاسی، عباداتی، اور معاشرتی احکام بیان ہو چکے ہیں۔ اب ان آیات میں بعض جنگی و سیاسی احکام بیان فرمائے جاتے ہیں اللہ تعالےٰ

[1] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۸۶،۸۷

Marfat.com

نے ان آیات میں ہمیں بتا دیا ہے کہ اپنی ملّت اور وطن کا دفاع اور اپنے اصول کا بچاؤ اعدائے دین سے کیونکر کریں۔ دینی احکام کا یہ بھی ایک ضروری اور اہم حصّہ ہے۔

[۲] آیت ۷۱، یہاں سے جہاد کا ذکر ہے اوپر کی آیت میں انعام یافتہ گروہ کی رفاقت کا بیان تھا اور احکام خداوندی میں حکم جہاد چونکہ شاق اور دشوار ہے خصوصاً منافقین پر جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے، لہٰذا یہاں جہاد کا حکم فرمایا۔ کہ ہر کوئی حضرات انبیاء و صدیقین وغیرہم کی رفاقت و معیّت کی امید نہ کرنے لگے۔ منقول ہے کہ شروع شروع میں بہت سے ضعیف الاسلام لوگ بھی دعوتِ اسلام قبول کر چکے تھے، پھر جب جہاد فرض کیا گیا تو بعض متزلزل ہو گئے اور بعض کفّار کے ہم زبان ہو کر آپؐ کی مخالفت کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! منافقوں کی کیفیّت تو تم کو پہلے سے معلوم ہو چکی ہے، اب خیر اسی میں ہے کہ تم اپنا ہر طرح سے بچاؤ اور اپنی خبرداری اور احتیاط کر لو۔ ہتھیاروں سے ہو یا تدبیر سے، عقل سے ہو یا سامان سے۔ اور دشمنوں کے مقابلہ و مقاتلہ کے لئے گھر سے نکلو، متفرق ہو کر یا سب اکٹھے، جیسا موقع ہو کرو۔

آیت ۷۲: اے مسلمانو! تمہاری جماعت میں بعض ایسے لوگ بھی گھسے ہوئے ہیں جو کہ جہاد کو جانے میں دیر لگاتے ہیں اور رکتے ہیں۔ اور حکم خداوندی کی تعمیل نہیں کرتے بلکہ دنیوی منافع کو تکتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں سے مراد منافق ہیں جیسے عبداللہ بن اُبیّ اور اُس کے ساتھی۔ کہ یہ لوگ بظاہر تو گو اسلام قبول کر چکے تھے مگر ان کی سب باتوں سے مقصود صرف دنیا کا نفع تھا۔ حق تعالیٰ کی فرماں برداری سے کوئی تعلّق ان کو نہ تھا۔

پھر جہاد کے میدان میں جا کر اگر مسلمانوں کو کوئی صدمہ پہنچ جائے مثلاً مقتول ہو گئے یا شکست پیش آگئی تو منافق بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا

---

[۲] فوائد القرآن ص ۱۱۴، تفسیر ابن کثیر ج ۵ ص ۶۲
(اردو ترجمہ) تفسیر حقانی ج ۲ ص ۲۰۴،

Marfat.com

بڑا فضل ہوا کہ ہم لڑائی میں ان کے ساتھ نہ تھے ورنہ ہماری بھی خیر نہ تھی، بحمد اللہ ہم خوب بچے۔

آیت ۷۳۔ اور اگر مسلمانوں پر خدا کا فضل ہو گیا مثلاً فتح ہو گئی، مال غنیمت بہت سا ہاتھ آگیا تو منافق سخت پچھتاتے ہیں اور دشمنوں کی طرح غلبۂ حسد سے کہتے ہیں کہ ہائے افسوس! میں جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تو مجھ کو بڑی کامیابی نصیب ہوتی۔ یعنی لوٹ کا مال ہاتھ آتا۔ یعنی منافقوں کو فقط اپنی محرومی پر افسوس نہیں ہوتا بلکہ اپنی محرومی سے زیادہ مسلمانوں کی کامیابی پر حسد اور قلق ہوتا ہے۔

لہ قرآن مجید کی اکثر آیات کی طرح ان آیات کو سمجھنے کے لئے بھی ان کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ احد میں ابھی حال ہی میں مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی تھی اور مشرکین کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں اس سے قدرۃً بڑھ گئی تھیں۔ اور اکیلے قریشِ مکہ ہی نہیں گرد و پیش کے دوسرے قبیلے بھی متحد ہو کر اسلام کے خلاف زبردست محاذ تیار کر چکے تھے مسلمانوں کو ہمت اور ثبات و استقامت کے یہ درس عین اُس وقت دیئے جا رہے ہیں۔ حِذر کے لفظ میں ہر قسم کی تیاری، ہتھیار، تدابیر وغیرہ داخل ہیں (راغب بیضادی، بحر) ان آیات سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اُمت اسلامیہ کی خوشی سے خوش ہونا علامتِ ایمان ہے اور اس کے خلاف کرنا علامتِ نفاق۔

لہ خُذُوْا حِذْرَكُمْ دشمن کے شر کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت ہر لحاظ سے تیار رہو۔ اس کے حالات کا پتہ چلاؤ اس کی تیاری اور طاقت کو معلوم کرو۔ اور جب تمہارے دشمن زیادہ ہوں تو ان کے باہمی تعلقات یعنی اتفاق و اختلاف پر بھی نظر رکھو۔ جب وہ تم پر حملہ آور ہوں تو اُن کے اور اپنے وسائل کو خوب جانچ پرکھ لو اور ہر ممکن طریقہ پر عمل کرو۔ دشمن کے احوال، عادات و خصائل، تعداد اس کی سرزمین کی تاریخ و جغرافیہ اس کے ہتھیار اور ان کا استعمال وغیرہ اور علم ہندسہ و حساب کیمیا اور ہر قسم کی جنگی تدابیر کو جاننا اس میں داخل ہے۔ جنگ کے

لہ تفسیر ماجدی ص۲۰۱، تفہیم القرآن ج۱ ص۳۷۱،
لہ تفسیر المراغی ج ۵ ص۸۸، ۸۹ تفسیر المنار ج ۵ ص۲۴۹ - ۲۵۷۔

Marfat.com

تمام ذرائع و وسائل مثلاً طیارے، بمب، ٹینک، بمبار، ڈبکنی کشتیاں، توپیں، ٹینک شکن آلات سب کی تیاری ضروری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کی سرزمین اور ان کے احوال سے واقف رہتے تھے، آپؐ جاسوس بھیجا کرتے تھے جو ہر ضروری خبر لاتے تھے۔ جب انہوں نے آپؐ کو خبر دی کہ قریش نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی ہے تو آپؐ نے فوراً فتح مکہ کی تیاری کر لی، اور ابو سفیان باوجود کوشش کے تجدید معاہدہ نہ کرا سکا اُس کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان کے نقضِ عہد کی خبر نہیں ہو سکی۔ ابو بکر صدیقؓ نے جنگ یمامہ کے لئے خالدؓ بن الولید کو بھیجا تو ہدایت کی کہ جس طرح وہ لوگ تم سے لڑیں تم بھی ان سے لڑو، تلوار کا جواب تلوار سے اور نیزے کا نیزے سے دو! یہ تیاری جس کا حکم مل رہا ہے یہ بھی تقدیرِ الٰہی کا ہی حصّہ ہے۔ ہماری تیاری اس لئے نہیں ہے۔ کہ ہم تقدیر کو ہٹائیں بلکہ اس لئے کہ دشمنوں کو ہٹائیں۔ تقدیر کا معنیٰ وہ نظام الٰہی ہے جس میں اسباب و مسبّبات کا لازمی تعلق ہوتا ہے تیاری بھی منجملہ اسباب ہے لہٰذا وہ تقدیر کے خلاف نہیں بلکہ اس میں داخل ہے۔

اس آیت نے اُمت کے ہر فرد پر جہاد کی تیاری، فنونِ حرب کا سیکھنا اور اسلحہ کی مہارت لازم قرار دے دی ہے۔ ہتھیاروں کا جمع رکھنا اور ان کے استعمال کا طریقہ سیکھنا فرائض جہاد میں سے ہے اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ از خود یہ فرائض سرانجام دے دوسروں پر انحصار نہ رکھے۔ اور اُمّت کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے اور اگر وُہ اس میں تقصیر کرے تو اس کے فرائض کا یاد دلانا امّت کے ذمّہ واجب ہے۔ ان احکام کی خلاف ورزی نے مسلمانوں کو سُست، کمزور اور غلام بنا ڈالا ہے۔ دین کے احکام اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں۔ سورہ انفال اور توبہ کی آیات میں یہ احکام مفصّل دیئے گئے ہیں۔

ان آیتوں میں قتال و جہاد سے سُستی کرنے والوں اور دوسروں کو بُزدل بنانے والوں کو سخت دھمکی دی گئی ہے اور انہیں منافق قرار دیا گیا ہے۔ ایمان کی علامت جہاد ہے اور نفاق کی علامت بزدلی، حُبّ دنیا، کراہتِ قتال اور دنیوی طمع ہے۔

لہ یہ آیات اور اگلی اِسی مضمون کی آیات کے متعلق ہم اس خیال کو ترجیح دیتے ہیں۔

لہ فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۱۳۷،

Marfat.com

کہ ان کا نزول غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق کے درمیانی عرصہ میں ہُوا تھا۔ ان آیات کے اندر سے مسلم جماعت کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہی بتاتی ہے۔ اس وقت کئی گروہ ایسے بھی مسلم جماعت کے اندر موجود تھے جو ابھی ایمان میں پختہ نہ ہوئے تھے۔ بعض منافق تھے۔ یہ آیات بتا رہی ہیں مسلم جماعت کی تربیت و تزکیہ اور اُسے جہاد و قتالِ حق کے لئے سخت جدّ و جہد کی ضرورت تھی۔ ان میں شوق پیدا کرنے، ترغیب دینے اور ایمانی رگ کو ابھارنے کی ضرورت تھی۔ تاکہ یہ جماعت اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہو سکے جو اس کے کندھوں پر ڈالا گیا تھا۔ ان کے عقائد کو کندن بنانے اور میدانِ جنگ میں ان کے کردار کو چمکانے کی سخت ضرورت تھی۔ ان آیات نے یہی کام کیا۔

قرآنی تربیت نے کئی میدانوں میں بیک وقت اس پہلی مسلم جماعت کی تربیت کی تھی۔ پہلا معرکہ تو نفس کے میدان میں لڑا گیا تھا کہ انسانی نفوس سے جاہلیّت کے وہم و خرافات اور شکوک و شبہات کو نکالا گیا اور ان کے بجائے انہیں علم و عمل، عقیدہ و کردار اور شجاعت و حرارت سے بھر دیا گیا۔

زیر تفسیر آیات میں مسلمانوں کو معرکے کی جنگی تدابیر کی تربیت (اسٹریٹجی) دی گئی ہے، میدان جنگ کے داؤ پیچ (ٹیکٹک) سکھائے گئے ہیں، اسلحہ کی اہمیّت اور ان کی دیکھ بھال کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن صرف رسوم عبادت اور شعائر ہی نہیں بتاتا بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس کی تعلیم اخلاق و آداب تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ جنگی و سیاسی احکام بھی دیتا ہے اس کے احکام دائمی اور عالمگیر ہیں۔ ہر زمانے میں ان کی ضرورت ہے۔ وہ زندگی کو مختلف دوائر میں بانٹ کر ان کے لئے الگ الگ احکام نہیں دیتا بلکہ اسے ایک وحدت قرار دے کر اس کی وحدت و مرکزیّت کو قائم و برقرار رکھتا ہے۔ اس وحدت کے جس حصّے کے لئے جس وقت کوئی حکم ضروری ہوتا ہے وہ اسے پیش کر دیتا ہے۔

ضعیف الایمان لوگوں اور منافقوں کی جو تصویر یہاں کھینچی گئی ہے وہ آپ کو ہر زمانے میں نظر آسکتی ہے اسے آپ آج بھی اپنے گرد و پیش میں دیکھ سکتے ہیں۔ بزدل لوگ دوسروں کو بزدل بنانے والے خواہ مخواہ اعتراضات کرنے والے تردّد و تذبذب کے مارے ہوئے، معرکہ سے پیچھے رہنے والے اور ہر موقع پر ذاتی و دنیوی منافع کی طلب کرنے والے یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن نے یہاں بے نقاب کیا ہے۔

Marfat.com

مومن آزمائش کی آرزو نہیں کرتا مگر جب وہ سر پر آپڑے تو ڈٹ جاتا ہے۔ وقت آپڑے تو اس کا نعرہ ہوتا ہے۔ تخت یا تختہ۔ کامیابی یا شہادت یہ دونوں ہی کامیابیاں ہیں۔ پس وہ کسی صورت میں بھی ناکام و نامراد نہیں ہوتا۔ ہر صورت میں راضی برضاء رہتا ہے، اور اس کے پیشِ نظر اپنی نہیں بلکہ اسلام کی سرفرازی ہوتی ہے۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ

سو چاہیئے کہ لڑیں اللہ کی راہ میں وہ لوگ جو بیچتے ہیں

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ

دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے اور جو کوئی لڑے

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ

اللہ کی راہ میں پھر مارا جائے یا غالب ہو تو ہم

نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا

دیں گے اس کو بڑا ثواب اور تم کو کیا ہوا کہ نہیں

تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ

لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ

مرد اور عورتیں اور بچے جو کہتے ہیں

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ

اے ہمارے رب نکال ہم کو اس بستی سے

الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ

کہ ظالم ہیں یہاں کے لوگ اور کر دے ہمارے لیے اپنے پاس سے

Marfat.com

اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝۷۵ الَّذِيْنَ

کوئی حامی اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے مددگار جو لوگ

اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ

ایمان والے ہیں وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو لوگ

كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ

کافر ہیں وہ لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ

سو لڑو تم شیطان کے حامیوں سے بے شک فریب

الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝۷۶ ع ۱۴

شیطان کا سست ہے

شرح الفاظ

[1] سَبِيْلِ اللّٰهِ حق کی تائید اور اُس کی مدد کرنا، دین کا کلمہ بلند کرنا اور اس کی دعوت کو پھیلانا، جب دشمن ہماری ملّت پہ پل پڑیں تو اُن سے امّت کا دفاع کرنا، جب وُہ ہماری کسی سرزمین پر حملہ آور ہوں یا ہمارے مال واسباب لوٹ لیں یا ہمارے شہری حقوق پامال کر دیں تو ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا۔ یہ سب صورتیں سبیل اللہ میں داخل ہیں يَشْرُوْنَ: یہاں شراء بمعنی بیع ہے جیسا کہ ان آیات میں آیا ہے:
وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (یوسف) وَبِئْسَمَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ (بقرہ) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرہ)؛ اس کا مادہ

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۹۰

Marfat.com

طغیان ہے جس کا معنیٰ ہے حق و عدل اور خیر سے تجاوز کر کے باطل و ظلم اور شر کی راہ اختیار کرنا کَیْدَ حیلہ کے طریقے سے فساد کی کوشش کرنا۔

ان آیات میں قتال کے وجوب کا وقت، اس کے فضائل اور اجر و ثواب بیان فرمایا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے وجوب کی حکمت کی طرف بھی (آیت ۷۶) اشارہ کیا گیا ہے۔

[1] آیت ۷۴: یعنی اگر منافق لوگ جہاد سے رُکیں تو رُکیں اور اپنے نشیب و فراز دنیوی کے تکتے رہیں تو تکتے رہیں، مگر جو لوگ کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو لات مار چکے ہیں ان کو چاہیئے کہ اللہ کی راہ میں بے تأمل لڑیں اور دنیا کی زندگی اور اُس کے مال و دولت پر نظر نہ رکھیں۔ اور سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری میں ہر طرح کا نفع ہے، غالب ہوں یا مغلوب، مال ملے یا نہ ملے۔

آیت ۷۵: یعنی دو وجہ سے تم کو کافروں سے لڑنا ضروری ہے ایک تو اللہ کے دین کو غالب اور بلند کرنے کی غرض سے دوسرے جو لوگ مظلوم مسلمان کافروں کے ہاتھ میں بے بس پڑے ہیں اُن کو چھڑانے اور خلاصی دلانے کی وجہ سے مکہ میں بہت لوگ تھے جو حضرتؐ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے اور ان کے اقرباء اُن کو ستانے لگے کہ پھر کافر ہو جائیں۔ سو خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ تم کو دو وجہ سے کافروں سے لڑنا ضرور ہے تاکہ اللہ کا دین سربلند ہو اور مسلمان جو مظلوم اور کمزور ہیں وہ کفار مکہ کے ظلم سے نجات پائیں۔

آیت ۷۶: جب یہ بات ظاہر ہے کہ مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر لوگ شیطان کی راہ میں سو پھر مسلمانوں کو شیطان کے دوستوں یعنی کافروں سے بلا تأمل لڑنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کا مددگار ہے کسی قسم تردّد نہ چاہیئے۔ اور سمجھ لو کہ شیطان کا حیلہ اور فریب کمزور ہے۔ مسلمانوں پر نہ چل سکے گا۔ اس سے مقصود مسلمانوں کو جہاد پر ترغیب دلانا اور ہمت بندھانا ہے جس کا ذکر آئندہ آیات میں بالتصریح آتا ہے۔

---

[1] فوائد القرآن ص۱۱۵، تفسیر حقانی ج ۲ ص۲۰۵-۲۰۶ تفسیر ابن کثیر ج ۵ ص۶۳

Marfat.com

[1] وَمَا لَكُمْ ... فِي سَبِيلِ اللّٰهِ : اعلائے کلمۃ اللہ تو خود ایک مستقل داعی اور محرک جہاد ہے لہٰذا استفہام سے غرض ترغیب و تحریص ہے اور خطاب مومنین صادقین سے ہے (روح المعانی) جہاد کا دوسرا داعی یہ ارشاد ہوا کہ کمزوروں کی دستگیری و نصرت اور مظلوموں کی اعانت، انہیں ظالم کافروں کے پنجے سے رہائی دلانا بھی مقاصد جہاد میں سے ہے (قرطبی) مکہ کے لوگوں کو ظالم فرمایا، کیونکہ وہ دہرے ظالم تھے ایک تو مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھا رہے تھے۔ دوسری طرف شرک کر کے خود اپنی جان پر ظلم کر رہے تھے (بحر) تفسیر کبیر، روح المعانی) آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بچوں، عورتوں اور مردوں کی ایک خاصی تعداد اسلام لا چکی تھی۔ مگر یہ لوگ سردارانِ قریش کے تشدد کے مقابلہ میں اپنے کو بے بس پا رہے تھے۔ نہ دفعِ ظلم پر ہی قادر تھے نہ ہجرت پر۔ ظلم و شقاوت سے بچے، بوڑھے اور عورتیں کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ یہ مناجات انہی کی زبان سے فریاد کے طور پر ادا ہوئی ہے۔

فی سبیل اللہ: جیسا کہ حق تعالیٰ خود ہر قسم کی نفسانی آمیزش و آلائش سے منزہ اور پاک ہے، اللہ والوں کا لشکر بھی کبھی ظلم و عدوان، ظلم و خیانت، مے نوشی و بدکاری کے آلاتِ حرب سے مسلح ہو کر جنگ نہیں کر سکتا۔ اس آیت نے جہاد فی سبیل اللہ کا فرق دنیا جہاں کی باقی تمام جنگوں سے اور جاہلی محاربات سے صاف صاف بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ سچے مسلمان کے پیش نظر تو سیع مملکت قومی تفوق، تجارتی منڈیاں قائم کرنا، دوسروں کو نیچا دکھانا نہیں ہوتا۔ بلکہ دنیا کے بلند ترین مقصد اور انسانیت کے اعلیٰ ترین نصب العین کلمۂ توحید کی برتری اور سربلندی کے لئے ہوتا ہے۔ رنگ و نسل، مرز بوم، قوم و وطن اور قبیلہ کی عزت و محبت پر کٹ مرنے والے اسلامی جہاد کی بلندی اور عظمت کو کیا جان سکتے ہیں: اسلامی جہاد میں ہزاروں من اور سینکڑوں ٹن شراب کی ضرورت نہیں پڑتی اسلامی لشکر میں آتشک و سوزاک کے ہزارہا مریض سپاہیوں اور افسروں کے لئے کسی ہسپتال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بدکاری اور سفلی جذبات نہیں ہوتے تو امراضِ خبیثہ کہاں سے آئیں گے؟ مسلم سپاہی خدا کے خوف سے سرشار ہوتا ہے لہٰذا اس کا قدم ان گندے راستوں پر نہیں پڑتا۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۰۱، تفہیم القرآن ج ۱، ص ۳۷۲، ۳۷۳، (مفہوم)

Marfat.com

یہاں طاغوت کے لفظ نے جاہلی و طاغوتی سپاہیوں کے تمرّد و سرکش، خدا فراموشی، نفس پرستی اور حدود شکنی کو واضح کر دیا ہے۔ اگر اس موقع پر اس کا ترجمہ نفس پرستی ہو تو شاید اُردو میں پورا مفہوم ادا ہو سکے۔ طاغوت اور نفس کی راہ میں لڑانے والی قوتوں کی نفس پرستی سنگ دلی، شقاوت، فریب و خیانت، شراب خوری، حرام خوری و حرام کاری کا جائزہ لیا جائے تو درندوں اور حیوانوں سے بھی ان کی حالت بدتر نکلے گی "شیطان کا فریب کمزور ہوتا ہے"۔ نہ صرف میدانِ جنگ میں بلکہ اخلاق و معاشرت، معاملات و عبادات کے ہر میدان میں اگر ذرا ہمّت اور صبر سے کام لیا جائے تو شیطان اور شیطانی طاقتوں سے مقابلہ کر لینا دشوار نہیں۔ شیطان کوئی ڈرنے اور سہم جانے کی چیز نہیں نہ وہ تم پر حاکم و آمر ہے ذرا ہمّت کر جاؤ تو وُہ خود تم سے پناہ مانگتا ہوا بھاگے گا۔

لہ ان آیات میں شرفِ جہاد کی طرف اشارہ ہے۔ جہاد صرف حق و عدل اور خیر کی خاطر ہوتا ہے نہ کہ ہوائے نفس اور طمع کی خاطر۔ پھر یہ بھی ارشاد ہے کہ مومن کو جہاد میں صرف دو باتوں پر یقین ہونا چاہیئے اوّل یہ کہ وہ اپنے نفس کو فتح و کامرانی پر جمائے۔ دوسرا یہ کہ اگر ایسا نہ ہو سکے تو شہادت پر صبر کرے۔ تیسری بات یعنی فرار اور بھاگ جانا، سو یہ مومن کی شان سے بعید ہے۔

خدا کی سنّت یہ ہے کہ حق غالب آتا ہے اور باطل سرنگوں ہوتا ہے حق اصلح و انفع ہے اس لئے بقاء کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ خدا کی راہ میں لڑنے والے اس چیز کی طلب میں جد و جہد کرتے ہیں جو تقاضائے فطرت اور خدا کی سنت کے مطابق ہے لہٰذا وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ شیطان کی راہ میں لڑنے والے زمین میں ناحق سرکشی اور بلندی کی خاطر لڑتے ہیں، لوگوں کو اپنی شہوات و خواہشات کا اسیر بنانا چاہتے ہیں۔ خدا کی سنّت کے تقاضا کے یہ چیز خلاف ہے لہٰذا وہ ناکام ہوتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ حق والے اپنے حق سے غفلت کی نیند سو جائیں اور شیطان والوں کو کھیل کھیلنے کے لئے میدان کھُلا مِل جائے۔ پھر بھی اہل حق جب کبھی غفلت سے بیدار ہوں گے تبھی حق غالب ہوگا اور باطل ناکام و نامراد۔ اہل حق کی ہمّت اس طرف متوجّہ ہونی چاہیئے کہ پوری تیاری کریں اور صبر و ثبات کے ہتھیاروں سے مسلّح ہو جائیں۔ اس میں وُہ

لہ تفسیر المراغی ج ۵ ص ۹۱-۹۳، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ،

Marfat.com

قوت ہے جو عَدَد اور اسلحہ میں نہیں۔

اسی راز سے نا آشنا ہو کر مسلمانوں نے دنیا میں ناکامی اور خسارہ پایا ہے۔ اور باطل پرست قوتیں اُوپر چڑھ گئی ہیں۔ خدا کا وعدہ آج بھی برحق ہے اگر کوئی اسلامی تحریک برپا ہو جائے تو اسے سچّا پا سکتی ہے۔

[1] مسلمان کی جنگ زمین پر غلبہ، اہل زمین پر تفوّق، خام مال کی منڈیاں حاصل کرنے، تجارت کے بازار تلاش کرنے، نوآبادیاں بنانے اور استحصال کی خاطر نہیں ہوتی۔ وہ کسی خاندان طبقہ، حکومت و سلطنت قوم و جنس اور وطن کی خاطر بھی نہیں لڑتا۔ اس کی جنگ محض خدا کے دین کی خاطر ہے تاکہ اس کا نام سربلند ہو، اس کا نظام انسانی زندگی کا نظام بنے اور عدل مطلق قائم ہو۔ جب وُہ اس غرض کے لئے لڑتا ہے اور مارا جاتا ہے تو شہید کہلاتا ہے۔ شہادت کا اطلاق کسی اور غرض پر لڑنے والے کے لئے کرنا قطعاً غلط اور خلاف قرآن ہے۔ جو کسی اور کو شہید کہتے ہیں وہ خدا اور رسولؐ پر بہتان باندھتے ہیں۔

دارالکفر اور دارالحرب میں گھرے ہوئے مظلوم مسلمانوں کی خاطر جہاد کرنا فرض ہے۔ یہ فی سبیل اللہ کا ہی ایک حصّہ ہے۔ دوسری آیات میں فتنہ کا لفظ جو بولا گیا ہے کہ اسے مٹانا عین تقاضائے اسلام ہے وُہ یہی فتنہ ہے جس میں مظلوم و مقید مسلمان مکّہ میں مبتلا کئے گئے تھے۔ انہیں اسلام سے ہٹانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس صورتِ حال کو ختم کرنا فرض ہے۔ اس لئے ان آیات میں انسانی شرف و مروّت اور شجاعت و حمیت کو ابھارنے کے لئے ان مظلوموں کی رقت انگیز تصویر کھینچی گئی ہے۔ ان کی مظلومیّت مسلمانوں کی حمیّت و شجاعت کی منتظر ہے اس آیت میں اسلام کے اعلیٰ ترین مرکز کعبہ کے حامل شہر مکّہ کو بھی ظالموں کی بستی فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اس وقت اس کی حالت یہی تھی۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں محض زمین و وطن کوئی چیز نہیں خدا کا دین اگر مکّہ میں بھی قائم نہ ہو تو وہ بھی "دارالحرب" ہے، ظالموں کی بستی ہے، اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ اُسے جلد از جلد دارالاسلام بنائیں۔ مظلوموں کی مدد کریں اور انہیں ظالموں کے پنجے سے رہائی دلائیں۔

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۱۴۶/۱۵۰

Marfat.com

مسلمانوں کو مزید شجاع اور بہادر بنانے کے لئے فرمایا گیا ہے کہ تمہاری پشت پر خدا کی مدد ہے، تمہارا جہاد خدا کی خاطر ہے، تم ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہو، تمہارا ہاتھ ایک مضبوط کڑے میں ہے۔ اس کے برخلاف اولیائے شیطان کی پشت پر شیطان ہے۔ ان کی جدوجہد اُسی کی راہ میں ہے اور اُس کا مکر و فریب اور داؤ اہل حق کے مقابلہ میں ضعیف ہے۔ مسلمان کے لئے غلبہ اور شیطان کے حمایتوں کے لئے شکست ہی شکست ہے۔ اس احساس و شعور نے انسانی تاریخ میں سیاسی اور جنگی معجزے دکھائے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ

کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جنہیں حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ تھامے رہو

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو پھر جب

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

حکم ہوا ان پر لڑائی کا اسی وقت ایک جماعت ان میں

يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ

ڈرنے لگی لوگوں سے جیسا ڈر ہو اللہ کا یا اس سے بھی

خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ

زیادہ ڈر اور کہنے لگے اے ہمارے رب تو نے ہم پر لڑائی کیوں فرض کی؟

لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ

کیوں نہ چھوڑے رکھا ہم کو تھوڑی مدت تک کہہ دے کہ فائدہ

الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ

دنیا دنیا کا تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے پرہیزگار کو

Marfat.com

وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۸﴾ اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ

اور تمہارا حق نہ رہے گا ایک تاگے برابر جہاں کہیں تم ہوگے موت تم کو

الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ

آپکڑے گی اگرچہ تم ہو مضبوط قلعوں میں اور اگر

تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ

پہنچے ان لوگوں کو کچھ بھلائی تو کہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ

اور اگر پہنچے ان کو کچھ برائی تو کہیں یہ تیری طرف سے

عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَا

ہے کہہ دے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے سو کیا

لِهٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ

حال ہے ان لوگوں کا ہرگز نہیں لگتے کہ سمجھیں کوئی

حَدِيْثًا ﴿۷۹﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ

بات جو پہنچے تجھ کو کچھ بھلائی

فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ

سو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے تجھ کو کچھ برائی

فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ

سو وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے اور ہم نے بھیجا تم کو لوگوں کی طرف

Marfat.com

رَسُوْلًا ۝ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا [1]

پیغام پہنچانے والا اور اللہ کافی ہے سامنے دیکھنے والا

شرح الفاظ

كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ : یعنی قتال سے اپنے ہاتھ روک رکھو۔ كُتِبَ فرض کیا گیا يَخْشَوْنَ النَّاسَ : وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں مشرک انہیں قتل نہ کر دیں۔ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ : یعنی جیسے وہ خدا کا عذاب آجانے سے ڈرتے ہیں۔ یا جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہیئے۔ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ تو نے ہمیں کیوں نہ چھوڑ دیا کہ کچھ مدّت بعد ہم اپنی طبعی موت مرجاتے یا تو نے ہمیں کچھ مدّت کے لئے اور مہلت کیوں نہ دے دی۔ مَتَاعُ الدُّنْيَا : یعنی دنیوی لذّات جن سے وہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ قَلِيْلٌ : جلد زائل ہو جانیوالا ہے۔ اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ موت تمہیں ہر جگہ آئے گی کوئی حفاظت یا آڑ اس سے نہ بچائے گی بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ بلند محل جو گچ اور چونہ اور سیمنٹ سے پلستر کئے گئے ہوں۔ یا بڑے بڑے مضبوط قلعے جن میں دشمن سے بچاؤ کا سامان کیا جاتا ہے حَسَنَةٌ : اچھی چیز، پسندیدہ چیز جیسے رضامندی، سرسبزی و شادابی اور فتح و غنیمت سَيِّئَةٌ : جو چیز بُری لگے جیسے شدّت، بیماری، جنگ و ضرر، شکست اور زخمی اور قتل ہو جانا لَا يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا : وہ بات نہیں سمجھتے جس سے انہیں نصیحت کی جاتی ہے اور جو انجام کے اعتبار سے ان کے لئے بہتر ہے۔

ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ اسلام نے زمانۂ جاہلیت کے لڑائی جھگڑوں اور مسلسل جنگوں سے روک دیا ہے، مثلاً اوس و خزرج میں جو لمبی لڑائیاں اور

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ ص ۹۳-۹۴،

Marfat.com

اختلافات چلے آتے تھے۔ وہ صرف اسلام کی وجہ سے ہی ختم ہو سکے، اس سے قبل کوئی تدبیر، کوئی صلح یا معاہدہ انہیں ختم نہ کر سکا تھا۔ اور اسلام نے انہیں حکم دیا تھا کہ باہمی جنگ اور ظلم و عدوان سے بچیں اور تہذیب نفوس، عطف و رحمت اور تزکیہ کے لئے نماز و زکوٰۃ کی پابندی کریں۔ اس تدبیر سے جاہلیّت کی حمیّت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ شریف انسانی جذبات پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد شدید ضرورت پیش آئی کہ اسلامی مرکزیت سے، بچاؤ کے لئے اور مشرکین کے ظلم و عدوان کے خلاف ہتھیار اُٹھائے جائیں جو مسلمانوں پر ظلم و ستم توڑ رہے تھے۔ پس جب جہاد و قتال فرض ہو گیا تو ضعیف الایمان مسلمان اور منافق اسے ناپسند سمجھنے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت ڈانٹ پلائی اور ان کی حالت کو افسوس ناک قرار دیا

لہ آیت ۷۷، مکہ میں ہجرت سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے۔ مسلمان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رخصت مانگتے کہ ہم کفّار سے مقابلہ کریں اور اُن سے ظلم کا بدلہ لیں۔ آپؐ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے کہ ابھی مجھ کو قتال و مقابلہ کا حکم نہیں ملا۔ بلکہ آپؐ انہیں صبر و درگزر کا حکم فرماتے کہ نماز و زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اُس کو برابر پورا کئے جاؤ۔ کیونکہ جب تک آدمی اپنے نفس پر اطاعت خداوندی میں جہاد کرنیکا اور جسمانی تکالیف کے برداشت کرنے کا خُوگر نہ ہو، اور اپنا مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اُس کو جہاد کرنا اور اپنی جان کا دینا بہت دشوار ہے اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تقریر کے مطابق زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی ہاں اُس کی تفاصیل اور مقادیر مدینہ میں مقرر کی گئیں۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھو ہماری کتاب الزکوٰۃ جس میں حضرت سیّد انور شاہؒ کی تحقیق کو مفصّل بیان کیا گیا ہے۔ (مؤلف)

ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو کافروں سے لڑنے کا حکم ہوا تو ان کو تو خوش ہونا چاہیئے تھا۔ کہ ہماری درخواست قبول ہوئی اور مُراد ملی مگر بعض کچے مسلمان کافروں کے مقابلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے یا اُس سے بھی زیادہ۔ اور وہ آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی مدّت اور ابھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶، تفسیر حقانی ج ۳، صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸، تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۴۶۹، ۴۶۹ (خلاصہ)

Marfat.com

ہوتا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تفسیر کے مطابق یہ آیت بعض کمزور درجے کے مہاجرین کے متعلق ہے۔ مگر بہت سے دیگر مفسرین کے نزدیک اس کا اشارہ بعض انصار کی طرف ہے جیسا کہ اوپر المراغی کے حوالہ سے گزرا، تفصیل آگے آرہی ہے۔ میری ناقص رائے میں یہی قوی ہے کہ آیت کو بعض انصار کے حق میں مانا جائے کیوں کہ جو مہاجر اسلام کی خاطر سب کچھ چھوڑ چکے تھے انہیں تو جہاد و قتال کا حکم اتنا سخت معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال ذرا آگے چلئے۔ (مؤلف)

آیت ۷۸: کیسے ہی مضبوط اور محفوظ و مامون مکان میں ہو مگر موت تم کو کسی طرح نہ چھوڑے گی۔ کیونکہ موت ہر ایک کیواسطے مقرر و مقدر ہو چکی ہے وہ اپنے وقت پر ضرور آئے گی۔ سو اگر جہاد و قتال میں نہ جاؤ گے تو بھی موت سے ہرگز نہیں بچ سکتے، تو اب جہاد سے گھبرانا اور موت سے ڈرنا اور کافروں کے مقابلہ سے خوف کرنا بالکل نادانی اور اسلام میں کچا ہونے کی علامت ہے۔

ان منافقین کا اور عجیب حال ہے کہ اگر تدبیر لڑائی کی درست آئی اور فتح ہوئی اور غنیمت کا مال ہاتھ آگیا تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے یعنی ایک اتفاقی بات ہو گئی ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے اور اگر تدبیر بگڑ جاتی اور ہزیمت و نقصان پیش آجاتا تو وہ آپؐ کی تدبیر پر الزام رکھتے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم انہیں جواب دے دیجئے کہ بھلائی اور برائی دراصل تو سب اللہ کی طرف سے ہے۔ سب باتوں کا موجد اور خالق تو وہی ہے۔ اس میں کسی دوسرے کو دخل نہیں۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ کہ وہ خدا کا الہام ہوتا ہے۔ تمہارا نبیؐ پر الزام رکھنا سراسر غلط اور بالکل نادانی ہے۔ کم فہمی کو چھوڑو اور بگڑی کو بگڑا نہ سمجھو، یہ اللہ کی حکمت ہے۔ وہ تم کو سدھارتا ہے اور آزماتا ہے۔ یہ تو اجمالی جواب ہوا، تفصیلی جواب اگلی آیت میں آرہا ہے۔

آیت ۷۹، اصل بات یہ ہے کہ بھلائی اور برائی کا خالق و موجد ہر چند اللہ ہے مگر بندہ کو چاہئے کہ بھلائی اور نیکی کو اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان سمجھے اور سختی اور برائی کو اپنے اعمال کی کوتاہی اور شامت جانے۔ اس کا الزام رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ رکھے۔ پیغمبر تو ان امور کے لئے نہ موجد ہے نہ خالق اور سبب۔ بلکہ موجد خالق تو اللہ تعالیٰ ہے اور سبب تمہارے اپنے اعمال ہیں۔

پیغمبرؐ کا کام فریضۂ رسالت کو ادا کرنا ہے، سو وہ آپؐ کئے جائیں ان کے الزامات

Marfat.com

کی پروانہ کریں۔ ہر ایک کو اُس کے اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا اور انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔ (برائی کی نسبت جو بعض دفعہ انسان کی طرف ہوتی ہے سو بحیثیت کاسب وسبب ہونے کے ہے، اصل خالق ومُوجد ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی لئے بعض دفعہ ہر کام کی نسبت اُسی کی طرف ہوتی ہے۔ پس یہ محاورات واستعمالات سمجھنے اور غور کے لائق ہیں۔ گہرا غور نہ کرنے اور محض سرسری نظر ڈالنے سے اکثر شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ مولف)

[1] آیت ۷۷ کا اشارہ تو بعض کمزور مہاجروں کی طرف تھا جو امن وعافیت کے متلاشی تھے۔ مگر آیت ۷۸ میں اشارہ منافقین کی طرف ہے۔ پہلی آیت میں قَالُوا کا لفظ حدیث النفس اور وسوسہ کے لئے آیا ہے۔ مگر اس آیت میں قول سے مراد زبانی قول ہے۔ عِنْدُ اللّٰہِ کا لفظ ہر قسم کے بھلے بُرے تکوینی افعال کے لئے ہے اور آیت ۷۹ میں مِنَ اللّٰہِ کا لفظ فضل وکرم اور احسان ورضاء کے لئے ہے یہ دونوں الگ الگ محاورے کے الفاظ ہیں (بحر) سَیِّئَۃ کا اطلاق اِس جگہ ان چیزوں پر ہوا ہے جو واقعۃً برائی بھی ہوں محض صُورۃً برائی نہ ہوں۔ صالحین وابرار کو حوادث ومصائب پیش آتے ہیں وہ صرف صورۃً ہی ایسے ہوتے ہیں حقیقت میں وہ ان کی بلندی مراتب کے لئے اور ذریعۂ رحمت ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے حق میں بداعمالی کا ثمرہ ہونیکا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (یعنی ان کے لئے محض آزمائش ہوتے ہیں۔ مولف) لِلنَّاسِ رَسُوْلًا: اس لفظ سے عموم بعثت اور ختم رسالت بھی ثابت ہوئی (بحر، روح المعانی، ابوالسعود) اور دشمنانِ اسلام اور بعض نام نہاد مدّعیانِ اسلام کا سارا واویلا محض غلط ثابت ہوگیا۔ مؤلف)

[2] آیت ۷۷ کے تین مفہوم ہیں اور تینوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔

۱۔ یہ کہ یہ بعض کمزور مہاجرین کے متعلق ہے جو فرضیّت جہاد سے قبل خود تقاضا کرتے تھے مگر اس کے بعد ان میں سے کچھ لوگ دشمنوں کا ہجوم دیکھ دیکھ کر سہم جاتے۔

۲۔ یہ کہ یہ منافقین کے متعلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب تک ان سے نماز اور زکوٰۃ جیسے بے خطر کاموں کا مطالبہ رہا تو وہ کھل کر سامنے نہ آئے مگر جہاد

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۰۳ [2] تفہیم القرآن ج ص ۳۷۴،

Marfat.com

وقتال کے حکم پر ان کا اصل معاملہ ظاہر ہو گیا اور وہ لرزنے لگے۔

۳۔ یہ بعض انصار کے متعلق ہے۔ جنہیں زمانۂ جاہلیت کی لڑائیوں سے روکا گیا تھا اور نماز و زکوٰۃ کے ذریعہ سے تزکیۂ نفس کا حکم ملا تھا۔ مگر حکم جہاد و قتال پر انہوں نے کمزوری دکھائی تھی۔

[1] علامہ احمدؒ مصطفیٰ المراغی کی مانند سیّد رشید رضا مصریؒ اور ان کے استاد محترم مفتی محمدؒ عبدہٗ مصریؒ کے نزدیک بھی آیت ۷۷ میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان سے مراد بعض ضعیف الایمان انصار ہیں نہ کہ مہاجرین لیکن اگلی آیت میں جو قول بیان ہوا ہے وہ تو صریحًا مدینہ کے یہود و منافقین کا ہے کہ حضورؐ کی آمدِ مدینہ کے بعد ایک مرتبہ قحط سالی کے آثار نمودار ہوئے تو ان خبیث النفس لوگوں نے اس کی نحوست کا الزام حضورؐ پر رکھ دیا۔

[2] سیّد قطب شہیدؒ نے اپنے دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ آیت ۷۷ بعض ضعیف الایمان مہاجروں کے بارے میں ہے۔ باقی آیات کو وہ بھی خالص منافقین کے حق میں قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر تفسیر ماجدی سے نقل کیا ہے اور جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تفسیر سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے۔ لیکن آخر بحث میں سیّد قطب شہیدؒ نے واللہ اعلم کہہ کر اپنا یہ خیال قوی ثابت کیا ہے کہ مہاجرین ان کمزوریوں سے بری تھے لہٰذا یہ آیت ان کے بارے میں نہیں ہے گو اس کا احتمال ہو سکتا ہے۔

پیغمبر کا کام تبلیغ رسالت ہے نیکی بدی خدا کے ہاتھ میں ہے اور پیغمبر کے ہاتھ میں یہ نہیں دیا گیا۔ کہ وہ لوگوں کی نیکی اور بدی کا مالک ہو۔ وہ ہدایت و تبلیغ کے لئے آتا ہے نہ کہ کائنات میں تصرف کرنے، اجتماعی قواعدِ کائنات کو بدلنے اور ان میں ہیر پھیر کرنے۔ پس ان جاہلوں کا آپؐ کی طرف نحوست کو منسوب کرنا قطعًا غلط ہے، عقل و نقل کے خلاف ہے اور خود وظائف رسالت کے برخلاف ہے۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۵ ص

[2] فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۱۵۲-۱۵۳۔

Marfat.com

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى

جس نے حکم مانا رسول کا سو اس نے حکم مانا اللہ کا اور جو الٹا پھرا

فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝٨٠ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۖ

تو ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا ان پر نگہبان اور کہتے ہیں کہ قبول ہے

فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ

پھر جب باہر گئے تیرے پاس سے تو مشورہ کرتے ہیں بعض ان میں سے

غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ

اس کے خلاف جو کہتا ہے اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورے کرتے ہیں

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝٨١

پس تو تغافل کر ان سے اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی ہے کارساز

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ

کیا وہ غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر یہ ہوتا کسی اور کا

غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝٨٢

سوائے اللہ کے تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت

شرح الفاظ

تَوَلّٰی : منہ پھیرا، اعراض کیا۔ حَفِیْظًا : نگران، ذمہ دار، چوکیدار۔ بَرَزُوْا باہر نکلے، چلے گئے۔ بَیَّتَ : چھپ کر خفیہ مشورہ کیا، رات کو سازش کی۔ وَکِیْلًا : کارساز متولی امور جس پر توکل کیا جائے۔ یَتَدَبَّرُوْنَ : غور و فکر کرتے، گہرائی میں اترتے۔

Marfat.com

ان آیات کا مضمون بھی پچھلی آیات سے مربوط ہے اور ان میں پیغمبرؐ کی اطاعت پر زور دے کر ضعفاء اور منافقین کی کجی اور انحراف بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۸۰۔ آپؐ کی رسالت کو محقق فرما کر اب اللہ تعالیٰ آپؐ کے متعلق یہ حکم سناتا ہے کہ جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری کرے گا۔ وہ بیشک ہمارا تابعدار ہے اور جو اس سے روگردانی کریگا تو ہم نے آپؐ کو اے پیغمبرؐ! ان لوگوں پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کو گناہ نہ کرنے دیں ہم ان کو دیکھ لیں گے، آپ کا کام صرف پیغام پہنچا تا ہے آگے ثواب یا عقاب یہ ہمارا کام ہے۔

آیت ۸۱۔ ان منافقوں کی ایک اور مکاری سنو۔ آپؐ کے روبرو آکر تو کہہ جاتے ہیں کہ ہم نے آپؐ کا حکم قبول کیا۔ اور باہر جاکر مشورہ کرتے ہیں اُس کے خلاف یعنی آپؐ کی مخالفت اور نافرمانی کا مشورہ کرتے ہیں۔ اور اللہ کے ہاں ان کے سب مشورے لکھے جاتے ہیں۔ وہ ان کو سزا دیگا۔ سو اے نبیؐ! آپؐ ان سے منہ پھیر لیں اور کسی بات کی پروانہ کریں، آپؐ سب کام اللہ کے حوالہ کر دیں وُہ آپؐ کے لئے کافی ہے

آیت ۸۲ پچھلی آیات میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہونا اور آپؐ کی اطاعت کا بعینہٖ خدا کا اطاعت ہونا تو ثابت ہو گیا۔ مگر منافق کہتے تھے کہ ہمیں خدا کی گواہی اور اُس کے ارشادات کی تسلیم و تصدیق میں تو ہرگز تأمل نہیں مگر یہ کیوں کر معلوم ہو کہ یہ خدا کا کلام ہے بشر کا بنایا ہوا نہیں؟ تو حق تعالیٰ نے اُس کا جواب دیا کہ یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے جس سے صاف معلوم ہو جائے کہ قرآن اللہ کا ہی کلام ہے۔ دیکھو اگر یہ خدا کا کلام نہ ہوتا جیسا کہ تم گمان کرتے ہو تو ضرور اس میں بہت سے مواقع میں طرح طرح کے اختلافات ملتے۔ دیکھو آدمی ہر حالت میں اُسی حالت کے موافق کلام کرتا ہے جو پیش آتی ہے، دوسری کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ غصہ میں مہربانی والوں کا دھیان نہیں رہتا اور مہربانی میں غصہ والوں کا۔ دنیا کے بیان میں آخرت کا لحاظ نہیں رہتا اور آخرت کے بیان میں دنیا کا، بے پروائی میں عنایت کا ذکر نہیں کرتا اور مہربانی میں بے پروائی کا۔ بالجملہ ایک حال کا کلام دوسرے حال کے کلام سے مختلف نظر آئے گا۔ لیکن قرآن مجید چونکہ خالق کا کلام ہے یہاں ہر چیز کے بیان میں دوسری جانب بھی ضرور مدِ نظر رہتی ہے۔ غور و فہم سے معلوم ہوتا ہے کہ

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۱۶ تا ۱۱۷ تفسیر حقانی ۳ صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰، تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۳۷۶

Marfat.com

قرآن میں ہر چیز کا بیان ہر مقام میں ایک ہی انداز پر ہے۔ یہاں منافقوں کا مذکورہ تھا جو سخت عقاب کے مستحق ہیں، سو یہاں بھی ان کی باتوں پر اُس قدر الزام ہے جتنا چاہئے اور جو الزام ان کی ایک خاص جماعت پر تھا وہ خاص اُسی پر لگایا گیا۔ اور فرما دیا گیا کہ اُن میں سے بعض ایسا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ غصہ وغیرہ کی حالت میں کلام اپنی حد سے نکل جائے اور دوسری حالت کے کلام سے مختلف ہو جائے۔ اور نیز یہ مطلب بھی ہے کہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جب کوئی طویل بات چیت کرتا ہے تو وہ یکساں نہیں ہوتی۔ بلکہ کوئی جملہ فصیح کوئی غیر فصیح کوئی صحیح، کوئی غلط، کوئی سچا کوئی کاذب، کوئی موافق کوئی باہم متناقض ضرور معلوم ہوتا ہے۔ اور قرآن اتنی بڑی کتاب ان جملہ اختلافات سے پاک ہے جو طاقت بشر سے باہر ہے۔ آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جو شخص تدبر اور فہم سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلا سکتا ہے، مگر کوئی فہیم ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھو جو اسی مقام پر تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے۔ کہ اول تو فرمایا ہے کہ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور پھر فرما دیا ہے کہ مَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ تو تناقض و اختلاف ہو گیا (حالانکہ دونوں جگہ حیثیت کا فرق ہے، خالق ہونے کے لحاظ سے ہر چیز خدا کی طرف سے ہے مگر عامل و کاسب ہونے کے لحاظ سے انسانی اعمال اُس کی اپنی طرف سے ہیں۔ اسی طرح بعض کاموں کی نسبت قرآن میں کبھی خدا کی طرف، کبھی شیطان کی طرف بھی کی گئی ہے ہر جگہ حیثیتوں کا فرق ہے اور بات درست ہے۔ مؤلف)

لہ اختلافاً کثیراً کے معنی میں بہت کچھ قیل و قال ہوئی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بیان میں تناقض مراد ہے کسی نے کہا کہ تحقیقات میں فرق مراتب مراد ہے اور کسی نے کہا کہ اس سے عبادت کی عدم یکسانی مراد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود اختلاف کثیر کا لفظ بڑا وسیع اور جامع ہے۔ معنوں اور ادبی ہر قسم کی بے آہنگی، ہر طرح کا جھول جھال اس کے اندر داخل ہے۔ قرآن مجید نے اس آیت سے دنیا کے سامنے اپنی یکتائی کا ایک مستقل چیلنج پیش کر دیا کہ ہر طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لو، ہر طرح جانچ پڑتال کر لو۔ مضامین کی پستی و بلندی عبارت کی ناہمواری اور کسی قسم کی کوئی کمی، کوئی کوتاہی اس کے اندر نہ پاؤ گے۔ اور یہی دلیل ہے۔ اس کی کہ یہ بشر اور مخلوق کا کام نہیں۔ قرآن کے جملہ

لہ تفسیر ماجدی ص ۲۰۴

Marfat.com

منکرین کے خلاف خواہ وہ کسی وجہ اور کسی پہلو سے ہوں یہ قیامت تک کے لئے ایک تحدّی ہے۔ قرآن میں تدبّر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا لفظی و معنوی اعجاز بالکل واضح ہو جائے گا اور اس وجہ سے آپؐ کی رسالت کی جانب سے شبہات کافور ہو جائیں گے۔ جن قدیم وجدید دشمنوں، ملحدوں اور روشن خیال مرتدوں کا خیال اس کے خلاف ہے وہ اس آیت پر تدبّر کریں۔ بعض عیسائی نما مسلمانوں یا مسلم نما عیسائیوں نے جو کچھ اس کے خلاف کیا ہے محض دیوانے کی بڑ ہے۔

یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ سے قیاس کی دلیل بھی نکل آئے گی اور ان لوگوں کا بھی ردّ ہو گیا جو سمجھتے ہیں کہ تفسیر قرآن حضرت رسولؐ اور امام معصوم کا حق ہے۔ کیونکہ قرآن تو سب کو تدبّر کی عام دعوت دیتا ہے اور ایسا نہ کرنے والوں پر الزام قائم کرتا ہے۔

[1] قرآن مجید نے خود فیصلہ کر دیا ہے کہ جو آیات متشابہ ہیں انہیں محکم کی طرف لوٹایا جائے، جو لوگ اس کے خلاف کرتے ہیں قرآن انہیں کجی پسند (اہلِ زیغ) قرار دیتا ہے۔ کلام الٰہی میں جو چیز عالم آخرت جنت و دوزخ، صفات الٰہیہ کے متعلق ہیں ان میں کوئی مادّی ذریعہ ایسا نہیں جو پوری طرح حل کر سکے۔ یا ان کی صحیح حقیقت کو جان سکے۔ ان میں پیغمبر معصوم کے قول پر ہی اعتماد لازم ہے اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ بہت سی صحیح احادیث میں قرآنی آیات کو باہم ٹکرانے اور ان میں اختلاف کرنے سے صاف طور پر منع فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح بے موقع بے وجہ اور فضول سوالات کو بھی ناپسند فرمایا گیا ہے۔ مسلمانوں میں فرقہ پرستی بدعت پسندی اور اختلاف صرف اسی حکم کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوئے ہیں۔

[2] رسولؐ چونکہ اپنی حیثیت رسالتؐ میں احکام الٰہی کا مبلّغ ہے لہٰذا اس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ براہ راست لوگوں سے کلام نہیں کرتا بلکہ پیغمبروں کے واسطے سے اپنے احکام دیتا رہا ہے۔ پس ان کی اطاعت ہی خدا کی اطاعت ہے لیکن پیغمبر باوجود پیغمبر ہونے کے آخر انسان ہے لہٰذا جو چیز بطور مشورہ اپنے اجتہاد سے کہے اور امورِ معاشرت و معیشت میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرے جسے علماء امر

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۵ ص ۱۰، (خلاصہ و اقتباس)،
[2] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۰۰، ۱۰۴، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۲۷۰، ۲۹۲

Marfat.com

ارشاد کا نام دیتے ہیں تو ایسے ارشاد کی اطاعت فرائض میں داخل نہیں۔ خود پیغمبرؐ نے ان کی یہی حیثیت رکھی ہے مثلاً تابیر نخل کا واقعہ یا مثلاً آپؐ کے کچھ طبی مشورے یا حضرت بریرہؓ کو اپنے خاوند کے پاس ہی رہنے کا مشورہ جبکہ بریرہؓ آزاد ہو گئیں اور انہیں فسخ نکاح کا شرعاً اختیار تھا، وغیرہ۔ صحابہؓ اس فرق کو خوب سمجھتے تھے اور وہ حضورؐ سے پوچھ لیا کرتے تھے کہ یہ کام آپؐ نے اپنی رائے سے کیا ہے۔ یا بذریعۂ وحی؟ چنانچہ جنگ بدر میں حبابؓ ابن المنذر کا آپؐ کو پہلا پڑاؤ بدل دینے کا مشورہ اور آپؐ کا اُسے قبول فرما لینا، علیٰ ہذا القیاس بوقتِ شوریٰ صحابہؓ کی مختلف آراء جس کی بہت سی مثالیں کتاب و سنت اور سیرت سے ملتی ہیں۔ مؤلف) اگر آپؐ فرماتے کہ یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے۔ تو وہ حضرات بعض دفعہ اختلاف کرتے ورنہ سر تسلیم جھکا دیتے تھے کیونکہ وحی سے اختلاف کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔

اس آیت ۸۰ کے شانِ نزول میں مقاتل نے بیان کیا ہے کہ جب حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے مجھ سے محبت رکھی اُس نے اللہ سے محبت رکھی اور جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ تو بعض منافق کہنے لگے کہ دیکھو یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔؟ یہ تو شرک تک جا پہنچا ہے اور دوسری طرف اپنی اطاعت کو عین خدا کی اطاعت کہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے۔ کہ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰؑ کو رب بنا لیا تھا ہم بھی اسے رب قرار دے لیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ خدا کی اطاعت کا کوئی طریقہ اس کے سوا نہیں ہے کہ رسولؐ کی اطاعت کی جائے کیونکہ وہی اس کا مبلغ اور نمائندہ ہے یہ شرک ہرگز نہیں ہے بلکہ یہی تو عین اسلام اور خلاصۂ توحیدِ خداوندی ہے۔

تدبّر کا اصل معنی ہے کسی چیز کے اَدبار (عواقب و انجام) میں غور و فکر کرنا۔ پھر اس کا استعمال مطلقاً تأمل اور غور و فکر میں ہونے لگا چاہے کسی چیز کی حقیقت میں ہو یا اجزاء میں سوابق و لواحق میں ہو یا اسباب میں۔ کلام میں تدبّر سے مراد یہ ہے کہ اُس کی غایت و مقاصد میں غور و فکر کیا جائے اور اُس پر عمل کرنے والوں کے انجام اور مخالفوں کے انجام کو سوچا جائے۔ قرآن پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ،

۱۔ حقائق کی جیسی تصویر قرآن نے کھینچی ہے یہ کسی مخلوق کے بس میں نہیں۔

۲۔ اس نے ماضی کا حال بیان کیا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے بوجہ اُمّی ہونے کے۔ اسی طرح اس نے آئندہ کے واقعات و حوادث بتائے اور اس

Marfat.com

کے بیان کے مطابق ہی وہ واقع ہوئے۔ حال کے واقعات بتائے، مثلاً دلوں
کے اندرونی خیالات، نفوس کے پوشیدہ جذبات و احساسات کی قلعی کھولی اور
خفیہ مشوروں کے حالات بیان کئے (جیسا کہ خود ان آیات میں ثابت ہے۔ اگر
۲۵۸ قرآن کا بیان صحیح نہ ہوتا تو منافق و یہود ضرور اس کی تردید کرتے۔ مگر ایسا بھی
نہ ہوا۔ مؤلف)

۳۔ اصول عقائد، قواعد تشریع اور سیاست مُدن و طبقات کے جو اصول
و قوانین اس نے وضع کئے وہ عین مطابق واقع اور موافق فطرت تھے۔

۴۔ اجتماعی سُنن، نوامیس تہذیب و تمدّن، مَلِل و اقوام کے طبائع کا بیان بذریعہ
شواہد و دلائل اور ضرب الامثال بیان کیا۔ ایک قصہ کو کئی جگہ مختلف بلیغ عبارات
سے دہرایا تاکہ عبرت و ہدایت کا مقصد باحسن وجوہ پورا ہو۔ یہ سب کچھ واقعات
کے مطابق اور باہم موافق تھا۔

۵۔ سفلی و علوی مخلوق کے بارے میں قرآن کے طرح طرح کے اقوال قسم قسم
کے بیانات بالکل متناسق و متناسب اور باہم متفق ہیں اس نے خلق و تکوین
پر گفتگو کی، نظام کواکب، ریاح و امطار، صحراء، بحار، خشکی و تری، حیوانات
و اشجار پر کلام کیا۔ ان کی حکمت و آیات کونیہ کو ظاہر فرمایا۔ ہر جگہ یہ کلام ایک دوسرے
کے موافق اور متناسب تھا، ذرّہ بھر کہیں تفاوت نہ پایا گیا۔

۶۔ اس نے عالم آخرت اور عالم غیب پر بھی کئی جگہ کلام کیا، حساب اعمال جزاء و سزاء
اور افعال کے نتائج و عواقب بتائے۔ کسی جگہ کلام میں کوئی جھول یا تفاوت
تناقض نہ تھا۔

یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہے کہ یہ کتاب ۲۳ سال میں آہستہ آہستہ
حسب ضرورت اور موافق حوادث نازل ہوتی رہی۔ آپؐ نے اس کی آیات و سُور
کی ترتیب بتائی، اسے حفظ کیا، دوسروں کو حفظ کرایا، اسے لکھوایا اور اس کی
شرح و تفسیر کی۔ یہ مشاہدہ ہے کہ جو از خود ایسی کتاب لکھے اس کے مضامین میں
جبکہ وہ بے حد و حساب بھی ہوں اور ساری زندگی سے متعلق ہوں، ضرور اختلاف
و تناقض پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے ماسوا گردش کائنات نے قرآن کے مضامین و بیانات کی صداقت
کو واضح کیا ہے۔ کسی نئی ایجاد نے اس کے کسی بیان کو نہیں جھٹلایا۔ علوم و فنون

Marfat.com

کی کثرت اور ایجادات کی بے پناہ فراوانی کے باوجود اس کا بیان اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ یہ سب کچھ اُس کی صداقت اور من جانب اللہ ہونے کے لئے کافی ہے۔

لے سب سے پہلے تو قرآن کا عدمِ اختلاف اور اس کا تناسق جانب ادا، اور اس کے فنّی طریقوں کے لحاظ سے قرآنی تعبیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی کلام میں نشیب و فراز پائے جاتے ہیں، کہیں موافقت ہے تو کہیں مخالفت کہیں قوت ہے کہیں ضعف، کہیں طلوع ہے کہیں غروب، کہیں آسانی ہے کہیں مشکل، کہیں نرمی ہے کہیں شدّت۔ ہر مفکر، فن کار، سیاسی لیڈر، سپہ سالار لشکر، ادیب، خطیب غرض ہر علم و فن کے آدمی میں یہ کمزوری موجود ہوتی ہے۔ مگر قرآن میں اس کے برخلاف اوّل سے آخر تک ثبات و تناسق ملحوظ ہے۔ ہم فقط اس وقت لفظی تعبیر اور اسلوب اداء سے بات کر رہے ہیں۔ پس اس مُعجز کتاب میں اوّل سے آخر تک اس لحاظ سے ایک ہی سطح ہے۔ ایک ہی کمالِ اداء ہے گو اختلافِ موضوعات کے باعث اس کے رنگ روپ بدلتے ہیں مگر معیار ایک ہی قائم رہتا ہے۔

اس کے بعد یہی واحد معیار اور اختلاف کا تناسق ان عبارات و مضامین میں بھی برقرار رہتا ہے۔ جنہیں یہ طرزِ ادا پیش کرتا ہے۔ یعنی انسان کی انفرادی و اجتماعی تربیت کا ایک ہی موضوع ہے جسے شروع سے آخر تک مدّ نظر رکھا گیا ہے۔ تمام مضامین اسی ایک مقصدِ اعظم کے گرد گھومتے ہیں، کہیں بھی یہ مقصد نظروں سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ یہ ترتیب ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانوں کے لئے ہم اس میں موجود پاتے ہیں۔ اقوام و ملل، قبائل و امم بدلتی رہیں مگر قرآن کے اس مقصد پر زمان و مکان کے تغیّر نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اس کی ترتیب ہر دور میں ہر جگہ کے لوگوں کے لئے یکساں مفید اور یکساں اعلیٰ و با مقصد رہی ہے۔

پھر انسانی کلام اور خدائی کلام کا یہ فرق صرف تعبیر لفظی، اداء فنّی اور موضوعات کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ تفکیر و تنظیم اور تشریع کے باب میں اس سے بھی واضح تر ہے۔ دنیا میں ہر انسانی نظریہ اور ہر انسانی مذہب اپنے اوپر انسانی ٹھپّہ رکھتا ہے۔ اُس میں نظر و فکر کی جزئیت اور ذہنی مشکلات سے تأثر صاف نظر آتا ہے، اس نظریے کے جزئیات میں متناقضات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے تصادم اندر ہی سے شروع

لے فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۱۶۸

Marfat.com

ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کا پیش کردہ نظام تشریع اس سے پاک ہے۔

ہاں اتنا ضرور ہے کہ قرآن کے لفظی و معنوی فضائل و مزایا کو پانے اور ان کی گہرائی تک پہنچنے میں ہر شخص، ہر طبقہ، ہر زمانہ کے لوگ ایک جیسے نہ ہوں۔ پھر یہ عین ممکن ہے کہ کسی زمانے میں اس کتاب فطرت کے بعض ایسے فضائل کھل کر سامنے آجائیں جو اس سے قبل نہ آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالق کائنات اور فاطر فطرت خود اس کا مصنف ہے اور اس کی دونوں تصنیفیں یعنی کونی و شرعی فی الاصل ایک ہیں۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ

اور جب ان کے پاس آئی کوئی خبر امن کی

اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى

یا خوف کی تو انہوں نے اسے مشہور کر دیا اور اگر اس کو پہنچا دیتے

الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ

رسولؐ تک اور اپنے حاکموں تک تو تحقیق کرتے اس کو

الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا

جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں اس کی اور اگر نہ

فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ

ہوتا فضل اللہ کا تم پر اور اس کی رحمت تو تم ضرور پیچھے ہو لیتے

الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

شیطان کے مگر تھوڑے

شرح الفاظ

[1] اَذَاعُوْا بِهٖ: اُسے پھیلا دیا، نشر و اشاعت کر دی اور لوگوں میں اس کا پروپیگنڈا کر دیا۔ رَدُّوْهُ: رَدّ کا معنیٰ ہے لوٹانا، اعادہ کرنا۔ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ:

[1] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۰۴-۱۰۵

Marfat.com

استنباط کا معنیٰ ہے نگاہوں سے پوشیدہ چیز کو باہر نکالنا فَضْلُ اللّٰہ : یہاں اس سے مراد ہے اطاعت رسولؐ کی ہدایت اور اُس کا راستہ۔ اِلَّا قَلِیْلًا یعنی تم میں سے بہت تھوڑے لوگ جن میں فطرت کی صفائی اور سلامتی موجود ہوتی۔

اس آیت میں افواہیں پھیلانے سے رد کا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا انجام اکثر بُرا ہوتا ہے۔ ابن جریر کے نزدیک اس آیت کا نزول منافقوں کے بارے میں ہوا تھا۔ لیکن افواہیں پھیلانے کی کمزوری منافقوں کے علاوہ بعض دفعہ کچھ اور عجائب پسند طبائع اور کمزور مزاج لوگوں میں بھی ہوتی ہے۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ بعض لوگوں کی نیت اس سے کچھ ہوتی ہے اور بعض کی کچھ۔ مثلاً منافق ایک افواہ ضرر پہنچانے کی نیت سے پھیلاتا ہے۔ مگر ایک ضعیف الایمان شخص محض ذاتی حسد و بُغض کی تسکین کی خاطر ایسا کرتا ہے۔ ایک تیسرا آدمی محض بھید کھولنے اور خبریں جانچنے کی خاطر ایسا کرتا ہے۔ اور بعض لوگ محض مذاق اور دل چسپی کا مشغلہ سمجھ کر بھی ایسا کرتے ہیں کیونکہ اکثر لوگ عجائب پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ایسی چیزیں سُن کر تعجب لاحق ہوتا ہے اور خبریں پھیلانے والا اس سے مزا لیتا ہے جب لوگوں کو ان کے کاروبار سے افواہ روک دے تو بہت مضر ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی دشمن کا جاسوس اسے سُن لے تو اُس کا ضرر کئی گنا بڑھ جاتا ہے پھر اس کا نقصان قومی و اجتماعی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو خواص تک محدود رہنی چاہئیں اور عوام تک ان کا جانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا، مثلاً سیاسی معاملات اور مصالح عامہ کی چیزیں۔

[1] ان منافقوں اور بعض کم سمجھ مسلمانوں کی ایک کمزوری یہ ہے کہ جب کوئی بات امن کی پیش آتی ہے، مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی سے صلح و عہد کا قصد فرمانا یا لشکر اسلام کی فتح کی خبر سُننا، یا یہ کوئی خوفناک خبر سُن لیتے ہیں جیسے دشمنوں کا کہیں جمع ہونا یا مسلمانوں کی خدانخواستہ شکست کی خبر آنا تو یہ ان خبروں کو بلا تحقیق مشہور کر دیتے ہیں اور اس میں اکثر مسلمانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ منافق ضرورت کی غرض سے اور کچھ کم فہم مسلمان کم فہمی سے ایسا کرتے تھے۔

چاہیئے یہ کہ کہیں سے کوئی خبر آئے تو اسے پہلے سرداروں، ذمہ داروں اور حاکموں تک پہنچائیں یا اُن کے نائبوں کو بتائیں۔ جب وہ تحقیق کر کے اُسے مان لیں تو ان کے کہنے کے مطابق اس کے بعد اُسے کسی دوسرے تک نقل کریں۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے ایک شخص کو کہیں زکوٰۃ لینے بھیجا وہ لوگ اُس کے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۱۷، تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱

Marfat.com

استقبال کو نکلے تو اُس نے غلطی سے سمجھا کہ مقابلہ کرنے کو نکل آئے ہیں چنانچہ ان کی آبادی کے، باہر سے ہی واپس پلٹ آیا اور مدینہ آکر کہہ دیا کہ وہ تو مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ سب مرتد ہو گئے ہیں۔ یہ خبر مدینہ بھر میں مشہور ہو گئی مگر بعد میں غلط ثابت ہوئی اگر اُس کی بات مان لی جاتی تو کس قدر نقصان ہوتا؟

اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تمہاری اصلاح اور تربیت کے لئے احکام نہ بھیجتا اور اور وقتاً فوقتاً تم حسب ضرورت ہدایت اور تنبیہہ نہ فرماتا رہتا جیسا کہ یہاں ایسے حالات میں رسولؐ اور ذمہ دار سرداروں کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا، تو تم گمراہ ہو جاتے مگر چند خواص کامل العقل اور کامل الایمان ہیں وہ بچ جاتے۔ ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھو اور شکر کرو اور احکام کی پوری تعمیل کرو۔

[1] ہیئت اسلامی شروع ہی سے ایک حد تک منظم بلکہ نیم عسکری جماعت تھی۔ اور یہ امر ہر اجتماعی تنظیم اور عسکری جماعت کے منافی تو خصوصاً ہے کہ اُمت کے عوام اور عام افراد جس خبر کو جہاں اور جب سُن پائیں، بلا اپنے سرداروں اور اہل حل و عقد کی طرف رجوع کئے بے تحقیق اسے لے دوڑیں اور بے تحاشا اسے پھیلانا شروع کر دیں۔

اولی الامر سے یہاں مراد عقل و فہم سلیم کے لوگ ہیں۔ مثلاً بقول ابن عباسؓ حضرت ابوبکرؓ اور اُن کے دوسرے ساتھی۔ اس آیت میں لفظ استنباط موجود ہے جس سے ایک بڑی اہم فقہی حقیقت روشنی میں آگئی۔ اور معلوم ہو گیا کہ استنباط و تخریج احکام ہر ایک کا کام نہ تھا۔ اس کے لئے ایک خاص فہم و سلیقہ اور مرتبہ تحقیق ضروری ہے اور ہر فرد اُمت اس سے بہرہ ور نہیں ہوتا آیت میں ضمیر منہم سے دونوں جگہ مجموعۂ اُمت اور جماعت مسلمہ مراد ہے۔ بقول امام رازیؒ آیت سے چار امور ثابت ہوئے: ۱۔ جو نئے مسائل پیش آئیں گے ان کی ثابت احکام نص سے نہیں بلکہ استنباط سے حاصل ہوں گے۔ ۲۔ استنباط بھی ایک شرعی حجت ہے۔ ۳۔ احکام میں عامیوں پر اہل علم کی تقلید واجب ہے۔ ۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استنباط احکام پر مامور تھے۔ آیت سے عقیدۂ امامت کا بھی ردّ نکل رہا ہے۔ کسی معصوم امام کا اگر اُمت میں وجود ہوتا تو استنباط احکام کی کیا ضرورت تھی امام خود ہی الہاماً ان احکام سے واقف ہوتا۔ (الجصاص)

[2] جن حالات میں یہ آیت اُتری وہ ہنگامہ کا موقع تھا۔ اس لئے ہر طرف افواہیں

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵۔ [2] تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۳۷۷

Marfat.com

اُڑ رہی تھیں۔ کبھی خطرے کی بے بنیاد مبالغہ آمیز خبریں آتیں اور ان سے یکایک بھگدڑ میں اور اُس کے اطراف میں پریشانی پھیل جاتی۔ کبھی کوئی چالاک دشمن کسی واقعی خطرے کو چھپانے کے لئے اطمینان بخش خبریں بھیج دیتا اور لوگ انہیں سُن کر غفلت میں مبتلاء ہو جاتے۔ ان افواہوں میں وہ لوگ بڑی دلچسپی لیتے تھے جو محض ہنگامہ پسند تھے۔ جن کے لئے اسلام اور جاہلیت کا یہ معرکہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا۔ جنہیں کچھ خبر نہ تھی کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ افواہیں پھیلانے کے نتائج کس قدر دُور رس ہوتے ہیں۔ ان کے کان میں جہاں کوئی بھنک پڑ جاتی اسے لے کر جگہ جگہ پھونکتے پھرتے تھے۔ انہی لوگوں کو اس آیت میں سرزنش کی گئی ہے۔ اور انہیں سختی کے ساتھ متنبہ فرما دیا گیا ہے کہ افواہیں پھیلانے سے باز رہیں اور ہر خبر جو ان کو پہنچے اُسے ذمہ دار لوگوں تک پہنچا کر خاموش ہو جائیں۔

۲ مقدمہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ جو کچھ سُن پائے اسے بیان کرنے لگ جائے۔

صحیحین کی حدیث ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے قیل وقال سے منع فرمایا، یعنی سُنی سنائی باتوں کو بیان کرنے سے روکا ہے۔ ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ انسان کا یہ فعل بہت بُرا ہے کہ یوں کہتا پھرے لوگوں نے یہ کہا ہے یا یہ خیال کیا ہے۔ ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی بات کو غلط گمان کرنے کے باوجود پھیلاتا ہے وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے سُنا کہ حضورؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے تو یک لخت نہ مان لیا بلکہ آکر خود تحقیق کی اور حضورؐ سے مل کر جب افواہ کا غلط ہونا معلوم ہو گیا تو بآوازِ بلند اس کی تردید فرمائی۔ استنباط کا لفظی معنیٰ ہے کسی چیز کو اُس کے اصل مخزن اور تہہ سے نکالنا، مثلاً کان کھود کر سونا چاندی وغیرہ نکالنا، استنباط ہے (اس کے اصطلاحی معنیٰ میں بھی یہ کھود کرید اور کوشش ملحوظ ہے جیسا کہ آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ اور اصول کی اصطلاح میں بھی یہی چیز پیش نظر ہے۔ مؤلف)

۱ سیاست اُمت اور مصلحت عامہ کے معاملات میں بھی ہر کوئی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ بعض لوگ خالص سیاسی امور کی بصیرت زیادہ رکھتے ہیں اور اُن میں بھی باہم تفاضل ہوتا ہے بعض مالی امور میں خصوصی مہارت کے مالک ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں

---

۲ تفسیر ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲۔
۱ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶۔ تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۲۹۸، ۳۰۳

Marfat.com

کی بصیرت قانونی و قضائی معاملات میں زیادہ ہوتی ہے، بعض مہندس (انجنیئر) ہوتے ہیں جو عمارتوں، پلوں اور جنگی اڈوں کی تعمیر میں ماہر ہوتے ہیں۔ اور پھر بعض ایسے ہوتے ہیں جو خالص جنگی امور کے ماہر ہوتے ہیں مجلسِ شوریٰ اور ارباب بصیرت کا کام یہ ہے کہ ان تمام امور پر بحث و تمحیص کے بعد فیصلے کریں اور مصلحتِ اُمّت کے پیشِ نظر جو مناسب سمجھیں حکم دیں۔ یہ عوام کے بس کی چیزیں نہیں ہیں۔

اِلَّا قَلِیْلًا: سے مراد وہ چند اصحاب عقل و فراست اور ارباب علم و ایمان ہیں جنہوں نے احکام کو براہِ راست مشکوٰۃ نبوّت سے اقتباس کیا تھا مثلاً ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ۔ ایک اور آیت کا بھی بالکل یہی مضمون ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا۔

[1] ان آیات میں مسلم جماعت کے اندر پائے جانے والے ایک گروہ کی تصویر کھینچی گئی ہے جس کے قلوب اس نظام سے پوری طرح ابھی مانوس و مالوف نہ ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں یہ نہ معلوم تھا کہ لشکرِ حق کے اندر بعض باتوں کی اشاعت سے نتائج کتنے سنگین ہو سکتے ہیں۔ زبان سے نکلا ہوا ایک عام لفظ ایک معمولی فقرہ اور ایک غیر اہم بات بھی نتائج کے لحاظ سے بعض دفعہ بڑی اہم اور سنگین ہو سکتی ہے۔ اس کے نتائج و عواقب صرف اشخاص کے لئے نہیں بلکہ جماعت کے لئے بھی خوفناک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک لشکر جو جنگ کے لئے تیار کھڑا ہے اُس میں اگر کوئی ایسی بات پھیلا دی جائے جو حالت امن میں تو قابلِ برداشت ہو سکتی ہے لیکن حالت جنگ میں نہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسی طرح حالت اطمینان میں اگر کوئی خوفناک خبر پھیلا دی جائے تو نتائج سنگین ہو سکتے ہیں۔ اس لئے افواہیں پھیلانے اور ان پر یقین کرنے سے منع فرما دیا گیا۔

جماعتی نظم و ضبط کے لئے یہ ایک اہم ضابطہ ہے جو قرآن نے بتایا ہے اسے دیکھ کر ہم اُس طریقے کا جائزہ لے سکتے ہیں جسے قرآن نے امّتِ مسلمہ کی تربیت کے لئے اختیار فرمایا تھا۔ اس میں پیغمبرؐ کی صداقت و امانت کی پختہ دلیل بھی موجود ہے کہ وہ یہ سب کچھ (باوجود اُمّی ہونے کے) از خود نہیں گھڑ رہے تھے بلکہ خدا کا کلام تھا جو ان پر نازل ہو رہا تھا۔

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲

Marfat.com

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا

سو تو لڑ اللہ کی راہ میں تو ذمہ دار نہیں مگر

نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ

اپنی جان کا اور تاکید کر مسلمانوں کو قریب ہے کہ اللہ

اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ وَاللّٰهُ

بند کر دے لڑائی کافروں کی اور اللہ

اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

بہت سخت ہے لڑائی میں اور بہت سخت ہے سزا دینے میں

شرح الفاظ

لہ حَرِّضْ: تحریض کا معنیٰ ہے کسی چیز کو مزین بنا کر پیش کرنا اور اس کے حصول پر ابھارنا اور اسے سہل قرار دینا۔ بَأس، قوت و طاقت، کافروں کی ساری قوت اس بات پر مرکوز تھی کہ اہل ایمان کو ان کے مومن ہونے کی وجہ سے ذلیل کر دیا جائے۔
تَنْكِيْلًا: مجرم کو ایسی سزا دینا جس سے دوسروں کو عبرت و نصیحت حاصل ہو تاکہ وہ ایسا کام نہ کریں۔

اس آیت مبارکہ میں بھی جہاد و قتال کی ترغیب و تحریض ہے۔ ایماندار بعض دفعہ کافروں کی قوت و شوکت سے دل میں ڈر جاتے تھے اس لئے ان کی ہمت بندھائی گئی ہے۔

لہ اگر کافروں کی لڑائی سے یہ منافق اور کچے مسلمان جن کا ذکر اوپر گزرا، ڈرتے ہیں۔ تو اے رسول! آپ تنہا اپنی ذات سے جہاد و قتال کرنے میں توقف نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ

لہ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۰۶-۱۰۷
لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۱۷، تفسیر ماجدی صفحہ ۲۰۵، تفسیر ابن کثیر ص صفحہ ۳، تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۱۲، ۲۱۳۔

Marfat.com

آپ کا مددگار ہے۔ اور مسلمانوں کو قتال کی تاکید کر دیں اگر بعض ساتھ نہ دیں تو پروا نہ کیجئے امید ہے کہ اللہ تعالےٰ کافروں کی لڑائی روک دے گا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ میں ضرور جہاد و قتال کے لئے جاتا ہوں اگرچہ ایک شخص بھی میرے ساتھ نہ ہو اور آپؐ صرف ستر ہمراہیوں سمیت بدر صغریٰ کو بغرضِ جہاد تشریف لے گئے جس کا وعدہ ابوسفیانؓ سے اُحد میں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیانؓ اور کفارِ قریش کے دل میں رعب اور خوف ڈال دیا اور کوئی مقابلہ میں نہ آیا بلکہ وہ وعدے سے جھوٹے ثابت ہوئے اور اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا اور آپؐ ہمراہیوں سمیت خیر اور سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لائے۔

اللہ تعالیٰ کی لڑائی اور اُس کا عذاب کافروں سے زیادہ سخت ہے جو لوگ کافروں کے ساتھ لڑنے اور اُن کو مارنے اور اُن کے ہاتھ سے مارے جانے سے ڈرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے غصہ اور اس کے عذاب کا کیونکہ تحمل کر سکتے ہیں؟

آیت سے معلوم ہوا کہ درجۂ ترغیب میں تبلیغ آپؐ کے فرائضِ رسالت میں داخل ہے۔ تحریض یہ ہے کہ کسی چیز کی خوبیاں بکثرت بیان کر کے اس کی جانب شوق و رغبت دلائی جائے۔ یہ آیت ان ظالم اور بے درد پادریوں کا پول کھول رہی ہے جنہوں نے یہ جھوٹ اچھال رکھا ہے کہ نعوذ باللہ حضورؐ کے پیر دلوٹ مار کے شوق میں جہاد پر ٹوٹ پڑتے تھے کیا بار بار ترغیب دلانے اور آمادہ کرنے کی ضرورت حریصوں کو ہوا کرتی ہے؟

اس آیت میں عَسَى اللّٰهُ الخ کے الفاظ سے کفار کے شر سے روک دینے اور غلبۂ اسلام کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے آنحضرتؐ کی ترغیب اور مسلمانوں کے عزم و ہمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ایک صدی کے اندر ہی اندر کوئی ایسی بت پرست اور کافر سلطنت روئے زمین پر باقی نہ رہی جو اسلامی آسمانی سلطنت کا مقابلہ کر سکے۔ جبل الطارق سے چین تک اور کوہ قاف سے آذربائیجان تک تمام بڑے بڑے ممالک اُس جھنڈے کے نیچے آ گئے جسے مدینہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند کیا تھا۔ فی الحقیقت یہ ایک بڑا معجزہ اور صداقتِ نبوت کی دلیل ہے۔

؎ اگر آپ دشمنوں پر فتح و نصرت چاہتے ہیں تو خدا کا حکم مان کر اس کی راہ میں

؎ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۰۷-۱۰۸

Marfat.com

قتال کیجئے۔ آپؐ صرف اپنے افعال کے ذمہ دار ہیں۔ اُن کے افعال کی آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ، اے اللہ تو نے ہم پر قتال جیسی سخت چیز کیوں فرض فرمائی؟ اور نہ آپؐ ان کے ذمہ دار ہیں جو سامنے آکر اطاعت کا دم بھرتے ہیں مگر خلوت میں جاکر آپؐ کے خلاف مشورے کرتے پھرتے ہیں۔ جو خدا کی اطاعت کرے اُسے نافرمانوں کی نافرمانی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ آپؐ کے ذمہ یہ فریضہ بھی ہے کہ دوسروں کو قتال پر تحریض و ترغیب دلائیں۔ کسی کو قہر و جبر سے اس طرف لانا آپؐ کے ذمہ نہیں ہے۔

آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ آپؐ کی دعوت کا مقابلہ قوت و طاقت سے کرنے والوں سے قتال کرنے پر آپؐ مامور ہیں چاہے اکیلے ہی کیوں نہ ہوں۔

اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ آپؐ کو دنیا جہان سے بڑھ کر شجاعت دی گئی تھی۔ آپؐ کی مقدس سیرت اس پر عملاً گواہ ہے۔ آپؐ نے پہلے پہل تن تنہا کام شروع کیا اور سارے مخالفوں کو اکیلے ہی للکارا۔ پھر جب آپؐ کے ساتھ ایک پاکباز جمعیت ہو گئی تب بھی آپؐ کی ہمت و شجاعت سب میں ممتاز رہی۔ جہاں کوئی کھڑا نہ رہ سکتا وہاں آپؐ پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہتے۔ اور جب جنگ کی گھما گھمی میں ساتھی اِدھر اُدھر بکھر جاتے تو آپؐ دشمنوں کے سامنے آنے سے کبھی متزلزل نہ ہوتے احد اور حنین کے واقعات اس پر گواہ ہیں۔

آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو قتال کی تیاری واجب ہے، جب وہ ایسا کریں گے تو نصرت الٰہی دست گیر ہوگی اور کفار کے حوصلے چھوٹ جائیں گے۔ پھر وہ سامنے آنے کے قابل نہ رہیں گے۔ عدّ کا لفظ یہاں تہیّہ اور اعداد (تیاری کرنا) کے معنوں میں آیا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ قتال کو بند کرنے کے لئے قتال کی پوری تیاری لازم ہے۔ عرب والوں کا مقولہ کیسا برمحل ہے کہ "خون ہی خون کی حفاظت کرتا ہے"!

اگر تیاری نہ ہوگی تو قوی ضعیف کو نگل جائے گا۔ تو ان یوں ہی برقرار رہ سکتا ہے کہ سب کی تیاری مکمل ہو۔ یہی ذریعہ ہے جو ظالم کو ظلم و ستم سے باز رکھتا ہے۔ پس مسلمانوں کو بحر و بر میں تنظیم جیش کی اور ہوا میں طیاروں اور بمباروں کی پوری تیاری رکھنا لازم ہے۔

Marfat.com

لہ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مسلم صفوں سے خلل کو پُر کرنے اور جماعت کی بعض کمزوریوں کو دُور کرنے کے لئے کیسی حکمت سے ان میں شجاعت پیدا کی تھی۔ پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ پر صرف اپنی ذات کی ذمہ داری ہے، فرض تبلیغ رسالت ادا کر چکنے کے بعد اگر کوئی نہ مانے تو تن تنہا اُٹھ کھڑے ہوں۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس وقت کفر و شرک کا دباؤ کتنا شدید تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کا زور توڑنے کی ذمہ داری خود لے لی تھی بشرطیکہ ایماندار حسب مقدور اُٹھ کھڑے ہوں! اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ راہ کی مشکلات کتنی سخت تھیں۔ صعوبتیں کتنی زیادہ تھیں اور راستہ کتنا ناہموار تھا۔ پھر آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نفس کا سب سے بڑا سہارا خداوند تعالیٰ سے ربط و ضبط ہے اسی سے سینے میں ٹھنڈک، دل میں نور اور مشاعر میں عزم و ہمت پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ سے استعانت اور اُسی کے ساتھ اطمینان ایک مردِ مومن کا سب بڑا ہتھیار ہے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ

جو کوئی سفارش کرے نیک بات میں اس کو بھی ملے گا

نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً

اس میں سے ایک حصّہ اور جو کوئی سفارش کرے بری بات میں

يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ

اس پر بھی ہے ایک بوجھ اس میں سے اور اللہ ہے ہر چیز پر

شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ

قدرت رکھنے والا ہے اور جب تم کو کوئی دعا دے

لہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۱۷۳، ۱۷۴

Marfat.com

فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

تو تم اس کو اس سے بہتر دعا دو یا وہی کہو الٹ کر بیشک اللہ ہے ہر چیز

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا

کا حساب لینے والا اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں

هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ

بے شک وہ تم کو جمع کرے گا قیامت کے دن اس میں کچھ شبہ

فِيْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ

نہیں اور اللہ سے زیادہ سچی کس کی

حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ ع ۱۱ ۸

شرح الفاظ

لہ شَفَاعَةٌ: بقول امام راغب اصفہانی شفع کا معنیٰ ہے ایک چیز کو اس کی مانند دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ اور شفاعۃ کا معنیٰ ہے کسی دوسرے کی مدد کے لئے یا اس سے کچھ طلب کرنے کے لئے اس کے ساتھ ملنا نَصِيْبٌ حِصّہ کِفْلٌ: حصہ۔ مُقِيْتًا: مقتدر، حافظ یا شاہد امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ مُقِيْتًا کا معنیٰ ہے کسی چیز پر قائم ہونے والا اس کی مدد کرنے والا اور حفاظت کرنے والا اس کا مادّہ قوت ہے، یعنی وہ رزق جو زندگی کو محفوظ رکھتا اور جان کو بچاتا ہے۔ قوت جب مصدر ہو تو اس کا معنیٰ ہے کھلانا، کھانا دینا۔ متعدی مصدر اِقَاتَۃٌ ہے جس کا معنیٰ ہے کسی کے لئے رزق کا سامان بہم پہنچانا اور وسائل رزق سے اس کی مدد کرنا۔ تَحِيَّةٌ: کا معنیٰ ہے کسی کو زندگی کی درازی کی دعا دینا مثلاً یوں کہنا

لہ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹

Marfat.com

کہ: حیّاك اللّٰہ : (خدا تجھے زندہ رکھے) پس اصل میں تحیّۃ کا معنیٰ ہے زندگی کی دعا، پھر ہر دعاء اور ثناء کو تحیّۃ کہا جانے لگا۔ اہل عرب صبح شام کی الگ الگ دعا ایک دوسرے کو دیتے تھے مثلاً: اَنْعِمْ صَبَاحًا، اَنْعِمْ مَسَاءً، عِمْ صباحًا، عِمْ مَسَاءً (انگریزی زبان میں بھی سلام کا یہی طریقہ ہے۔ مؤلف) شارع علیہ السّلام نے مسلمانوں کے باہمی سلام کے لئے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کا لفظ رکھا۔ جس سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ یہ دین سلامتی اور امان کا دین ہے حَسِیْبًا عمل پر محاسبہ کرنے والا جیسے جلیس بمعنیٰ مجالس (کسی کے ساتھ بیٹھنے والا، حسیب کا معنیٰ مکافی اور کافی بھی ہے۔ تب یہ لفظ حَسْبُکَ کَذَا: (فلاں چیز تیرے لئے کافی ہے) سے ماخوذ ہے

جب ایمان دار آپؐ کی تحریض سے جہاد و قتال پر آمادہ ہوں گے اور انہیں آپؐ کی اطاعت سے بہت سا فائدہ پہنچے گا تو اے پیغمبرؐ! ان کے اس اجر میں آپؐ کو اجر و ثواب کا استحقاق ہوگا۔ کیونکہ آپؐ نے انہیں ترغیب و تحریض دلا کر اپنے آپؐ کو ان کا شفیع و نصیر بنایا ہے اور وہ آپؐ ہی کے ذریعہ سے ان بلند اغراض تک پہنچے ہیں۔ نیکی کی ترغیب بھی نیکی ہے جس طرح کہ برائی کی ترغیب بھی برائی ہے کتاب و سنّت کے اور بھی بہت سے دلائل سے یہی مضمون ثابت ہے۔

[1] آیت ۸۵: اگر کوئی نیک کام میں سعی و سفارش کرے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں کو جہاد کی تاکید فرمانا یا کوئی بری بات میں ساعی ہو جیسا کہ منافقوں اور سست مسلمانوں کا جہاد سے ڈر کر دوسروں کو بھی ڈرانا۔ تو اوّل صورت میں ثواب کا اور دوسری صورت میں گناہ کا حصّہ ملے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی محتاج کی سفارش کرے اور دولت مند سے کچھ دلوا دے تو یہ بھی خیرات کے ثواب میں شریک ہوگا۔ اور جو کوئی کافر، مفسد یا مشرک سارق کو سفارش کر کے چھڑا دے پھر وہ فساد اور چوری کرے تو فساد اور چوری میں یہ سفارشی بھی شریک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ جب ہر چیز پر قادر (مقیت)، اور صاحب اقتدار اور ہر چیز کا حصّہ بانٹنے والا ہے تو نیکی اور بدی کے حصّہ دینے میں اُس کو کوئی دشواری نہیں

آیت ۸۶۔ کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا درحقیقت اللہ سے اُس کی شفاعت

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۱۷ - ۱۱۸، تفسیر ماجدی صفحہ ۲۰۵، تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۱۲، تفسیر ابن کثیر پ ۵ ص ۴۰۷

Marfat.com

حسنہ کی ایک خاص صورت کو جو مسلمانوں میں شائع و ذائع ہے، صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ جب کوئی اے مسلمانو! تم کو دعا دے یا سلام کہے تو تم کو اس کا جواب ضرور دینا چاہئے۔ یا تو وہی کلمہ تم بھی اُس کو کہو یا اس سے بہتر، مثلاً اگر اس نے کہا السلام علیکم تو واجب ہے تم پر کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہو۔ اور زیادہ ثواب چاہو تو ورحمۃ اللہ بھی بڑھا دو۔ اور اگر اُس نے یہ لفظ بڑھایا ہو تو تم وبرکاتہٗ کا لفظ زیادہ کر دو اللہ کے ہاں ہر چیز کا حساب ہوگا اور اُس کی جزا ملے گی، سلام اور اُس کا جواب بھی اس میں آگیا۔ اس سے شفاعت حسنہ کی پوری ترغیب ہو گئی اور شفاعت سیئہ کی خرابی اور مضرت معلوم ہو گئی کیونکہ شفاعتِ حسنہ جو کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ جزا دے گا۔ اور جس کی شفاعت کی ہے اُس پر اُس کے ساتھ حُسن سلوک اور مکافات کا حکم فرمایا۔ بخلاف شفاعت سیئہ کے کہ اس سے بجز معصیت و محرومی کے کچھ نہ ملے گا۔

آیت ۸۷۔ یعنی قیامت کا آنا اور ثواب و عقاب کے سب وعدوں کا پورا مناسب سچ ہے، اس میں تخلّف نہیں ہوگا۔ ان باتوں کو سرسری خیال مت کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ سلام کہنے والا مسلمان ہو تو جواب میں زیادہ الفاظ کہے جائیں اور غیر مسلم ہو تو اُسی کے الفاظ دُہرا دیئے جائیں۔

لہ اس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلّقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے اور جیسا کہ تعلّقات کی کشیدگی میں ہوا کرتا ہے اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسروں کے ساتھ کج خلقی سے پیش نہ آنے لگیں۔ اس لئے انہیں ہدایت کی گئی کہ جو تمہارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے۔ بلکہ تمہارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ بنو۔ ایک داعی و مبلّغ گروہ کے لئے جو دُنیا کو راہِ راست پر لانے اور مسلکِ حق کی طرف دعوت دینے کے لئے اٹھا ہو۔ درشت مزاجی، ترش روئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں۔ اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے مگر اس مقصد کو الٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لئے وہ اٹھا ہے۔

لہ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۳۷۸-۳۷۹۔

Marfat.com

کافر و مشرک اور ملحد و دہریئے جو کچھ کر رہے ہیں اس سے خُدا کی خدائی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اُس کا خدائے واحد اور خداوندِ مطلق ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی کے بدلے بدل نہیں سکتی۔ پھر ایک دن وہ سب انسانوں کو جمع کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ دکھاوے گا۔ اس کی قدرت کے احاطہ سے بچ کر کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا خدا ہرگز اس بات کا حاجت مند نہیں کہ اس طرف سے کوئی اس کے باغیوں پر جلے دل کا بخار نکالتا پھرے اور کج خلقی و ترش کلامی کو زخم دل کا مرہم بنائے۔ یہ تو ہے اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت سے۔

لیکن یہی آیت اس پورے سلسلہ کلام کا خاتمہ بھی ہے جو پچھلے دو تین رکوع سے چلا آرہا ہے۔ اس حیثیت سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو شخص اپنے لئے جس راہِ عمل کو پسند کرتا ہے، اور جس راہ میں اپنی کوشش اور محنت صرف کرنا چاہتا ہے کئے جائے آخر کار سب کو ایک دن اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر ہر ایک اپنی سعی و عمل کے نتائج دیکھ لے گا۔

؎ ان آیات میں شفاعت کا اصل معنیٰ تو ہے کسی کی نصرت و مدد کرنا، اگر یہ نصرت و اعانت نیکی میں ہے تو شفاعت حسنہ ہے ورنہ شفاعت سیئہ۔ پہلی باعثِ اجر ہے اور دوسری باعث وِزر۔ لیکن آیت کے معنیٰ میں لوگوں کی باہم سفارشیں بھی داخل ہیں۔ ان کی بھی دو ہی اقسام ہیں۔

ا۔ شفاعتِ حسنہ، کہ سفارشی کوئی ضرر دُور کرے، کسی مظلوم سے ظلم کو دُور کرے یا کسی منفعت کے حقدار کو وہ منفعت پہنچانے کی سعی کرے بشرطیکہ اس میں کسی اور کا ضرر نہ ہو۔

ب شفاعتِ سیئہ، جو کہ کسی کے حق کو ساقط کرنے کے لئے کی جائے کسی کا حق مارنے میں ہو، غیر مستحق کو کوئی فائدہ پہنچانے کے لئے ہو یا خلل و فساد کے لئے خواہ مخواہ کسی کی جانب داری کی جائے۔

اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ شفاعتِ حسنہ وہ ہے جو شرع کے پسندیدہ کاموں میں ہو اور سیئہ اس کے برخلاف ہے۔

؎ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۲۰۱۰

Marfat.com

پھر آیت میں یہ عبرت بھی ہے کہ حاکم عادل کے پاس کوئی غلط سفارش نہیں چل سکتی۔ ہاں اگر وہ کسی معاملے کو جانتا نہ ہو کسی مظلوم کی مظلومیت کا اسے علم نہ ہو، کسی حقدار کی حق تلفی ہو رہی ہو اور اسے خبر نہ ہو تو ان چیزوں کی اس کے ہاں سفارش ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ سفارش کرنے والے کی رضاء کی خاطر حق و عدل اور مصلحتِ عامّہ کے خلاف نہ کرے گا۔ کیونکہ یہ اس کے عدل و انصاف کے خلاف ہے۔

اس کے برخلاف ظالم حاکم کے ہاں سفارشوں کا رواج ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقرّب دوستوں اور حواریوں کو اپنے ظلم و ستم میں حصّہ دار بنا لیتا ہے۔ حق تلفی ظلم و عدوان، غیر مستحقوں کی رعایت میں وہ ان کی سفارشیں مانتا ہے تاکہ وُہ اس کی خدمت میں چاق و چوبند رہیں، اور اس سے اخلاص میں کمی نہ کریں۔ ایسے حاکموں اور ایسی حکومتوں میں ظلم و ستم اور حق تلفی کا خوب رواج ہوتا ہے۔ حاکموں سے یہ چیز حکومت میں اور وہاں سے عوام میں آ داخل ہوتی ہے۔ پھر اندھیر مچ جاتا ہے۔ ہر طرف فساد و اضطراب کا دَور دَورہ ہوتا ہے اور اعمال کا نظام معطّل ہو کر رہ جاتا ہے۔

سلام کا احسن جواب کبھی تو بعض الفاظ کی زیادتی سے ہوتا ہے اور کبھی معنے اور حُسنِ ادا سے ہوتا ہے مثلاً ایک شخص پست آواز سے سلام کہے جس سے اُس کی بے پروائی ثابت ہوتی ہے مگر جواب دینے والا بلند آواز سے اور بشاشت و مسکراہٹ سے اسے جواب دیتا ہے۔ تو یہ جواب چاہے مختصر ہی کیوں نہ ہو یقیناً حُسنِ ادا و معنوی اعتبار سے احسن کہلائے گا۔

اسلام کے مقرر کئے سلام میں کچھ خصائص پائے جاتے ہیں۔

۱۔ اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں کے لئے اپنا خاص نظام وضع کیا ہے اور اسے شرک و کفر اور جاہلیت کے اثرات سے کاملاً محفوظ کر دیا ہے۔ اسی طرح اس نے سلام کے معاملہ میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔

۲۔ یہ سلام مسلم جماعت کے افراد کے اندر ایک دائمی محبّت و مودّت اور امن و سکون کے جذبات پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے حضورؐ نے افشائے سلام کا حکم دیا ہے۔ مسلم کو پہلے سلام کہنا از روئے حدیث و سُنّت حضورؐ کا طریقہ (سنّت) ہے مگر جب کوئی سلام

لہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۱۷۵۔ ۱۷۹۔

Marfat.com

کہہ دے تو اس کا جواب ان آیات کی رُو سے واجب ہو جاتا ہے۔ سلام غیروں سے تعارف، اپنے عزیزوں اور عام مسلمانوں سے مودّت و اخلاص اور سلامتی کا ایک عظیم سبب ہے۔

۳- اسلام سلامتی کا دین ہے۔ آیاتِ جہاد و قتال کے درمیان سلام کے احکام کو لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کی اس حیثیت کا اظہار کیا جائے۔ وہ سلامتی کا دین ہے اور اُس کے قتال کا مقصد دنیا میں امن و سکون اور سلامتی کو پھیلانا اور قائم رکھنا ہے۔ وہ لوگوں کی ذاتی اغراض و شہوات سے بالاتر ہے۔

اور غالباً یہی باعث ہے کہ اس آیت کے فوراً بعد اگلی آیت میں اسلام کی پہلی بنیاد توحید کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ آخرت پر ایمان عقیدۂ توحید کا لازمی نتیجہ ہے اس لئے اسے بیان کر دیا گیا ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ

پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے معاملہ میں دو فریق ہو رہے ہو حالانکہ اللہ

اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا

نے ان کو الٹ دیا ان کے اعمال کے سبب کیا تم چاہتے ہو کہ راہ پر لاؤ

مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ

جس کو گمراہ کیا اللہ نے اور جس کو گمراہ کرے اللہ ہرگز نہ پائے گا

لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا

تو اس کے لیے کوئی راہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر

فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ

ہو رہے پھر تم سب برابر ہو جاؤ سو ان میں سے کسی کو دوست مت بناؤ

Marfat.com

حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا

یہاں تک کے وطن چھوڑ آئیں اللہ کی راہ میں پھر اگر وہ اس کو قبول نہ کریں

فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ

تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو جہاں انہیں پاؤ

وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو دوست اور نہ مدد گار

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ

مگر وہ لوگ جو ملاپ رکھتے ہیں ایک قوم سے کہ تم میں

وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ

اور ان میں عہد ہے یا آئے ہیں تمہارے پاس کہ تنگ ہو گئے

صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا

ہیں ان کے دل تمہاری لڑائی سے یا اپنی قوم کی لڑائی

قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ

سے اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر زور دے دیتا

فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ

تو ضرور لڑتے تم سے سو اگر وہ تم سے یک سُو رہیں پھر تم سے نہ لڑیں

وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ

اور پیش کریں تم پر صلح تو اللہ نے نہیں دی تم کو

Marfat.com

عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ

ان پر راہ اب تم دیکھو گے کچھ اور لوگوں کو جو چاہتے ہیں

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ

کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور اپنی قوم سے بھی

كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ

جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اسکی طرف لوٹ جاتے ہیں پھر اگر وہ

يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا

تم سے یک سو نہ ہوں اور نہ پیش کریں تم پر صلح اور نہ اپنے ہاتھ

اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ

روکیں تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو جہاں ۹۱

ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ع ۱۲ ع ۹

انہیں پاؤ اور ان پر ہم نے تم کو دی ہے کھلی سند

Marfat.com

شرح الفاظ

فِئَتَیْن: فِئَۃ جماعت کو کہتے ہیں۔ اَرْکَسَھُمْ، رَکْس بروزن نصر کا معنیٰ ہے کسی چیز کو اُس کے سر کے بل واپس لوٹانا (اگر اُس کا سر ہو) یا اُسے پہلی حالت سے زیادہ ردّی حالت میں بدل دینا جیسے کھانے اور چارے کو پاخانے اور گوبر کی شکل میں تبدیل کر دینا۔ اور یہاں اس سے یہ مراد ہے کہ اُن لوگوں نے مسلمانوں کے لیے دوستی اور ساتھ دینے کا اعلان و اظہار کیا تھا مگر بعد میں غدر و قتال کی طرف بدل گئے۔ سَبِیْلًا: طریق، راستہ۔ اَوْلِیَآء، ولی کی جمع ہے بمعنی نصیر و مُعین یَصِلُوْن: یعنی ان کے ساتھ ملتے ہیں اتصال رکھتے ہیں: صِیْثَاق" عہد و پیمان حَصِرَتْ تنگ ہوئے اَلسَّلَمَ جھکنا، انقیاد۔ اَلْفِتْنَۃ شرک۔ ثَقِفْتُمُوْھُم: تم انہیں پاؤ۔ سُلْطَانًا مُّبِیْنًا: واضح حُجّت کھلی دلیل۔

ان آیات کا مضمون یہ ہے کہ سب منافقین ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں لہٰذا تم ان کے بارے میں تردّد مت کرو، نہ اپنی رائے میں تبدیلی و تقسیم پیدا کرو کیونکہ ان کے کفر و نفاق کے دلائل واضح ہیں۔ لہٰذا جب بھی موقع ملے اور ضرورت ہو اُن سے قتال کرو۔ امام ابن جریر طبریؒ نے عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیات مکّہ کے کچھ لوگوں کے بارے میں ہیں انہوں نے اسلام کا اظہار کیا تھا مگر مسلمانوں کے خلاف مشرکوں کی مدد کرتے تھے مسلمانوں میں ان کے بارے میں اختلاف واقع ہوا تو ان آیات میں ان کی اصل کیفیت کا فیصلہ سُنایا گیا ہے۔[1]

[2] آیت ۸۸، ان منافقوں میں وہ لوگ داخل ہیں جو ظاہر میں بھی ایمان نہ لائے تھے، بلکہ ظاہر و باطن میں کُفر پہ قائم تھے۔ لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ ظاہر میل جول اور محبّت کا معاملہ رکھتے تھے۔ اور غرض ان کی یہ تھی کہ مسلمانوں کی فوج ہماری قوم پہ چڑھائی کرے تو ہمارے جان و مال اس حیلہ سے محفوظ رہیں۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ اُن کا آنا جانا اس غرض سے ہے اور دل سے محبّت کے باعث نہیں تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ ان شریروں سے

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۱۳-۱۱۴۔ [2] فوائد القرآن صفحہ ۱۱۸-۱۱۹۔

Marfat.com

ملنا ترک کرنا چاہیے، تاکہ یہ ہم سے جُدا ہو جائیں۔ اور بعض دوسروں نے کہا کہ ان سے ملے جایئے شائد ایمان لے آئیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہدایت و گمراہی اللہ کے قبضہ میں ہے۔ تم اس کا فکر مت کرو، اور ان لوگوں سے بالاتفاق وُہ معاملہ کرنا چاہیئے جو آگے مذکور ہے۔ دو فریق مت بنو۔

آیت ۸۹ :- یہ منافق لوگ تو کفر پر ایسے جمے ہوئے ہیں کہ خود تو اسلام کیا قبول کریں گے وُہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی مثل کافر ہو کر ان کے برابر ہو جاؤ۔ سو اب تم کو چاہیئے کہ وہ جب تک ایمان نہ لائیں اور اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے پاس نہ چلے آئیں، اس وقت تک ان کو اپنا دوست نہ بناؤ نہ اپنے کسی کام میں ان کو دخل دینے کا موقع دو اور نہ ان کی حمایت اور اعانت کرو۔ اور اگر وہ لوگ ایمان اور ہجرت کو قبول نہ کریں تو گو ان کو قید کرو اور قتل کرو، جہاں بھی ان پر قابو پاؤ یہی سلوک کرو۔ اور ان سے اجتناب کلی رکھو اور کوئی تعلق نہ رکھو۔

آیت ۹۰ :- اس ظاہری میل جول کے باعث انہیں قید اور قتل سے مت بچاؤ مگر دو صورتیں اس سے مستثنےٰ ہیں : ایک تو یہ کہ جن لوگوں سے تمہاری صلح ہے ان سے ان کا بھی معاہدہ اور مصالحت ہو تو وُہ بھی صلح میں داخل ہو گئے۔ دوسری صورت یہ کہ جو لوگ لڑائی سے عاجز ہو کر تم سے صُلح کریں اور اس بات کا عہد کریں کہ نہ اپنی قوم کے طرف دار ہو کر تم سے لڑیں گے اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں گے اور اس عہد پر قائم بھی رہیں تو ایسے لوگوں سے بھی مت لڑو۔ اور ان کی مصالحت کو قبول کر لو اور اللہ تعالےٰ کا احسان سمجھ کہ یہ لوگ تمہاری لڑائی سے باز آ گئے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر جری اور غالب تر کر دیتا۔

آیت ۹۱، پھر بعض اور لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم سے عہد کر جاتے ہیں کہ تم سے نہ لڑیں گے نہ اپنی قوم سے، تاکہ تم سے اور اپنی قوم دونوں سے امن میں رہیں، لیکن اس عہد پر قائم نہیں رہتے۔ بلکہ جب اپنی قوم کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ان کے مددگار ہو جاتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں سے تم درگزر مت کرو۔ تمہارے ہاتھ تو صریح حجت آ گئی کہ انہوں نے اپنا عہد خود توڑ ڈالا۔

لہ مَنْ اَضَلَّ اللّٰہ: جب انہوں نے گمراہی کا قصد کر لیا تو اللہ کا قانونِ تکوینی

لہ نقشہ ماجدی صفحہ ۲۰۶-۲۰۷

Marfat.com

یہ ہے کہ ہر عزم فعل پر فعل پیدا کر دیا جاتا ہے اور اسی قاعدہ کے مطابق مشیت تکوینی نے انہیں گمراہی میں ڈال دیا تو اب انہیں نکال کون سکتا ہے؟ اللہ کی طرف اِضلال (گمراہ کرنا) کی نسبت منافقین کے کفر اختیاری کے نتیجہ کے طور پر ہے. تو کیا اب تم ان کے قلوب میں زبردستی ایمان ڈال سکو گے جو سرے سے ایمان کا ارادہ ہی نہیں کرتے؟

حَتّٰی یُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: یہ ہجرت کی فرضیت کا دور تھا اور اس وقت ہجرت بھی اقرار شہادتین کی طرح لازمی تھی۔ پس وہ لوگ جو ہجرت نہ کرتے ان سے مسلمانوں جیسا برتاؤ نہ رکھا جا سکتا تھا یہی دوستی کے جواز کی شرط تھی۔ یوں تو تجارت وغیرہ کی غرض سے کافر بھی دارالاسلام میں آ سکتے تھے، لیکن دنیا کے قانون کے لحاظ سے اسلام کا ثبوت اقرارِ شہادتین اور ہجرت فی سبیل اللہ سے ہی مل سکتا تھا۔ رہی تصدیق قلب، سو وہ صرف عند اللہ ہے، بندوں کے ذمہ اس کی تفتیش نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ محارب کافروں اور مشرکوں میں داخل ہو گئے۔ اور ہجرت نہ کی تو وہ بھی انہی کے حکم میں داخل ہو گئے۔ ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو گا جو دیگر محارب دشمنوں سے ہوتا ہے

آیت ۹۱ میں فتنہ کے لفظ سے مراد قتالِ مسلمین ہے۔ اصل فتنہ تو کفر و شرک اور فسادِ عقیدہ ہی ہے مگر یہاں اس سے مُراد مسلمانوں سے لڑنا ہے جیسا کہ آیت کا سیاق بتاتا ہے (بعض آیات میں فتنہ سے مراد مسلمانوں کو ایمان و اسلام سے روکنا اور مسلمان ہو جانے کے باعث اذیت دینا بھی ہوتا ہے جیسے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (مؤلف) سُلطان کا معنیٰ اس آیت میں گرفت اور دلیل ہے جیسا کہ دوسری آیات میں بھی یہی معنیٰ ہوتا ہے (تسلط و اقتدار بھی دراصل سلطان (دلیل) ہی کی ایک قسم ہے۔ مؤلف)

[1] ابن ابی حاتم کی روایت کے مطابق عبد اللہ بن عباسؓ کے نزدیک ان آیات میں بیان کئے جانے والے منافق وہ لوگ ہیں، جو مکہ میں تھے بظاہر تو وہ کلمہ گو تھے مگر مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرتے تھے اور ہجرت بھی نہیں کی تھی۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عہد و معاہدہ اور حلف کی

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ۵ صفحہ ۷۷۰۷۶

Marfat.com

کتنی اہمیت ہے۔ اگر کوئی قوم مسلمانوں کے حلیفوں سے صلح و معاہدہ کرے تو مسلمانوں پر بھی اس حلف و معاہدہ کی پابندی لازم ہو جاتی ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ حکم سورہ توبہ کی ابتدائی آیات کے نزول سے منسوخ ہو گیا تھا، اور لوگوں کو صرف چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی۔

[1] جاؤکم حصرت صدورھم: ان سے مراد سراقہؓ بن مالک کی قوم بنو مدلج ہے، حسب روایت حدیث و سیرت حضورؐ نے ان کے معاہدہ کو قبول فرما لیا تھا۔

[2] اس موقع پر ایک بات کو واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ نہ صرف اس مقام کو بلکہ قرآن مجید کے اُن تمام مقامات کو سمجھنے میں آدمی ٹھوکر کھائے گا جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمان کو منافقین میں شمار کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ایک چھوٹا سا خطہ ملکِ عرب میں ایسا بہم پہنچ گیا جہاں ایک مومن کے لئے اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن تھا۔ تو حکمِ عام دے دیا گیا کہ جہاں جہاں جس جس علاقے میں جس جس قبیلے میں اہل ایمان کفار سے دبے ہوئے ہیں اور اسلامی زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں رکھتے وہاں سے وہ ہجرت کریں۔ اور مدینہ کے دارالاسلام میں آجائیں اس وقت جو لوگ ہجرت کی قدرت رکھتے تھے۔ اور پھر صرف اس لئے اُٹھ کر نہ آئے کہ انہیں اپنے گھر بار، اعزا و اقربا، اور اپنے مفادات اسلام کی نسبت زیادہ عزیز تھے، وہ سب منافق قرار دیئے گئے۔ مگر جو لوگ حقیقت میں بالکل مجبور تھے ان کو مستضعفین میں شمار کیا تھا جیسے کہ آگے رکوع ۱۴ میں آرہا ہے (اور آیت ۵۷ میں صراحتہً گزر چکا ہے۔ مؤلف)

اب ظاہر ہے کہ دارالکفر کے رہنے والے کسی مسلمان کو محض ہجرت نہ کرنے پر منافق صرف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جبکہ دارالاسلام کی طرف سے ایسے تمام مسلمانوں کو یا تو دعوتِ عام ہو یا کم از کم اُس نے اُن کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھے ہوں۔ اس صورت میں بلاشبہ وُہ سب مسلمان منافق قرار پائیں گے جو دارالکفر کو دارالاسلام بنانے کی کوئی سعی بھی نہ کر رہے ہوں اور استطاعت کے باوجود ہجرت بھی نہ کریں۔ لیکن اگر دارالاسلام کی طرف سے نہ تو دعوت ہی ہو اور نہ اس نے اپنے دروازے

---

[1] تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۱۴۔ [2] تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۳۷۹-۳۸۲

Marfat.com

ہی مہاجرین پر کھلے رکھے ہوں، تو اس صورت میں تو صرف ہجرت نہ کرنا کسی شخص کو منافق نہ بنا دے گا۔ بلکہ وہ منافق صرف اس وقت کہلائے گا جبکہ کوئی کام فی الواقعہ منافقانہ کرے (جیسا کہ اس آیت ۸۸ میں مولانا کے نزدیک ان لوگوں کا معاملہ زیر بحث ہے جو مسلمان ہونے کے باوجود مکہ سے ہجرت نہ کرتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف کارروائیوں میں کفار کا ساتھ دیتے تھے۔ مؤلف) آگے آیت ۸۹ کا حکم قتل و حبس انہی لوگوں کے بارے میں ہے۔ کیونکہ انہوں نے محارب کافروں کا ساتھ دیا تھا۔ آیت ۹۰ میں قتل و اخذ کے حکم سے استثناء ہے۔ جبکہ ایسے لوگ کسی معاہد قوم کے ہاں چلے جائیں۔ کیونکہ معاہدے کے باعث ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔

[1] علامہ احمد مصطفےٰ المراغی اور علامہ سید رشید رضا صاحب المنار بھی اس آیت ۸۸ کی تفسیر میں ہمارے استاذ الاستاذ حضرت شیخ الہندؒ کے ہمنوا ہیں کہ یہ آیت دراصل ان مشرکوں کے بارے میں ہے جو مسلمانوں سے مودّت و ولاء ظاہر کرتے تھے۔ وہ دراصل مسلمانوں کی قوت سے خائف تھے۔ اس لئے اُن سے میل جول رکھ کر اپنی اور اپنے اہل قوم کی جان و مال کو بچانا چاہتے تھے۔ لیکن اگر خدانخواستہ مسلمانوں میں کمزوری پاتے تو ان کے خلاف ہو جاتے اور علانیہ عداوت پر اُتر آتے۔ ان کی ظاہری چاپلوسی اور محبّت و مودّت کی وجہ سے بعض مسلمان انہیں چونکہ اپنے اولیاء اور دوستوں میں شمار کرنا چاہتے تھے لہٰذا اس آیت میں انہیں منافقین کے لفظ سے یاد کیا گیا تاکہ مسلمانوں کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اَرْکَسَھُمْ، کا لفظ بولا ہے، گویا کہ وُہ سر کے بل الٹے ہو گئے ہیں اور اب اپنے مُنہ پر چل رہے ہیں جیسا کہ ایک آیت میں فرمایا ہے۔ اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِہٖٓ اَھْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ : کیونکہ ان کی فطرت بگڑ چکی ہے، ان کی بداعمالی ان کا احاطہ کر چکی ہے۔ اور وہ سراسر ضلالت میں سرگردان ہو رہے ہیں۔

جو شخص سُنن فطرت سے روگردانی اور ضلالت کے باعث طریق حق سے گمراہ ہو جائے اُسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے؟ حق کا تو صرف ایک ہی راستہ ہے جو صراطِ مستقیم ہے، مگر اس کے دائیں بائیں باطل اور ضلال کے لئے بے شمار

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۱۴، ۱۱۹، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۳۱۸، ۳۳۰

Marfat.com

چھوٹے چھوٹے راستے اور پگڈنڈیاں ہیں جو بھی راہِ حق کو چھوڑ کر اُن میں سے کسی پر ہولے گا وہ جتنا اُس راستے پر دُور تک چلا جائے گا اتنا ہی گمراہ ہوتا جائے گا:
وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ
اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کا معنیٰ اپنی مبارک اُنگلی سے لیکر کھینچ کر سمجھایا تھا کہ ایک سیدھا لمبا خط کھینچا جو سبیل اللہ تھا اور اُس کے اردگرد کئی اور خط کھینچ کر بتایا کہ یہ شیطان کے راستے ہیں جو پہلے سیدھے خط سے کسی صورت میں نہیں مل سکتے۔

فطرت کا سیدھا راستہ انسانی عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے۔ شیطانی راستے کج اور ٹیڑھے میڑھے ہیں جو عقلِ سلیم کے یکسر خلاف ہیں۔ راہِ حق سے اکثر جو چیز انسان کو ہٹاتی ہے وہ اندھی تقلید، شک و شبہ اور غرور ہے جن کی وجہ سے انسان پر عقل و فکر کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، نفع و ضرر سے وہ اندھا ہو جاتا ہے اور حق و باطل کے امتیاز سے بے بہرہ ہو جاتا ہے جب وہ اپنی عقل کو چھوڑ کر کچھ "بڑوں" اور آباؤ اجداد کے پیچھے ہو لیتا ہے اور ان کو اپنے سے زیادہ کامل العقل اور روشن دماغ جانتا ہے تو بس اپنی باگ ڈور شیاطین کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو اسے کفر و ضلالت اور شرک کی وادیوں میں بھٹکا دیتے ہیں۔

ان آیات کی رُو سے عصرِ تنزیل میں تین قسم کے لوگ تھے جن کے احکام یہاں بیان فرمائے گئے ہیں۔

۱۔ سلیم الفطرت لوگ جن کی رائے متعین تھی۔ انہوں نے اسلام و ایمان کی طرف سبقت کی اور نورِ اسلام سے منوّر ہو گئے

۲۔ "صلح پسند" لوگ جو نہ اِدھر تھے نہ اُدھر۔ جب تک ان سے عہد شکنی اور جانبداری نظر نہ آئے ان سے صلح و صفائی رکھنے کا حکم دیا گیا تاکہ مسلمانوں کے دشمن کم رہیں اور خواہ مخواہ لوگوں کو دشمن نہ بنایا جائے۔

۳ شرک و ضلالت میں کھبے ہوئے جو محارب دشمن تھے۔ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کی روایت کے مطابق سراقہ بن مالک مدلجی کی قوم پر حضورؐ نے خالد بن ولیدؓ کو چڑھائی کرنے کا حکم دیا (جنگ اُحد کے بعد) تو سراقہ نے حاضرِ خدمت ہو کر جنگ نہ کرنے اور الگ رہنے کا معاہدہ کرنا چاہا حضورؐ نے خالدؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ جاؤ اور ان کی شرطوں کے مطابق ان سے معاہدہ کر لو۔

Marfat.com

امام رازی نے فرمایا ہے کہ حضورؐ نے فتح مکہ سے قبل اسی قسم کا ایک معاہدہ ہلال ابن عویمر الاسلمی سے بھی کیا تھا۔

لہ مسند امام احمد اور صحیحین کی وہ روایات جن میں ان آیات کا شانِ نزول جنگ اُحد سے واپس پلٹ جانے والی عبداللہ بن اُبیّ رئیس المنافقین کی جماعت کو قرار دیا گیا ہے گو یہ روایات سند کے لحاظ سے زیادہ مضبوط ہیں مگر ہم ابن ابی حاتم کی روایت کو تاریخی لحاظ سے قوی ہونے کی بناء پر ترجیح دیتے ہیں کہ ان آیات میں بیان کئے جانے والے لوگ مکہ کے باشندے تھے نہ کہ مدینہ کے۔ یہ بات مُسلّم اور ثابت شُدہ ہے کہ منافقین مدینہ کے بارے میں قتال کا حکم نہیں اترا اور نہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قتال کیا ہے بلکہ بار بار کے اشتعال انگیز واقعات کے باوجود حضورؐ نے انہیں قتل بھی نہیں کیا۔ ان کے برخلاف ان کے بارے میں چشم پوشی کا رویہ مُسلّم تھا تاکہ مسلم معاشرہ انہیں خود اپنے میں سے نکال باہر کرے اور انہیں برداشت نہ کرے۔ ہاں ان کے بیرونی جھاڑ جھنکار مثلاً یہود مدینہ کو ضرور جلاوطن کیا گیا تھا پہلے مدینہ سے اور پھر جزیرۂ عربیہ سے بھی، کیونکہ یہی وہ خبیث لوگ تھے جو انہیں بھڑکاتے اور شرارت پر آمادہ کیا کرتے تھے۔ لیکن ان آیات میں ایک حتمی اور جازم حکم موجود ہے کہ اس طبقے کو قیدی بھی بنایا جائے اور جہاں یہ قابو میں آئیں انہیں قتل بھی کیا جائے اس سے قطعی اور لازمی طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین مدینہ کے علاوہ کوئی اور طبقہ ہے۔ اسی طرح حَتّٰی یُھَاجِرُوْا کا لفظ بھی یہی بتاتا ہے کہ یہ مدینہ کے باہر کے لوگ ہیں جن سے تعلقات اسلامیہ کی بنیاد ہجرت کو قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ فتح مکہ سے پہلے کا معاملہ ہے کیونکہ اس کے بعد مکہ بھی دارالاسلام ہو گیا تھا اور ہجرت منقطع ہو گئی تھی۔ اور اُس وقت ہجرت کا معنی یہ تھا کہ دارالکفر سے دارالاسلام کو نقلِ مکان کیا جائے۔ جماعتِ مسلمہ سے اپنے آپ کو جوڑا جائے اور اس کے نظام کو قبول کیا جائے۔ ورنہ دوسری صورت صرف کفر و نفاق کی ہی تھی۔ پس یہ لوگ وہی تھے جنہوں نے مکہ اور اس کے ماحول سے ہجرت نہ کی تھی اور بظاہر مسلمانوں سے تعلقات رکھنے اور زبانی دعویٰ اسلام کے باوجود کفار کا ساتھ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے بارے میں بعض کا یہ قول کہ وہ

لہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۱۸۰، ۱۸۹

Marfat.com

مسلمان ہیں باعث تعجب سمجھا گیا اور خطاب کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ الخ۔

ان آیات میں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ امّتِ مسلمہ کی بنیاد برادری اور خاندان کے روابط پر نہیں ہے، نہ خون اور قرابت کے تعلقات پر نہ وطن وجنس کے تعلقات پر اور نہ تجارت اور کاروبار کے اقتصادی ومعاشی تعلقات پر۔ بلکہ امّت کی بنیاد عقیدے پر اور اُس سے پھوٹنے والے اجتماعی نظام پر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ دارالاسلام والے ایمانداروں اور بلا مجبوری دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں کے درمیان "ولایت" کو منقطع قرار دیا گیا ہے۔ دارالحرب والے جب تک ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہ چلے آئیں ان میں اور دارالاسلام کے باشندوں میں کوئی "موالات" نہیں ہے۔ پھر ہجرت میں بھی فی سبیل اللہ کی شرط لگی ہوئی ہے۔ یعنی ہجرت صرف عقیدہ کی خاطر ہو کسی اور غرض اور کسی دنیوی منافع کی خاطر نہ ہو۔

اسلام غیر مسلموں کو ترکِ کفر اور قبولِ اسلام پر ہرگز مجبور نہیں کرتا۔ اگر وہ اسلامی نظام کے وفادار بن کر اس کے ماتحت بھی رہیں تو انہیں نہ صرف کفر پر باقی رہنے بلکہ کفر کے اظہار اور شعائر وعبادات کی کھلی آزادی بھی دیتا ہے۔ وہ اس معاملے میں اتنا روادار بلکہ فیاض ہے کہ آجکل کی نام نہاد سیکولر حکومتیں بھی اتنی روادار نہیں ہوتیں۔ مگر جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہوں، کلمۂ اسلام کو اختیار کر چکے ہوں، ان کے بارے میں وہ اتنا روادار نہیں بلکہ انہیں نظم وضبط کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ وہ انہیں ڈسپلن کو توڑنے، اسلامی صفوں میں اضطراب انتشار پیدا کرنے اور جماعتی نظم کو کمزور کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ پس وہ منافقین کے بارے میں شدید ہے، بالخصوص جو لوگ ہجرت نہیں کرتے اور غیر مسلموں کی مدد کرتے ہیں انہیں تو وہ بالکل برداشت نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ رواداری نہ ہوتی بلکہ کمزوری ہوتی۔ اسلام میں رواداری کی تو گنجائش ضرور ہے مگر کمزوری اور ضعف وبزدلی کی ہرگز نہیں۔ وہ ایک مضبوط عقیدہ اور ایک پختہ نظام ہے پختگی رواداری کے خلاف نہیں مگر بزدلی اور ضعف کے خلاف ضرور ہے۔

ان آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام حتی الوسع صلح وصفائی کا علمبردار ہے۔ جب تک صلح وصفائی اس کے بنیادی تصورات کے خلاف نہ پڑے وہ اس کا حامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی معاہد (ذمّی یا غیر ذمّی) کے ساتھ جا بسیں وہ انہیں بھی معاہد شمار کرتا ہے۔ اور جو لوگ بالکل غیر جانبدار ہو جائیں

Marfat.com

اُن سے بھی تعرّض نہیں کرتا۔ ہاں جو لوگ دعوتِ اسلامی کا راستہ روکیں، دشمنوں کی مدد کریں اسلامی نظام کے باغی ہوں، چاہے وہ مسلم ہی کیوں نہ کہلاتے ہوں انہیں وہ ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا

اور مسلمان کا کام نہیں کہ قتل کرے مسلمان کو

اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ

مگر غلطی سے اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو غلطی سے تو آزاد کرنا ہے

رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ

گردن ایک مسلمان کی اور خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو مگر

اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ

یہ کہ وہ معاف کر دیں پھر اگر مقتول تھا ایسی قوم میں سے جو تمہاری دشمن ہے

مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ

اور وہ جو مسلمان تھا تو آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی اور اگر وہ تھا ایسی قوم میں

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے تو خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو

وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ

اور آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھے دو ماہ

مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

کے مسلسل گناہ بخشوانے کو اللہ سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے

Marfat.com

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا

اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے پڑا رہیگا اسی میں

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت کی اور تیار کیا اس کے لیے بڑا عذاب

شرح الفاظ

مَا كَانَ : روا نہیں، یہ اُس کا کام نہیں خَطَـًٔا : یعنی بلا ارادہ۔ یہاں خَطَـًٔا کا لفظ تَعَمُّد : ارادہ کے مقابلے میں آیا ہے۔ فَتَحْرِيْرُ : آزاد کرنا، خلاصی کر دینا۔ رَقَبَةٍ : گردن۔ مراد شخص ہے دِيَةٌ : خوں بہا۔ مُسَلَّمَةٌ : سپرد کی ہوئی۔ یعنی مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دی جائے اَنْ يَّصَّدَّقُوْا : ان یتصدقوا وہ صدقہ کر دیں معاف کر دیں۔ معلوم ہوا کہ مقدمہ قتل بھی شرعاً قابل راضی نامہ ہے۔ مِيْثَاقٌ : معاہدہ، صلح و صفائی۔ مُتَتَابِعَيْنِ پے در پے، یعنی مسلسل اگر ایک دن کا بھی ناغہ ہو گیا تو تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ مُتَعَمِّدًا : ارادۃً جان بوجھ کر۔ خَالِدًا ہمیشہ رہنے والا، یہاں مراد ہے طویل عرصہ رہنے والا۔ کیونکہ بے شمار دلائل کتاب و سنّت سے گناہ گار مسلمانوں کا آخرکار بری ہو جانا ثابت ہے۔ غَضِبَ ناراض ہو گیا۔ لَعَنَهٗ اس پر لعنت کی، اسے اپنی رحمت سے دُور کر دیا۔ اَعَدَّ تیار کیا۔

[1] ان آیات میں مومنوں، معاہدوں اور ذمیّوں کے قتل کا عدمِ جواز بیان فرمایا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں عمد و خطاء سے جو فرق ہوتا ہے اسے واضح فرمایا گیا ہے۔ امام ابن جریرؒ نے عکرمہؒ سے ان آیات کا شانِ نزول یہ بیان کیا ہے کہ حارث بن یزید جو بنی عامر بن لُوَیّ میں سے تھا وہ ابو جہل کے ساتھ مل کر عیاش بن ابی ربیعہؓ کو اسلام لانے کی وجہ سے عذاب دیا کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ حارث رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے مدینہ کو روانہ ہوا تو مدینہ سے باہر عیاش نے اُسے حرّہ کے مقام پر دیکھ لیا اور تلوار سے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا گمان یہ تھا کہ حارث ابھی کافر ہے حالانکہ وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ پھر عیاش نے حضورؐ کی خدمت میں آکر واقعہ بیان کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں حضورؐ

[1] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۱۹

Marfat.com

نے یہ آیات پڑھ کر سنائیں اور عیاشؓ کو حکم دیا کہ ایک مومن غلام آزاد کرے۔
لہ آیت ۹۲: اس موقع پر قتل خطاء کے احکام بیان فرمائے جاتے ہیں اور یہ کہ کلمہ اسلام کہنے والے کو قتل کرنا گناہِ عظیم ہے۔ ہاں اگر غلطی سے مارا گیا تو مجبوری کی بات ہے اور اُس کے احکام یہ ہیں۔ قتل خطاء کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً غلطی سے مسلمان کو شکار سمجھ کر مار ڈالا، یا تیر، گولی شکار پر چلائی مگر چوک کر کسی مسلمان کو جا لگی۔ ایک صورت قتل خطا کی یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کافروں میں ہو اور اس کو کوئی مسلمان کافر سمجھ کر بوجہ لاعلمی قتل کر ڈالے اور یہاں اسی صورت کا بیان فرمانا مقصود ہے مجاہد کو یہ صورت اکثر پیش آجاتی ہے اور آیات سابقہ کے یہی مناسب ہے۔ گو قتل خطاء کی اور صورتوں کا بھی یہی حکم ہے۔ وہ صورتیں بھی اس میں آگئیں۔

اس آیت میں قتلِ خطاء کے دو احکام بیان فرمائے ہیں۔ ایک تو آزاد کرنا بردہ مسلمان کا اور اس کا مقدور نہ ہو تو دو ماہ کے متصل روزے رکھنا۔ یہ کفارہ ہے خدائے تعالیٰ کی جناب میں اپنی خطاء کا۔ دوسرے اس مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا، یہ اُن کا حق ہے اور ان کے معاف کرنے سے معاف بھی ہو سکتا۔ مگر کفارہ کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق تین صورتیں ہو سکتی ہیں، کیونکہ جس مسلمان کو غلطی سے قتل کیا اُس کے وارث مسلمان ہوں گے یا کافر اگر کافر ہیں تو اُن سے مصالحت ہے یا دشمنی۔ اوّل دونوں صورتوں میں مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا پڑے گا تیسری صورت میں خون بہا لازم نہ ہوگا اور کفارہ سب صورتوں میں ادا کرنا ہوگا۔ خون بہا حنفی فقہ کے مطابق تخمیناً دو ہزار سات سو چالیس روپے ہوتے ہیں۔ یہ روپیہ قاتل کی برادری کو تین برس میں متفرق طور پر مقتول کے وارثوں کو دینا ہوگا۔

آیت ۹۳: اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو غلطی سے نہیں بلکہ قصداً اور مسلمان معلوم کرنیکے بعد قتل کرے گا۔ تو اُس کے لئے آخرت میں جہنّم اور لعنت اور عذابِ عظیم ہے کفارہ سے اُس کی رہائی نہیں ہوگی۔ باقی رہی دنیوی سزا وہ قصاص ہے جو سورۂ بقرہ میں گزرا۔ جمہور علماء کے نزدیک خلود فی النار

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰، تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۸۷، ۸۳

Marfat.com

اُس کے لئے ہے جو مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے کیونکہ اُس کے کفر میں شک نہیں۔ یا خلود سے مراد یہ ہے کہ وہ مدّت دراز تک جہنّم میں رہے گا۔ یا یہ کہ وہ شخص مستحق تو اسی سزا کا ہے آگے اللہ مالک ہے جو چاہے کرے۔ واللہ اعلم۔

لہ شرک وغیرہ اعتقادی معصیتوں سے قطع نظر، عملی گناہوں میں انسان کے لئے سب سے بڑا گناہ قتل مومن ہے۔ اتنے بڑے گناہ کی جسارت ایک مومن سے بہ ثبات عقل و حواس بہت بعید ہے۔ ہاں غلطی اور دھوکے سے ہو جائے تو وہ الگ بات ہے۔ قتل جو خطاء نہ ہو اُس کی دو قسمیں ہیں ایک قتل عمد جس میں آلۂ قتل استعمال ہوا ہو۔ (۱) دوسرے قتل شبہ عمد جس میں آلۂ قتل استعمال نہ ہوا ہو۔ (۲) ان دونوں کے احکام میں کچھ اختلاف ہے۔ جو قتل کسی شرعی حجّت سے کیا جائے۔ مثلاً قصاص میں تو اسے قتل نہیں کہا جاتا۔ قتلِ خطاء کی دو قسمیں ہیں ایک غلطی قصد و ظن کی مثلاً دُور سے آدمی کو دیکھ کر شکار سمجھا اور مار ڈالا۔ یا آدمی ہونا تو پہچانا مگر مومن کو کافر حربی سمجھ کر مار دیا۔ دوسرے غلطی نفسِ عمل میں ہوئی مثلاً نشانہ لگایا جانور پر مگر جا پڑا آدمی پر۔

دیت کا مال مقتول کے وارثوں پر بقدر ان کے حصّہ میراث کے تقسیم ہوگا اگر وارث کوئی نہ ہو تو ان کا قائم مقام بیت المال ہے اور وہ اس میں جمع ہو گئی۔ دیت کی مقدار سنّت سے تو ایک ہزار اونٹ ثابت ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس پر قیاس کر کے ایک ہزار دینار شرعی یا دس ہزار درہم شرعی ٹھہرائی ہے لیکن جس طرح عراق و مصر و شام کے حالات عرب سے مختلف تھے اسی طرح ہمارے ہاں کے حالات خود ان ملکوں سے مختلف ہیں۔ لہٰذا دیت کی مقدار کو ہر ملک کے عرف کے ماتحت قاضی کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے گا مگر شرط یہ ہے کہ قاضی شرعی مقدار سے کم و بیش نہ کرے۔

مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ: اس صورت میں دیت نہیں آتی کیونکہ مقتول جب کافروں کے درمیان رہتا تھا تو اس کی دیت بھی کافروں ہی کے ہاتھ میں جاتی اور کافروں کے لئے مسلم کی میراث ممنوع ہے۔ جان اُس کی بہر حال بوجہ ایمان

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۰۸-۲۰۹، تفسیر حقانی ج ۳۔ صفحہ ۲۱۵-۲۱۷۔

۲ہ حدیث کی بعض روایات میں بعینہٖ یہی مقدار موجود ہے المراغی ج ۵ صفحہ ۱۲۱،

Marfat.com

کے محفوظ تھی لہٰذا کفارہ مقرر کیا گیا، لیکن دیت کا تعلق ایمان سے نہیں بلکہ اس کے مقام سے ہے۔ وہ دار اسلام سے باہر تھا لہٰذا دیت ساقط ہو گئی۔ اور اس کی ایک وجہ اس کا ہجرت نہ کرنا بھی ہے (قرطبی)

وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق: آیت کے اس حصہ میں غیر مسلم معاہد یا ذمی کے قتل خطاء کا بیان ہے۔ کفارہ اور دیت کے لحاظ سے غیر مسلم معاہد اور ذمی بھی ایک مسلمان کے برابر حق رکھتا ہے۔ (تفسیر کبیر، قرطبی، بیضاوی، مدارک) اس حکم سے پتہ چل گیا کہ ایک طرف تو اسلام انسانی جان کی حرمت کا کتنا خیال رکھتا ہے اور دوسری طرف معاہدے اور عقد ذمہ کا اس کی نگاہ میں کتنا احترام ہے۔ مؤلف۔

لہ توبۃ من اللہ: یعنی یہ جرمانہ نہیں بلکہ توبہ اور کفارہ ہے۔ جرمانہ میں ندامت و شرمساری اور اصلاح نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی بلکہ عموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے، اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کار خیر اور ادائے حقوق کے ذریعہ سے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو دے۔ اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے تاکہ وہ نہ صرف یہ گناہ معاف کر دے بلکہ آئندہ کے لئے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادہ سے بھی محفوظ رہے۔ کفارہ کے لغوی معنی ہیں چھپانے والی چیز۔ کسی کار خیر کو گناہ کا کفارہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نیکی اس گناہ پر چھا جاتی ہے۔ اور اسے ڈھانک لیتی ہے۔ جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔

لہ مومن کے قتل سے خود ایمان منع کرتا ہے، نفس پر تسلط اور ارادے پر حکومت و تصرف اسی ایمان کا ہے اور وہ یہ عظیم گناہ کرنے سے روکتا ہے ہاں خطا ہو جائے تو الگ بات ہے۔ خطاء میں فعل کا یا اس شخص کے قتل کا ارادہ نہیں ہوتا لہٰذا وہ مستثنیٰ ہے۔

مومن کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ایمانی حقوق کا شعور پیدا نہ کرے۔ یہ حقوق خدا کے بھی ہوتے ہیں اور بندوں کے بھی۔ دوسری قسم میں

لہ تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۸۳ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۱۲۰-۱۲۵، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۳۳۱-۳۴۵

Marfat.com

قصاص داخل ہے. کیونکہ اس میں قتل سے زجر و منع پایا جاتا ہے. اگر اسے ترک کر دیا جائے تو خون کے حقوق سے استہزاء ہوگا. اور یہ استہزاء اُمّت کے بہت بڑے حقوق توڑنے کا ہم معنی ہے. گویا ایسے شخص نے ایمان کے ارکان میں سے ایک رُکن گرا دیا. قرآن کا ارشاد اس بارے میں بالکل واضح اور صاف ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۝

قتلِ خطا پر سزا کی وجہ یہ ہے کہ خطا ہونے کے باوجود اس میں ایک گونہ سہل انگاری اور بے پروائی پائی جاتی ہے، یہی حال نسیان کا بھی ہے. پس ان میں ایسی صفت پائی جاتی ہے کہ مرتکب کو اللہ تعالیٰ سزا دیدے. غالباً اسی سبب سے ان پر عدمِ مواخذہ کی دعاء سکھائی گئی ہے: لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا (البقرۃ) اور قرآن سے یہ امر ثابت ہے کہ آدمؑ نے قصداً نہیں بلکہ نسیان سے غلطی کی تھی مگر پھر بھی اسے معصیت کا نام دیا گیا اور اُنہیں گرفت ہوئی. لیکن اللہ تعالیٰ نے حقوق اللہ میں خطاء و نسیان اور جبر پر گرفت نہ کرنے کا بالخصوص اس اُمّت پر فضل و کرم فرمایا ہے، جیسا کہ ابن ماجہ کی حدیث میں یہی الفاظ وارد ہیں۔

امام زہریؒ اور ابو حنیفہؒ نے اس آیت سے استدلال کر کے غیر مسلم معاہد اور ذمّی کی دیت بھی مسلمان کی دیت کے برابر قرار دی ہے، لیکن بعض دوسری روایات کی بناء پر امام احمد بن حنبلؒ نے ان کی دیت مسلمان سے نصف قرار دی ہے، گویا ان کے نزدیک اس آیت میں غیر مسلم کے قتلِ خطا کا ذکر نہیں ہے. مؤلف)

آیت سے تو معلوم ہوا کہ دیت قاتل کے ذمہ ہے مگر سنت نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ دیت قاتل کے عاقلہ (اس کے قریبی عصبات) کے ذمہ ہوگی اور بالاقساط وصول کی جائے گی. اس کی حکمت یہ ہے کہ رشتہ داروں کے درمیان باہمی ضمانت و ذمہ داری پیدا کی جائے. لیکن اگر وہ اس کی ادائیگی سے عاجز ہوں تو پھر دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی۔

مسلمان کی عمداً قتل کرنے والے کی توبہ کے بارے میں علمائے اسلام کی تین آراء ہیں۔

(۱) عبداللہ بن عباسؓ اور سلف کا ایک فریق اس کا قائل ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو گیا ہے اُن کا استدلال آیت ۹۳ کے علاوہ مسند احمد و نسائی اور بیہقی کی بعض روایات بھی ہیں جن میں قتلِ مومن عمداً کو

Marfat.com

بڑی تشدید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان حضرات کا یہ خیال ہے کہ حالتِ شرک میں اگر کسی نے بدکاری اور قتل کا ارتکاب کیا ہو اور پھر وہ شرک سے تائب ہو تو اس کے ضمن میں ان گناہوں سے بھی اُس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ گناہ حالتِ شرک کے ہیں اور ان کی شدت کا احساس اسے اس وقت نہ تھا۔ نیز وہ ان سے بڑے گناہ یعنی شرک کا شکار تھا۔ پس اسے ایک گونہ معذور سمجھا جائے گا۔

لیکن جو شخص ایمان دار ہو، توحید و رسالت پر ایمان رکھتا ہو اسے حرمتِ قتل کا احساس ہونا لازم تھا۔ کیونکہ اسے یہ تو معلوم ہی ہے کہ مومن اس کا بھائی اور مددگار ہے۔ پس اس کے بعد وہ قتل جیسے فعل کا ارتکاب کیسے کر سکے گا؟ اگر ایسا کرے گا تو گویا اس نے اسلام و ایمان کی توہین کی اور دین کے ستون کو گرا دیا۔

اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ مسلمانوں کا رابطہ اسلام و ایمان اس وقت کمزور پڑا جب کہ وُہ ایک دوسرے کے قتل پر اور جان و مال کی حرمت توڑنے پر دلیر ہو گئے، تو انہوں نے خدائی احکام پر اپنی شہوات و غضب کو ترجیح دی، اور جو لوگ ایسا کریں وہ اسی قابل ہیں کہ ہمیشہ جہنّم میں رہیں کیونکہ انہوں نے اپنی شہوات کو مسلمانوں کی مصلحت پر راجح کر دیا ہے، خدائی حدود پر جری اور دلیر ہو گئے ہیں اور شرع کی حرمت ان کے قلوب میں باقی نہیں رہی ابن عباسؓ اور بعض سلف کی اس رائے کو معتزلہ نے قبول کیا ہے، اور اپنے مشہور مذہب کو، کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر و خارج از اسلام ہے، اس سے خوب تقویّت دی ہے۔ علاّمہ زمخشریؒ نے کشاّف میں اس مقام پر ایک بڑا چھُبتا ہُوا سا نوٹ لکھا ہے۔

(۲) دوسرے فریق کی رائے یہ ہے کہ خلود سے مراد یہاں "مکثِ طویل ہے" دوام نہیں۔ کیونکہ قطعی نصوص بے حدّ و حساب موجود ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ گناہ گار ایماندار وں کا عذاب دائمی نہ ہو گا۔ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اس فعل کی جزا یہ ہے، یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ قاتل کو یہی جزا دے گا جیسا کہ ایک مقام پر فرمایا ہے کہ۔ جزآءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ "مِّثْلُھَا : اگر اس سے مراد یہ لیا جائے کہ ہر برائی کی جزا اسی جیسی دی جائے گی تو آگے اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ اس سے تعارض ہو جائے گا۔ حدیثِ مرفوع میں حضوؐر کا ارشاد اس سزا کے بارے میں ہے کہ اگر اللہ اس کی سزا دے تو وہ یہی ہے جو بیان ہوئی۔ ابن عباسؓ سے بھی اس آیت کی تفسیر میں بعینہٖ اسی

Marfat.com

قسم کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تم کسی شخص سے کہو کہ اگر تم نے فلاں کام کیا تو تمہاری سزا قتل و قید اور ضرب ہو گی۔ پھر اگر اسے معاف کر دو، یا سزا نرم کر دو تو اس میں کوئی جھوٹ اور خلافِ وعدہ چیز لازم نہیں آتی۔

(۳) تیسرا فریق عکرمہؒ اور ابن جریجؒ کا ہے، جنہوں نے فرمایا ہے کہ آیت میں جو سزا بیان ہوئی ہے یہ اس قاتل کی ہے جو اسے حلال جانے۔ ایسے شخص کا حکم بالاتفاق کفر و ارتداد ہے۔ گویا اس تیسرے فریق نے بھی اصولاً دوسرے فریق کی تائید کی ہے اور جمہورِ اہل حق کا یہی مذہب ہے۔

[1] اسلامی عقیدے اور اخوت کے ہوتے ہوئے یہ تصور دشوار ہے کہ ایک مسلم دوسرے مسلم کے قتل کا ارتکاب کرے گا، حدّ و قصاص کا معاملہ جداگانہ ہے۔ ہاں اگر خطا سے ایسا ہو جائے تو اس کے احکام یہاں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ مسلمان کے عمداً قتل کو قرآن نہایت بعید قرار دیتا ہے۔ ساری دنیا میں مسلمان کے خون کے برابر کوئی مادی چیز قیمتی نہیں ہے۔ ایک مسلم دوسرے مسلم کے ساتھ اختلاف میں یہاں تک جا ہی نہیں سکتا کہ اسے عمداً قتل کر ڈالے۔ کیونکہ ان کے اندر اسلام نے جو تعلق قائم کیا ہے وہ بڑا متین عمیق، ضخیم، اور معزز و محترم ہے۔ یہی باعث ہے کہ قتلِ عمد کی سزا نہایت شدید اور خوفناک الفاظ میں بیان ہوئی ہے یہ قتل فقط ایک جان کا قتل نہیں بلکہ عقیدے کا قتل ہے۔ اس گہرے رشتے کا قتل ہے جو اسلام نے اپنے ماننے والوں میں قائم کر دیا ہے۔ اسی رشتے نے قاتلوں اور دشمنوں کو باہم ملا دیا تھا اور ایک جان کر دیا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ

اے ایمان والو جب سفر کرو اللہ

سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى

کی راہ میں تو تحقیق کر لیا کرو اور مت کہو اس شخص کو جو تم سے

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۱۸۹-۱۹۲

Marfat.com

اَلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ

سلام علیک کرے کہ تو مسلمان نہیں تم چاہتے ہو اسباب

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ

دنیا کی زندگی کا سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں ہیں

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

تم بھی ایسے ہی تھے اس سے پہلے پھر اللہ نے تم پر فضل کیا

فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

سو اب تحقیق کر لو بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے

شرح الفاظ

ضَرَبْتُمْ: زمین میں چلنے کو ضَرَبَ فِی الْاَرْضِ کہتے ہیں، کیوں کہ چلنے والا زمین پر پاؤں مارتا ہے، لاٹھی ٹیکتا ہے یا اُس کی سواری کے پاؤں زمین پر پڑتے ہیں فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یعنی دشمنانِ دین سے جہاد و قتال کے لئے فَتَبَیَّنُوْا اچھی طرح تحقیق کر لو، جلد بازی مت کرو اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ یعنی تمہارا مُطیع و منقاد اور فرمانبردار ہو جائے اور تم سے قتال نہ کرے — اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا، دنیوی زندگی کا فانی و موجود سامان جسے نیک و بد سبھی استعمال کرتے ہیں مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ، یعنی رزق اور خدا

تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۱۲۵-۱۲۶ تفسیر ابن کثیر پارہ ۵ صفحہ ۸۳، ۸۵
تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۲۱۷-۲۱۸

Marfat.com

تعالےٰ کا فضلِ کبیر۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو قتلِ خطا کی اقسام میں سے ایک خاص قسم پر متنبہ فرمایا ہے جو اُس زمانے میں واقع ہو سکتا تھا (بلکہ ہوتا بھی تھا) کیوں کہ اسلام پھیل چکا تھا۔ اور عرب کا کوئی حصّہ نہ رہا تھا جس میں کوئی نہ کوئی شخص یا گروہ مسلمان نہ ہو چکا ہو۔ بعض علی الاعلان ابھی مصلحتاً مسلمان نہ ہوتے تھے مگر اسلام طرف کافی مائل تھے اور موقع کی تلاش میں تھے کہ کفر گڑھ سے نکل کر دارالاسلام میں مسلم جماعت سے جا ملیں۔ اس وقت جو لوگ کفار کی سرزمین میں جہاد و تجارت کے لئے جاتے تھے انہیں اکثر ایسے لوگ ملتے تھے۔ پچھلی آیات میں چونکہ کچھ غیر مسلموں اور جان بوجھ کر ہجرت نہ کرنیوالے مسلمانوں کا ذکر آچکا ہے لہذا اس آیت میں فرما دیا گیا کہ ہر وہ شخص جو دارالکفر میں پایا جائے اُسے کافر ہی نہ سمجھ لیا جائے۔ خوب تحقیق کرنی لازم ہے تاکہ جن لوگوں میں علامات اسلام پائی جائیں انہیں قتل و ضرب اور حبس و قید سے بچایا جا سکے۔ اسلام کی علامت ایک تو کلمۂ توحید ہے اور ایک مسلمانوں کا باہمی سلام ہے، جس کا ذکر پچھلی آیتوں میں ہو چکا ہے پس وہ شخص جس میں اسلام کی علامات پائی جائیں اُسے خواہ مخواہ کافر شمار نہ کر لیا جائے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ اگر ایمان ان جیسے لوگوں کے دلوں میں ابھی راسخ نہیں ہوا تو ان سے مس ضرور کر چکا ہو، اور کچھ عرصہ بعد وہ اچھے ایمان دار ہو جانے والے ہیں۔

اسی لئے اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں تحقیقات کا حکم دیا ہے، اور مدّعی اسلام کے مسلم ہونے سے انکار کرنے کو روکا ہے۔ سلام کہنا فقط ایک علامتِ اسلام ہے پس اسے قبول کر لیا جائے گا اور بلاوجہ سلام کہنے والوں کو کافر نہیں ٹھیرایا جائے گا یہیں سے معلوم ہو گیا کہ جب سلام کا نتیجہ یہ ہے تو اقرارِ شہادتین کا معاملہ تو اس سے کہیں اہم تر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ایسے لوگوں کو کافر شمار کرتا ہے وہ محض دنیوی متاع کی خاطر ایسا کرتا ہے۔ یعنی چاہتا ہے کہ ایسے مدّعی اسلام لوگوں کو مباح الدم اور مباح المال قرار دے کر ان کا مال بطور مالِ غنیمت حاصل کر لے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایمان داروں

Marfat.com

کو ارشاد کیا ہے کہ اپنے دلوں سے اس قسم کے وہم و گمان اور باطل خیالات کو نکال دیں اپنے باطن کو اچھی طرح ٹٹول لیں اور اپنے وہم و گمان کی بنیاد محض خواہشاتِ نفس پر نہ رکھیں۔ اور جب تک کوئی پختہ ثبوت اس کے خلاف نہ مل جائے اسکی توجہ کو قبول کر لیں۔

اس آیت کے نشانِ نزول میں بہت سی روایات آئی ہیں۔ ان میں ایک روایت بخاری، ترمذی اور حاکم وغیرہ ہم نے ابنِ عباس سے بیان کی ہے کہ بنی سُلیم کا ایک شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا۔ وہ بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہانک رہا تھا۔ پس اس نے ان حضرات کو سلام کہا۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص نے محض جان بچانے اور محفوظ رہنے کی خاطر سلام کہا ہے، سو انہوں نے اس کا پیچھا کیا، اسے قتل کر ڈالا اور ریوڑ کر ہانک کر حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

امام احمد اور طبرانی وغیرہ نے عبداللہ بن ابی حدآد الاسلمی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم مسلمانوں کی ایک جماعت کو کہیں روانہ فرمایا۔ اس جماعت میں ابو قتادہؓ اور محلم بن جثامہ بھی تھے عامر بن الاضبط الاشجعی ہمارے پاس سے گزرا اور ہمیں سلام کہا لیکن محلّم نے اس پر حملہ کر کے اُسے قتل کر ڈالا۔ جب ہم واپس حضورؐ کی خدمت میں آئے تو یہ واقعہ آپؐ کو بتایا اس پر یہ آیت نازل ہوئی"، اور مُسند بزّار میں عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت یوں درج کی گئی ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریّہ روانہ فرمایا جس میں مقداد بن الاسودؓ بھی تھے۔ جب یہ لوگ منزل مقصود پر پہنچے تو دیکھا کہ جس قوم کا قصد تھا وہ تو کہیں ادھر اُدھر منتشر ہو گئی ہے مگر ایک شخص وہاں موجود تھا جس کے پاس بہت سامال تھا۔ اُس شخص نے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ کہا مگر مقدادؓ نے پھر بھی اسے قتل کر دیا۔ حضورؐ کو جب یہ اطلاع ملی تو فرمایا کہ کل کو تو لَا اِلٰهَ اِلَّا کے بارے میں کیا جواب دیگا؟ اور اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس بات سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ نزول آیت سے قبل کئی واقعات پیش آئے ہوں اور حضورؐ نے ان سب مواقع پر یہ آیت پڑھی ہو تو لوگوں نے ہر واقعہ کو سبب نزول قرار دے دیا ہو۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ متعدد واقعات

Marfat.com

کے پیش آچکنے کے بعد آیت اتری ہو اور ہر واقعہ کو سبب نزول سمجھا گیا ہو۔ بعض دفعہ بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ کسی واقعہ میں بطور استشہاد بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی اس آیت کو اس موقع یا واقعہ پر بھی چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ مؤلف)

احقر مؤلف رقمطراز ہے کہ حضرات صحابہؓ کو ایسے لوگوں کے بارے میں غلط فہمی کا پیدا ہونا یا بلا تحقیق ان کا انہیں مار ڈالنا کچھ بھی قابل تعجب نہیں۔ اس زمانے میں ایسے واقعات عام تھے پھر متعدد بار مسلمانوں کو دھوکہ بھی دیا گیا تھا۔ مبلغین کو لے جا کر فریب سے قتل و قید کرنے کے واقعات متعدد بار پیش آئے تھے۔ راستے پُر امن نہ تھے اور یہ واقعات دارالاسلام کے باہر کے ہیں جن علاقوں میں یہ واقعات پیش آئے تھے "وہ غیروں کے علاقے تھے"، پھر بھی اسلام نے صبر و حوصلہ اور تحقیق کا حکم دیا جو اس کی فطری اور متوازن تعلیم کے عین موافق ہے۔ واللہ اعلم[1] حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج کو ایک قوم جہاد کیلئے بھیجا۔ اس قوم میں ایک شخص مسلمان تھا جو اپنا مال و اسباب اور مواشی اُن میں سے نکال کر علیحدہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے مسلمانوں کو دیکھ کر السلام علیکم کہا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کافر ہے اپنی جان و مال کو بچانے کی غرض سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے اس لیے اُس کو مار ڈالا اور اُس کے مواشی اور مال و اسباب سب لے لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ و تاکید فرمائی گئی کہ جب تم جہاد و قتال کے لئے سفر کرو تو تحقیق سے کام لو، بے سمجھے بوجھے کام مت کرو۔ جو تمہارے سامنے اسلام ظاہر کرے اس کے مسلمان ہونیکا ہرگز انکار مت کرو۔ اللہ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں، ایسے حقیر سامان کے لئے متاعِ دنیوی پر نظر نہ رکھنی چاہیئے۔

فرمایا ہے کہ پہلے تم بھی ایسے ہی تھے۔ یعنی اسلام لانے سے قبل، زمانہ جاہلیت میں دنیا کی غرض سے ناحق خون کیا کرتے تھے۔ لیکن اب مسلمان ہو کر ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیئے بلکہ جس پر مسلمان ہونے کا احتمال بھی ہو تو اس کے قتل سے بچو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس سے پہلے شروع زمانۂ اسلام میں تم بھی کافروں کے شہر میں رہتے تھے تمہاری مستقل حکومت اور مستقل بود و باش نہ تھی جیسا اس حالت میں تمہارا اسلام

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۲۰

Marfat.com

معتبر سمجھا گیا اور تمہارے جان و مال کی حفاظت و رعایت کی گئی ایسا ہی اب تم کو بھی اس طرح کے مسلمانوں کی رعایت و حفاظت لازم ہے۔ بلا تحقیق ان کو قتل مت کرو، محض اللہ کے حکم کے موافق قتل کرو، اپنی کسی غرض کا اس میں بالکل دخل نہ ہو۔ احتیاط و غور سے کام کرنا چاہیئے۔

سلہ یہ تحقیق و احتیاط سفر و حضر دونوں میں واجب ہے۔ سفر جہاد کی قید آیت میں محض اس لئے ہے کہ نزول آیت سے قبل اتفاق سے ایسا سفرِ جہاد میں پیش آچکا تھا (قرطبی)، کسی شخص کے قتل سے دست کشی اس شخص کے مجرّد اظہارِ اسلام سے واجب ہو جاتی ہے اس کے باطن کی تفتیش ہرگز تمہارے ذمّہ نہیں۔ فقہاء اسلام کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ جان و مال کو محفوظ کر دینے والی چیز کلمۂ شہادت ہے۔ کافر غیر معاہد بھی اگر اسے پڑھے گا تو مسلم کے لئے اس پر تلوار اٹھانا حرام ہو جائیگا۔ (قرطبی)۔ ایمان صرف قول کا نام نہیں بلکہ تصدیق قلب بھی اس کی حقیقت میں داخل ہے، مگر بندوں کے پاس علم کا کوئی ذریعہ بجز لفظ و قول کے نہیں (قرطبی)

مسلمانوں سے فرمایا گیا ہے کہ آخر تم پر بھی تو ایک دور ایسا گزر چکا ہے کہ تمہارے اسلام و ایمان کا ثبوت بجز تلفظِ کلمہ اور دعوئ زبانی کے اور کچھ بھی نہ تھا تمہارے اخلاص قلب اور تمہارے حسنِ اعمال کی شہادت تو بہت بعد کو پیش آئی (کشاف) اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ زندیق کی توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ (تفسیر کبیر) امام ابو حنیفہؒ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ بچوں کا اسلام بھی قبول ہے کیونکہ آیت عام ہے اور اس میں بالغ و نابالغ کا کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ (تفسیر کبیر) اور منافقین کو بھی باوجود ان میں سے کئی ایک کا نفاق کھل جانے کے جس چیز نے قتل و حبس سے بچایا وہ یہی تلفظِ کلمۂ ایمان ہے۔

سلہ ابتدائے اسلام میں "السلام علیکم" کا لفظ مسلمانوں کے لئے شعار و علامت کی حیثیت رکھتا تھا، اور ایک مسلمان دوسرے کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمہارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں۔ میرے پاس تمہارے لئے امن و سلامتی اور عافیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا نہ تم مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔ جس طرح

سلہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۰۹ سلہ تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۸۴، ۳۸۵

Marfat.com

فوج میں ایک لفظ شعار PASSWORD کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے استعمال کرتے ہیں تاکہ مخالف فوج سے ممیّز ہوں اسی طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں بطور شعار مقرر کیا گیا تھا۔ خصوصیّت کے ساتھ اُس زمانہ میں اس شعار کی اہمیّت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اُس وقت عرب کے نومسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔

لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آجاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو اپنا مسلمان ہونا جتانے کے لئے سلام کہتا یا کلمہ پڑھتا تھا مگر مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوتا تھا کہ یہ دراصل کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے۔ اس لئے بسا اوقات وہ اسے قتل کر بیٹھے تھے اور اس کی چیزیں بطور غنیمت لوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی، مگر اس قسم کے واقعات پیش آتے ہی رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس پیچیدگی کا حل کیا تو یہ آیت نازل فرمائی جس میں ظاہر پر مدار رکھنے اور کلمہ و سلام کا اعتبار کر لینے کا حکم دیا گیا۔ کیونکہ اس طرح اگر کوئی کافر حیلے سے بچ جائے تو یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ایک واقعی مسلمان کو غلط فہمی میں مار ڈالا جائے (قتلِ مسلم کا معاملہ تو ویسے ہی بڑا شدید ہے جیسا کہ اوپر گزرا۔ مؤلف)

اس آیت میں یہ بھی عبرت وارشاد ہے۔ کہ اہل قبلہ کو محض اختلاف رائے کی بناء پر کافر ٹھہرانا سخت قسم کی غلطی ہے۔ ایک مسلمان محض اٹکل سے اس کی جرات نہیں کر سکتا۔ ہم کوئی اسلام و ایمان کے ٹھیکہ دار نہیں۔ جب تک واضح دلیل کسی کے کفر وارتداد کی نہ ہو محض فقہی و کلامی اختلاف کی بناء پر کسی تکفیر کرنا بہت بڑی جرات وجسارت کا کام ہے۔

انسانی جان و مال کا احترام اسلام میں اس قدر اہم ہے۔ کہ جو شخص ہمیں سلام کہہ دے بظاہر مطیع و منقاد ہو جائے، اہل معاہدہ یا اہل ذمہ میں سے ہو اُس کا قتل جائز نہیں۔ اسلام دنیوی مال و متاع کی خاطر قتل و فساد سے روکتا ہے۔ اور محض تعدّی، بغاوت اور زیادتی کا مقابلہ کرنے یا حق و اصلاح کو قائم کرنے کی خاطر ہی اس کی اجازت دیتا ہے۔ ایک طرف اسلام کی یہ تعلیم رکھو اور دوسری طرف موجودہ دور کی مہذّب (اور اسلام کے خلاف

لہ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۲۸، تفسیر المنار ج ۵ ص ۲۴۵-۲۵۰

Marfat.com

زہریلا اور معاندانہ پروپیگنڈا کرنے والی) حکومت کا رویّہ دیکھو کہ کس طرح حیلے بہانے اور دھوکے فریب سے فساد اور قتل و غارت کو روا رکھتی ہیں۔ لڑائی کا مقصد محض لوٹ مار اور فتح و غلبہ قرار دیتی ہیں، اور جو مضبوط اور طاقت ور نظر آئے صرف اسی کے معاہدے کا احترام کرتی ہیں۔

اس آیت نے مالِ دنیا کا لالچ مسلمانوں کے دل سے جھاڑ دیا ہے۔ اور فیصلے میں بے احتیاطی اور سرعت سے منع فرما دیا ہے۔ مسلمان کا جہاد و قتال محض "فی سبیل اللہ" ہے۔ لہٰذا مال و دولت کا لالچ اس کے کسی حساب میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ طمع و رعونت اور بے احتیاطی زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، اب اسلام میں اسے کیونکر روا رکھا جا سکتا تھا!

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

برابر نہیں بیٹھ رہنے والے مسلمان

غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ

جن کو کوئی عذر نہیں اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں اللہ کی راہ

اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ

میں اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ نے بڑھا دیا

الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى

لڑنے والوں کا اپنے مال اور اپنی جان سے

الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ

بیٹھ رہنے والوں پر درجہ اور ہر ایک سے وعدہ کیا اللہ نے بھلائی

وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا

کا اور زیادہ کیا اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں سے اجر

عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً

عظیم میں جو کہ درجے ہیں اللہ کی طرف سے اور بخشش ہے

Marfat.com

ع ۱۳ ع ۱۰ وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

اور رحمت ہے اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

شرح الفاظ

الضرر: بیماری اور وہ اسباب عجز و مجبوری جن کی بناء کوئی شخص جہاد و قتال سے عاجز رہتا ہے۔ مثلاً نابینا ہونا، لنگڑا ہونا وغیرہ۔ الحسنیٰ بہترین جزاء و ثواب یعنی جنت و رضا الٰہی۔

ان آیات میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی فضیلت و عظمت بیان فرمائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے۔ کہ اس راہ پر چل پڑنا ہی فوزِ عظیم ہے۔ ایسے شخص کو جو اس مقصد عظیم کے لئے نکلے اُن تمام چیزوں سے بچنا چاہیئے جو اس میں خلل انداز ہوں۔ روایات میں ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر سے قصداً پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق اُتری تھی۔ کعب بن مالکؓ، مرارہؓ بن ربیع اور ہلالؓ بن امیہؓ ایسے ہی حضرات تھے۔ لیکن اس غزوہ میں قتال فرضِ عین نہ تھا (جیسا کہ غزوۂ تبوک میں تھا) لہٰذا صرف یہ فرمایا گیا کہ ان لوگوں کو ایک بہت بڑی فضیلت سے محرومی ہوئی ہے۔ پھر جب کچھ حضرات، جن میں یہ تین حضرات مشہور ہیں، غزوۂ تبوک سے بھی رہ گئے تو شدید تعاقب ہوا اور سخت سزا دی گئی۔ ایک عرصہ کی آزمائش و ابتلاء کے بعد ان کی توبہ کا اعلان ہوا۔ اسی توبہ کی بناء پر سورۂ براءۃ کا نام توبہ ہوا۔ دیکھو ہماری تفسیر سورۂ توبہ مطبوعہ علمی کتاب[1]

اس سے پہلے مسلمان کو نادانستگی اور چوک سے قتل کر دینے پر عتاب اور تنبیہ فرمائی تھی۔ اس لئے احتمال تھا کہ کوئی جہاد کرنے سے رُک جائے۔ کیونکہ مجاہدین کو ایسی صورت پیش آ ہی جاتی ہے۔ اس لئے مجاہدین کی فضیلت بیان فرما کر جہاد کی ترغیب دلائی گئی۔ خلاصہ ان آیات کا یہ ہے۔ کہ لنگڑے، لنجے، اندھے، بیمار اور معذور لوگوں کو تو جہاد کرنے کا حکم نہیں باقی سب مسلمانوں میں جہاد کرنے والوں کے بڑے درجے ہیں جو جہاد نہ کرنے والوں کے لئے نہیں۔ اگرچہ جنتی وہ بھی ہیں جو جہاد نہیں کرتے اس سے معلوم ہو گیا کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے فرض عین نہیں۔ یعنی اگر مسلمانوں کی کافی مقدار اور ضرورت کے موافق جماعت جہاد کرتی رہے۔ تو جہاد نہ کرنے والوں پر گناہ نہیں۔ ورنہ سب گنہ گار ہوں گے۔ حق تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ جہاد کرنے والوں کے بارہ میں اجر و مغفرت اور رحمت و فضل کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اسے پورا فرمائے گا۔ یا یہ کہ اگر مجاہد کے ہاتھ سے نادانستگی میں کوئی مسلمان قتل ہو گیا۔ تو حق تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ اس اندیشے کی وجہ سے جہاد سے مت رکو

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۲۱ / تفسیر حقانی ج ۲ صفحہ ۲۱۸۔

Marfat.com

حضرت استاذ الاستاذ نے فرضیت جہاد پر جو مختصراً کلام فرمایا ہے۔ یہ عام حالات کے متعلق ہے۔ جب غیروں کا حملہ ہو جائے، اسلامی سرحدیں خطرہ میں پڑ جائیں۔ تو جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ مسئلہ کی تفصیل سورہ توبہ و انفال میں موجود ہے۔ اور ہمارے فقہاء نے اس پر مفصل و مدلل گفتگو فرمائی ہے۔ کچھ بحث ہم نے اپنی تفسیر سورۂ توبہ میں کی ہے۔ مؤلف)

۱؎ فرقۂ شیعہ نے ان آیات سے یہ استدلال کیا ہے۔ کہ ان سے حضرت علیؓ کی فضیلت حضرت ابوبکرؓ پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت علیؓ نے جہاد و قتال حضرت ابوبکرؓ سے کہیں زیادہ کیا ہے۔ اور اس کو آیت میں معیارِ فضیلت قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ استدلال باطل ہے۔ اگر صرف قتل کفار ہی معیار فضیلت ہوتا تو بقول امام رازیؒ حضرت علیؓ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل و اشرف ہوتے، حالانکہ اس کے قائل شیعہ بھی نہیں۔ معلوم ہوا کہ افضلیت کلی کے اجزاء اور بھی متعدد ہیں، مثلاً تبلیغ دین میں مصروفیت، اقامت احکام و استحکام ملت میں مشغولیت وغیرہما۔ اور ان سارے امور میں حضرت صدیق اکبرؓ ٹھیک اپنے آقا و سردارؐ کے نقشِ قدم پہ چلنے والے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے جلیل القدر صحابہ بڑی تعداد میں آپ ہی کی سعی و تبلیغ سے ایمان لائے اور پھر یہ بھی ہے۔ کہ حضرت علیؓ کے مجاہدانہ جوہر مدنیہ میں آکر چمکے جبکہ اسلام کو ایک گونہ غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ برخلاف اس کے ابوبکر صدیقؓ نے دین کی گرانبہا خدمات اس وقت سے انجام دینا شروع کی تھیں۔ جبکہ ملت اسلامیہ نہایت ہی ضعف و پستی میں تھی اور اُمت ہر طرف سے نرغۂ اعداء میں محصور تھی۔ (تفسیر کبیر)

آیت کا بیان تو یقیناً میدانِ جہاد میں جانے والوں اور میدانِ جنگ سے رہ جانے والوں ہی کے لئے ہے۔ لیکن لفظِ جہاد کو قتال کے معنی میں مخصوص و محدود کر دینا صحیح نہیں۔ بلکہ نصرتِ دین کی ہر سعی و فکر اس کے اندر آجاتی ہے۔ (حضورؐ کے زمانے میں وہ کون سا اہم میدانِ جنگ ہے۔ جس میں ابوبکر صدیقؓ اپنے محترم آقاؐ کے ساتھ حاضر نہ تھے؟ بلکہ میدانِ جنگ میں بھی جو قرب انہیں نصیب تھا۔ وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ پھر غزوۂ تبوک میں لشکر کا سب سے بڑا جھنڈا صدیقؓ کے ہاتھ میں تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد انہوں نے مرتدین و منکرین زکوٰۃ اور مدعیانِ نبوت کا قلع قمع کرنے میں جو جوش و خروش اور ہمت و جرأت دکھائی وہ صرف انہی کا حصہ تھی۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود کچھ لوگوں نے اس عظیم انسان کی شان گھٹانے کی جسارت کی! میدانِ جنگ میں صرف لڑنا ہی اہم کام نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری اور اہم جنگی تدبیریں ہوتی ہیں۔ جنگ کو پہلے نقشوں میں فتح کیا

۱؎ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۰۔

Marfat.com

جاتا ہے۔ تب کہیں جاکر اصل عمل کا وقت آتا ہے۔ ابوبکر صدیق رضؓ کی یہ مہارت و قابلیت ان کے دورِ خلافت کی تدابیر سے ظاہر و باہر ہے۔ اس جانی جہاد کے ساتھ انہیں مالی جہاد کی جو توفیق ملی وہ تو بے نظیر و بے مثال تھی۔ مؤلف)

لہ صحیح بخاری میں ہے۔ کہ جب آیت ۹۵ اتری تو پہلے اس میں غیر اولی الضرر کے الفاظ نہ تھے۔ آپؐ حسب معمول کاتب وحی زید بن ثابت رضؓ کو یہ آیت لکھوا رہے تھے۔ اسی حالت میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (نابینا صحابی) حاضر ہو گئے۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ اس آیت نے جو مجاہدین و غیر مجاہدین کا فرق بتایا ہے، میں تو معذور نابینا ہوں۔ لہٰذا میں جہاد کا ثواب کیسے لے سکتا ہوں؟ اور اس میں کوئی استثناء نہیں اس پہ الفاظ غیر اولی الضرر نازل ہوئے جن سے معذوروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ بعض اور روایات میں ہے کہ حضرت زیدؓ اپنے ساتھ قلم دوات اور اونٹ کی چوڑی ہڈی لکھنے کو لائے تھے اور اس وقت حضورؐ کی ران مبارک ان کی ران پہ تھی (بالکل پاس پاس بیٹھے تھے۔ اور جس طرح بھرے میں ہو جاتا ہے۔ حضورؐ کے جسم اطہر کا کچھ حصہ حضرت زیدؓ کی ران پہ تھا! مؤلف) حضرت زیدؓ کا بیان ہے۔ کہ صرف اتنے سے اتصال سے مجھ پہ وحی کا اتنا بوجھ پڑا کہ قریب تھا۔ میری ران شکستہ ہو جائے میں نے اتنی بوجھل چیز کبھی نہیں دیکھی۔ (یہ تو حضورؐ ہی کا دل گردہ تھا۔ کہ وحی کے بوجھ کو بفضلِ خدا برداشت کر جاتے تھے، پھر بھی شدید سردی کے دنوں میں بھی پیشانی مبارک پہ پسینے کے سفید قطرے موتیوں کی طرح جھلکنے لگتے اور جب وحی کی کیفیت جاتی رہتی تو پیشانی سے پسینہ صاف کرنے لگتے تھے! مؤلف)

عبداللہ بن عباس رضؓ کا بیان ہے۔ کہ اس آیت میں بدر میں شامل ہونے والوں اور نہ شامل ہونے والوں کا ذکر ہے۔

لہ مجاہدین کے ایمانی درجات بھی بلند ہیں جن کے تحت وجان و مال کو راہ خدا میں صرف کرتے ہیں۔ انہی درجات پہ آخرت کے درجات مبنی ہیں جو بے حد و حساب ہیں مغفرۃ جس کا یہاں ذکر ہے۔ اس سے مراد ان کے بعض گناہوں سے مغفرت ہے۔ جن کا کفارہ جہاد و قتال ہی ہو سکتا ہے۔ اور رحمت سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ خاص فضل و احسان ہے۔ جو وہ درجات و مغفرت کے علاوہ انہیں عطا فرمائے گا۔ حدیث صحیح میں ہے۔ کہ حضورؐ جب تبوک سے واپسی پہ مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تمہارے ساتھ ہر عمل میں شریک رہے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ کیا مدینہ میں بیٹھے بیٹھے انہیں یہ سب کچھ مل گیا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ ہاں! انہیں عذرؐ نے روک رکھا تھا۔ (ان کے جسم تمہارے

لہ تفسیر ابن کثیر پ ۵ صفحہ ۸۵ لہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۱۹۷-۱۹۸

Marfat.com

[1] ان آیات نے نزولِ قرآن کے وقت کی اسلامی سوسائٹی کا حال جہاد اور قعود کے نقطۂ نظر سے بیان کیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ معاشرہ کے بعض عناصر میں جہاد و قتال کی جانب سے کچھ تراخی اور ڈھیل پائی جاتی تھی۔ کچھ لوگ مالی قربانیوں میں اتنا حصہ نہیں لیتے تھے۔ جتنا ان کے لئے ضروری تھا۔ لیکن حکم اور قاعدہ جو یہاں بیان فرمایا گیا ہے وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ راہ حق میں جانی و مالی قربانی کرنے والے ایسا نہ کرنے والوں سے بہتر اور برتر ہیں۔ معذور اس سے مستثنےٰ ہیں۔

ایک صحیح حدیث میں حضورؐ کا ارشاد مذکور ہے۔ کہ جنت میں سو درجے ہیں۔ ہر دو کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے۔ جتنا زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ ہے۔ اور اعلیٰ ترین درجہ راہِ خدا میں جانی و مالی جہاد کرنے والوں کے لئے ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ کہ جس شخص نے خدا کی راہ میں ایک تیر چلایا اُسے ایک درجہ مل گیا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ درجہ سے کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ وہ تمہارے گھر کی دہلیز اور سیڑھی نہیں بلکہ نہایت بلند درجہ ہے، اتنا بلند کہ ہر دو درجوں کے درمیان سو سال کی مسافت ہے۔

آج جبکہ جدید انکشافات نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ کائنات میں کروں کے مابین فاصلے کس قدر ہیں۔ اور بعض ستاروں کی روشنی دوسرے تک روشنی کے سینکڑوں سالوں میں جا کر پہنچتی ہے۔ ہم حضورؐ کے ان ارشادات کو کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ وہ حضرات جن کے سامنے اس قسم کی سہولتیں نہ تھیں۔ وہ صرف حضورؐ کے ارشاد پر آمَنَّا وَصَدَّقْنَا: کہتے تھے درحقیقت ان کے ایمان کی مضبوطی بے حد و حساب ہے!

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ

وہ لوگ کہ ان کی جان نکالتے ہیں فرشتے اس حالت میں کہ وہ بُرا کر رہے ہیں اپنا

قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی

وہ فرشتے ان سے کہتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم بے بس تھے

الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا

اس ملک میں فرشتے کہتے ہیں کہ کیا نہ تھی خدا کی زمین کشادہ، جو تم چلے جاتے وطن چھوڑ

---

[1] تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۲۵۰-۲۵۲

Marfat.com

فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾

کر وہاں؟ سو ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ اور وہ بہت بری جگہ پہنچے

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ

مگر جو ہیں بے بس مردوں اور عورتوں

وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا

اور بچوں میں سے جو نہیں کر سکتے کوئی تدبیر اور نہ

يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ

جانتے ہیں کہیں کا راستہ سو ایسوں کو امید ہے کہ اللہ

٩٩ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا

معاف کرے اور اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ

اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں پاتے گا اس کے مقابلہ میں

مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ

جگہ بہت اور کشائش اور جو کوئی نکلے اپنے

بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ

گھر سے ہجرت کر کے اللہ اور رسول کی طرف پھر

يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى

آ پکڑے اس کو موت تو مقرر ہو چکا اس کا ثواب اللہ

Marfat.com

اللّٰہِ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع ۱۱ ۱۴

کے ہاں اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

شرح الفاظ

تَوَفّٰھُمُ : تَوَفّٰی : کا معنی ہے۔ کسی چیز کو پورا پورا اخذ کر لینا۔ اور اس آیت میں اس سے مراد ملائکہ کا لوگوں کی قبض ارواح کرنا ہے۔ مَاْوٰھُمْ :۔ اُن کا ٹھکانا، اُن کا مسکن مُرٰغَمًا : لوٹنے کی جگہ مُرٰغَمًا : ہجرت کی جگہ اور ایسا ٹھکانا جس میں ان کو خیر و عافیت اور وسعت ملے گی۔ اور اس سے دشمنوں کی ناک خاک آلود ہو جائے گی۔ وہ ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ :۔ اس کا اجر خدا کے ہاں واجب ہو گیا۔ یہاں وقوع بمعنیٰ وجوب ہے۔ یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں۔

پچھلی آیتوں میں بلا عذر بیٹھ رہنے والوں پر مجاہدین اسلام کی فضیلت کا ذکر تھا۔ زیر تفسیر آیات میں ان لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جو نصرتِ دین سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ اور ساکن و قاعد ہو کر متواتر اسی حال میں رہتے ہیں۔ پھر اپنا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ ہم تو کفر کی سرزمین میں بستے ہیں۔ ہمیں کفار نے جبراً خدمتِ حق اور نصرت دین سے روک رکھا تھا۔ ہم ان کفار کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کے ارشاد کے مطابق وہ درحقیقت غیر معذور ہیں۔ کیونکہ جن حالات کا انہیں سامنا تھا۔ ان کا فرض یہ تھا۔ کہ دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کر جاتے اور اہل ایمان کی جماعت میں جا ملتے تاکہ انہیں عزت و شرکت حاصل ہو جاتی۔ پس دراصل یہ اپنے وطن کے محبّ ہیں نہ کہ اسلام کے کوہ وہیں پڑے ہیں۔ اپنے اہل و عیال اور دوستوں میں پُرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ اصل میں ان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ حق میں کمزور ہیں۔ وہ معذور نہیں انہوں نے ہجرت کو ترک کر کے اپنے آپ کو اُن دنیوی بھلائیوں سے بھی محروم کر لیا ہے۔ جو دار الاسلام کی طرف دوسرے ہجرت کرنے والوں کو حاصل ہو چکی تھیں۔ یوں

۱؎ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۳۱ ۔ ۱۳۲،

Marfat.com

ان کی دنیا برباد ہوئی پھر اُنہوں نے اقامتِ حق اور اعلائے کلمۃ الدین کی جد وجہد کو ترک کر کے آخرت کا خسارہ بھی حاصل کر لیا ہے۔

اپنی جانوں پر ان کا یہ ظلم ہے کہ اذیّت کے خوف سے حق پر عمل کرنا ترک کر چکے ہیں، اور ایسے لوگ اپنے باطل پرست قرابت داروں کے نزدیک بھی کوئی قدر و قیمت اور عزّت و احترام نہیں رکھتے کیونکہ عزت و احترام تو کردار سے ہوتا ہے۔ جو ان کے ہاں مفقود ہے۔ باطل پرست بیشک اہل حق کے دشمن ہیں۔ مگر ان کے دلوں کی گہرائیوں میں ان کی قربانیوں اور کردار کی عظمت موجود ہے۔

یہ اور اسی قسم کے کچھ باطل حیلے بہانے اور جھوٹے عذر ہیں۔ جو ہمارے زمانے میں بدعت پرستوں اور اہل باطل کا ساتھ دینے والوں نے تراش لئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم باطل پرستوں کی مُدارات کر کے ان کی اذیّت سے بچنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ عُذر نہایت بودا اور غیر معتبر ہے۔ کیونکہ اس عُذر سے اقامتِ حق کا فریضہ ان کے کندھوں سے اُتر نہیں جاتا۔ واجب تو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں اذیّت اٹھا کر حق کو قائم کرنے کی جدّ و جہد کی جائے۔ اگر ایک وطن میں ایسا نہ ہو سکے۔ تو ہجرت کر کے ایسے مقام کو وطن بنایا جائے۔ جہاں یہ فریضہ ادا ہو سکے۔

ابن المنذرؒ اور ابن جریرؒ طبری نے عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ کہ اس آیت کے نزول کا سبب اہل مکّہ میں سے کچھ لوگ ہیں جو اسلام تو لا چکے تھے مگر اُسے پوشیدہ رکھتے تھے۔ مشرکوں نے جنگ بدر میں انہیں اپنے ساتھ مکّہ سے نکالا اور ان میں سے بعض میدان میں قتل ہو گئے۔ مسلمان آپس میں کہنے لگے کہ وہ لوگ تو مسلمان تھے۔ اور انہیں جبراً میدان میں لایا گیا تھا۔ لہٰذا ان کے لئے استغفار کرنا چاہیئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ مسلمانوں نے انہیں لکھ کر مکّہ میں کچھ باقی رہ جانے والے لوگوں کو پہنچا دیا اور انہیں بتا دیا کہ وہ غیر معذور ہیں۔ پس وہ ہجرت کے ارادے سے نکلے مگر مشرکوں نے پیچھے سے جا لیا۔ جب پکڑے گئے تو واپس مکّہ لوٹ گئے۔ اس پر یہ آیت اُتری: مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ سو مسلمانوں نے یہ بھی لکھ کر انہیں مکّہ بھیج دی۔ اس پر وہ بہت غمگین ہوئے تو یہ آیت اُتری: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا الخ تو مسلمانوں نے یہ بھی لکھ کر انہیں بھیج دی۔ تب آخر کار وہ وہاں سے آخری بار نکلے اور مشرک انہیں روکنے کو آئے، بعض بچ کر نکل آئے اور بعض قتل ہو گئے۔

Marfat.com

[1] بعض مسلمان ایسے بھی ہیں جو کہ دل سے تو سچے مسلمان ہیں مگر کافروں کی حکومت میں رہتے ہیں۔ اور اُن سے مغلوب ہیں اور کافروں کے خوف سے اسلامی باتوں کو کھل کر نہیں کر سکتے نہ حکمِ جہاد کی تعمیل کر سکتے ہیں۔ سو اُن پر فرض ہے کہ وہاں سے ہجرت کریں۔ اس رکوع میں اسی کا ذکر ہے۔ آیت ۹۷ کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اُوپر ظلم کرتے ہیں۔ یعنی کافروں کے ساتھ مل کر رہے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے تو فرشتے مرنے کے وقت اُن سے پوچھتے ہیں۔ کہ تم کس دین پر تھے۔؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمان تھے مگر بوجہ ضعف و کمزوری کے دین کی باتیں نہ کر سکتے تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ کی زمین تو بہت وسیع تھی تم یہ تو کر سکتے تھے۔ کہ وہاں سے ہجرت کر جاتے سو الیسوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ البتہ جو لوگ واقعی ضعیف ہیں اور عورتیں اور بچے کہ نہ وہ ہجرت کی تدبیر کر سکتے ہیں۔ نہ ان کو کوئی ہجرت کا راستہ معلوم ہے۔ وہ قابلِ معافی ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ مسلمان جس ملک میں کھلا نہ رہ سکے وہاں سے ہجرت فرض ہے۔ اور سوائے ان لوگوں کے جو بالکل معذور ہیں اور بے بس ہیں۔ اور کسی کو وہاں پڑے رہنے کی اجازت نہیں (حضرت استاذ الاستاذ رحمۃ اللہ کے ارشاد کا مطلب تو واضح ہے۔ مگر اس میں کچھ تفصیل بھی ہے۔ اگر کوئی دوسرا ایسا ملک موجود ہو جہاں جا کر شعائرِ اسلام کی ادائیگی ممکن ہو تو وہاں ہجرت کر جانا جائز و افضل ہے۔ بشرطیکہ وہ ملک ان مہاجروں کو لینے کو تیار ہو۔ اور اگر "دار الاسلام" موجود ہو تو دار الکفر کے مسلمانوں پر حسبِ تفصیل سابق ہجرت فرض ہے یہاں بھی یہی شرط ہے۔ کہ وہاں گنجائش اور آمادگی موجود ہو۔ دار الاسلام کے مسلمانوں پر اپنے دروازے ان مسلمانوں پر کھولنا فرض ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو خدا کے ہاں مجرم ہوں گے۔ اگر خدانخواستہ کوئی بھی ایسی جگہ نہ ہو جہاں دار الکفر کے مسلمان جا سکیں تو پھر وہ معذور ہیں۔ لیکن حالات کو بدلنے کی کوشش ان پر حسبِ مقدور فرض ہے۔ تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ مؤلف)

آیت ۱۰۰ میں ہجرت کی ترغیب ہے اور مہاجرین کو تسلی دی جاتی ہے۔ یعنی جو شخص اللہ کے واسطے ہجرت کرے گا اور اپنا وطن چھوڑے گا۔ تو اس کو رہنے کے لئے بہت جگہ ملے گی۔ اور اُس کی روزی اور معیشت میں فراخی ہو گی۔ تو ہجرت کرنے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۲۱، تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۱-۲۱۲، تفسیر ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۹۷-۹۸، تفسیر حقانی ج ۲ صفحہ ۲۱۹-۲۲۰،

Marfat.com

میں اس سے مت ڈرو کہ کہاں رہیں گے۔ اور کیا کھائیں گے۔ اور یہ بھی خطرہ نہ کرو کہ شائد راستہ میں موت آجائے تو اِدھر کے رہیں گے اور نہ اُدھر کے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی ہجرت کا پورا ثواب ملے گا۔ اور موت تو اپنے وقت پر آنی ہے۔ اُس مقدّر وقت سے پہلے آ ہی نہیں سکتی۔

ان آیات کے نزول کے وقت ہجرت کی فرضیّت اس لئے تھی کہ منکرین کی ایذاء و مزاحمت سے محفوظ رہ کر مسلمان حکومت الٰہی کے اندر رہیں اور اپنے ہاں قانونِ الٰہی کا نفاذ کر سکیں۔ جب لشکرِ اسلام کو کافی قوت حاصل ہو گئی اور منکرین کی مزاحمت کا زور ٹوٹ گیا۔ تو ہجرت فرض نہ رہی۔ مگر اب بھی جب کہیں اور جب کبھی وہ اسباب ہجرت پائے جائیں اُس وقت وہاں سے ہجرت فرض ہو جائے گی۔ چنانچہ فقہا لکھتے ہیں کہ جب ایک ملک میں رہ کر فرائضِ دین پوری طرح ادا نہ ہو سکتے ہوں۔ اور یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا ملک موجود ہے۔ جہاں فرائضِ دین ادا ہو سکتے ہیں۔ تو پہلے سے دوسرے کو ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔ (تفسیر مدارک احکام القرآن، الجصاص الرازی رح)

ہر ایسا سفر جو رضائے الٰہی کے لئے ہو مثلاً سفرِ حج، طلبِ علمِ دین کا سفر، تبلیغ دین کے لئے سفر وغیرہ وہ سب اجر کے لحاظ سے سفرِ ہجرت کے حکم میں داخل ہیں (مدارک)

لہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اس کے لئے نظامِ کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظامِ کفر کو نظامِ اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے۔ دوسری صورت یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے۔ اور اس معصیت کے لئے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں جہاں ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں ہے۔ تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا جنگل بھی ایسا نہیں ہے۔ جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو اور احکامِ کفر کی اطاعت۔

لہ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۳۸۷-۳۸۸۔

Marfat.com

سے بچا رہے ؟
لا ھجرۃ بعد الفتح والی حدیث سے مراد ہجرت مدنیہ کا اختتام ہے۔ نہ کہ ہمیشہ کے لئے ہجرت ہی کا نسخ۔ جب مکہ فتح ہو کر دار الاسلام بن گیا اور پورا عرب اسلام کے زیر نگیں آگیا تو ہر جگہ امن تھا اور شعائر اسلام علانیہ ادا ہو سکتے تھے۔ لہٰذا اُس وقت کی ہجرت کو بھی ختم کر دیا گیا۔ مگر جب بھی مکہ جیسے حالات پیدا ہوں گے ہجرت از سر نو فرض ہو جائے گی۔

[1] امام ابن جریر طبریؒ نے آیت ۱۰۰ کے متعلق سعید بن جبیرؓ سے نقل کیا ہے۔ کہ یہ آیت جندبؓ بن ضمرہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اسے اللہ کا یہ ارشاد پہنچ چکا تھا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ؟ کیونکہ حضورؐ نے یہ آیت مکہ کے مسلمانوں کو لکھوا کر بھیج دی تھی۔ مگر امرِ ہجرت کی اہمیت کے پیش نظر اپنے بیٹوں سے کہنے لگا کہ میری چارپائی اٹھالو اور مجھے مکہ سے لے کر نکل چلو۔ میں اُن کمزوروں میں سے نہیں ہوں جو کوئی تدبیر (حیلہ) نہ کر سکیں اور جنہیں ہجرت کا کوئی راستہ بھی نہ ملے۔ میں آج کی رات مکہ میں نہیں ٹھہرنا چاہتا۔ بیٹے اسے اٹھا کر مدنیہ کو لے کر چل پڑے۔ وہ بہت بوڑھا تو تھا ہی مقام تنعیم میں جا کر اس کی وفات ہو گئی۔ یہ جگہ مدنیہ کے قریب واقع ہے۔ جب موت کا وقت آیا تو وہ اپنا داہنا ہاتھ بائیں پر مارتا اور کہتا جاتا تھا۔ کہ اے اللہ یہ دایاں ہاتھ تیرے لئے اور بایاں تیرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔ میں تیری بیعت اُن شرطوں پر کرتا ہوں جن پر تیرا رسولؐ لوگوں سے بیعت لیا کرتا ہے۔ جب اس کی موت کی خبر صحابہؓ کو پہنچی تو انہوں نے جندبؓ کے بیٹوں کو تسلی و تسکین کی خاطر کہا کہ تمہارا باپ مدنیہ میں ہی فوت ہوا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ومن یخرج من بیتہ مھاجرا الی اس واقعہ کے علاوہ اور بھی اس کے سبب نزول میں مروی ہیں۔

بیہقی نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص حج کے ارادے سے نکلا اور راستے میں مر گیا۔ تو اس کے لئے حج کا ثواب لکھا گیا اور جو شخص عمرہ کرنے کو نکلا اور راہ میں مر گیا۔ تو اس کے لئے عمرہ کا اجر

---

[1] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۲۵-۱۲۶، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۳۵۲-۳۶۲،

Marfat.com

لکھا گیا اور جو شخص جہاد کو اپنے گھر سے نکلا اور مر گیا۔ تو اس کے لئے قیامت تک غازی کا اجر لکھا گیا۔ ابتدائے اسلام میں ہجرت کے مشروع ہونے کے تین اسباب تھے۔

(ا) اعدائے اسلام کی مخالفت اور ان کا مسلمانوں کو اسلام کی خاطر فتنہ میں مبتلا کرنا اور شعائر دین کی ادائیگی سے روکنا۔

(ب) احکام دین کا حصول یعنی مشرکوں کی ایذا رسانی اور رکاوٹ کے باعث داعیوں اور مبلغوں کا ہر جگہ بھیجنا دشوار تھا۔ اور اطراف کے مسلمان احکام دین سے بے خبر تھے لہٰذا ان پر ہجرت فرض کر دی گئی تاکہ وہ مرکز اسلام میں آکر اسلام سیکھ سکیں آج بھی ہر وہ آبادی جہاں احکام دین کو سکھانے اور قائم کرنے والے موجود نہ ہوں وہاں کے مسلمانوں پر دوسروں علاقوں میں جاکر علم دین کا حاصل کرنا فرض ہے۔

(ج) دعوت اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے احکام و حدود کو قائم کرنے کے لئے ایک اسلامی حکومت کا قیام مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے۔ جب ایسی حکومت قائم ہو جائے تو ہر حملہ آور طاقت سے اس کا دفاع کرنا، اس کو مضبوط اور طاقت ور بنانا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا سب مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ ورنہ وہ دین کی کمزوری اور اس میں مداخلت کا سبب بنیں گے۔ ایسی حکومت کی مضبوطی کے لئے ہجرت بھی ایک سبب ہے۔

فتح مکہ کے بعد یہ اسباب زائل ہو گئے تھے، لوگ فوج در فوج دین خداوندی میں آداخل ہوئے تھے۔ اور حضورؐ نے اطراف و جوانب میں اسلام کے داعی و مبلغ بھیج دیئے تھے۔ جو بلا مزاحمت یہ کام کرنے لگے تھے۔ اس لئے حضورؐ نے ارشاد فرمادیا تھا۔ کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔

اوپر کے تین اسباب میں سے کوئی سبب اگر آج بھی پایا جائے تو ہجرت فرض ہو جاتی ہے۔

لہ ان آیات میں "قاعدین" کے ایک دوسرے گروہ کا بیان ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں ان کے مالی و دنیوی مصالح ہجرت سے روکتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو قربانی پر آمادہ ہو کر ہجرت کر سکتے تھے۔ مگر اس راہ کی مشکلات نے اُس سے باز رکھا تھا۔ وہ

لہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۲۰۲-۲۰۷

Marfat.com

دیکھ رہے تھے۔ کہ مشرکین مکہ کسی مہاجر کو مال اسباب ساتھ نہیں لے جانے دیتے اور مزاحمت کرتے ہیں۔ حضورؐ اور اکثر صحابہؓ کے ہجرت کر جانے کے بعد اُن باقی رہ جانے والوں پر مشرکین کی اذیت کا ہاتھ پہلے سے بھی زیادہ کھل گیا تھا۔ اس کے کچھ اور اسباب بھی تھے۔ مثلاً جنگ بدر میں کفار کی شکست فاش، شام کی تجارت کا راستہ غیر محفوظ ہو جانا بلکہ تقریباً بند ہو جانا، اسلام کا اطراف و جوانب میں پھیلتے جانا اور اس کی طاقت و شوکت کی روز افزوں فراوانی وغیرہ۔ مشرکوں نے کمزور بقیہ مسلمانوں کو سخت ایذاء پہنچائی۔ بعض کو دین سے پھیر دیا، بعض سے کلماتِ کفر کہلوائے اور انہیں اپنی عباداتِ شرکیہ میں شامل کیا۔ دارالاسلام کے قائم ہو چکنے سے پہلے تو ان چیزوں (خوف جان سے بظاہر اظہار کفر) کا جواز سمجھ میں آتا تھا۔ مگر اس کے بعد اس کی گنجائش غیر مقبول تھی۔ ان لوگوں کا فرض تھا کہ ایسے حالات میں ہجرت کر جائیں۔ ہاں جو فی الاصل معذور و مجبور تھے۔ اُن کا معاملہ دوسرا تھا۔

اللہ تعالےٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کی دینی غیرت کو ابھارا ہے۔ اور ان کے قلوب میں غیرت مردانگی، عزت نفس، اسباب دنیوی کا مقابلہ کرنے اور حرص و ہوا اور لالچ سے کنارہ کش ہو جانے کے شریف و رفیع جذبات پیدا کئے ہیں۔ ہجرت نہ کرنے والوں کو اپنے اوپر ظلم کرنے والا قرار دیا ہے۔ اور چیزوں سے اگر صرفِ نظر کر لیا جائے تو یہ ایک لفظ ہی دلوں میں کپکپی پیدا کرنے اور انہیں ہلا دینے کے لئے کافی ہے۔ پھر موت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور ملائکہ کی ان سے جو گفتگو نقل فرمائی ہے۔ اس کی موجودگی میں تو بزدلی اور ضعف و مذلت کا نام و نشان تک مٹ جانا چاہیئے۔ اس کا کہنا یہ ہے۔ کہ ایسے لوگ زندگی بھر جس موت میں مبتلا رہے تھے۔ اس کی تلخی جسم سے روح کی جدائی کے وقت اور بھی سخت ہو جاتی ہے۔ پھر اس مذلت پر قناعت کی آخر کیا وجہ ہے؟ اس سے قرآن نے صرف ان لوگوں کو مستثنےٰ قرار دیا ہے۔ جو فی الواقع ضعف و عذر کا شکار تھے۔ اور ان کی تدابیر منقطع ہو چکی تھیں۔

اس نے صرف اتنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ نفوسِ انسانی کی تربیت و اصلاح کے لئے نہایت صراحت و فصاحت سے بتا دیا ہے۔ کہ جو لوگ دروازہ کھٹکھٹائیں ان کے لئے کھولا جاتا ہے۔ جو راہِ حق کے لئے مخطرات و مہالک کو لبیک کہنے پر اتر آئیں وہ ضائع نہیں کئے جاتے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو اُس نے فی سبیل اللہ کا لفظ بول کر واضح کیا ہے۔ کہ یہ قربانی بہت عظیم اور مخلصانہ ہے۔ پھر

Marfat.com

اس نے بتایا ہے۔ کہ ایسی ہجرت کرنے والا مُلک خدا کو بہت وسیع پائے گا۔ تدابیر و وسائل اس کے سامنے کھول دیئے جائیں گے، نجات وحیات اور رزق وکشائش کا اس سے بر ملا وعدہ کیا جاتا ہے۔ زندگی کی حرص، مال ومتاع کی محبّت، وسائل حیات کی پابندیاں اور مستقبل کے خطرات ہی تو وہ چیزیں ہیں۔ جو انسان کو اقدام سے روکتی ہیں۔ لیکن جب اسے بتا دیا گیا کہ جدّوجہد کرنے والے کے سامنے یہ چیزیں حاضر کر دی جائیں گی۔ تو اس کے دل میں سکون و طمانیّت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ قربانی کے لیے بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔

۳۱۲

لیکن ایک کھٹک پھر بھی باقی رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ موت کا تو پتہ نہیں کب آجائے بعض دفعہ اثنائے راہ میں بھی آگھیرتی ہے۔ تو کیا اس صورت میں عمل کرنے والے کی محنت ضائع ہو گئی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نہیں۔ خدا کے ہاں عزم ونیّت اور خلوص وارادہ کا وزن ہے۔ جب یہ چیزیں پائی گئیں تو موت پہ تو خدا کے سوا کسی کا اختیار نہیں۔ پس اثنائے راہ میں مرجانے والا مہاجر ہی شمار ہو گا۔ اور وہ اس کے علاوہ بھی خدا کی مغفرت ورحمت کا حق دار کہلائے گا۔ پس یہ ایک ایسا سودا ہے جس میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ

اور جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر گناہ نہیں

جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۚ اِنْ

کہ کچھ کم کرو نماز میں سے اگر

خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ اِنَّ

تم کو ڈر ہو کہ ستائیں گے تم کو کافر البتہ

الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۱۰۱﴾

کافر تمہارے صریح دشمن ہیں

Marfat.com

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ

اور جب تو ان میں موجود ہو پھر نماز میں کھڑا کرے

فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا

تو چاہیے کہ ایک جماعت ان کی کھڑی ہو تیرے ساتھ اور ساتھ لے لیں

اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ

اپنے ہتھیار پھر جب یہ سجدہ کریں تو ہٹ جائیں تمہارے

وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا

پاس سے اور آئے دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی

فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ

وہ نماز پڑھیں تیرے ساتھ اور ساتھ لے لیں اپنا بچاؤ

وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ

اور اپنے ہتھیار کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بے خبر ہو

عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ

اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر حملہ کریں

عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

یک بارگی اور تم پر کچھ گناہ نہیں

اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ

اگر تم کو تکلیف ہو مینہ سے یا تم

Marfat.com

مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا

بیمار ہو کہ اتار رکھو اپنے ہتھیار اور ساتھ لے لو

حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا

اپنا بچاؤ بے شک اللہ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب

مُّهِيْنًا ۝ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

ذلت کا پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو یاد کرو اللہ کو

قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ

کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے پھر جب خوف جاتا رہے تو درست کرو نماز

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝

بے شک نماز فرض ہے ایمانداروں پر اپنے مقررہ وقتوں میں

شرح الفاظ

لہ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ :۔ تم کہیں سفر کرو، کیونکہ مسافر زمین پر اپنے پاؤں مارتا ہے لاٹھی ٹیکتا ہے۔ یا اس کی سواری اپنے پاؤں سے اس پر چلتی ہے۔ تَقْصُرُوْا : اس کا مصدر قصر ہے۔ جو قصر سے ماخوذ ہے، قصر طول کے بالمقابل ہے۔ قصر کا معنیٰ ہے۔ کسی چیز کو چھوٹا (قصیر) اور مختصر کر دینا۔ جناح تنگی، حرج۔ دراصل یہ لفظ ایک عربی محاورے سے ماخوذ ہے، جب اونٹ پر نہایت ثقیل بوجھ لادا جائے حتیٰ کہ اس کی پسلیاں اس بوجھ سے ٹوٹ جائیں تو کہتے ہیں جُنِحَ الْبَعِيْرُ : (اونٹ کی پسلیاں ۔ جوانح ۔۔۔ ٹوٹ گئیں) يَفْتِنَكُمْ وہ تمہیں قتل و اذیت پہنچائیں اور تنگ کریں۔ فَاَقَمْتَ لَهُمُ : تو نماز کی تیاری کرے۔ اذان اور طہارت وغیرہ جو نماز کی تیاری

لہ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۲۷ - ۱۳۸،

Marfat.com

کے لئے ہوتا ہے۔ وہ بھی اقامت صلوٰۃ ہی ہے۔ اَسْلِحَتَهُمْ اُن کے ہتھیار اس کا واحد سلاح ہے۔ جو ہر آلۂ قتال پر بولا جاتا ہے، مثلاً تلوار، نیزہ، خنجر، توپ، گولہ، بندوق اور تیر وغیرہ۔ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ :۔ تم نماز کو ادا کرو اور تمام شرائط کی پابندی کرو۔ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا: مقررہ وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے۔ جس میں اس کی ادائیگی واجب ہے خُذُوْا حِذْرَكُمْ ان کی احتیاط، چوکس رہنا، باخبر رہنا اور ہمہ وقت تیار رہنا۔

سفرِ جہاد میں اکثر ایسے مواقع آجاتے ہیں۔ کہ قتال بالفعل تو شروع نہ ہو مگر اس کا ہر دم خطرہ ہو، ایسے وقت میں "صلوٰۃ الخوف" پڑھی جاتی ہے۔ جس کا ذکر ان آیات میں وارد ہوا ہے۔ جب صلوٰۃ الخوف باجماعت پڑھی جائے تو اس کا طریقہ بتایا گیا ہے[1]

لہ آیت ۱۰۱ : جب تم جہاد وغیرہ کے لئے سفر کرو اور کافروں سے جو کہ تمہارے صریح دشمن ہیں۔ اس کا خوف ہو کہ وہ موقع پاکر ستائیں گے۔ تو نماز کو مختصر رکھو۔ یعنی جو نماز حضر میں چار رکعت کی ہو اُس کی دو رکعت پڑھو۔

سفر تین منزل کا ہونا ضروری ہے۔ اس سے کم ہوگا۔ تو قصر جائز نہ ہوگا۔ اور کافروں کے ستانے کا ڈر اُس وقت موجود تھا جب یہ حکم نازل ہوا، جب یہ خوف جاتا رہا تو اُس کے بعد بھی آپؐ سفر میں دو ہی رکعت پڑھتے رہے اور صحابہؓ کو بھی اسی کی تاکید فرمائی لہٰذا اب سفر میں ہمیشہ قصر کرنے کا حکم ہے۔ خوف مذکور ہو یا نہ ہو۔ اور یہ اللہ تعالےٰ کا فضل ہے۔ شکریہ کے ساتھ مسلمانوں کو اس کا قبول کرنا لازم ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے (ان مسائل کی مزید مناسب تفاصیل ہماری کتاب کتاب الصلوٰۃ (شرح مشکوٰۃ) کے باب "صلوٰۃ الخوف" میں ملاحظہ فرمائیے مطبوعہ علمی کتاب خانہ لاہور۔ مؤلف)

آیت ۱۰۲ : اوپر کی آیت میں نمازِ سفر کا بیان تھا۔ اس آیت میں نماز خوف کا بیان ہے۔ یعنی کافروں کی فوج مقابلہ میں ہو تو مسلمانوں کی فوج دو حصے ہو جائے ایک حصہ امام کے ساتھ آدھی نماز پڑھ کر دشمن کے مقابلہ پر جا کر کھڑا ہو جائے۔ اور دوسرا حصہ آکر امام کے ساتھ نصف باقی پڑھ لے۔ امام کے سلام کے بعد دو جماعتیں اپنی رہی ہوئی آدھی نماز جُدا جُدا پڑھ لیں۔ اگر مغرب کی نماز ہو تو اوّل جماعت دو رکعت اور دوسری جماعت ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے۔ اور اس حالت میں آمد و رفت نماز کے اندر معاف ہے۔ اور تلوار، زرہ، سپر وغیرہ کے اپنے ساتھ رکھنے کا بھی

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۲۲-۱۲۳،

Marfat.com

ارشاد فرمایا تاکہ کفار موقع پاکر یک بارگی حملہ نہ کردیں (اور صلوٰۃ الخوف کا حکم اُس وقت ہے۔ جبکہ جنگ بالفعل شروع نہ ہو۔ حالت قتال میں جیسی صورت ممکن ہو اختیار کی جائے گی۔ حتیٰ کہ اگر پڑھنا ممکن نہ ہو تو نماز کو ملتوی کر دیا جائے گا۔ یہ سب کچھ احادیث سے ثابت ہے۔ مؤلف)

اگر بارش یا بیماری اور ضعف کی وجہ سے ہتھیار کا اٹھانا مشکل ہو تو ایسی حالت میں ہتھیار اتار کر رکھ دینے کی اجازت ہے۔ لیکن اپنا بچاؤ کر لینا چاہیئے۔ مثلاً، زرہ، سپر خود ساتھ رکھے لو۔ اگر دشمنوں کے خوف سے اتنی مہلت بھی نہ ملے کہ نماز خوف بصورت مذکورہ ادا کر سکیں تو جماعت موقوف کر کے تنہا تنہا نماز پڑھ لیں۔ لیکن اگر پیادہ ہو کر پڑھنے یا سواری سے اُترنے کا بھی موقع نہ ملے تو سواری پر اشارہ سے نماز پڑھ لیں، اگر اس کی بھی مُہلت نہ ملے تو نماز کو قضا کر دیں۔ آیت کے آخر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق تدبیر اور احتیاط و اہتمام کے ساتھ کام کرو اور اللہ کے فضل و کرم سے امید رکھو۔ وہ کافروں کو تمہارے ہاتھ سے ذلیل و خوار کر دے گا۔ تم اُن سے خوف مت رکھو۔

آیت ۱۰۳: خوف کے وقت بوجہ تنگی و بے اطمینانی اگر نماز میں کسی طرح کی کوتاہی ہو گئی۔ تو نماز خوف سے فراغت کے بعد ہر وقت اور ہر حالت میں کھڑے ہو یا بیٹھے یا لیٹے، اللہ کو یاد کرو حتیٰ کہ عین ہجوم اور مقابلہ کے وقت بھی۔ کیونکہ وقت کی تعیین اور دیگر قیود کی پابندی تو بحالتِ نماز تھی جن کی وجہ سے تنگی اور بے اطمینانی پیش آنے کا موقع ہے۔ اس کے سوا ہر حالت میں بلا تعیّن وقت اللہ کو یاد کر سکتے ہو لہٰذا کسی وقت اس کی یاد سے غافل نہ رہو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا کہ صرف وہ شخص کہ جس کے عقل و حواس کسی سبب سے مغلوب ہو جائیں البتہ معذور ہے۔ ورنہ کوئی شخص اللہ کو یاد کرنے سے معذور نہیں۔

جب خوف جاتا رہے اور خاطر جمع ہو جائے تو پھر جو نماز پڑھو اطمینان اور تعدیل ارکان اور رعایت شروط اور محافظت آداب کے ساتھ پڑھو جیسا کہ امن کی حالت میں پڑھنا چاہیئے۔ اور جن زائد حرکات کی اجازت دی گئی وہ بوجہ ضرورت حالت خوف کے ساتھ مخصوص ہیں۔ نماز یقیناً وقت معین میں فرض ہے۔ سفر و حضر اطمینان د

Marfat.com

خوف ہر حالت میں اُسی وقت میں پڑھنی چاہیئے، یہ نہیں کہ جب چاہو پڑھ لو۔ یا یہ مطلب ہے۔ کہ نماز کے متعلق حق تعالےٰ نے پورا ضبط اور تعیّن فرما دیا ہے۔ کہ حضر میں کیا ہونا چاہیئے اور سفر میں کیا، اطمینان میں کیا کرنا چاہیئے اور خوف میں کیا۔ سو ہر حالت میں اُس کی پابندی کرنی چاہیئے۔

[1] اِنْ خِفْتُمْ :۔ خوارج کے سوا تمام اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل اس پر گواہ ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ والا فقرہ بطورِ شرط قصر کے نہیں آیا۔ بلکہ اس میں اس حالتِ واقعی کا بیان ہے۔ جو نزولِ آیت کے وقت موجود تھی۔ اور قصرِ صلوٰۃ کا حکم ہر سفر کے لئے عام ہے۔ (مدارک، روح المعانی) اور فِی الْاَرْضِ کے لفظ سے صرف خشکی کا سفر ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے مراد سفر کی حالت ہے۔ چاہے بحری سفر ہو چاہے بحری (پیدل) ہو یا سواری پر، ہوائی ہو یا زمینی۔ کیونکہ سفر بہر حال سفر ہے مؤلف)

صلوٰۃ الخوف میں ہتھیاروں اور احتیاط کی تاکیدات کو دیکھ کر فقہائے اسلام نے ستنباط کیا ہے کہ عین عبادت منصوص کی حالت میں بھی اسباب و انتظام پر نظر رکھنا ولی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اسلامی شریعت نے ہمہ وقت بیداری، مستعدی ور چستی کا حکم دیا ہے۔ اور کسی حالت میں بھی دشمن سے غفلت کی اجازت نہیں دی۔

نمازِ خوف کی جو صورت بیان ہوئی ہے۔ وہ اس وقت کیلئے ہے۔ جبکہ سارا لشکر ب ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیے۔ اور حضورؐ کی دنیا میں حینِ حیات ہر مسلمان ا یہی خواہش اور آرزو تھی کہ آپؐ ہی کے ساتھ نماز گزارے۔ لیکن حسبِ ضرورت دیا زائد جماعتیں بھی کی جا سکتی ہیں (بلکہ بعض علماء نے تو، مثلاً امام ابو یوسفؒ، صلوٰۃ خوف کو حضورؐ کے ساتھ ہی خاص مانا ہے۔ اور وَاِذَا كُنْتَ فِيهِمْ سے استدلال کیا ہے، رحال جمہور امت کے نزدیک یہ نماز اس طرح آپؐ کے ساتھ تو خاص نہیں مگر حسبِ صلحت دوسرا امام بھی کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ تفصیل ہماری کتاب الصلوٰۃ میں ملے ۔ مؤلف)

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲،

Marfat.com

[1] صحیح مسلم کی ایک حدیث میں جو جناب علیؓ سے مروی ہے۔ موزوں پہ مسح کی مدت مقیم کے لئے ایک دن رات اور مسافر کے لئے تین دن رات آئی ہے۔ یہیں سے علماء نے شرعی سفر کی یہ مقدار نکالی کہ وہ تین منزل کا سفر ہے۔ جس سے احکام شرع میں کچھ تبدیلی آتی ہے۔ مثلاً موزوں پہ مسح کی مدت بڑھتی ہے۔ اور نماز میں قصر کا حکم ہوتا ہے۔ علامہ شعبیؒ، امام ابراہیمؒ، نخعیؒ، سعیدؒ بن جبیر اور امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔ پھر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سفر میں قصر واجب ہے۔ اس کے خلاف جائز نہیں۔ مگر امام شافعیؒ سفر میں قصر کو جائز فرماتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی سفر میں بھی پوری نماز پڑھے تو جائز ہوگا۔ تفصیل فقہ میں ملے گی۔ اسی طرح امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک سفرِ مباح میں تو قصر ہے سفرِ معصیت میں نہیں۔ لیکن آیت میں یہ شرط موجود نہیں اس لئے امام ابوحنیفہؒ نے ہر سفر میں قصر کو مشروع قرار دیا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ معصیت کا سفر نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس سے قصر پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مؤلف)

[2] قاعدہ یہ ہے کہ جب منطوق باعتبار غالب کے آئے تو اس کا مفہوم مخالف معتبر نہیں ہوتا۔ پس خوف کی شرط جو ان آیات میں ہے۔ یہ باعتبار ان عمومی حالات کے ہے جو نزول کے وقت موجود تھے۔ اس کی کئی مثالیں قرآن مجید میں ہیں۔ مثلاً ایک آیت میں فرمایا ہے۔ کہ تم اپنی لونڈیوں کو بدکاری پہ مجبور مت کرو اگر وہ اس سے بچنا چاہتی ہیں۔ سو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر لونڈیاں بدکاری کرانا چاہیں۔ تو پھر انہیں کھلی اجازت دے دو۔ بلکہ اس میں ایک حالتِ موجودہ کا بیان ہے۔ کہ عرب جاہلیت میں لوگ اپنی لونڈیوں سے بالجبر زنا کراتے تھے، جیسا کہ عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین کے متعلق ثابت ہے۔ اسی طرح پیچھے گزر چکا ہے۔ کہ فلاں فلاں عورتیں تم پہ حرام ہیں ان میں سے ایک وہ لڑکی ہے۔ جو اپنی منکوحہ کے پہلے خاوند سے ہو بشرطیکہ اس عورت سے صحبت بھی ہو گئی ہو۔ اس کے بیان میں اللہ تعالےٰ نے فِیْ حُجُوْرِکُمْ کا لفظ بولا ہے۔ چونکہ ایسی لڑکیاں عموماً اس دوسرے خاوند کی پرورش میں ہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایسا فرمایا گیا۔ ورنہ چاہے اس کی پرورش میں ہو یا نہ ہو، بہرصورت وہ لڑکی حرام ہے

---

[1] تفسیر حقانی ج ۲ صفحہ ۲۲۱-۲۲۲،

[2] تفسیر ابن کثیر پ ۵ صفحہ ۸۹۔

Marfat.com

پس جس طرح ان دو مقامات کی قید کا حال ہے۔ اسی طرح یہاں خوف کی شرط بھی ہے اور اس کی تائید بہت سی احادیث و آثار سے بھی ہوتی ہے۔

[1] صلوٰۃ الخوف کی ترکیب کا انحصار بڑی حد تک جنگی حالات پر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے یہ نماز پڑھائی ہے۔ اور امام وقت مجاز ہے کہ ان طریقوں میں سے جس طریقہ کی اجازت جنگی صورت حال دے اُسی کو اختیار کرے (صلوٰۃ الخوف کی تقریباً ۱۶ صورتیں ہیں۔ اور سب بالاتفاق جائز ہیں۔ حافظ ابن القیمؒ نے حک و ترمیم اور تہذیب کے بعد چھ صورتیں بیان کی ہیں مناسب تفصیل کے لئے دیکھئے ہماری کتاب الصلوٰۃ۔ مؤلف)

[2] امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بعض ائمہ سلف کا قول بیان کیا ہے۔ کہ ان آیات میں سے کسی میں بھی سفر کی نماز کے قصر کا بیان نہیں ہے۔ اور کہ ان میں صرف صلوٰۃ الخوف کا بیان ہے۔ اسی تفسیر کو علامہ سید رشید رضا اور علامہ احمد مصطفےٰ المراغی نے اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات میں "قصر خوف کا بیان ہے جو جنگی حالات میں اور ڈاکوؤں وغیرہ کے خوف کے وقت کیا جاتا ہے۔ اور یہ وہ قصر سفر نہیں ہے جس میں چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ قصر سفر کتب فقہ میں بیان ہوا ہے۔ اور حضورؐ کی سنت متواترہ سے لیا گیا ہے۔ یہاں قصر خوف کا ذکر ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ہے۔ کہ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا، ہاں! ان دونوں کے بیان میں فرق یہ ہے۔ کہ سورۃ نساء کی ان آیات میں عدد رکعات کی قصر کا بیان ہے۔ کہ امام نصف نماز ایک گروہ کے ساتھ پڑھے اور نصف دوسرے کے ساتھ۔ اور سورۃ بقرہ کی آیت میں ہیئت صلوٰۃ کا قصر بیان ہوا ہے۔ کہ جب نماز کی صورت کی اقامت کا موقع نہ ہو تو جس طرح ممکن ہو اشارے سے نماز پڑھ لی جائے (اس تفسیر کی بنا پر آیت ۱۰۱ کا تعلق جب قصر سفر سے نہ رہا تو اِنْ خِفْتُمْ کی جو بحث اوپر گزری ہے۔ وہ پیدا نہیں ہوگی کیونکہ قصر خوف میں تو خوف ہوتا ہی ہے! مؤلف)

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۳۹۱،

[2] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۳۸-۱۴۴، تفسیر المنار ج ۵ ص ۲۶۳-۲۸۷،

Marfat.com

اب رہی قصرِ سفر، سو اس کے بارے میں علامہ المراغی اور علامہ سید رشید رضا لبنانی فرماتے ہیں۔ کہ یہ قصر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے خلفائے راشدین سے اور دیگر تمام صحابہ رضؓ سے ثابت ہے۔ تمام صحاح میں بالخصوص صحیحین میں اس کا ثبوت واضح طور پر موجود ہے۔ اور حق یہی ہے۔ کہ جس طرح حنفیہ کا مسلک ہے۔ یہ قصر واجب ہے۔ صرف مستحب اور جائز ہی نہیں، مقدار سفر کو مسند احمد، مسلم، ابوداؤد کی ایک حدیث نے متعین کر دیا ہے۔ جو حضرت انس رضؓ سے مروی ہے۔ کہ حضورؐ جب تین دن (تین فراسخ یا فرسنگ) کے سفر پہ ہوتے تو قصر فرماتے تھے۔ اس مقدار کا اعتبار بری سفر میں تو پیدل اور اونٹ کی درمیانی رفتار سے ہوتا ہے۔ اور سمندری سفر میں (جب کشتی بادبانی ہو) اعتدالِ ہوا کی شرط پہ اُس کی درمیانی رفتار سے ہوگا۔

آیت ۱۰۲: میں پہلے گروہ کے بیان کے وقت تو صرف یہی فرمایا گیا ہے۔ کہ وہ لوگ اپنے ہتھیار لے کر نماز پڑھیں، مگر دوسرے گروہ کے بیان میں فرمایا ہے۔ کہ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ اس فرق کی وجہ یہ ہے۔ کہ دشمن پہلے گروہ کی صف بندی کے وقت اس قدر متنبہ اور ہوشیار نہیں ہوتا جتنا کہ دوسرے گروہ کے آنے پہ ہوتا ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے وہ یہ سمجھے کہ یہ لوگ قتال کے لئے صف بندی کر رہے ہیں۔ نماز کے لئے نہیں۔ مگر دوسرے کے آنے کے وقت اس کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ اور وہ یقیناً جان لے گا کہ یہ لوگ نماز ادا کر رہے ہیں۔ اگر وہ زیادہ ہی بد باطن ہوگا تو عین ممکن ہے۔ کہ حالتِ نماز میں ہی حملہ آور ہو جائے۔ لہٰذا دوسرے فریق کو زیادہ ہوشیار، چوکنا، بیدار اور محتاط رہنے کا حکم دیا۔ کئی صحیح احادیث میں حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ رضؓ کا نماز خوف میدانِ جنگ میں ادا کرنا ثابت ہے۔ جیسا کہ بخاری، احمد، بیہقی اور حاکم وغیرہ ہم نے روایت کیا ہے۔

نماز کی ادائیگی کے بعد ہر حالت میں ذکر اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ تاکہ ہم اس حقیقت کو ہمیشہ یاد کرتے رہیں کہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کے دین کے مددگار ہوں۔ انہیں دنیا و آخرت میں کامیابی کی بشارت دی گئی ہے، دل کے ذکر کے علاوہ زبان سے بھی حمد و ثنا اور تکبیر و تسبیح کا حکم ہے۔ یہ ذکر ہر حال میں جاری رہنا چاہیئے۔ قیام ہو یا قعود، جلوس ہو یا لیٹنے کی حالت پھر میدان ہو یا امن کا مقام، بالفعل جنگ جاری ہو یا نہ ہو، کھڑے ہو کر حملہ کریں یا بیٹھ کر، مورچے میں

Marfat.com

ہوں یا کہیں اور، زخمی ہو کر لیٹ جائیں یا بطور تدبیر جنگ ایسا کریں، غرض ہر وقت ہر حال میں اور ہر جگہ یہ ذکر جاری رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا ذکر دلوں کو قوی کرتا ہمتوں کو بلند کرتا اور دنیوی مشقتوں اور تکلیفوں کو آسان بنا دیتا ہے۔ اس ثبات وصبر کے نتیجے میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے فلاح و نصرت ملتی ہے۔ سورۃ الانفال میں ہے۔ اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

جب ہمیں تفصیل سابق کے مطابق حالتِ جنگ میں ذکر اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ تو حالتِ امن میں بدرجۂ اولیٰ اس کا حکم ہوگا۔ ہاں! مومن تو ہر حال میں ایک دائمی جہاد اور مستمر لڑائی میں مصروف رہتے ہیں۔ کبھی وہ دشمنانِ دین سے لڑتے ہیں۔ تو کبھی خواہشات نفسانی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے بہت سی آیات میں مومنوں کو ذکر کا حکم دیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ؛ ذکر اللہ میں نفس کی تربیت ہے۔ روح کی صفائی ہے۔ اللہ کے جلال وعظمت کی یاد ہے۔ اور اس احساس کی تازگی ہے۔ کہ خدا کی راہ میں اور اُس کی رضاء کی خاطر ہر مشکل کو برداشت کر لینا آسان ہے۔

امام ابن جریر طبریؒ نے عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں پہ جو فریضہ بھی مقرر فرمایا ہے۔ اُس کی ایک معلوم جزاء بیان کی ہے۔ پھر حالت عذر میں عذر والوں کو اس کے ترک والتوا کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن ذکر اللہ کا یہ حال نہیں ہے۔ کیوں کہ نہ تو اس کی کوئی حد بیان فرمائی گئی ہے۔ اور نہ اس کے ترک میں کسی کو معذور رکھا گیا ہے۔ جب تک کسی کی عقل وحواس مغلوب نہ ہو جائے۔ اس کے ترک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے قیام وقعود اور پہلوؤں پہ لیٹ کر بھی ذکر کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ دن رات میں، بحر وبر میں، سفر وحضر میں، غنیٰ وفقر میں، مرض وصحت میں، پوشیدہ اور علانیہ، غرض ہر حال میں خدا کو یاد کیا جائے۔

ان آیات میں نماز کو تحدید وقت کے ساتھ فرض کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اگر نماز کو اس کے معلوم ومتعین اوقات میں محدود نہ کر دیا جاتا۔ تو لوگوں کی ایک بڑی اکثریت اس کی پرواہ نہ کرتی۔ علاوہ ازیں وقت کی پابندی سے ایک انفرادی واجتماعی تربیت وتزکیہ اور تہذیب نفس کا انتظام ہو جاتا ہے۔ اور نفس سے

Marfat.com

سہل انگاری اور غفلت دور ہو جاتی ہے۔ پس جو شخص دن رات کے ان پانچ معلوم اوقات میں نماز ادا نہیں کرتا وہ اغلباً اپنے پروردگار کو فراموش کر دے گا۔ بحرِ غفلت میں غرق ہو جائے گا۔ اور جس کا ایمان مضبوط ہو اور نفسِ مزکّٰی ہو وہ خدا کے صرف اسی قلیل ذکر پر اکتفاء نہیں کرتا، بلکہ اور بھی مناجات کرتا ہے۔ اور بفضلِ خدا بہت سے نوافل بھی پڑھتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ نمازان پانچ اوقات میں محدود و مخصوص کی گئی ہے۔ تاکہ مختلف احوال و اوقات مومن کو اس کے پروردگار کی یاد دلاتے رہیں۔ مبادا اس پر غفلت طاری ہو جائے، وہ شر میں ڈوب جائے اور خیر سے پرے ہٹ جائے۔ اور جو نوافل و اذکار میں کمال حاصل کرنے کا متمنّی ہو اسے اپنے احوال کے موافق اوقات چن لینا مشکل نہیں ہے۔

[1] سیّد قطب شہیدؒ بھی ان لوگوں کے ہم نوا ہیں۔ جو آیت ۱۰۱ کو قصرِ سفر کے لئے نہیں بلکہ قصرِ خوف کے لئے قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے۔ کہ قصر کفّار کے خوف کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ اس کا حکم سنتِ متواترہ سے خوف و امن ہر حالت میں ثابت ہے۔ اور یہاں چونکہ خوف کی شرط موجود ہے۔ لہٰذا یہ وہ خاص قصر ہے، جسے صلوٰۃ الخوف کہا جاتا ہے۔ حالت جہاد و قتال میں چونکہ اس کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا رخصت دے دی گئی سیّد مرحوم فرماتے ہیں۔ کہ قصر کا یہ معنی جو ہم نے یہاں اختیار کیا ہے۔ وہی ہے۔ جسے امام ابوبکر الجصاصؒ الرّازی حنفی نے احکام القرآن (جلد ۲ صفحہ ۳۰۷ - ۳۰۸) میں اختیار فرمایا ہے۔

پھر سیّد قطبؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ الخوف الگ چیز ہے اور قصر الخوف الگ ہے۔ قصر الخوف میدانِ معرکہ کے علاوہ بھی ضروریات جہاد و قتال میں ادا ہو سکتی ہے مگر صلوٰۃ الخوف کا تعلق صرف میدان معرکہ سے ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہاں اس نماز کا صرف فقہی حکم ہی بیان نہیں فرمایا بلکہ اس کا تعلق مجاہدین کی تربیت اور اصلاح و تزکیہ سے ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ قابل غور ہے۔ کہ مسلمان کو میدانِ جنگ میں نماز پر کتنی حرص ہونی چاہیے۔ ایمان کے لحاظ سے یہ چیز بالکل واضح ہے۔ کیونکہ یہ نماز میدان جنگ کے اسلحہ میں سے ہے۔ بلکہ حقیقت میں اصل ہتھیار ہی یہی ہے۔ پس ضروری

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۲۰۸ - ۲۱۲،

Marfat.com

تھا۔ کہ اس ہتھیار کو درست اور تیز کیا جاتا۔ اہل ایمان نے دوسرے اسلحہ سے پہلے اور ان سے زیادہ اسی ہتھیار سے کام لیا تھا۔ صلوٰۃ الخوف میں خدا کی معرفت کا تصوّر اس کی معیّت کا یقین، اپنے مقاصد کی حقانیت کا یقین اور توحید کا صحیح عقیدہ پایا جاتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ دشمن کے سامنے پوری روحانی تیاری کی جائے، احتیاط و حذر کی امکانی حدود کو حاصل کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ روحانی ثابت قدمی اور قلبی اطمینان و سکون کا سامان کیا جائے۔ اسی یقین و اطمینان کی دولت سے فتح و نصرت ملتی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِنْ تَكُونُوا

اور ہمت نہ ہارو ان کا پیچھا کرنے میں اگر تم

تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۚ

بے آرام ہوتے ہو تو وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں جس طرح تم ہوتے

وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَ

ہو اور تم کو امید ہے اللہ سے جو ان کو نہیں اور

كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٠٤﴾ ع ۱۵ ۴ ۱۲

اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

شرح الفاظ

لَا تَهِنُوا : وھن اسکا مادّہ اور مصدر ہے۔ جس کا معنیٰ ہے۔ ضعف اور بودا پن۔ ابتغاء : طلب و تلاش، تعاقب کرنا۔ تَأْلَمُونَ الم سے بمعنی دکھ اٹھانا اور تکلیف برداشت کرنا۔

لہ پچھلی آیتوں میں میدانِ معرکہ میں نماز پڑھنے، ذکر اللہ کی پابندی اور تعلق باللہ کا ذکر تھا۔ اس آیت میں دشمن کے مقابلے میں کمزوری کے اظہار سے روکا گیا

Marfat.com

ہے۔ اور اس پر یہ دلیل قائم کی گئی ہے۔ کہ مشرک تم سے زیادہ خوف کے مستحق ہیں، کیونکہ جہاں تک قتال کے الم و مشقت اور مادی تکلیف کا سوال ہے۔ اس میں تو مومن و کافر دونوں مساوی ہیں۔ لیکن مومن کافر سے اس امر میں ممتاز ہے۔ کہ اُسے اپنے رب سے وہ کچھ امید و رجاء ہے۔ جو کافر کو نہیں ہے۔ مومن اللہ سے نصرت و معونت کا متوقع ہے۔ اس کا عقیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ اپنے وعدوں کو پورا کرنے پر قادر ہے اور اسے کوئی چیز اس سے روک نہیں سکتی۔ علاوہ ازیں اسے راہِ حق میں ابتلاء کے باعث اجر و ثواب کی امید بھی ہے۔ جس سے کافر محروم ہے۔ امید جتنی قوی ہوگی۔ الم و مصیبت کا احساس اتنا ہی خفیف ہوگا۔ لیکن بعض دفعہ جد و جہد کی تھکن اور سعی کی تکلیف اُمید پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لئے بیداری اور اختیار کی ضرورت ہے۔

لہ یعنی کفار کی جستجو اور تعاقب میں ہمت سے کام لو اور کوتاہی نہ کرو۔ اگر تم کو ان کی لڑائی سے زخم اور درد پہنچتا ہے۔ تو اس تکلیف میں تو وہ بھی شریک ہیں۔ اور آئندہ تم کو حق تعالےٰ سے وہ امیدیں ہیں۔ جو ان کو نہیں، یعنی دنیا میں کفار پر غلبہ اور آخرت میں ثوابِ عظیم۔ اور اللہ تعالےٰ تمہارے مصالح اور تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔ اس کا جو بھی حکم ہے۔ اس میں تمہارے لئے بڑے منافع اور حکمتیں ہیں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔ پس اس کا حکم ماننے کو غنیمت اور نعمت سمجھو۔

لہ روایات میں آتا ہے۔ کہ یہ آیت غزوۂ حمراء الاسد کے سلسلہ میں نازل ہوئی اس کا ذکر سورۃ آلِ عمران کی آیت اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (ع ۱۸) میں بھی آیا ہے۔ (جنگ اُحد کی عارضی کامیابی کے نشہ میں ابوسفیان نے آئندہ سال انہی دنوں میں میدانِ بدر میں پھر لڑنے کا اعلان کیا تھا۔ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو نقصان پہنچ چکا تھا۔ مگر حضورؐ کے ارشاد پر وہ لوگ فوراً تیار ہو گئے۔ مشرکین کا لشکر مکہ سے نکلا مگر راستہ سے ہی واپس چلا گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو اعصابی جنگ سے کمزور و بزدل بنانے کے لئے بہت سا غلط پروپیگنڈا بھی کیا کرایا۔ مگر مسلمان باوجود حالتِ کی نزاکت کے فوراً تیار ہو گئے۔ جن کمزور ایمان کے لوگوں نے کچھ بے ہمتی دکھائی تھی۔ انہیں اس آیت میں سرزنش فرمائی گئی ہے۔ مسلمان جائے موعود پر جا کر انتظار کرتے رہے مگر کفار نہ پہنچے اور مسلمان بفضلِ خدا کامیابی کا پھریرا اڑاتے واپس آئے۔ اسی مضمون کی ایک اور آیت اس طرح ہے۔ اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُہٗ۔ (مؤلف)

لہ ذاد المسیر، صفحہ ۱۲۲، تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۲۳، تفسیر ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۹۶ تا ۱۰۰۔ تفسیر ماجدی

Marfat.com

ہے تعجب کا مقام ہے۔ اگر اہل ایمان حق کی خاطر اتنی تکلیفیں بھی برداشت نہ کریں جتنی کفارِ باطل کی خاطر برداشت کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے سامنے صرف دنیا اور اُس کے ناپائیدار فائدے ہیں۔ اور اس کے برعکس اہل ایمان ربّ السّمٰوات والارض کی خوشنودی و تقرب اور ابدی انعامات کے امیدوار ہیں۔

سلہ اس آیت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے۔ کہ مسلمان صرف دفاع پہ ہی اکتفاء نہ کریں، بلکہ حسبِ ضرورت و مصلحت آگے بڑھ کر حملہ کریں، اقدام کریں اور کفار پہ چڑھ جائیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ جو شخص ہجوم و اقدام کا ارادہ کر کے جاتا ہے۔ اس کا عزم بلند اور ہمت قوی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دفاع نہایت ضروری ہے۔ مگر صرف اسی پہ اکتفاء کرنا درست نہیں کیونکہ فقط دفاع پہ رہنے والوں کا عزم کھوکھلا اور قوت کمزور ہوتی ہے۔ (۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ مؤلف)

جب وہ کافر ہوتے ہوئے صبر و ثبات دکھاتے ہیں۔ تو تم مسلمان ہو کر کیوں صابر و ثابت قدم نہیں رہتے؟ کافر اپنے کفر پہ اتنا پکا ہے۔ تو مومن کو اپنے ایمان پہ اس سے بدرجہا زیادہ پختہ ہونا لازم ہے۔ مومن کے لئے راہِ جہاد میں ناکامی کا سوال ہی نہیں۔ اس کے سامنے دو اچھی باتوں میں سے ایک کا وعدہ موجود ہے، یا کامیابی اور یا شہادت کی موت اور سیدھا جنّت میں پہنچ جانا۔ اس وعدہ کی موجودگی میں مومن کا عزم کیوں کر ڈھیلا ہو سکتا ہے۔ اور جو اس وعدہ سے مایوس ہو جائے وہ عزم و ہمّت میں کمزور اور صبر و ثبات میں مردہ ہے۔

سلہ اس آیت کے کلمات نہایت مختصر ہیں۔ لیکن مومن و کافر کے طرزِ عمل، عقیدہ اور عزم و ثبات کا واضح فرق بیان کرتے ہیں۔ مومن بھی معرکہ میں زخم و الم برداشت کرتے ہیں۔ اور کافر بھی پس تکلیف میں تو مادی اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ مگر نتیجہ اور جزا و ثواب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مومن کا جہاد خدا کے لئے ہے۔ لہٰذا اجر محفوظ ہے کافر کا کوئی اجر نہیں نہ اس کے سامنے کوئی بلند تر مقصد ہے۔ پھر اگر کفار معرکہ پہ اصرار کریں تو مومن کیوں نہ کریں؟ اگر کافر اپنے کفر کی خاطر تکالیف اٹھائیں تو مومن اپنے ایمان و عاقبت کے لئے ایسا کیوں نہ کریں؟ ہر مقابلے میں عقیدہ کی پختگی ہی فتح پاتی ہے اور مومن سے بڑھ کر کس کا عقیدہ پختہ ہو سکتا ہے؟

لہ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۳۹۲، سلہ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۴۵-۱۴۶، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۲۸۷-۳۸۹ سلہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۲۱۳-۲۱۴

Marfat.com

آیت کے مضمون کا تعلق کھلے معرکے سے ہے۔ لیکن اگر کوئی وقت ایسا ہو کہ اس کی نوبت نہ آئے تو پھر بھی یہ قاعدہ غیر متغیر ہے۔ کیونکہ باطل ہمیشہ عافیت و خیر سے نہیں رہ سکتا چاہے غالب ہی کیوں نہ ہو۔ اس کو اندرونی بیماریاں، خفیہ آلام اور پوشیدہ امراض چمٹ جاتے ہیں، کیونکہ وہ اندر سے کھوکھلا اور متناقض ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں مومن جماعت کا فرض یہ ہے۔ کہ صبر و تحمل سے کام لے ہمت نہ ہارے۔ چٹان کی طرح مضبوط رہے اور ریت کی مانند ڈھے نہ جائے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ

بے شک ہم نے اتاری تیری طرف کتاب سچی کہ تو انصاف کرے

بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ

لوگوں میں جو کچھ سمجھا دے تجھ کو اللہ اور تو مت ہو دغا بازوں کی

خَصِيْمًا ۝ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا

طرف سے جھگڑنے والا اور بخشش مانگ اللہ سے بے شک اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ

مہربان ہے اور مت جھگڑ ان کی طرف سے جو اپنے جی میں دغا

اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِــيْمًا ۝

رکھتے ہیں اللہ کو پسند نہیں جو کوئی ہو

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ

شرماتے ہیں لوگوں سے اور نہیں شرماتے اللہ سے

وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ

اور وہ ان کے ساتھ ہے جب رات کو مشورہ کرتے ہیں اسی بات کا

Marfat.com

وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ

جس سے اللہ راضی نہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے سنتے

جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ

ہو تم جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں پھر کون جھگڑا کرے گا

اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ

اللہ سے ان کے بدلے دن قیامت کے یا کون ہوگا ان کا

وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ

کارساز اور جو کوئی کرے گناہ یا اپنا برا کرے

ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

پھر اللہ سے بخشوالے تو پائے گا اللہ کو بخشنے والا مہربان

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ

اور جو کرے گناہ سو کرتا ہے اپنے ہی حق میں

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے اور جو کوئی کرے

خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ

خطا یا گناہ پھر تہمت لگا دے اس کی کسی بے گناہ پر تو اپنے

ع ۱۶ ۱۳ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا

سر دھرا بہتان اور گناہ صریح اور اگر نہ ہوتا

Marfat.com

فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ

تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو قصد کر ہی چکی تھی

طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ

ایک جماعت ان کی کہ تجھ کو بہکا دیں اور وہ بہکا نہیں سکتے

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ

مگر اپنے آپ کو اور تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

اور اللہ نے اتاری کتاب اور حکمت

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ

اور تجھ کو سکھائیں وہ باتیں جو نہ جانتا تھا تو اور اللہ کا

فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

فضل تجھ پر بہت بڑا ہے

شرح الفاظ

لِتَحْكُمَ : تاکہ تو فیصلہ کرے۔ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ : جو تجھے بتایا اور بذریعہ وحی تیری طرف اتارا ہے۔ خَصِيْمًا : ان کی طرف سے جھگڑنے اور لڑنے والا يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ : اپنے سے بھی خیانت کرتے ہیں، تبکلف خلاف فطرت چلتے ہیں۔ اور باعتبار نتیجہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ مجادلہ کا معنیٰ ہے۔ سخت جھگڑنا، کسی کی شدید حمایت و وکالت کرنا، وَكِيْلًا : کارساز جس کے سپرد حفظ و حمایت کا فریضہ کیا جائے[1] سُوْٓءًا : جو برائی انسان دوسرے کو پہنچائے اور اس دوسرے کو وہ بری لگے، اس سے اس کا نقصان ہو۔ يَظْلِمُ : ظلم سے مراد یہاں وہ چیز ہے۔ جس کا ضرر صرف عامل تک محدود ہے۔ مثلاً جھوٹی قسم باعتبار فاعل۔ يَسْتَغْفِرِ : استغفار کا معنیٰ ہے۔ اللہ سے مغفرت طلب

[1] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸،

Marfat.com

کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ برائی کی قباحت کا احساس رکھنا اور اُس سے نادم ہو کر توبہ کر لینا۔ یَکْسِبْ کسب کا معنیٰ ہے۔ وہ کام جو نفع لائے یا کوئی مضرّت دور کرے۔ اِثْمًا گناہ خَطِیْئَۃً جو گناہ اور غلطی بلا قصد و ارادہ ہو جائے، اس کے مقابلے میں اِثْم سے مراد وہ گناہ ہے۔ جو جان کر کیا جائے، یعنی اس کا عامل یہ جانتے ہوئے کرے کہ یہ گناہ ہے۔ یَرْمِ بِہٖ: تھوپ دے، کسی اور کے ذمہ لگا دے، قذف کرے اِحْتَمَلَ بہ تکلّف اٹھایا۔ جان بوجھ برداشت کیا، اپنے پہ لادا، بُہْتَانًا: دوسرے پہ ایسا جھوٹ باندھنا جس سے وہ مبہوت اور حیران رہ جائے۔

پچھلی آیات میں اعدائے حق سے بچ کر رہنے، اُن کا مقابلہ کرنے اور احتیاط و استعداد کے ساتھ ان کا تعاقب کرنے کا حکم تھا۔ ان آیات میں حق کی حفاظت و حمایت اور اس کے لئے پوری غیر جانبداری کا حکم دیا جا رہا ہے۔ امام ابن جریر طبریؒ نے قتادہؓ سے روایت کی ہے۔ کہ یہ آیات ایک انصاری شخص طعمہ بن اُبیرق کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔ اس کے پاس اپنے چچا کی ایک زرہ بطورِ امانت تھی جسے اس نے خود چرایا اور الزام ایک یہودی زید بن سمین پہ لگا دیا جو ان کے ہاں آیا کرتا تھا۔

یہودی بآوازِ بلند "انصاف انصاف" پکارتا ہوا حضورؐ کی خدمت میں آیا اور اپنا معاملہ عرض کیا۔ طعمہ کی برادری والے بھی اپنے ساتھی کی مدد کرنے اور عذر بیان کرنے آموجود ہوئے۔ حضورؐ کے دل میں خیال گزرا کہ طعمہ کا عذر قبول کر لیں، اس پہ یہ آیت اُتری۔ ان میں ایک بے گناہ پہ بہتان لگانے والا یہی طعمہ تھا۔ جب خدائے تعالےٰ نے اس کا حال کھول دیا تو یہ شخص پہلے تو منافق بنا مگر پھر مشرکینِ مکہ سے جا ملا۔ اس پہ یہ آیت اتری۔ وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ الخ

لہ آیت ۱۰۵:۔ منافق اور ضعیف الاسلام لوگوں میں جب کوئی کسی گناہ اور خرابی کا مرتکب ہوتا تو سزا اور بدنامی سے بچنے کے لئے حیلے گھڑتا اور آپؐ کی خدمت میں ایسے انداز سے اس کا اظہار کرتا کہ آپؐ اس کو بری سمجھ جائیں۔ نہ صرف یہی بلکہ کسی بری الذمہ شخص کے ذمہ تہمت لگا کر اُس کو مجرم بنانے میں سعی کرتا۔ اور یہ منافق مل جل کر مشورہ کرتے۔ چنانچہ ایک دفعہ یہ ہوا کہ ایک ایسے ہی مسلمان نے دوسرے مسلمان کے

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۲۳-۱۲۴، تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۲۲۳-۲۲۴، تفسیر ابن کثیر پارہ ۵ (مختصراً) صفحہ ۹۷-۱۰۰،

Marfat.com

گھر میں نقب لگائی ایک تھیلا آٹے کا اور کچھ ہتھیار چرا کر لے گیا۔ اس تھیلے میں اتفاقاً سوراخ تھا۔ اسلئے چور کے گھر تک راستے میں آٹا گرتا گیا۔ چور نے یہ تدبیر کی کہ مال اپنے گھر میں نہ رکھا۔ بلکہ رات ہی میں وہ مال لیجا کر ایک یہودی کے پاس امانت رکھ آیا۔ جو اسکا واقف تھا۔ صبح کو مالک نے آٹے کے سراغ پر چور کو جا پکڑا مگر تلاشی پر اس کے گھر سے کچھ نہ نکلا۔ ادھر چور نے قسم کھالی کہ مجھ کو کچھ خبر نہیں۔ آٹے کا سراغ آگے کو چلتا ہوا نظر آیا تو مالک نے اسی سراغ پر یہودی کو جا پکڑا، اس نے مال کا اقرار کر لیا۔ کہ میرے گھر میں موجود ہے۔ مگر یہ تو میرے پاس فلاں شخص رات کو امانت رکھ گیا ہے۔ میں چور نہیں ہوں۔ مالک نے یہ قصہ فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچایا۔ چور کی قوم اور اسکی جماعت نے اتفاق کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے اس پر چوری ثابت نہ ہونے دو اور یہودی کو چور بناؤ۔ چنانچہ وہ یہودی سے جھگڑے اور آپؐ کی خدمت میں چور کی برأت پر قسمیں کھائیں اور گواہی دی۔ قریب تھا کہ یہودی چور سمجھا جائے اور مجرم قرار دیا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے متعدد آیتیں نازل فرمائیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور سب کو متنبہ فرمایا کہ چور یہی مسلمان ہے۔ یہودی اس معاملے میں سچا اور بے قصور ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے ایسے لوگوں کی قلعی کھول کر سب کو متنبہ کر دیا۔

آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ اے پیغمبرؐ! ہم نے اپنی سچی کتاب آپؐ پر اسلئے اتاری کہ ہمارے سمجھانے اور بتلانے کے موافق تمام لوگوں میں نیک ہو۔ یا بد، مومن ہو یا کافر، حکم اور انصاف کیا جائے اور جو دغا باز ہیں انکی بات کا اعتبار اور انکی طرفداری ہرگز مت کرو، انکی قسم اور گواہی پر کسی بے قصور کو مجرم مت بناؤ۔ یعنی ان دغا بازوں کی طرف ہو کر یہودی سے مت جھگڑو۔

آیت ۱۰۶ :۔ یعنی قبل از تحقیق حال صرف ظاہری حال کو دیکھ کر چور کو بری اور یہودی کو چور خیال کر لینا آپکی عصمت اور عظمت شان کے مناسب نہیں اس سے استغفار چاہیئے۔ اس میں کامل تنبیہ ہو گئی ان مخلص صحابہ کو جو بوجہ تعلق اسلامی یا قومی وغیرہ چور پر حسن ظن کر گزرے اور یہودی کو چور قرار دینے میں ساعی ہوئے۔

Marfat.com

آیت ۱۰۷، ۱۰۸ پہلی آیت میں جب ان لوگوں کی دغا اور برائی تبلا دی گئی تو شاید رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بوجہ غلبۂ شفقت جو آپؐ کو تمام خلق بالخصوص اپنی امت پر تھا حق تعالیٰ سے ان خطا واروں کی معافی چاہی اس پر ارشاد ہوا کہ ان دغابازوں کی طرف ہو کر اللہ سے کیوں جھگڑتے ہو؟

ایسے لوگ اللہ کو خوش نہیں آتے، یہ تو راتوں کو لوگوں سے چھپ چھپ کر نا جائز مشورے کرتے ہیں۔ اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے اور ان کے تمام امور پر حاوی ہے۔ اور اگر آپؐ نے ان لوگوں کے لئے معافی نہ بھی مانگی ہو تو آپؐ کی طرف سے معافی مانگنے کا احتمال تو بالیقین موجود تھا۔ دیکھئے دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ۔ کا ——— ارشاد صریح موجود ہے۔ سو اس کی پیش بندی کے لئے حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرما کر ان لوگوں کی سفارش سے آپؐ کو روک دیا۔ واللہ اعلم۔

آیت ۱۰۹، اس میں خطاب ہے چور کی قوم اور ان لوگوں سے جو اس کے طرفدار ہوئے تھے یعنی اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے، اس بیجا حمایت سے چور کو قیامت میں کوئی نفع نہیں ہو سکتا۔

آیت ۱۱۰۔ سوءٓ اور ظلم سے بڑے اور چھوٹے گناہ مراد ہیں۔ یا سوءٓ سے وہ گناہ مراد ہے جس سے دوسرے کو درد پہنچے، جیسے کسی پر تہمت لگانا اور ظلم وہ ہے کہ اس کی خرابی اپنے نفس تک رہے۔ یعنی گناہ کیسا ہی ہو اس کا علاج استغفار اور توبہ ہے۔ توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ البتہ گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ اگر آدمیوں نے جان بوجھ کر یا فریب سے کسی مجرم کی برأت ثابت کر دی یا غلطی سے مجرم کو بے قصور سمجھ گئے، تو اس سے اس کے جرم میں تخفیف بھی نہیں ہو سکتی، البتہ توبہ سے معاف ہو سکتا ہے۔ اس میں اس چور کو اور اس کے سب طرف داروں کو جو دیدہ دانستہ طرفدار بنے ہوں یا غلطی سے، سبھی کو توبہ اور استغفار کا ارشاد ہو گیا۔ اور اس طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہو گیا کہ اب بھی اگر کوئی اپنی بات پر جما رہے گا اور توبہ نہ کرے گا تو اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت سے محروم ہو گا۔

آیت ۱۱۱:۔ یعنی جو اپنے قصد سے گناہ کرے گا تو اس کا وبال اسی پر پڑے گا اور اس کی سزا خاص اس کو دی جائے گی، کسی دوسرے کو سزا نہیں ہو سکتی۔

کیونکہ ایسا تو وہ کر سکتا ہے جس کو واقعی بات کی خبر نہ ہو یا حکمت سے بے بہرہ ہو۔ مگر حق تعالیٰ تو بلا مبالغہ بصیغۂ مبالغہ "علیم وحکیم" ہے، وہاں اس کی گنجائش کہاں؟ تو اب خود چوری کر کے یہودی کے سر لگانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

آیت ۱۱۲:۔ جس نے کوئی چھوٹا یا بڑا گناہ کر کے کسی بے گناہ کے ذمہ لگایا تو اس پر دو گناہ لازم ہو گئے، ایک جھوٹی تہمت کا دوسرا وہ اصلی گناہ۔ تو ظاہر ہو گیا کہ خود چوری کر کے یہودی پر تہمت دھرنے سے اور وبال بڑھ گیا، نفع خاک بھی نہ ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا، توبہ خالص

Marfat.com

کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔

آیت ۱۱۳:۔ اس آیت کا خطاب جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ اور ان خائنوں کے فریب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ نیز آپؐ کی عظمت شان، عصمت و طہارت کا بیان ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ آپؐ علمی کمال میں جو کہ باقی تمام کمالات پر فائق ہے، اوّل و افضل اور فائق ترین ہیں۔ اور یہ کہ آپؐ پر اللہ کا فضل بے نہایت ہے۔ یہ ہمارے بیان سے ادا نہیں ہو سکتا اور ہماری سمجھ میں بھی نہیں آسکتا۔ اور اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ آپکو جو چور کی برأت کا خیال ہوا تھا۔ وہ ظاہر حال کو دیکھ کر اور اقوال و شہادت کو سن کر اسے سچ جان کر ہو گیا تھا۔ اس میں حق سے پھر جانا، جانبداری یا حق میں نرمی بالکل داخل نہ تھی۔ اور اتنی بات میں کچھ برائی نہ تھی بلکہ یہی ہونا ضروری تھا۔

جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے حقیقت ظاہر ہو گئی تو کوئی خلجان باقی نہ رہا۔ اور ان سب باتوں سے مقصود یہ ہے کہ آئندہ کو وہ فریبی لوگ تو آپؐ کو بہکانے اور دھوکا دینے سے رک جائیں اور مایوس ہو جائیں۔ اور آپؐ اپنی عظمت و تقدس کے مطابق غور اور احتیاط سے کام لیں۔ واللہ اعلم۔

ترمذی ابواب التفسیر میں چوری کرنے والے منافق کا نام بشیر اور جن صاحب کے گھر میں نقب لگائی گئی تھی ان کا نام رفاعہؓ بن زید انصاری آیا ہے۔ بشیر کے دوسرے دو بھائی مومن تھے اور ان کے قبیلے کا نام بنو اُبیرق تھا۔

آیت ۱۰۶:۔ میں جو استغفار کا حکم آپؐ کو ملا ہے یہ اس منافق کے حق میں سفارش کرنے والوں اور اس کی برادری کے لوگوں کے لئے ہے۔ قرآن میں اس کی بہت مثالیں ہیں کہ خطاب بظاہر حضورؐ سے ہوتا ہے، اور حکم دوسروں کو مثلاً یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ. وَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ. (قرطبی تفسیر کبیر)

لیکن اگر اس سے یہ مراد لیا جائے کہ حکم آپؐ کو ہے کہ اپنے لئے مغفرت طلب کیجئے، تو اس سے اشارہ آپؐ کے اس میلانِ طبع کی طرف ہے کہ منافق کی قوم کی شکایت پر آپؐ نے چوری کا شک کرنے والوں پر اظہار ناراضگی فرمایا۔ میلانِ طبع کسی درجہ میں بھی گناہ نہیں ہے۔ مگر پیغمبرؐ طہارت و تقویٰ کے جس بلند مقام پر فائز تھے اس کے پیش نظر اتنا سا میلانِ طبع بھی آپؐ کی شانِ بلند کے خلاف سمجھا گیا اور اس استغفار کا حکم ملا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ نیکوکاروں کی نیکیاں مقربین کے گناہ شمار ہوتے ہیں (مؤلف)

وَهُوَ مَعَهُمْ:۔ اس سے مراد معیتِ مکانی نہیں جس سے بعض باطل فرقے۔ مثلاً قدری، معتزلی اور جہمی وغیرہ قائل ہوئے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد معیتِ علمی لی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ علم و رؤیت اور قدرت و سمع کے لحاظ سے ان کے ساتھ ہے۔ معیت مکانی خدا تعالیٰ کی تنزیہ کے خلاف ہے۔

یہ بشیر جو طعمہ بن ابیرق کے نام سے مشہور ہے سزا کے خوف سے مرتد ہو کر مکہ چلا گیا۔ مگر وہاں بھی کسی کے

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۳-۲۱۴۔

Marfat.com

گھر میں نقب لگائی اور دیوار کے نیچے دب کر مر گیا تھا۔

۱؎ اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس معاملے کی ظاہری رُوداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بجائے خود آپؐ کے لئے کوئی گناہ نہ ہوتا، لیکن اس وقت جبکہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک زبردست کشمکش برپا تھی، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کے مطابق یہودی کے خلاف فیصلہ فرما دیتے تو اسلام کے مخالفوں کو آپؐ کے خلاف اور پوری اسلامی جماعت اور خود دعوت اسلامی کے خلاف ایک زبردست انتقامی حربہ مل جاتا۔ وہ یہ کہتے پھرتے کہ اجی یہاں حق و انصاف کا کیا سوال ہے، یہاں تو وہی جتھہ بندی اور عصبیت کام کر رہی ہے جس کے خلاف تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی خطرے سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس مقدمہ میں مداخلت فرمائی۔

ان آیات میں ایک طرف ان مسلمانوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جنہوں نے محض خاندان اور قبیلہ کی عصبیت میں مجرموں کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ انصاف کے معاملہ میں کسی تعصب کا دخل نہ ہونا چاہیئے۔ یہ ہرگز دیانت نہیں ہے کہ اپنے گروہ کا آدمی اگر برسرِ باطل ہو تو اس کی بیجا حمایت کی جائے، اور دوسرے گروہ کا آدمی اگر برسرِ حق ہو تو اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے۔

۲؎ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا: بددیانتوں کی مدافعت مت کرو۔ یعنی خیانت کار لوگوں کی چرب زبانی اور جھگڑے میں ان کی قوتِ جدل کو دیکھ کر ایسا نہ ہو کہ تم حق کی تہ تک پہنچنے میں کوتاہی کر جاؤ۔ ورنہ تم ان کے حامی و مددگار شمار ہو گے۔ اس کی تائید حضرت ام سلمہؓ کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، میں تو ایک انسان ہی ہوں اور تم میرے پاس مقدمات لاتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں سے اپنے دلائل کو زیادہ چرب زبانی سے پیش کریں اور میں مقدمہ کی ظاہری رُوداد سُن کر ان کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ پس اگر ایسا ہو تو جس کے حق میں کسی مسلمان بھائی کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہے وہ اسے نہ لے کیونکہ میں اس کے لئے جہنم کا ایک ٹکڑا قطع کر رہا ہوں۔!

اس آیت سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ قاضی کو اپنی مجلس میں شخصی عقیدہ فطری میلان اور دینی جھکاؤ کو دخل انداز نہ ہونے دینا چاہیئے۔ نیز جسے وہ حق پر سمجھتا ہے عدالت کی کرسی میں بھی اس کی کوئی مدد نہ کرے بلکہ وہاں فریقین مقدمہ سے بالکل مساویانہ سلوک کرے۔

اسی طرح اگلی آیات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر قاضی مقدمہ کی ظاہری رُوداد پر فیصلہ کر دے تو جس کے حق میں فیصلہ کر رہا ہے اس کے لئے پھر بھی جائز نہیں کہ وہ محض اس فیصلہ کی رُو سے دوسرے کا حق کھا جائے۔

۱؎ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۹۴۔

۲؎ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۴۱-۱۵۲۔ تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۳۹۰-۲-۴۔ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۲۱/۴-۲۲

Marfat.com

افسوس ہے کہ دینی ہدایات کو ترک کر دینے کے باعث آج مسلمانوں میں بے انصافی، تعصب، دوسروں کا حق مارنا، بہتان و تہمت لگانا ہر حیلے بہانے سے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا اور مختلف قسم کی حیلہ سازیاں اور سازشیں پھیل گئی ہیں۔ ان کی وجہ سے عاقبت تو خراب ہوتی ہی ہے دنیا میں بھی سوائے اضطراب و انتشار کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ان آیات نے ایک ایسا قصہ بیان کیا ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ عاجز ہے۔ اگر صرف اسی ایک واقعہ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ دین اسلام خدا کی طرف سے ہے کیونکہ انسانوں کا عقیدہ چاہے کتنا ارفع و اعلیٰ ہو، ان کی روحانی صفات چاہے کتنی بلند ہوں اور ان کی طبائع چاہے کتنی مستقیم ہوں، وہ خود بخود اس بلند سطح پر نہیں پہنچ سکتے۔ جہاں انہیں ان آیات نے پہنچایا ہے۔ یہ صرف خدا کی وحی ہے جس نے یہ کارنامہ دکھایا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ مدینہ کے یہود اسلام کے زہریلے دشمن تھے اور وہ ہر وقت زہر میں بجھے ہوئے تیر اپنے ملعون ترکش سے اسلام اور مسلمانوں پر پھینکتے رہتے تھے اس سورۃ نے اور آلِ عمران اور البقرہ نے ان کی کارروائیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ اسلام کے خلاف جھوٹ پھیلاتے تھے۔ منافقوں اور مشرکوں کو ابھارتے اور ان کی مدد کرتے تھے۔

نت نئی سازشیں کرتے تھے۔ روزانہ نیا جھوٹ تصنیف کر کے اسے رائج کرتے تھے۔ حضورؐ پر طعن و تشنیع اور تہمت و بہتان کی بارش کرتے تھے۔ عہد شکن تھے۔ غدار اور بے وفا تھے۔ مسلم معاشرہ کو اندر سے کھوکھلا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بیرونی دشمنوں کی مدد کرتے تھے۔ اسلام ابھی ایک نئی اُبھرنے والی طاقت تھا۔ ہر مسلمان ایک سطح پر نہ تھا، ان کے اندر کچھ کمزور اور جلدی فریب میں آجانے والے لوگ بھی تھے۔

جاہلیت کے کچھ اثرات ابھی تک باقی تھے۔ ذات برادری اور قبیلے کا تعصب بھی پوری طرح مرا نہیں تھا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے رشتے اور تعلقات بھی راہ میں حائل تھے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود یہ آیات اتریں جن میں ایک یہودی سے انصاف کرنے کا حکم دیا گیا اور عدل و انصاف کے معاملے میں کسی چیز کا بھی لحاظ نہ کیا گیا۔ گو مسلمان اپنے ایک چور ساتھی کی مدد پر تھے اور ظاہری حالات یہود کے خلاف تھے مگر ان آیات نے جو روّیہ اور رویّہ پیش کیا وہ دنیا بھر میں بے نظیر ہے۔ انسانیت اتنا بلند اخلاق و کردار اور عدل و انصاف کا ایسا تصور کاہے کو پیش کر سکے گی!

یہاں سوال صرف ایک بے گناہ کی برّیت کا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بلندی پر جا کر عدل و انصاف کی میزان کو قائم کرنا مدِنظر ہے۔ اسی قسم کے احکام نے اس پاک سوسائٹی کو دنیا کی اعلیٰ ترین اور بلند ترین

Marfat.com

سوسائٹی بنا کر پیش کر دیا ہے۔ اس انصاف اور بے تعصبی کی مثال دنیا کی کوئی قوم بھلا پیش تو کرے۔

ایک طرف دشمن قوم کا فرد (یہودی) تھا۔ دوسری طرف دین الٰہی کے مددگاروں (انصار) کے گروہ کا ایک فرد تھا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ وہ شخص مرتد ہو کر مرا۔ لیکن اسلام نے ان سب سے بلند تر مقصد اقامتِ عدل کو ہی پیشِ نظر رکھا۔ اس فیصلے میں کئی خطرات پوشیدہ تھے مثلاً یہود کی مزید سرکشی، انصار کی دل شکنی، یہود کے ہاتھوں میں انصار کے خلاف ایک اور حجت کا آجانا کہ وہ باہم چوری کرتے اور الزام دوسروں پر دھرتے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا۔

مگر اسلام نے عدل و انصاف کی میزان کو قائم کیا اور ہر قسم کے خدشات کو جھٹک کر رکھ دیا۔ اس نے مسلم معاشرے کی ایسی تربیت کی کہ وہ دنیا کی امامت و قیادت اور لوگوں میں اقامتِ عدل کے فرض کی ادائیگی کے قابل ہو جائے۔

ان آیات نے عیسائیت کے "موروثی" گناہ کے عقیدے کی جڑیں بھی کھود دی ہیں۔ ہر شخص کی نیکی بدی اپنے ہی لئے ہے۔ وہ خود اس کا ذمہ دار اور نتائج کا حامل ہے۔ اپنا بوجھ کسی اور پر نہیں لاد سکتا۔ یہی فطرت کی تعلیم ہے اور اس کے خلاف جو کچھ ہے محض شور و شغب ہے۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ

کچھ اچھے نہیں ان کے اکثر مشورے مگر جو کوئی

أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ

کہ کہے صدقہ کرنے کو یا نیک کام کو یا صلح کرانے کو

بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ

لوگوں میں اور جو کوئی یہ کام کرے اللہ کی

مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

خوشی کے لئے تو ہم اس کو دیں گے بڑا ثواب

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ

اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ اس پر

Marfat.com

لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ

کھل چکی سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے راستے کے خلاف

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ

تو ہم حوالہ کر دیں گے اسکو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور اسے دوزخ میں

سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع

ع ۱۴ ۵

ڈالیں گے اور وہ بہت بُری جگہ پہنچا

شرح الفاظ

لہ نَجْوَاهُمْ: ان کی سرگوشی، کانا پھوسی، پوشیدہ بات۔
نَجْوٰى نَجِيٌّ: کی جمع بھی ہے، اس صورت میں نجواہم کا معنی ہوگا۔ ان میں سے سرگوشی کرنے والے۔ مَعْرُوْفٍ بھلی چیز جو فطرت و عقل سلیم کے مطابق ہو اور شرعی احکام کے خلاف نہ ہو۔ ابْتِغَآءَ: طلب و تلاش کرنا۔ يُشَاقِقِ: اس کا مصدر مشاقۃ ہے، بمعنی مخالفت و عداوت۔ اس کا مادہ شق ہے، کیونکہ دو مخالفوں میں سے ہر ایک دوسرے کی خلاف سمت (شق) پر ہوتا ہے۔

ان آیات میں بھی طعمہ بن ابیرق اور اس کے اعوان و انصار کا ذکر ہے۔

آیت ۱۱۵ :- بالخصوص اس مرتد منافق کی عداوت و مخالفت کا اعلان کر رہی ہے، جیسا کہ اوپر ابن جریرؒ سے اس کا شانِ نزول بیان کیا جا چکا ہے۔

لہ آیت ۱۱۴ :- منافق اور حیلہ گر آپؐ کے کان میں بات کرتے تاکہ لوگوں میں اپنا اعتبار بڑھائیں اور مجلس میں بیٹھ کر آپس میں یہودہ سرگوشی کیا کرتے کسی کی عیب جوئی کسی کی شکایت کرتے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جو لوگ باہم کانوں میں مشورے کرتے ہیں ان کے اکثر مشورے خیر سے خالی ہوتے ہیں۔ صاف اور سچی بات کو چھپانے کی حاجت نہیں۔ اگر چھپاتا ہے تو گویا اس میں کوئی فریب ہوتا ہے البتہ کوئی چھپائے تو صدقہ اور خیرات کی بات کو چھپائے تاکہ لینے والا شرمندہ نہ ہو۔ یا کسی ناواقف کو غلطی سے بچائے اور اس کو اچھی بات

لہ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۵۲-۱۵۳
۔ فوائد القرآن صفحہ ۱۲۵، تفسیر حقانی ج ۲ صفحہ ۲۲۵-۲۲۶، تفسیر ابن کثیر پ ۵ صفحہ ۱۰۱-۱۰۲

Marfat.com

اور صحیح مسئلہ بتلائے تو چھپا کر بتائے تاکہ اس کو ندامت نہ ہو۔ یا دو آدمیوں میں لڑائی ہو اور غصہ والا جوش میں صلح نہیں کرتا تو اوّل کوئی تدبیر بنا کر پھر اس کو سمجھائے، حتیٰ کہ توریہ کی بھی اجازت ہے۔ آخر میں فرمایا کہ جو کوئی امور مذکورہ کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرے گا اس کو بڑا عظیم الشان ثواب ہوگا۔ یعنی ریاکاری یا کسی اور دنیاوی غرض کے لئے نہ ہونا چاہیئے۔

آیت ۱۱۵: ۔جب کسی پر حق بات واضح ہو چکے، پھر اس کے بعد بھی وہ رسولؐ کے حکم کی مخالفت کرے اور سب مسلمانوں کو چھوڑ کر اپنی الگ راہ اختیار کرے تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جیسا کہ اس چور نے کیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے قصور کا اعتراف کرتا اور توبہ کرتا اس نے یہ کیا کہ ہاتھ کٹنے کے خوف سے مکہ بھاگ گیا اور مشرکین میں مل گیا۔

اکابر علماء نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا کہ اجماعِ اُمّت کا مخالف اور منکر جہنمی ہے۔ یعنی اجماعِ امّت کو ماننا فرض ہے حدیث میں وارد ہے کہ اللہ کا ہاتھ مسلمانوں کی جماعت پر ہے جس نے جدی راہ اختیار کی وہ دوزخ میں گر پڑا۔

۱؎ اجماعِ امّت کے حجّتِ شرعیہ ہونے کی تقریر استدلال یہ بیان کی گئی ہے کہ طریقِ مؤمنین سے الگ ہونا جب حرام اور باعثِ جہنم ٹھہرا تو اس کا عکس یعنی اتباعِ طریقِ مومنین واجب ہے۔ اور اس کی مخالفت بھی کتاب و سنّت کی مخالفت کے بعد ناجائز ٹھہرے گی۔ اور یہاں قرآن مجید نے عدم اتباعِ طریقِ مومنین کو مخالفت رسولؐ کے ساتھ جمع کر کے فرمایا ہے (مدارک، ابن کثیر)

۲؎ سرگوشی کے خیر نہ ہونے میں کثیر کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ بعض سرگوشیاں ایسی خاص باتوں میں ہوتی ہیں جنہیں شر سے موصوف نہیں کیا جا سکتا، گویا وہ خیر مقصود میں بھی داخل نہ ہوں، مثلاً زراعت اور تجارت اور دیگر کاروبار میں جو حسبِ ضرورت و مصلحت سرگوشی کی جائے۔ وہ بہت سی سرگوشیاں جن کی خیر کی نفی کی گئی ہے ان سے مراد لوگوں کے بارے میں اور ان کے معاملات میں سرگوشی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تین قسم کی سرگوشی کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جو خیر و برکت کی بنیاد ہیں۔

قرآن کریم نے سرگوشی کو کئی مقامات پر گناہ اور شر کا امکان اور مظنہ قرار دیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے۔

إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ الخ

غور سے معلوم ہوتا ہے کہ عادۃً سرگوشی کے اکثر گناہ اور شر کا باعث ہونے کا سبب یہ ہے کہ

۱؎ تفسیر واحدی، صفحہ ۲۱۶ ۲؎ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۵۳/۱۵۶۔ تفسیر المنار ج ۵۔

Marfat.com

عموماً نیکی کے اظہار اور اسے برملا بیان کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ اسی طرح اکثر جو چیز چھپا کر کی جائے وہ اکثر شر اور گناہ ہوتی ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ: گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور تم اسے لوگوں کے سامنے کرنے اور لوگوں کے اس پر مطلع ہو جانے کو بُرا جانو۔

خداوند تعالیٰ کی رضا و اخلاص اور عدم ریا میں ہے۔ شہرت کی طلب اور ریاکاری اعمال کو ضائع کر دیتی ہے۔ جیسا کہ فخریہ مال دار کرتے ہیں ان کا نیکیوں کا برملا اظہار کرنا اس بات کا غماز ہے کہ وہ نیکی سے رضائے الٰہی کے طالب نہیں ہیں بلکہ دنیوی نفع چاہتے ہیں۔ اس لئے نیکی کا اخفاء ان پر شاق ہے۔ وہ نیکی کو لوگوں کے دلوں کو اپنے لئے مائل کرنے کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔ ان سے اپنی خدمت اور اعزاز و اکرام کے خواہش مند ہیں۔

آیت ۱۱۵ :- میں خداوند کریم کے دیئے ہوئے ارادے اور اختیار کا ذکر ہے۔ جو شخص برائی کی راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے زبردستی اس سے نہیں ہٹاتا بلکہ اس کے اعضاء و جوارح اور قوتیں اس میں اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ کو بھیج دیا ہے۔ راہِ حق واضح کر دی ہے اور اس پر چلنے والے مومنین سامنے موجود ہیں۔ اگر کوئی اس راہ پر چلنا چاہے تو چل سکتا ہے۔ اور اگر نہیں چلنا چاہتا اور اپنے ارادے اور اختیار سے راہِ ضلالت کو اختیار کر لیتا ہے تو اسے اسی راہ پر چلنے کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہاں عاقبت اور انجام اس کا بہت خراب ہوگا۔ اور یہ چیز بھی پہلے سے واضح کر دی گئی تاکہ نیکی کی ترغیب ہو۔

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ اندھی تقلید اور جہالت کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ راہِ حق کو پانے کے لئے برابر کوشش کریں، اخلاص سے نظر و فکر اور استدلال کو کام میں لائیں مگر انہیں دعوت حق ہی صحیح طور پر نہ پہنچے تو وہ انشاء اللہ تعالیٰ معذور ہوں گے۔ کیونکہ ان کے سامنے ہدایت کا تبیّن نہیں ہو سکا۔

لہ قرآنِ پاک نے کئی بار سرگوشی سے منع فرمایا ہے۔ سرگوشی (نجوی) یہ ہے کہ مسلم جماعت اور قیادت سے بعید کوئی طائفہ پوشیدہ طور پر مشورے کے لئے جمع ہو۔ اسلامی تربیت و تنظیم کا تقاضا یہ تھا کہ ہر آدمی اپنی مشکلات اور معاملات کو براہِ راست رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کر پیش کرے۔ اگر وہ کوئی ذاتی معاملہ لایا ہو تو، بشرطیکہ وہ اسے لوگوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا، آہستہ سے حضورؐ کے کان میں کہہ دے۔ ورنہ برسرِ عام اس معاملے کو بیان کرے جس کا تعلق عوام سے ہو۔
اس روّیے کی حکمت یہ تھی کہ مسلم جماعت میں الگ الگ ٹولیاں نہ بننے پائیں۔ کچھ لوگ

لہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۱۲۶/۲۲۹۔

Marfat.com

اپنے اپنے افکار و تصورات کی بنا پر اصل جماعت سے الگ نہ ہونے پائیں۔ معاشرے میں سازش اور خفیہ اجلاسوں کی بیماری نہ پھیل سکے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کی جماعت گاہ مسجد کو قرار دیا گیا ہے جہاں سب لوگ کھلے بندوں آسکتے ہیں۔ نمازوں کے لئے جمع ہوتے ہیں اور شخصی اور ہر ضروری ملی امر کے لئے مشورہ کرسکتے ہیں۔ خالص ذاتی اور شخصی معاملات کی بات تو دوسری بات ہے، مگر اجتماعی معاملات کو اگر اس "پارلیمنٹ ہوس" میں نہ لایا جاتا تو یہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ کوئی چیز مسلم جماعت کے خلاف اندر ہی اندر پک رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافق عموماً چھپ چھپ کر راتوں کو مشورے کیا کرتے تھے۔ پس ضروری معلوم ہوا کہ چند نیک باتوں کو چھوڑ کر لوگوں کے تمام خفیہ مشوروں کو وہ خطاب دیا جائے جو قرآن نے ان آیات میں دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ	
بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخشتا	
مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ	
ہے اس کے سوا جس کو چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا	
بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ اِنْ يَّدْعُوْنَ	
اللہ کا تو وہ بہک کر دور جا پڑا اللہ کے سوا نہیں	
مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا	
پکارتے مگر عورتوں کو اور نہیں پکارتے مگر شیطان	
مَّرِيْدًا ۝ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ	
سرکش کو جس پر لعنت کی اللہ نے اور کہا شیطان نے کہ میں البتہ لوں گا	
عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ	
تیرے بندوں سے حصہ مقررہ اور ان کو بہکاؤں گا	

Marfat.com

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ

اور ان کو امیدیں دلاؤں گا اور ان کو سکھاؤں گا کہ چیریں جانوروں کے

الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ

کان اور ان کو سکھاؤں گا کہ بدلیں صورتیں بنائی ہوئی اللہ کی

وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور جو کوئی بنا لے شیطان کو دوست اللہ کو چھوڑ کر

فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝۱۱۹ يَعِدُهُمْ

تو وہ پڑا صریح نقصان میں ان کو وعدہ دیتا ہے

وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا

اور ان کو امیدیں دلاتا ہے اور جو کچھ وعدہ دیتا ہے ان کو شیطان سو

غُرُوْرًا ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؗ وَلَا

سب فریب ہے الیسوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور نہ

يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ۝۱۲۱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

پائیں گے وہاں سے کہیں بھاگنے کی جگہ اور جو لوگ ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

اور عمل کئے اچھے ان کو ہم داخل کریں گے باغوں میں جن کے نیچے بہتی

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ

ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی ہمیشہ وعدہ ہے

Marfat.com

اللّٰہِ حَقًّا ۗ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ﴿۱۲۲﴾

اللہ کا سچا اور اللہ سے سچا کون؟

شرح الفاظ

یَسْئَلُکَ عُوْنَ: ان کی طرف توجہ کرتے ہیں اور ان سے ایک سمجھ میں نہ آنے والے غیبی تسلط و اقتدار کے پیش نظر مدد طلب کرتے ہیں۔ اِلَّآ اِنَاثًا: اہل عرب بعض دفعہ مرد کے پر مؤنث کے لفظ کا اطلاق کرتے ہیں، کیوں کہ وہ اسے ضعیف و عاجز جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے اِنَاثًا کا معنی ہے (اموات/ مردے) شَیْطٰنًا: جن و انس میں سے جو خبیث و موذی ہو اُسے شیطان کہتے ہیں۔ مَرِیْدًا: سرکش، اغواء و اضلال کا ماہر و فنکار۔ مرد کے دونوں معنی ہیں مہارت و تمرّد (استکبار اور سرکشی) لَعَنَہُ اللّٰہُ لعن کا معنی ہے ناراضگی اور اہانت کے ساتھ کسی کو دور ہٹانا اور نکال دینا۔ نَصِیْبًا حصہ، کسی چیز میں سے کچھ نکالا ہوا ٹکڑا۔ مَفْرُوْضًا: معیّن اور مقرر شدہ۔ لَاُمَنِّیَنَّھُمْ: میں انہیں ضرور ہی امانی میں مبتلا کر دوں گا، امانی اُمنیہ کی جمع ہے، یعنی خالی خولی خواہش و آرزو۔ تمنّی کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ دل میں کسی چیز کا اندازہ لگانا اور اس کی تصویر کشی کرنا خواہ وہ محض ظن و تخمین سے ہو یا دیکھ کر کسی دلیل سے۔

لیکن زیادہ تر اس کا استعمال ظن و تخمین اور حدس پر اور بے حقیقت خیالات پر ہوتا ہے۔ فَلَیُبَتِّکُنَّ تبک کا معنی ہے قطع کرنا، کاٹنا، سَیْفٌ بَاتِکٌ (یعنی تیز تلوار) اسی سے ہے۔ تبتیک کا معنی ہے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنا۔ غُرُوْرًا:۔ باطل، دھوکا بے حقیقت چیز۔ مَحِیْصًا بھاگنے اور خلاصی پانے کی جگہ حیص بیص یا حاص باص کا معنی ہے ایسی مشکل جس سے نکلنا دشوار ہو۔

اوپر گزر چکا ہے کہ بشیر منافق (طعمہ بن اُبیرق) چوری کر کے الزام یہودی پر دھرتا تھا۔ جب معاملہ کھل گیا تو مرتد ہو کر مشرکوں سے جا ملا۔ ان آیات میں فرمایا ہے کہ اگر وہ شخص مرتد نہ ہو جاتا تو سچی توبہ سے اُسکی مغفرت کی امید ہو سکتی تھی، مگر مرتد ہو کر اس نے اپنے اور رحمتِ الٰہی کے درمیان ایک دبیز پردہ ڈال

Marfat.com

لیا۔ یہ پردہ شرک کا تھا۔ خدا کے ہاں ہر گناہ کی بخشش کا جواز ہے مگر شرک کا نہیں۔ مشرک خدا کی رحمت و عفو اور بخشش سے دور پھینک دیا گیا ہے۔ وہ شیطان کا اصلی پیرو ہے جو مردودِ بارگاہ ہے۔

[1] آیت ۱۱۶: ۔ شرک سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے گا بخشش دے گا۔ مگر مشرک کو ہرگز نہ بخشے گا اس کے لئے عذاب ہی مقرر فرما چکا۔ تو چوری کرنا اور جھوٹی تہمت لگانا اگرچہ کبیرہ گناہ ہے مگر یہ بھی احتمال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس چور کو بخش دیتا۔ لیکن جب وہ چور رسولؐ کے حکم سے بچنے کو بھاگا اور مشرکوں میں جا ملا تو اب اس کی مغفرت کا احتمال بھی نہ رہا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شرک صرف یہی نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش کرے بلکہ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں کسی اور کے حکم کو پسند کرنا بھی شرک ہے۔

ضَلٰلًا بَعِيْدًا: دُور جا پڑا۔ اس لئے کہ وہ شخص تو اللہ ہی سے صریح منحرف ہو گیا اور اللہ کے مقابلہ میں دوسرا معبود بنا کر شیطان کا پورا مطیع ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی رحمت سے سب سے مستغنی ہو بیٹھا۔ اور جو اتنی دور جا پڑا تو اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت کا کیوں کر مستحق ہو سکتا ہے! بلکہ ایسے شخص کی مغفرت تو خلافِ حکمت ہونی چاہیئے یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مغفرت سے مایوس فرما دیا گیا اور مسلمان خواہ کتنا بھی گنہ گار ہو چونکہ اس کی خرابی صرف اعمال تک ہے، اس کا عقیدہ، تعلق اور توقع چونکہ جوں کی توں موجود ہیں لہٰذا اس کی مغفرت ضرور ہو گی، جلدی یا دیر کے بعد جب اللہ چاہے گا بخش دے گا۔

آیت ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ان مشرکوں نے اللہ کے سوا جو اپنا معبود بنایا تو ان بتوں کو جنہیں عورتوں کے نام سے نامزد کر رکھا ہے منات، عزیٰ، نائلہ وغیرہ۔ اور حقیقت الامر دیکھئے تو یہ مشرکین شیطان سرکش ملعونِ الٰہی کی پرستش کرتے ہیں، اُسی نے تو بہکا کر ایسا کرایا۔ اور بت پرستی کرنے میں اس کی عین اطاعت اور عین خوشی ہے۔ اس سے مشرکین کی پرلے درجے کی ضلالت اور جہالت و حماقت ظاہر فرمانی مقصود ہے۔

دیکھئے اوّل تو اللہ کے سوا کسی کو معبود بنانا، اس سے بڑھ کر ضلالت اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر بنایا تو کس کو؟ پتھروں کو جن میں کسی قسم کی حس و حرکت ہی نہیں اور عورتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اور کس کے تبلانے سے ایسا کیا؟ شیطان مردود و ملعونِ خداوندی کے بہکانے سے؛ کیا اس ضلالت و جہالت کی نظیر مل سکتی ہے؛ اور کیا کوئی احمق سے احمق بھی اس کو قبول کر سکتا ہے؟

جب شیطان سجدہ نہ کرنے پر ملعون اور مردود کیا گیا تو اس نے اُسی وقت کہا تھا کہ میں تو غارت ہو ہی چکا مگر میں بھی تیرے بندوں میں سے اور اولادِ آدمؑ میں سے اپنے لئے ایک مقدار معلوم اور بڑا حصہ لے لوں گا۔ یعنی ان کو گمراہ کر کے اپنے لئے ساتھ جہنم میں لے جاؤں گا، جیسا کہ سورۂ حجر

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۲۵-۱۲۶۔ تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۲۶-۲۲۸۔

Marfat.com

اور سورۂ بنی اسرائیل وغیرہ میں مذکور ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ متمرد اور ملعون ہونے کے علاوہ شیطان تو جملہ بنی آدم کا اوّل روز سے سخت دشمن اور بدخواہ ہے اور اس دشمنی کو صاف ظاہر کر چکا ہے۔ تو اب یہ احتمال بھی نہ رہا کہ گو شیطان ہر طرح سے خبیث و گمراہ ہے مگر شاید کسی کو خیر خواہانہ کوئی نفع کی بات بتا دے۔ بلکہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دشمن ازلی تو بنی آدم کو جو کچھ بتلائے گا ان کی گمراہی اور بربادی ہی کی بات بتلائے گا۔ پھر ایسے گمراہ اور بدخواہ کی اطاعت کرنا کس قدر جہالت اور نادانی ہے۔

نصیبًا مفروضًا کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ تیرے بندے اپنے مال میں میرا حصّہ ٹھہرائیں گے جیسا کہ لوگ بُت یا جنّ وغیرہ غیر اللہ کی نذر اور نیاز کرتے ہیں۔

آیت ۱۱۹ - ۱۲۰ :۔ شیطان نے کہا کہ جو لوگ میرے حصّہ میں آئیں گے ان کو طریقے طریقے سے گمراہ کروں گا۔ ان کو حیاتِ دنیوی اور خواہشات نفس کے حصول کی اور آخرت کی نفی اور حساب و کتاب کی نفی کی آرزو دلاؤں گا۔ اور اس بات کی تعلیم دوں گا۔ کہ جانوروں کے کان چیر کر ان کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیں گے اور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورتوں کو اور اس کی مقرر کردہ باتوں کو بدل ڈالیں گے۔

کافروں کا دستور تھا کہ گائے، بکری، اُونٹ کا بچہ بُت کے نام کا کر دیتے، اور اس کا کان چیر کر یا اس کے کان میں نشانی ڈال کر چھوڑ دیتے اور صورت بدلنے سے مراد یہ ہے کہ مثلاً خوجہ کرنا یا بدن کو سوئی سے گود کر تل بنانا یا نیلا داغ دینا یا بچوں کے سر پر چوٹیاں رکھنا کسی کے نام کی۔

مسلمانوں کو ان باتوں سے بچنا لازم ہے۔ ڈاڑھی منڈوانا بھی اسی تغییر کرنا خلق میں داخل ہے۔ اور اللہ کے جتنے احکام ہیں کسی میں کوئی تغیر کرنا بہت سخت بات ہے۔ جو چیز اُس نے حلال کر دی اس کو حرام کرنا یا حرام کو حلال کرنا۔ اسلام سے نکال دیتا ہے۔ تو جو کوئی ان کاموں میں مبتلا ہو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ میں شیطان کے مقررہ حصہ میں داخل ہوں جس کا ذکر اوپر گذرا۔

آیت ۱۲۱ :۔ جب شیطان کی خباثت و شرارت اور عداوت کی کیفیت خوب معلوم ہو چکی تو اب اس میں کچھ شک نہ رہا کہ اپنے سچے معبود سے منحرف ہو کر جو کوئی اس کی موافقت کرے گا سخت نقصان میں پڑے گا۔ اس کے تمام وعدے اور امیدیں محض فریب ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان سب کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

آیت ۱۲۲ :۔ جو لوگ شیطان کی خرابی سے محفوظ ہیں اور ارشادِ خداوندی کے موافق ایمان لائے اور اچھے عمل کئے وہ ہمیشہ کے لئے باغ و بہار میں رہیں گے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے جس سے سچی بات کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ پھر ایسے سچے وعدے کو چھوڑ کر شیطان کی جھوٹی باتوں میں آنا کس قدر گمراہی اور کتنی بڑی مضرت کو اپنے سر لینا ہے۔

سلہ مشرک قوموں کی دیومالا (میتھالوجی) میں ہمیشہ دیویوں دیوتاؤں کی ایک بڑی اور اہم تعداد رہی

سلہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۷، ۲۱۶۔

Marfat.com

ہے۔ ہندوؤں میں درگا دیوی، کالی مائی، لکشمی جی، سرسوتی دیوی کے نام ایک ایک کی زبان پر ہیں۔ عرب جاہلیّت میں یہ دیوی پرستی اور زیادہ زور کے ساتھ جاری تھی۔ چنانچہ قرآن پاک میں بھی جاہلی معبودوں کے سلسلہ میں جن ناموں کی صراحت آئی ہے وہ دیویوں ہی کے نام ہیں۔ یعنی لات، منات، عُزّیٰ اور نائلہ وغیرہ لغت میں اُنثیٰ کے ایک معنی دیوی، کمزور اور ضعیف العمل چیزوں کے بھی آئے ہیں۔ (راغب)

پھر چونکہ جمادات تمام تر انفعالیت کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور پتھر کے بت یا مورتیاں انہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں جن میں نہ جان ہوتی ہے اور نہ کوئی قوتِ فاعلی، اس لئے لغت نے اِناث کا استعمال مجازاً ان کے لئے بھی جائز رکھا ہے (راغب، ابن جریر)

شیطان نے کہا تھا کہ میں انسانوں کے عقائد اور بنیادی خیالات کو بھی ڈگمگا دوں گا۔ اور ان کے نفسانی جذبات اور خواہشات کو بھی اُبھار دوں گا۔ گمراہیاں دو ہی طریقوں سے آسکتی ہیں۔ اور انسان شیطانی اثر دو ہی طریقوں سے قبول کر سکتا ہے، ایک عقل و فکر کی راہ ہے اور دوسرے جذبات و احساسات کا راستہ ہے۔ قرآن مجید کے ضلال اور تمنّی کے دو جامع لفظوں نے ان سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ ضلال کے تحت میں ہر قسم کی عقلی، فکری اور نظری گمراہیاں آگئیں۔ اور تمنّی کے تحت میں معاصی و فواحش کی جانب میلان اور نظر سے ان کی مضرتوں کا غائب ہونا آگیا ہے۔

تغییر خلق اللہ کی دو بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں: ایک خلق تکوینی میں تغییر دوسرے خلق شرعی میں تغییر۔ جاہلیت نے تغییر کی بہت سی ترقی یافتہ صورتیں ایجاد و اختیار کر لی ہیں۔ مثلاً مردوں کا چہرے کے بال بالکل صاف کر کے اور طرح طرح کی نزاکتیں اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک عورت بن جانا، عورتوں کا سر کے بال کٹا کر اور مردانہ وضع و لباس اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک مرد بن جانا، ایسے اپریشن کرانا جن سے جنس تبدیل ہو جائے یعنی عورت، مرد، اور مرد عورت بن جائے۔ خلقِ شریعی میں تغییر کا معنی ہے احکامِ دین میں تحریف کرنا۔ شرک کی تمام اقسام بھی اس میں داخل ہیں (راغب، جلالین، قرطبی)

یَعِدُهُمْ: مثلاً یہ شیطانی وعدے کہ حشر و نشر اور حساب و کتاب وغیرہ کچھ نہیں۔ جو کچھ ہے یہی مادی دنیا ہے۔ جزوی عقل ہی سب سے بڑا اور آخری معیار ہے، وحی الٰہی محض وہم ہے، مادہ کی قوتیں اور قوانین ہی سب کچھ ہیں، ان کے اوپر کوئی مشیّتِ اعلیٰ حاکم نہیں وغیرہ۔

یُمَنِّیَنَّهُمْ: شیطانی جذبات مثلاً یہ کہ فحش کاری میں کوئی عیب نہیں شراب صحت کے لئے ضروری ہے، قانونِ حجاب ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

لہ مشرک بتوں کو عورتوں کا نام دیتے تھے، فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے! بتوں کی صورتیں

لہ تفسیر ابن کثیر پ۵ صفحہ ۱۰۲-۱۰۳

Marfat.com

عورتوں جیسی بناتے تھے (انہیں عورتوں کا سالباس پہناتے تھے۔ مؤلف) اس وجہ سے اِناثاً کا لفظ بولا گیا ہے۔

۱؎ تغییر خلق اللہ (خدائی بناوٹ میں ردوبدل کرنا) کا مطلب اشیاء کی پیدائشی بناوٹ میں ردوبدل کرنا نہیں ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے تو پوری انسانی تہذیب ہی شیطان کے اغوا کا نتیجہ قرار پائے گی۔ اس لئے کہ تہذیب تو نام ہی ان تصرفات کا ہے جو انسان خدا کی بنائی چیزوں میں کرتا ہے۔ دراصل اس جگہ جس ردوبدل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لئے خدا نے اسے پیدا نہیں کیا۔ اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ تمام افعال جو انسان اپنی اور اشیاء کی فطرت کے خلاف کرتا ہے، اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشائے فطرت سے گریز کے لئے اختیار کرتا ہے، اس آیت کی رُو سے شیطان کی گمراہ کن تحریکات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً عملِ قوم لوط، ضبطِ ولادت، رہبانیت، برہمچرج، مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مردوں کو خواجہ سرا بنانا، عورتوں کو ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں، اور انہیں تمدن کے ان شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لئے مرد کو پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار افعال جو شیطان کے شاگرد دنیا میں کر رہے ہیں۔ دراصل یہ معنی رکھتے ہیں۔ کہ یہ لوگ خالق کائنات کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کو غلط سمجھتے ہیں اور انہیں اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

۲؎ آیت ۱۱۶:- جیسی آیت بعینہٖ اس سے قبل اسی سورت میں گزر چکی ہے وہاں جس ربط میں آئی تھی اور اس سے جو غرض تھی وہ اور تھی اور یہاں اس سے اور فوائد و اغراض مطلوب ہیں۔ قرآن پاک ایک ہی مضمون کو بار بار کئی مقاصد کے لئے دہراتا ہے۔

بعض دفعہ غرض یہ ہوتی ہے کہ اس مضمون کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس لئے اس کا تکرار ضروری ہوتا ہے۔ بعض دفعہ اس مضمون سے ہر جگہ الگ الگ، اگرچہ بنیادی طور پر ایک مقصد کا حصول پیش نظر ہوتا ہے۔ قاعدہ یہ بھی ہے کہ جو مضمون بنیادی اور اہم ہو اسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سیاسی و دینی رہنما اس تکرار سے بار بار اپنے مطلوبہ مقاصد کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے لئے کتب و صحائف، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سارے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہیں۔ جس چیز کو بار بار دہرایا جائے وہ ذہن و دماغ میں قرار پکڑ لیتی ہے اور اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ انسانی ذہن کی ساخت ہی ایسی ہے کہ جس چیز کی مدح یا مذمت اکثر سنے اس سے ضرور متاثر ہو جاتا ہے۔

۱؎ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۵۷/۱۶۳/ تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۱۸/۴/۱۳۱ ۲؎ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۳۹۸-۹۹

Marfat.com

شرک ارواح کے فساد اور عقول کی ضلالت کی انتہا ہے اسے سو خوبیوں اور نیکیوں میں چھپاؤ اس کی خباثت و نجاست کم نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اچھائیوں کو بھی لے ڈوبتا ہے اور اس کی گندگی ان پر بھی غالب آجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خلوص کو چاہتا ہے، وہ دوئی پسند نہیں۔ اور شرک کی فطرت ہی اخلاص کے خلاف ہے۔

افسوس بعض نام نہاد مسلمان توسّل و شفاعت کے بہانے سے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ غیر اللہ کو مصائب میں پکارتے ہیں مگر اس کا نام دعا رکھتے ہیں، حالاں کہ نام بدلنے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ وہ جنہیں پکارتے ہیں انہیں اولیاء و شفعاء کا نام دیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی وہ شرک ہے جس میں مشرکین مکہ مبتلا تھے۔

اگر ایسے لوگوں میں اس دعا من غیر اللہ کے علاوہ اور کوئی شرک نہ بھی پایا جائے تب بھی ان کے اس فعل کے شرک ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ۔ (ابوداؤد) یعنی عبادت اپنے اصلی رنگ میں دعا ہی میں ظاہر ہوتی ہے جیسے انسان مصائب کے وقت دل کی گہرائی سے نکال کر زبان پر لے آتا ہے یہی وہ چیز ہے جو مشرک اور موحد میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ مشرک مصائب و شدائد میں غیر اللہ کو پکارتے ہیں، ان پر بھروسہ کرتے ہیں اور دل کا قرار حاصل کرتے ہیں۔ شرک اور کس بلا کا نام ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ الخ۔

شرک کی کئی قسمیں ہیں۔

ا۔ شرک فی العبادۃ جس کا اظہار غیر اللہ سے دعا کرنے میں ہوتا ہے۔ یہ شرک کی قوی ترین قسم ہے۔

ب۔ وہ شرک جو عقل و فکر اور نظر و استدلال میں خطا پر مبنی ہے اور جس میں شبہات و وساوس کا بڑا دخل ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو دنیوی حاکموں جیسا ٹھہرا کر اس کے تقرب کے لئے اسی قسم کے وسائل کا سہارا ڈھونڈنا جیسا کہ دنیا دار حاکموں کے تقرب کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ وسیلہ، سفارش اور درجہ بدرجہ تقرب اس شرک کے خصائص ہیں۔

ج۔ ربوبیت میں شرک، یعنی مخلوق میں سے کسی کو شارع اور قانون ساز سمجھنا اور اس کی تحلیل و تحریم پر اعتماد رکھنا۔

Marfat.com

ان آیات سے واضح ہے کہ آخرت کی جزا نفس کی حالت پر مبنی ہے جو اسے دنیا میں حاصل تھی۔ مثلاً عقیدہ کی سلامتی اور درجہ فضیلت کی مقدار جس کے لئے نیکی کا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح سزا و عقاب کا مدار فسادِ عقیدہ اور رذائل کے اکتساب پر ہے۔ انسانوں کے درجے جزا و سزا میں بہت متفاوت ہیں۔ پست ترین درجہ شرک کا اور اعلیٰ ترین توحید کا ہے۔ ان دونوں کی اپنی اپنی صفات ہیں جو ان کے موافق و مناسب ہیں۔ پس شرک و کفر کی مغفرت نہیں ہو سکتی کیوں کہ اگر مشرک کو بھی پیغمبروں، صدیقوں، شہدا اور صالحین کے ساتھ ملا دیا جاتا تو یہ سنتِ خداوندی کے بالکل خلاف تھا۔

ان آیات نے انسان اور اس کے قدیم دشمن شیطان کے درمیان ایک دائمی معرکے کی تصویر پیش کی ہے جس انسان میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ میں خلیفۃ اللہ اور اشرف المخلوقات ہوں، اور شیطان میرا ازلی دشمن ہے۔ وہ شیطان کے پھیلائے ہوئے شرک اور مشرکانہ رسوم کے جال میں نہیں پھنس سکتا۔ اسلام نے اس دائمی جنگ میں کامیابی کے لئے لازم قرار دیا ہے کہ آدمی خدا اور اس کے دوستوں کے جھنڈے تلے آ کھڑا ہو اپنا نام حِزْبُ اللّٰہ میں لکھوا لے اور اس دائمی جنگ میں اپنا وزن نیکی کے پلڑے میں ڈال دے۔ شیطان اور اس کے ساتھی کبھی اپنی اس جنگ سے نہیں تھکتے، نہ اکتاتے ہیں۔ انسان کی دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ اللہ کا دوست ہوگا یا شیطان کا۔ تیسری کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ ہر شخص کو اپنا مقام اور موقف معلوم کر لینا چاہیئے اور سمجھ سوچ کر اس معرکہ میں کودنا چاہیئے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ

نہ تمہاری امیدوں پر مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ

جو کوئی برا کام کرے گا اس کی سزا پائے گا اور نہ پائے گا اپنا اللہ کے سوا

اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ

کوئی حمائتی اور مددگار اور جو کوئی اچھے کام

الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ

کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہو

سلسلہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۲۳۱۔

Marfat.com

فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ

سو وہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور ان کا حق ضائع نہ ہوگا

نَقِيْرًا ۝۱۲۴ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ

تل بھر اور اس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے پیشانی رکھی

وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ

اللہ کے حکم پر اور وہ نیک کاموں میں لگا ہوا ہے اور چلا دین ابراہیم پر

حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝۱۲۵

جو ایک ہی طرف کا تھا اور اللہ نے بنا لیا ابراہیم کو خالص دوست

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور سب

اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝۱۲۶ ع ۱۶

چیزیں اللہ کے قابو میں ہیں

شرح الفاظ

[1] اَمَانِیّ: اُمْنِیَّۃٌ کی جمع ہے۔ کسی چیز کی تمنا سے نفس میں اس کی جو صورت بنتی ہے اسے اُمنیہ کہتے ہیں کئی دفعہ اس سے مراد بے حقیقت چیز ہوتی ہے، اسی لئے جھوٹ اور جھوٹی آرزو کو بھی اُمنیہ کہا جاتا ہے۔ جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے، مَا تَغَنَّيْتُ وَلَا تَمَنَّيْتُ مُنْذُ اَسْلَمْتُ (جب سے میں اسلام لایا ہوں کسی باطل خیال اور جھوٹی آرزو کا شکار نہیں ہوا) وَلِیًّا: کارساز، معاملے کا ہاتھ میں لینے والا اور مصائب کو دفع کرنے والا۔ نَصِیْرًا: مددگار، مشکلات سے نکالنے والا۔ نَقِیْرًا: کھجور کی گٹھلی کی پشت پر جو

[1] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۶۳-۱۶۵۔

Marfat.com

جو نقطہ ہوتا ہے، اُسے نقرہ بھی کہتے ہیں اور قلت میں اس کی مثال بیان کی جاتی ہے۔ حَنِیْفًا: ضلالت سے، کجی سے ہٹا ہوا۔ خَلِیْلًا: اس کا مادہ خُلَّۃ ہے جس سے مراد دل کی گہرائی میں پیوست ہو جانے والی محبت و مودّت ہے دلی اور سچے دوست کو خلیل کہتے ہیں۔ مُحِیْطًا: سب چیزوں کا عالم اور ان پر قادر۔ شرک کی برائی اور مشرکین و یہود و نصاریٰ کی ضلالت و گمراہی واضح کر دینے کے بعد ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ کہ ہم ویسے نہ ہو جائیں۔

وہ لوگ شیطانی وساوس و غرور کا شکار تھے اور مشرک و ظالم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو "آل اللہ"، خدا کے پیارے اور اس کے بیٹے قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جہنم ان کے لئے نہیں دوسروں کے لئے بنائی گئی ہے۔ انہوں نے غلط شفاعتوں اور جھوٹے وسیلوں پر تکیہ کر لیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں بعض کمزور ایمان کے لوگوں کے دلوں میں اسی قسم کی غلط آرزوئیں پیدا ہونے کا خدشہ پیدا ہوا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے دفع کیا ہے۔

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ۔

ہر زمانے کے کمزور ایمان کے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نصیحت فرمائی۔ افسوس بعد والے مسلمانوں میں یہی بیماری سرایت کر گئی، اگر وہ ان آیات پر غور و تدبر کریں تو یقیناً اس بیماری سے شفاء حاصل ہو جائے۔

ابن ابی شیبہ نے حسن بصریؒ سے ایک موقوف حدیث روایت کی ہے کہ۔ ایمان آرزو اور جھوٹی شیخی سے حاصل نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک حقیقت کا نام ہے جو دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور عمل اس کی تصدیق کرتا ہے۔ حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ کچھ لوگوں کو مغفرت کے غلط تصور نے دھوکے میں ڈال دیا، وہ دنیا سے گناہوں سے لدے ہوئے رخصت ہوئے، اگر سچے مومن ہوتے تو اچھے عمل بھی کرتے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدیؒ سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ کچھ مسلمان اور یہود و نصاریٰ باہم ملے۔ یہود نے مسلمانوں سے کہا کہ ہم تم سے بہتر ہیں۔ ہمارا دین تمہارے دین سے پرانا ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے اتری تھی۔ ہمارا نبیؑ تمہارے نبیؐ سے پہلے ہوا ہے، ہم ابراہیمؑ کے دین پر ہیں اور ہم یہود کے علاوہ کوئی جنت میں نہ جائے گا۔

اس کے بعد نصاریٰ نے بھی اسی طرح کی باتیں کہیں۔ مسلمان کہنے لگے کہ ہماری کتاب تمہاری کتاب کے بعد اتری، ہمارا نبیؐ تمہارے نبیؐ کے بعد آیا، تمہیں حکم دیا گیا ہے کہ ہمارا اتباع کرو اور اپنا طریقہ چھوڑ دو پس ہم تم سے بہتر ہیں، ہم ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے دین پر ہیں اور جنت میں صرف وہی داخل ہوگا جو ہمارے دین پر ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کر کے مسلمانوں کی حجت کو کامران کیا اور راہِ حق

Marfat.com

کی وضاحت فرمائی۔

سلہ آیت ۱۲۳-۱۲۴:- کتاب والوں یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کو خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں جن گناہوں پر خلقت پکڑی جائے گی ہم نہ پکڑے جائیں گے۔ ہمارے پیغمبرؑ حمایت کر کے ہمیں بچالیں گے۔ اور نادان اہل اسلام بھی اپنے حق میں یہ خیال کر لیا کرتے تھے۔ سو فرما دیا کہ نجات اور ثواب کسی کی امید اور خیال پر موقوف اور منحصر نہیں جو برا کام کرے گا پکڑا جائے گا۔ کوئی ہو اللہ کے عذاب کے وقت کسی کی حمایت کام نہیں آسکتی۔ اللہ جس کو پکڑے وہی چھوڑے تو چھوٹے۔ دنیا کی مصیبت اور بیماری کو دھیان کر لو۔ اور جو کوئی نیک عمل کرے گا۔ بشرطیکہ ایمان بھی رکھتا ہو۔ سو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور اپنی نیکیوں کا پورا ثواب پائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ثواب و عذاب کا تعلق اعمال سے ہے کسی کی امید اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا۔ پس ان امیدوں پر لات مار دو اور نیک کاموں میں ہمت کرو۔

آیت ۱۲۵:- پہلے معلوم ہو چکا کہ اللہ کے نزدیک اعمال کا اعتبار ہے یہودہ آرزو کا کوئی نتیجہ نہیں۔ اہل کتاب وغیرہ سب کے لئے یہی قاعدہ مقرر ہے۔ اس میں اشارہ تھا، اہل اسلام یعنی حضرات صحابہؓ کی تعریف اور فضیلت کی طرف اور اہل کتاب کی مذمت اور برائی کی طرف۔ اب کھول کر فرماتے ہیں کہ:- دینداری میں ایسے شخص کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ کہ جو شخص اللہ کے حکم پر سر رکھے ہوئے ہے اور نیک کام میں دل سے لگا ہوا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کے دین کی سچی پیروی کرتا ہو جو سب کو چھوڑ کر اللہ کا ہو گیا تھا اور اللہ نے اس کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ تینوں خوبیاں حضرات صحابہؓ میں علی وجہ الکمال موجود تھیں نہ کہ اہل کتاب میں اب اس سے اہل کتاب کی وہ آرزو جو پہلے گزری، محض لغو اور باطل ہو گئی۔

آیت ۱۲۶:- زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب خدا کے بندے اور اس کی مملوک و مخلوق ہیں اور اُس کے قبضہ میں ہیں۔ اپنی رحمت و حکمت سے جس کے ساتھ جو چاہے اور جیسا چاہے معاملہ کرے۔ اُس کو کسی کی حاجت نہیں۔ خلیل بنانے سے کوئی دھوکا نہ کھائے اور اہل عالم کے جملہ اعمالِ خیر و شر کی جزا اور سزا میں تردد نہ کرے۔

سلہ وَهُوَ مُؤْمِنٌ:- ایمان کی قید بہت ضروری ہے۔ ہر عمل کے واقعۃً صالح ہونے کے لازم ہے کہ محرکِ عمل بھی صحیح ہو۔ ایمان ہی عمل کی جڑ اور اس کا محرک ہے۔ پس ریاکاری، نمائش یا دہم پرستی مقصود نہ ہو اور عمل صرف لِلّٰہ ہو مؤلف اسی اخلاصِ نیت کا نام اور اصطلاح شریعت میں ایمان ہے۔ اور بغیر اخلاصِ نیت کے کوئی عمل مقبول نہیں اس کے بغیر عمل صالح صرف صورۃً ہی صالح ہوگا۔

سلہ فوائد القرآن صفحہ ۱۲۶، تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۲۹-۲۳۰۔ سلہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۷۔

Marfat.com

حقیقت صالحیت سے خالی ہوگا۔ یہیں سے اس بحث کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے کہ جو بعض سطحی دماغ والوں نے آج کل پیدا کر رکھی ہے، یعنی آیا کافروں کے اعمال صالح قبول ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ بغیر اخلاص نیت کے اور بغیر ایمان کے کسی عمل پر عمل صالح کا اطلاق ہی درست نہیں تو اس کے اجر کا کیا سوال ہے؛ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ کے بعد وَهُوَ مُؤْمِنٌ کے الفاظ سے اس مسئلہ کو بھی بالکل صاف کر دیا کہ ایمان اور عمل صالح دو الگ الگ چیزیں ہیں باہم مرادف نہیں (مدارک) مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى سے ان تمام جاہلی مذہبوں کی تردید ہو گئی جو حسن عمل کے باوجود عورت کو محض عورت ہونے کی بنا پر ثمرۂ حسن عمل سے محروم ٹھہرائے ہوئے ہیں (اور اس کے باوجود جب "تہذیب جدید" کی ترنگ میں آتے ہیں تو اسلام پر زبان طعن و تشنیع دراز کر کے عداوت و شقاوت کا ثبوت دیتے ہیں! مؤلف) اسلام میں عورت کو اس کی جنس کی بنا پر ہرگز کسی اجر سے محروم نہیں کیا گیا۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ اس کی فرمانبرداری ظاہر و باطن دونوں طرح سے ہو۔ عقائد و اعمال دونوں کو درست کر لے (ابن عباسؓ، ابن کثیر)

خَلِيْلًا: تورات میں بھی ابراہیمؑ کا لقب "خدا کا دوست" آیا ہے۔

(۲ تواریخ ۲۰: ۷ ایسعیاہ (۴۱: ۸) خلت خالص اور دلی محبت کا نام ہے۔ خلیل کا معنی ہے سچا دوست (تاج، معالم، قرطبی) خلت الٰہی سے مراد تقرب و مقبولیت کا اعلیٰ مقام ہے۔ قرآن نے ملت ابراہیمیؑ (بالفاظ دیگر اسلام) کی پیروی کو لازم گردانا اور ابراہیمؑ کے خلیل اللہ ہونے کا اعلان کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ پیروان اسلام کو آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں خلت کا مقام میسر آسکتا ہے۔

[۱] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں فرمایا تھا کہ لوگو! اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ بن ابی قحافہ کو بناتا، لیکن تمہارا ساتھی (یعنی حضورؐ خود) خلیل اللہ ہے (بخاری و مسلم) حضورؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ بے شک ابراہیمؑ خلیل اللہ ہیں، موسیٰؑ کلیم اللہ ہیں اور عیسیٰؑ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، آدم صفی اللہ ہیں اور میں بطور واقعہ بیان کرتا ہوں نہ کہ فخراً، کہ میں حبیب اللہ ہوں۔ سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں، سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی، سب سے پہلے جنت کا دروازہ میں کھٹکھٹاؤں گا، اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اسے میرے لئے کھولے گا اور میں داخل ہوں گا اور میرے ساتھ فقرائے مومنین ہوں گے اس میں کوئی فخر کی بات نہیں کہ قیامت کے دن میں سب اگلوں پچھلوں سے زیادہ عزت و اکرام والا ہوں گا۔

[۲] روایات میں ہے کہ جب یہ آیت اتری مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ تو اس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر پ۵ صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸

[۲] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۶۵/۱۶۸، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۴۳۱/۴۴۱۔

Marfat.com

کو بہت خوف اور غم لاحق ہوا اور انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! اس آیت کے ہوتے ہوئے کون بچ سکے گا؟

حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم غمگین نہیں ہوتے؟ تمہیں کئی مصائب نہیں آتے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ فرمایا کہ یہ سب گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں (پس اس طرح گناہوں کی مقدار اس قدر نہ رہی کہ جس کی جزا سے تم گھبراتے ہو! مؤلف)

صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمان پر سخت شاق گزری اور انہیں اس سے بہت غم و الم لاحق ہوا۔ پس انہوں نے حضورؐ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ۔ راہِ راست پر چلو اور نیک کاموں میں لگے رہو۔ مسلمان کو دنیا میں جو غم و الم اور تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جو کانٹا اسے چبھے اور جو خراش اسے لگے وہ بھی کفارہ ہے۔ یہ مضمون بہت سی احادیث میں آچکا ہے اسی لئے جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ امراض، اسقام، دنیا کے مصائب اور ہم و غم سب گناہوں کے لئے باعثِ کفارہ ہوتے ہیں۔ اور بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ مصائب اسی وقت کفارہ ہوں گے جبکہ دل میں اچھا اثر چھوڑ جائیں، قوت ایمان کا سبب بنیں۔

ان کی وجہ سے برائی کو ترک کر دیا جائے اور صحیح توبہ کر لی جائے اور عمل صالح کو اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ پس اس لحاظ سے یہ چیزیں عبرت پیدا کر کے نفس و عقل کی تربیت کرتی ہیں لیکن اگر مصائب گناہوں کو بڑھا دیں تو وہ کفارہ نہیں ہوں گی بلکہ اس کے برعکس وہ باعث ذنوب بنیں گی۔ مثلاً اگر مصیبت کے نتیجے میں آدمی بے صبر ہو جائے، جزع فزع کرنے لگے، عزت نفس کو ہاتھ سے کھو دے اور ذلیل ہو جائے۔ ایمان میں کمزوری آجائے اور پہلے سے زیادہ گناہ کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ حدیث میں بیان کردہ کفارہ کا تعلق اس قسم کے گناہوں سے ہرگز نہیں ہے۔

آیت ۱۲۶:۔ اپنے سے پہلی آیات کے خاتمہ کے طور پر آئی ہے، اس کی وجوہات یہ ہیں۔

۱۔ اس بات کی دلیل بیان کرنا کہ گردن خم کرنے اور توجہ کرنے کا مستحق ہر وقت اور ہر حال میں صرف اللہ تعالیٰ ہے جو کہ ہر چیز کا مالک ہے۔ دوسرے تو اپنے نفس کے مالک بھی نہیں ہیں۔

۲۔ ابراہیمؑ کو اللہ نے جو خلیل بنایا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ میں اور ابراہیمؑ میں ذاتی و صفاتی طور پر کوئی مقاربت (رشتہ و قرابت داری) پائی جاتی ہے۔ اس آیت نے

Marfat.com

اس تسم کے ہر وہم کو رد کر دیا ہے۔

۳۔ پچھلی آیات میں جو وعدہ و وعید گزرا ہے اللہ تعالیٰ بوجہ خالق و مالک ہونے کے اسے پورا کرنے پر قادر ہے۔ کوئی چیز اسے اس سے روک نہیں سکتی۔

عمل و جزا کے بارے میں اسلام کا ایک عظیم قانون ہے جو ان آیات میں بیان ہوا ہے۔ وہ یہ کہ ثواب و عقاب کی میزان آرزوؤں اور جھوٹی شیخی پر مبنی نہیں بلکہ ایک ثابت شدہ مضبوط اصل پر قائم ہے۔ اس قانون کے سامنے سب افراد، جماعتیں اور قومیں برابر ہیں۔ اس میں کوئی جانبداری نہیں ہوتی۔ خداوند تعالیٰ سے تعلق کی بنیاد کسی نسب و صہر پر نہیں۔ بلکہ ایمان و عمل پر ہے۔ برائی کی سزا لازم ہے اور نیکی کا بدلہ مل کر رہے گا۔

احسن دین یہ اسلام ہے جو ملّت ابراہیمؑ ہے اور احسن العمل "احسان" ہے، عبادت میں احسان یہ ہے کہ خدا کی عبادت یوں کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیوں کہ تم اگر اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھتا ہی ہے۔ اللہ پاک نے ہر چیز میں احسان کو واجب کیا ہے۔ حتیٰ کہ ذبح کرتے وقت جانور کو راحت پہنچانا اور تیز چھری استعمال کرنا بھی لازم ہے۔

اسلام کی نگاہ میں مرد و عورت "نفسِ واحدہ" کے دو پہلو ہیں۔ ان آیات کی رو سے ایمان و عمل اور انسانی جزا و سزا کے قانون میں یہ دونوں برابر ہیں آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عمل کا اعتبار اور اس کی قیمت ایمان پر منحصر ہے۔ ایمان کے بغیر عمل کی قبولیّت اللہ کے ہاں منفی اور مفقود ہے۔ کیوں کہ اگر یہ قاعدہ نہ ہو تو ایمان کا کچھ فائدہ نہیں رہتا اور ایمان و کفر مساوی قرار پاتے ہیں۔

اس کے پیش کردہ تصوّرِ توحید میں اور فلسفیانہ توحید میں بنیادی فرق ہے۔ بعض علم اور فلسفے خدا کی وحدانیّت کا اقرار کرتے ہیں مگر اس سے ارادے کی نفی کرتے ہیں۔

بعض علم کی نفی کرتے ہیں۔ بعض تسلّط و اقتدار کی نفی کرتے ہیں، اور بعض ملک و حکومت کی نفی کرتے ہیں۔ ان فلسفوں کی رُو سے توحید الٰہی ایک خالی خولی اور سبلی تصوّر رہ جاتا ہے جس کی لوگوں کی زندگی میں کوئی فاعلی حیثیّت نہیں رہتی نہ ان کے خلاف اخلاق و اطوار میں کوئی اثر رہتا ہے اور نہ ان کے شعور و ادراک اور عملی زندگی میں کوئی واقعیّت۔

وہ محض ایک کلامی مسئلہ ہی رہ جاتا ہے۔ اسلام نے اللہ کو خالق و مالک ہر چیز پر محیط و کارپرداز ہر چیز کا نگران، ذرّہ ذرّہ کے اقتدار و تسلّط کا مالک اور کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا علم رکھنے والا قرار دیا ہے۔ جیسا کہ آیت ۱۲۶ سے ثابت ہوتا ہے۔

سلہ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۲۳۲/۲۳۶۔

Marfat.com

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ

اور تجھ سے رخصت مانگتے ہیں عورتوں کے نکاح کی کہہ دے اللہ تم کو اجازت

فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى

دیتا ہے ان کی اور جو کچھ تم کو سنایا جاتا ہے قرآن میں سو حکم ہے ان یتیم

النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ

عورتوں کا جن کو تم نہیں دیتے جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے

وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ

اور چاہتے ہو کہ ان کو نکاح میں لے آؤ اور حکم ہے ناتوان

مِنَ الْوِلْدٰنِ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ

لڑکوں کا اور یہ کہ قائم رہو یتیموں کے حق میں انصاف پر

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ

اور جو کرو گے بھلائی سو وہ اللہ کو

عَلِيْمًا ۝ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا

معلوم ہے اور اگر کوئی عورت ڈرے اپنے خاوند کے

نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا

لڑنے سے یا جی پھر جانے سے تو گناہ نہیں دونوں پر کہ کرلیں آپس میں کسی

بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ

طرح صلح اور صلح خوب تر ہے اور دلوں کے سامنے موجود

Marfat.com

الشُّحَّ ۚ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ

ہے حرص اور اگر تم نیکی کرو اور پرہیزگاری کرو تو اللہ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۲۸ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا

کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے اور تم ہرگز برابر نہ رکھ

اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا

سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو سو بالکل

تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ

پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو جیسے ادھر میں لٹکتی

وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۲۹

اور اگر اصلاح کرتے رہو اور پرہیزگاری کرتے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۱۳۰)

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا

اور اگر دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو بے پروا کر دیگا اپنی کشائش سے اور اللہ کشائش

والا تدبیر والا ہے۔

شرح الفاظ

يَسْتَفْتُوْنَكَ : اِسْتِفْتَاءٌ، کا معنیٰ ہے فتویٰ طلب کرنا، یہ لوگ آپؐ سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔
يُفْتِيْكُمْ : یہ صورت جو تم پر مشکل ہے اس کا حل کرتا ہے اور اسے کھول کر بیان کرتا ہے۔ اِفْتَاءٌ، کا معنیٰ ہے فتویٰ دینا۔ سوال کا جواب دینا اور خواب کی تعبیر بیان کرنا۔ مَا كُتِبَ لَهُنَّ : ان کا جو حصہ میراث میں مقرر ہے۔ اَنْ تَقُوْمُوْا : تم پورا دھیان رکھو اور صحیح رعایت و نگرانی کرو۔ بِالْقِسْطِ عدل و انصاف سے
خَافَتْ : بعض اسباب و علامات سے اسے ایسی توقع ہو۔ نُشُوْزًا : اعراض اور تکبر و ترفع۔
اِعْرَاضًا : انحراف اور میل فَلَا جُنَاحَ : کوئی حرج، تنگی اور گناہ نہیں۔ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ :

Marfat.com

یعنی لالچ نفسوس کے سامنے حاضر ہے۔ غائب نہیں۔ المعلّقۃ: جو نہ مطلقہ ہے نہ خاوند والی۔ مِنْ سَعَتِہٖ: اپنی غنا سے، فضل و رحمت سے۔ وَاسِعًا: غنی، غیر محتاج، کھلی مغفرت اور رحمت والا۔

خلاصۂ آیات

اس سورہ کی ابتداء میں عورتوں، یتامیٰ اور قرابت کے متعلق احکام بیان ہوئے۔ پھر آیت ۳۶ وَاعْبُدُوا اللّٰہَ سے لے کر آیت ۱۲۶ تک احکام عامّہ ارشاد فرمائے گئے جن کا تعلق دین کی بنیادوں اور اصول سے ہے، اس کے ساتھ ساتھ اہل کتاب، منافقین اور جہاد و قتال کے بعض احکام بیان فرمائے گئے۔ ان موجودہ آیات سے پھر گفتگو اُسی پہلے مضمون کی طرف مڑ گئی ہے اور عورتوں کے متعلق بعض احکام فرمائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے گزشتہ احکام میں کچھ اضافے اور ان کی وضاحت اور صراحت کی ضرورت محسوس کی تھی۔

پس گزشتہ ابتدائی آیات نے دو ضعیفوں یعنی عورت اور یتیم کے حقوق کی مراعات کو واجب ٹھہرایا تھا، مہر اور میراث میں عورتوں کے کچھ حقوق کی تاکید فرمائی تھی۔ ان پر ظلم کرنا حرام قرار دیا تھا۔ اور ظلم و ستم سے بچتے ہوئے چار تک عورتوں سے نکاح کو مباح ٹھہرایا تھا۔ لیکن بارہا ایسا ہو جاتا ہے کہ ان احکام کے بارے میں بعض واقعات میں اشتباہ واقع ہو جاتا ہے، مثلاً عین ممکن ہے کہ دو یا زیادہ بیویوں میں جو عدل و انصاف واجب ہے اس کی حقیقت میں اشتباہ ہو جائے، مثلاً کیا دلی محبت اور اس کے لوازم میں بھی عدل داخل ہے؟ کیا بیویوں میں سے ایک کے ساتھ اگر زیادہ تبسّم و تبسّط کا رویہ اختیار کیا جائے تو دوسری پر یہ ظلم و بے انصافی تو نہ ہوگی؟!

اور کیا یتیم لڑکی سے اگر نکاح کی رغبت ہو تو اسے اگر اس کے مقررہ حصّہ میراث سے محروم کیا جائے تو یہ ظلم و ستم ہوگا یا نہیں؟ علیٰ ہذا القیاس اگر عورت خلاصی چاہتی ہے اور مرد طلاق نہیں دیتا تو کیا ایسی صورت میں کچھ دے دلا کر مصالحت کی گنجائش ہے۔ پس یہ وضاحتیں چونکہ ضروری تھیں، لہٰذا ان آیات میں یہی مضمون بیان فرمایا گیا ہے۔ گویا یہ آیات ان پہلی آیات کی تفصیل و تبیین کی غرض سے نازل فرمائی گئی ہیں۔

امام ابن جریر طبری نے روایت کی ہے کہ جاہلیت میں عورت اور بچہ میراث سے محروم تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء کے شروع میں احکام میراث نازل فرمائے تو یہ چیز لوگوں پر شاق گزری۔ انہوں نے کہا کہ بچہ جو مال کمانے اور اس کی حفاظت کے قابل نہیں کیا وہ بھی وارث ہوگا؟! اور اسی طرح عورت بھی جس کا کسب مال میں

Marfat.com

میں حصّہ نہیں کیا وہ بھی وارث بنے گی؟

انہیں اُمید تھی کہ اس بارے میں کوئی جدید حکم ضرور اترے گا۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو لوگوں نے باہم کہا کہ اگر کوئی حکم نہ آیا تو بہرحال سابقہ نازل شدہ احکام پر عمل واجب ولابدّی ہوگا۔ پس انہوں نے اس بارے میں حضورؐ سے دریافت کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

آیت[1] ۱۲۷: ۔ اس صورت کی ابتداء میں یتیموں کا حق ادا کرنے کی تاکید فرمائی تھی اور حکم دیا تھا کہ یتیم لڑکی جس کا ولی مثلاً چچا کا بیٹا ہو، اگر جانے کہ میں اس کا حق پورا ادا نہ کروں گا تو خود اس سے نکاح نہ کرے بلکہ کسی اور سے اس کا نکاح کر دے اور خود اس کا حمایتی بنا رہے، اس پر مسلمانوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کرنا موقوف کر دیا تھا۔ مگر تجربہ سے معلوم ہے کہ بعض جگہ لڑکی کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کا ولی ہی اُسے اپنے نکاح میں لائے، کیونکہ جیسی رعایت وہ کرے گا کوئی غیر نہ کر سکے گا۔ تب مسلمانوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی اجازت مانگی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور رخصت مل گئی اور فرمایا کہ وہ جو پہلی ممانعت سنائی گئی تھی وہ خاص اس صورت میں تھی کہ ان کا پورا حق ادا نہ کرے۔ اور یتیموں کے حق ادا کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اور جو یتیموں سے سلوک اور بھلائی کرنے کے ارادہ سے ایسا نکاح کیا جائے تو اجازت ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ عرب جاہلیت میں یتیموں کو بعض حقوق سے محروم رکھتے تھے۔

انہیں میراث نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ میراث اس کا حق ہے جو دشمنوں سے لڑائی کرے، یتیم لڑکیوں سے ان کے اولیاء نکاح کر کے نفقہ اور مہر میں کمی اور ان کے مال میں بے جا تصرّف کرتے تھے۔ اب اس موقع پر چند رکوع پہلے سے جو اشارہ چلا آرہا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ واجب الاتّباع حکم الٰہی ہے۔ کسی کی عقل، کسی کا دستور، کسی کا حکم، کسی کی آرزو اور قیاس قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے کسی کی بات سننے اور کسی کا حکم ماننے سے کفر و ضلالت لازم آتی ہے۔ اس مضمون کو طرح طرح کی تاکیداتِ بلیغہ سے ظاہر کر کے دکھلایا ہے۔

اب اس کے بعد آیات سابقہ کا حوالہ دے کر بعض اور مسائل عورتوں اور یتیم لڑکیوں کے نکاح کے متعلق بتلائے جاتے ہیں۔ تاکہ ان تاکیداتِ کے بعد کسی کو عورتوں کے حقوق ادا کرنے میں کوئی شبہ اور حجھک باقی نہ رہے۔

ان آیات میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا لِّمَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ الخ کے مصداق حضرات صحابہؓ ہیں جو کہ نکاح، مہر، نفقہ اور دیگر معاملات میں اپنے زیردستوں کی حق تلفی گوارا نہیں کرتے، اور حکم خداوندی کے مقابلہ میں اپنے منافع اور اغراض ذاتیہ اور اپنی قوم کے رسم و رواج کی اصلاً پرواہ نہیں کرتے۔ یہی لوگ حکم الٰہی کی مخالفت کے احتمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ جو کرتے ہیں، صاف اجازت لینے کے بعد کرتے ہیں۔

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۲۷/ تفسیر حقانی جلد ۳ صفحہ ۲۳۰، ۲۳۲/ تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۱۰۹، ۱۱۲۔

Marfat.com

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری ذرّہ ذرّہ بھلائی کا علم ہے، سو یتیموں اور عورتوں کے حق میں جو بھلائی کرو گے اس کی جزاء ثواب ضرور پاؤ گے۔

آیت ۱۲۸:۔ اگر کوئی عورت خاوند کا دل اپنے سے پھرا دیکھے اور اس کو خوش اور متوجہ کرنے کو اپنے مہر یا نفقہ وغیرہ میں سے کچھ چھوڑ کر اس کو راضی کرے تو اس مصالحت میں کسی کے ذمہ کچھ گناہ نہیں۔ زوجین میں مصالحت اور موافقت بہت ہی اچھی بات ہے۔ البتہ بے وجہ عورت کو تنگ کرنا، اور بلا اس کی رضا کے اس کے مال میں تصرّف کرنا گناہ ہے۔

اپنے نفع اور مال کی حرص اور بخیلی ہر ایک کے جی میں گھسی ہوئی ہے، سو اگر بر مصلحت اگر عورت مرد کو کچھ نفع پہنچائے گی تو مرد خوش ہو جائے گا۔ اور مرد اگر عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کریں گے اور بدسلوکی اور لڑائی سے پرہیز رکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی سب باتوں سے خبردار ہے۔ اس نیکی کا ثواب ضرور عنایت کرے گا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ اعراض اور ناخوشی کی نوبت آئے گی اور نہ راضی کرنے کے لئے کسی کو اپنا حق چھوڑنے کی ضرورت ہوگی۔

آیت ۱۲۹:۔ اگر کئی عورتیں نکاح میں ہوں تو یہ تم سے نہ ہو سکے گا کہ محبت قلبی اور ہر ہر امر میں بالکل مساوات اور برابری رکھو۔ مگر ایسا ظلم بھی نہ کرو کہ ایک کی طرف تو بالکل جھک جاؤ اور دوسری کو درمیان میں لٹکتی رکھو، نہ تو خود ہی آرام سے رکھو اور نہ علیحدہ ہی کرو کہ وہ کسی اور سے نکاح کر سکے۔ اگر اصلاح اور مصالحت کا معاملہ کرو گے اور تعدّی اور حق تلفی سے بچتے رہو گے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔

آیت ۱۳۰:۔ اگر زوجین جدائی ہی پسند کریں اور طلاق کی نوبت آجائے تو کچھ حرج نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کا کارساز ہے۔ وہ سب کی حاجت کا پورا کرنے والا ہے۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ زوجہ کو راحت سے رکھے اور ایذا نہ دے اور اس پر قادر نہ ہو تو پھر طلاق دے دینا مناسب ہے۔ واللہ اعلم۔

سلہ یتیموں اور عورتوں کے حقوق جن کی قرآن نے بار بار اتنی تاکید کی ہے، آج معمولی سی بات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تو آج ہے ظہور اسلام کے ساڑھے تیرہ سو سال بعد باقی اگر ان احکام کی اہمیّت کا پورا اندازہ کرنا ہے تو تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ چھٹی صدی عیسوی میں عرب کی خصوصاً اور ہندوستان، ایران، چین، یورپ کل دنیا کی عموماً کیا حالت عورتوں کے حقوق کے باب میں تھی۔

تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ : رغبت کے یہاں دونوں معنی ہیں یعنی ان کے نکاح میں تمہیں

سلہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۸-۲۱۹۔

Marfat.com

رغبت ہے لیکن حقوق کی ادائیگی نہیں کرتے نہ ان کی میراث کا حصّہ ان کے حوالہ کرتے ہو۔ دوسرا معنی یہ کہ ان کے نکاح سے تو بوجہ یتیم ہونے کے نفرت کرتے ہو لیکن دوسرے سے نکاح اس لئے نہیں کرنے دیتے کہ ان کا حصّہ میراث ادھر جائے گا۔ لبّ لباب دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے یعنی عورتوں کے حقوق کی عدم ادائیگی۔

آیت ۱۲۹ : میں جس عدل کی نفی کی جارہی ہے اس سے مراد غیر اختیاری امور میں مساوات ہے۔ مثلاً کیفیاتِ قلب میں، محبت و رغبت میں، اور ایسی کامل مساوات تو والدین بھی عادتاً اپنی ساری اولاد کے درمیان نہیں رکھ سکتے اوپر کی آیات میں وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً عدل امورِ اختیاریہ میں مراد ہے۔ یعنی ہر بیوی کی ضروریات کا، مزاج و مذاق کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ پس لفظ عدل دونوں جگہ ہے لیکن مفہوم الگ الگ ہے۔

اور اس کی مثالیں قرآنِ پاک کے اسلوبِ بیان میں کثرت سے ملتی ہیں (قرطبیؒ، الجصاص) پس بعض جدید محرّفین نے اس آیت سے جو یہ نکالنا چاہا ہے کہ قرآنِ مجید نے عدل بین الازواج کو ناممکن بتایا ہے۔ اور تعددِ ازدواج کی اجازت صرف عدل کی شرط کے ساتھ دی ہے، تو اس طرح اس اجازت کو ایک بار ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے پھر واپس لے لیا ہے۔ تو ایسے لوگوں نے قرآنِ پاک پر بہت ظلم کیا ہے۔ اور اس کی جانب اس عیب کو منسوب کیا ہے کہ وہ جس چیز سے روکنا چاہتا ہے۔ براہِ راست منع نہیں کر دیتا بلکہ اس کے لئے خواہ مخواہ ایک پُرپیچ راستہ اختیار کیا ہے۔

[1] وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ : یہاں الشح سے مراد تنگ دلی ہے۔ معنی یہ ہوا کہ "نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں، عورت کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے اندر بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو ایک مرغوب بیوی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ مرد کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ جو عورت دل سے اتر جانے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو اس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے، اور اس کے حقوق ناقابلِ برداشت حد تک گھٹا دینا چاہئے۔ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ : مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مساوات نہیں برت سکتا۔

ایک خوب صورت ہے دوسری بدصورت۔ ایک جوان ہے اور دوسری عمر رسیدہ، ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست، ایک بدمزاج ہے اور دوسری خوش مزاج ہے، اور اسی طرح کے

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۴۰۲ - ۴۰۳ -

Marfat.com

دوسرے تفاوت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبت اور رغبت اور جسمانی تعلق میں بھی ضرور ہی دونوں کے ساتھ مساوات کا سلوک رکھا جائے۔ بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنائے رکھتے ہو، تو کم از کم اس سے اس حد تک تعلق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر نہ رہ جائے۔

ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیئے کہ دوسری یوں معلق ہو جائے گویا اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔ آیت کے اس فقرے نے کوئی موقع اس مطلب کے لئے نہیں چھوڑا جو مسیحی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس آیت سے نکالنا چاہتے ہیں۔

سلہ اس آیت (۱۲۹) میں بندگانِ نفس اور غلامانِ شہوت کے لئے بہت بڑی عبرت اور غور و تامل کا موقع ہے۔ ایسے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ خاندانی زندگی کا مقصد بس حیوانی لذت کا حصول اور شہوت رانی کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ انہیں قرآن پاک کے بیان کردہ ان بنیادی مقاصد پر غور کرنا چاہیئے تھا جو ازدواجی زندگی سے مقصود ہیں۔ وہ سکونِ قلب اور مودت و رحمت سے بے خبر ہیں، نسلِ انسانی کے بقاء اور اولاد کی اصلاح و تربیت سے غافل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بالعموم مرنے چکھتے پھرتے ہیں اور بھونرے کی طرح پھولوں کا رس چوس کر اڑ جاتے ہیں۔ عدل و انصاف کی میزان کو قائم نہیں کرتے جس پر حیاتِ زوجیت اور حیاتِ انسانی کا مدار ہے۔

سلہ اسلام جاہلی تصورات کو اور معاشرت کے جاہلی رسوم و رواج کو جدید معاشرے سے خارج کر دینا چاہتا تھا اس نے اس جدید معاشرے کا احساس و شعور اتنا قوی کر دیا تھا کہ باوجودیکہ یہ لوگ نئے نئے جاہلیت سے نکل کر اسلام میں آئے تھے، مگر احکام خداوندی کی ادائیگی کا جذبہ، خوفِ خدا، نافرمانی کی صورت میں بُرے انجام کا احساس ان میں شدید طور پر بیدار ہو گیا تھا۔

سورۂ نساء کی ابتدائی آیات نے جب زمانہ جاہلیت کی قدیم ظالمانہ رسوم پر چوٹ لگائی اور عورتوں اور یتامیٰ کے حقوق مقرر کئے تو لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے۔ وہ ہر وقت اس احساس سے پُر رہتے کہ خدا کا حکم معلوم کیا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے وہ کئی وضاحتیں طلب کیا کرتے تھے اور

سلہ تفسیر المراغی جلد ۵ صفحہ ۳، ۱، تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۲۴۴، ۲۵۲، سلہ فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۲۴۶ ۳

Marfat.com

بعض دفعہ مباحات سے پرہیز تک بھی جا پہنچتے تھے۔ چنانچہ زیر تفسیر آیات میں ان کے دل میں پیدا ہونے والے خدشات و خطرات کو دور کیا گیا ہے، اور بعض سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کے اس احساس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس وقت جو کشمکش وہاں برپا تھی وہ کوئی "طبقاتی جنگ" نہ تھی، جو تاریخ کے جدلی مادی نظریئے کے مطابق دنیا کی ہر تبدیلی اور ہر انقلاب میں کارفرما رہی ہے۔ یہ کشمکش خالصتہً حق و باطل، اسلام اور جاہلیت اور صدل و ظلم کے درمیان تھی۔

مارکس کی جدلی مادیت کا نظریہ یہاں ہرگز صحیح ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہاں ایک جدید انسان جنم لے رہا تھا۔ اس کی تربیت کی جا رہی اور حق و باطل کے اندر جنگ قائم تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جو اعتدال و توازن اور فطرت و انسانیت عظمی کا کامل ترین نمونہ تھے، ان کا ایک ارشاد سنن ابوداؤد میں ہے: "اے اللہ! بیویوں کے درمیان یہ میری تقسیم اور عدل و انصاف ہے، لیکن اس کا تعلق صرف ان اختیاری معاملات سے ہے، جن کا مالک میں ہوں۔ جن چیزوں کا فقط تو مالک ہے، میں نہیں، انہیں مجھ سے مواخذہ نہ کرنا۔ یہ حدیث آیت ۱۲۹ کی صحیح تفسیر ہے۔ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ عدل سے کیا مراد ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ

اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور ہم نے

وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

حکم دیا تھا پہلے کتاب والوں کو

وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا

اور تم کو کہ ڈرتے رہو اللہ سے اور اگر نہ مانو گے تو اللہ کا ہے جو کچھ

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا

آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہے بے پروا

حَمِيْدًا ۝۱۳۱ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

سب خوبیوں والا اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ

Marfat.com

الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۱۳۲ اِنْ يَّشَاْ

زمین میں ہے اور اللہ کافی ہے کارساز اگر چاہے

يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ

تم کو دور کردے اے لوگو! اور لے آئے اور لوگوں کو

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝۱۳۳ مَنْ كَانَ

اور اللہ کو یہ قدرت ہے جو کوئی

يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا

چاہتا ہے ثواب دنیا کا سو اللہ کے ہاں ہے ثواب دنیا کا

وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۱۳۴ ع ۱۹ ۸ ۶

اور آخرت کا اور اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے

شرح الفاظ

وَصَّيْنَا، توصیہ بمعنیٰ حکم ہے یعنی ہم نے حکم دیا۔ غَنِيًّا: غیر محتاج قابلِ تعریف۔

ان آیات کا مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف اور احسان کے جو احکام دیئے ہیں یہ اس لئے نہیں کہ اسے بندوں کے اعمال کی حاجت ہے یا ان سے اس کا کوئی فائدہ وابستہ ہے۔ نہیں۔ بلکہ وہی قادر و مالک اور خالق و مقتدر ہے۔ یہ احکام بندوں کے فائدے کے لئے ہیں۔ اگر ان کی پابندی کریں گے تو خود انہی کا فائدہ ہے اور بصورتِ دیگر انہی کا نقصان بھی ہے۔ خدا کے ہاتھ میں صرف اس دنیا کا نہیں بلکہ دونوں جہان کا بھلا، برا اور ثواب و عذاب ہے۔ احکام میں بندوں کی مصلحت اور بہتری ہے اگر وہ تدبر و تفکر سے کام لیں تو ان کے ایمان مضبوط ہو جائیں۔ اور عمل کا احساس قوی ہو جائے۔

Marfat.com

اور اس کی مخالفت سے بچنا سب کے لئے ضروری ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری کی بات کی طرف دھیان دینا اور اس کی مخالفت سے بچنا سب کے لئے ضروری ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری کی بات کی طرف دھیان دینا اور کان رکھنا ہرگز جائز نہیں۔ بیچ میں چند حکم یتیموں اور عورتوں کے متعلق، جن میں لوگ مبتلا تھے، بیان فرما کر پھر اسی ترغیب و ترہیب کا بیان ہے۔ ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو یہ حکم سنا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اس کی نافرمانی نہ کرو، تو اب کوئی اگر اس کے حکم کو نہ مانے تو وہ سب چیزوں کا مالک ہے۔

اس کو کسی کی پرواہ نہیں۔ یعنی اپنا ہی کچھ بگاڑے گا، اس کا کچھ نقصان نہیں۔ اور فرمانبرداری کرے گے تو سمجھ لو کہ وہ سب چیزوں کا مالک ہے۔ تمہارے سب کام بنا سکتا ہے۔ تین دفعہ فرمایا کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ اوّل سے کشائش اور وسعت مقصود ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ دوسری سے بے نیازی اور بے پروائی کا بیان مقصود ہے، کہ وہ کسی کا حاجت مند نہیں اور اس کو کسی کی پرواہ نہیں اگر تم منکر ہو تو ہوتے رہو، تیسری دفعہ میں رحمت کا اور کارسازی کا اظہار ہے بشرطیکہ تقویٰ اختیار کرو۔

آیت ۱۳۳:۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور دنیا سے اٹھا لے اور دوسرے لوگ پیدا کر دے جو مطیع و فرمانبردار ہوں اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغنا اور بے نیازی خوب ظاہر ہو گئی اور نافرمانوں کو پوری تہدید و تخویف بھی ہو گئی۔

آیت ۱۳۴:۔ اگر تم اللہ کی تابعداری کرو تو تم کو دنیا بھی دے اور آخرت بھی، پھر صرف دنیا کے پیچھے پڑتے ہو اور اس کی نافرمانی کر کے آخرت سے محروم رہتے ہو، یہ بڑی نادانی ہے۔

خوفِ خدا[1] اور تقویٰ الٰہی تمام احکام الٰہی کی تعمیل کی بنیاد ہے اور اسے آسان، اور خوش گوار بنا دینے والی والی بھی۔ انسان کی ساری زندگی کا سنگِ بنیاد یہی تقویٰ ہے اور اس لئے یہ عین مقتضائے حکمت ہے کہ قرآن مجید اس کی تاکید سے لبریز ہے۔ عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے مذہب کی بنیاد خوفِ خدا پر نہیں، بلکہ محبت الٰہی پر ہے اور ان کے پادری اسے بڑے فخر سے پیش کرتے رہتے ہیں۔

حالانکہ ان کی انجیل بھی ان تاکیدوں سے خالی نہیں (متی ۱: ۲۸، لوقا ۱۲ - ۵) اسی طرح تورات میں بھی خوفِ الٰہی کو بہت سے مقامات پر پیش کیا گیا ہے۔ خوفِ خدا کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کی ذات معاذ اللہ خوفناک ہے۔ بلکہ ڈرنا اس کی مخالفت اور اپنی برائی کے برے انجام سے ہوتا ہے قرآن نے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ کہہ کر اعلان کر دیا ہے کہ ذات الٰہی مرکزِ عشق و محبت ہے۔ ڈرنے کا معنیٰ یہ بھی ہوتا ہے کہ خدا کے غیبی تسلط و اقتدار کے سوا اس کائنات میں کوئی ایسا اقتدار نہیں ہے۔ پس کسی اور سے ڈر کر راہِ ہدایت سے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۲۸، تفسیر ابن کثیر پارہ ۵ صفحہ ۱۱۳، ۱۱۴، تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۴۰۵، ۴۰۶ مفہوم

[2] تفسیر ماجدی، صفحہ ۔۔۔

Marfat.com

ہٹ جانا سفاہت وحماقت بھی ہے اور کفر وجہالت بھی! مولف)

كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا : سے یہاں ماضی کا مفہوم مقصود نہیں بلکہ صفتِ قدرت کی ازلیت اور غیر متناہیت کا اثبات مقصود ہے (قرطبی) صیغۂ ماضی لانے میں یہ نکتہ ہے کہ صفت کے قدیم ہونے کی طرف اشارہ ہو جائے ذات وصفات کو کوئی حادث نہ سمجھ لے۔ (قرطبی)

سلہ اس میں ضمناً اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ دین الٰہی اور خدا کے جلال کبریائی کو دنیا میں ظاہر وغالب کرنے میں کسی قوم اور کسی شخص پر انحصار نہیں۔ جب بنی اسرائیل نے ارتداد ونافرمانی کی تو اس نے ان کو پامال کر کے مسیح علیہ السلام کے حواریوں اور ماننے والوں کو سرفراز کر دیا۔ پھر جب انہوں نے دین سے انحراف اور بیشمار بدعات اختیار کیں تو عرب کے ریگستان میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا اور ایک گمنام قوم کو دنیا میں جلوہ گر کر کے روم وایران کی سلطنتوں پر نور افگن کر دیا۔

سلہ غنياً حميدًا : اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے ہی ہر چیز سے غنی ہے، خود بخود محمود ہے اس کی صفات کامل ہیں۔ وہ اپنی تکمیل کے لئے تمہارے شکر کا محتاج نہیں۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔

حدیث قدسی میں وارد ہے کہ: اے میرے بندو! تمہیں یہ مقدور ہرگز نہیں کہ مجھے کوئی ضرر پہنچا سکو، نہ تم میں کبھی یہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ مجھے کوئی نفع پہنچا سکو۔ اگر تمہارے اگلے پچھلے، انسان اور جن تم میں سے کسی پرہیزگار ترین شخص جیسے ہو جائیں تو اس سے میری حکومت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے اور انسان وجن تم میں سے کسی بدترین آدمی جیسے ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کچھ کمی نہیں آتی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن وانسان اگر ایک سپاٹ میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے سوال کریں۔ پھر میں ان میں سے ہر ایک کا سوال پورا کر دوں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی، جس طرح کہ سمندر میں ڈال کر سوئی باہر نکالنے سے اس میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اے میرے بندو! یہ تو تمہارے ہی اعمال ہیں جنہیں میں تمہارے لئے جمع کر رہا ہوں۔ پھر تمہیں ان کی پوری جزا وسزا ملے گی۔ پس جسے بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جسے اس کے سوا کچھ ملے وہ سوائے اپنے کسی کو ملامت نہ کرے (مسلم)

سلہ اسلام کو بھیجنے والا چونکہ خود خالق ومالکِ کائنات ہے، لہٰذا اس کے تشریعی وتکوینی احکام باہم مطابق ومتوافق ہیں۔ خاندانی زندگی کی تنظیم کے بارے میں جو احکام اوپر گزرے ہیں یہ بھی خدا کے اس

سلہ تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۳۳ سلہ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۷۶، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۴۵۲۔ ۴۵۴ سلہ فی ظلال القرآن
سلہ فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۲۴۷۔

Marfat.com

فطری دین کا ایک حصّہ ہیں جو اس ساری کائنات اور ساری حیات کی تنظیم میں کارفرما ہے۔
دینِ اسلام کائناتِ الٰہی کے فطری دین کا ایک حصّہ ہے۔ پس کائنات کی فطرت اور اسلام کے شرعی قوانین اور احکام کی فطرت بالکل ایک ہے۔ دونوں ایک ہی طرف سے آتے اور ایک ہی منبع سے صادر ہوتے ہیں۔ اسلام کے احکام کائنات کی فطرت کی مانند انسان کی فطرت کے بھی موافق ہیں کیونکہ وہ بھی اس کائنات میں رہتا اور اسی کا ایک حصّہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندانی زندگی کے احکام کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے مالک الملک ہونے کا بار بارا عادہ فرمایا ہے۔ ساری کائنات کا نظام ایک ہے۔ کائنات میں ایک ہی خدا کا تسلّط و اقتدار کارفرما ہے، ایک ہی مالک و خالق ہے۔ یہی وہ توحید ہے جس کی وصیّت ساری آسمانی کتابوں میں فرمائی ہے اور اسی کا اظہار و اعلان ان آیات میں فرمایا جا رہا ہے۔

قرآنِ پاک میں اکثر احکام اور اوامر و نواہی کے متّصل بعد میں اللہ تعالیٰ کے اقتدار و ملوکیّت کا ذکر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں فی الحقیقت لازم و ملزوم ہیں۔ جس کو تکوینی سلطنت و اقتدار حاصل ہے اسی کو تشریعی و قانونی تسلّط و اقتدار بھی حاصل ہے۔ اقتدار ایک ہے، صرف اس کے دو پہلو ہیں جو باہم متلازم ہیں۔ یہی عقیدہ توحید کا راز ہے جس کو پا کر انسان حقیقت میں بندہ خدا اور خلیفۃ اللہ بنتا ہے۔ اسی اقتدار سے۔ خوف اور اسی کی مخالفت سے ڈرنا واجب ہے یہی تقویٰ ہے جس کا یہاں اور قرآن میں بہت سے مقامات پر حکم آیا ہے۔ تقویٰ اور توحید دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

ان آیات میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اسلام دارین کی کامیابی کا کفیل ہے۔ دونوں جہان کی سعادت و خیر کا ضامن ہے، وہ یک رخا نہیں بلکہ کامل و شامل کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ

اے ایمان والو قائم رہو انصاف پر

شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ

گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا

وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ

یا قرابت والوں کا اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج ہے تو اللہ اس کا

Marfat.com

أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ

خیرخواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف کرنے میں

وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا

اور اگر زبان ملوگے یا بچاؤ گے تو اللہ تمہارے سب

تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

کاموں سے واقف ہے اے ایمان والو

آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي

یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے

نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ

نازل کی ہے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی تھی

مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ

پہلے اور جو کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر

وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ

اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر تو وہ بہک

ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾

کر دور جا پڑا

Marfat.com

شرح الفاظ

قَوّٰمِیْنَ: قائم کرنے والے۔ بِالْقِسْطِ: انصاف سے عدل سے (کو) شُھَدَآءَ: شاہد اور شہید کی جمع، گواہی دینے والے۔ اَوْلٰی زیادہ حق دار۔ اَلْھَوٰی خواہش نفس۔ تَلْوٗا: لَیٌّ: مصدر سے موڑنا، انحراف کرنا۔ جانبدار بننا۔ تُعْرِضُوْا: اِعراض مصدر سے منہ پھیرنا۔

۵۱ اسلام میں عدل وانصاف اور قسط کا حکم عام ہے۔ سب سے انصاف کا حکم ہے۔ اس سے پہلے معاشرتی احکام میں عورتوں اور یتیموں سے عدل وانصاف کے احکام دیئے گئے، کیوں کہ وہ معاشرے میں ضعیف تھے اور جاہلیت کے دور میں ان سے اکثر بے انصافی کی جاتی تھی۔ ان آیات میں سب لوگوں سے عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی معاملات کی بنیاد ہی عدل وانصاف پر ہے۔ اور نظم وضبط اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ شہادتِ حق کا حکم دیا ہے چاہے کسی کے اپنے خلاف پڑ جائے یا عزیز ترین قرابت داروں کے خلاف، کسی کے فقر وغنیٰ کی وجہ سے جانبداری کو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔ عدل وانصاف انسان کے نفس وقرابت کے حقوق پر بھی مقدم ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں قرابت داروں اور اپنے ہم قوم وہم قبیلہ لوگوں کی جانبداری اختیار کی جاتی تھی۔ اسلام نے اس سے صاف طور پر روک دیا ہے۔ عدل کا معاملہ ہر طرح کے لحاظ ورعائت سے بلند تر ہے۔

۵۲ آیت ۱۳۵: گواہی سچی اور اللہ کے حکم کے موافق دینی چاہیئے، اگرچہ اس میں تمہارا یا تمہارے کسی عزیز واقارب کا نقصان ہوتا ہو۔ حق ہو اس کو صاف ظاہر کر دینا چاہیئے دنیوی نفع کے لئے آخرت کا نقصان نہ ہو۔ سچی گواہی دینے میں اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مال دار کی رعائت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ اور حق کو چھوڑ بیٹھو۔ جو حق ہو سو کہو، اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ اور ان کے مصالح سے واقف ہے اور اس کے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔

زبان ملنا یہ ہے کہ سچی بات تو کہی مگر زبان داب کر اور پیچ سے کہ سننے والے کو شبہ پڑ جائے، یعنی صاف صاف سچ نہ بولا اور بچا جانا، اعراض یہ ہے کہ پوری بات نہ کہی بلکہ کچھ بات کام کی رکھ لی۔ سو ان دونوں صورتوں میں گو جھوٹ تو نہیں۔ بولا مگر بوجہ عدم اظہار حق گنہگار ہوگا، گواہی سچی، صاف اور پوری دینی چاہیئے۔

آیت ۱۳۶: یعنی جو اسلام کو قبول کرے اس کو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں پر دل سے

---

۵۲ فوائد القرآن صفحہ ۱۲۸، تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۳۴/۲۳۵ ر

Marfat.com

یقین لائے۔ اُس کے ارشادات میں سے اگر ایک ارشاد پر بھی یقین نہ لائے گا تو وہ مسلمان نہیں۔ صرف ظاہر اور زبانی بات کا اعتبار نہیں۔

۱۵ احکام خداوندی کی تعمیل میں اور زندگی کے مختلف معاملات میں بار بار راہِ حق و دیانت سے ہٹنے کی ترغیب ہوتی رہتی ہے اور کہیں اپنے ذاتی نقصان کے خیال سے، کہیں بزرگوں عزیزوں کی مروّت اور خاطر سے قدم کو بار بار لغزش ہونے لگتی ہے اس لئے قرآن نے یہاں (آیت ۱۳۵) تاکید کی ہے کہ ایسے تمام موقعوں پر حق و دیانت پر قائم رہو۔ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ کا ایک معنیٰ تو یہی ہے کہ گواہی سے مقصود اللہ کی رضاجوئی ہے (بحر، قرطبی) اور دوسرا معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے گواہ بن جاؤ یعنی تمہاری شہادت، شہادتِ الٰہی کے قائم مقام بن جائے۔

محققین نے لکھا ہے کہ اس آیت کا پورا مصداق تو محدّثین ہوئے ہیں۔ کہ جنہوں نے روایت حدیث کے باب میں کسی کی ذرا رعایت نہیں کی اس لئے وہ "اللہ کے گواہ" بن گئے اور ان کی روایات پر دین کے ایک حصّہ کا مدار ٹھہر گیا۔

فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا: جس کے خلاف تمہاری سچی گواہی پڑ رہی ہے اور اس کی خاطر تم سچے اظہار سے بچنا چاہتے ہو۔ اس پر جتنا تمہارا حق ہے اس سے کہیں بڑھ کر اللہ کا حق ہے۔ جھوٹی گواہی کے محرک عموماً دو ہی ہوتے ہیں یعنی وہ فریق اگر امیر ہے تو اس کا دباؤ، لحاظ، مروّت اور اگر غریب ہے تو اس کے ساتھ جذبۂ ہمدردی۔ یہاں ان دونوں کی جڑ کاٹ دی ہے اور بتایا ہے کہ دونوں صورتوں میں جتنا تمہارا تعلّق ان کے ساتھ ہے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اللہ کا تعلق ان کے ساتھ ہے۔

آیت ۱۳۶: میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو کلمۂ اسلام پڑھ کر اجمالاً تو ایمان لا چکے ہیں اور اسی لئے لقب مومنین سے مشرف ہیں۔ انہی کو تاکید ہو رہی ہے کہ تفصیل کے ساتھ ایمانیات کے ایک ایک جزء پر اپنا عقیدہ مضبوط کریں۔ آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان عقائد میں سے ہر ہر عقیدہ پر فرداً فرداً ایمان لانا ضروری ہے۔ ان میں سے کسی ایک عقیدہ کا بھی انکار دائرہ اسلام سے خارج کر دینے کے لئے کافی ہے۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ سے آگے چاروں جگہ وَاو کے معنیٰ میں ہے (مدارک)

۱۵ آیت ۱۳۵: میں یہ فرمانے پر اکتفاء نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہئیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لئے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہو کہ وہ سہارا تم بنو۔

آیت ۱۳۶: میں ایمان لانے والوں سے کہنا کہ ایمان لاؤ بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن

---

۱۵ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۲۱/۲۲۲۔ ۱۵ تفہیم القرآن صفحہ ۴۶۲ ج ۱

Marfat.com

دراصل یہاں لفظِ ایمان دو الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے، پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے۔ اپنی فکر کو اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویے اور چلن کو اپنی دوستی اور دشمنی کو اپنی سعی و جہد کے مصرف کو بالکل اس عقیدے کے مطابق بنالے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔

آیت میں خطاب ان تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنی کے لحاظ سے "ماننے والوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

۸۱ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو جب رسول اکرمؐ نے خیبر والوں کے کھیتوں اور باغوں کا اندازہ کرنے کو بھیجا تو انہوں نے آپ کو رشوت پیش کی چاہی تاکہ آپ مقدار کم بتائیں۔ تو آپ نے فرمایا! سنو! خدا کی قسم نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تمام مخلوق سے زیادہ عزیز ہیں۔ اور میرے نزدیک تم کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہو، لیکن اس کے باوجود حضورؐ کی محبت میں آکر یا تمہاری عداوت کو سامنے رکھ کر نا ممکن ہے کہ میں انصاف سے ہٹ جاؤں اور تم میں عدل نہ کروں۔ یہ سُن کر وہ کہنے لگے۔ بس اسی سے تو زمین و آسمان قائم ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا معنی جس طرح یہ ہے کہ۔ اے اللہ ہمیں سیدھی راہ پر قائم رکھ اسی طرح یٰاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا کا بھی ہے کہ ایمان لائے ہو تو اس پر قائم رہو، زبان سے مانا ہے تو دل سے مانو، اجمالاً مانا ہے تو تفصیلاً بھی مانو۔

۸۲ قَوَّامٌ مبالغہ کا صیغہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ قسط و عدل کو پوری طرح کامل و تمام قائم رکھا جائے اور اس میں کوئی نقص نہ ڈالا جائے اللہ تعالیٰ نے اقامۃ الصلوٰۃ، اقامۃ الشہادۃ، اقامۃ الوزن اور اقامۃ القسط کا حکم دیا ہے کہ ان چیزوں کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ اقامتِ عدل کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً اگر کوئی حاکم و قاضی ہو تو فیصلے میں عدل کرے یہ قانونی عدل ہے۔ پھر معاشرے میں عدل ہے جیسے ازواج و اولاد میں مساوات و انصاف رکھنا۔ پھر اپنے نفس سے عدل بھی ہے کہ اس کے فطری تقاضے جائز حدود کے اندر پورے کئے جائیں اور جسم و جان کو امانت الٰہی سمجھ کر مہلک چیزوں سے بچایا جائے مؤلف، اسی طرح معاشی عدل، سیاسی عدل وغیرہ بھی ہے۔ مسلمان جب قرآن پر عامل تھے تو ساری اقوام و ملل سے بڑھ کر عادل و منصف تھے اور دنیا والوں کو ان پر پورا بھروسہ تھا۔ افسوس جب سے انہوں نے قرآن کی ہدایت پر عمل کرنا چھوڑا ہے، اُن کا حال ہر لحاظ سے پتلا ہو گیا ہے۔ اب نہ صرف ان کے حکام

۱؎ تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۱۱۴ ۵ تفسیر المراغی ج ۸۵/۱۷۸/۱۸ تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۱۶۰-۱۵۵۔

Marfat.com

قضاۃ بلکہ عوام بھی باہم ظلم و ستم کرنے لگے ہیں اور اضطراب و انتشار کا شکار ہیں۔

شہادت سے مراد حق کو ظاہر کرنا ہے "شاہد للہ" بننے کا مطلب یہ ہے کہ حق کو طلب کرو، اسی کا اتباع کرو اور بوقتِ ضرورت کسی جانبداری یا رعایت کے بغیر اسی کا اظہار کرو۔ والدین یا قرابت داروں کا حق یہ نہیں ہے کہ ان کی خاطر حق کو ترک کر دیا جائے۔ اسی طرح انسان کی اپنی جان کا بھی اس پر حق ہے مگر یہ حق اگر عدل و انصاف سے ٹکرائے تو حق نہ رہے گا، باطل بن جائے گا۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ زندگی قصاص کا نام ہے جو لوگ ظلم و ستم، حق تلفی اور ناجائز رعایت اور جانب داری میں کسی کا ساتھ دیتے ہیں۔ یقیناً دوسرے ان کے خلاف بھی ظالموں اور حق تلفی کرنے والوں کا ساتھ دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جانب داری ظلم و تعدّی اور بگاڑ کے پھیلنے کا باعث بن جائے گا۔

حافظ ابن جریر طبریؒ نے سدّی سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت دو شخصوں کے بارے میں اتری تھی۔ اُن میں سے ایک تو مال دار تھا اور دوسرا محتاج۔ دونوں کا کوئی اختلاف تھا جسے وہ بغرض فیصلہ حضورؐ کی خدمت میں لائے۔ حضورؐ کا دلی میلان اس فقیر کی طرف تھا اور آپؐ کا خیال تھا کہ ایک محتاج شخص غنی پر زیادتی نہیں کر سکتا، لامحالا دوسری طرف سے ہی زیادتی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ عدل و انصاف کو قائم کرنے میں فقر و غنیٰ کو کوئی دخل نہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کی رضامندی بھی اللہ کی رضامندی پر مقدّم نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں سے تمہارے لئے زیادہ اقرب ہے۔ وہ اُن سے بھی اقرب ہے اور ان کی مصلحت کو خوب جانتا ہے۔

شہادت اللہ کے لئے ہے نہ کہ لوگوں کے لئے اور عدل خدا کی سرزمین میں اسکی میزان ہے، اسکے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کمزور کو طاقتور سے سچے کو جھوٹے سے اور حق دار کو باطل پرست سے حق دلواتا ہے۔
(امام قتادہؒ)

اس آیت کے آخر میں خبیر کا لفظ بولا گیا ہے نہ کہ علیم کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خبیر وہ ہے جو معاملات کے حقائق اور پوشیدگیوں کو جانتا ہو۔ اور شہادت میں دھوکا اور حیلہ بازی بکثرت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ انسان اپنے آپ کو بھی دھوکے میں رکھتا ہے اور شہادت کو چھپانے یا اُسے بدل ڈالنے کے لئے قسم قسم کے عذر گھڑ لیتا ہے۔

آیت ۱۳۶: کا خطاب بقول ابن عباسؓ ان لوگوں سے ہے جو یہود میں سے ایمان لائے تھے مثلاً عبداللہؓ بن سلام، اسدؓ بن کعب، اُسیدؓ بن کعب ثعلبہؓ بن قیسؓ سلامؓ (عبداللہ بن سلامؓ کے بھائی) اور یامین بن یامینؓ انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا کہ ہم آپؐ پر اور موسیٰؑ پر اور قرآن پر اور تورات پر تو ایمان لائے ہیں لیکن اور کسی رسولؑ یا کتاب پر نہیں لائے۔ حضورؐ نے انہیں سب رسولوں اور سب کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی۔ ان حضرات نے حکم کی اطاعت کی اور سب پر ایمان لائے۔

Marfat.com

خدا کی کتابوں اور رسولوں میں تفریق کرنا (جیسا کہ یہود و نصاریٰ کا شیوہ ہے) کفر ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم میں دور میں ایک رہی ہے۔ تمام رسولوں کی ہدایت ایک ہی تھی۔ پس جو بعض کو مانے اور بعض کا انکار کرے وہ کبھی مومن نہیں کہلا سکتا۔ اس کے دل میں تعصب بھرا ہے اور ہدایت و ضلالت کی حقیقت و ماہیت سے قطعاً بے خبر ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن پاک میں کئی جگہ اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے اور کتابوں اور تمام رسولوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

پہلی مسلم جماعت کو صحیح معنوں میں اُمّت مسلمہ اور "شہداء علی الناس" بنانے کے لئے تربیت دی گئی۔ کے جن مرحلوں میں سے گزارا گیا ان میں سے ایک مرحلہ اس وقت ہمارے سامنے ہے یہ جماعت بھر میں، قائمت عدل کے لئے برپا کی گئی تھی۔ لہٰذا اسے بے لوث اور بے غل و غش عدل قائم کرنے کا حکم لما جاہلیت کے تعصبات، قومی تفاخر، قبائلی جانبداری اور رنگ و نسل کے اختلافات سے اسے بلند تر کر دیا گیا۔ یہ مت نوحید خالص اور ایمان کامل خالص کی علمبردار ٹھہرائی گئی۔ تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانا اس کا طرۂ منار رہا۔ ل و قسط کی امانت کی علمبردار وہی جماعت ہو سکتی ہے جس کا عقیدہ آفاقی و دائمی ہو۔ ظلم و بغاوت کو در ہر حال و ہر جگہ میں عدل و قسط کو قائم کرنا مسلم قوم کے فرائض اولیہ میں سے ہے۔

دنس کائنات نے دنیا میں کئی تہذیبیں کئی دور، کئی حکومتیں اور سلطنتیں بنائیں اور مٹائیں۔ مگر عدل و سط، شہادت للہ کا جو تصور اس پہلی مسلم جماعت نے عملاً دنیا کے سامنے پیش کیا وہ ہر لحاظ سے بے مثل و نظیر ہے۔ اس کا تصور، دہ اس کا معاشی و معاشرتی انصاف اس کی اخلاقی بلندی اور حقوق العباد کی ادائیگی کا بلند نظر۔ سب کچھ اب تک منفرد ہے اور رہتی دنیا تک منفرد ہی رہے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ

جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہوئے پھر مسلمان ہوئے، پھر کافر ہوئے پھر

ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا

بڑھتے رہے کفر میں تو اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشنے کا اور نہ

لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿١٣٧﴾ بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ

نہیں راہ دکھلانے کا خوش خبری سنا دے منافقوں کو کہ

لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣٨﴾ الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ

ان کے لئے دردناک سزا ہے وہ لوگ جو بناتے ہیں کافروں

Marfat.com

الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ

کو اپنا رفیق ایمانداروں کو چھوڑ کر کیا ڈھونڈتے ہیں

عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝۱۳۹ وَقَدْ

ان کے پاس عزت؟ سو عزت تو ساری اللہ ہی کے لیے ہے اور حکم

نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ

اتار چکا تم پر قرآن میں کہ جب سنو اللہ کی آیتوں

اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ

برا انکار ہوتے اور ہنسی ہوتے تو نہ بیٹھو ان کے ساتھ

حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا

یہاں تک کہ مشغول ہوں کسی دوسری بات میں نہیں تو تم بھی انہیں

مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ

جیسے ہو گئے یقیناً اللہ اکٹھا کرے گا منافقوں کو اور کافروں کو

فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ

دوزخ میں ایک جگہ وہ منافق جو تمہاری تاک

فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ

میں ہیں اگر تم کو فتح ملے اللہ کی طرف سے تو کہیں کیا ہم نہ

مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ

تھے تمہارے ساتھ اور اگر نصیب ہو کافروں کو تو کہیں کیا ہم نے

Marfat.com

نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ

گھیر نہ لیا تھا تم کو اور بچا دیا تم کو مسلمانوں سے

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ

سو اللہ فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن اور ہرگز

يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾

نہ دے گا اللہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ

شرح الفاظ

اِزْدَادُوْا: وہ زیادہ ہوگئے، بڑھ گئے۔ بَشِّرْ: خوشخبری دے، یہاں یہ لفظ بطور تذلیل وتبکیت آیا ہے۔ الْعِزَّةَ: غلبہ، احترام واکرام۔ يُسْتَهْزَأُ: ٹھٹھا کیا جاتا ہے، خاکہ اڑایا جاتا ہے مخول کیا جاتا ہے۔ يَخُوْضُوْا: خوض مصدر سے، گھسنا۔ سوچ وبچار کرنا۔ بات چیت میں مصروف ہونا حدیث بات چیت، گفتگو۔ يَتَرَبَّصُوْنَ: تربص مصدر سے، انتظار کرتے ہیں۔ نَصِيْبٌ: حصہ یعنی اگر کافروں کو فوائد دنیویہ میں سے کچھ ملے۔ نَسْتَحْوِذْ: اِسْتَحْوَذَ کا معنی ہے غلبہ واستیلاء اور تصرف اور تمکن۔ نَمْنَعْكُمْ منع کا معنی ہے روکنا، محفوظ رکھنا۔ سَبِيْلًا: راہ، یعنی کامیابی کا راستہ۔

خلاصۂ آیات

[1] ان آیات میں خالص منافقین کا ذکر ہے جو بظاہر ایمان لائے تھے مگر کفر ان کے دلوں پر غالب تھا۔ جو انہیں عقل وفہم اور تدبر وتفکر سے روکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بارہا داخل اسلام ہو کر پھر اس میں سے نکل جاتے تھے۔ دراصل انہوں نے ایمان کا مزہ اور اس کی حقیقت کی مٹھاس چکھی ہی نہ تھی نہ اس کی محبت ان کے دلوں میں جاگزین ہوئی تھی نہ اس کے فضائل ومناقب سے وہ آشنا تھے۔ ان منافقین کے لئے دردناک

[1] تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۸۱ / ۱۸۲۔

Marfat.com

مناسب ہے کیوں کہ یہ کافروں سے درپردہ مل کر مومنین کے خلاف کارروائیاں کرتے ہیں۔ مومنوں کا یہ کام نہیں کہ ایسے لوگوں کو دلی دوست اور رازدان بنائیں، نہ ان کے ہاں کوئی جاہ و منزلت ڈھونڈھنا۔[1]

آیت ۱۳۷: یعنی یہ لوگ ظاہر میں تو مسلمان ہوئے اور دل میں مذبذب رہے اور آخر کو بے نصیب لائے ہی مرگئے ان کو نجات کا راستہ نہیں ملے گا۔ وہ کافر ہیں۔ ظاہر کی مسلمانی کچھ کام نہ آئے گی، اس سے منافقین ہیں۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے، کہ اوّل ایمان لائے پھر بت پرستی کر کے کافر ہوئے۔ پھر توبہ کر کے مومن ہوئے مگر پھر عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر کے کافر ہوئے کے بعد رسولِ اکرمؐ کی رسالت کا انکار کر کے کفر میں ترقی کر گئے۔

آیت ۱۳۸-۱۳۹: منافق لوگ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ اور ان کا یہ خیال کہ کافروں کے پاس بیٹھ کر ہم کو دنیا کی عزت ملے گی، بالکل ہے۔ سب عزت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جو اس کی اطاعت کرے گا اس کو عزت ملے گی۔ خلاصہ یہ ہوا ایسے لوگ دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل و خوار ہوں گے۔

آیت ۱۴۰: اے مسلمانو! خدائے تعالیٰ پہلے قرآن پاک میں تمہیں حکم بھیج چکا ہے کہ جس مجلس میں احکام الٰہی کا انکار اور تمسخر کیا جاتا ہو وہاں ہرگز نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی ویسے ہی سمجھے جاؤ گے۔ اللہ جسو دوسری باتوں میں مشغول ہوں اس وقت تمہیں ان کے ساتھ بیٹھنے کی ممانعت نہیں۔ منافقوں کی مجا میں آیات و احکام الٰہی پر انکار و استہزاء ہوتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ جو فرمایا کہ تم پر پہلے حکم جا چکا ہے، سو اشارہ ہے ان آیات کی طرف۔ وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ جو پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جو شخص مجلس میں اپنے دین پر طعنہ اور عیب سُنے اور پھر انہی میں بیٹھا سنا کرے، اگرچہ آپ کچھ نہ کہے، وہ منافق ہے۔

آیت ۱۴۱: یہ منافق وہ لوگ ہیں جو برابر تمہاری تاک اور انتظار میں لگے رہتے ہیں، پھر اگر تمہاری فتح ہو تو تم سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھی نہیں؟ مالِ غنیمت میں ہم کو بھی شریک کرو۔ اور اگر کافروں کو لڑائی میں کچھ حصّہ مل گیا۔ یعنی وہ غالب آگئے تو ان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تم کو گھیر نہ لیا تھا اور تمہاری حفاظت نہیں کی؟ اور ہم نے کیا تمکو مسلمانوں کے ضرر سے نہیں بچایا، لوٹ میں ہم کو بھی حصّہ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص بظاہر مسلمان ہو مگر گمراہوں سے بھی بنائے تو وہ بھی منافق ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم میں اور اُن میں حکم فیصل فرمائے گا۔ تم کو جنت دیگا اور ان کو جہنم میں ڈالے گا۔ دنیا میں جو کچھ ان سے ہو سکے کر دیکھیں مگر اہل ایمان کی بیخ کنی ہرگز نہ کر سکیں گے

---

[1] فوائد القرآن صفحہ ۱۲۹-۱۲۸۔ تفسیر عثمانی ج ۱ (مفہوم) ۶۲۵/۶۳۶، تفسیر ابن کثیر پ ۵ (مفہوم) صفحہ ۱۱۶، ۱۱۷۔

Marfat.com

جوان کی دلی تمنّا ہے۔

[1] آیت ۱۳۷: سے یہود مرتدّین کا کوئی خاص گروہ جو بار بار مرتد ہوا اور منافقین کا گروہ مراد لیا گیا ہے۔ آخری تفسیر ہی ظاہر و مناسب ہے (ابن جریر / تفسیر کبیر، روح المعانی)

آیت ۱۳۹: اسے فقہا نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ منکروں اور کافروں سے بلا ضرورت میل جول، خلا، ملا ان کی وضع قطع بلا ضرورت بنانا، ان کا فیشن اختیار کرنا، ان کے لباس اور تمدّن و معاشرت کو فخر و عزت کی چیز سمجھنا یہ سب داخل نفاق ہے۔

آیت ۱۴۰: سے معلوم ہوا کہ استہزا کرنے والے دشمنوں سے خلا ملا رکھنا اتنا خطرناک ہے جس سے منع کرنے کے لئے پہلے سورۂ انعام (آیت ۶۸: ۷) میں حکم آیا جو مکی سورت ہے۔ پھر اس سورۂ نساء میں دوبارہ حکم دیا گیا جو مدنی ہے حکم کا تکرار اس کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مکہ میں مشرکین استہزا کرتے تھے اور مدینہ میں یہود و منافقین۔ آیت کا حکم عام ہے ہر بے دینی کا ہر مشغلہ اور کفر و انکار اور استہزا کا ہر مظاہرہ اس کے تحت میں آجاتا ہے، مسیحی یا ہندوانہ تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی ماحول کے جو گہرے اثرات طبعی طور پر مسلمانوں پر پڑ رہے ہیں۔ وہ سب اس وعید کے تحت میں آجاتے ہیں۔ اپنے شعائر و اصولِ دین پر مضحکہ سنتے رہنا خواہ وہ تعلیم گاہوں میں ہو یا بازاروں اور میلوں میں یا سینماؤں اور تھیٹروں میں یوں بھی ہر صورت بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔

آیت کے آخر سے معلوم ہوا کہ اصلی مشابہت اور جوڑ توڑ کافروں اور منافقوں میں ہی ہے۔ کفر دونوں میں ہے ایک میں ظاہر دوسرے میں پوشیدہ۔ مگر ایمان داروں کا ان سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔

آیت ۱۴۱: سے معلوم ہوا کہ حربی کافروں سے مسلمانوں کی مخبری کرنا، جاسوسی کرنا سب نفاق ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کی کامیابی کے لئے فتح کا لفظ آیا ہے جو شان و عظمت کو ظاہر کرتا ہے، لیکن کفار کے لئے نصیب کا لفظ بولا گیا ہے جس میں حقارت اور پستی پائی جاتی ہے۔

(کشّاف)

اس آیت کے آخری جملے سے معلوم ہوا کہ کافر کی گواہی مسلمان کے خلاف ناقابل قبول ہے کافر کسی نابالغ مسلمان کا ولی نہیں ہو سکتا، اور کافر کسی مسلمان کی میراث بھی نہیں پا سکتا۔

[2] آیت ۱۴۲: سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لئے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے، ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضا سے دماغ میں ایک لہر اٹھی تو مسلمان ہو گئے، اور جب دوسری لہر اٹھی تو کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بننے میں نظر آیا تو مسلمان

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۲۲۲/۲۲۳۔ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۰۷

Marfat.com

بن گئے، اور جب معبود مغفت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لئے بے تکلف اسی طرف چلے گئے ایسے لوگوں کے لئے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے ہی پر اکتفاء نہ کرے بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے۔ اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کردے اور اپنی قوت اسی جدوجہد میں صرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلے میں دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ کفر میں مزید ترقی اور ایک جرم پر پے در پے جرائم کا اضافہ ہے جس کا وبال بھی مجرد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیئے۔

آیت ۱۳۹: میں عزت کا لفظ اردو محاورے کے مطابق محض عزّت و احترام اور قدر و منزلت نہیں ہے عربی میں عزت کے لفظ کا معنی بہت وسیع ہے، یہاں اس سے مراد ناقابلِ ہتک حرمت ہے یعنی حیثیّت کا وہ بلند اور محفوظ مقام کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

آیت ۱۴۱:۔ ہر زمانے کے منافقین کی یہی خصوصیّت ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں ان کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرہ اسلام میں برائے نام شمولیّت کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں اور جو فائدے کافر ہونے کی حیثیّت سے حاصل ہونا ممکن ہیں ان کی خاطر یہ کفّار سے جا کر ملتے ہیں، اور ہر طریقہ سے انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی متعصّب مسلمان نہیں ہیں۔ نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری وفاداریاں اور دلچسپیاں دراصل تمہارے ساتھ ہیں۔ فکر و تہذیب اور مذاق سے ہر طرح کی موافقت تمہارے ساتھ ہے اور کفر و اسلام کی کشمکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمہارے ہی پلڑے میں پڑے گا۔

[1] اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین اور وسیع مغفرت والا ہے وہ ایسا نہیں کرتا کہ کسی کو محض پیدائش کے لحاظ سے اور صرف مشیّت سے ہی مغفرت اور ہدایت سے محروم کر دے اس کی مشیّت یقیناً اس کی حکمت و انسانی مصلحت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کی سُنّت اور ازلی حکمت یہ ہے کہ انسانوں کا کسب (علم و عمل) ان کے نفوس میں مؤثر ہو۔ پس جس شخص پر اندھی اور جامد تقلید کی مدت طویل ہو جائے اس کی عقل سے نورِ دلیل چھپ جاتا ہے، اور جس شخص پر فسق و عصیان کا عہد لمبا ہو جائے وہ مغفرت کے ان اسباب سے محروم ہو جاتا ہے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے۔ وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی۔

اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مغفرت (نفس سے گناہ کا اثر مٹا دینا) توبہ اور نیک عمل کی تاثیر

---

[1]

Marfat.com

سے ہوتی ہے یہ تاثیر ان علائق کو مٹا دیتی ہے۔ جو نفس میں ان گناہوں کی وجہ سے پیدا ہو چکے ہوتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔

ان آیات میں عزّت کے لفظ کا معنی ہے قوت و غلبہ اور حفاظت و نشان و شوکت، عزّت اللہ ہی کے پاس ہے۔ جو لوگ ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں اور علم و ہدایت میں انبیاء کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی سنن و حکمت کے مطابق وہ عزّت انہیں دیتا ہے، یہی اس کی مشیّت ہے۔ جب ایمان والوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیا تھا تو اُس نے انہیں یہ عزت دی تھی۔ لیکن جب مومن کہلانے والوں نے عزت کی راہوں سے منہ موڑ لیا تو انہیں کہیں بھی عزت نہ مل سکی۔ وہ ذلیل و خوار ہو گئے اور دنیا کے بیشتر ممالک میں رسوا ہو گئے۔ ان کے لئے عزّت حاصل کرنے کا آج بھی فقط یہی ایک راستہ کھلا ہے۔

ان آیات نے یہ بھی بتایا ہے کہ اہل ایمان اگر واقعی ایمان دار ہوں اور احکام و اوامر کتاب کے مطابق دشمنوں کے لیے ہر قسم کی قوت تیار رکھیں تو بوقتِ مقابلہ گو بعض دفعہ عارضی طور پر کفار کو فتح و ظفر کا حصّہ مل جاتا ہے مگر آخری اور کامل فتح بہرحال ایمان و حق کی ہوتی ہے چاہے کفر کے پاس کتنی قوت ہو اور چاہے اوّل اوّل اس کا کتنا غلبہ اور قوت و شان نظر آئے۔ قرآن کا فیصلہ ہے۔

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ مسلمانوں نے جہاں کہیں شکست کھائی اور ذلت و خواری سے دوچار ہوئے ہیں اس کا باعث ہدایت دین سے روگردانی، جہالت، سہل انگاری اور جہاد و قتال سے انحراف ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ علم طبیعی حاصل کریں، میکانکی اور ریاضی کے علوم میں مہارت پیدا کریں اور کفر و کفّار کے لئے بحکمِ خداوندی ہر قسم کی تیاری بہم پہنچائیں!

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار ان آیات میں یوں فرمایا گیا ہے: وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ۝

[1] ایمان لانے سے پہلے جو کفر تھا اسے تو ایمان مٹا دیتا ہے کیوں کہ جو شخص تاریکیوں میں پڑا ہو اور روشنی کا مشاہدہ نہ کر سکے وہ معذور ہے۔ لیکن ایمان کے بعد کفر اور پھر وہ بھی بار بار، ایک ایسا کبیرہ گناہ ہے جس کے لئے نہ کوئی مغفرت ہے نہ معذرت۔ کفر ایک پردہ ہے، جب یہ پردہ اٹھ جائے تو فطرت خالق سے مل جاتی ہے اور بھولے بھٹکے مسافر قافلے میں آکر شامل ہوتے ہیں، روح وہ حلاوت پا لیتی ہے جس کی اسے تلاش تھی اور اس ایمانی حلاوت کا مزا کبھی بھول نہیں سکتی۔ ایمان کے بعد ارتداد اس بات کا ثبوت ہے کہ روح نے حقیقت ایمانی کو چکھا نہیں تھا۔ ایسے لوگ عمداً ضلالت کو پسند کرتے

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۲۵۸/۲۶۵/

Marfat.com

اور گمراہی کے صحراؤں میں بھٹکنے کے لئے ایمان کے شہر سے نکل بھاگتے ہیں۔ پس یہ عین عدل ہے کہ ان پر مغفرت کی راہیں بند کر دی جائیں۔

نفس جب تک اللہ کے لئے مجرد و منفرد نہ ہو جائے وہ کبھی بھی ضروریات و مصالح اور حرص و طمع کی آلائشوں سے آزاد نہیں ہو سکتا، نہ وہ دنیوی مفادات اور خواہشات کی سطح سے بلند ہو سکتا ہے۔ اسے وہ آزادی و عظمت اور حرمت و اکرام حاصل نہیں ہو سکتا جو ایسے نفوس کے لئے خاص ہے جن میں خدا بستا ہے نفاق کا بیج انہیں منافع و مصالح اور طمع و حرص سے پھوٹتا ہے۔ نفاق کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ باطل کے مقابلے میں حق پر جم جانے میں ضعف کا نام ہے۔ یہ ضعف خوف اور طمع کا نتیجہ ہے جب غیر اللہ سے خوف و طمع وابستہ کر لی جائے تو یہی نفاق ہے جب دنیوی حرص اور مادی تعلقات آدمی کو مقید کر لیں تو بس وہ منافق ہے۔

اس سورت کا موضوع یہ ہے کہ مسلم جماعت کی تربیت کر کے انہیں اسلام کی سیدھی راہ پر چلنے کے قابل بنایا جائے اور جاہلیت کے اثرات و بقایا کو ان کی زندگی کے ہر شعبہ سے نکال پھینکا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرتی احکام کے آگے پیچھے اور ان کے بیان کے دوران میں بار بار ایمان، شہادت للہ، نفاق وغیرہ کے موضوع لائے گئے ہیں۔ اللہ کی مسلم جماعت کو مشرکین و منافقین سے میدانِ معرکہ میں دو دو ہاتھ کرنے کی تربیت دے رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں اور ان کے بعد سورت کے اختتام تک یہی مضمون مسلسل بیان فرمایا ہے۔

منافقین کو عذابِ الیم کی "خوشخبری" دیتے ہوئے ان کا قصور یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ کافروں کو اولیاء بناتے ہیں کافروں سے مراد یہاں اغلباً یہود ہیں جن کے پاس یہ منافق پناہ گیر ہوتے تھے ان سے مل کر مسلم جماعت کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور انہیں مسلمانوں کے راز بتاتے تھے۔

عزت و قوت اور غلبہ و شوکت کا مرکز اللہ تعالیٰ ہے جو شخص یا جماعت اس سے منسوب ہو گئی اور دوسروں سے قطع تعلق کر کے اسی کی ہو گئی وہی عزت و غلبہ کی حق دار ہے۔ یہ ایک ایسی بندگی ہے جسے اختیار کرنے والا بہت بلند اور اعلیٰ و ارفع ہو جاتا ہے۔ ہر ایک غلامی سے چھوٹ جاتا ہے، جو شخص یا جماعت اس چوکھٹ سے منحرف ہو وہ بہت سوں کی غلام ہو جاتی ہے اسے قدم قدم پر خوف و اضطراب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہت برسوں کی غلامی کا قلادہ انہی گردن میں ڈالنا پڑتا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

پس صورتیں صرف دو ہیں۔ یا تو خدا کی غلامی کرو اور غیر اللہ پر غالب و سربلند ہو جاؤ۔ اور یا پھر ہر ہر چوکھٹ

Marfat.com

رسمجدہ، رزیدہ ہو کر اور ذلت و نکبت کا پٹہ اپنی گردن میں ڈال لو۔

یک مومن، مومن ہوتے ہوئے غیر اللہ سے طالب عزت نہیں ہو سکتا دشمنانِ خدا اور رسولؐ کے پاس عزت اور نصرت اور قوت طلب کرنے والے خدا پر ایمان نہیں رکھتے مسلمان جو "ایماندار" کہلاتے ہیں انہیں قرآن میں تدبر کرنا چاہیئے: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآن؟

مردہ آباؤ اجداد، جبکہ وہ کافر و مشرک ہوں ان کی طرف اپنے آپ کو منسوب کر کے فخر جتانا، فرعون کی اولاد بنا نازاں اور مشرکوں کے ساتھ نسبی تعلق کو قابلِ عزت و وقار جاننا اشوریوں، فنیقیوں، بابلیوں، اور جاہلی عرب سے نسبت قائم کر کے اپنے آپ کو باعزت قرار دینا بھی یقیناً اس آیت کی وعید کے تحت میں داخل ہے۔ عزت صرف خدا، رسولؐ اور ایمانداروں کے لئے ہے جو اسے دوسروں کے پاس تلاش کرتا ہے، وہ ذلیل ہو کر رہے گا۔

مسند امام احمد میں حضورؐ کا ایک ارشاد منقول ہے کہ جو شخص فخر و عزت کے لئے اپنے کو کفار آباؤ اجداد سے نسبت ظاہر کرے وہ جہنم میں ان کے ساتھ دسویں نمبر پر ہوگا

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں اجتماعیت کی بنیاد عقیدہ پر ہے۔ اُمت کا لفظ اسلام میں فقط مؤمنوں کے لئے مخصوص ہے، جو کوئی قومیت کی کوئی اور بنیاد تلاش کرتا ہے وہ تقاضائے اسلام کے خلاف کرتا ہے۔ ذلت و نکبت اس کے انتظار میں ہے اور اسے غلبہ و عزت اور قوت و شوکت کبھی نصیب نہ ہوگی۔

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی!

بے حمیتی، بے غیرتی اور اسلام دشمن کے خلاف بجائے سن لینے کی بزدلی قطعاً نفاق ہے۔ ایمان کی علامت حمیت و غیرت ہے جب یہ نہ رہے تو ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل حمیت و غیرت کمزور ہوتی ہے پھر بجھتی ہے، اور آخر کار مر جاتی ہے۔ یہی وقت ایمان کی موت کا بھی ہے۔ دین و اہل دین کے خلاف استہزا سن کر مومن یا تو مدافعت کرتا ہے یا اس مجلس کا مقاطعہ کرتا ہے چشم پوشی اور سکوت شکست خوردگی کی پہلی علامت ہے۔ یہ مقام ایمان و کفر کے درمیان ایک پُل کی مانند ہے اس کے بعد آدمی یا اس طرف ہوتا ہے یا اس طرف۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں اس خاموشی اور مدافعت کو نفاق ٹھہرایا گیا ہے۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں ملے گا۔ میں اس کی کوئی تاویل و توجیہ نہیں کرتا۔ مگر مطلق لیتا ہوں۔ خدا کا وعدہ قاطع ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ جب ایمان کی حقیقت مومنوں کے دلوں میں جاگزین ہو جائے تو دنیوی غلبہ بھی یقیناً انہی کو ملتا ہے۔ مجھے اس وعدے پر بھروسہ ہے اور شبہ و تذبذب ہرگز نہیں کہ مومن ہرگز شکست نہیں کھا سکتے، عارضی شکست شکست نہیں ہے اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو جب بھی شکست ہوئی صرف ایمانی حقیقت میں (شعور میں یا عمل میں) کسی کمی یا کمزوری کے باعث ہوئی۔ تیاری کرنا اور اسلحہ و اسباب جمع کرنا بھی ایمان ہی کا حصہ ہے۔

جنگِ اُحد میں عارضی شکست کا باعث حکم رسولؐ کی نافرمانی تھی حنین میں عارضی شکست کا

Marfat.com

باعث نومسلموں کا تعداد پر فخر و غرور تھا۔ ساری تاریخ میں ایک ایک واقعہ کو ٹٹول لا جائے تو یہی حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ فتح ایمان کے لئے ہے اور شکست کفر و نفاق کے لئے۔ ہاں جد و جہد یا تکالیف کبھی کبھی ابتلاء کے لئے بھی ہوتی ہیں۔ اور یہ ابتلاء حقیقت ایمان کی تکمیل کے لئے ہے۔

شکست سے میری مراد کسی معرکے میں شکست نہیں، بلکہ روح کی شکست، اس کی تھکن، مایوسی اور قنوط ہے۔ اگر کوئی عارضی شکست یہ آثار پیدا کر دے تو وہ واقعی شکست ہے۔ لیکن اگر وہ عبرت و نصیحت کو ابھارے، نئے سرے سے ہمت کو بلند کر دے، تازہ عزم و عمل کی روح کو بیدار کر دے تو وہ یقیناً شکست نہیں ہے۔

پس جب ان آیات میں خدا کا وعدہ ہے کہ مومنوں کو شکست نہ ہوگی تو اس سے مراد یہی روح کی شکست خوردگی، اور ہمت کی موت ہے مومن کی روح کو ہی فتح ملتی ہے۔ اور مومن فکر ہی سے سرفراز ہوتا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ

یقیناً منافق دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دے گا

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ

اور جب کھڑے ہوں نماز کو تو کھڑے ہوں ہارے جی سے لوگوں کے

النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

دکھانے کو اور یاد نہ کریں اللہ کو مگر تھوڑا سا

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ

ادھر میں لٹکتے ہیں دونوں کے بیچ نہ ان کی طرف اور نہ

اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ

ان کی طرف اور جس کو گمراہ کرے اللہ تو ہرگز نہ پائے گا

لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

واسطے اس کے کہیں راہ

Marfat.com

شرح الفاظ

يُخٰدِعُوْنَ: خداع کا معنی ہے کہ تم کسی چیز کو مزین کر کے کسی کے سامنے پیش کرو اور اسے یقین دلاؤ کہ یہ اسی طرح ہے جس طرح وہ چاہتا اور پسند کرتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہو۔ کُسَالٰی: کسلان کی جمع ہے، بوجھل، سست، آہستہ رو۔ یُرَآءُوْنَ: مُرَآۃ کا معنی ہے ایک دوسرے کو زبردست دیکھنا۔ پس مُرائی (ریاکار) لوگوں کو اپنا عمل دکھاتا ہے۔ اور لوگ اسے عمل کی خوبی دکھاتے ہیں مُذَبْذَبِیْنَ: ذبذبہ کسی معلق چیز کی حرکت کی آواز کی حکایت ہے، پھر اسے ہر حرکت و اضطراب کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ منافقین کے کچھ احوال اوپر گزر رہے ہیں، یہ مضمون ان آیات میں بھی جاری ہے۔

آیت ۱۴۲: منافق دل سے کافر ہیں اور ظاہر میں مسلمان، تاکہ دونوں طرف کی مضرت اور ایذا سے محفوظ رہیں اور دونوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کی اس دغابازی کی یہ سزا دی کہ ان کی تمام شرارتوں اور مخفی خباثتوں کو اپنے نبیؐ پر ظاہر فرما کر ایسا ذلیل کیا کہ کسی قابل نہ رہے۔

ان کی سب دغابازی مسلمانوں پر کھل گئی اور آخرت میں جو اس کی سزا ملے گی وہ بھی ظاہر فرما دی چنانچہ آئندہ آیات میں اس کا ذکر آتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان کی دھوکا بازی سے تو کچھ نہ ہوا اور اللہ نے ان کو ایسا دھوکے میں ڈالا کہ دنیا و آخرت دونوں ضائع ہوئیں۔ نماز جو نہایت ضروری اور خالص عبادت ہے اور اس کے ادا کرنے میں جانی و مالی کسی مضرت کا بھی اندیشہ نہیں منافق لوگ اس سے جی چراتے ہیں یہ کمزوری لوگوں کے دکھلانے کو اور دھوکا دینے کو پڑھ لیتے ہیں تاکہ ان کے کفر کی کسی کو اطلاع نہ ہو اور وہ مسلمان سمجھے جائیں۔ پھر ایسوں سے کسی اصلاح کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اور وہ کیسے مسلمان ہو سکتے ہیں!

آیت ۱۴۳: یہ منافقین تو بالکل تردد اور حیرت میں گرفتار ہیں۔ نہ ان کو اسلام پر اطمینان ہے نہ کفر پر، سخت پریشانی میں مبتلا ہیں۔ کبھی ایک طرف جھکتے ہیں تو کبھی دوسری طرف۔ اللہ جس کو بھٹکانا اور گمراہ کرنا چاہے اس کو نجات کا راستہ کہاں مل سکتا ہے۔

وَهُوَ خَادِعُهُمْ: ان کی چالوں کو ناکام کر کے اور انہیں ان کی سزا دیکر اللہ تعالیٰ منافقوں کی چالوں کو انہی پر الٹ رہا ہے۔ وہ اسلام کا جھوٹا اقرار کر کے اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں ان کے ساتھ معاملہ ہو رہا ہے اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا۔ خداع کی نسبت جب اللہ کی طرف ہو تو اس سے خداع کی مجازات (بدلہ دینا) مراد ہوتی ہے (قرطبی)

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۳۰۔ سہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۲۳-۲۲۴۔

Marfat.com

ابن کثیر/

عبادت میں نشاط، چستی اور مستعدی تو صرف ایمان و اعتقاد کی قوت سے پیدا ہوتی ہے جب سے یہی مفقود ہے تو ظاہر ہے کہ منافقوں میں کاہلی اور بے ہمتی کیسے نہ پیدا ہوتی؟ ان کے ہاں تو مقصود با ظاہرداری اور دکھاوا تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى

اِلَّا قَلِيْلًا = سے مراد یہی ظاہری حرکات ہیں ورنہ بقول حضرت حسن بصریؒ اگر یہ قلیل عمل بھی اللہ کے لئے ہوتا تو کثیر بن جاتا (ابن جصاص) ریا کا معنی ہے کسی اچھی چیز کو خدا کی رضا کے لئے نہیں بلکہ محض دکھاوے کے لئے اختیار کرنا۔ جب نماز جب اہم ترین رکن اسلام کا یہ حال ہے تو دوسری عبادتوں کا معاملہ اسی سے سمجھ لیجئے۔ نماز کی صراحت بالخصوص اسی لئے کی گئی ہے کہ اعمال میں سے نماز ہی ایمان اور اسلام کا ظاہری معیار ہے۔ فقہا نے کہا ہے کہ جس نماز ریائی کا یہاں ذکر ہے جو معصیت کے درجہ میں ہے اور اس کا دہرانا واجب ہے وہ یہ ہے کہ جو عقیدہ کے بغیر لوگوں کو دھوکہ میں ڈالنے کے لئے پڑھی جائے کہ لوگ اس سے اسے مسلمان سمجھ لیں گے۔ باقی جو نماز اس ریا کی نیت سے نہیں بلکہ اپنے مسلم ہونے، مقبول الشہادت ہونے کے لئے اور جواز امانت کا حق دار بننے کے لئے سربستہ خیر للہ پڑھی جائے وہ اس وعید کے تحت میں داخل نہیں ہے (ابن عربی)

آیت ۱۴۳ میں اضلال کی نسبت اللہ کی طرف اس کی سنت تکوینی کے مطابق ہے جس کے ماتحت وہ عزم عمل پر عمل کو مرتب کر دیتا ہے۔

چونکہ منافقوں کو نماز سے نہ آخرت میں امید ثواب تھی نہ ترک سے خوف عقاب، بلکہ ظاہرداری تھی سو ایسے کام میں قطعاً سستی اور کاہلی ہوا کرتی ہے، اس لئے وہ نماز کو سستی سے ادا کیا کرتے تھے۔ نماز میں سستی کئی طرح سے ہوتی ہے، وقت پر جماعت سے نہ پڑھنا، مکروہ اوقات میں بلا رعایت شرط پڑھنا اور رکوع و سجود اور باقی ارکان میں خشوع و خضوع کو ملحوظ نہ رکھنا بلکہ یونہی ٹھونگیں مارنا، ایک شخص نے آنحضرتؐ کے عہد میں اسی طرح سے نماز پڑھی تھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا پھر پڑھ تو نے نماز نہیں پڑھی اسی طرح کئی بار اس نے پڑھی اور آپؐ نے فرمایا۔ آپؐ نے آخر کار سمجھایا کہ اس طرح پڑھو۔

منافق چونکہ دکھاوے کی نماز پڑھتے تھے۔ اس لئے ان نمازوں میں حاضر نہ ہوتے تھے جن میں ایک دوسرے کو لوگ کم دیکھیں یا جن میں مشقت ہو مثلاً فجر اور عشاء کی نمازیں۔ حضورؐ نے صحیحین کی ایک حدیث ارشاد فرمایا ہے کہ یہی دو نمازیں منافقوں پر زیادہ بوجھل ہیں۔ اور دوسری صحیح احادیث کی بنا پر انہی میں غیر حاضر ہونے والوں کے گھروں کو جلا ڈالنے کا حضورؐ نے قصد فرمایا تھا۔ مگر پھر اس لئے نہ کیا کہ عورتوں اور بچوں پر

---

۱ تفسیر ابن کثیر ج ۵ ص ۱۹-۱۸

Marfat.com

رحم آیا تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ خدا کی قسم اگر ایک چرب ہڈی یا دو اچھے کھُر ملنے کی امید ہوئی تو یہ لوگ نماز کیلئے دوڑے چلے آتے۔ ایک اور حدیث میں تین مرتبہ حضورؐ نے قسم کھا کر کہا فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ جان بوجھ کر بلا عذر اسے بالکل آخری وقت میں جلدی جلدی پڑھ دے۔

مذبذب کی مثال حدیث میں یوں آئی ہے کہ منافق یوں ہوتا ہے جیسے دو ریوڑوں کے درمیان ایک ایسی بکری ہو جو کبھی ممیاتی ہوئی اُس ریوڑ میں جا ملے اور پھر بھاگ کر ممیاتی ہوئی اس ریوڑ میں آجائے۔ اس نے ابھی یہ نہیں طے کیا کہ کس ریوڑ میں رہے۔ ابن ابی حاتم میں مومن، کافر اور منافق کی مثال یوں آئی ہے کہ تین شخص دریا پار کرنے کو کئے۔ ایک تو کنارے پر رہ گیا دوسرا جلدی جلدی پار اتر گیا، اور تیسرا دریا میں اترا تو پہلے کنارے والے نے اُسے واپس بلایا، اتنے میں وہ منجدھار میں پہنچ چکا تھا اب واپس مڑا تو ڈوب کر مر گیا، پہلا کافر ہے، دوسرا مومن اور تیسرا منافق۔

۱؎ دورِ نبویؐ میں نماز کی حاضری ہی اسلام کی علامت تھی لہٰذا منافقوں کو مسلمانوں میں شامل رہنے کے لئے یہ حاضری دینی پڑتی تھی۔ لیکن ذوق و شوق، آمادگی، دل چسپی اور خندہ پیشانی جس سے مسلمان نماز پڑھتے تھے وہ منافقوں میں مفقود تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا باندھ کر زبردستی لائے جا رہے ہیں، ورنہ حقیقت میں انہیں عبادت سے کوئی رغبت نہ تھی۔

جس طرح رزق اللہ کے قبضے میں ہے مگر انسان کو اس کے حصول کے لئے جدوجہد اور محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، جو حلال ذرائع سے کمانا چاہے اسے انہی ذرائع سے ملتا ہے جو حرام راستے اختیار کرے وہ اُن سے لیتا ہے۔ اسی طرح ہدایت و ضلالت اور فکر و عمل کی تمام راہوں کا معاملہ ہے۔ یہ سب اللہ کے اختیار اور قبضۂ قدرت میں ہیں، لیکن راستے کا تعین اور جائز و ناجائز کا فرق انسان کی اپنی صوابدید اور طلب و سعی پر ہے۔ نیکی والوں کے لئے وہی راہ آسان کر دی جاتی ہے۔ اور بدی کرنے والوں کے لئے بدی کی راہ۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ جو جس راستے کو منتخب کرے اس پر چلنے کی آسانیاں اسے مہیا کر دی جاتی ہیں۔

۲؎ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ سے مراد یہ ہے کہ منافق رسول اللہؐ سے دھوکا بازی کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ایمان کا ذکر کرتے ہیں اور دل میں کفر چھپاتے ہیں۔ ان کے اس فعل کو خدا سے دھوکا بازی اس لئے کہا گیا کہ خدا کے رسولؐ سے ایسا معاملہ کرنا گویا اللہ سے کرنا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ جو لوگ اے پیغمبرؐ آپؐ سے بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

۱؎ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۱۱۷، ۱۱۸ و مفہوم ۲؎ تفسیر المراغی جلد ۱ صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱، تفسیر المنار ج ۵ صفحہ ۴۶۷، ۴۶۹۔

Marfat.com

اس طرزِ بیان سے دو چیزیں مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے اس بُرے فعل یعنی دھوکا بازی کی برائی بیان کی جائے۔ اور وہ دوسرے یہ کہ جس کو دھوکا دینا چاہتے ہیں یعنی رسول اللہؐ ان کی عظمتِ شان کا اظہار کیا جائے۔ کہ اُن سے ایسا معاملہ کرنا گویا خدا سے کرنا ہے۔

وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ میں اللہ تعالیٰ کے فعل کو محض مُشاکلتِ لفظی کے باعث خداع کہہ دیا گیا ہے۔ اس طرح کی مثالیں قرآنِ پاک اور لغتِ عرب میں بہت سی ہیں۔

مثلاً، وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ خداع کا لفظ (اسی طرح مکر بھی مؤلف) مذموم معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس میں جھوٹ پایا جاتا ہے اور وہ اپنے فاعل کے ضعف و عجز پر دلالت کرتا ہے۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دنیوی و اُخروی سزا اور بُرے انجام کو ہرگز نے کے لیے یہ لفظ بولا ہے۔ کیوں کہ وہ سزا اور انجام ان کی خواہش اور دل پسندی کے خلاف ہوں گے کیونکہ یہ منافقین پیغمبرؐ اور ایمان داروں کو دھوکا دیکر ایسے راستے پر چلے ہیں جس کا انجام دنیا میں ضلالت اور آخرت میں ذلت و رسوائی ہے۔ وہ تو اس طرزِ عمل سے سلامتی اور نجات کے طالب ہیں مگر یہی چیز ان سے دُور رہے گی۔ گویا انہوں نے اپنے آپ کو بھی فریب ہی دیا ہے۔ سو ان کی یہ حالت خدا کی اُن سے دھوکا بازی کہلائی یعنی اللہ نے انہیں یہ انجام اور یہ روز بد دکھایا۔ جو لوگ منافق ہوں یا ان جیسا طرزِ عمل اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ کی سنّت یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں ذلت و عذاب سے دوچار ہونگے ہر قوم و ملت کے منافقوں کا یہی حال ہے کہ وہ فریب کاری کرتے اور کذب و افتراء سے کام لیتے ہیں خفیہ تدابیر، سازشیں اور دھوکا ان کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ وہ دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت ان سے فائدہ اٹھائیں یا ان کی پناہ میں چلے جائیں۔ تاریخ کی کتابیں ان اشرار کے حالات سے پُر ہیں۔

بالخصوص ان کی تعداد کسی قوم میں اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب اس قوم کا دور ضعف و زوال ہو اور دشمن طاقتور ہوں۔ یہ منافق تو صرف مادّی نفع کے سوداگر ہیں، جہاں سے مل جائے گا حاصل کرلیں گے۔ اس کے حصول کے لیے ہر راستہ، ہر تدبیر اور ہر سازش کر سکتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان کے نفع سے کس کس کا کتنا نقصان ہوگا۔

[1] ان آیات کا مضمون بھی اہل ایمان کو منافقوں اور کفّار سے روگردانی پر آمادہ کرتا ہے۔ جب ان کے عقائد اتنے گندے، اعمال اتنے تاریک اور سازشیں اتنی گھناؤنی ہیں تو کون مسلمان ان کی ولایت کا دم بھر سکتا ہے؟ ایک مومن تو ضرور ان آیات کو پڑھ کر کفر و نفاق اور ان کے حاملین سے ناک بھوں چڑھائے گا، ان کی حرکات اور بداعمالیوں پر نفرین کرے گا۔ اور ان سے قطع تعلق کو عین ایمان سمجھے گا۔

---

[1] ۔ فی ظلال القرآن ج ۵ صفحہ ۲۶۶، ۲۶۸۔

Marfat.com

وَهُوَ خَادِعُهُمْ: کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان منافقوں کو ڈھیل دے رہا ہے۔ ان کی گمراہیوں میں بھٹکنے کے لئے انہیں چھوڑے ہوئے ہے اور ان کی رسّی دراز کر رہا ہے۔ کوئی مصیبت انہیں متنبہ نہیں کرتی، نہ کوئی حادثہ یا آفت انہیں عبرت و نصیحت پذیری پر آمادہ کرتی ہے اللہ نے انہیں چھوڑ دیا ہے کہ جہنم کی راہ پر چلتے رہیں اور آخر کار اس میں جا گریں۔ یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ تکالیف و شدائد بارہا رحمتِ خداوندی ثابت ہوتے ہیں۔ بارہا بندوں کو ان سے عبرت و نصیحت حاصل ہو جاتی ہے۔ بارہا وہ اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ انحراف و ضلال کی راہوں سے واپس پلٹ آتے ہیں۔ اسی طرح بارہا ایسا ہوتا ہے کہ راحت و آسائش اور عافیت و نعمت خداوند تعالیٰ کی طرف سے گناہ گار بندوں کے لئے ڈھیل اور مہلت ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ گمراہی اور کجروی میں ایسے مقام پر پہنچ چکے ہوتے ہیں کہ اب ان کو شدائد و حوادث سے عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ نتیجہ بُرے انجام کی صورت میں نکلتا ہے۔

نماز کیا ہے؟ خدا کی ملاقات کے مشوق کی حرارت اور تپش، اپنے معبود کے سامنے مودب کھڑے ہونا، اس کے قرب و اتصال میں محو ہونا اور اس سے مدد مانگنا۔ جو دل ایمان و عقیدہ کی لذت سے خالی ہوں انہیں یہ اعلیٰ چیزیں کیسے حاصل ہو سکتی ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی نماز کھوکھلی حرکات اور بے مصرف نشست و برخاست سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ ریاکار خدا کی یاد میں محو نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگوں کی یاد میں مصروف ہوتا ہے۔ اس کی توجہ خدا کی طرف نہیں بلکہ مادیت کی طرف ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ان آیات میں منافقین کی نماز کے بارے میں ارشاد ہوئی ہے۔ اس سے بھی ایک طرف تو ایک واقعہ کا بیان ہو رہا ہے اور دوسری طرف اس کے کرداروں کی برائی اور پستی کا اظہار مقصود ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ

اے ایمان والو نہ بناؤ کافروں کو

اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ

اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا یہ چاہتے ہو اپنے

تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۴۴ اِنَّ

اوپر اللہ کا الزام صریح بیشک

الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ

منافق ہیں سب سے نچلے درجہ میں ہیں دوزخ کے

Marfat.com

وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا

اور ہرگز نہ پائے تو ان کے واسطے کوئی مددگار۔ مگر جنہوں نے توبہ کی

وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ

اور اپنی اصلاح کی اور مضبوط پکڑا۔ اللہ کو اور خالص حکم بردار ہوئے

لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ

اللہ کے سو وہ ہیں ایمان والوں کے ساتھ اور جلد دے گا

اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٤٦﴾ مَا يَفْعَلُ

اللہ ایمان والوں کو بڑا ثواب کیا کرے گا

اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ ۚ وَ

اللہ تم کو عذاب کرکے اگر تم حق کو مانو اور یقین رکھو اور

كَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴿١٤٧﴾

اللہ ہے قدردان سب کچھ جاننے والا

شرح الفاظ

سُلْطَانًا: حجت و برہان، دلیل۔ مُبِينًا، واضح، ظاہر و باہر۔ الدَّرْك: درک ہو یا درک۔ دونوں کا معنی ہے نچلا طبقہ اوپر کے طبقے کو درجہ کہتے ہیں۔ الْأَسْفَلُ: سب سے نچلا، پست ترین۔ جہنم کے سات طبقے ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں درکات اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ وہ پے در پے اور یکے بعد دیگرے ہیں۔ اعتصموا۔ انہوں نے تھام لیا، مضبوط پکڑ لیا۔ اللہ سے اعتصام کا مطلب ہے اس کی کتاب اور اس کے

لہ تفسیر المراغی ج ۵ صفحہ ۱۸۹، ۱۹۰

Marfat.com

رسولؐ کے احکام وارشادات کو مضبوط تھام لینا۔ شَاکِرًا شکر گزار، یہاں اس سے مراد ہے منعم، جزا دینے والا فضل ورحمت سے ایمان وعمل کو قبول کرنے والا۔ اس قبولیت کو یہاں شکر سے ایک تو بوجہ شَکَرْتُمْ کی مشاکلت کے تعبیر فرمایا گیا ہے اور دوسرے اس میں فیاضی، دریا دلی اور رحمت کا اظہار ہے۔

ان آیات میں ایمان والوں کو منافقوں کی روش اختیار کر کے کفار سے موالات کرنے سے روکا گیا ہے پھر منافقین کے انجام کا اظہار فرمایا گیا ہے۔ تو یہ اصلاحِ احوال، اعتصام باللہ اور دین میں اخلاص کا حکم دیا گیا ہے اور اپنی رحمت اور فضل وکرم کا اعلان فرمایا گیا ہے۔

[1] آیت ۱۴۴-۱۴۵: مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کرنا نفاق کی دلیل ہے۔ ایسا منافقین کرتے ہیں۔ سو تم اے مسلمانو! ایسا ہرگز مت کرنا ورنہ خداوند تعالیٰ کا صریح الزام اور پوری حجت تم پر قائم ہو جائے گی کہ تم بھی منافق ہو۔ اور منافقوں کے لئے دوزخ کا سب سے نچلا درجہ مقرر ہے اور کوئی ان کا مددگار بھی نہیں ہو سکتا کہ اس طبقہ سے ان کو نکالے یا عذاب میں کچھ تخفیف کرا دے۔ اور مسلمانوں کو ایسی بات سے دور رہنا چاہیئے۔

آیت ۱۴۶: جو منافق اپنے نفاق سے توبہ کرے اور اپنے اعمال کی درستی کرے، اللہ کے پسندیدہ دین کو خوب مضبوط پکڑے، اللہ پر توکل کرے اور ریا وغیرہ مرابیوں سے اپنے دین کو پاک صاف رکھے تو وہ خالص مسلمان ہے۔ دنیا وآخرت میں وہ مسلمان کے ساتھ ہوگا، ایمان والوں کو جو بڑا ثواب ملنے والا ہے وہ ان کو بھی ملے گا جنہوں نے نفاق سے توبہ کی۔

آیت ۱۴۷: اللہ تعالیٰ نیک کاموں کا قدردان ہے اور بندوں کی سب باتوں کو خوب جانتا ہے۔ سو جو شخص اسکے حکم کو ممنونیت اور شکر گزاری کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے تو اللہ عادل ورحیم کو ایسے شخص پر عذاب کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی ایسے شخص کو وہ ہرگز عذاب نہ دے گا، وہ تو سرکش اور نافرمان لوگوں کو عذاب دیتا ہے۔

[2] آیت ۱۴۸: کی نہی کھلے کافروں کے علاوہ پوشیدہ کافروں (منافقوں) کو بھی مشتمل ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر فقہائے حنفیہؒ نے غیر مسلم ذمیوں کو مال کا وکیل بنانا اور ان سے شرکتِ تجارت (مضاربت) بھی ناپسند (مکروہ) ٹھہرائی ہے (الجصاصؒ الرازی)

آیت ۱۴۵: میں منافقوں کے لئے جہنم کا پست ترین درجہ ثابت فرمایا گیا ہے۔ منافق بھی گو کافر ہی ہوتا ہے۔ مگر کفر کے ساتھ ساتھ اس میں چونکہ مکر وفریب کا بھی اضافہ ہے لہٰذا اس کی سزا میں اضافہ اس کے جرم کے عین مطابق ہے۔

آیت ۱۴۶: میں یہ سبق بھی ہے کہ نومسلم یا تائب یا نو صالح کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے۔

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۲۲۴-۲۲۵ [2] فوائد القرآن ص۱۳، ابن کثیرؒ ص۱۳ (مفہوم)

Marfat.com

یہ اسلامی اور ایمانی برادری میں نئے نئے شامل ہونے والے بھائی ہیں جو اور زیادہ عزت و اکرام کے مستحق ہوتے ہیں۔

آیت ۱۴۷: میں یہ تعلیم بھی آگئی کہ اسلام کا خدا مشرک اور جاہلی قوموں کے خونخوار و سفاک دیوی دیوتاؤں کی طرح نہیں جسے بندوں کی آزار دہی میں ہی لطف آرہا ہو۔

۱۴۷ کافر چونکہ ظاہر و باطن میں منکر و مخالف ہیں لہٰذا اُن سے اسلام کو اس قدر مضرت نہیں پہنچ سکتی جتنی کہ ان پوشیدہ کافروں (منافقوں) سے پہنچتی ہے دیکھئے بہت سے ایسے خبیثوں سے جو در پردہ کافر و بے دین اور ظاہر میں مسلمان ہیں کس قدر اسلام کو مضرت پہنچتی ہے۔ ہزاروں بدعتیں انہوں نے ایجاد کی ہیں۔ تاویلات رکیکہ کر کے یہی قرآن کو الٹ پلٹ کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کا عذاب بھی کھلے کافروں سے زیادہ سخت اور شدید تر ہے۔

۱۴۸ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں اپنی ساری دل چسپیوں، محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے۔ کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لئے اسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

شَكَرْتُمْ: شکر کے اصل معنی اعترافِ نعمت اور احسان مندی کے ہیں کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمہیں سزا دے۔

زبان سے اعترافِ احسان کرنا، دل سے اس کی قدر کرنا اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دینا ان تینوں کے مجموعے کا نام شکر کہلاتا ہے۔ خدا کا شکر یہ ہے کہ دل کو خلوص سے اس کی وفاداری اور محبت ٹپکتی ہو، زبان سے اس کا اقرار و اعتراف ہو اور اپنے عمل سے اس کے اوامر پر عمل اور نواہی سے پرہیز کیا جائے۔ جب خدا کی طرف شکر کو منسوب کیا جائے تو اس کا معنی خدمت کا اعتراف اور قدر دانی ہوگا۔

۱۴۹ ان آیات میں کافروں کی "ولایت" سے منع کیا گیا ہے۔ ولایت سے مراد قول و عمل سے مدد اور نصرت ہے۔ ہر وہ کام جس میں مسلمانوں کی مضرت ہو اس میں کفار کی ولایت ممنوع اور حرام ہے۔ قرآن پاک نے بار بار کفار کی ولایت سے روکا ہے۔ لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ تمام کفار کو اس معاملے میں ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلم ذمیوں کو ملازم رکھنا اور ان سے خدمتِ ملک و وطن کا کام لینا اس

---

۱۴۸ تفسیر حقانی ج ۲ صفحہ ۲۳۸، ۱۴۹ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۴۱۲۔ ۱۴۹ المنار ج ۶ ص ۴۶۷-۴۶۹ ج ۵ المراغی ص ۳۲

Marfat.com

اس ضمن میں نہیں آتا۔ اس کی مثالیں خلافتِ راشدہ اور بعد کی حکومتوں میں بھی ملتی ہیں۔

منافقین اہل جہنم میں سے بدترین لوگ ہیں۔ ان میں مکر و خداع، خدا اور رسولؐ سے دھوکا بازی اسلام کو خفیہ طور پر نقصان پہنچانا اور مسلمان سے دھوکا کرنا جمع ہو گیا ہے۔ ان کی روحیں سب اور روحیں سے پست تر اور ان کے نفوس دوسروں سب نفوس سے زیادہ گرے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ سخت ترین عذاب کے حق دار ٹھہرے۔ عام کفار پر حقیقتِ توحید سے جہالت کا مرض غالب ہے گو وہ خدا کو مانتے ہیں مگر اس کی ذات و صفات میں اوروں کو شریک گردانتے ہیں۔ مورتیوں، پتھروں اور زندہ و مُردہ اولیاؒ کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ ٹھہراتے ہیں۔ انہوں نے خداوند کریم کو بھی دنیا کے ظالم امرا اور بے عدل حکام و ملوک پر قیاس کر رکھا ہے جن تک پہنچنے کے لئے کئی چوکھٹوں پر سجدہ ریز ہونا اور کئی وسیلوں کا واسطہ ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ منافقین کے اس شدید ترین سزا سے بچنے کے لئے چار شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

۱۔ صحیح توبہ اور ظاہر و باطن سے درست مومن بن جانا۔

۲۔ نیک اعمال کی جدوجہد مثلاً قول و عمل کا صدق، امانت اور وعدہ خلافی اور اسلامی اخلاق و آداب اور عبادات کی پابندی۔

۳۔ خدا سے اعتصام کرنا، یعنی اپنے ہر عقیدہ و عمل سے اس کی رضا چاہنا

۴۔ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر لینا، توحید خالص، عمل کے خلوص اور اخلاق و آداب کے خلوص کے ساتھ ساتھ عبادات کو صرف اللہ کے لئے سرانجام دینا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ۔ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ۔ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وغیرہ کئی آیات میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

ان آیات میں سے آخری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا عذاب انتقام کے لئے یا نفع کی طلب اور مضرت سے بچنے کے لئے نہیں ہوتا۔ یہاں استفہام بطور انکار آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک سے غنی اور بے نیاز ہے۔ وہ جلب منفعت اور دفع مضرت سے منزہ ہے۔ عذاب تو لوگوں کے کفر و شرک اور نفاق و عصیان پر ہوتا ہے اس میں کوئی الزام اللہ پر نہیں آسکتا، اللہ نے بندوں کو عقل و حواس اور وجدان و جوارح عطا کئے، پیغمبر بھیجے کتابیں اتاریں اور سبکی کو ان کی فطرت کے اندر مرکوز کیا۔ مگر انہوں نے عقل و فکر اور حواس کو کفر و شرک میں استعمال کیا۔ اپنا بھی نقصان کیا اور خدا کے رسولوں کی بھی مخالفت کی۔ شکر و ایمان کی راہ چھوڑ کر کفر و طغیان اور ناشکری کا راستہ اختیار کر لیا۔ اگر وہ شکر و ایمان کی راہ اختیار کرتے تو ان کی ارواح پاک ہو جاتیں۔ ان کے اعمال پاک صاف ہو جاتے اور وہ رضاء الٰہی کے حق دار ٹھہرتے، شکر کا نتیجہ دنیا اور آخرت میں نعمت کی زیادتی ہے اور کفر و ناشکری کا پھل خسارہ اور عذاب ہے۔ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ

Marfat.com

ثُمَّ اِنَّ عَلَی اِلٰی لَتَنْسِلِ ثُیُوْہ وہ تو اتنا بڑا قدردان اور رحیم و کریم ہے کہ چند روزہ زندگی کی حقیر طاعات کے مقابلہ میں دنیا و آخرت کے بلند درجات عطا فرماتا ہے۔

۵۱ ان آیات میں منافقوں کے مومنوں کی معیت اور اجرِ عظیم کے مستحق بننے کے لئے چار شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، توبہ، اصلاح، اعتصام باللہ اور اخلاص دین للہ۔ دوسرے مواقع میں صرف دو لفظ یعنی توبہ اور اصلاح ہی کافی سمجھے گئے ہیں۔ کیوں کہ ان میں اعتصام و اخلاص بھی آجاتا ہے۔ لیکن چوں کہ یہاں معاملہ متذبذب، منافق اور منحرف لوگوں کا ہے اس لئے بطور تاکید و مبالغہ ان چار چیزوں کی صراحت فرمائی گئی ہے۔ انسانی نفوس کے تزکیہ و تربیت میں قرآن کا یہ ایک عجیب منہج ہے جس کا یہاں کچھ اظہار ہوتا ہے۔

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَہْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ

اللہ کو پسند نہیں کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا ۵۱ (۱۴۸)

اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا ۱۴۸ اِنْ تُبْدُوْا

مگر جس پر ظلم ہوا ہو۔ اور اللہ ہے سننے والا اور جاننے والا۔ اگر تم کھول کر کرو

خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ

کوئی بھلائی یا اس کو چھپاؤ یا معاف کرو برائی کو تو اللہ بھی

کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ۱۴۹

معاف کرنے والا بڑی قدرت والا ہے

شرح الفاظ

لَا یُحِبُّ اللّٰہ: اللہ کسی چیز کو پسند کرنا یہ ہے کہ وہ اس سے راضی ہو اور اس پر ثواب دے۔ الجَہْرُ بِالسُّوْٓءِ: کسی کی برائی اور عیوب کا برسرِ عام ذکر کرنا۔ جہر کا لفظ اخفاء کے مقابلہ میں ہے اور السوء ہر بری چیز ہے

۵۱ تفسیر المراغی ج ۶ صفحہ ۳، فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۲۶۹

Marfat.com

جو متعلق شخص کو بُری لگے اور اس کی عزت کو گھٹانے کا سبب بن سکے۔ تُبْدُوْا: اِبْدَاءٌ، کا معنی ہے ظاہر کرنا، علی الاعلان کرنا اس کے مقابلے میں لفظ اخفاء آیا ہے۔ تعفوا: یعنی دوسروں کی برائیوں کو برسرِ عام بیان نہ کرنا اگر وہ تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی کریں تو انہیں معاف کردو۔

لہ گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین پر اتمامِ حجت کے لئے ان کے بہت سے مفاسد اور عیوب بیان فرمائے ہیں اور ایمانداروں کو ان جیسے اعمال و اخلاق کو اختیار کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ زیرِ تفسیر آیات میں کسی کی برائی سرِعام بیان کرنے، اسکی کو علی الاعلان یا پوشیدہ کرنے اور دوسروں کی اذیت اور برائی سے درگزر کرنے کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ایمان دار قرآن میں کافروں اور منافقوں کے عیوب و مفاسد کے ذکر سے کہیں یہ استدلال نہ کرنے لگیں کہ کسی کی برائی کو برملا بیان کرنا مطلقاً جائز ہے یا مستحب ہے۔ کیوں کہ اگر اس کی کھلی چھٹی دے دی جاتی تو معاشرے میں مفاسد پھیل جانے کا خدشہ تھا۔ اور اس کے علاوہ بھی کئی ضرر ہیں جنہیں ابھی بیان کیا جائے گا۔ تفسیر المراغی

لہ دینی یا خالص دنیوی اعتبار سے اگر کسی کا کوئی عیب معلوم ہو تو اسے مشہور نہ کرنا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ سب کی بات سنتا ہے اور سب کے کام کو جانتا ہے۔ ہر ایک کو اس کے موافق جزا دے گا۔ کسی کی برائی کو دوسروں سے بیان کرنا غیبت کہلاتا ہے اور غیبت کی حرمت کو سورۃ الحجرات میں صراحتہً بیان فرمایا گیا ہے! مولف)

البتہ مظلوم کو رخصت ہے کہ ظالم کا ظلم لوگوں سے بیان کرے۔ ایسے ہی بعض اور صورتوں میں بھی غیبت روا ہے۔ اور یہ حکم یہاں شاید اس لئے بیان فرمایا کہ مسلمان کو چاہیئے کہ کسی منافق کا نام مشہور نہ کرے اور علی الاعلان اس کو بدنام نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بگڑ کر اور بے باک ہو جائے۔ بلکہ مبہم نصیحت کرے، منافق آپ ہی سمجھ لے گا۔ یا تنہائی میں نصیحت کرے اس طرح شاید ہدایت قبول کرلے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ بھی ایسا ہی کرتے تھے، کسی کا نام لے کر مشہور نہیں فرماتے تھے یعنی عام عمل یہی تھا۔ مگر جب پانی سر سے گزر گیا اور منافقوں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو احادیث میں وارد ہے کہ زندگی کے آخری دور میں حضورؐ نے ایک دفعہ کچھ لوگوں کے نام لے کر انہیں مسجد سے اٹھا دیا تھا۔ یہ خطبۂ جمعہ کا واقعہ تھا! مولف)

دوسری آیت میں مظلوم کو معافی کی رغبت دلانی مقصود ہے، کہ حق تعالیٰ زبردست اور قدرت والا ہو کر خطاکاروں کی خطائیں بخشتا ہے، پس بندۂ زبردست عاجز کو تو بطریق اولیٰ دوسروں کا قصور معاف کر دینا چاہیئے، خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینا جائز ہے مگر افضل یہ ہے کہ صبر کرے اور بخش دے۔ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ منافقوں کی اصلاح چاہتے ہو تو ان کی ایذا اور شرارت پر صبر کرو اور بخش

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۳۱۔ ۲ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۳

Marfat.com

اور پردہ سے ان کو سمجھاؤ۔ ظاہر کی لعن طعن سے بچو اور انہیں کھلا مخالف نہ بناؤ۔ دلائل شرع سے ثابت ہے کہ ظالم کو معاف کرنے سے اگر دینی مفسدہ اور مضرت کا خدشہ ہو تو اسے نہ بخشنا ہی اولیٰ ہے مثلاً اگر معافی سے اُس کے ظلم پر اور دلیر ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے تو اس وقت معاف نہ کرنا ہی بہتر ہے نیز معافی کا سوال تو اس سے ہے جب کہ ظالم شرمسار ہو کر معافی مانگے۔ ورنہ معافی کا سوال بے محل ہوگا۔ اور معافی دوسروں پر مظالم کی نہیں دی جا سکتی صرف وہی معاف کر سکتا ہے جس پر زیادتی ہوئی ہو۔ مولف)

۱۵ آیت ۱۴۸، نے اخلاق کی اصلاح میں غیبت و بدگوئی کو اور قانون کی اصلاح میں ہتک عزت کو بالکل ناجائز قرار دے دیا ہے اور فرد و جماعت، شخص و ملت دونوں کے ہاتھ میں فلاح و اصلاح کی ایک بڑی اصل دیدی ہے۔ اس میں پشت پیچھے کسی کے عیب کی تشہیر بھی آگئی اور اس کے رد بدو تلخ کلامی بھی۔ بلا ضرورت اور بلا مصلحت شرعی کسی کی بدگوئی کسی حال میں جائز نہیں۔ محدثین نے جو روایت حدیث کے احوال کو کرید اور بیان کیا ہے وہ شرعی ضرورت و مصلحت کے ماتحت ہے۔ اس طرح عدالت شرع میں گواہوں پر جرح و قدح وغیرہ کو بھی سمجھ لیجئے۔ مولف)

نہ کسی کے سامنے نہ اس کی غیر حاضری میں کسی کی بدگوئی کی جائے۔ مظلوم البتہ اپنے دل کا بخار یک جھلک کر بھی نکال سکتا ہے اور حاکم کے سامنے فریاد بھی لے جا سکتا ہے۔ انسان کے طبعی تقاضوں اور اضطراری ضرورتوں کا اس حد تک لحاظ بجز شریعت اسلامی کے اور کس نے کیا ہے؟ فقہا نے تصریح کر دی ہے کہ جھوٹی بات کی شہرت مظلوم کو بھی جائز نہیں۔ لیجئے مظلوموں کے ساتھ ساتھ ظالموں کے حق بھی اسی سچی اور فطری الٰہی شریعت نے تسلیم کر لئے۔ اس آیت سے انتقام کی اجازت نکل رہی ہے جس کی ایک جزو شکایت بھی ہے۔ اور ضعفاء کی اس میں بڑی رعایت ہے کہ اس سے دل کا کینہ دور ہو جاتا ہے۔

آیت ۱۴۹: انسان اپنے نفس کو ٹٹولے تو نظر آئے کہ کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے یا اس پر مال خرچ کرنے سے کہیں زیادہ شاق نفس پر یہ گزرتا ہے کہ کوئی ہمیں دکھ پہنچائے اور ہم اس سے درگزر کر جائیں اور انتقام نہ لیں۔ اس لئے فعل خیر سے الگ اور ممتاز کر کے اس وصف چشم پوشی کو اور عدم انتقام کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اس آیت میں تین مرتبے بیان ہوئے ہیں جو اخلاقی حیثیت سے الگ الگ ہیں، اور انہیں یہاں کیسی صحیح ترتیب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ پہلا درجہ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا کا ہے کہ کسی کے ساتھ نیکی کی اور ساتھ ہی اس کا اظہار و اعلان بھی کر دیا نہ بطور ریاکاری بلکہ بطور ترغیب خیر وغیرہ۔ مولف)

کیوں کہ خلق سے داد لینے کی خواہش ایک حد تک طبعی ہے۔ ایک درجہ نیکی کا یہ بھی ہوا مگر یہ ہلکی قسم کی اور ابتدائی نیکی کی سطح ہے۔ اَوْ تُخْفُوْهُ میں نیکی کا اونچا مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ نیکی کرے مگر کسی سے صلہ یا داد

تفسیر ماجدی ص ۲۲۵

Marfat.com

وغیرہ کی پرواہ نہ رکھے۔ بلکہ اسے خلق کے علم میں ہی نہ آنے دے اور مقصود اس سے تمام تر رضائے آلٰہی ہی رکھے۔

تعفوا عن سوء: یہ نیکی کا تیسرا مرتبہ ہے کہ انسان کو ناگواریاں پیش آئیں اور وہ انہیں نظر انداز کر جائے۔ برائی کرنے والے سے بدلہ نہ لے، یہ درجہ نفس کے لئے شاق ہے اور اس کا مرتبہ سلوک و اخلاق کے منتہی کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ عَفُوًّا قَدِیْرًا کے دو لفظوں میں بالاختصار سارا سلوک و اخلاق آگیا ہے۔ بقول مولانا تھانوی پہلی آیت میں ضعفاء کی رعایت تھی اور اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اہل ہمت کے مناسب حال ہے۔

۱؎ ان آیات میں اس طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ خود بھی کوئی اپنے گزشتہ گناہ لوگوں پر ظاہر نہ کرے اور نہ توبہ اس بات کی مقتضی ہے کہ کسی کے سامنے اپنا کچا چٹھا کھولے۔ جیسا کہ عیسائیوں میں دستور ہے کہ پادری کے روبرو بوقتِ توبہ گزشتہ گناہوں کا اقرار و اظہار کرایا جاتا ہے (انسان کی عزتِ نفس اور کرامت کا جتنا لحاظ اسلام نے رکھا ہے اور کہیں اس کا عشرِ عشیر بھی پایا نہیں جاتا۔ مؤلف)

۲؎ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ مظلوم ظالم کے لئے بددعا کر سکتا ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ دوسرے مسلمان کے لئے بددعا کرے، مظلوم بھی اگر صبر و تحمل سے کام لے تو بہتر ہے۔ ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی کوئی چیز چوری ہو گئی تو وہ ان چرانے والوں کے خلاف بددعا کرنے لگیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیوں ان کا بوجھ ہلکا کر رہی ہو؟ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ہے کہ ظالم کے خلاف اللہ سے مدد طلب کرنے اور اس سے اپنا حق واپس ملنے کی دعا کرنی چاہیئے۔

۳؎ ان آیات میں مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق یہودی اور بت پرست سب کے سب اس وقت ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصہ کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمہارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اسے حق پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا علانیہ ہر حال میں بھلائی کئے جاؤ اور برائیوں سے درگزر کرو۔ کیوں کہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیئے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو اس کی شان یہ ہے کہ وہ نہایت

۱؎ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۴۱۳، ۴۱۴۔

۲؎ تفسیر حقانی ج ۲ صفحہ ۲۳۹ و ۲۴۰ ابن کثیر ج ۲۔

Marfat.com

حلیم اور بُردبار ہے۔ سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے قریب تر ہونے کے لئے تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الظرف بنو۔

(المراغی) اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے بندے آپس میں بر ملا ایک دوسرے کے عیوب بیان کریں کیوں کہ اس میں کئی مفاسد ہیں۔

(۱) اس سے باہم بغض و عداوت پیدا ہوتے ہیں جن کا نتیجہ بعض دفعہ حق تلفی اور قتل و غارت تک پہنچ جاتا ہے۔

(۲) اس سے سننے والوں کے دلوں میں بُرے اثرات پیدا ہوتے ہیں، برائیاں پھیلتی ہیں اور بدکاریاں رواج پاتی ہیں۔ کیوں کہ انسانوں کی عادت ہے کہ وہ ایک دوسرے کی پیروی کرتے ہیں۔ جب وہ دوسروں کو گالیاں دیتے لوگوں کی عزت کو اچھالتے اور گناہوں کو بر ملا بیان کرتے دیکھتے ہیں تو ان میں بھی یہی عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بالخصوص اس کا اثر بچوں پر بہت بُرا پڑتا ہے کیوں کہ ان میں تقلید کا مادہ (تراص۔ ملوم) بڑوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے وہ جو کچھ اپنے اردگرد پھیلا ہوا دیکھتے ہیں اسی کو اپنا لیتے ہیں۔ جب برائیاں بڑوں میں پھیل جائیں تو چھوٹے ان کی تقلید کرتے ہیں۔ خواص کا اثر عوام تک پہنچتا ہے۔ برائی کرنے والا جب دیکھتا ہے کہ دوسرے بھی ایسا کرتے ہیں تو وہ دلیر ہو جاتا ہے اور بدی کے خلاف عام لوگوں میں جھجک باقی نہیں رہتی۔

خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، ایک برائی دوسری کو دعوت دیتی ہے اور معاشرہ گندا ہو جاتا ہے۔ برائی کا سننا بھی اثر میں برائی کرنے کی مانند ہے، کیوں کہ سننے والا بھی اس سے متاثر ہوتا ہے اور دیکھنے والا بھی۔ برائی جب بار بار ہو اور زیادہ ہو تو سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں سے اس کی مضرت کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ دلوں میں کلام کی تاثیر کے مقام اور درجے سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لئے وہ نہ تو اپنی زبانوں کو اس کے ذکر سے بچاتے ہیں، نہ کانوں کو اس کے سننے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ گو اللہ تعالیٰ بُری بات کو آہستہ کہنے سے بھی راضی نہیں اسی لئے اُس نے

برائی، تعدی اور پیغمبر کی معصیت کی خفیہ سازشوں اور پوشیدہ مشوروں سے بھی قرآن پاک میں واضح طور پر روکا ہے، مگر یہاں جہر کا ذکر کفاروں اور منافقین کے مفاسد کے بیان کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے بر ملا برائی بیان کرنا پوشیدہ ایسا کرنے سے زیادہ مضر ہے، کیوں کہ اس کا ضرر عوام میں پھیلتا اور تمام طبقات کو محیط ہو جاتا ہے۔

مظلوم کو جس سے مدد اور ہمدردی کی امید ہو اس کے رُوبرُو اور حاکم کے رُوبرُو ظالم کی برائی کے بیان کرنے کی اجازت ہے۔ وہ اپنی مظلومیت اور ظالم کے ظلم کو کھول کر بیان کر سکتا ہے، کیوں کہ اللہ

سلہ تفسیر المراغی ج ۶ صفحہ ۵۰۴، تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۲۰۷۔

Marfat.com

تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے بندے ظلم پر بھی خاموش رہیں اور زیادتی کے سامنے جھک جائیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ظلم سے اباد کیا جائے اور عزت نفس کو سلامت رکھا جائے۔ یہاں موجودہ صورت میں دو مفسدوں میں تعارض ہو گیا ہے۔

۱۔ بدگوئی کر کے ظالم کے خلاف برملا شکوہ کرنے کا مفسدہ۔

۲۔ ظلم پر سکوت کا مفسدہ۔

حالاں کہ اس کا نتیجہ ظلم کا پھیلنا اور اس کی زیادتی ہے۔ ظلم کے پھیلنے سے تو میں ہلاک ہو جاتی ہیں اور آبادیاں اجڑ جاتی ہیں۔ پس یہ پہلا مفسدہ دوسرے کی نسبت خفیف تر تھا لہٰذا شرع کے اس قاعدے کے مطابق کہ ضرورت اپنی حد تک ہی ضرورت شمار ہو گی۔ مظلوم کو ظالم کی بدگوئی جائز ہے بشرطیکہ وہ حد سے تجاوز نہ کرے دفع ظلم میں جن چیزوں کا دخل نہیں ہے انہیں خواہ مخواہ درمیان میں نہ لائے۔ حدیث میں ہے۔

اِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ صَقَالًا (مسند احمد) "حق دار کو گفتگو کا حق ہے"

نوٹ (۱) (۲) (۳) ۱؎ قرآن ایک نئی اُمت اٹھا رہا تھا۔ جاہلیت کے وسط سے کچھ صالح لوگوں کو نکال کر انہیں باہم جوڑ رہا تھا۔ ان کی اعتقادی اور اخلاقی تربیت کر رہا تھا اور انہیں بشریت کی رہنمائی کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اس رہنمائی کے لئے اشخاص اور معاشرہ کی تشہیر ضروری تھی۔ جب ان کی تطہیر ہو چکی تو اس کے ذریعے سے دنیا میں ایک بے نظیر و بے مثال انقلاب پیدا کیا گیا۔ یہ آیتیں اسی عمل تطہیر کا حصہ ہیں۔

برسر عام بدگوئی کی ابتدا (انفرادی تہمتوں) گالیوں اور قذف و بہتان سے ہوتی ہے۔ اگر اس کا راستہ نہ روکا جائے معاشرے میں اضطراب و انتشار رونما ہو جاتا ہے۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں رہتی۔ بار ہا بے گناہوں پر بھی تہمت و بہتان اور کذب و افتراء کے تیر برس جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیک و بد میں امتیاز نہیں رہتا۔ حیا اور غیرت و حمیت آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے اور جب ایسا ہو تو تہذیبوں کے فنا ہونے کا وقت یہی ہوتا ہے۔

مظلوم کو بدگوئی کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ ظلم کا بدلہ لے سکے۔ تعدی کو رفع کر سکے اور اپنی ذات و شخصیت کو برائی سے بچا سکے۔ وہ ظلم اور ظالم کی معاشرہ میں تشہیر کرے تاکہ معاشرہ اس کا ساتھ دے اور ظالم سے اس کا انصاف حاصل کرے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ظلم سے روکے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ظالم اپنے فعل کے انجام سے ڈرے اور ظلم پر جرات نہ کر سکے۔ اگر ایک دفعہ کر چکا ہو تو اس کے تکرار سے باز آ جائے۔ اسلام لوگوں کی شہرت و عزت کی حمایت کرتا ہے جب تک وہ ظلم نہ کریں۔ جب ان سے ظلم سرزد ہو جائے تو پھر مظلوم کو اجازت دیتا ہے کہ ان کی شہرت کو بٹہ لگائیں اور ان کی عزت

۱؎ فی ظلال القرآن ج ۶ صفحہ ۹، ۱۱۔

Marfat.com

کو داغ دار کر دیں۔

یہ اس لئے ہے کہ اسلام میں عدل و قسط کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ اس کے قیام کے لئے دُور تک جانے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے نظام میں ظلم، بداخلاقی اور بے حیائی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ

بلاشبہ جو لوگ منکر ہیں اللہ کے اور اس کے رسولوں کے

وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ

اور چاہتے ہیں کہ فرق نکالیں اللہ میں اور اس کے رسولوں میں

وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ

اور کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں بعض کو اور نہیں مانتے بعض کو

وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ

اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس کے بیچ میں

سَبِیْلًا ۝۱۵۰ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ

ایک راہ ایسے لوگ ہی ہیں اصل کافر

وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۝۱۵۱

اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لئے ذلت کا عذاب

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ

اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور جدا

یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ

نہ کیا ان میں سے کسی کو ان کو جلد دے گا

Marfat.com

يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ

ان کے ثواب اور اللہ ہے

۲۱ غَفُورًا رَّحِيمًا ع ۱۱ ع ۱

بخشنے والا مہربان

شرح الفاظ

يُفَرِّقُوْا: تفریق کا معنی ہے جدا جدا کرنا، خدا اور رسولؐ کے درمیان تفریق یہ ہے کہ خدا پر تو ایمان لایا جائے مگر رسالت سے انکار کر دیا جائے۔ پس یہ بھی کفر ہے جیسے کہ خدا کے وجود یا اس کی توحید کا انکار کفر ہے **وَيَقُوْلُوْنَ** اس میں تفریق کی تشریح کی گئی ہے۔ بعض ایمانیات کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا بھی اسی طرح کفر ہے جس طرح سب کا انکار کفر ہے پھر رسولوں میں تفریق بھی کفر ہے۔ حیرت ہے کہ اس قسم کی آیات کی موجودگی میں بعض مُلحدین نے یہود و نصاریٰ اور بعض دیگر مشرک و کافر قوموں کے "نجات یافتہ" ہونے کا ثبوت خود قرآن سے بہم پہنچانے کی جسارت کی ہے۔ **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ**۔

ان آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ ایمان کے دو بڑے رُکن ہیں۔ باقی سب ارکان کا مدار انہی پر ہے۔ ان دو کے بغیر ایمان کے غیر مقبول ہے۔ اور وہ ہیں خدا کی توحید پر ایمان اور اس کے تمام رسولوں پر بلا تفرقہ ایمان جو کوئی ان میں سے ایک کا بھی انکار کرتا ہے وہ پکا کافر ہے اور اس کا ٹھکانا جہنّم ہے۔

۱؎ آیت ۱۵۰، ۱۵۱: یہاں سے یہود کا ذکر شروع ہوا ہے۔ چونکہ یہود میں نفاق کا مضمون بہت تھا۔ اور آپؐ کے زمانہ میں جو منافق تھے وہ یہودی تھے یا یہودیوں سے ربط ضبط اور محبّت رکھنے والے اور ان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے قرآن پاک میں ان دونوں کا ذکر اکٹھا فرمایا گیا ہے۔ ان آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں، اور اللہ اور اس کے رسولوں سے میں فرق کرنا چاہتے ہیں، یعنی اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے رسولوں کو نہیں مانتے، اور بعض رسولوں کو تو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، اور ان کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے بیچ میں ایک نیا مذہب اپنے لئے نکالیں، ایسے ہی لوگ اصل اور ہٹ کے کافر ہیں۔ ان کے لئے خواری اور ذلّت کا عذاب تیار ہے۔

اللہ کا ماننا جبھی معتبر ہے کہ آدمی اپنے زمانے کے پیغمبر کی تصدیق کرے اور اس کا حکم مانے۔ نبی کی تصدیق

۱؎ فوائد القرآن صفحہ ۱۳۱۔

Marfat.com

کرے اور اس کا حکم مانے۔ نبی کی تصدیق کے بغیر خدا پر ایمان لانا محض غلط ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ ایک نبی کی تکذیب اللہ کی اور تمام رسولوں کی تکذیب سمجھی جاتی ہے، یہود نے جب رسول اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو حق تعالیٰ کی اور تمام انبیاء کی تکذیب کرنے والے قرار دیئے گئے اور کٹے کافر سمجھے گئے۔

آیت ۱۵۲: اور جن لوگوں نے کسی نبی کو جدا نہیں کیا، بلکہ اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو بڑے ثواب عطا فرمائے گا۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو نبی اکرم پر ایمان لائے۔ ایمان ایک وحدت کا نام ہے جس کے تمام اجزاء پر عقیدہ و یقین لازم ہے۔ اگر کسی نے اس وحدت کے کسی جزء کا انکار کیا تو گویا اس نے اس وحدت کو منتشر کر دیا۔ رسول ہی مرکز ایمان و اسلام ہے لہٰذا اگر اپنے دور کے رسول کا انکار کیا جائے تو حقیقتِ ایمان مفقود ہو جاتی ہے۔ مولف

لہ آیت ۱۵۰: کی ضمن میں نہ صرف عیسائی آتے ہیں جو نبوتِ مصطفوی کے تو صاف منکر ہیں اور رسالت عیسوی کا بھی انکار کرتے ہیں اور اس کے بجائے الوہیت و ابنیت مسیح کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ بلکہ آج کل کے بہت سے "آزاد خیال" اور "روشن خیال" بھی اس ذیل میں آجاتے ہیں۔

یورپ میں ایک فرقہ "خدا پرستوں" کا کہلاتا ہے اور ہندوستان میں برہمو سماج ہے، یہ لوگ توحید کے تو قائل ہیں لیکن عقیدۂ و نبوت کے منکر ہیں یہ سب مثالیں اسی ناقص اور غلط ذہنیت کی ہیں جسے اسلام مٹانا اور فنا کرنا چاہتا ہے (رسالت پر ایمان لائے بغیر توحید پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کی ذات و صفات کی معرفت اس کے رسولوں کے بغیر ناممکن ہے۔ محض عقل سے اس راز کو پا لینا محال ہے۔ کوئی دو فلاسفر بھی خدا کی صفات کے مسئلہ پر متفق نہیں۔ حالاں کہ اکثر و بیشتر فلاسفر یونان (وغیرہم) خدا کے قائل ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ توحید کا عقیدہ بلا رسالت بالکل بے معنی اور محض عقلی ڈھکوسلہ ہے۔ مولف)

بیّن ذلک سبیلا یعنی راہ جیسے دہلی کے ایک مغل بادشاہ اکبر نے کفر و اسلام کو ملا جلا کر ایک دین الٰہی اکبر شاہی ایجاد کیا تھا۔ اور پھر تین پشتوں کے بعد ایک اور شہزادہ داراشکوہ نے بھی کچھ اسی قسم کی کوشش کی تھی۔ اور بعض ملحد طبع آج بھی شرک و توحید، کفر و اسلام کو مخلوط و ممزوج کر کے طرح طرح کے خوشنما ناموں کے ساتھ ایک نئے دین کی ترکیب و اختراع میں لگے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی نظر دینِ اسلامی کی وحدت اور اس کے عقائد و ارکان کے اندرونی نظم و ارتباط پر سرے سے ہے ہی نہیں۔

ایسے لوگوں کو نہ صرف کافر بلکہ سچے کافر اُلْكَافِرُوْنَ حَقًّا فرمایا گیا ہے۔ اس جملہ کی ترکیب خود ہی زور پیدا کرنے کے لئے ہے، لیکن حقاً کا لفظ مزید تاکید و مبالغہ کے لئے لایا گیا ہے (کشاف / بیضاوی، بحر، تفسیر کبیر) ایسے لوگوں کے خیالات و نظریات کی تہ میں اصلی روگ اپنی بڑائی کا ہوتا ہے۔

لہ تفسیر ماجدی ص ۲۲۵-۲۶

Marfat.com

شعوری یا لاشعوری طور پر بہر حال یہ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کی عقل وحی الٰہی کے مقابلہ میں زیادہ وزن دار ہے، اور پیغمبروں سے معاذ اللہ جو کوتاہیاں رہ گئی ہیں ان کی تلافی یہ اپنی عقل آرائیوں سے کر دیں گے۔ اسی کبر و خود بینی کی سزا انہیں آخرت میں یہ ملے گی کہ علاوہ جسمانی تعذیب کے یہ خلق کی نظر میں ذلیل و رسوا ہو کر بھی رہیں گے۔

وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ: قرآن مجید نے وحدتِ وحی و رسالت پر بڑا زور دیا ہے۔ اور سارے انبیاء کو ایک مستقل نظام و سلسلہ کے اندر منسلک قرار دیا ہے۔

سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ اُجُوْرَهُمْ: سوف یہاں قربِ زمانی کے لئے نہیں بلکہ جزم و تیقن کے لئے ہے (کشاف تفسیر کبیر) متکلمین نے آیت سے معتزلہ کا رد بھی نکالا ہے جو مرتکب گناہ کبیر کے دوام عذاب کے قائل ہیں۔ حالانکہ آیت میں یہ مضمون صاف موجود ہے کہ ایمانِ محض پر بھی اجر ملے گا۔ (تفسیر کبیر)

سلہ یہودی دو رسولوں کے منکر ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام۔ عیسائی سوائے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی سب انبیاء کو بظاہر مانتے ہیں، سامری حضرت یوشعؑ بن نون کے بعد کسی اور پیغمبر کو نہیں مانتے تھے۔ اسی طرح مجوسیوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زرادشت کو اپنا پیغمبر مانتے تھے لیکن جب انہوں نے ان کی شریعت کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ شریعت ہی اٹھالی۔ اس آیت کی رُو سے یہ سب لوگ کافر ہیں۔

کیوں کہ ایک نبی کو نہ ماننا بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ سب کو نہ ماننا۔ ایسے لوگ ہوا و ہوس اور خواہشات نفسانی کے پیرو ہیں۔

جس دلیل سے ایک پیغمبر کی نبوت ثابت ہے اسی سے اوروں کی بھی ثابت ہے۔ اگر نبی کو نبی ہونے کی حیثیت سے مانا جائے تو سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی کا انکار کرنا محض ہوائے نفس کی اور تعصب کی وجہ سے ہے۔

سلہ کافروں کی تین اقسام ہیں جن میں کوئی فرق نہیں:

(۱) توحید و رسالت دونوں کے منکر۔

(۲) خدا کے وجود یا توحید کو ماننے والے مگر رسالت کا سرے سے انکار کرنے والے۔

(۳) بعض رسولوں کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے والے۔ ان میں سے کسی کے بھی کافر ہونے میں ذرہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

سلہ تفسیر ابن کثیر پ ۶ صفحہ ۴۰۳، تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۰۷۔ سلہ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۱۲

Marfat.com

لہٰذا جو شخص خدا پر تو ایمان لانے کا مدعی ہو مگر وحی و رسالت کا منکر ہو، اس کا ایمان صحیح نہیں۔ اُسے نہ تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ خدا کا شکر کیسے کرے اور نہ وہ خدا کی صحیح عبادت کرنے کا راستہ پا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے ایمان کے دعویدار سوائے اپنی شہواتِ نفس کے کسی اور چیز کے قائل نہیں ہوتے۔ ان کا اڑھنا بچھونا یہی ہوائے نفس ہوتی ہے۔ یہی حال یہود و نصاریٰ کا ہے۔ جو بعض انبیاء برحق کا انکار کرتے ہیں اس کی وجہ ہے کہ توحید پر ایمان سوائے ایمان بالرّسالت کے ممکن نہیں۔ کیوں کہ ایمان کی راہ تو صرف رسول ہی بتا سکتے ہیں۔ اسی طرح رسالت پر ایمان اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس کا فہم حاصل ہو اور رسولوں کی صفات، ان کے فضائل و وظائف اور ان کی تاثیر ہدایت کو سمجھا جائے۔

اور جو شخص مسئلہ رسالت کو کما حقہٗ سمجھ لے وہ بالیقین معلوم کرے گا کہ رسولوں کی صفات کامل اور اعلیٰ و اکمل طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں ظاہر ہوئی ہیں۔ آپؐ ایک ایسی کامل و تام کتاب لائے جس کے مضامین پر اس کے سوا کوئی اور کتاب حاوی و مشتمل نہیں، باوجودیکہ آپؐ کی نشوونما ایک اُمّی قوم کے درمیان ہوئی تھی۔ پھر آپؐ کی کتاب اور اصولِ دین و سنّت تواتر قطعی سے منقول ہوئے ہیں، ان کی سندِ متصل و معتبر ہے، اور کسی کتاب و شرع کا یہ حال نہیں ہے۔

۴۰۰

پیغمبر اللہ مالک الملک کے نائب اور نمائندے تھے جنہیں اس نے اپنی سلطنت میں رعیت کا انتظام اور رہنمائی کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ ان کی لائی ہوئی کتابیں شہنشاہ حقیقی کے فرامین و قوانین ہیں۔ پیغمبر صرف خدا کے احکام نافذ کرتے تھے۔ ان کے ہر حکم کی اطاعت خدا کی رعیت پر فرض ہے۔ کیونکہ وہ احکام خدا کی طرف سے ہیں۔ ہر جدید قانون پچھلے قوانین کو منسوخ کر دیتا ہے اور نئے حکم کی موجودگی میں پہلے پر عمل کرنا باطل و ممنوع ہے۔ آخری دستورالعمل قرآن ہے اور آخری پیغمبر حضرت محمد رسولؐ ہیں۔

ان آیات میں کفّار کے متعلق تو فرمایا: اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ مگر ایمان داروں کے لئے فرمایا: اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ حالاں کہ مقابلے کا تقاضا تھا کہ یوں فرمایا جاتا کہ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا اس کا باعث یہ ہے کہ یہاں کفریہ عقائد کے بالمقابل ایمانی عقائد کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور یہ بھی پیش نظر ہے کہ کوئی شخص صرف ایمان پر ہی معزور نہ ہو جائے، مبادا عمل کو ترک کر دے برحق مومنین کا ذکر ایک اور آیت میں آیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا الخ۔ یعنی ایمانِ کامل و برحق کے لئے عقیدہ و عمل دونوں ضروری ہیں۔

ط تفسیر المراغی ج ۶ ص، المنار ج ۶ ص ۱۰۷

Marfat.com

لہ اسلام میں توحید کا تصوّر بہت وسیع اور محیط ہے۔ توحید الٰہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ خدا کے دین کی وحدت کو مانا جائے۔ دین صرف ایک ہی ہے، یعنی اسلام۔ اسی کو ہر پیغمبر نے حسبِ اقتضائے زمانہ پیش فرمایا۔ اسی میں سے "وحدتِ رسالت" کا عقیدہ بھی نکلتا ہے۔ یعنی ہر پیغمبر کے ذریعہ سے بھیجی جانے والی رسالت اور دین ایک ہی تھا۔ پس دین کی وحدت اور رسالت کی وحدت کا انکار کرنا دراصل خدا کی توحید کا انکار ہے۔ خدا کا دین اپنے مصدر و منبع اور اساس و بنیاد کے لحاظ سے ایک ہے، اس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا ہے۔

ایمان ایک ایسی وحدت کا نام ہے جس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ ایمان باللہ کا مطلب ہے، خدا کی توحید پر ایمان لانا۔ خدا کی توحید کا تقاضا ہے وحدت دین، تاکہ تمام انسانوں کی زندگی ایک وحدت کی مانند اس دینِ واحد کی اساس پر استوار ہو۔ اسی طرح وحدانیتِ الٰہی کا تقاضا وحدتِ رسالت بھی ہے۔ سب رسولوں کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا۔ سب کا منہ ایک ہی طرف تھا، سب کا دین ایک تھا یعنی اسلام۔

مسلم وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا۔ یعنی سماوی ادیان قبل از تحریف و تغیر ایک ہی تھے۔ اختلاف و تفرقہ اس تحریف و تبدیلی کے بعد پیدا ہوا۔ یہی حقیقت ہے جس کے باعث مسلم کا ایمان تمام رسولوں پر، تمام کتابوں پر اور ہر زمانے میں ان کے پیش کردہ دین پر ثابت و مسلّم ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو بہت سی جگہوں پر واضح کیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ۔ سورۂ آل عمران، سورۂ المائدہ، الانعام وغیرہ۔

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ

تجھ سے درخواست کرتے ہیں اہل کتاب کہ تو ان پر اتار لائے

كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ

کوئی لکھی ہوئی کتاب آسمان سے سو بیشک چکے ہیں موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑی

مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ

چیز سو کہا ہم کو دکھلا دے اللہ کو بالکل سامنے سو آ پکڑی ان پر

الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ

بجلی ان کے گناہ کے باعث پھر بنا لیا بچھڑے کو

مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ

بہت کچھ نشانیاں دیکھ چکنے کے بعد پھر ہم نے وہ بھی

Marfat.com

ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿١٥٣﴾

معاف کیا اور دیا ہم نے موسیٰؑ کو غلبہ صریح

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ

اور ہم نے اٹھایا ان پر پہاڑ قرار دینے کے واسطے اور

قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ

ہم نے کہا داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور ہم نے کہا

لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا

کہ زیادتی مت کرو ہفتہ کے دن میں اور ہم نے ان سے لیا قول

غَلِيْظًا ﴿١٥٤﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ

مضبوط ان کو جو سزا ملی ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ

اللہ کی آیتوں سے اور خون کرنے پر پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا

کہ ہمارے دل پر غلاف ہے بلکہ اللہ نے مہر کر دی ان کے دل پر انکے کفر کے سبب

يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥٥﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ

سو ایمان نہیں لاتے مگر کم اور ان کے کفر پر اور

عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا

مریمؑ پر بڑا بہتان باندھنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے

Marfat.com

قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ

قتل کیا ہم نے مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا

اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ

اور انہوں نے نہ اس کو مارا اور نہ سولی پر چڑھایا ولیکن وہی صورت

لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي

بن گئی انکے آگے اور جو لوگ اس میں مختلف باتیں کرتے ہیں سو وہ لوگ اس جگہ شبہ

شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا

میں پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ نہیں ان کو اس کی خبر صرف اٹکل

اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿١٥٧﴾ بَل

پر چل رہے ہیں اور اس کو قتل نہیں کیا بے شک بلکہ

رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٥٨﴾

اس کو اللہ نے اٹھا لیا اپنی طرف اور اللہ ہے زبردست حکمت والا

وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ

اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لائیں گے اس کی

مَوْتِهِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا

موت سے پہلے اور قیامت کے دن وہ ہوگا ان پر گواہ

شرح الفاظ

اَرِنَا: دکھا ہم کو، اِرَاءَۃٌ مصدر۔ جَهْرَةً: روبرو، برملا، کھلے بندوں۔

Marfat.com

الصّٰعِقَةُ: گرنے والی بجلی صعق کا معنی بے ہوش ہونا اور بے ہوش کرنا بھی ہے: بجلی کی کڑک اور گرنے سے بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اس لئے اسے صاعقۃ کہا گیا سُلْطَانًا مُّبِيْنًا: واضح دلیل، کھلا معجزہ ظاہر اقتدار۔ لَا تَعْدُوْا: تجاوز نہ کرو، احکام الٰہی سے روگردانی مت کرو مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا پختہ عہد، پکا معاہدہ فَبِمَا: پس بہ سبب، لو جہ نَقْضِهِمْ: ان کا توڑ دینا بِغَيْرِ حَقٍّ پیغمبر کا قتل ہونا ہی ناحق ہے۔ پس یہ لفظ بطور تاکید و مبالغہ آیا ہے۔ یعنی ان کا قتل خود قاتلوں کے نزدیک بھی ناحق تھا، انہوں نے عمداً یہ برا فعل کیا تھا۔ غُلْفٌ: اغلف کی جمع، غلاف دار، جن میں کوئی چیز اثر نہ کرے۔ طَبَعَ: مہر لگا دی اِلَّا قَلِيْلًا: یعنی ان میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لاتے ہیں۔ یا ان کا ایمان بہت قلیل یعنی صرف زبانی ہے بُهْتَانًا عَظِيْمًا: بہت بڑی جھوٹی تہمت، یہود نے مریمؑ پر بدکاری کی تہمت لگائی تھی مَا صَلَبُوْهُ: انہوں نے اسے صلیب پر نہ چڑھایا۔ یہود و نصاریٰ اس بات پر متفق تھے کہ عیسیٰؑ کو یہود کے آباؤ اجداد نے صلیب پر مار دیا تھا۔ اسی پر پولس نے مسئلہ کفارہ کی بنیاد رکھی تھی۔ قرآن نے اس غلط خیال اور باطل عقیدہ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ ہمارے ہاں کے "نئے عیسائیوں" اور جعلی پیغمبروں نے قرآن کے اس واضح اعلان کے خلاف کہا کہ عیسیٰؑ صلیب پر چڑھائے ضرور گئے تھے مگر وہاں مرے نہیں۔ یہ قرآن سے کھیلنے کی واضح مثال ہے شُبِّهَ: تشبیہ بنائی گئی یعنی کسی اور شخص کو جو عیسیٰؑ کے مشابہ تھا انہوں نے عیسیٰؑ سمجھ کر صلیب پر مارا اور خوش ہو گئے کہ ہم نے عیسیٰؑ کو قتل کر دیا ہے۔ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ: اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا، یعنی جس کے متعلق قتل و صلیب کا جھوٹا دعویٰ تھا اسے خدا نے بچا کر زمین سے اٹھا لیا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ: بالضرور اس پر ایمان لائے گا۔ یعنی عیسیٰؑ پر قَبْلَ مَوْتِهٖ: اس کی موت سے قبل، معلوم ہوا کہ آیت کے نزول کے وقت تک عیسیٰؑ پر موت نہیں آئی تھی شَهِيْدًا: گواہ

گزشتہ آیات میں تفریق بین الرسل کا رد فرما کر زیر تفسیر آیات میں یہود کے بعض عقائد و اعمال بیان فرمائے ہیں جو ان کے تعصب و عناد اور لعنت و جہل پر صریح دلالت کرتے ہیں ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس بدطینت قوم نے خدا کے رسولوں میں کیسے تفریق کی، ان میں سے بعض کی نافرمانی، بعض کا قتل اور بعض کی تکذیب کی۔ بعض پر گھناؤنے الزامات لگائے اور ان کے نام و پیغام کو مسخ کرنے اور بگاڑنے کا مکروہ کام سرانجام دیا۔

لہ آیت ۱۵۳: یہودیوں کے چند سردار آپؐ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اگر تم سچے پیغمبر ہو تو ایک کتاب لکھی لکھائی یکبارگی آسمان سے لا دو جیسے کہ حضرت موسیٰؑ تورات لائے تھے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئی اور اس تمام رکوع میں الزامات کو ان کے جواب میں ذکر فرمایا ہے، اس کے بعد تحقیقی جواب دیا ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہودی جو آپؐ سے عناداً ایسی کتاب طلب کرتے ہیں۔ ان کی یہ بے

لہ فوائد القرآن صفحہ ۱۳۲، ۱۳۳، تفسیر ماجدی ۲۲۶، ۲۲۹

Marfat.com

باکی اور سرکشی تعجب کی بات نہیں۔ ان کے بزرگوں نے تو اس سے بھی بڑی اور سخت بات اپنے نبی موسیٰؑ سے طلب کی تھی کہ خداوند تعالیٰ کو آشکارا ہم کو دکھادو ورنہ ہم یقین نہ کریں گے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزرا اس پر یہ ہوا کہ ان کے کہنے والوں پر بجلی آپڑی اور سب مر گئے۔ پھر حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی دعا سے ان کو زندہ کیا۔ ایسی عظیم الشان نشانیاں دیکھ کر پھر یہ کیا بچھڑے کو پوجنے لگے۔ بالآخر حق تعالیٰ نے اس سے بھی درگزر فرمائی جیسا کہ سورہ بقرہ میں ذرا تفصیل سے گزرا ہے۔

موسیٰؑ کو طلبہ یہ دیا گیا کہ انہوں نے اس بچھڑے کو تو ذبح کر کے آگ میں جلا دیا اور راکھ ہوا میں اڑا دی اور ستر ہزار آدمی بچھڑے کو سجدہ کرنے والے قتل کئے گئے۔

آیت ۱۵۴: جب یہود نے کہا تھا کہ تورات کے حکم سخت ہیں ہم نے نہیں مانتے، تو اس وقت کوہ طور کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر معلق قائم کر دیا تھا کہ ان حکموں کو قبول کرو اور مضبوطی سے پکڑو، ورنہ پہاڑ ڈالا جاتا ہے۔

یہود کو حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخل ہو سجدہ کرتے اور سر جھکائے۔ انہوں نے سجدہ کے بدلے سُرین پر سرکنا اور پھسلنا شروع کر دیا۔ جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا، دوپہر میں ستر ہزار کے قریب مر گئے۔

یہودیوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔ اور سب دنوں سے زیادہ ہفتہ ہی کے دن مچھلیاں دریا میں کثرت سے نظر آتیں۔ یہودیوں کی رال ٹپک پڑی اور انہوں نے یہ کیا کہ دریا کے پاس حوض بنالئے۔ ہفتہ کے دن جب مچھلیاں دریا سے حوضوں میں آتیں تو ان کو بند کر رکھتے۔ پھر دوسرے دن حوضوں میں سے شکار کرتے۔ اس فریب اور عہد شکنی پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بندر بنا دیا جو جانوروں میں بہت خسیس اور بے کار ہے۔

آیت ۱۵۵: جب یہود نے اس عہد توڑ دیا تو حق تعالیٰ نے ان کی عہد شکنی پر اور آیات الٰہی سے منکر ہونے پر اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ ہمارے دل تو غلاف میں ہیں، ان پر سخت عذاب مسلط فرمائے۔ جب رسولِ خدا نے یہودیوں کو ہدایت کی تو کہنے لگے "ہمارے دل پردہ میں ہیں، تمہاری بات وہاں تک پہنچ نہیں سکتی"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات نہیں، بلکہ کفر کے سبب ان کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے، جس کے باعث ان کو ایمان نصیب نہیں ہو سکتا مگر تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی۔

آیت ۱۵۶، ۱۵۷: اور نیز اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰؑ سے منکر ہو کر دوسرا کفر کیا اور حضرت مریمؑ پر طوفان باندھا۔ اور ان کے اس قول پر کہ فخر سے کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰؑ ابن مریم کو جو خدا کا رسول تھا، مار ڈالا۔ ان تمام وجوہ سے یہود پر عذاب اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔

Marfat.com

آیت ۱۵۸:۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول کی تکذیب فرماتا ہے۔ اور ارشاد ہوتا ہے۔ کہ یہودیوں نے نہ عیسیٰؑ کو قتل کیا نہ سولی پر چڑھایا۔ یہود جو مختلف باتیں اس بارہ میں کہتے ہیں اپنی اپنی اٹکل سے کہتے ہیں، اللہ نے ان کو شبہ میں ڈال دیا، خبر کسی کو بھی نہیں۔ واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھالیا اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے۔ اور اس کے.....! ہر کام میں حکمت ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے قتل کا عزم کیا تو پہلے ایک آدمی ان کے گھر میں داخل ہوا۔ حق تعالیٰ نے ان کو تو آسمان پر اٹھالیا اور اس شخص کی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ کردی۔ جب باقی لوگ گھر میں گھسے تو اس کو مسیح سمجھ کر قتل کر دیا۔ پھر خیال آیا تو کہنے لگے کہ اس کا چہرہ تو مسیحؑ کے مشابہ ہے اور باقی بدن ہمارے ساتھی کا معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ مقتول مسیحؑ ہے تو ہمارا آدمی کہاں گیا؟

اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو مسیحؑ کہاں ہے؟ اب صرف اٹکل سے کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، علم کسی کو بھی نہیں۔ حق یہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ہرگز مقتول نہیں ہوئے بلکہ انہیں اللہ نے اوپر اٹھالیا اور یہود کو شبہ میں ڈال دیا۔

آیت ۱۵۹: حضرت عیسیٰؑ اوپر آسمان میں زندہ موجود ہیں، جب دجّال پیدا ہوگا۔ تو تب وہ اس جہان میں تشریف لاکر اسے قتل کریں گے اور یہود و نصاریٰ ان پر ایمان لائیں گے کہ بے شک عیسیٰؑ زندہ ہیں۔ مرے نہیں تھے۔ (اور وہ خدا کے بندے اور رسول ہیں (مؤلف) اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ ان کے حالات اور اعمال کو ظاہر کریں گے کہ یہود نے میری تکذیب کی مخالف ہو گئے اور نصاریٰ نے مجھ کو خدا کا بیٹا کہا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ، یہاں اصل میں تقدیر کلام یوں ہے۔ فَبِنَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ۔ (قرطبی) یعنی ہم نے ان کی عہد شکنی کے باعث انہیں ملعون قرار دے دیا۔ ما کا لفظ زائد ہے جو تاکید کے لئے آیا ہے۔ اور عربی زبان میں ایسی حذف و تاکید کی بہت سی مثالیں موجود ہیں (قرطبی، بحر)

إِلَّا قَلِيلًا سے اگر إِلَّا ایمانًا قلیلًا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہودی بعض رسولوں کو مان کر دوسروں کا انکار کرتے ہیں مثلاً حضرت اسحٰقؑ کو مانا مگر حضرت اسماعیلؑ کی تکذیب کی، اسی طرح موسیٰؑ کو مانا مگر عیسیٰؑ و خاتم النبیین کی تکذیب کی۔ علیٰ ہذا القیاس عیسائی بھی اس ضمن میں داخل ہو گئے کہ انہوں نے رسولِ خدا کی تکذیب کی۔ ان کا ایمان شرعی ایمان نہیں کہلا سکتا، جب تک سارے سلسلۂ نبوت پر ایمان نہ ہو کوئی آدمی مومن نہیں ہو سکتا (تفسیر کبیر)

بُهْتَانًا عَظِيمًا۔ یہود کی کتابوں میں حضرت مریمؑ جیسی پاک سرشت خاتون پر نہایت گندی اور گھناؤنی باتیں لکھی ہیں جن کا نقل کرنا، رد کرنے کے خیال سے بھی بہت ناقابل برداشت ہے۔ اور صرف مریمؑ پر نہیں ان کی موجودہ تورات اور دوسری کتب میں حضرت نوحؑ، ہارونؑ، لوطؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ جیسے رسولوں پر شراب خوری

Marfat.com

بدکاری اور شرک وجعلسازی وغیرہ کے گندے بہتان موجود ہیں معاذاللہ۔ مؤلف)

المسیح عیسٰی بن مریم رسول اللہ: یہود تو حضرت عیسیٰؑ کو نہ مسیح مانتے ہیں نہ رسول اللہ، لہٰذا یہ دو الفاظ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی واقعی شان کو بیان کرنے کے لئے خود استعمال فرمائے ہیں۔ اور ان سے اس طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جس کے قتل کے وہ مدعی ہیں وہ کوئی ایسی ویسی شخصیت نہیں بلکہ مسیح اور رسول اللہ ہے (بحر، کشاف بیضاوی مدارک)

اِنَّا قَتَلْنَا، قتل کا اصل معنی روح کو جسم سے جدا کرنا ہے چاہے کسی طریقہ سے ہو۔ اسی کو راغب، تاج، ابوالبقاء، امام قرطبیؒ نے لَا تَقْتُلُوْا کے تحت میں "ختم کر دینا"، "کام تمام کر دینا" کہتے ہیں۔ (راغب، تاج۔ ابوالبقاء/ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ قتل کی تعریف یہ ہے کہ ایسا فعل کرنا جس سے روح جسم سے الگ ہو جائے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں مثلاً نحر، ذبح، گلا گھونٹنا، پتھر سے کچلنا وغیرہ۔ یہاں قتل سے مراد اصلاح فقہ کا قتل نہیں ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ کسی تیز دھار آلے سے ہلاک کیا جائے

تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سزائے موت اگرچہ رومی عدالت سے ملی اور وہی ملکی عدالت تھی اور سزا دینے کا اختیار رکھتی تھی لیکن آپؑ کو سزا دلوانے میں اور آپؑ کے لئے سزائے موت کا حکم سنوانے میں تمام تر یہودی ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اسی لئے قرآن مجید نے بھی جو تاریخ کی دقیق حقیقتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا، بالکل صحیح طور پر حضرت مسیحؑ کے قتل کرنے (بزعم الیشاں) یا اقدام قتل کی ذمہ داری یہود پر ہی رکھی۔ انجیلیں اتنے جزو پر متفق ہیں کہ رومی عدالت کا حاکم حضرت عیسیٰؑ کو سزا دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ وہ اس سے بچ رہا تھا۔ یہ یہودی تھے جنہوں نے جھوٹا استغاثہ گھڑا، جھوٹی گواہیاں فراہم کیں اور بلوہ و فساد کی دھمکی دے دے کر حاکم کو قتل کا حکم سنانے پر مجبور کیا انجیل متی میں ہے کہ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا، بلکہ الٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں راست باز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے" (۲۷، ۲۶-۲۴) اسی کی تائید دوسری انجیلیں کرتی ہیں، بلکہ لوقا میں تو اتنی تصریح اور زائد ہے کہ حاکم نے ملزم کو سزائے موت سے بچانے کی تین بار کوشش کی مگر یہود نے ہر دفعہ اس بات کو رد کر دیا۔

(۲۳، ۲۲) یہ بیانات تو مسیحیوں کے ہیں۔ خود یہود کی لکھی ہوئی جو قدیم ترین حیاتِ مسیحؑ دنیائے معلوم میں موجود ہے اور جس کا ترجمہ انگریزی میں بھی شائع ہو چکا ہے، اس میں اس واقعہ کو فخر کے ساتھ اپنی ہی جانب منسوب کیا ہے۔ انجیلوں میں جو پیشین گوئیاں حضرت مسیحؑ کی زبان سے اپنے قتل و صلب کے بارے میں منقول ہیں ان میں بھی ساری ذمہ داری سردارانِ یہود ہی کے سر ملتی ہے، اور

Marfat.com

• اور رسولوں یا حاکموں کا ذکر ہی نہیں آتا (متی ۱۶: ۲۱، مرقس ۸: ۳۱، لوقا ۹: ۲۲)۔ (اس سب کچھ کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کا موجودہ گٹھ جوڑ اہل اسلام کے لئے باعث عبرت ہونا چاہیئے۔ عرب ممالک کے خلاف یہود کی علمی و عملی، سیاسی و جنگی حمایت کو تو یہ کہہ کر ہلکا کیا جاتا رہا کہ یہ ایک سیاسی دغل ہے جس کا مذہب سے تعلق نہیں۔ لیکن موجودہ پوپ پال کا نہ صرف یہ فتویٰ جس کی رو سے یہود کو مسیحؑ کے خون سے بری قرار دے دیا گیا ہے۔ چاہے اس کی کوئی تاویل کی جائے، بہرصورت اس کا محرک اسلام دشمنی اور مسلم کشی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ کاش! مسلمانوں کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ اب بھی موالات کفار سے توبہ کر لیں، ورنہ مشرق اوسط کا انجام آنکھوں کے سامنے ہے۔ مؤلف)

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ: صلب کا اصل معنی محض سولی پر چڑھانا ہے، نہ کہ سولی پر مارنا اور ختم کرنا، اور یہ مفہوم سولی دینے سے بلکہ سولی چڑھانے سے ہی ادا ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور علامہ تھانویؒ نے اپنے اپنے ترجمہ میں یہی مفہوم لیا ہے۔ امام راغبؒ اصفہانی نے صلب کی تعریف میں لکھا ہے کہ: هُوَ تعليق الانسان لتقتل (مفردات راغب) (افسوس پنجابی نبی اور اس کے پیروؤں نے قرآن میں صریح تحریف کر کے اس آیت کا معنی یہ کیا ہے کہ یہود نے مسیحؑ کو صلیب پر چڑھایا ضرور تھا مگر وہ اس پر مرے نہیں بلکہ مردہ سمجھ کر بے ہوشی میں ان کے جسم کو اتار دیا گیا اور بعد میں وہ کشمیر کو بھاگ آئے تھے۔ لعنة الله على الكاذبين (مؤلف)

شُبِّهَ لَهُمْ ان پر شبہ ڈال دیا گیا، وہ دھوکے میں ڈال دیئے گئے یا حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ ہم سے مراد یہود اور اعدائے مسیحؑ ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ (مدارک، بیضاوی) یا یوں کہا جائے کہ شبہ انہیں مقتول کے متعلق ہوا اور وہ اس کی شخصیت کے بارے میں دھوکے میں پڑ گئے۔ یعنی "ان کے لئے ایک تشبیہ بنائی گئی"۔ (جلالین) بہرحال سب معنی صحیح ہیں اور تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہود کو دھوکہ ہوا اور وہ حضرت مسیحؑ کے دھوکے میں کسی اور شخص کو سولی پر چڑھا لے گئے

لیکن یہ شخص کون تھا اور دھوکے کی صورت کیا ہوئی؟ اس کا تصریحی جواب نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی صحیح حدیث میں۔ اب سوا اس کے چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ کی جزئیات کو ایک ایک کر کے لایا جائے، اس وقت کے پس منظر کو سامنے لایا جائے، اور جو صورت واقعہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس اور مقتضائے حال معلوم ہو اسی کو ترجیحی طور پر اختیار کیا جائے۔

پہلی بات اس سلسلے میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یروشلم کے لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام، خواص بھی آپؑ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے۔ چنانچہ آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لئے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک گروہ بھی اس ضرورت کے لئے کافی ثابت نہ ہوا۔ بلکہ آپ کی شناخت کے لئے آپؑ ہی کی برادری کے منافق اور غدار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے لیکن امام رازیؒ اس

Marfat.com

سے بخوبی آگاہ ہیں۔

چنانچہ صراحتاً اسے تفسیر کبیر میں بیان فرمایا ہے۔ متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک دو بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے" سپاہیوں کے ساتھ شامل تھی۔ اس پر بھی انہیں گرفتاری اور شناخت کے لئے یہودا (اسکریوطی / منافق) کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو یسوع نے ان سے پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہی ہوں"

(۱۸: ۳-۸) حضرت مسیحؑ کا تعظیمی تخیل تو بعد کی پیداوار ہے۔ معاصر مخالفین و معاندین کی نظر میں تو آپکی حیثیت صرف یسوعؑ ناصری نامی ایک غیر معروف اور بدنام مجرم کی تھی۔ وہ سامنے موجود تھا اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

دوسری بات یہ خیال میں رکھنے کی ہے حضرت عیسیٰؑ کو، یا بالفاظ یہود یسوعؑ ناصری کو تبدیل ہیئت میں خاص ملکہ تھا انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق اسی قدرت کو بطور معجزہ بیان کیا گیا ہے۔ "چھ دن کے بعد یسوعؑ نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ساتھ لیا اور انہیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا۔ اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا" (متی ۱۲: ۱-۲) "جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرے کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی (لوقا: ۹-۲۹) نیز مرقس ۹-۲ پر بھی یہ مذکور ہے۔ یہ معجزہ تھا یا نہ تھا یہ ایک الگ بحث ہے بہرحال آپ کو اس پر قدرت حاصل تھی۔

تیسرے اس تاریخی حقیقت کو ذہن میں حاضر رکھا جائے کہ ملک (شام و فلسطین) کی آبادی اس وقت یہود (اسرائیلیوں) پر مشتمل تھی اور اسی برادری کے ایک فرد آپؑ بھی تھے۔

لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی۔ اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے مختلف تھے، بلکہ شکل و صورت، وضع قطع و لباس زبان و معاشرت وغیرہ میں بھی ان سے ایسے ہی الگ تھے جیسے غلام ہندوستان میں گورے اور دیسی لوگ الگ الگ تھے۔ پس حکمرانوں کی نظر میں سب لوگ یہود اور اسرائیل تھے اور ایک جیسے تھے۔

چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ ملایئے کہ جس مقام پر رومی عدالت تھی وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلے پر تھا۔ اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف ٹی (T) کے مشابہ یا ریلوے سگنل سے ملتی جلتی تھی۔ وہ سولی گھر میں پوری گڑی ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑا ہوا رہتا تھا۔ باقی جو لکڑی اس کے اوپر آڑی پڑتی تھی، اس کے لئے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سولی گھر تک لانا پڑتی تھی۔

یہاں تک جو کچھ عرض ہوا اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے امور ذیل کو بھی نظر کے سامنے لایئے۔

Marfat.com

(۱) جب حکم سنایا گیا ہے تو وہ جمعہ کا دن تھا، دن ختم ہو رہا تھا، اور یہود کو جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پاکر شاموں شام گھر واپس آجائیں۔ جمعہ کی شام ہی سے ان کا یوم السبت شروع ہو جاتا تھا اور اس دن کے حدود کے اندر مجرم کو سزا دینا ممنوع تھا۔ اور پھر یہود کا اہم تہوار عید فسح بھی شروع ہو رہی تھی۔ غرض یہود کو اس امر کی بہت جلدی تھی کہ کسی طرح ان کا یہ مجرم جلد سے جلد سولی پاکر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے

(۲) لاغر و ناتواں مجرم (یعنی خود حضرت مسیحؑ) کے لئے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں، خصوصاً جبکہ یہودی بچے اور شریر قسم کے یہود خود ہی قدم قدم پر انہیں چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے چلے جاتے۔ اب اس ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھ کر غور فرمائیے کہ رومی سپاہی جو مجرم بلکہ مجرموں کو آپکے ساتھ سولی کے لئے دو مجرم اور بھی حراست میں لئے ہوئے تھے، اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے، ایسے موقع پر کیا کرتے؟ خود تو اپنے اوپر وہ سولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے... انہوں نے وہی کیا جو کوئی بھی ان جیسا انسان کرتا۔ یعنی انہوں نے مجمع میں سے کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی لکڑی اسی پر لاد دی۔ اگر یہ گارد اس موقع پر جب کہ وہ کسی ایسے ہندوستانی مجرم کو زیر حراست لئے جاتا ہوتا تو کیا کرتا؟ یہی کرتا کہ بھیڑ میں سے کسی ہندوستانی کو پکڑ لیتا اور صلیب اس پر لاد دیتا۔ یہ محض قرینہ و قیاس ہی نہیں انجیلوں میں اتنے جزو کی تصریح موجود ہے۔ "انہیں شمعون نام ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بے گار پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے" (متی ۲۷: ۳۲) اور شمعون نام ایک کرینی آدمی اسکندر اور روفس کا باپ دیہات سے آتے ہوئے ادھر کو گزرا۔ انہوں نے اسے بے گار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے" (مرقس ۱۵-۲۱) اور جب اس کو لئے جاتے تھے تو انہوں نے شمعون نام ایک کرینی کو جو دیہات سے آتا تھا، پکڑ کے صلیب اس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے (لوقا ۲۳-۲۶) جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ و منظم مجمع نہیں بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا) اس افراتفری کے ساتھ ایک دیہاتی کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اس سے تمسخر کرتا ہوا سولی گھر کے پھاٹک تک پہنچا تو رومی پولیس گارد جو ساتھ تھی، اب اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے۔ وہ اپنے دستور کے موافق اسی کو مجرم سمجھے جس پر صلیب لدی ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کے لئے سب یہودی اجنبی تھے، اور اس لئے باہمد گر ہم شکل اور یکساں انہیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ انہیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نظر نہ آسکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا، لیکن ادھر مجمع کا شور و ہنگامہ ادھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت اور پھر سولی پر لٹکا دینے کی جلدی، اسی افراتفری کے عالم میں اسی شمعون کرینی کو پکڑ کر سولی پر

Marfat.com

چڑھا دیا گیا اور وہ چیختا چلاتا رہا۔ حضرت مسیحؑ قدرۃً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہو گئے اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیے مارتے رہ گئے وَلٰکن شُبِّہَ لَھُم! یہ عقیدہ نوایجاد نہیں خود مسیحیوں کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیؔ کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سالِ وفات ۱۴۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا۔ اور کھلم کھلا کہتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیحؑ نہیں ہوئے بلکہ شمعونؔ کرینی ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن پولوسؔ (متوفی ۶۵ء) کے افر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی اس کی تو بنیاد ہی عقیدہ کفارہ پر ہے۔ یعنی اس عقیدہ پر کہ ابن اللہ نے یا خود خدا نے مجسم ہو کر، اور صلیب پر چڑھنے کی تکلیف اٹھا کر اور اپنی جان دے کر سب کی طرف سے مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس لئے یہ موجودہ رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کے مانے اور فرض کئے ہوئے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔

اس لئے لامحالہ اسی پولوسی اور کلیسیائی مسیحیت نے کل قدیم صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو بدعتی اور مبتدع قرار دے کر کلیسا سے خارج کر دیا۔ اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنانِ مسیحؑ یہود پہلے سے کہہ رہے تھے۔ یعنی یہ کہ عیسیٰؑ صلیب پر وفات پا گئے۔ گو ظاہر ہے کہ اس اشتراکِ عقیدہ میں نیتیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود وفاتِ مسیحؑ کو موضع تحقیر و اہانت میں بیان کرتے ہیں اور مسیحی بعینہٖ اسی واقعہ کو آپ کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں۔ لیکن نفس عقیدہ بہرحال دونوں میں مشترک ہے۔ اور بڑے تاسف اور قلق کا مقام ہے کہ آج بیسویں صدی میں بعض نام نہاد "مسلمان" فرقے بھی اسی گمراہی کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ اور طرفہ یہ ہے کہ وفاتِ مسیحؑ کے اس باطل اور خلافِ تحقیق عقیدہ کو "روشن خیالی" کا تحفہ اور تحقیق کا پرتو سمجھ رہے ہیں۔

اختلفوا فیہ۔ یعنی ان یہود و نصاریٰ نے مسیحؑ کے بارے میں اختلاف کیا کوئی اسے خدا، ابن اللہ اور خدائی کا تیسرا رکن قرار دیتا ہے۔ کوئی شعبدہ باز کہتا اور مرتبہ انسانیت سے بھی نیچے گراتا ہے (روح المعانی جلالین، مدارک، بحر)

فِی شَکٍّ فِیہِ: یعنی بقول مولانا تھانویؒ قولِ بلا دلیل میں پڑ گئے ہیں۔ یعنی نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہود آپس میں دست و گریبان ہیں اور عیسائیوں میں خدا معلوم اس بنیادی عقیدہ کے متعلق کتنے فرقے بن چکے ہیں (مسلمانوں کی فرقہ بازی بھی مذموم ہے مگر وہ بنیادی عقائد کے بارے میں بہت کم ہے اور بالعموم اس کا باعث جزئیات و تفاصیل ہیں۔ مؤلف)

مَا لَھُم بِہٖ مِن عِلمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ: وہ وہم و گمان اور اٹکل کے پیرو ہیں۔ اور وہم و گمان حقیقت و راستی سے بہت بعید ہے۔ عیسائیوں نے تو غضب ہی کر رکھا ہے کہ اپنے سارے مذہب یعنی الوہیت مسیحؑ، وفات مسیحؑ، احیائے مسیحؑ کی بنیاد محض وہم و گمان اور غلط عقیدت اور ہوائی عقائد پر رکھ

Marfat.com

دی ہے۔ یہاں ظن کا لفظ علم کے مقابل بولا گیا ہے۔ علم وہ جو دلائل سے ثابت ہو۔ ظن وہ جو بلا دلیل ہو یا اس کی بنیاد کوئی نص نہ ہو نہ اس سے استنباط و استخراج اس آیت سے استنباط کی نفی نہیں ہوتی وہ تو خود دلائل شرع میں داخل ہے اور علم کا حصہ ہے۔ قیاس دوسرے لفظوں میں یہی استنباط و استخراج ہے۔ قیاس، ظن نہیں دونوں میں بہت فرق ہے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا : یہاں یقیناً کا لفظ نفیٔ قتل کی تاکید کے لئے ہے (کشاف / مدارک، جلالین) عقیدۂ وفاتِ مسیحؑ یا قتل مسیحؑ چونکہ بہت بڑی غلط فہمی اور گمراہی کا باعث ہے۔ اور دنیا کی دو بڑی قومیں یہودی اور عیسائی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس لئے قرآن مجید کو اس کی تردید کی ضرورت بھی بہت وضاحت اور تاکید کے ساتھ کرنی پڑی۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ کا معنی اپنی طرف یا اپنے آسمان کی طرف۔ قرآن مجید میں اس طرح کے حذفِ مضاف کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔ اور جس طرح "اللہ نے فلاں کو اپنی طرف بلا لیا" سے مراد آخرت کی طرف بلا لینا سمجھی جاتی ہے، اسی طرح عربی اور اردو دونوں محاورہ میں اللہ کی طرف اٹھا لینے سے مراد آسمان کی طرف اٹھا لینے سے ہے۔ (راغب، قرطبی، مدارک، بحر) رفع کے اصل معنی جسمانی اور مادی رفع ہی ہے (راغب) روحانی رفع اور بلندی مراتب اس کا مجازی معنی ہے۔ اور بلا سبب، بلا دلیل اور بلا ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز کو اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی ایسی وجہ یہاں موجود نہیں جس کے باعث خواہ مخواہ مجازی معنیٰ مراد لیا جائے۔

بعض نادان اور نوخیز فرقوں کا یہ استدلال کہ چونکہ رفع کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہے لہٰذا رفع جسمانی تو مراد ہو ہی نہیں سکتا اور اس لئے لامحالہ رفع مجازی یعنی قرب و منزلت مراد ہوگی۔ قرآن فہمی سے بعد پر مبنی ہے۔ آخر قرآن مجید ہی میں اس طرح کی آیات بھی موجود ہیں۔ **وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ** یہاں ہجرت سے مراد حقیقی ترکِ وطن اور جسمانی و مادی ہجرت ہی ہے نہ کہ رفع درجات۔ یا پھر مثلاً **قَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ** یہاں رب کی طرف جانے سے شام کی طرف جانا مراد ہے، اور یہ ذہاب مادی و جسمانی ہے۔ امام رازیؒ نے خوب لکھا ہے کہ تعظیم و تشریف کے جس سیاق میں یہاں رفع الی اللہ کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ یہ رفع کوئی امتیازی اور مخصوص چیز ہے جو متقین اور صالحین کے عام دخولِ جنت اور وہاں کی لذاتِ جسمانی و حسی سے الگ ہے (تفسیر کبیر) رفع جسمانی کا عقیدہ لازمۂ ایمان اور شرطِ اسلام ہو یا نہ ہو، بہرحال ظاہر قرآن سے قریب تر ضرور ہے (اور نقلی و عقلی مسیحوں نے دفاتِ مسیحؑ پر سارا زور محض اس لئے صرف کیا ہے کہ پہلے مسیحؑ کو مار کر اپنے لئے "سیٹ"

Marfat.com

خالی کریں اور لوگوں کو اپنی روحانی وجسمانی چودھراہٹ کے گرد جمع کرسکیں۔ یہ صریح استحصال مذہبی ہے۔ پنجابی جعلی نبوت نے اس عقیدہ وفاتِ مسیحؑ میں بھی جو الٹ پھیر کئے ہیں اور جس جس طرح کی فریب کاریاں اس سلسلے سرزد ہوئی ہیں ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس جعلی نبوّت کے حاملین محض روحانی ریاست کے حریص ہیں۔ مولف/

آیت کے آخر میں عزیزاً حکیماً فرمایا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی صفتِ عزیز کے آگے اپنے نبی کو بچالینا اور دشمنوں کو ناکام کرنا کچھ مشکل نہیں اور یہی تقاضائے حکمت بھی تھا۔

سلہ عَلٰی مَرْیَمَ بُهْتَانًا عَظِیْمًا: حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا معاملہ یہود کی قوم میں فی الواقع ذرّہ بھر بھی مشتبہ نہ تھا، بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیّت کا بچّہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے، نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لئے ہوئے آئی اور قوم کے چھوٹے اور بڑے ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کرکے آگئے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کے جواب دینے کی بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کردیا، کہ تمہیں یہ جواب دے گا۔؟

مجمع میں سے لوگوں نے حیرت سے کہا کہ اس بچے سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں پڑا ہوا ہے؟ مگر لیکا یک وہ بچہ گویا ہوگیا اور اس نے نہایت صاف اور شستہ زبان میں مجمع کو خطاب کرکے کہا کہ "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ (سورۂ مریم)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کی جڑ ہمیشہ کے لئے کاٹ دی تھی جو ولادتِ مسیحؑ کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے سنِ شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرتِ مریمؑ پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰؑ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوّت کے کام کی ابتداء فرمائی۔ اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی ان کے علماء و فقہا کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا۔ ان کے بداعمالیوں اور ان کے عوام و خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہوگئے تھے، اور اس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی۔ جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دینی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا۔

تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لئے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی۔ کہ مریم علیہ السلام معاذ اللہ زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم ولدالزنا۔ حالاں کہ یہ ظالم جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کی یہ بہتان طرازی کسی حقیقی شبہ کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا۔ بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر

سلہ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۴۱۷-۴۲۱

Marfat.com

محض حق کی مخالفت کے لئے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے۔ کیوں کہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

اِنَّا قتلنا المسیح الخ: یہود کی جرأتِ مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کے قتل کا اقدام کیا۔ اور فخریہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ گہوارے کے واقعہ سے یہودیوں کو عیسیٰؑ کی نبوت میں شک و شبہ کرنے کا کوئی موقع یا گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انہوں نے حضرت موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا مفصلاً ذکر سورۂ آلِ عمران میں ہے) ان کے بعد تو معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ ہو چکا تھا۔ اور واضح تھا کہ آں جناب پیغمبر ہیں۔ اس لئے واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں۔ جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے (ان کا حضرت عیسیٰؑ کی رسالت سے انکار ازراہِ لعنت و عناد تھا۔ مؤلف)

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی کسی شخص کو نبی مانتے اور جانتے ہوئے اسے قتل کر دے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں جو ان کی برائیوں پر انہیں ٹوکے اور ناجائز کاموں سے ان کو روکے۔ ایسے لوگ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں۔ ہمیشہ بدکار قوموں میں قتل اور قید کی سزائیں پاتے رہے ہیں۔

تلمود میں لکھا ہے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس فتح کیا تو وہ ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا اور سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک جگہ اسے دیوار پر ایک تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے یہودیوں سے پوچھا کہ یہ نشان کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا "یہاں زکریاؑ نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری برائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا آخر جب اس کی ملامتوں سے ہم تنگ آ گئے تو ہم نے اُسے مار ڈالا"۔ بائبل میں یرمیاہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل کی بداخلاقیاں حد سے گزر گئیں اور حضرت یرمیاہ نے ان کو متنبہ کیا کہ ان اعمال کی پاداش میں خدا تم کو دوسری قوموں سے پامال کرا دے گا، تو ان پر الزام لگایا گیا کہ یہ شخص کسدیوں (کلدانیوں) سے ملا ہوا ہے۔ اور قوم کا غدار ہے اس الزام میں ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ حضرت مسیحؑ کے واقعہ صلیب سے ڈیڑھ سال پہلے ہی حضرت یحییٰؑ کا معاملہ پیش آ چکا تھا۔ یہودی بالعموم ان کو نبی جانتے تھے اور کم از کم یہ تو مانتے ہی تھے کہ وہ ان کی قوم کے صالح ترین لوگوں میں ہیں۔ مگر جب انہوں نے ہیرودیس (والیٔ ریاست یہودیہ) کے دربار کی برائیوں پر تنقید کی تو اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے اور پھر والیٔ ریاست کی معشوقہ کے مطالبہ پر ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہودیوں کے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زعم میں مسیحؑ کو سولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا ہو کہ "ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے"!

آیت ۱۵۷: تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیحؑ صلیب پر چڑھائے جانے سے پہلے ہی اٹھا لئے گئے تھے۔ اور یہ کہ مسیحیوں اور یہودیوں دونوں کا یہ خیال کہ مسیحؑ نے صلیب پر جان دی، محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قرآن

Marfat.com

اور بائبل کے بیانات کا متقابل مطالعہ کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً پیلاطس کی عدالت میں پیشی تو آپ ہی کی تھی مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سنا چکا، اور جب یہودیوں نے مسیحؑ جیسے پاک نفس انسان کے مقابلہ میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھہرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر مہر بھی لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اٹھا لیا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا وہ آپ کی ذات مقدس نہ تھی بلکہ کوئی اور شخص تھا۔ جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسیٰ بن مریم سمجھ لیا: تاہم ان کا جرم اس سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس کو انہوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسیٰ بن مریمؑ ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طرح ان کے لئے مشتبہ ہو گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعہ معلومات نہیں ہے، اس لئے مجرد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس شبہ کی نوعیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انہوں نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو صلیب دی ہے، درآنحالیکہ عیسیٰ ابن مریمؑ ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

عیسیٰؑ کے بارے میں اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں۔ اور ان میں مسیحؑ کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک متفق علیہ قول نہیں ہے، بلکہ بیسیوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل حقیقت ان کے لئے بھی مشتبہ ہی رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیحؑ نہ تھا بلکہ مسیحؑ کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت سے صلیب دے رہے تھے اور مسیحؑ وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیحؑ ہی کو گیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی، بلکہ صلیب سے اتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی (پنجابی مسیح اور اس کی امت کا بھی یہی موقف ہے۔ ع اوّل بآخر نسبتے دارد! مؤلف)

کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے صلیب پر وفات پائی، پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے مختلف حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر مسیحؑ کی موت جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا، مگر اس میں جو الوہیت کی روح تھی وہ اٹھا لی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیحؑ جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں (اور وہ بھی ایک ایسی چیز کے بارے میں جس پر موجودہ عیسائیت کی بنیاد ہے۔ عقیدۂ کفارہ موجودہ عیسائیت کی جان ہے اور اس کی بنیاد مسیحؑ کے صلب و قتل پر رکھی گئی ہے! مؤلف)

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ : یہ اس معاملہ کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جزم و صراحت کے ساتھ جو چیز بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو قتل کرنے میں یہود کامیاب نہیں ہوئے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اٹھانے کی کیفیت کیا تھی۔ تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ نہ قرآن اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ

Marfat.com

ان کو جسم و روح کے ساتھ کرۂ ارض سے اٹھا کر آسمان پر لے گیا اور نہ یہ صاف کہتا ہے کہ انہوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اٹھائی گئی۔ اس لئے قرآن کی بنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی قطعی نفی کی جا سکتی ہے اور نہ اثبات۔ لیکن قرآن کے اندازِ بیان سے یہ بات بالکل نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اٹھا لے جانے کی نوعیت و کیفیت خواہ کچھ ہو بہر حال مسیحؑ کے ساتھ اللہ نے کوئی ایسا معاملہ ضرور کیا ہے جو غیر معمولی نوعیت کا ہے اس غیر معمولی پن کا اظہار تین چیزوں سے ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و روح سمیت اٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ان اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بڑا گروہ الوہیتِ مسیحؑ کا قائل ہو لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن نے صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہٖ وہی "رفع" (ASCENSION) کا لفظ استعمال کیا ہے جو عیسائی اس واقعہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کتابِ مبین کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کو مزید تقویت پہنچانے والی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسیحؑ کا اٹھایا جانا ویسا ہی اٹھایا جانا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دنیا سے اٹھایا جاتا ہے، یا اگر اس رفع سے مراد محض درجات و مراتب کی بلندی ہوتی جیسے حضرت ادریسؑ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ: وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا، تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لئے زیادہ مناسب الفاظ یہ ہو سکتے تھے کہ یقیناً انہوں نے مسیحؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو زندہ بچا لیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے اس کو ذلیل کرنا چاہا تھا مگر اللہ نے اس کو بلند درجہ عطا کیا۔"

تیسرے یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورہ میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ "اسے اللہ نے اٹھا لیا"، تو اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا کہ: اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔" یہ تو صرف کسی ایسے واقعہ کے بعد ہی موزوں و مناسب ہو سکتا ہے جس میں اللہ کی قوتِ قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

اس کے جواب میں قرآن سے اگر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہ ہے کہ سورہ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّيْكَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ لفظ طبعی موت کے معنی میں صریح نہیں ہے، بلکہ قبضِ روح اور قبضِ روح و جسم دونوں پر دلالت کر سکتا ہے۔ لہٰذا ان قرائن کو ساقط کر دینے کے لئے کافی نہیں ہے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ بعض لوگ جن کو مسیحؑ کی طبعی موت کا حکم لگانے پر اصرار ہے سوال کرتے ہیں کہ توفی کا لفظ قبضِ روح و جسم پر استعمال ہونے کی کوئی اور نظیر بھی ہے؟ لیکن جب قبضِ روح و جسم کا واقعہ تمام نوعِ انسانی کی تاریخ میں پیش ہی ایک مرتبہ آیا ہو تو اس معنی پر اس لفظ کے استعمال

Marfat.com

کی نظیر پوچھنا محض ایک بے معنی بات ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ آیا اصل لغت میں اس استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں؟ ہے تو ماننا پڑے گا کہ قرآن نے رفع جسمانی کے عقیدہ کی صاف تردید کرنے کے بجائے یہ لفظ استعمال کرکے ان قرائن میں ایک قرینہ کا اور اضافہ کر دیا ہے جن سے اس عقیدہ کو الٹی مدد ملتی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ موت کے صریح لفظ کو چھوڑ کر دفات کے محتمل المعنین لفظ کو ایسے موقع پر استعمال کرتا جہاں رفع جسمانی کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ایک فاسد اعتقاد یعنی الوہیتِ مسیحؑ کے اعتقاد کا موجب بن رہا تھا۔ پس قرآن کی رُو سے زیادہ مطابقت اگر کوئی طرزِ عمل رکھتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ رفع جسمانی کی تصریح سے بھی اجتناب کیا جائے اور موت کی تصریح سے بھی، بلکہ مسیحؑ کے اٹھائے جانے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ کا ایک غیر معمولی ظہور سمجھتے ہوئے اس کی کیفیت کو اسی طرح مجمل چھوڑ دیا جائے جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے اسے مجمل چھوڑ دیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ :- اس فقرے کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ اور الفاظ میں دونوں کا احتمال ہے۔ ایک معنی یہ کہ مسیحؑ کی موت سے پہلے دنیا بھر کے اہل کتاب ان پر صحیح ایمان لائیں گے۔ دوسرے یہ کہ اہل کتاب میں سے ہر مرنے والا اپنی موت سے پہلے مسیحؑ پر ایمان لے آئے گا۔ اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مسیحؑ کی طبعی موت جب واقع ہوگی اس وقت جتنے اہل کتاب موجود ہوں گے وہ سب اُن پر یعنی ان کی رسالت پر ایمان لا چکے ہوں گے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہل کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالت مسیحؑ کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے، اور وہ مسیحؑ پر ایمان لے آتے ہیں۔ مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں معنی متعدد صحابہؓ تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ ہی کے علم میں ہے (لیکن اہل تحقیق نے کہا ہے کہ بِهٖ اور مَوْتِهٖ کی ضمائر کا ایک ہی مرجع ہونا چاہیئے تاکہ انتشار ضمائر لازم نہ آئے۔ تفصیل اس کی سید المحدثین علامہ سید محمد انور شاہؒ کی مشہور کتاب عقیدۃ الاسلام میں ملے گی۔ مؤلف)

۵۷ کسی نبی پر کوئی کتاب آسمان سے اس طرح نازل نہیں ہوئی جیسا کہ یہود نے سوال کیا تھا۔ بلکہ الہام کے ذریعہ سے نازل ہوئی تھیں۔ وہ تختیاں جو موسیٰؑ کوہ طور سے لائے تھے، تورات نہ تھی، بلکہ ان پر دس حکم لکھے ہوئے تھے جن کو موسیٰؑ نے بعد میں تورات میں لکھوا دیا تھا۔ واللہ اعلم۔

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ اصل میں غُلُفٌ ہے جیسے کُتُبٌ وَرُسُلٌ پر غُلُفٌ، کُتُبٌ اور رُسُلٌ بھی استعمال ہونے لگا۔ یہ غلاف کی جمع ہے مطلب یہ کہ یہودی اپنے آپ کو علم کا غلاف یا جزدان کہتے تھے یعنی ان کا دعویٰ تھا کہ ہم بہت عالم ہیں، ہمارے دلوں میں علم و فضل کے خزانے بند ہیں، لہٰذا کسی کے وعظ و پند یا ہدایت کے محتاج نہیں۔

لہ تفسیر حقانی ج ۳ ص ۴۲ تا ۴۴

Marfat.com

عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ یہودی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا رسول نہ مانتے تھے، صرف بطور تمسخر رسول اللہ کہا۔ جیسے وَقَالُوْا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ (مشرکوں نے بطورِ تمسخر حضورؐ سے کہا کہ اے وہ شخص جس پر یہ قرآن اتارا گیا ہے، یقیناً تو دیوانہ ہے/

۱۵۱ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ: کتاب کا ایک معنی خط بھی ہے، بعض روایات کے مطابق یہود نے آپؐ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آپؐ کی رسالت کے بارے میں براہِ راست خط بھیجے تو تب ہم آپؐ پر ایمان لائیں گے (یہ محض ان کا تعصب و عناد اور عداوت و تعنت تھا، ورنہ اللہ تعالیٰ کا خط (وحی، پیغام، کتاب) تو ہمیشہ پیغمبر ہی لاتے رہے ہیں۔ اگر ہر آدمی کو الگ الگ خط آنا ہوتا تو مسئلہ رسالت ہی باطل ہو جاتا۔ پھر بھلا پیغمبر کی کیا ضرورت تھی؟ اسی قسم کا مطالبہ آپؐ سے مشرکین مکہ نے بھی کیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہود کا مطالبہ مشرکین کی دیکھا دیکھی تھا یا مشرکین کو یہود کے اکسانے اور سکھانے پڑھانے کی بنا پر/ مؤلف/

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ: مشرکین کا قول قرآن پاک نے یوں نقل کیا ہے: قُلُوْبُنَا فِیْ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اِلَیْہِ (ہمارے دل تمہاری دعوت کی طرف سے پردوں میں ہیں) اس سے بھی ہر دو فریق کی مشابہت ثابت ہو گئی۔

شُبِّہَ لَھُمْ: یہ شخص جس پر حضرت عیسیٰؑ کی تشبیہ ڈالی گئی تھی، بعض روایات کے مطابق تو آپ کا ایک حواری سرجیس تھا۔ اور اس نے خود حضرت عیسیٰؑ کے دریافت کرنے پر اپنے آپ کو اس قربانی کے لئے پیش کیا تھا، چنانچہ وہی پکڑا اور صلیب دیا گیا۔ کچھ دوسری روایات کے مطابق مشابہت والا آدمی وہ جاسوس تھا جس نے رشوت لے کر آپ کو پکڑوانے کا ذمہ لیا تھا اس کا نام یہودس دکریا یوطا یا یہودا اسخریوطی تھا۔ جب یہ پکڑوانے کو آیا تو حضرت عیسیٰؑ کو تو اٹھا لیا گیا اور اسی پر حضرت عیسیٰؑ کی مشابہت پڑ گئی اور اسی کو پکڑ کر سولی دے دی گئی۔ اس کے واویلا اور شور و غل کو بھی کسی نے نہ مانا۔ ابن جریر طبریؒ کی رائے ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو کی مشابہت ان کے ساتھیوں پر ڈالی گئی تھی پس انہی میں سے ایک کو پکڑ کر صلیب پر چڑھا دیا گیا۔

۱۵۲ یہود کا اللہ تعالیٰ کو روبرو دیکھنے کا سوال جہالت و حماقت پر مبنی تھا۔ کیوں کہ انہوں نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ ایک محدود جسم ہے جس کا ادراک آنکھوں کو اس دنیا میں ہو سکتا ہے۔ رہا حضورؐ سے ایک لکھی لکھائی کتاب یا خدا کی طرف سے ایک خط اتارنے کا مطالبہ سو یہ یا تو ان کے عناد کی دلیل ہے کہ ایسا مطالبہ انہوں نے محض ستانے اور عاجز کرنے کی خاطر کیا تھا۔ اور یا یہ بھی نبوت و رسالت سے جہالت کی دلیل ہے۔

---

۲ الرازی، المنار ج ۶ ص ۱۱-۸۹

Marfat.com

سورۃ النساء۔

ان میں پیغمبر آچکے تھے مگر پھر بھی انہوں نے ایسا جاہلانہ مطالبہ کیا۔ پیغمبروں کی آیات و معجزات اور شعبدہ بازوں اور جادوگروں کے مکارانہ حیلوں اور فن کارانہ چابک دستیوں میں واضح فرق ہوتا ہے۔ پیغمبر اور شعبدہ باز میں عقائد و اخلاق و کردار، مقاصد اور تعلیم ہر چیز کے لحاظ سے امتیاز ہوتا ہے جو ہر صاحب عقل و خرد کو نظر آجاتا ہے۔

موسیٰؑ سے سوال کرنا ان یہود کی طرف منسوب کیا گیا حالانکہ واقعۃً سوال کرنے والے ان کے سلف تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلف و سلف اخلاق صفات میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اولاد اپنے آباؤ اجداد کی وارث ہوتی ہے۔ بالخصوص یہود جو کسی اور قوم میں رشتہ داری ہی نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں قرآن کے نزدیک ساری امت ایک شخص واحد کی مانند شمار ہوتی ہے جبکہ خلف اپنے سلف کے متبع ہوں۔

عیسیٰؑ کی تشبیہ جو ایک اور شخص پر ڈال دی گئی تھی یہ ایک معجزہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تائید فرمائی تھی۔ ویسے اس قسم کے واقعات بالکل ممکن ہیں اور کئی دفعہ ہو چکے ہیں۔ ایک انگریز نے جو قانون، شرعی علوم اور طب کا ماہر تھا ۱۵۳۹ء کا فرانس میں ہونے والا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک شخص جس کا نام مارٹن جیر تھا اُسے پہچاننے کے لئے ۱۵۰ آدمی جمع کئے گئے۔ ان میں سے ۹۰ نے یقین سے کہا کہ یہ واقعی مارٹن ہے۔ لیکن ۵۰ نے کہا کہ یہ کوئی اور شخص ہے، مارٹن نہیں۔ باقی ۶۰ آدمی متردد تھے اور نفیاً یا اثباتاً کوئی بات بھی جزم و یقین کے ساتھ نہ کہہ سکے۔ پھر بعد میں اور دلائل سے واضح ہو گیا کہ یہ شخص مارٹن جیر نہیں تھا، اور اسے پہچان کر اثبات کرنے والے دھوکے میں آگئے تھے۔ وہ تین سال تک مارٹن کی بیوی کے ساتھ خاوند کی حیثیت سے رہا اور مارٹن کے سب اعزہ و اقربا بھی اسے مارٹن ہی سمجھتے رہے۔ پھر جب اس کے خلاف ثابت ہو گیا تو مقدمہ ایک اور عدالت میں منتقل کیا گیا۔ وہاں ۳۰ گواہ لائے گئے جن میں سے ۱۰ نے قسم کھا کر گواہی دی کہ یہی مارٹن ہے، سات نے کہا یہ مارٹن نہیں اور باقی ۱۳ متردد میں رہے۔

اہل کتاب کو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں جو شک پڑا اس کا ذکر انجیل متی (۲۶، ۳۱) اور انجیل مرقس (۱۴، ۲۷) میں بھی ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ نے حواریوں سے فرمایا تھا کہ تم سب اس رات (گرفتاری والی) کے بارے میں شک میں پڑ جاؤ گے۔ پھر جب حواریوں کو ہی شک لاحق ہو گیا تو بعد والوں کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔

انجیل برنباس میں ہے کہ گرفتار ہونے والا مسیحؑ نہ تھا بلکہ یہودا اسخریوطی تھا۔ مسلمانوں کی ۷۲ روایات عیسیٰؑ کے بچ جانے اور کسی کے قتل و مصلوب ہونے پر متفق ہیں، جبکہ عیسائیوں کی روایات میں اضطراب و انتشار ہے۔

Marfat.com

۱۵۱ پچھلی آیات میں بتایا گیا تھا کہ اسلام میں ایمانیات کا مرکز رسالت و نبوت ہے۔ ان آیات اہل کتاب کے بارے میں جو انہوں نے رسالت و نبوت کے متعلق اختیار کیا، وضاحت کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو ان کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عناد و عداوت کے اظہار کا بیان ہے دوسری طرف موسیٰؑ سے انہوں نے جو سلوک کیا اس کا ذکر ہے اور تیسری طرف حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں انہوں نے خاص طور پہ جو کچھ کہا اور کیا اس کا بیان ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے قتل و صلب کا معاملہ ایسا ہے جس میں یہود و نصاریٰ خبط اور وہم و گمان کا شکار ہوئے ہیں۔ یہود تو انہیں بطور تمسخر و استہزا "رسول اللہ" کہہ کر قتل کر ڈالنے کے مدعی ہیں۔ نصاریٰ ان کے مصلوب و مدفون ہونے کے قائل ہیں مگر کہتے ہیں کہ وہ تین دن کے بعد جی اٹھے تھے۔ اور تاریخ عیسیٰؑ کی پیدائش اور انجام وغیرہ سے بالکل خاموش ہے، گویا کہ کوئی ایسا واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔

عیسائیوں کی انجیلیں مخفی طور پہ عیسیٰؑ کے دور کے بعد ایسے زمانے میں لکھی گئی تھیں جبکہ عیسیٰؑ پر ایمان لانے والے سخت تکلیف و عذاب کا شکار تھے۔ ان کے لکھنے والے گمنام ہیں۔ ان کے بیانات مختلف ہیں۔ بہت سی انجیلوں میں سے چار کا انتخاب بلا دلیل کر لیا گیا تھا۔ یہ قصہ دوسری صدی کے اواخر کا ہے۔ انجیل کا معاملہ از اول تا آخر شک و شبہ سے پُر ہے۔ انجیل برنباس کا بیان چار مشہور انجیلوں سے مختلف ہے۔ برنباس خود حواری ہے اور اپنا بیان نقل کرتا ہے کہ یہودا اسخریوطی کی شکل و صورت اور آواز بدل کر بالکل مسیحؑ جیسی ہو گئی اور مسیحؑ کو خدا نے محفوظ اٹھا لیا۔

قرآن نے واقعہ قتل و صلب کا انکار کر دیا ہے۔ یہی واقعہ یہود کے ہاں عیسیٰؑ کے معاذ اللہ ملعون ہونے کی اور نصاریٰ کے ہاں کفارہ کی بنیاد ہے۔ قصہ کی تفاصیل قرآن نے بیان نہیں کیں، یہ اس کے موضوع سے خارج تھیں۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ

سو یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کیں ان پر بہت سی پاک چیزیں

اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ۱۶۰

جو ان پر حلال تھیں اور اس وجہ سے کہ وہ روکتے تھے اللہ کی راہ سے بہت

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ

اور اس وجہ سے کہ سود لیتے تھے حالانکہ ان کو اس کی ممانعت ہو چکی تھی اور اس وجہ سے

Marfat.com

اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ

کہ لوگوں کا مال کھا لیتے تھے ناحق اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے واسطے جو ان میں سے ہیں

عَذَابًا اَلِيْمًا ۝١٦١ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ

عذاب دردناک لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان میں

وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ

اور ایمان والے سو مانتے ہیں اس کو جو نازل ہوا تجھ پر اور جو نازل ہوا

مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ ۚ وَالْمُؤْتُوْنَ

تجھ سے پہلے اور آفرین ہے نماز پر قائم رہنے والوں کو اور جو دینے والے

الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

ہیں زکوٰۃ کے اور یقین رکھنے والے ہیں اللہ پر اور قیامت کے

الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ

دن پر سو اسیوں کو ہم دیں گے

اَجْرًا عَظِيْمًا ۝١٦٢

ع ۲۲ ۱۰ ۲

بڑا ثواب

شرح الفاظ

طَيِّبٰتٍ: پاکیزہ چیزیں، یعنی یہود پر بطور سزا یہ چیزیں حرام کی گئی تھیں۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ کی حرام کردہ ہر چیز گندی اور غیر پاکیزہ ہے۔ **الرِّبٰوا**: اس کا لفظی معنی ہے بڑھانا، چونکہ اصل مال پر ناجائز طور پر کچھ بڑھا لیا جاتا ہے لہٰذا اسے ربوا کہا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی میں سُود ہے۔ اور انگریزی

Marfat.com

کے الفاظ بھی اسی کے ہم معنیٰ ہیں۔ سُود کا معنیٰ بھی نفع ہے۔ الرّٰسخون پختہ کار، مضبوط، پکے اور گہرے علم والے۔ وَالمقیمین مقامِ مدح میں منصوب ہے، یعنی "اور کیا کہنے ہیں نماز قائم رکھنے والوں کے"!

ان آیات میں یہود کی دنیوی و اُخروی سزا بیان فرمائی گئی ہے۔ دنیا میں تو ان پر بعض حلال چیزوں کو حرام ٹھہرا دیا گیا اور آخرت میں ان کے لئے عذابِ الیم تیار ہے۔ ہاں ان میں سے جو حضورؐ پر ایمان لے آئے ان کی صفات بیان کر کے ان کی مدح فرمائی گئی ہے۔

۱۶۰ آیت ۱۶۰-۱۶۱: یہود کی اگلی پچھلی سخت سخت شرارتیں ذکر فرما کر جس سے ان کی سرکشی اور اُن کا گناہوں پہ دلیر ہونا ظاہر ہو گیا، اب فرماتے ہیں کہ اسی واسطے ہم نے ان پر شریعت بھی سخت رکھی تاکہ ان کی سرکشی ٹوٹے تو اب یہ شبہ نہ رہا کہ تحریمِ طیبات تو ان پر تورات میں کی گئی تھی اور حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت اور حضرت مریمؑ پہ بہتان لگانا نزولِ تورات کے بہت بعد ہوا تو اس جرم کی سزا کیسے مقدم ہو گئی؟، اس تمام رکوع کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے اہلِ کتاب برابر ایک سے ایک زائد شرارت اور نافرمانی اور عہد شکنی اور حضراتِ انبیاء کی ایذا رسانی کرتے چلے آئے ہیں۔ اب اگر اے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم سے عناداً تورات جیسی کتاب دفعۃً واحدۃً طلب کریں اور قرآن شریف جو سب کتابوں سے افضل ہے اس پر کفایت نہ کریں تو ان نالائقوں سے کیا بعید ہے؟ ان کی اس قسم کی ناشائستہ حرکات سے تعجب مت کرو اور متحیر نہ ہو، ان کی تمام حرکات، چھوٹی بڑی اگلی پچھلی ہم کو خوب معلوم ہیں۔ ہم نے دنیا میں اسی لئے ان پر سخت شریعت بھیجی اور آخرت میں ان کے لئے سخت ترین عذاب تیار کر رکھا ہے۔

آیت ۱۶۲: بنی اسرائیل میں جن کا علم مضبوط ہے، جیسے عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی اور جو لوگ کہ صاحبِ ایمان ہیں وہ قرآن اور تورات و انجیل سب کو مانتے ہیں۔ اور نماز کو قائم رکھنے والوں کا تو کیا کہنا ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اللہ اور قیامت پر یقین والے جو لوگ ہیں ان کو ہم بڑا ثواب دیں گے۔ بخلاف فریقِ اوّل کے کہ ان کے لئے سخت عذاب موجود ہے۔

۱۶۲ فَبِظُلْمٍ میں ب سببیت بتلانے کے لئے ہے۔ اس سے یہ صاف نکل آیا کہ اسرائیلی اُمّت پر بعد میں جو کچھ سختیاں ہوئیں خود انہی کی بدولت ہوئیں، بلا سبب نہ تھیں۔ جس طرح افراد کے نفسِ سرکش کی اصلاح کی ایک صورت یہ ہے کہ بعض مباحات سے بھی اُسے روک دیا جائے، اسی طرح جب کسی قوم کا مزاج اعتدال سے منحرف ہو جاتا ہے تو اس کے لئے بھی مناسب صورت یہی ہوتی ہے کہ جن جائز چیزوں کی وہ عادی تھی ان سے اُسے محروم کر دیا جائے۔

---

۱۶۰ فوائد القرآن صفحہ ۱۳۳، تفسیر حقانی ج ۳ صفحہ ۲۴۶-۲۴۷ (خلاصہ) ۱۶۲ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۲۹-۲۳۰

Marfat.com

وَبِصَدِّهِمْ : یہود کی قومی فردِ جرم کی یہ دوسری دفعہ ہے۔ یعنی خود اپنی جانوں پہ تو ظلم کر ہی رہے تھے مگر ان کی گمراہی متعدی بھی تھی اور دوسروں کو بھی بھٹکا رہے تھے۔ کثیرًا کا ایک معنی تو یہی ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کو راہِ حق سے روک دیتے تھے۔ دوسرا معنیٰ تو یہی ہے کہ ان کی روکنے یا گمراہ کرنے کی خصلت بہت زائد تھی۔ تیسرا معنیٰ یہ بھی کیا گیا ہے کہ مدّت طویل تک راہ خدا سے روک تھام کرتے رہے۔ غرض کثرت کا تعلق مدّت و کیفیت اور زمانہ تینوں سے ہو سکتا ہے۔

وقد نهوعنه : تورات میں ممانعتِ سود کے احکام آج تک لکھے چلے آرہے ہیں۔ (خروج ۲۲۔ ۲۵، احبار ۳۵، ۳۷، ۳۶، ۳۷) یہ اور بات ہے کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ سود خوار قوم یہی قوم یہود ہے۔ اور ان کے شاملاک دنیا میں ضرب المثل بن چکے ہیں۔

عذابًا اليمًا : آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سزائیں تو عموماً عمومی و اجتماعی رنگ میں ملتی ہیں، چنانچہ فلاں فلاں نعمتوں سے ساری قوم محروم کر دی گئی۔ لیکن آخرت میں سزائیں تمام تر انفرادی اور شخصی حیثیت سے ملتی ہیں۔ ہر فرد اپنے اپنے اعمال کو بھگتے گا۔

لہ آیت ۱۶۰ : کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) یہ کہ حُرِّمْنَا سے مراد حرمتِ قدری ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود تھا کہ یہ لوگ اپنی کتاب میں تحریف کریں گے اور کئی حلال چیزوں کو اپنے اوپر خود حرام ٹھہرالیں گے (گویا ان احمقوں اور ظالموں کی ظلم یہ تھا کہ خدا کی حلال کردہ پاک چیزوں کو اپنے اوپر از خود حرام کر لیا۔ اپنے آپ کو عملاً خود سزا میں گرفتار کر لیا اسی کو حَرَّمْنَا کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ (مولف)

اور یہ سب کچھ ان کے اپنے تشدد اور سخت گیری کے باعث ہوا جیسا کہ نصاریٰ نے از خود رہبانیت اختیار کر لی جو بوجہ خلافِ فطرت ہونے کے چل نہ سکتی تھی، اس لئے اپنی ایجاد کردہ پابندی کو بھی نبھا نہ سکے۔ مؤلف

(۲) دوسرا معنیٰ حَرَّمْنَا کا یہ ہے کہ اس سے مراد حرمتِ شرعی ہے۔ یعنی نزول تورات سے قبل جو چیزیں پچھلے پیغمبروں کی شریعت میں حلال تھیں وہ نزول تورات کے وقت قوم یہود کی بدکاریوں اور سخت دلی کے باعث حرام کر دی گئیں۔ جیسے فرمایا ہے کہ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَائِيلَ الخ پھر تورات میں کچھ چیزوں کی حرمت کا ذکر سورۃ الانعام میں فرمایا لیا ہے وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا الخ یعنی یہود پر ہر ناخن دار جانور حرام کر دیا گیا اور گائے بکری کی چربی بھی جو گوشت سے الگ ہو حرام کر دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ بڑے باغی و طاغی اور پیغمبروں کے سامنے اکڑنے والے تھے۔

وَالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ تمام آئمہ قرآت کے مصاحف میں اور ابی بن کعبؓ کے مصحف میں اسی طرح ہے۔ علامہ ابن جریر طبریؒ کے بقول عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں والمقیمون الصلوٰۃ

لہ تفسیر ابن کثیر ج ۶ صفحہ ۲۰۔

Marfat.com

ہے۔ بعض آئمہ نے اسے کتابت کی غلطی بتایا ہے۔ صحیح قرأت پہلی ہی ہے والمقیمین کا نصب بوجہ مدح کے ہے جیسے اس آیت میں وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ کلام عرب اور اشعار میں اس کے بہت سے نظائر موجود ہیں۔

[1] یہود اتنے سرکش اور ڈھیٹ تھے کہ جو حلال چیزیں بطور سزا ان پر حرام کی گئی تھیں ان کے متعلق کہا کرتے کہ یہ تو نوحؑ و ابراہیمؑ کے زمانہ سے حرام چلی آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے کئی مقامات پر ان کے اس زعم کو رد فرمایا ہے، اور بعض چیزیں شمار کر کے بتائی ہیں کہ یہ خدا کی سب شریعتوں میں حلال تھیں صرف یہود یہ ان کی سرکشی و بغاوت کے باعث حرام کر دی گئیں۔

عذاب کی دو قسمیں ہیں: ایک تو دنیوی مثلاً شریعت کے سخت احکام اتارنا اور حد و تعزیر وغیرہ جو جرائم کی سزائیں ہیں اور اجتماعی نظام میں اللہ تعالیٰ کی سنت کا جو تقاضا ہے مثلاً ظلم کا قوموں کے ضعف و غلامی اور تہذیب و تمدن کی بربادی کا باعث ہونا۔ دوسرا اُخروی عذاب ہے جسے کتاب کریم نے جہنم کے عذاب نار سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَبِصَدِّهِمْ: صَدَّ کا لفظ لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ اسی طرح صدود کا لفظ ہے۔ یہود میں یہ دونوں معنے موجود تھے۔ انہوں نے اپنے نفوس کو بھی انبیاء کی متابعت سے روکے رکھا اور لوگوں کے لئے بُری مثال پیش کر کے یا برائی کا حکم دے کر اور نیکی سے منع کر کے صَدّ کے دوسرے معنی کے مرتکب ہوئے۔

موجودہ تورات میں بے شمار دلائل و شواہد کی بنا پر تحریف کا یقین ہو چکا ہے اور اس تحریف کی ایک مثال مسئلہ سود بھی ہے۔ سود تمام انبیاء کے دین میں حرام رہا ہے، تورات میں بھی حرام تھا۔ لیکن بابل کی غلامی سے آزاد ہو کر تورات کا جو نسخہ لکھا گیا اس میں یہود نے یہ تحریف کی کہ صرف اسرائیلیوں سے سود لینا حرام لکھا گیا، نہ کہ غیر اسرائیلیوں سے۔ سفر خروج اور استثناء میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہود و نصاریٰ اس بات پر متفق ہیں کہ تورات کا پہلا اور اصلی نسخہ بیت المقدس پر حملے قتل و غارت، آگ لگائے جانے اور لوٹ مار کے واقعات میں گم ہو گیا تھا۔ موجودہ تورات قطعاً اصلی نہیں۔ لیکن اس موجودہ بائبل کی بعض کتابوں مثلاً زبور (مزمور ۱۵) اور امثال سلیمانؑ میں سود کی مطلقاً حرمت کا ذکر آج بھی موجود ہے۔ ان میں یہ لکھا ہوا نہیں کہ اسرائیلیوں سے سود لینا حرام اور غیر اسرائیلیوں سے لینا حلال ہے۔

ان آیات میں اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ کا لفظ ہے، باطل میں رشوت، خیانت، مکر و فریب وغیرہ سب داخل ہے۔ ایک اور آیت میں اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ کا لفظ ہے۔ سحت کا معنیٰ ہے کسب حرام اس سے مراد فتویٰ فروشی، تحریف کتاب الٰہی اور رشوت ہے۔

---

[1] المراغی ج ۶ ص ۱۷۱ المنار ج ۶ ص ۶۶-۵۹

Marfat.com

نماز قائم کرنے والوں کو مقام مدح میں رکھ کر بعد میں زکوٰۃ دینے والوں اور مومنوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا تقاضا ہے کہ زکوٰۃ بھی ادا کی جائے۔ کیونکہ جو شخص دین کے تقاضے کے مطابق نماز کو قائم کرے گا وہ زکوٰۃ سے کبھی گریز نہیں کر سکتا، کیونکہ زکوٰۃ نفس کو پاک کرتی، ہمت کو بلند کرتی، اور نفس پر مال کی اہمیت کو کم کرتی ہے۔ اور نماز کے بھی یہی فوائد آئے ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا ہے:
اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا، وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الخ بے شک انسان بے صبرا ثابت ہوا ہے۔ جب شر پہنچے تو جزع فزع کرتا ہے، اور بھلائی پہنچے تو اسے لوگوں سے روک لیتا ہے، ہاں! مگر نمازیوں کا یہ حال نہیں ہے۔

[1] یہودی قوم کو دنیا میں جو عبرت ناک سزا ملی اور مل رہی ہے وہ کبھی دوسری قوم کو نہیں ملی۔ وہ ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزت کا ٹھکانا میسر نہیں۔ دنیا میں تتر بتر کر دیئے گئے ہیں اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خطہ میں ذلت کے ساتھ پامال نہ کئے جاتے ہوں۔ اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں مگر اس قوم کو موت نہیں آتی۔ اس کو دنیا میں "نہ زندوں میں نہ مردوں میں" کی سزا دی گئی ہے تاکہ قیامت تک دنیا میں قوموں کے لئے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی رہے، اور اپنی سرگزشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلہ میں باغیانہ جسارتیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ یہود کی موجودہ سلطنت "اسرائیل" ایک عارضی وقفہ ہے جو اس ذلیل ترین قوم کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی تغافل شعار قوم کو تازیانۂ عبرت لگوانے کے لئے انہیں دیا گیا ہے۔ جب بھی مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو گئے انشاء اللہ اس قوم کا حال ایک دفعہ پھر عبرتناک ہو گا، شاید تباہی اور بربادی کے لئے دنیا کے کونوں سے یہود کو ایک جگہ اکٹھا کیا جا رہا ہے تاکہ ان پر ایک آخری ضرب لگائی جائے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (مؤلف)

[2] ان آیات نے یہود کی طبیعت اور ان کی تاریخ کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور بتا دیا ہے کہ کس طرح یہود نے پیغمبروں سے بہانہ سازی کی، کیونکر ان کی بات کو رد کیا اور ان سے تعنت و عناد برتا، اپنے اوہام و محسنات اور تراشیدہ مفکرات کی، موسیٰؑ کی قدم قدم پر مخالفت کی، پیغمبروں اور ان کے الہیٰ سے گستاخی کی اور ان کے حق میں علانیہ بدتمیزی کا وطیرہ اختیار کیا، رسولوں کو قتل کیا اور اس طرح نجر کیا۔ مسلمانو! کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کی [illegible] یہود کا مکر و فریب اور دسیسہ کاریاں کارفرما ہیں۔ اہل اسلام کو یہود کے [illegible] بغض و عناد حق اور اسلام اور اہل اسلام کی شدید دشمنی سے بے خبر نہیں، رہنی چاہیئے یہود حق اور اہل حق کے کھلے اور

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۲ صفحہ ۳۱ - ۳۲ ۔ [2] تفہیم القرآن صـ ۴۲۳

Marfat.com

پوشیدہ دشمن ہیں۔ یہ دشمنی ان کی جبلت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کے دل سخت ان کے جگر نہایت غلیظ اور ان کی ارواح تاریک ہیں۔ وہ صرف طاقت کے تھپڑے کے سامنے گردن جھکاتے ہیں جو کہ صرف اس وقت مانتے ہیں جبکہ قوت کی تلوار ان کی گردن پر لٹک رہی ہو!

کتاب کریم نے جو کچھ ارشاد کیا تھا جب مسلمانوں نے اس کے سامنے گردنیں خم کر دیں تو یہود کی گردنیں مسلمانوں کے سامنے جھک گئیں۔

مگر آہ جب مسلم قوم نے قرآن کو ترک کر دیا تو یہود جیسی شریر، ظالم اور دشمن حق قوم ان کی گردنوں پر مسلط ہو رہی ہے۔ علاج فقط قرآن کی طرف لوٹنے میں ہے۔

ان آیات میں علم کے ساتھ "راسخ" کی قید ہمیں بتاتی ہے کہ ایسا علم ہی صحیح معرفت کا دروازہ کھولتا ہے، یہی ایمان پیدا کرتا ہے اور نور قلب کو اجاگر کرتا ہے۔ سطحی علم ایک کثیف پردہ ہے جو کفر کی مانند معرفت صحیحہ کے سامنے حائل ہو جاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ ہر زمانے میں ہو سکتا ہے کہ گہرا اور پکا علم ہی وہ چیز ہے جو لوگوں کو کائنات کے دلائل حقہ کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ سطحی علم ایک چھلکے کی مانند ہے جو عالم شہادہ عالموں اور حق کے مغز کے درمیان حائل ہے۔ ایسے لوگوں کے قلوب و ارواح حق و صداقت کے مشتاق نہیں ہوتے اور انہیں سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوتا وہ تو فقط ایمان کا حصہ ہے۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّ

ہم نے وحی بھیجی تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوح پر اور

وَالنَّبِيّٖنَ مِنۢ بَعْدِهٖ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرٰهِيمَ

ان نبیوں پر جو اس کے بعد ہوئے اور وحی بھیجی ابراہیم پر

وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَ

اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور

عِيسٰى وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهٰرُونَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ

اور عیسیٰ پر اور ایوب پر اور یونس پر اور ہارون پر اور سلیمان پر

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ

اور ہم نے دی داؤد کو زبور اور بھیجے ایسے رسول جنکا احوال ہم نے

Marfat.com

عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ط

سنایا تجھ کو اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا احوال نہیں سنایا تجھ کو

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ ۱۶۴ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ

اور باتیں کیں اللہ نے موسیٰ سے بول کر بھیجے پیغمبر خوش خبری

وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ

اور ڈرانے والے تاکہ باقی نہ رہے لوگوں کو اللہ پر

حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا

الزام کا موقعہ رسولوں کے بعد اور اللہ زبردست ہے

حَكِيْمًا ۱۶۵ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ

حکمت والا ہے لیکن اللہ شاہد ہے اس پر جو تجھ پر

اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَشْهَدُوْنَ ط

نازل کیا کہ یہ ازلی کیا ہے اپنے علم کے ساتھ اور فرشتے بھی گواہ ہیں

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۱۶۶

اور اللہ کافی ہے حق ظاہر کرنے والا

شرح الفاظ

اَوْحَيْنَا: ہم نے وحی بھیجی، ایجاعٌ مصدر سے. قَصَصْنَاهُم: ہم نے حال (تقدیم بیان کیا. تَكْلِيْمًا: بات چیت کرنا. مُبَشِّرِيْنَ: بشارت دینے والے، تبشیر: مصدر مُنْذِرِيْنَ

Marfat.com

ڈرانے والے۔ اِنْذَارٌ مصدر۔ حُجَّةٌ دلیل۔ یعنی پیغمبر بشارت دینے اور ڈرانے کو بھیجے گئے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم پر راہ ہدایت واضح نہیں ہوئی تھی۔

لله لغت میں وحی کا معنی ہے ایما اور اشارہ کرنا۔ قرآن کی اس آیت میں یہ لفظ اسی لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فَاَوْحٰی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا۔ حضرت زکریاؑ نے لوگوں کو اشارے سے بتایا کہ صبح و شام خدا کی پاکیزگی بیان کرو۔ وحی کا یہ ایک معنی الہام بھی ہے جو دل میں ڈالا جاتا ہے چنانچہ اس آیت میں یہی معنی مراد ہے: وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰۤی اَنْ اَرْضِعِیْهِ (ہم نے موسیٰؑ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰؑ کو دودھ پلا۔ اسی طرح وحی کا لفظ فطرت و غریزۂ دائمی پر بھی بولا جاتا ہے مثلاً: وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ (اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی فطرت میں یہ خیال رکھ دیا کہ پہاڑوں، درختوں اور چھتوں میں گھر بنا) وحی کا معنی مخفی طور پر اعلام و اشارہ پر بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ اس معنی میں قرآن کا ارشاد ہے۔ شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ۔

وحی کا اصطلاحی معنی شرع میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نفوس قدسیہ میں ایک بلا واسطہ یا بالواسطہ عرفان و معرفت پیدا کر دیتا ہے جسے وہ بالیقین جان لیتے ہیں کہ یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ بالواسطہ وحی کبھی تو آواز کی شکل میں ہوتی ہے جسے پیغمبرؑ کانوں سے سنتے ہیں اور کبھی بلا آواز ہوتی ہے۔ وحی کے شرعی معنی اور الہام میں یہ فرق ہے کہ الہام ایک نفسی وجدان کا نام ہے جس پر نفس یقین کرتا ہے اور اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے، لیکن اسے یہ شعور نہیں ہوتا کہ یہ آیا کہاں سے ہے؟ پس الہام کا وجدان بالفاظ دیگر بھوک، پیاس اور مسرت و غم کے وجدان سے زیادہ مشابہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وحی محض وجدان کا نام نہیں بلکہ اس سے بہت ہی بلند تر عرفان و یقین پیدا کرنے والی ایک چیز ہے جسے نبی کے سوا دوسرا ہرگز محسوس نہیں کر سکتا۔

خلاصۂ آیات

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ وحی الٰہی جنسِ واحد ہے۔ سو اگر آپؐ کے معاند اہل کتاب کا ایمان پہلے رسولوں پر صحیح ہوتا تو وہ کبھی آپؐ کی نبوت کا انکار نہ کرتے، کیوں کہ جس دلیل سے انبیائے سابقین کی نبوت و رسالت ثابت ہے اُسی دلیل سے بدرجہا اولیٰ آپؐ کی نبوت بھی ثابت ہوتی ہے۔ پس یہ ممکن

لله المراغی ج ۶ ص ۲۱، ۲۰

Marfat.com

نہیں ہے کہ پہلے انبیاء پر ایمان کا دعویٰ ہو اور آپؐ کا انکار کیا جائے۔ منکرین کا دراصل کسی پر بھی ایمان نہیں اور وہ متعصب نفس پرست ہیں۔

اہل کتاب اور مشرکین مکہ اور سب کفار قرآن مجید کی حقانیت اور صداقت میں طرح طرح کے یہودہ شبہے پیدا کرتے تھے۔ دیکھئے یہود کا قول پیچھے گزر چکا ہے کہ انہوں نے کہا جس طرح تورات سارے ایک ہی دفعہ اتری تھی ایسے ہی تم بھی ایک کتاب آسمان سے لادو تو ہم تم کو سچا جانیں اسی طرح بعض مقامات پر قرآن نے مشرکوں کا بھی اسی قسم کا بھی مطالبہ نقل کیا ہے! مولف)

بقول شخصے ع خوئے بدرا بہانہ بسیار! سو حق تعالیٰ نے اس بگ چند آیتیں نازل فرما کر اس کی حقیقت واضح فرما دی اور وحی کی عظمت اور کفار کے سب خیالات اور بیہودہ شبہات کو رد کر دیا۔ اور وحی الٰہی کی متابعت کو عام طور پر اور قرآن مجید کی اطاعت کو بالخصوص بیان فرما کر بتلا دیا کہ حکم الٰہی کا ماننا سب کا فرض ہے کسی کا کوئی عذر اس میں نہیں چل سکتا جو اس کو تسلیم کرنے میں تردد تامل یا انکار کرے وہ گمراہ اور بے دین ہے۔ اب یہاں سے تحقیقی جواب دیا جاتا ہے۔

اس آیت ۱۶۳: اسے معلوم ہو گیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو پیغمبروں پر بھیجا جاتا ہے۔ اور انبیاء کے سابقین پر جیسے وحی نازل ہوئی ویسے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی۔ تو جس نے اس پہلی وحی کو مانا اسے چاہیئے کہ اس وحی کو بھی بالضرور مانے جس نے اس کا انکار کیا گویا ان سب کا منکر ہو گیا۔ حضرت نوحؑ اور ان سے پچھلوں کے ساتھ تشبیہ کی وجہ شاید یہ ہے کہ حضرت آدم کے وقت سے وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہو گئی۔ گویا اول حالت محض تعلیمی حالت تھی حضرت نوحؑ کے زمانہ میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہو گئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے چنانچہ اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوحؑ سے ہی شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر پہلا عذاب بھی حضرت نوحؑ کے وقت سے ہی شروع ہوا۔ خلاصہ یہ کہ پہلے حکم الٰہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ڈھیل دی جاتی تھی اور سمجھانے ہی کی کوشش کی جاتی تھی۔

حضرت نوحؑ کے زمانہ میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہو چکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی پوشیدگی باقی نہ رہی تو اب نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا۔ اول حضرت نوحؑ کے زمانہ میں طوفان آیا۔ اس کے بعد حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ وغیرہ کے زمانہ میں کافروں پر قسم قسم کے عذاب آئے۔ تو آپؐ کی وحی کو حضرت نوحؑ اور ان سے پچھلوں کی وحی سے تشبیہ دینے میں اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری تنبیہ کر دی گئی کہ جو آپؐ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ عذاب عظیم کا مستحق

Marfat.com

ہوگا۔

آیت ۱۶۴: حضرت نوح کے بعد جو انبیاء ہوئے ان سب کا بالاجمال ذکر فرما کر جو ان میں اولوالعزم ہیں اور جو مشہور اور جلیل القدر ہیں ان کو تخصیص اور تفصیل کے ساتھ ذکر فرما دیا۔ جس سے خوب معلوم ہو گیا کہ آپؐ کے اوپر جو وحی نازل ہوئی اس کا حق ہونا اور اس کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا تمام اولوالعزم اور مشاہیر انبیاء کی وحی کو۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء پر جو وحی آتی ہے، کبھی فرشتہ پیغام لاتا ہے، کبھی کتاب لکھی ہوئی مل جاتی ہے، کبھی بغیر پیغام اور بدون واسطے کے خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بات کرتا ہے۔ مگر ان صورتوں میں چونکہ وہ اللہ ہی کا حکم ہے کسی دوسرے کا حق نہیں تو بندوں پر اس کی اطاعت یکساں فرض ہے۔ بندوں تک پہنچنے کا ذریعہ تحریر ہو یا تقریر ہو، خواہ پیغام ہو۔ تو اب یہود کا یہ کہنا کہ توراۃ کی طرح پوری کتاب ایک ہی دفعہ میں آسمان سے لاؤ گے تو ہم تم کو سچا جانیں گے درست نہیں، کتنی بے ایمانی اور حماقت ہے۔ جب وحی حکم الٰہی ہے اور اس کے نازل ہونے کی صورتیں البتہ متعدد ہیں، تو پھر کسی صورت میں آئے اس کے ماننے میں تردد اور انکار کرنا یا یہ کہنا کہ فلاں خاص طریقہ سے آئے گی۔ تو مانوں گا درست نہیں، صریح کفر ہے اور کھلی حماقت ہے۔

آیت ۱۶۵: اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو برابر بھیجا کہ مومنوں کو خوشخبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں تاکہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر مرضی معلوم نہ تھی، معلوم ہوتی تو ضرور اس پر چلتے۔ سو جب اللہ نے پیغمبروں کو معجزے دیکر بھیجا اور پیغمبروں نے راہ حق بتلائی تو اب دین حق کے قبول کرنے میں کسی کا عذر نہیں سنا جا سکتا۔ وحی الٰہی ایسی قطعی حجت ہے کہ اس کے رد و بدل کوئی حجت نہیں چل سکتی بلکہ سب حجتیں قطع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ اللہ کی حکمت اور تدبیر ہے۔ اور زبردستی کرے تو اس کو کون روک سکتا ہے مگر اس کو پسند نہیں۔

آیت ۱۶۶: یعنی وحی ہر پیغمبر کو آتی رہی یہ کچھ نئی بات نہیں سب کو معلوم ہے لیکن اس قرآن میں اللہ نے اپنا خاص علم اتارا اور اللہ اس حق کو ظاہر کر دے گا۔ چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو علوم اور حقائق قرآن مجید میں سے حاصل ہوئے اور برابر حاصل ہوتے رہیں گے وہ کسی کتاب سے نہیں ہوئے اور جس قدر ہدایت لوگوں کو آنحضرتؐ سے ہوئی اور کسی سے نہیں ہوئی۔

سلہ ان آیات کا ردئے سخن زیادہ تر یہود کی طرف ہے اس لئے سوائے دو پیغمبروں کے باقی جتنے نام لئے گئے ہیں ان کی نبوت کے وہ قائل تھے۔ عیسیٰؑ کی نبوت کے منکر تھے اور سلیمان علیہ السلام کو نبی سے زیادہ ایک دنیا دار بادشاہ مانتے تھے گویا ان کی نبوت کے بھی تقریباً منکر تھے۔

سلہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۳۰-۲۳۱۔

Marfat.com

زَبُوْرًا: زبور سے مراد یہاں اس کے لفظی معنی ہیں اس کا لفظی معنی ہے ہر لکھی ہوئی چیز (لسان) تاج / زبور کے نام سے اس وقت جو کتاب حضرت داؤدؑ کی طرف منسوب ہے وہ عہد عتیق کے مجموعہ کی انیسویں کتاب ہے۔ اس میں احکام و مسائل شریعت درج نہیں بلکہ صرف حمد مناجات اور دعائیں وغیرہ ہیں۔ اور جابجا آخری نبیؐ کی بابت پیش گوئیاں بھی موجود ہیں۔

آیت ۱۶۴: اسے معلوم ہوا کہ جن انبیاء کا نام کتاب و سنت میں صراحتہً آگیا ہے ان پر تفصیلی اور باقی سب پر اجمالی ایمان لانا فرض ہے (مدارک) مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے اس آیت کے نزول سے قبل۔

اس آیت میں تَكْلِيمًا: بطورِ مفعول مطلق لایا گیا ہے جس سے مراد ایک خاص نوع کا کلام ہے۔ ورنہ کلام اپنے عام معنی میں تو ہر نبی کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ (قرطبی، روح المعانی، تھانوی)

آیت ۱۶۶: کی ابتداء لٰكِنِ سے ہوئی ہے جو کلمۂ استدراک ہے اور استدراک قول سابق پر ہوتا ہے مطلب یہ کہ اگر یہ معاند یہود کی اب بھی نبوتِ محمدیؐ پر ایمان نہ لائیں تو نہ لائیں لیکن ..... روایات میں آتا ہے کہ یہودیوں نے پچھلی آیات سُن کر کہا تھا کہ ہم تو آپؐ کی رسالت کی گواہی نہیں دیتے، سو اس آیت میں اسی کا جواب ہے (تفسیر کبیر قرطبی)۔

اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ اللہ نے اس قرآن کو اپنے کمال علم سے اتارا ہے۔ اور اسی کمال علمی نے تو اسے معجزہ بنا دیا ہے۔ اس سے صراحتہً ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے اثباتِ علم کا اثبات کیا ہے۔ معتزلہ خدا کی صفات کے منکر تھے، اس آیت سے ان کی گمراہی بھی ثابت ہو گئی۔

فرشتوں کی شہادت ایک تو اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ ان منکروں کے انکار سے کہیں زیادہ وزن اور اہمیت رکھتی ہے نیز دنیا کا تکوینی کاروبار فرشتوں کے سپرد ہے تو گویا ان کی شہادت ساری کائنات قدرت کی شہادت ہے۔

لہ جن پیغمبروں کے نام قرآنِ پاک میں آئے ہیں وہ یہ ہیں۔ آدمؑ، ادریسؑ، نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ لوطؑ، اسحاقؑ، اسماعیلؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، شعیبؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، یونسؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، الیسعؑ، زکریاؑ، عیسیٰؑ، یحییٰؑ، ذوالکفلؑ، ایوبؑ اور الیاسؑ اور ان سب کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم

معتزلہ چونکہ صفات الٰہیہ کے منکر تھے لہٰذا وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا کو ایک معتزلی نے یوں فرمایا وَكَلَّمَ اللّٰهَ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (یعنی موسیٰؑ نے اللہ سے کلام کیا) تو ایک بزرگ نے فرمایا کہ پھر اس آیت کو کہاں لے جاؤ گے: وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ

لہ تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۲۱۔

Marfat.com

یعنی اس میں کسی طور پہ تحریف چل ہی نہیں سکتی۔

[1] موجودہ بائبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبور داؤد نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیئے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلام حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح بائبل میں امثالِ سلیمانؑ کے نام سے جو کتاب موجود ہے اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً الحاقی ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان امثال کا بڑا حصہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوبؑ کے نام سے بھی بائبل میں درج ہے۔ لیکن حکمت کے بہت جواہر اپنے اندر رکھنے کے باوجود اسے پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایوبؑ کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے۔ اس لئے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب کی ابتدا میں حضرت ایوبؑ کے جس صبر عظیم کی تعریف کی گئی ہے، اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوبؑ اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے خلاف سراپا شکایت بنے ہوئے تھے، حتیٰ کہ ہم نشین انہیں اس بات پہ مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے مگر وہ کسی طرح مان کر نہ دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائبل میں انبیائے بنی اسرائیل کے اصحائف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل، عاموس اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقام ایسے آتے ہیں جنہیں پڑھ کر آدمی کی روح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیم ان کی شرک کے خلاف جہاد ان کا توحید کے حق میں پرزور استدلال اور ان کی بنی اسرائیل کے اخلاقی زوال پہ سخت تنقیدیں پڑھتے وقت آدمی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اناجیل میں حضرت مسیحؑ کی تقریریں اور قرآن مجید اور یہ صحیفے ایک سرچشمے سے نکلی ہوئی سوتیں ہیں۔

دوسرے انبیاء علیہ السلام پہ تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آرہی ہے۔ فرشتہ پیغام سنا رہا ہے اور وہ سن رہے ہیں لیکن موسیٰؑ کے ساتھ یہ خاص معاملہ برتا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی۔ بندے اور خدا کے درمیان اس طرح باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ مثال کے لئے اس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورۂ طٰہٰ میں نقل کی گئی ہے۔ بائبل میں بھی حضرت موسیٰؑ کی اس خصوصیت کا ذکر اسی طرح کیا گیا ہے (خروج ۳۳، ۱۱)

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۴۲۴-۴۲۵۔

Marfat.com

لہ والاسباط: یہ لفظ سبط کی جمع ہے، اس کا معنی ہے اولاد کی اولاد۔ بنی اسرائیل میں ۱۲ اسباط تھے۔ یعنی یعقوبؑ کے دس بیٹے اور یوسفؑ کے دو بیٹے بنی اسرائیل کے اسباط اسی طرح تھے جس طرح بنی اسماعیل کے قبائل۔

انبیاء علیہم السلام کا ذکر کئی مکی سورتوں میں آیا ہے مثلاً سورۃ الانعام، ہود اور الشعراء۔ جن نبیوں کے واقعات کا بیان نہیں کیا گیا اس کا باعث یہ ہے کہ قرآنِ پاک میں قصوں کے ذکر سے مقصود عبرت و تذکیر اور نصیحت و احتجاج کے علاوہ حضورؐ کو ایمانداروں کو ثابت قدمی کی تلقین کرنا تھا چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ: اور یہ مقاصد ان قصوں سے حاصل ہو جاتے ہیں جو بیان فرمائے گئے ہیں۔ رہے وہ حضرات جن کے نام نہیں لئے گئے تو ان کے بارے میں ہم پر واجب ہے کہ یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں میں پیغمبر بھیجے ہیں۔ خدا کی رحمت سب لوگوں کے لئے تھی، کسی خاص قوم یا برادری سے مخصوص نہ تھی جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے۔

قرآن اس ضمن میں فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ: وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی طرف صرف دین اسلام نے رہنمائی کی ہے۔ اہل کتاب اسے نہ جانتے تھے، پھر بھی تعصب اور ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ قرآن ان کی کتابوں سے اقتباس لے کر لکھا گیا ہے، حالاں کہ اس میں ایسے بہت سے حقائق ہیں جن کو اس نے اپنے دلآویز بیان سے واضح کیا ہے کئی صدیوں کے بعد علم صحیح اور سائنس نے اس کے بیان کردہ حقائق کو کھول دیا ہے۔ اگر قرآن ان حقائق کو نہ کھولتا تو صرف عقل انسانی ان تک نہ پہنچ سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کی حقیقت کی معرفت دشوار ہے ہم تو آپس میں جو کلام خود کرتے ہیں اس کی بھی پوری حقیقت سے واقف نہیں۔ ہمیں اس امر کی کیفیت معلوم نہیں کہ ہوا کے ذرات اور لہریں آواز کو کانوں تک پہنچاتی ہیں، چہ جائیکہ ہم خدا کے کلام کی کیفیت پر بحث کرنے لگیں۔

قرآن کی ایک اور آیت میں وحی پر بھی تکلیم کا اطلاق کیا گیا ہے، وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ

اس آیت میں کلام الٰہی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ وحیا، یعنی پوشیدہ طور پر دل میں بات ڈالنا۔

لہ تفسیر المراغی ج ۶ صفحہ ۲۱۔ ۲۲، تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۲۶۔ ۷۶،

Marfat.com

۲- پس پردہ سے بات کرنا۔ (مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ)

۳- فرشتۂ مرسل کے ذریعے پیغام بھیجنا۔

پس پردہ میں حکمت یہ ہے کہ اس سے ایک چیز پر متوجہ ہو جانے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ دل کے خیالات اور احساسات متحد ہو کر ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ موسیٰؑ کا حال ہوا تھا جب انہوں نے درخت میں آگ کی روشنی دیکھی۔ اور فرشتہ مرسل سے مراد روح القدس جبرئیلؑ (الروح الامین) ہیں

آیت ۱۶۵ کا مضمون قرآن کی کئی آیتوں میں وارد ہوا ہے: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى.

دین حق اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہے، محض عقل اسے نہیں پا سکتی تھی۔ لازم تھا کہ اس کی معرفت وحی الٰہی سے ہو۔ ہاں! دین حق تزکیۂ نفوس ہیں اور انہیں ابدی زندگی کے قابل بنانے میں (یعنی عالم قدس میں) فطرت کی سُنن و عادات کے عین مطابق ہے۔ اس کے احکام پر عمل کرنے یا نہ کرنے پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔ پس یہ جزا و سزا صرف اسی کو دی جا سکتی ہے جسے صحیح طریقے سے اس کی دعوت پہنچی ہو۔

اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ: اللہ نے اس قرآن کو اپنے خاص علم سے اتارا ہے، جسے نزول قرآن سے قبل کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ اُسے ایسے نظم و اسلوب بیان سے تالیف کیا گیا جس نے ہر صاحب بیان اور فصیح و بلیغ کو عاجز کر دیا۔ اس میں بے نظیر الٰہیات، ادبیات، سیاسیات و اجتماعیات کے علوم ہیں۔ پہلی قوموں اور انبیاء کے واقعات اور حکمتیں ہیں۔ وہ فوراً ارواح پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس میں ماضی، حال اور مستقبل کی غیبی خبریں ہیں۔ ان سب چیزوں سے اللہ نے شہادت دیدی ہے کہ ہر کلام وحی خداوندی ہے۔

؎ اسلامی تعلیمات کے مطابق تمام رسولوں کی جماعت ایک ہی ہدایت ایک ہی دین اور ایک ہی مقصد کی علم بردار ہے۔ انسانوں کی یہ برگزیدہ جماعت وقت کے فاصلوں سے بے نیاز اور زمان و مکان کی پابندیوں سے بالاتر ہے۔!

مختلف اقوام و اجناس، مختلف ملکوں اور زمین کے متعدد علاقوں سے اور زمان و وقت کے مختلف وقفوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اصول و مقاصد کے لحاظ سے بالکل واحد جماعت ہے۔ نام و نسب، وطن اور سرزمین، زمانہ اور دور انہیں جدا نہیں کر سکتے۔ ان کا مصدر و منبع ایک ہے۔ ان کے پاس ایک ہی ہدایت اور ایک ہی روشنی ہے۔ ان میں سے ہر ایک بشیر و نذیر ہے، ہادی و رہنما ہے اور انسانی قافلے کی رہنمائی اسی ایک نور ہدایت سے کرتا ہے جو اسے اللہ کی طرف سے ملی تھی۔ یہ الگ بات ہے

؎ فی ظلال القرآن ج ۶ صفحہ ۴۲۔

Marfat.com

کہ تقاضائے وقت اور مصلحت ہدایت کی خاطر ان میں سے بعض کو ایک قبیلے کی طرف، بعض کو ایک قوم کی طرف، بعض کو ایک علاقے کی طرف اور بعض کو ایک شہر یا ایک آبادی کی طرف بھیجا گیا۔ اس مقدس قافلے کی طرف سردار محمد رسول اللہ ﷺ جنہیں ان سب کے آخر میں خاتم النبیین اور سید المرسلین بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت و رحمت کا تقاضا تھا کہ اس مقدس جماعت کو انسانوں کی طرف بھیجے۔ فرماں برداروں کو انعام دے اور نافرمانوں کو سزا دے۔

انبیاء کی ہدایت کو پہچاننے اور سمجھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سے نوازا ہے جس کی وجہ سے وہ انفس و آفاق کے ایمانی دلائل میں تدبر کر سکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انبیاء کو نہ بھیجتا تو بھی عقل و فہم کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ لوگ توحید الٰہی پر ایمان لائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف عقل پر ہی نہیں چھوڑا کیوں کہ اس پر اکثر شہواتِ نفسانی کا غلبہ ہو جاتا ہے بلکہ اپنی رحمت سے پیغمبروں کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا اور انسانوں پر اپنی حجت تمام کر دی ہے۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بھٹکنے کے لئے اندھیرے میں چھوڑ دیا گیا تھا اور راہِ حق مجھ پر واضح نہیں ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ جو خالق و مالکِ کائنات ہے اور اپنی مخلوق کی قوت و صفات کو سب سے بڑھ کر جاننے والا ہے، اُسے معلوم تھا کہ عقل انسانی اپنی حیرت انگیز صلاحیتوں کے باوجود خود بخود ہدایت تک پہنچنے اور اپنی زندگی کی مصلحتوں کو کماحقہٗ جان لینے کے قابل نہیں ہے۔ وہ دنیا و آخرت میں اپنی صلاح و فلاح کا راستہ از خود معلوم کر سکتی ہے، اور نہ انفس و آفاق میں بکھرے ہوئے دلائل ایمان کو تلاش کر کے توحید الٰہی اور فلاح کائنات کے راستے پر گامزن ہو سکتی ہے۔ عقل کی اس اندرونی روشنی کے ساتھ ساتھ رسالت کی بیرونی روشنی بھی ضروری تھی۔ جس طرح اشیاء کو دیکھنے کے لئے آنکھوں کی باطنی روشنی (نورِ بصیرت) کے ساتھ ساتھ بیرونی روشنی بھی ضروری ہے اسی طرح عقل و رسالت کا بھی حال ہے۔ عقل اندرونی روشنی ہے۔ اور رسالت بیرونی۔ علاوہ ازیں عقل آلۂ ہدایت تو ضرور ہے مگر از خود ہدایت تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ وہ رسالت کی رہنمائی و اعانت و ضبط کا محتاج ہے۔ انسانی زندگی کی پیچیدگیاں صرف عقل سے حل نہیں ہو سکتیں۔ پس اس کے علاوہ ایک کامل نور کی ضرورت پیش آئی جو نورِ رسالت کہلاتا ہے۔ اللہ کی حکمت و مصلحت اور فضل و رحمت کا یہ اقتضاء ہوا کہ رسالت کو جزا و سزا کا معیار قرار دے اس کے بغیر کسی کو عذاب و عقاب میں مبتلا نہ کرے۔

عقل کا کام اور وظیفہ یہ ہے کہ رسالت سے ہدایت حاصل کرے اور رسول کا کام یہ ہے کہ تبلیغ حق کا فریضہ ادا کرے تبیین و تفصیل سے کام لے اور انسانی فطرت پر جو دنیا کے ماحول سے زنگ چڑھ گیا ہو اُسے دور کر دے، عقل انسانی کو دلائل انفس و آفاق میں غور و فکر اور تدبر کرنے کے لئے تیار کرے۔ نظرِ صحیح، بحثِ سلیم اور درست جد و جہد کا راستہ کھولے۔ پھر انسانی عقل کے سامنے حیاتِ انسانی کی

Marfat.com

فوز و فلاح کے لئے نظامِ حیات اور دستورِ عمل واضح کرے۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ رسالت عقل کی رہنما ہے نہ کہ عقل رسالت پر حاکم اور اس کی رہنما۔ رسالت عقل کو اس معنی کے لحاظ سے مخاطب کرتی ہے کہ وہ اُسے جگاتی، اُس پر راستہ واضح کرتی اور اس پر دستورِ حیات پیش کرتی ہے، نہ اس معنی کے لحاظ سے کہ رسالت کے صدق و کذب کا معیار ہی عقل محض کو ٹھہرا دیا جائے اور دین اور اس کے احکام کی صحت و بطلان عقل ہی کو سونپ دیا جائے۔ اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ حق کو قبول یا رد کر دینے کا اختیار سراسر عقل کو دلایا گیا اور اُسے حق پر غالب و حاکم بنا دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ جب حکمِ خدا و رسولؐ ثابت ہو جائے تو فیصلہ کُن وہی ہوتا ہے۔ ہاں اس کے ثبوت و عدم ثبوت میں عقل بحث کر سکتی ہے۔ اس کے فوائد کو عقل بیان کر سکتی ہے۔ اس کا قبول کرنا، اُس کی اطاعت کرنا اور اسے نافذ کرنا عقل پر فرض ہے۔ اس لحاظ سے نصّ کا معنی سمجھنا، عبارت کے لغوی و اصطلاحی معانی پر غور کر کے اس کا مدلول معلوم کرنا عقل کے ذمہ ہے اور اس حد پر اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ جب نصّ کا حکم ثابت ہو جائے تو اب عقل کو قبول یا عدمِ قبول کا اختیار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے سامنے فقط قبول و اطاعت کا راستہ کھلا ہے۔ کیونکہ نصّ اور حکم تو خدا کی طرف سے ہے اور عقلِ انسانی نہیں ہے جو خدا اور رسولؐ کے حکم میں صحت و بطلان یا قبول و عدمِ قبول کا مقام حاصل کر سکے۔

اس نقطہ پر آ کر بہت سی گڑبڑ واقع ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ تو عقل کو ہی خدائی کا مقام دے دیتے ہیں اور اس کی بلا شرط اور بے چون و چرا اطاعت کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو عقل کو لغو ٹھہراتے اور ہدایت و ایمان میں اُسے کوئی مقام دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں۔ صحیح راستہ وسط کا ہے کہ نہ تو عقل کو معبود کا درجہ دیا جائے اور نہ اسے لغو ٹھہرایا جائے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی رسالت کو اصل اور اعلیٰ مقام دیا جائے۔ اور عقل کو اس کے بعد کا درجہ۔ یعنی رسالت عقل کو خطاب کرتی ہے تاکہ اس کی حدود واضح کرے، اس کی ذمہ داریوں کا تعیّن کرے اور اس کے لئے دستور العمل پیش کرے۔ عقل جب اپنا کام سرانجام دے لے یعنی رسالت کے احکام اور کتاب و سنّت کے معانی کو سمجھ لے تو اب اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے، یعنی اذعان و قبول اور تصدیق و اطاعت کا راستہ۔ رسالت اور عقل کے درمیان یہی توازنِ فطری اور برحق ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے افراط و تفریط ہے۔

اللہ تعالیٰ سے صحیح دین حاصل کرنے میں عقل کا دائرہ کار یہ ہے کہ وہ دین کے ثابت شدہ مسلّم عقائد و حقائق اور احکام و اعمال کا مقابلہ نہ کرے۔ اپنے منطقی و فلسفی مقالات و مُسلّمات پر اصرار نہ کرے۔ اپنے محدود تجربات پر عجز و سہو نہ کرے اور اپنے ناقص حدود کا پورا خیال رکھے۔ دین کے ثابت شدہ حقائق و مُسلّمات عقل کے ناقص و محدود تجربات پر فائق ہیں۔ جب دین کے کسی عقیدہ و حکم کا دین میں سے ہونا دلائل شرعیہ سے ثابت ہو جائے تو عقل کو انہیں تسلیم کر لینا چاہیئے اور ان کے سامنے گردن خم کر دینی چاہیئے، اس وقت

Marfat.com

اپنی الگ تھلگ اور مستقل حیثیت پر اصرار کرنے سے انتشار و اضطراب واقع ہوگا۔

دین میں جہاں اجتہاد کی اجازت دی گئی ہے یا نصوص و احکام کا مفہوم سمجھنے کے لئے جد و جہد کی اجازت دی گئی، وہی عقل و فکر کا میدان ہے۔ اس میدان میں چند مسلّمہ اور معلوم شدہ اصولوں کے اندر رہتے ہوئے عقل و فکر پر کوئی پابندی نہیں۔ اسے اپنا کام کرنے اور چیزوں کی گہرائی میں اترنے کی وہاں کھلی چھٹی دی گئی ہے۔ بشرطیکہ وہ ان صحیح اصول اور ثابت شدہ قواعد و ضوابط کے اندر رہے جنہیں دین کی مرکزیت اور حاکمانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اس میدان میں کوئی آمرانہ شخص، جماعت یا حکومت و سلطنت عقل پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتی، یہی راز ہے اس واقعہ اور حقیقت کا کہ اسلام نے بڑے بڑے عقلاء، مجتہدین، مفسّرین، محدّثین، فقہاء اور تجرباتی و طبیعی علوم کے ماہرین پیدا کئے ہیں جن پر صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ ساری انسانی تاریخ کو ناز کرنا بجا ہے۔

اسلام ایک عقلی دین ہے اس معنی کے اعتبار سے کہ وہ اپنے قواعد و مسلّمہ اصول کے ماتحت عقل و فکر کو مخاطب بناتا اور اسے اپنے میدان میں۔ ایک وسیع میدان میں۔ کام کرنے کی دعوت دیتا ہے، جد و جہد اور اجتہاد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور عقل کو کسی مادّی معجزے سے مجبور و مقہور نہیں کرتا۔ وہ عقل کو اس معنی میں مخاطب بناتا ہے کہ اس کے لئے نظر و فکر اور تدبّر کی صحیح راہیں پیش کرتا ہے، انفس و آفاق میں ایمانی دلائل اور موجباتِ ہدایت پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ عقل پہ سے وہم و گمان، رسم و رواج اور حماقت و جہالت کے پردے ہٹا دے، فطرت و عقل پر غالب شدہ شہوات کی تہوں کو دور کر دے، نصوص و احکام میں غور و فکر کر کے ان کے معانی و مدلولات کو نکالنے کی حوصلہ افزائی کرے۔ وہ اس پر ایسی کوئی چیز فرض نہیں کرتا جسے وہ سمجھ نہ سکے۔

اور جس کے مدلول و مفہوم کو سمجھنے سے عاری ہو۔ جب مدلولات کے سمجھنے اور مسلّمہ قواعد و ضوابط کے جاننے کا مرحلہ آتا ہے تو عقل کے سامنے دو راہیں کھلتی ہیں۔ اگر وہ تصدیق و اذعان اور اطاعت اور تسلیم کا راستہ اختیار کرے تو مومن ہے۔ ورنہ دوسرا راستہ اختیار کرنے کی صورت میں وہ کافر ہے۔ وہ دین کے عقائد و احکام کی صحت و عدم صحت کے لئے حاکم و فیصلہ کن طاقت نہیں ہے نہ اسے یہ اختیار ہے کہ چاہے تو انہیں قبول کرے ورنہ رد کر دے اور دونوں صورتوں میں اسے اعلیٰ و برتر سمجھا جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ شکست خوردہ مغربی ذہنیت کے نام نہاد "آزاد خیال" اور "عقلیت پسند" لوگ دین کے بارے میں جو مسلک و مشرب اختیار کرتے ہیں وہ اسلامی نہیں بلکہ سراسر غیر اسلامی ہے۔

پس کائنات و انسان اور دوسری مخلوقات کے بارے میں جب اللہ تعالیٰ ایک بات فرما دے تو وہی برحق ہے چاہے کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اسی طرح فرائض و مناہی اور اوامر و نواہی کا حال بھی ہے!

Marfat.com

کون ومکان، کائنات ومخلوقات، انسان وحیوان اور اشیاء واحیاء کے بارے میں جب اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ "اللہ نے سات آسمان اور انہیں کی مانند زمینیں پیدا کیں"، کیا کافروں نے دیکھا نہیں کہ آسمان وزمین ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا"، "اللہ نے ہر جان دار چیز کو پانی سے پیدا کیا"، "انسان کو خمیر خندہ کھنکھناتے گیچڑ سے پیدا کیا اور جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا" تو جو کچھ اللہ نے فرمایا وہی برحق اور صحیح ہے چاہے عقل ابھی اپنے تجربات اور علم وفن سے اس کی حقیقت تک رسائی نہ کر سکی ہو۔

اسی طرح جب وہ فرماتا ہے کہ: "جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے"، "اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور باقی ماندہ سود ترک کر دو اگر تم مومن ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خدا اور رسولؐ سے جنگ کرنے کا تمہیں اعلان کیا جاتا ہے۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل مال تمہارے ہیں، نہ کسی پر ظلم کرو نہ کوئی تم پر ظلم کرے"۔ "اے عورتو! اپنے گھروں میں باوقار طور پر ٹھہری رہو اور پہلی جاہلیت جیسی آرائش کی دلدادہ قیدی مت اختیار کرو"۔ "عورتوں کو اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر لپیٹنی چاہئیں اور اپنی آرائش کی نمائش نہ کرنی چاہیئے"، تو جو کچھ اللہ کا ارشاد ہے وہی درست اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہے عقل کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اُسے "تاریک خیالی" اور "رجعت پسندی" ٹھہرائے۔ کیوں کہ عقل کے فیصلوں میں حق وناحق کا احتمال ہے مگر خدا کے فیصلے تو یقیناً صادق وبرحق ہیں۔

اسی طرح دینی عقائد وتصورات اور بشری زندگی کے نظام حیات کا بھی حال ہے۔ جو عقائد واحکام اور معاملات ٹھہرا دیئے گئے ہیں وہی برحق ہیں۔ عقل ان میں میں میخ نہیں نکال سکتی، نہ تغیراتِ زمانہ کا سہارا لے کر راہِ فرار اختیار کر سکتی ہے۔ اگر وہ انہیں پسند نہیں کرتی تو دینی دائرے سے باہر ہو جائے، یہی درست طریقہ ہے۔ مگر منافقانہ طرزِ عمل اختیار کرنا بزدلی اور حماقت ہے۔

یہ جو کچھ ہم نے کہا اس میں عقل کی قیمت کو کم کرنا مدِ نظر نہیں۔ اس کا دائرہ عمل بڑا وسیع ہے۔ جدید حالات پر احکامِ دین کو منطبق کرنے کا وسیع میدان اس کے سامنے کھلا پڑا ہے۔ اسی طرح کائنات کی طبیعت اور مادے کی قوت اور اس کے مخفی خزانوں کو معلوم کرنے کا وسیع میدان اس کے سامنے موجود ہے۔ علیٰ ہذا القیاس زندوں اور زندگی کے راز، خدا کی مسخر کردہ کائنات سے فائدہ اٹھانے کے لئے نئے طریقے معلوم کرنے کا میدان، زندگی اور زندہ چیزوں کے راز دریافت کرنا، زندگی کو نشوونما دینا اور اس کی ترقی کے ذرائع سوچنا یہ سب کچھ اس کے بس میں ہے۔

عقل کی ذمہ داری اور اس کے میدانِ عمل پر یہ مختصر کلام کرنے کے بعد اب ہم اس عظیم ترین ذمہ داری کی طرف آتے ہیں جو رسولوں پر ڈالی گئی ہے۔ خاتم النبیینؐ کے بعد یہ ذمہ داری اہل ایمان پر آپڑی ہے اس لئے اس کا بیان ضروری ہے۔ یہ ذمہ داری جتنی عظیم ہے اتنی ہی ثقیل بھی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ بشریت کا دنیوی

Marfat.com

واخروی انجام، جزا و سزا اور سعادت و شقاوت رسولوں سے اور ان کے بعد ان کے متبع مومنوں سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ اس لئے یہ معاملہ بڑا ہولناک اور نہایت عظیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے سچے رسولؐ اس ذمہ داری کی جسامت کا احساس کر کے اس کے بوجھ تلے دبے جاتے تھے۔

اسی بوجھ کے متعلق اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ: "اے پیغمبرؐ! ہم عنقریب آپؐ پر ایک بوجھل قول ڈالنے والے ہیں،" اور اس کو اٹھانے کی تیاری کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ: "اے کملی پوش! رات کو اٹھ، نصف رات سے کچھ کم یا کچھ زیادہ عرصہ عبادت میں کھڑا رہ اور قرآن پاک کو ترتیل سے پڑھا کر!" "ہم نے یہ قرآن آپؐ کی طرف اتارا ہے، پس آپؐ اپنے رب کے حکم سے صبر کریں اور ان میں سے کسی گناہ گار یا ناشکرے کافر کی بات مت مانیں، اور صبح و شام اپنے رب کا نام یاد کریں اور رات کو سجدہ اور تسبیح میں گزار دیں۔" "کہ دو کہ مجھے خدا کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور اس کے سوا مجھے کہیں ٹھکانا نہیں مل سکتا..... ہاں میرا فریضہ خدا کے احکام و رسالت کو پہنچا دینا ہے۔" "وہ خدا عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں رسولوں میں سے جسے چاہے بتا دے۔ اور رسول کے آگے اور پیچھے چوکی پہرہ لگا دیتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبروں نے خدا کے پیغام پہنچا دیئے ہیں۔"

رسولوں نے اس عظیم فریضے کی امانت کو ادا کر دیا اور خدا کی رسالت کو پہنچا دیا۔ پھر وہ اس عظیم بوجھ سے سبکدوش اور سرخرو ہو کر خدا کے حضور جا حاضر ہوئے۔ انہوں نے یہ پیغام زبان سے عمل سے اور اپنے اسوہ و قدوہ سے پہنچا دیا۔ دن رات اس کو بڑھانے اور راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں ایک دائمی جہاد کرتے رہے، شبہات کا ازالہ کیا، ضلالتوں کا مقابلہ کیا، باغی و طاغی قوتوں، انسانوں اور اداروں کا شدید مقابلہ کیا اور جہادِ مسلسل سے دین کو سربلند کر دیا۔ سب سے زیادہ جہاد و قتال زبان و سنان دونوں سے۔۔۔ اس مقدس جماعت کے سردار اور رسولوں کے سربراہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

آپؐ کے بعد اس تبلیغِ رسالت کا بوجھ ایمانداروں پر آ پڑا۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ امتِ محمدیہ کی ذمہ داری بڑی شدید و مدید اور طویل و دائم ہے۔ وہ اس بوجھ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک اپنے مقدس سربراہ اور پہلے قافلہ سالار صلی اللہ علیہ وسلم جیسا عزم و حزم اور ہمت و استقلال نہ دکھائے۔ تبلیغ رسالت کا فریضہ بہت بڑا ہے اور لوگوں کی عادات و رسوم اوہام و خرافات، شکوک و شبہات، عداوت و تعصبات کچھ اسی قسم کے آج بھی ہیں جیسے پہلے تھے۔ اس سلسلے میں جان کھپانے اور جگر کاوی کرنے کی ہمت پیدا کرنا لازم ہے۔ آج بھی باغی و طاغی دعوتِ توحید کی راہ روکنے کے لئے کھڑے ہیں۔ زبان، عمل، جذبات و احساسات اور نیت و ارادہ ہر چیز سے اس تبلیغ کی ضرورت ہے۔ راستے کی مشکلات کو دور کرنا واجب ہے اور ان قوتوں کو راستے سے

Marfat.com

سے ہٹا دینا لازم ہے جو اسلامی دعوت اور انسانوں کے درمیان حائل ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ہماری تبلیغ کوئی تبلیغ نہیں اور ادائیگی فریضہ کوئی ادائیگی نہیں۔ یہ بات ایک ایسا فریضہ ہے جس کے اٹھانے اور ادا کرنے سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہم انحراف کر گئے اور کائناتِ انسانی گمراہ رہی یا ہو گئی تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہوگی۔ دنیا میں بھی دنیا کی سعادت و شقاوت میں ہمارا بہت بڑا حصہ ہے اور آخرت میں ثواب و عقاب کی سب سے بڑی ذمہ داری ہم پر پڑے گی۔

یہ ذمہ داری کمر شکن ہے اس سے جسم کے پٹھے پھڑکتے اور کانپتے ہیں۔ مسلم کہلانے والا اگر اس ذمہ داری کا حامل ہے تو بہتر ورنہ دنیا و آخرت کی رسوائی اس کے سامنے ہے۔ شہادت حق کا فریضہ اپنی ذات سے شروع ہو کر اہل و عیال، ذات برادری، گلی محلے، شہر اور ملک تک اور پھر ساری دنیا تک وسیع ہو جاتا ہے۔ یہ فقط رسمی "تبلیغ" نہیں بلکہ علمی و عملی "شہادتِ حق" ہے۔

آیات زیرِ بحث سے رسالت کا رحمت و فضلِ خداوندی ہونا اور عدلِ الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ

جو لوگ کافر ہوئے اور روکا اللہ کی

اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ

راہ سے وہ بہک کر دور جا پڑے جو لوگ

كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا

کافر ہوئے اور حق دبایا ہرگز اللہ بخشنے والا نہیں ان کو اور نہ

لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ

دکھلائے گا ان کو سیدھی راہ مگر راہ دوزخ کی رہا کریں گے

فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾

اس میں ہمیشہ اور یہ اللہ پر آسان ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ

اے لوگو تمہارے پاس رسول آچکا ٹھیک بات لے کر

Marfat.com

مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا

تمہارے رب کی سو مان لو تاکہ بھلا ہو تمہارا اور اگر نہ مانو گے

فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ

تو بے شک اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور

كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا

شرح الفاظ

صَدُّوْا: خود رُکے اور دوسروں کو روکا۔ صَدَّ لازم و متعدی ہر دو طرح استعمال ہوتا ہے ضَلٰلًا بَعِيْدًا: دور کی گمراہی۔ یعنی وہ گمراہی میں بہت آگے جا چکے ہیں جہاں سے واپسی دشوار ہے۔ لِيَسِيْرًا: آسان۔

۱؎ پچھلی آیات میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت فرمایا گیا اور یہود کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا گیا۔ اب ان آیات میں ان لوگوں کو بُرے انجام سے ڈرایا گیا ہے جو دلائل کے واضح ہونے کے بعد بھی کفر و انکار پر اصرار کریں گے، ظلم و اعراض کو جاری رکھیں گے اور باز نہ آئیں گے۔

۲؎ آیت ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹: قرآنِ پاک اور حضرت پیغمبر ﷺ کی تصدیق اور توثیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ آپ ﷺ سے منکر ہوئے اور تورات میں جو آپ ﷺ کے اوصاف اور حالات موجود تھے ان کو بھی چھپا لیا اور لوگوں پر کچھ ظاہر کر کے ان کو بھی دینِ حق سے باز رکھا، سو ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہو نہ ہدایت۔ جس سے خوب واضح ہو گیا کہ ہدایت آپ ﷺ کی متابعت میں منحصر ہے اور گمراہی آپ ﷺ کی مخالفت کا نام ہے۔ جس سے یہود کو پوری سرزنش ہو گئی اور ان کے خیالات کی تغلیط واضح ہو گئی۔

آیت ۱۷۰:۔ آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کی کتاب کی تصدیق اور آپ ﷺ کے مخالفین یعنی اہل کتاب کی تغلیط و تفصیل فرمایا کر اب عام طور پر سب لوگوں کو منادی کی جاتی ہے کہ اے لوگو! ہمارا رسول ﷺ سچی کتاب اور سچا دین لے کر تمہارے پاس پہنچ چکا۔ اب تمہاری خیر اس میں ہے کہ اس کی بات مانو، اور نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ ساری کائنات اللہ کی ہے، اور وہ تمہارے تمام احوال سے خبردار ہے۔ تمہارے افعال و اعمال کے مطابق پورا

۱؎ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۲۵ ۲؎ فوائد القرآن ص ۱۳۴

Marfat.com

حساب وکتاب ہو کر ان کا بدلہ ملے گا۔ اس ارشاد سے معلوم ہو گیا کہ وحی جو پیغمبر پر نازل ہو اس کا ماننا فرض اور انکار کفر ہے۔

[1] وَظَلَمُوْا: اس ظلم سے مراد دونوں قسم کے ظلم ہو سکتے ہیں۔ ایک ظلم تو خود اپنے نفس اور جان پر کفر و انکار کر کے۔ دوسرا ظلم یہ ہے کہ دوسروں کو اسلام و ایمان کے راستے سے ظلم یا کفر سے روکا جائے۔

اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ: یہ قانون مجازات و مکافات عمل کا بیان ہو رہا ہے کفر اور ظلم کے نتیجے قدرۃً اسلام اور عدل کے نتیجوں سے بالکل مختلف نکلیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ: قرآنی دعوت کی عالم گیری کا اس میں ایک اور ثبوت ہے (قرطبی، روح المعانی، کبیر) الحق میں سچے دعویٰ اور سچے دلائل دونوں آ گئے۔

فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ: ایمان لانے اور زندگی کو شریعت کے مطابق ڈھالنے میں نفع تمام تر بندہ کا اپنا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس میں کوئی غرض اٹکی ہوئی نہیں ہے، جیسا کہ مشرک قوموں نے اپنے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں تصور کر رکھا ہے۔ وہ اپنے دیوی دیوتاؤں اور باطل معبودوں کو اپنے ہی جیسا محتاج تصور کرتے تھے۔ لہٰذا بار بار انہیں یہ حقیقت یاد دلانے کی ضرورت تھی۔

[2] ضلالت میں شدید ترین لوگ وہ ہیں جو گمراہی کے باوجود اپنے دل میں اپنے آپ کو حق پرست سمجھتے ہیں، خود تو قرآن کی صداقت کے اعتراف اور رسول اللہ کی رسالت کی حقانیت کے اقرار سے رکتے ہی ہیں۔ دوسروں کے دلوں میں بھی شک و شبہات ڈال کر اسلام سے روکتے ہیں۔ یہود کا یہی کردار تھا اور اب بھی ہے! مؤلف: وہ اس ضلالت کو مال کی کمائی کا ذریعہ بناتے تھے۔ یہی شیطان کی راہ ہے جو اسلام سے بہت بعید ہے۔

ان یہود نے خیر و سعادت دارین تک پہنچانے والے راستے سے خود بھی اعراض کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا اور مکر و فریب اور زور و ساندلی سے دوسروں کو اغوا کر کے ان کی گمراہی کا باعث بنے، اور اپنی بدکاریوں سے ان پر راہ حق کو ملتبس کر دیا اور صراط مستقیم سے روک کر ان پر ظلم کیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں کہ ایسے ظالموں کو قیامت کے دن ان کا کفر و ظلم بخش دے گا، کیوں کہ ان دونوں چیزوں نے ان کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے، ان کے دلوں کو منحرف کر ڈالا ہے اور ان کی اندرونی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ کفر و ظلم اور قبیح افعال کو ان کے سامنے خوب صورت بنا کر پیش کرتے ہیں، بری عادتوں اور بداعمالیوں کو خوبصورت بنا کر دکھاتے ہیں۔ یہ چیز فقط صحیح ایمان اور صالح اعمال سے ہی دور ہو سکتی جو ان کے دلوں کی میل اتار دے اور انہیں پاک صاف کر دے۔ قیامت کو اس کا کوئی موقع نہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ دار الجزاء ہے نہ کہ

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۳۱-۲۳۲ [2] تفسیر المراغی ج ۶ صفحہ ۲۵، ۲۶، تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۷۷-۸۱ طبع ثالث

Marfat.com

دارالعمل. ایسے لوگوں کو زبردستی اسلام و ایمان کی راہ پر نہیں ڈالا جاتا. جو جہنم کا راستہ انہوں نے اپنے لئے چن لیا ہے اسی پر انہیں چلتے رہنے دیا جاتا ہے. یہی عدلِ الٰہی ہے اور انسانی ارادہ و اختیار کا یہی مطلب ہے.

ان آیات میں سے آخری آیت میں تمام انسانوں کو مخاطب بنایا گیا ہے. کیوں کہ پہلی آیات میں حجت تمام ہو چکی اور راہِ حق واضح کر دی گئی ہے. اب دعوتِ حق سے اعراض میں کوئی عذر باقی نہ رہا. نہ قبولِ حق میں کوئی رکاوٹ باقی ہے. یہود اپنے نبیوں کی پیش گوئیوں کے مطابق ایک نبی اور ایک مسیح کے منتظر تھے. انجیل یوحنا کی پہلی فصل میں ہے کہ یہودی کاہنوں اور عالموں نے کچھ لوگوں کو یوحنا (حضرت یحییٰؑ) کے پاس یہ دریافت کرنے کو بھیجا کہ وہ کون ہیں، کیوں کہ نبوت کی علامتیں ان پر ظاہر تھیں. سو انہوں نے یوحنا سے پوچھا کہ کیا تو مسیح ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں. انہوں نے پوچھا کہ کیا تو "وہ نبی" ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں اس سے تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ جو ایک "نبی" کے منتظر تھے، جب انہوں نے زیرِ تفسیر آیت سنی اور پڑھی ہو گی تو دل میں ضرور جان لیا ہو گا کہ یہ وہی "نبی" ہے جس کی پیش گوئی موسیٰؑ نے استثناء میں اور عیسیٰؑ نے انجیل میں کی تھی. دوسرے پیغمبروں کی طرف منسوب ہونے والی کتابوں میں بھی ایسی پیش گوئیاں موجود ہیں.

آیت کے آخر میں فرما دیا ہے کہ پیغمبرؐ کا کام کچھ تم پر موقوف نہیں. اللہ تمہارے ایمان و کفر سے بے نیاز ہے. اور اس میں تمہارا ہی نفع و نقصان ہے.

[1] ان آیات میں کفر، صدّ عن السبیل، ضلالت، ظلم اور جہنمی ہونے کے جو واضح اوصاف مذکور ہوئے ہیں یہ عام ہونے کے باوصف پورے پورے یہود پر صادق آتے ہیں. اس دینِ حق کے بارے میں ان کا موقف ان آیات سے صراحتہً معلوم ہو جاتا ہے. اس میدان میں یہودِ مدینہ، معاصرینِ موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور حضورؐ کے بعد آنے والے یہود تا ایندم سب برابر ہیں. چند خوش نصیب افراد اس سے مستثنیٰ ہیں جن کی قرآن نے بار بار مدح بیان کی ہے. عام یہود "ضلالِ بعید" میں جا پڑے ہیں، یعنی عقیدہ و تصور میں، عقل و فکر میں، عملی رویہ میں، غرض ہر پہلو سے وہ سراسر کفر ہی کفر ہو چکے ہیں.

کفر فی نفسہٖ ظلم ہے، کیوں کہ وہ کافر کے نفس پر، حق پر اور دوسرے لوگوں پر ظلم ہے. یہی سبب ہے کہ قرآن نے شرک کو ظلمِ عظیم قرار دیا ہے اور خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو ظالم ٹھہرایا ہے. لیکن یہود کا ظلم دوہرا تھا. ایک تو کفر کو اختیار کرنے کا اور دوسرا راہِ حق سے دوسروں کو روکنے کا. اسی لئے

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ صفحہ ۳۰۶، ۳۰۱.

Marfat.com

کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں.

یہود و نصاریٰ اپنے آپ کو خدا کے بیٹے اور پیارے ٹھہراتے تھے، خدا کی برگزیدہ قوم بنے پھرتے تھے. جنت کے واحد مالک اور جہنم سے بری بنتے تھے اس لیے قرآن نے واضح کر دیا کہ تمہیں کوئی سرخاب کا پر لگا ہوا نہیں ہے. تم بھی عام انسانوں میں سے ہو. خدا کا قانون سب کے لئے برابر ہے. خیر و شر کی جزا و سزا سب کے لئے ایک جیسی ہے. اور اللہ تعالیٰ پر ہر مجرم کو سزا دینا بڑا آسان ہے. کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا.

رسالت کی غرض و غائت اور اس کی حقیقت جو اوپر بیان ہو چکی ہے، اس کا واضح تقاضا تھا کہ اللہ پاک ایک آخری عظیم الشان رسالت کو برپا کرے اور سب لوگوں کو اسکی اطاعت کی طرف کھلی دعوت دے. پس ان آیات میں فرما دیا گیا ہے کہ وہ رسول العالمین، وہ کائناتی اور آفاقی رسول آچکا ہے. اب خیر و ہدایت اسی کی پیروی میں منحصر ہے اور ضلالت و حماقت اس کی مخالفت کا نام ہے. اللہ نے اس آخری رسالت کے ذریعہ سے اپنی حجت کو تمام عالم پر تمام کر دیا ہے. اب کسی کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا. یہ رسالت زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہے. ہر نبی کا انکار کفر و ظلم ہے. مگر اس آخری رسالت کا انکار تو بہت ہی بڑا ظلم اور سب سے بڑا کفر ہے. کیوں کہ یہ خدا کی رحمت کی ناشکری ہے. وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ.

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا

اے کتاب والو! مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں اور مت کہو

عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى

اللہ کی شان میں مگر پکی بات. بے شک مسیح جو ہے عیسیٰ

ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى

مریم کا بیٹا وہ رسول ہے اللہ کا اور اس کا کلمہ ہے جس کو ڈالا

مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ز فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۫ وَلَا

مریم کی طرف اور روح اس کے ہاں کی سو مانو اللہ کو اور اسکے رسولوں کو اور نہ

Marfat.com

تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ

کہو کہ خدا تین ہیں ۔ اس بات کو چھوڑ دو بہتر ہوگا تمہارے لئے، بیشک اللہ معبود ہے

وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا

اکیلا اس کے لائق نہیں ہے کہ اس کے اولاد ہو اس کا ہے جو

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ

کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ

وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا ع ۲۳ ۹ ۳

کارساز مسیحؑ کو اس سے ہرگز عار نہیں کہ وہ بندہ ہے

لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ

اللہ کا اور نہ فرشتوں کو جو مقرب ہیں اور جس کو عار آئے

عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ

اللہ کی بندگی سے اور تکبر کرے سو وہ جمع کرے گا ان سب کو اپنے پاس

جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اکٹھا پھر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے

فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ

سو ان کو پورا دے گا ان کا ثواب اور زیادہ دے گا

Marfat.com

مِنْ فَضْلِهٖ ۚ	وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا	
اپنے فضل سے	اور جنہوں نے	عار کی
وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ		
اور تکبّر کیا	سو ان کو عذاب دے گا	
عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ		
عذاب	دردناک	اور نہ پائیں گے
لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا		
وہ اپنے لئے	اللہ کے سوا	کوئی حمایتی اور نہ
نَصِيْرًا ۱۷۳		
مددگار		

شرح الفاظ

لَا تَغْلُوْا: غلوّ کا معنی ہے حد سے گزر جانا۔ اس کا باعث بالعموم محبت کی زیادتی اور تعصب ہوتا ہے۔ غلو کرنے والا بہت سادگی اور نیک نیتی سے گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے عیسائیوں کو خاص کر فرمایا ہے۔ كَلِمَتُهٗ: کلمہ کا معنی پیش گوئی، وعدہ، نشان بھی آتا ہے مثلاً: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ اللہ کے وعدوں میں تبدیلی نہیں ہوتی! یہاں بھی کلمہ سے مراد وعدہ اور نشان ہے جو مریمؑ سے غیر معتاد طریقے سے پورا ہونے کا اعلان کر کے پورا کیا گیا تھا۔ اسی طرح کلمہ سے مراد یہ بھی ہے کہ عیسیٰؑ کو غیر معتاد طریقے سے لفظِ کُنْ سے پیدا کیا گیا تھا جیسا کہ آدمؑ کو بھی اسی کُنْ کے کلمہ سے پیدا کیا گیا تھا۔

اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ: خدا نے وہ وعدہ مریمؑ سے کیا تھا، یا وہ کلمہ کُنْ روح القدس کی معرفت مریمؑ تک پہنچایا اور پھونکا تھا۔ رُوْحٌ مِّنْهُ: اس کی طرف سے ایک روح ہے، جیسا کہ آدمؑ کے متعلق فرمایا۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ: (میں نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی) یا یہ مطلب ہے کہ عیسیٰؑ

Marfat.com

کی پیدائش روح القدس کی پھونک کے نتیجے میں ہوئی تھی لہٰذا وہ روح القدس کا فیضان ٹھہرے۔ وَلَا تَقُولُوا ثَلٰثَةٌ: اور یہ مت کہو کہ خدا تین ہیں۔ تثلیث عیسائیت کا ایک مسلّمہ عقیدہ ہے جس کا رد کیا گیا۔ موجودہ عیسائی دنیا کے اکثر فرقے تثلیث پرست ہیں۔ کچھ لوگ ہمیشہ اس کے منکر رہے ہیں اور آج بھی ہیں، لیکن وہ بہت تھوڑے ہیں۔ پولوس کی عیسائیت کی جان اسی مسئلہ تثلیث میں ہے، جس کا گہرا تعلق مسئلہ کفارہ اور صلیب سے ہے۔ کفارہ اور صلیب کا کافی رد پہلے ہو چکا ہے اب یہاں تثلیث کا رد فرمایا جا رہا ہے۔ انْتَهُوا: باز آجاؤ، انحراف ترک کر دو۔ يَسْتَنْكِفَ: استنکاف کا معنی ہے غرور تکبر سے کسی چیز سے رکنا۔ استکبار کا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس حد سے بڑا جانے جس پہ وہ دراصل ہے، ایسا کرنے کا باعث خود پسندی اور غرور ہوتا ہے۔ استکبار کا نتیجہ استنکاف ہوتا ہے، گویا وہ پہلا درجہ ہے اور یہ آخری مقام۔ حشر کا معنی ہے جمع کرنا اکٹھا کرنا۔ فَيُوَفِّيهِمْ: تَوْفِيَةٌ: کا معنی ہے پورا پورا ادا کرنا۔

خلاصۂ آیات

سلہ پچھلی آیات میں یہود کے کفر کا بیان تھا اور ان پر حجت تمام کی گئی تھی۔ ان کے کفر کا ایک بڑا سبب عیسیٰؑ کی توہین و تحقیر اور ان کی شان میں گستاخی ہے۔ یہ تفریط کا پہلو تھا۔ اب افراط کا بیان ہو رہا ہے کہ دوسری طرف عیسائیوں نے عیسیٰؑ بن مریمؑ کو خدا، ابن اللہ، خدائی کا تیسرا رکن قرار دے کر ایک اور قسم کے کفر و شرک کا ارتکاب کیا۔ ان آیات میں عیسائیوں کے اسی غلو کا رد اور ان پر اتمام حجت کے لئے دلیل کا بیان ہے۔

(تنبیہ) ابتدائے سورت میں ہم نے تعداد آیات پر مختصر گفتگو کی تھی۔ یہاں آیت ۱۷۳ میں بھی ایک وقف اور فاصلے کا اختلاف ہے۔ اگر عَنْ اَبًا اَلِيْمًا پہ وقف آیت مانا جائے تو نصیرؒ کے وقف پر آیت کا عدد ۱۷۴ ہوگا، ورنہ ۱۷۳۔ ہمارے ہاں کے مصاحف میں اس اختلاف کو اس علامت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ عَنْ اَبًا اَلِيْمًا اس مختصر گذارش سے ہماری اس تمہیدی گفتگو کی وضاحت ہو جاتی ہے جو سورت کی ابتدا میں درج ہے۔ مؤلف)

سلہ آیت ۱۷۱:۔ اہل کتاب اپنے انبیاء کی تعریف میں غلو سے کام لیتے ہیں اور حد سے نکل جاتے انہیں خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگتے۔ سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کی بات میں مبالغہ مت کرو اور جس سے عقیدت و محبت ہو اس کی تعریف اور شان میں حد سے نہ بڑھنا چاہیے۔ جتنی بات تحقیق سے ثابت شدہ اور مسلّم ہو اس سے زیادہ نہ کہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی شان مقدس میں بھی۔ یہی بات کہنی ضروری ہے

سلہ تفسیر المراغی ج ۶ صفحہ ۲۸ سلہ فوائد القرآن صفحہ ۱۳۵۔

Marfat.com

ہے جو محقق و مسلم ہو اپنی طرف سے کچھ نہ کہنا چاہیئے۔ فرمایا کہ تم نے یہ کیا غضب کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جو خدا کے رسول ہیں۔ اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے تھے، ان کو وحی کے خلاف خدا کا بیٹا کہنے لگے اور تین خداؤں کے معتقد ہو گئے۔

ایک خدا، دوسرے حضرت عیسیٰؑ اور تیسرے مریمؑ (بعض عیسائی فرقوں کی تثلیث یہی ہے اکثر کہتے ہیں کہ خدا، عیسیٰؑ اور جبریلؑ یعنی باپ، بیٹا اور روح القدسؑ! مؤلف) ان باتوں سے باز آؤ۔ اللہ تعالیٰ واحد اور یکتا ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ اس کی ذات پاک اس سے منزہ و مقدس ہے یہ تمام خرابی اس کی ہے کہ تم نے وحی کی اطاعت اور پابندی نہ کی۔ وحی کی متابعت کرتے تو خدا کے لئے بیٹا نہ مانتے اور تین خداؤں کے قائل ہو کر صریح مشرک نہ ہوتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید الرسل اور قرآن پاک افضل الکتب کی تکذیب کر کے آج ڈبل کافر نہ بنتے۔

اہل کتاب کے ایک فریق (یہود) نے تو حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا رسول بھی نہ مانا اور قتل کرنا پسند کیا۔ اس فریق کا ذکر پہلے گزرا۔ دوسرے فریق نے ان کو خدا کا بیٹا کہا۔ دونوں فریق کافر ہو گئے۔ ہر دو فریق کی گمراہی کا باعث وحی کی مخالفت ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ سعادت دارین اور نجات وحی کی متابعت میں منحصر ہے۔

یہاں فرمایا گیا ہے کہ ساری کائنات ارضی و سماوی اور جو کچھ اس میں ہے، وہ اللہ کی مخلوق و مملوک ہے۔ سب اسی کے بندے ہیں۔ پھر بھلا کوئی اس کا شریک اور بیٹا کیونکر ہو سکتا ہے۔! اور کون ایسا ہے جسے ایسا کہا جا سکے۔؟ اللہ تعالیٰ ہی سب کام بنانے والا ہے سب کی کارسازی کے لئے وہی کافی ہے، کسی دوسرے کی حاجت نہیں، پھر بتلایئے کہ اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہو سکتی ہے؟ خلاصہ یہ ہوا کہ نہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور نہ اس کی ذات پاک میں اس کو گنجائش اور نہ اس کو اس کی حاجت، اس سے معلوم ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو ایمان اور عقل دونوں سے محروم ہو۔

مضمون بالا سے معلوم ہو گیا کہ جو کوئی حق تعالیٰ کے لئے بیٹا یا کسی اور کو اس کا شریک مانتا ہے درحقیقت وہ تمام موجودات کو مخلوق، باری تعالےٰ کو خالق جملہ کائنات نہیں مانتا، نیز اللہ تعالیٰ کو سب کی حاجت برآری اور کارسازی کے لئے کافی نہیں جانتا۔ گویا وہ خدا کو خدائی سے نکال کر مخلوقات اور ممکنات میں داخل کر دیتا ہے۔ ارشاد فرمایا سُبْحَانَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ میں جس ناپاکی کی طرف مخفی اشارہ تھا اس کا پتہ چل گیا۔ اور فرزند حقیقی اور فرزند مجازی دونوں میں وہ ناپاکی چوں کہ برابر موجود ہے تو خوب سمجھ میں آ گیا کہ اس کی ذات مقدس جیسے اس سے پاک ہے کہ اس کے بیٹا پیدا ہو، اس سے بھی پاک و برتر ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو

Marfat.com

بیٹا بنانے

آیت ۱۷۲:۔ اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجا لانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے، عیسیٰؑ اور ملائکہ مقربین سے اس نعمت کی قدر اور ضرورت پوچھیے، ان کو اس سے کیسے ننگ و عار ہو سکتی ہے؟

البتہ ذلت اور غیرت تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں ہے جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ اور معبود مان لیا ہے اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مان کر ان کی عبادت کرنے لگے سو ان کیلئے ہمیشہ کو عذاب اور ذلت ہے۔

(اس آیت میں بطور اشارہ عیسیٰؑ کی زندگی اور دوبارہ دنیا میں آمد کی دلیل پائی جاتی ہے۔ اس کی دلیل یہ کہ فرشتوں کی زندگی اور موت تو زیر بحث ہی نہیں اور عیسیٰؑ کے متعلق فرمایا جا" ہے کہ وہ ہرگز خدا کا بندہ ہونے سے انکار و استکبار نہ کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ کب؟ اگر کہا جائے کہ وہ مر چکا ہے اور حشر کو بندگی کا اقرار کرے گا۔ تو جواب یہ ہے کہ آیت کہتی ہے کہ جو کوئی خدا کی بندگی اور عبدیت سے انکار و استکبار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے حشر میں رسوا کرے گا معلوم ہوا کہ یہ انکار و اعتراف حشر سے پہلے پہلے ہوگا کہ مسیحؑ بھری دنیا میں آکر اپنی بندگی اور عبودیت کا اقرار اور اعلان کرے گا اور اپنے پجاریوں کی بے ملا تغلیط و تکفیر کرے گا۔ مؤلف)

آیت ۱۷۳:۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے ناک چڑھائے گا اور سرکشی کرے گا، وہ یونہی نہ چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ ایک روز سب کو اللہ کے سامنے جمع ہونا ہے اور حساب دینا ہے سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے یعنی اللہ کی بندگی پوری بجا لائے، ان کو ان کے کاموں کا پورا ثواب ملے گا۔ بلکہ اللہ کے فضل سے بڑی بڑی نعمتیں ان کے ثواب سے زیادہ بھی ان کو عنایت ہوں گی، اور جن لوگوں نے اللہ کی بندگی سے ناک چڑھائی اور سرکشی کی، وہ عذاب عظیم میں گرفتار ہوں گے اور کوئی ان کا خیر خواہ اور مددگار نہ ہوگا۔ جن کو اللہ کی بندگی میں شریک کر کے عذاب میں پڑے وہ بھی کام نہ آئیں گے۔ سو اب نصاریٰ خوب سمجھ لیں کہ ان دو صورتوں میں سے ان کے مناسب حال کیا ہے؟ اور حضرت مسیحؑ کے موافق شان کیا ہے۔!

لہ لا تغلوا فی دینکم: دین میں غلو کرنا یہ ہے کہ عقائد و مسائل میں اضافہ و افراط کر کے دین میں اپنی طرف سے دخل دیدیا جائے، خواہ یہ کسی نیت سے ہو (جصاص) مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہود کا غلو احکام میں تعمق تھا اور مسائل باطن کی طرف سے اعراض تھا۔ اور مسیحیوں کا غلو مسائل باطن میں تعمق اور ظاہر کی طرف سے اعراض ہے۔ طریق حق ظاہر و باطن کو جمع کرنا ہے۔

انما المسیح الخ: اللہ کے نائبوں اور رسولوں کو معبود سمجھ بیٹھنے کا مرض مشرک قوموں میں عام

لہ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۳۲، ۲۳۳۔

Marfat.com

عام رہا ہے۔ عیسائیوں نے بھی مصری، یونانی اور رومی مشرکوں اور مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیغمبر برحق کو خدا یا فرزندِ خدا کا درجہ دے رکھا تھا، یہ اسی کی تردید ہو رہی ہے۔

کلمۃ اللہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ عیسیٰؑ خود کلمہ تھا یا کلمہ کُن (جس سے وہ پیدا ہوا تھا) عیسیٰؑ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کلمہ کُن سے بالواسطہ جبریلؑ مریمؑ کو القاء کئے ہوئے کلمہ سے پیدا ہوا تھا (روح المعانی، معالم، ابن کثیر، راغب)

رُوْحٌ مِّنْهُ: یعنی خدا کی پیدا کی ہوئی روح ہے جو مریمؑ کی طرف بھیجی گئی تھی۔ اور روح کا انتساب اللہ کی طرف محض شرف و عظمت کے لئے ہے جیسے بیت اللہ، ناقۃ اللہ، نعمت اللہ، سمار اللہ، ارض اللہ وغیرہ (مدارک، ابن جریر، ابن کثیر، ابن عباسؓ، امام رازیؒ، معالم التنزیل، جصاصؒ) م اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف عیسیٰؑ میں ہی اللہ کی روح تھی کسی اور میں اللہ کی روح نہیں ہوتی، اللہ کی روح تو ہر فرد بشر میں ہے ارشادِ الٰہی ہے وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي۔ قرآن میں موقع تخصیص و امتیاز پر کبھی کسی کو عبدہٗ سے تعبیر کیا گیا ہے اور کبھی کسی کو عبادنا، عبدنا کہہ کر پکارا گیا ہے، حالاں کہ اللہ کے عبد تو سبھی ہیں۔

وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ: خواہ تین اقنوم (ارکان و اجزاء) ہوں یا تین مستقل بالذات ہستیاں مسیحی تثلیث کا عقیدہ خود مسیحیوں کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے۔ باپ غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی اور روح القدس ازلی۔ تاہم تین ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی۔ اسی طرح تین غیر مخلوق نہیں اور نہ تین غیر محدود، بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔ یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق، تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسا باپ خدا، بیٹا خدا اور روح القدس خدا۔

پس یہی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا"۔ اب ایک طرف تو یہ گورکھ دھندا ہے (جس کا کوئی الٹا سیدھا کوئی مطلب و مفہوم نہیں! مؤلف) اور دوسری طرف اسلام کا صاف و سادہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ کیا کوئی بھی مناسبت دونوں میں ہے؟ اسلام کی توحید بالکل صاف، واضح اور ہر ایک کی سمجھ میں آنے والی ہے۔ وہ یونانیوں کے شرک و تثلیث، عیسائیوں اور ہندوؤں کی مورتی کی تعلیم سے بالکل جداگانہ، الگ تھلگ اور صریح ہے! مؤلف)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ اس آیت سے حلول و اتحاد کا صریح رد ہوتا ہے جس کے بعض صوفیاء قائل ہوئے ہیں۔ والد و مولود (باپ اور بیٹے) میں ہم جنسیت (قومی و جنسی) حاجب ہے۔ خالق و مخلوق میں جو تعلق ہے، مالکیت و مملوکیت کا ہے

لہٰذا اولاد کا تصور وہاں ہر لحاظ سے باطل ہے، بندہ بہر حال بندہ ہے چاہے کوئی ہو، پیغمبر ہو، ولی ہو، مرشد ہو

Marfat.com

یا کوئی اور ہو، اس کے لیے نوکر کے اسے درجہ معبودیت تک پہنچانا صریح شرک ہے۔

لہ وَكَلِمَتُهٗ اور خدا کا ارشاد ہے مریمؑ کی طرف کلمہ (فرمانِ خداوندی) بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مریمؑ کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کرے۔ عیسائیوں کو ابتدا ہی سے مسیحؑ کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا، مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو کلام یا نطق (Word) کا ہم معنی سمجھ لیا۔ پھر اس کلام و نطق سے اللہ پاک کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریمؑ کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیحؑ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیحؑ کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیحؑ کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

وَرُوْحٌ مِّنْهُ یہاں تو خود مسیحؑ کو خدا کی طرف سے ایک روح کہا گیا ہے۔ اور سورۂ بقرہ میں یوں ادا کیا گیا ہے کہ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے پاک روح سے مسیحؑ کی مدد کی) دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیحؑ کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی۔ وہ سراسر حقانیت اور راست بازی تھی اور از سر تا پا فضیلت اخلاق تھی یہی تعریف حضورؐ کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انہوں نے اس میں غلو کیا اور رُوْحٌ مِّنَ اللّٰهِ کو عین روح اللہ قرار دے لیا۔ اور روح القدس کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ پاک کی اپنی روحِ مقدس تھی جو مسیحؑ کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیحؑ کے ساتھ ایک تیسرا خدا روح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیل متی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ؟ فرشتے نے اسے (یعنی یوسف بڑھئی کو) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیوں کہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے (باب ۱۔ آیت ۲۰)

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ: عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی مسیحؑ کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصل دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتدا میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیحؑ کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا۔ اس کی وجہ سے انہوں نے مسیحؑ اور روح القدس کی الوہیت کو بھی خداوند عالم کی الوہیت کے ساتھ مانا۔ خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لئے یہ مسئلہ ایک

لہ تفہیم القرآن ج ۱ صفحہ ۲۷۴۔ ۲۹۴۔

Marfat.com

ناقابل حل چیستان بن گیا کہ عقیدہ توحید کے باوجود عقیدہ تثلیث کو اور عقیدہ تثلیث کے باوجود عقیدہ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ سیکڑوں فرقے اسی کی مختلف تعبیر پر بنے ہیں۔ اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے ہیں اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیحؑ نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف اس غلو نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیحؑ اور روح القدس کی الوہیت کا تخیل چھوڑ دیں، صرف اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کریں اور مسیحؑ کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں نہ کہ کسی طور پر شریک فی الالوہیت۔

سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ: یہ عیسائیوں کے چوتھے غلو کی تردید ہے۔ بائبل کے عہد جدید کی روایات اگر صحیح ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیحؑ نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلق سے تشبیہ دی تھی اور باپ کا لفظ خدا کے لئے وہ محض بطور مجاز و استعارہ کے استعمال کرتے تھے (تمثیلوں اور کنایات و استعارات میں مسیحؑ کے کلام کرنے کا ثبوت واضح طور پر بار بار انجیل سے ملتا ہے اور کوئی تعصب سے متعصب پادری بھی اس کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مؤلف) یہ تنہا مسیحؑ ہی کی خصوصیت نہیں، قدیم ترین زمانہ سے بنی اسرائیل خدا کے لئے باپ کا لفظ برتتے چلے آرہے تھے، اور اس کی بکثرت مثالیں بائبل میں موجود ہیں (عہد نامہ عتیق) مسیحؑ نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا تھا اور وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیحؑ کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا، ان کا عجیب و غریب نظریہ اس بات میں یہ ہے کہ چونکہ مسیحؑ خدا کا مظہر ہے اور اس کے کلمے اور اس کی روح کا جلالی ظہور ہے اس لئے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اور خدا نے اپنے اکلوتے کو زمین پر اس لئے بھیجا کہ انسانوں کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسان کے گناہ کا کفارہ ادا کرے۔

حالانکہ اس کا ثبوت خود مسیحؑ کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اس غلو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبرؑ کی عظیم الشان شخصیت سے متاثر ہو کر مبتلا ہو گئے (حیرت ہے کہ ایک طرف تو عیسائی مسیحؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور دوسرے ہی سانس میں خدا، ارکان تثلیث میں سے تیسرا خدا بھی کہتے ہیں۔ اگر وہ خدا ہے تو پھر خدا کا بیٹا کیسے ہے؟ اور خدا کا بیٹا ہے تو خدا کیوں کر ہے؟ ذرا غور کریں تو ابنیت مسیحؑ کا عقیدہ اور تثلیث کا عقیدہ .... حسب بیان موجودہ عیسائیت۔ بالکل ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور بیک وقت دونوں عقیدوں پر ایمان خلاف عقل و فطرت اور ناممکن ہے! مؤلف)

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدہ کی تردید نہیں کی، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں

Marfat.com

ہے. بلکہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس سوال کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے کہ جب مسیحؑ خدا کا اکلوتا تھا تو (بقول یہود و نصاریٰ ہر دو! مؤلف) صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے اگر مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کی تردید کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دور کر دیا جائے کہ مسیحؑ صلیب پر چڑھا لئے گئے تھے (حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ بنیادی و اصولی عقیدہ نہ ہونے کے باوجود عیسائی پادری اور مناد غیر عیسائی عوام کے سامنے سب سے پہلے اسی مسئلہ صلیب و کفارہ کو ہی نہایت پر فریب انداز میں خوب صورت بنا کر پیش کرتے ہیں حالانکہ اس جیسی بے عقلی اور بے انصافی شاید دنیا میں اور کوئی نہ ہو۔ اور اس پر ایک سو ایک شبہ اور اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے! مؤلف)

[1] عیسائی صرف نبوت و رسالت ہی کو خدائی کے مقام پر پہنچا دینے کے مجرم نہیں بلکہ انہوں نے اپنے دیگر بزرگانِ دین کو بھی تحلیل و تحریم کے اختیارات دے کر شرک و غلو کا ارتکاب کیا ہے اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۔ (توبہ ۳۱)

یعنی انہوں نے یہ کہا کہ سچ جھوٹ، حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کے پرکھنے کا ہمیں کوئی حق حاصل نہیں، جو کچھ ہمارے بزرگ کہہ دیں بس اسے اندھا دھند مان لو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے تم ایسا نہ بڑھانا جیسے نصاریٰ نے عیسیٰؑ ابن مریمؑ کو بڑھایا، میں فقط ایک بندۂ خدا ہوں۔ پس تم عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کہنا (مسند احمد) بخاری میں بھی اس مضمون کی حدیث موجود ہے اللہ نے قرآنِ پاک میں بار بار مسیحؑ کی عبدیت و رسالت کا اعلان کیا ہے اور ان کی ماں کو ایک بزرگ عمران کی بیٹی فرمایا ہے۔

کلمہ خدا خود خدا نہیں بن گیا بلکہ مسیحؑ کو خدا کے کلمہ (کُن) سے پیدا کیا گیا ہے اور جس طرح انہیں رُوْحٌ مِّنْهُ فرمایا ہے اسی طرح ساری کائنات کے متعلق فرمایا ہے جَمِيْعًا مِّنْهُ پس یہاں مِن کا حرف تبعیض کے لئے نہیں جیسا کہ ملعون نصاریٰ نے کہا ہے۔ بلکہ یہ مِن ابتدا کے لئے ہے۔ اور روح اللہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے ناقۃ اللہ اور بیت اللہ۔ یعنی یہ نسبت اظہار تشریف و عظمت کے لئے ہے۔

عیسیٰؑ کے بارے میں عیسائیوں کے عقائد میں اتنا خبط ہے کہ جہاں دس عیسائی جمع ہوں، وہاں ان کے گیارہ خیالات ہوں گے۔ کوئی عیسیٰؑ کو ابن اللہ کوئی شریک خدا اور معلوم نہیں کیا کیا کہتا ہے۔ یہ اختلاف ان میں شاہ قسطنطین کے زمانے سے پہلے کا چلا آتا ہے۔ ہر کونسل میں اختلاف بڑھتا رہا اور عقیدۂ توحید گم ہو کر رہ گیا۔ ان کے بہت سے فرقے ہیں جو اسی مسئلہ پر ایک دوسرے کو کافر اور بدعتی وغیرہ کہتے ہیں۔ (اختلاف مسلمانوں میں بھی ہے لیکن توحید اور رسالت جیسے بنیادی مسائل میں نہیں اکثر فروع میں ہے گو وہ بھی سخت افسوسناک ہے۔ مؤلف)

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۶ صفحہ ۲۶، ۲۹۔

Marfat.com

عیسائیوں نے مسیحؑ کو ابن اللہ کہا تو مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔ اس کا واضح رد آیات میں سے آخری آیت میں فرما دیا گیا۔ فرشتوں کو ایک اور آیت میں عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ فرمایا گیا ہے۔

۱؎ روح کے لفظ میں پاکیزگی، طہارت اور لطافت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں رُوح اور رِیح کے الفاظ عربی میں قریب المعنی ہیں، اردو میں رُوح کا ترجمہ پھونک یا سانس بھی کیا جاتا ہے۔ چونکہ جبریلؑ نے بامرِ خداوندی مریمؑ کے گریبان میں پھونک ماری تھی جس سے انہیں حمل رہ گیا لہٰذا اس نسبت سے انہیں رُوْحٌ مِّنْہُ فرمایا گیا ہے۔

۲؎ جبریلؑ نے جب مریمؑ کو عیسیٰؑ کی پیدائش کی بشارت دی اور مریمؑ نے اسے بعید جانا تو جبریلؑ نے خدا کی طرف سے فرمایا: کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔

اس سے معلوم ہوا کہ کلمہ کُنْ کسی چیز کے خلق و ایجاد کے ارادے کے وقت خدا کی تکوین پر قدرت کو ظاہر کرنے والا کلمہ ہے۔ عیسیٰؑ کی تائید روح القدس سے کی گئی تھی جیسے سب اہل ایمان کے متعلق بھی تائید روح القدس کا ارشاد یوں ہوا ہے۔ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ۔

عیسیٰؑ کی پیدائش میں خدا کا جو نشان ہے وہ آدمؑ کی پیدائش کی مانند ہے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو عام عادت کے خلاف پیدا فرمایا ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔

ہارون الرشید کے دربار میں ایک عیسائی عالم کا مناظرہ علی بن حسین واقدی مروزی سے ہوا۔ عیسائی نے کہا کہ تمہاری کتاب قرآن میں وَرُوْحٌ مِّنْہُ کا لفظ موجود ہے جو دلالت کرتا ہے کہ عیسیٰؑ کا خدا کا جزو ہے۔ واقدی نے یہ آیت پڑھی: وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ۔ اور کہا کہ اگر تمہارا قول درست ہے تو اس آیت میں ساری کائنات کے لئے مِنْہُ فرمایا گیا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب لوگے کہ ساری کائنات خدا کا جزو ہے؟ اس پر وہ نصرانی خاموش ہو گیا اور اسلام لے آیا۔ انجیل متی میں لکھا ہے کہ مریمؑ اپنے خاوند یوسفؑ سے پہلے روح القدس کے تصرف سے حاملہ پائی گئی۔ انجیل لوقا میں اس واقعہ کی مزید تفصیل آئی ہے اور وہاں بھی روح القدس کے آنے اور مریم کو تسلی دینے اور اس سے گفتگو

۱؎ تفسیر حقانی ج ۲ صفحہ ۲۵۳ تا ۲۵۴ تفسیر المراغی ج ۶ صفحہ ۲۹، ۳۵، تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۸۱، ۸۹۔

Marfat.com

کرنے کا ذکر ہے کہ تمہیں جو حمل ہوگا وہ روح القدس کے تصرف سے ہوگا۔ پس دُفْ ثُمَّ مِنْہُ کا یہ معنی قطعًا باطل ہے کہ عیسیٰؑ خدا کا جز ہے۔ انجیل تو امیں بھی اسی باب میں یہ صراحت بھی ہے کہ یحییٰؑ کی والدہ الیصابات (الیشاع) روح القدس سے بھر گئی اور وہ اس سے قبل بانجھ تھی۔ اور یحییٰؑ کے باپ زکریاؑ بھی روح القدس سے پُر ہوئے۔

ان دلائل سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ روح القدس مسلمانوں اور نصاریٰ دونوں کے نزدیک جبریلؑ کا خاص لقب ہے جس کے واسطے سے عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ اور یحییٰؑ کی پیدائش ایک اور طرز سے بواسطہ روح القدس واقع ہوئی۔ وہ یہ کہ ان کے والد بہت بوڑھے اور ماں بانجھ تھی۔ وہ دونوں اولاد پیدا کرنے کا سبب بن سکتے تھے عیسیٰؑ اور یحییٰؑ دونوں کا معاملے میں واسطہ اور سبب ایک ہی ہے، یعنی جبریل علیہ السلام کا تصرف۔

ان آیات میں وَلَدٌ کا لفظ آیا ہے اور عیسائی اپنی مذہبی عبارات میں بالعموم ابن کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ گو ان کی بعض عبارتوں میں مولود کا لفظ بھی موجود ہے دیکھئے "مسائل دین کی تفسیر" شائع کردہ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور مؤلف) سو یہ ولد کا لفظ اس لئے آیا ہے کہ اگر عیسائی ابن سے مراد حقیقی بیٹا لیتے ہیں ——— جیسا کہ لفظ سے یہی سمجھا جاتا ہے ——— تو لازم ٹھہرا کہ وہ معاذ اللہ خدا کے نطفہ سے پیدا ہوئے ہوں، اور یہ امر اللہ پر محال ہے۔ اور اگر وہ اس سے مجازی بیٹا مراد لیتے ہیں ——— جیسا کہ بالعموم کہتے ہیں ——— تو اس میں عیسیٰؑ کی کوئی خصوصیت نہیں کیونکہ بعینہٖ یہی لفظ بائبل کے عہد قدیم و جدید میں اسرائیلؑ، داؤدؑ، حواریوں اور دوسرے کئی نیکوکاروں کے لئے بولا گیا ہے۔

ساری مخلوق خدا کا بندہ ہونے میں برابر ہے چاہے کوئی ماں باپ کے بغیر پیدا ہوا ہو جیسے ملائکہ اور آدمؑ چاہے صرف ایک واسطہ سے اس کی پیدائش ہوئی ہو جیسے حوّاؑ اور عیسیٰؑ اور چاہے ماں باپ ہر دو سے پیدا ہوا ہو جیسے کہ باقی انسان۔

عقیدۂ تثلیث اور اس کی نشوونما

معلوم ہونا چاہیئے کہ عقیدۂ تثلیث خالص مشرکانہ اور بت پرستانہ عقیدہ ہے جسے بت پرستوں نے عیسائی ہو کر اپنے پہلے مذاہب سے عیسائیت میں داخل کر دیا ہے اس سلسلے میں انہوں نے بعض یہودی کتابوں پر اعتماد کیا تھا اور ان کی عبارتوں میں ترمیم و اضافہ اور تحریف و تبدیلی کر کے اپنی مشرکانہ اغراض پوری کر لی تھیں۔ اس طرح انہوں نے توحید کی بنیاد کو ڈھا دیا۔ اور توحید پر لاتعداد دلائل عبارات کتب مقدسہ کو بگاڑ ڈالا۔ یورپ کے علماء نے اس کی تفصیل بیان کی ہے اور قدیم و جدید آثار اور تاریخ سے بہت سے دلائل و شواہد پیش کئے ہیں۔ عظیم محقق

Marfat.com

سورلیس نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستان کے آثارِ قدیمہ" میں کہا ہے کہ تباہ و برباد ہو جانے والی اکثر اقوام و ملل کے ہاں ایسی دینی تعلیمات موجود تھیں جن میں "لاہوتِ ثلاثی" یا "لاہوتِ ثالوثی" کا ذکر پایا جاتا ہے۔

مسٹر فائبر نے اپنی کتاب "بت پرستی کی اصل" میں کہا ہے کہ ہم ہندوؤں میں بھی ایک تثلیث کا تصور پاتے ہیں جو برہما، وشنو اور شیو سے مرکب ہے۔ بودھ مذہب والوں میں بھی تثلیث کا تصور موجود ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بدھ معبود ہے اور خدائی کے تین ارکان ہیں جو اس سے نیچے ہیں۔

مسٹر ڈوآن نے اپنی کتاب "خرافاتِ توراۃ" میں لکھا ہے کہ مصر میں منفس کے معبد کے پجاری جب مبتدیوں کو مذہبی تعلیم دیتے تو کہتے تھے کہ اوسل نے ثانی کو پیدا کیا اور پھر ان دونوں نے ثالث کو پیدا کر کے مقدس تثلیث کو مکمل کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصری علم الاصنام میں بھی تثلیث کا واضح تصور موجود تھا۔ تولیسو شاہِ مصر نے تنیتسو کی کاہن سے دریافت کیا کہ اس سے پہلے کوئی اس سے بڑا موجود ہے جو اللہ ہے۔ اور ہر چیز سے پہلے ہے۔ پھر کلمہ ہے اور ان دونوں کے ساتھ روح القدس ہے اور ان تینوں کی فطرت و طبیعت (مادہ) ایک ہے اور وہ ذات میں ایک ہیں، اور ان سے ہی ابدی قدرت صادر ہوئی ہے۔

مصنف کہتا ہے کہ اس سے معلوم ہو گیا کہ تثلیث کے دوسرے رکن کا نام جو کلمہ رکھا گیا ہے یہ مصری بت پرستانہ تعلیم سے لے کر مسیحی تعلیمات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اور اگوستین جو دہلی میں مدفون ہے اسے کلمہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اسی طرح سکندری علم الٰہیات میں جس کا معلم مسیحؑ سے کئی سال پہلے افلاطون (PLATO) تھا، صاف طور پر لکھا ہے کہ کلمہ دوسرا الٰہ ہے اور اسے "خدا کا اکلوتا بیٹا" بھی کہا جاتا ہے۔ سیجین نے اپنی کتاب "اینگلو سیکسنز" میں لکھا ہے کہ فارس والے متردسا کو کلمہ، درمیانہ اور فارس والوں کا مخلص کہا کرتے تھے۔ اور مسٹر ڈوآن نے کہا ہے کہ ایرانی ایک ایسے معبود کو پوجتے تھے جس کے تین ارکان (اقانیم) تھے اور ان کے ارکان کے نام یہ ہیں۔

آہورمزدہ، متراتا، اہرمن۔ یہی تصور بعینہٖ ہندوؤں میں تھا۔ فارس والوں کے ہاں آہورمزدہ خالق تھا۔ متراتا خدا کا بیٹا تھا جو مخلص (برگزیدہ) اور درمیانہ کہلاتا تھا اور اہرمن فرشتہ تھا۔ لیکن فارس کے مجوسیوں کے متعلق مشہور تر یہ ہے کہ وہ دو خداؤں کے قائل تھے۔ ایک تو روشنی اور بھلائی کا منبع تھا اور دوسرا تاریکی اور برائی کا مصدر۔

"دینی افکار کا ارتقاء" نامی کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ یونانی بھی تثلیث کے قائل تھے۔ اور جب قربانیاں چڑھانے کا وقت آتا تو ان کے پجاری قربان گاہ کے گرد تین بار مقدس پانی چھڑکتے تھے۔ ان کا معبود بھی تین ارکان سے مرکب تھا۔ پھر وہ قربان گاہ کے گرد جمع ہونے والوں پر تین بار پانی چھڑکتے۔ انگیٹھی سے بخور کو پکڑتا ہوتا تو تین انگلیوں سے پکڑتے۔ یہ سب تثلیث کے پیشِ نظر تھا۔ اور ان کا اعتقاد تھا کہ بزرگوں اور دانا ؤں کے قول کے مطابق ہر مقدس چیز کو مثلث ہونا چاہیئے یہی وجہ ہے کہ یونانی بت پرست اپنے تمام دینی مراسم و اعمال

Marfat.com

میں تین کے عدد کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ جب شاہ قسطنطین نے عیسائیت کو قبول کیا تو عیسائیوں نے ان تمام یونانی خرافات در رسوم تثلیث کو اپنا لیا۔ تورات جو مسیحؑ کی شریعت تھی اسے انہوں نے منسوخ کر دیا اور ان تمام چیزوں کو مسیحؑ سے منسوب کر کے اس پر بھی ظلم کیا۔

اب خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نصرانی دین کی اصل بنیاد تو خالص توحید پر تھی، مگر کاہنوں اور پجاریوں نے اس کا رخ شرک و بت پرستی کی جانب موڑ دیا۔ اور تثلیث کا عقیدہ اس نئی عیسائیت میں یونان اور روم کی راہ سے داخل ہوا یونانیوں اور رومیوں نے یہ غلط اور باطل خرافات مصری اور ہندی بت پرستوں سے لی تھی۔ تثلیث کو جب عیسائیت میں داخل کیا گیا تو اصل بنیاد تو وہی تھی مگر کچھ مظاہر، نام، رسوم و اعمال اور عقائد تبدیل کر لئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان ظالموں نے خدائی شریعت کو یکسر منسوخ کر دیا اور اس کے بدلے ایسی بدعات اور اندھی مقلدانہ رسمیں اپنا لیں جنکا خدائی شریعت سے کوئی میل ہی نہ تھا۔ اصل عیسائی دیانت تو زہد و تواضع کا مذہب تھا اس کو طمع، لوٹ کھسوٹ، تکبر، ریاکاری اور بندوں کو غلام بنانے کا دین بنا ڈالا۔ اس محرف دین کو انہوں نے مسیحؑ کی طرف منسوب کر دیا حالاں کہ مسیحؑ کی طرف سے اس سلسلے میں ان کے پاس کوئی دلیل اور ہدایت نام کو بھی نہیں ہے۔ اگر ان کے ہاں صرف عیسیٰؑ کا وہی قول ہوتا جسے یوحنا نے اپنی انجیل میں روایت کیا ہے کہ ”یہی ہمیشہ کی زندگی ہے کہ وہ تجھے ہی حقیقی معبود جانیں اور یسوع مسیحؑ کو پہچانیں جسے تو نے بھیجا ہے“ تو ان کی بصیرت کے لئے کافی تھا۔ کیوں کہ اس میں توحید و رسالت کا صراحتہً اعلان ہے۔

اور مرقس نے اپنی انجیل کے بارہویں باب میں کہا کہ: ایک فقیہ نے یسوع سے پوچھا کہ سب حکموں میں پہلا حکم کون سا ہے؟ تو یسوع نے جواب دیا کہ پہلا حکم یہ ہے کہ سُن لے اسرائیل! رب ہمارا معبود ایک ہی رب ہے الخ فقیہ نے جواب دیا کہ بہت اچھا، اے استاد! تو نے برحق جواب دیا ہے کیوں کہ خدا ایک ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ جب یسوعؑ نے دیکھا کہ اس نے عقل سے جواب دیا ہے تو کہا کہ: تو خدا کی بادشاہت سے دور نہیں ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ توحید خالص ہی وہ مقبول عقیدہ ہے جو انجیل کی عبارت سے بلا دلیل ثابت ہوتا ہے۔

وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ: اس آیت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ پیدائش اور افعال کے لحاظ سے فرشتے مسیحؑ سے عظیم تر ہیں۔ ان میں سے ایک روح القدسؑ بھی ہے جس کی پھونک سے مسیحؑ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اسی لئے بہت سے علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مقرب فرشتے انبیاء سے افضل ہیں کیوں کہ آیت کا یہ اقتباس نصاریٰ کے غلو کے رد میں اور مسیحؑ کو معبود بنانے کے رد میں ہے۔

اور اسے عبودیت کے مقام سے اٹھا کر معبودیت تک پہنچا دینے کے رد میں ہے۔ اس نصاریٰ کا رد اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ترقی بلند تر کی طرف ہو۔ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ فلاں

Marfat.com

شخص امیر المومنین کے ہاتھ چومنے بلکہ وزیر کا ہاتھ چومنے سے بھی عار نہیں رکھتا، تو یہ بات لغو ہوگی کیوں کہ امیر کے ذکر کے بعد وزیر کا ذکر بے کار ہے۔ وزیر تو امیر کے تابع ہے لہٰذا اگر یوں کہا جائے تو کلام درست ہوگا کہ "فلاں شخص وزیر کا بلکہ امیر المومنین کا ہاتھ چومنے سے بھی گریز کرتا ہے"۔

دوسرے علماء کہتے ہیں۔ کہ اس آیت سے ملائکہ مقربین کی انبیاء پر فضیلت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ اس آیت میں لفظ ملائکہ کی خلقت کے عظیم ہونے اور اعمال عظیم پر انہیں قدرت ہونے کا بیان ہے۔ اور نصاریٰ کے رد میں یہی چیز مناسب تھی کیوں کہ انہوں نے مسیحؑ کے بلا باپ پیدا ہونے اور بعض معجزات کے ان سے صادر ہونے کو دیکھ کر انہیں خدا بنا ڈالا تھا۔ اس لئے دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ ملائکہ کی طرف تو دیکھو جو ماں باپ کے بغیر پیدا ہوئے ہیں اور وہ کام ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ جو مسیحؑ سے بھی نہیں ہو سکتے۔ سو کیا انہیں بھی خدا یا معاذ اللہ اس سے بھی بڑا مان لوگے!

کچھ بھی ہو ہمارے خیال میں یہ بحث ہی بے کار ہے۔ اور ملائکہ اور انبیاء کا باہم مقابلہ کرنا محض اٹکل پچو اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے، عقیدہ صرف نص سے ثابت ہوتا ہے اور اس باب میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔ نہ ایمان یا عمل میں اس بحث سے کچھ فائدہ ہے۔

لہ دعوت اسلامی کی ابتداء کے وقت جس طرح ابراہیمی دین میں انحراف کے ذریعہ سے مشرکانہ اور بت پرستانہ عقائد و اعمال اور رسوم و تصورات راہ پا چکے تھے، بعینہٖ اسی طرح اہلِ کتاب میں مشرکانہ عقائد و اعمال گھس چکے تھے۔ چنانچہ اسلام نے شدید جدوجہد سے ان بت پرستانہ عقائد و تصورات کو باطل ثابت کیا اور اصل توحید خالص نظریہ واضح کیا۔ اس نے ارسطو کے قبل از مسیحؑ کے فلسفے اور افلاطون کے بعد از مسیحؑ کے فلسفے پر بھرپور نظر ڈالی اور بتایا کہ ان میں کہاں کہاں شرک اور بت پرستی کا عمل دخل ہے۔

عیسائی لوگ باوجود اختلافِ مذاہب کے بالعموم عقیدۂ تثلیث پر متفق تھے، یعنی ان کے نزدیک ایک خدا تین ارکان (اقانیم) میں تقسیم تھا۔ ان ارکان کا دوسرا رکن مسیحؑ ابن کہلاتا تھا۔ پھر عیسائی فرقوں میں یہ اختلاف ہے کہ کیا مسیحؑ میں بیک وقت لاہوتی اور ناسوتی دو فطرتیں پائی جاتی ہیں یا صرف ایک طبیعت پھر وہ ایک طبیعت ناسوتی ہے یا کچھ اور پھر جنہوں نے دو فطرتوں کا عقیدہ رکھا ہے ان میں یہ اختلاف ہوا کہ ان دو طبیعتوں کے باوجود کیا مسیحؑ کی مشیت ایک ہے یا زیادہ؟ اور کیا وہ باپ کی طرح قدیم ہے یا مخلوق ہے؟ ان اختلافات نے بڑا طول کھینچا اور مختلف فرقوں میں شدید خانہ جنگی اور عذاب و عقاب اور ظلم و ستم کا باعث بنتے رہے۔ (اس کی کچھ تفصیل ہم نے سورۃ المائدہ کی تفسیر میں بیان کر دی ہے وہاں ملاحظہ کی جائے۔ از مؤلف)

لہ فی ظلال القرآن ج ۲ صفحہ ۴۰، ۴۱۔

Marfat.com

نصرانی عقیدے پر جو مختلف ادوار وادوار گزرے ہیں ان کا تاریخی تتبع اور تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت ثابت و روشن ہو جاتی ہے کہ عقیدہ تثلیث، عقیدہ ابنیت مسیحؑ، اور اسی طرح اس کی ماں مریمؑ کی الوہیت کا عقیدہ اور مختلف قسم کی تثلیثوں میں اس کے داخل ہونے کا عقیدہ وغیرہ پہلی عیسائیت کے اجزاء ہرگز نہ تھے۔ بلکہ یہ بعد میں مشرک قوموں کے اذہان، میل جول اور ان کے عیسائیت میں اپنے قدیم عقائد سمیت آ داخل ہونے سے پیدا ہوئے تھے۔ اغلب یہی ہے کہ تثلیث کا مسئلہ قدیم مصری مشرک مذاہب سے ماخوذ ہے۔ قدیم مصری تثلیث کے تین مشہور عناصر (اقانیم) تھے: اوزورکیس، ریزکیس اور حورکیس۔

تثلیث کے منکر عیسائیوں نے اس کے قائلین کے ہاتھوں ہر دور میں ——— بالخصوص دوسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک ——— رومن بطریقوں اور ملوکانی سلطنت کے قائم کردہ علمی مجالس و مباحث کے ہاتھوں شدید تکالیف اور عذاب برداشت کئے۔ انہیں قتل، نہب اور جلا وطنی اور قید کی مہیب منزلوں سے گزرنا پڑا لیکن بہرحال یہ مخالفت جاری ہی رہی۔

تثلیث کا عقیدہ ہمیشہ سے علمند عیسائیوں کے دل میں کھٹکتا اور ان کی عقول سے ٹکراتا رہا ہے۔ کلیسا کے کارپرداز اسی خلاف عقل و نقل عقیدے کو مقبول بنانے، یا کم از کم اس کے اندر ملی تضادات کو رفع کرنے کی شدید کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایسے ایسے چیستان اور گورکھ دھندے ایجاد ہوئے ہیں جو دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تثلیث کے حل کی ہر کوشش ایک نئی پیچیدگی پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

پادری پیٹر نے جو عیسائی عقائد کے نظارجین میں سے ایک ہے، اپنے رسالہ "اصول و فروع" میں اعتراف کیا ہے کہ ہم نے پہلی اپنی عقل و ہمت کے بقدر عقیدہ تثلیث کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور امید ہے کہ مستقبل میں اسے زیادہ صفائی سے سمجھ سکیں گے۔ جبکہ ہم سے ساری ارضی و سماوی کائنات کے پردے دور ہو جائیں گے" گویا پادری صاحب کے نزدیک یہ عقیدہ اتنا پیچیدہ اور نامعقول ہے کہ اس کی اصل حقیقت اس دنیا میں معلوم نہیں ہو سکتی! افسوس اتنی غیر معقول اور غیر فطرتی چیز پر ایک عظیم مذہب کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اس میں داخل ہونے والے تعلیم کی دلچسپی سے نہیں بلکہ "دوسری مادی و شہوانی دلچسپیوں" کے باعث داخل ہوتے ہیں۔ اور اب تو یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ موجودہ دور کی عیسائیت مغربی تہذیب اور مغربی امپریلزم کا ایجنٹ اور اس کا دُم چھلّا بن کر رہ گئی ہے اس کے بے شمار دلائل و شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں۔ (مؤلف)

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

اے لوگو! تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے رب کی طرف سے سند

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (۱۷۴)

اور اتاری ہم نے تم پر روشنی واضح

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ

سو جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کو مضبوط پکڑا تو ان کو

فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّ

داخل کرے گا اپنی رحمت میں اور فضل میں اور

يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ؕ

پہنچا دے گا ان کو اپنی طرف سیدھے راستے پر

شرح الفاظ

بُرْهَانٌ: کھلی اور واضح دلیل جس کا انکار متعصب اور ہٹ دھرم انسانوں کے سوا کوئی اور نہ کر سکے۔ اس آیت میں برہان سے مراد پیغمبر آخر الزمان کی ذات والا صفات ہے جو بحیثیت آفتاب آمد دلیل آفتاب کا مصداق ہیں۔

نُوْرًا مُّبِيْنًا: واضح روشنی اس سے مراد یہاں قرآن پاک ہے جو روشنی کا مینار اور ہدایت کا منبع ہے۔

وَاعْتَصَمُوْا مضبوط تھام لیا، اچھی طرح پکڑ لیا۔

خلاصۂ مطلب

لہ مشرکوں، یہود و نصاریٰ اور منافقین سے گفتگو کر چکنے اور ان پر حجت تمام کر چکنے کے بعد اب اس

لہ تفسیر الراغی ج ۶ صفحہ ۳۶،

Marfat.com

سورۃ کے اختتام پر ساری کائناتِ انسانی کو محمد رسول ؐ کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت پیش کی جاتی ہے۔ اس نبوت کی صداقت اظہر من الشمس اور ہر قسم کے دلائل سے موید و مزین ہے۔

[1] پہلے سے وحی الٰہی اور بالخصوص قرآن پاک کی عظمت و حقانیت کا بیان اور اس کی متابعت اور اتباع کی تاکیدات کا ذکر تھا۔ جس کے قائل نصاریٰ تھے۔ اس کی تردید و ابطال کے بعد اب اخیر میں پھر اسی اصلی اور ضروری بات کی سب کو تاکید فرمائی جاتی ہے کہ لے لوگو! تمہارے پاس رب العالمین کی طرف سے حجت کاملہ اور روشن نور پہنچ چکا ہے جو ہدایت کے لیے کافی و وافی ہے یعنی قرآن پاک۔ اب کسی تامل اور تردد کی گنجائش نہیں۔ سو جو کوئی اللہ پر ایمان لائے گا وہ اللہ کی رحمت اور فضل میں داخل ہوگا۔ اور براہِ راست اس تک پہنچے گا۔ اور جو اس کے خلاف کرے گا اس کی گمراہی اور خرابی اسی سے سمجھ لیجئے۔

[2] برہان سے مراد رسول اللہ کی ذات اقدس ہے جن کی سیرتِ پاک اور تعلیم کی جامعیت نے ہر مشکل کو آسان اور ہر پتھر کو پانی کر دیا ہے (ابن عباسؓ، قرطبیؒ، بحر) اور یا یہا الناس کا خطاب ساری کائناتِ انسانی اور جملہ اہل مذاہب سے ہے (ابن جریرؒ، روح المعانی، ابن کثیرؒ)

نوراً مبیناً۔ اس سے مراد اس آیت میں قرآن پاک ہے جس کے اندر بڑے اور چھوٹے، انفرادی اور اجتماعی سارے مسائل کا حل موجود ہے (ابن عباسؓ، قرطبی، روح المعانی۔

[3] جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات اللہ کی طرف سے ایک کھلا برہان اور روشن دلیل ہے۔ آپؐ لوگوں پر ایمان کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں، تمام معاملات میں رہنمائی کرتے ہیں ——— اور دلائل و بینات سے آپؐ کی تائید کی گئی ہے۔ آپؐ اپنی عملی سیرت سے اپنی لائی ہوئی تعلیم پر حق کی گواہی اور صادق دلیل ہیں۔ آپؐ نے جو قوانین شرع پیش کئے وہ آپؐ کی صداقت و حقانیت کی کھلی دلیل ہیں۔ غور فرمائیے کہ ایک امی جس نے کسی درس گاہ میں تعلیم نہ پائی بچپن اور جوانی میں ان چیزوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی جو آپؐ کی قوم اور ماحول میں "علم" کہلاتی تھیں مثلاً شعر، انساب کا علم اور ایامِ عرب کی تاریخ بلکہ آپؐ نے مشرک بچوں سے خلا ملا بھی نہ کیا۔ اپنی قوم کے قصہ گوؤں کی محفلوں میں تشریف نہ لے گئے اور لوگوں کے لہو و لعب میں شامل نہ ہوئے۔ آپؐ نے معاشرتی و منزلی تربیت کبھی حاصل نہیں کی نہ کبھی اجتماعی تادیب سے کوئی حصہ پایا۔ ایسی کوئی تیاری بچپن اور جوانی میں نہ کی جو آپؐ کو اس ذمہ داری کے اٹھانے کے قابل بنا سکتی جسے آپؐ نے سن کہولت میں اٹھایا۔ کوئی دینی، اجتماعی سیاسی اور جنگی تربیت حاصل نہ کی۔ اس سب کچھ کے باوجود کائنات کی ہر لحاظ سے رہنمائی کے لیے اکملے اور بہترین طریقہ سے اس کا حق ادا کر دیا، کامل و اتم قوانین و ضوابط پیش

---

[1] فوائد القرآن ص ۱۳۶ [2] تفسیر ماجدی ص ۲۲۴

[2] تفسیر المراغی ج ۶ صفحہ ۳۶، ۳۷، تفسیر المنار ج ۶ ۹۸، ۱۰۳۔

Marfat.com

کر دیئے اور ان پر عمل کر کے بھی ثابت کر دیا کہ یہ عملی ہیں۔ پس آپؐ کی اپنی ذات، زندگی، تسلیم و تلقین اور اعمال و افعال خود اس بات کی واضح اور صریح دلیل ہیں کہ آپؐ پر وحی نازل ہوئی تھی اور جو کچھ آپؐ نے پیش کیا۔ وہ خدا کی طرف سے پیش کیا۔

قرآن نورِ مبین ہے، ہر وہ چیز جو اس کا مقصد نزول ہے اسے اُس نے کھول کر بیان کر دیا ہے مثلاً خدا کی توحید و ربوبیت، اور تمام انبیاء کی بعثت کا سب سے بڑا اور اعلیٰ مقصد یہی رہا ہے۔ لوگوں نے پیغمبروں سے اس حقیقت کو اپنی استعداد کے مطابق سیکھا لیکن بعد میں مشرکانہ رسوم اور بت پرستانہ عقائد و تصورات ملا دیئے۔ جب تمام مشہور مذاہب میں بُت پرستی گھس گئی اور ان کی تعلیمات کو بگاڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نورِ مبین بنا کر نازل فرمایا۔ اس نے دلائل توحید کو ہر ممکن اسلوب اور طرز ادا سے پیش فرمایا، کائناتی، عقلی اور نفسی دلائل پیش کر کے توحید کی حقیقت واضح کی اور اسے ضرب الامثال اور مختلف واقعات و قصص کے ضمن میں پیش کیا۔ گمراہوں کے زنگ آلود دلوں کو صاف کیا گمراہ کرنے والوں کے شکوک و شبہات کو دور کیا۔

قرآن نے توحید الٰہی کو ثابت کرنے اور شرک و صنم پرستی کی جڑیں کھود دینے کے لئے جو طرزِ بیان پیش کیا ہے ایسا کسی نبی، کسی فلسفی اور حکیم نے نہیں کیا۔ اس لئے واجب ہوا کہ اسے خدائے برحق کی طرف سے مانا جائے۔ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝

قرآن کی عبارت اور مضامین، نظم و ترتیبِ الفاظ و معانی ہر چیز اس بات پر گواہ ہے کہ یہ محمد رسولؐ اللہ جیسے اُمّی کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ قرآن نے دنیوی سعادت اور اُخروی کامیابی کے جو اصول و ضوابط اور احکام و اوامر پیش کئے ہیں یہ کسی بھی انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی لئے اسے پیش کرنے والا برہان ہے اور خود قرآن نورِ مبین ہے۔

[1] قرآن میں ربانی صنعت کا چھاپ اتنا واضح ہے کہ وہ اسے انسانی صنعت اور انسانی کلام سے بالکل جدا کر دیتا ہے۔ اس میں اس کے حروف و الفاظ اور عبارات و معانی سب برابر ہیں۔ یہ ایک ایسا واضح قضیہ ہے کہ اسے بعض دفعہ عربی زبان کا ایک حرف تک نہ سمجھنے والے بھی عجیب انداز میں اس حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم بحیرۂ اطلانٹک میں نیویارک کی طرف جاتے ہوئے دخانی جہاز پر سوار تھے۔ جمعہ کے دن ہم نے نماز جمعہ قائم کی، نماز میں شامل ہونے والے چھ تو عربی مسافر تھے جو مختلف عربی ممالک کے باشندے تھے اور بہت سے جہاز کے عملہ کے لوگ تھے جو نو کی تھے۔ میں نے خطبہ جمعہ پڑھا اور اس

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ صفحہ ۵، ۵۲۔

Marfat.com

میں بہت سی قرآنی آیات پڑھیں۔ اس وقت جہاز کے بہت سے مسافر اور ملازم ہمارے گرد حلقہ باندھے غور سے دیکھ رہے تھے۔

اسلامی طریقِ عبادت ——— نماز ——— کا اثر ملاحظہ کیجئے کہ نماز ختم ہونے کے بعد یوگوسلاویہ کی ایک لیڈی ہمارے پاس آئی، وہ یوگوسلاویہ سے بھاگ کر امریکہ کی ولایاتِ متحدہ کو جا رہی تھی۔ وہ آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو کوشش کے باوجود رک نہ سکے۔ اور اس کی آواز میں لکنت تھی۔ اس نے ہمیں ٹوٹی پھوٹی انگریزی زبان میں کہا کہ تمہاری نماز کو دیکھ کر میں اس تاثیر کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتی جو مجھ میں پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن میں عربی کے ایک حرف سے بھی واقف نہیں ہوں، اس کے باوجود میں محسوس کرتی ہوں کہ اس میں ایسی موسیقی کی تاثیر ہے جو میں نے کسی اور زبان میں نہیں دیکھی پھر جو کچھ خطبہ دینے والے نے کہا ہے اس میں چند فقرات تو ایسے تھے جن کے اثر کو واضح کرنے کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔

میں نے جان لیا کہ وہ فقرات جن کا اس عورت پہ ایک خاص اثر ہوا تھا وہ قرآنی آیات تھیں جو میں نے اپنے خطبے میں پڑھی تھیں۔ واقعی قرآن کا ایک خاص تسلط ہے جو غیر محسوس طور پر سننے والوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہر سننے والے کا ایسا ہی حال ہوتا ہے، مگر ایسا ہونا ضرور ہے اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ وہ لوگ جو عربی زبان کو جانتے ہیں اور اس کے اسالیب بیان کو جانتے ہیں، ان پر تو قرآنِ پاک کا بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ وہ چاہے معاند دشمن ہی کیوں نہیں نہ ہوں۔ اور چاہے اس کتاب پاک کو چھپ کر ہی کیوں نہ سُنیں۔ اس کے اثر و تسلط سے بچ نہیں سکتے۔

حضورؐ کے زمانہ مبارک میں اخنس بن شُریق، ابوسفیان بن حرب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) نے حسب بیان سیرت ابن ہشام چھپ کر سُنا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے پوشیدہ رہ کر سُن رہا تھا رات بھر سنتے رہے اور فجر کے قریب واپس گئے۔ راستے میں ایک دوسرے سے ملے اور باہم ملامت کرنے لگے۔ کہ اگر عوام اور احمق لوگ دیکھ پائیں گے تو کیا کہیں گے؟ لیکن دوسری رات کو پھر حضورؐ کے مکان کے قریب چھپ کر سنتے رہے تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ پھر انہوں نے باہم عہد کیا کہ آئندہ ایسا ہرگز نہ کریں گے۔

یہ قرآن کی حیرت انگیز تاثیر و تسلط کا ایک واقعہ ہے۔ ایسے بہت سے واقعات ہر زمانے میں پیش آئے ہیں اور اب بھی آتے رہتے ہیں۔ یہ تو قرآن کی عبادت کا اثر ہے۔ رہے اس کے مضامین و معانی، سو انہوں نے تو عرب جیسی جاہل اور اُجڈ قوم کو جب اس نے اسے اپنایا تو دنیا کا امام و پیشوا بنا دیا تھا۔ یہی وہ چیز ہے جسے ان آیات "اعتصام" بالقرآن" فرمایا گیا ہے۔

Marfat.com

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ

حکم پوچھتے ہیں تجھ سے، سو کہہ دے اللہ حکم بتاتا ہے تم کو کلالہ کا

اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ

اگر کوئی مرد مرگیا اور اس کی اولاد نہیں اور اس کی

اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ

ایک بہن ہے تو اس کو پہنچے آدھا اس کا جو چھوڑ مرا اور وہ بھائی

اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ

وارث ہے اس بہن کا اگر نہ ہو اس کی اولاد پھر اگر دو بہنیں ہوں

فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ

تو ان کو پہنچے دو تہائی اس مال کا جو چھوڑ مرا۔ اور اگر کئی

كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً

شخص ہوں اسی رشتہ کے کچھ مرد اور کچھ عورتیں

فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ

تو ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۷۶

بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے

ع ۲۴ ۴

شرح الفاظ

الکلالہ جس کے اولاد اور والدین نہ ہوں، ایسے شخص کے وارث کو بھی

Marfat.com

کلالہ کو ہمارے ہاں کا دلد کہتے ہیں. مگر یہ لفظ کلالہ کے پورے مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا. جیسا کہ ظاہر و واضح ہے.

خلاصہ آیت

اِس سُورت کی ابتدا بھی اموال و جائیداد کی وراثت کے احکام سے ہوئی تھی. اب اختتام بھی اسی پر ہوتا ہے کہ اوّل و آخر ایک جیسے ہو جائیں. سُورت کا وسطی حِصّہ دین کے مخالفوں یہود و نصاریٰ مشرکین اور منافقین سے بحث و مناظرہ پر مشتمل ہے.

امام احمدؒ بخاریؒ مسلمؒ اور دیگر اصحاب سُنن نے حضرت جابر بنؓ عبداللہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں بیمار اور بے ہوش تھا جب رسولؐ خدا میرے گھر تشریف لائے. آپؐ نے وضو فرمایا تو مجھ پر پانی کے چھینٹے ڈالے تو میں ہوش میں آگیا. میں نے حضورؐ سے گذارش کی کہ اگر میں فوت ہو جاؤں تو میرے سوائے کلالہ کے کوئی نہ ہوں گے، تو میری میراث کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ اِس پر یہ آیت نازل ہوئی.

امام عبدالرزاقؒ اور ابن جریر طبریؒ نے حضرت ابن سیرینؒ سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریمؐ سفر میں تھے اور حذیفہ بنؓ الیمان آپؐ کے پہلو میں چل رہے تھے. حضورؐ نے یہ آیت حذیفہؓ کو پہنچائی اور انہوں نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کو پہنچا دی جو ان کے پیچھے جا رہے تھے. جب حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حذیفہؓ سے اِس آیت کی تفسیر پوچھی. حذیفہؓ نے جواب دیا کہ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ امیر المومنین ہونے کی وجہ سے میں آپکو کوئی ایسی بات بتاؤں گا. جو اس دن (نزولِ آیت) کے دن نہ بتائی تھی تو آپ یقیناً ایسی بات کے سُننے سے عاجز رہیں گے (یعنی جو کچھ میں اس دن بتا چکا ہوں وہی جانتا ہوں اور کچھ نہیں! مولف) اِس پر جناب عمرؓ نے فرمایا خدا تم پر رحم کرے، میرا یہ ارادہ نہیں تھا.

مشہور محدّث امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کلالہ کے بارے میں دو آیتیں نازل فرمائی ہیں. ایک تو موسم سرما میں اور وہ سورۂ نساء کے اوّل میں ہے (آیت ۱۲) اور اس میں اجمال و ابہام ہے. ظاہری الفاظ سے معنی و مطلوب واضح ہونا مشکل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے موسم گرما میں ایک اور آیت اُتاری (یعنی زیرِ تفسیر آیت) جو سورۂ نساء کی آخری آیت ہے. اِس میں زیادہ بیان ہے اور پہلی آیت کے اجمال کی شرح ہے. سوال کرنے والے نے پہلی آیت کے ابہام کی وجہ سے پوچھا تھا پس اللہ پاک نے کلالہ کا حکم اس آیت (۱۷۶) میں کھول کر بتا دیا ہے.

کلالہ کا معنی ہے کمزور ضعیف. یہاں وُہ شخص مراد ہے جس کے وارثوں میں باپ اور اولاد میں سے کوئی نہ ہو. جیسا کہ پہلے بیان ہوا. کیوں اصلی وارث والد اور ولد ہی ہیں. جس کے یہ ہیں تو اس کے حقیقی بھائی بہن کو بیٹا بیٹی کا حکم ہے اور اگر حقیقی نہ ہوں تو یہی حکم سوتیلوں کا ہے. جو کہ باپ میں شریک ہوں. ایک بہن ہو تو آدھا اور دو بہنیں

Marfat.com

ہوں تو دو تہائی اور اگر بہن بھائی دونوں ہیں تو مرد کو دوہرا حصہ اور عورت کو اکہرا حصہ ملے گا۔ اور اگر فقط بھائی ہوں بہن کوئی نہ تو وہ بہن کے مال کا وارث ہوں گے۔ یعنی اُن کا کچھ حصہ معیّن نہیں کیونکہ وہ عصبہ ہیں جیسا کہ آیت میں آگے یہ سب سورتیں مذکور ہے۔ اب باقی رہ گئے وہ بھائی بہن جو صرف مال میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں۔ سو ان کا حکم شروع آیت میں فرما دیا گیا ان کا حصہ معیّن ہے (یعنی ایک ہی ہو چاہے بہن، چاہے بھائی ہو تو اس کا حصہ ۱/۶ ہے، اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب ۱/۳ میں شریک ہیں۔ آیت ۱۲)

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی کوئی غرض اِن احکام سے وابستہ نہیں۔ محض اپنے فضل و کرم اور رحمت سے بندوں کے لئے احکام بیان فرما دیئے ہیں۔ اب وہ اگر ان کو مانیں گے تو راہِ راست پر ورنہ گمراہ ٹھہریں گے۔ اِس سے یہ بھی حکم نکل آیا کہ مسائل دینیہ میں سے جو معلوم نہ ہوں انہیں دریافت کر لینا چاہیے۔ اِس سے صحابہؓ نے جو کلالہ کے بارے میں دریافت کیا تھا اس کی تحسین ہو گئی اور آئندہ اِس قسم کے سوالات کی ترغیب سمجھ میں آگئی۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ یعنی احکام کی مصلحت و حکمت اسی کو معلوم ہے۔

بندے کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کلالہ کے اور دوسرے لوگوں کو جو حصے مقرر کر کے دیئے گئے۔ ان کی مقداروں کی کیا وجہ ہے؟ پس احکامِ دین میں صرف وحی پر انحصار کرنا واجب ہے۔ محض اپنی عقل کے بھروسے پر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں وحی کے خلاف جرأت کرنا بڑی حماقت اور گستاخی ہے۔ جبکہ آدمی معاملات میں بھی وحی کا محتاج ہے۔ تو جو امور عالمِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو سراسر محتاج ہوگا۔ اوپر کی آیت میں ایک طرف تو اہلِ کتاب کے کفر و شرک اور نافرمانی کا ذکر تھا۔ دوسری طرف فاما الذین امنوا واعتصموا بہ الخ میں اصحاب رسول اللہ کی فرمانبرداری اور حقانیت بطریق مقابلہ خوب سمجھ میں آجاتی ہے۔ اِس ضمن میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایک طرف تو اہل کتاب کی گمراہی تھی کہ انہوں نے کفر و شرک اور تثلیث و انبیت جیسے مسائل از خود گھڑ لئے تھے اور روح الٰہی کا خم ٹھونک کر مقابلہ کیا تھا۔ مگر دوسری طرف اصحابِ رسول کی فرمانبرداری کا یہ عالم ہے کہ اصولی مسائل میں تحریف و انحراف تو الگ رہا۔ جزوی معاملاتِ میراث و نکاح وغیرہ میں بھی وحی خداوندی اور منتظر رہتے ہیں۔

ہر امر میں رسولِ خدا کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور اپنی عقل کو حاکم اور خواہش کو غالب نہیں بناتے۔ ایک دفعہ اگر تشفی نہ ہو تو دوسری مرتبہ حاضرِ خدمت ہو کر دریافت کرتے ہیں۔

ع بلبلیں رفعت را از کجا است بہ کجا!

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بھی بلا حکم وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے۔ اگر حکمِ وحی موجود نہ ہوتا تو اس کا انتظار فرماتے تھے۔ اور جب وحی

Marfat.com

آتی تب حکم فرماتے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ ذات پاک وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ چنانچہ متعدد آیات میں اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ وغیرہ صاف مذکور ہے۔ باقی جو ہیں وہ سب واسطہ ہیں۔ اور دل کو حکم الٰہی پہنچانے کا البتہ اتنا فرق ہے کہ کوئی واسطہ اتنا قریب ہے کوئی بعید ہے۔ جیسے حکمِ سلطانی کو پہنچانے کے لئے وزیرِ اعظم اور دیگر مقربین شاہی اور حکام ادنیٰ و اعلیٰ درجہ بدرجہ سب واسطہ ہوتے ہیں۔ پھر اِس سے زیادہ گمراہی کیا ہوگی کہ کس امر میں وحی الٰہی کے مقابلہ میں کوئی گمراہ کسی کی بات سنے اور اِس پر عمل کرے ۔

آنانکہ زردئے تو بجائے نگرانند
کوتہ نظرانند چہ کلانہ نظرانند

نیز یہ بھی اشارہ ہے کہ ایک ہی دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہل کتاب درخواست کرلئے تھے، وہ خوبی نہیں کہ جو حسب حاجت اور حسب موقع متفرق نازل ہونے میں ہے کیونکہ ہر کوئی اپنی ضرورت کے موافق اِس صورت میں سوال کرسکتا ہے اور بذریعۂ قرآن اِس کو جواب مل سکتا ہے۔ جیسا کہ اِس موقع پر اور قرآن پاک کے بہت سے مواقع پر موجود ہے۔ اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بار بار اللہ تعالیٰ کے خطاب کے شرف و عزت کو مشتمل ہے جو صرف اسی امت کو حاصل ہوا۔

جس صحابی کی بھلائی میں یا اِس کے سوال کے جواب میں کوئی آیت نازل ہوئی وہ اِس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے۔ اور اختلاف کے موقع میں جس کی رائے یا جس کے قول کے موافق قرآن اترا قیامت تک اِس کی خوبی اور نیک نامی باقی رہے گی۔

سو کلالہ کے متعلق سوال و جواب کا ذکر فرما کر اِس طرح کے بالعموم سوالات اور جوابات کی طرف اشارہ فرمادیا اور شاید اسی اشارہ کی غرض سے سوال کو مطلق رکھا۔ اور مسئول عنہ کو سوال کے ساتھ ذکر نہ فرمایا بلکہ جواب میں اِس کی تصریح فرمائی جس کی دوسری نظیر قرآن شریف میں نہیں اور نیز جواب کو بالتصریح حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمادیا۔ کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے (جس کی وجہ یہ ہے کہ لغوی لحاظ سے تو اِس کا معنیٰ ہے ضعیف، جو دوسرے پر بوجھ ہو اور عاجز، لیکن قرآن نے اِسے ایک قانونی اصطلاح کے طور پر استعمال فرمایا ہے۔ مؤلف) عامۂ فقہا کے نزدیک ابوبکر صدیق رضؓ کا بیان کردہ معنی درست ہے۔ یعنی وہ شخص کلالہ ہے کہ اِس کی موت کے وقت اِس کے والدین، دادا اور اولاد میں سے کوئی نہ ہو۔ خود قرآن کے طرز بیان سے اِس معنی کی تائید ہوتی ہے۔

کیونکہ اِس نے یہاں کلالہ کی بہن کو نصف ترکہ کا وارث ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ اگر اِس کو باپ زندہ ہوتا تو بہن کو سرے سے ہی کچھ نہیں ملتا۔ پس کلالہ صرف لاولد کو نہ کہیں گے۔

اِس آیت میں کلالہ کی میراث کے سلسلے میں جن بہن بھائیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ حقیقی یا باپ شریک ہیں۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔

Marfat.com

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک دفعہ خطبہ میں اس کی تصریح کی تھی اور کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ صرف مال شریک یعنی اخیافی بہن بھائیوں کی میراث کلالہ کا ذکر اوپر آیت ۱۲ میں گزر چکا ہے۔ مولف)

حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ سورتوں میں سب سے آخری سورت برأۃ ہے اور آیتوں میں سے سب سے پچھلی آیت یَسْتَفْتُوْنَکَ الخ اُتری ہے (اس کا مطلب یہ ہوا کہ احکام کی آیتوں میں سے آخری آیت یہ ہے ورنہ کئی دلائل سے ثابت ہے کہ مطلقاً آخری آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ہے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس آیت کے نزول تک سورۂ نساء ایک علیحدہ اور مکمل سورت سمجھی جاتی تھی۔ اور اس آیت کے نزول پر حضورؐ نے اس آیت کو آخری آیت کے طور پر اس میں ملانے کا حکم دیا واللہ علم مولف)۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق تین مسائل کو تشریح طلب سمجھتے تھے۔ دادا کی میراث کلالہ کی تعریف اور سود کے بعض احکام انہوں نے کئی مرتبہ اس بارے میں حضورؐ سے دریافت بھی کیا تھا۔ حضورؐ نے انہیں اس آیت پر غور کرنے کا حکم دیا تھا۔ حافظ ابن جریر طبریؒ نے روایت کی ہے کہ آیت کلالہ بھی حضرت عمر فاروقؓ کے سوال پر اُتری تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے خطبے میں تصریح کر دی تھی۔ کہ سورۂ النساء کی آیت ۱۲ میں کلالہ کی میراث کے سلسلے میں صرف اخیافی بھائی بہنوں کا حکم مذکور ہے اور آخری آیت میں کلالہ کے حقیقی اور علّی (باپ شریک) بہن بھائیوں کی میراث کا بیان ہے اس آیت میں بہنوں کا ⅔ حصہ فرما دیا گیا ہے۔

دو سے زیادہ بہنوں کا بھی یہی حکم ہے۔ کلالہ کی آیت کی اس تفسیر میں جو اوپر بیان ہوئی جمہور صحابہؓ تابعین اور ساتوں فقہائے مدینہ اور چاروں آئمہ فقہ کا کوئی اختلاف نہیں ہے (۱۲) سورۂ نساء خاندانی زندگی کے احکام اور افرادِ خاندان کے باہمی اجتماعی تکافل سے شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسمیں اسلامی اجتماعی تنظیمات کا بیان ہوا۔ اور آخر میں کلالہ کے احکام کی تکمیل فرما دی گئی۔

کلالہ کے بعض احکام آیات میراث میں آ چکے ہیں۔ باقی ماندہ احکام اس آیت میں بیان فرما کر واللہ بکل شیٔ علیم پر سورت کو ختم فرما دیا گیا۔ قرآن ایک ایسا صحیفہ ہے۔ جو میراث اور غیر میراث کے احکام کا جامع اور کامل و شامل ہے۔ اس میں خاندانی تعلقات جماعتی زندگی کے احکام و ضوابط اور دیگر قوانین کا بیان ہے۔ اب یا خدا کے حکم کا اتباع ہے۔ جو ہدایت کا راستہ ہے اور یا اس سے انحراف کا راستہ ہے جو سراسر ضلالت ہے۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں اور حق کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں۔

صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہٖ وصفیہٖ وخیر خلقہٖ سید المرسلین وخاتم النبیین محمد وآلہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ وانبائہٖ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

Marfat.com

مطابق نصاب ایوائے اسلامیات

تفسیر سُورَہ

المائدہ

جس کی تالیف میں قدیم وجدید ذخیرہ تفسیر بالخصوص فوائد القرآن عثمانی، تفسیر المنار، فی ظلال القرآن، تفسیر المراغی، تفسیر ابن کثیر، تفسیر حقانی، تفہیم القرآن اور ترجمان القرآن کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔

پروفیسر میاں منظور احمد

ایم اے علوم اسلامیہ گولڈ میڈلسٹ، ایم اے عربی، گولڈ میڈلسٹ
فاضل دیوبند، فاضل دیوبند، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

علمی کتاب خانہ بیرسٹر سٹریٹ / اردو بازار لاہور

Marfat.com

۷۲۵

قیمت ۷۵ روپے

منظور پرنٹنگ پریس لاہور

Marfat.com

انتساب

حضرت الاستاذ اما والمفسرین شیخ الاسلام

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ

کے نام

گرچہ خردیم نسبتے ست بزرگ
ذرہ آفتاب تابیم

خاکپائے عثمانی

میاں منظور احمد ایم اے فاضل دیوبند

Marfat.com

Marfat.com

سورۃ المائدہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

پیرایۂ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ مجھ جیسے ہیچمدان کو محض خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے قرآن مجید کی تفسیر کا یہ سلسلہ تالیف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کتابِ پاک کی تفسیر لکھنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے جس میں دورِ صحابہ رضہ کے بعد بڑے بڑے ائمۂ دین، علمائے لغت، محدثین و فقہاء اور ہر دور کے مشہور اعاظم رجال کے نام آتے ہیں۔

"تفسیر قرآن مجید" کے لئے جس تبحرِ علمی اور طہارتِ عمل کی ضرورت ہے۔ ان دونوں سے دامن خالی ہونے کے باعث قلم اٹھاتے ہوئے نہ صرف خوف بلکہ شرم و ندامت کا خیال بھی دامنگیر رہا۔ لیکن اس احساس نے ہمت بندھائی کہ جو کام میں کرنا چاہتا تھا اس کے لئے جب کوئی مناسب شخص آگے نہیں بڑھا تو بہرحال مجھے تو کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے۔

پنجاب یونیورسٹی نے ایم۔ اے علوم اسلامیہ کے لئے سورۃ المائدہ سے سورۃ البراءۃ تک پانچ سورتوں کا تفسیری مطالعہ بطور نصاب مقرر کر رکھا ہے۔ اس کے لئے جو کتابیں تجویز کی گئی ہیں وہ ہمارے ہاں بہت کم ملتی ہیں۔ حاجی سردار محمدؐ صاحب مالک علمی کتاب خانہ لاہور جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا عظیم فضل و کرم فرمایا ہے، وہ عموماً ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں کہ طلبا اور عام لوگوں کی کوئی علمی ضرورت پوری کریں۔ یا کوئی اور علمی خدمت سرانجام دیں۔ انہوں نے بہت ہمت افزائی سے مجھے اس کام پر آمادہ کیا کہ میں فی الحال ان پانچ سورتوں کی آسان اور معتدل قسم کی تفسیر لکھوں۔

میں نے اس تفسیر میں اس امر کا التزام کیا ہے کہ وہ کتابیں جو یونیورسٹی نے طلبہ کے مطالعہ کے لئے تجویز کی ہیں۔ ہر آیت کی تفسیر کے ضمن میں ان کے اقتباسات ایک مناسب ترتیب سے درج کر دوں۔ ان کے علاوہ ہمارے دور کے عظیم مفسر و محدث شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ نے اپنے بے نظیر حاشیۂ قرآن میں علوم و معارف کے جو موتی بکھیرے ہیں انہیں تو میں نے تقریباً بتمام و کمال ہی لے لیا ہے اور ہر آیت کی تفسیر انہی سے شروع کی ہے۔ اپنی طرف سے میں نے بہت کم لکھا ہے۔ صرف ان بزرگوں کے علوم و معارف کو ایک ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔

تفسیر المنار کے اقتباسات کے لئے میں نے بالعموم تفسیر المراغی پر اعتماد کیا ہے کیونکہ المراغی کی حیثیت المنار کے ایک بہترین خلاصے کے علاوہ ایک مختصر اور مفید تفسیر کی بھی ہے۔ بعض مقامات پر آپ کو صرف المنار ہی کا حوالہ نظر آئے گا۔ ان مقامات کو یا تو المراغی نے لیا نہیں یا بہت اختصار

Marfat.com

بیان کیا ہے۔

فی ظلال القرآن کا آخری (تیسرا) ایڈیشن میرے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اس میں پہلے ایڈیشنوں کی نسبت بہت سی ترامیم اور اضافے پائے جاتے ہیں۔ سید قطب شہید کی نگارشات کو میں نے ہر موقع پر آخر میں بطور حرفِ آخر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ جو یونیورسٹی کی تجویز کردہ ہیں، میں نے دیگر مواد سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً تفہیم القرآن اور ترجمان القرآن۔ اس لئے کتاب اب صرف ایم۔ اے کے طلبہ کے لئے نہیں بلکہ دیگر قارئین کے لئے بھی انشاءاللہ تعالیٰ یکساں مفید ثابت ہوگی۔ اللہ کرے کہ میری کوشش مفید ثابت ہو۔

میاں منظور احمد

التراجم والسوانح

تفسیر ابن کثیر: امام حافظ عماد الدین ابوالفداء اسمٰعیل رح دمشقی کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔ محققین اہل علم کے نزدیک یہ تفسیر بہت سے فوائد و خصوصیات کی حامل ہے جن سے دوسری تفاسیر بالعموم مجموعی حیثیت سے خالی ہوتی ہیں۔ یہ کتاب نہ زیادہ مجمل ہے نہ مفصل، بلکہ بالکل حدّاعتدال میں ہے۔ علامہ ابن کثیر عموماً قرآن کی تفسیر پہلے خود قرآن سے کرتے ہیں۔ پھر احادیث بمع سند و حوالہ بیان کرتے ہیں اور ان پر کلام کرتے ہیں۔ اسرائیلی روایات کی نشاندہی اور رد بھی کرتے جاتے ہیں۔ پھر اقوال صحابہ رض و تابعین رح بیان کرتے ہیں۔ کہیں کہیں صرفی و نحوی مسائل، علم قرأت و تجوید اور بلاغت و معانی پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔

گذشتہ تقریباً ساڑھے چھ صدیوں سے عالم اسلام میں اس تفسیر کو قبول عام حاصل ہے۔ فقہی مسائل بہت کم بیان کرتے ہیں اور نقل مذاہب میں پوری دیانتداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ کلامی مسائل پر بھی بعض جگہ مناسب گفتگو کر کے مسلک اہل سنت کی تائید کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ تفسیر ابن کثیر کی جلالتِ قدر کے بہت معترف تھے اور اپنے شاگردوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ احقر کے ایک خط کے جواب میں حضرت نے تفسیر ابن کثیر اور روح المعانی کے مطالعہ کی تاکید فرمائی تھی۔ فوائد القرآن میں جابجا ابن کثیر کے حوالے ملتے ہیں۔

علامہ حافظ ابن کثیر رح کی ولادت ۷۰۰ھ یا ۷۰۱ھ میں بمقام مجدل ہوئی جو ملکِ شام کے مشہور قصبہ بُصریٰ کے مضافات میں واقع تھا۔ ان کا اصل نام اسمٰعیل، کنیت ابوالفداء، لقب عماد الدین اور عرفِ عام ابن کثیر ہے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے اور اپنے برادر بزرگ کے زیر سایہ

Marfat.com

پرورش وتعلیم کے مراحل طے کئے۔ علم حدیث میں ان کے اساتذہ میں امام حافظ رح ابن کثیر، علامہ حافظ ذہبی، حافظ جمال الدین رح مزی، علامہ ابن رح المرضی اور حافظ ابن رح سویدی کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ حافظ جمال الدین رح بن یوسف المزی کی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوا۔

علامہ ابن کثیر رح تمام علوم متداولہ بالخصوص حدیث، فقہ، تفسیر، لغت وعربیت اور علم تاریخ میں امام ہوئے۔ ان کے علم وفضل، حافظہ، فہم وفراست اور علمی دیانت کے سب علما امت قائل ہیں۔ علامہ حافظ ابن حجر رح عسقلانی، حافظ جلال الدین سیوطی رح اور علامہ زاہد رح الکوثری نے اس کا کھلا اعتراف کیا ہے۔

ان کا سن وفات ۷۷۴ھ ہے۔ دمشق میں اپنے نامور استاد حافظ ابن تیمیہ کے پہلو میں مقبرۂ صوفیہ میں دفن ہوئے۔

علامہ حافظ ابن کثیر رح نے تفسیر قرآن اور تاریخ وسیرت کی مشہور کتاب "البدایہ والنہایہ" کے علاوہ مختلف علوم وفنون میں کم وبیش ڈیڑھ درجن مفید کتابیں تصنیف فرمائیں۔

فوائد القرآن:

سورۃ البقرہ والنساء از شیخ الہند مولانا محمود حسن رح اور بقیہ از شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح حضرت شیخ الہند رح نے شاہ عبدالقادر رح کے مشہور ترجمہ پر نظر ثانی کر کے اسے ایک جدید اور مستقل حیثیت دے دی۔ پھر جزیرۂ مالٹا میں قید فرنگ (۱۹۱۷ تا ۱۹۲۰ء) میں اس ترجمہ کی تکمیل کے علاوہ سورۂ البقرہ اور النساء کے فوائد بھی لکھے۔ قضاء الٰہی سے مولانا موصوف رہائی کے بعد جلد ہی ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو مولائے حقیقی سے جا ملے تو فوائد تفسیر کی تکمیل کے لئے قرعۂ فال حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مرحوم کے نام پڑا۔ انہوں نے اپنے مخصوص محققانہ، متکلمانہ اور ادیبانہ انداز میں یہ فوائد تحریر فرمائے مگر فرط ادب کے تقاضے سے اپنے استاد محترم کے حصہ فوائد کو نہیں چھوا۔ بعد میں بھی تقاضے ہوئے لیکن جتنا کام ہو چکا تھا حضرت رح نے اسی پر اکتفاء فرمایا۔

یہ فوائد اگر غور سے پڑھ لئے جائیں تو فہم قرآن کے لئے کافی ہیں۔ ان کی موجودگی بہت سی تفاسیر سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام کی نگاہ تقریباً سبھی جدید مسائل اور تقاضوں پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوائد میں احقاق حق کے ساتھ ساتھ ابطال باطل کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبند کے ایک جید عالم اور ادیب زمیندار مولانا فضل الرحمٰن کے فرزند تھے۔ سن پیدائش ۱۸۸۵ء ہے۔ چھوٹی ہی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے۔ بالخصوص آپ کا شغف علم کلام، تفسیر اور حدیث سے تھا۔ سیاسی مسلک کے لحاظ سے آپ نے مسلم لیگ کی ہمنوائی کی اور بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ قیام پاکستان

Marfat.com

کے بعد وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ مارچ ۱۹۴۹ء کو انہوں نے مشہور قرارداد پاس کروائی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بمقام بہاولپور جاں بحق ہو گئے۔

تفسیر قرآن کے علاوہ مسلم کی مشہور شرح فتح الملہم لکھی اور نصف درجن کے قریب رسائل مختلف موضوعات پر سپردِ قلم کئے۔

پاکستان و ہند کے علاوہ دنیا بھر کے گوشے گوشے میں علامہ مرحوم کے شاگرد موجود ہیں جو ان سے حدیث و تفسیر میں استفادہ کر چکے ہیں۔ وہ مفسر و محدث اور متکلم و ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شعلہ نوا خطیب اور آتش نفس مقرر بھی تھے۔ اس حیثیت سے بھی متحدہ ہندوستان میں ان کا ایک منفرد مقام تھا۔ صوبۂ سرحد اور ضلع سلہٹ کے استصواب رائے میں عوام نے انہی کی تقاریر سے متاثر ہو کر بے پناہ اکثریت سے مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں رائے دی تھی۔

تفسیر حقانی: کتاب کا اصل نام "فتح المنان بتفسیر القرآن" اور عرفِ عام میں تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے۔ اس تفسیر میں خود بقولِ مؤلف روایت و درایت دونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ مطالبِ قرآنی کو اردو زبان میں واضح کرنے کے لئے آیات کا شانِ نزول، احکام کی آیات میں مجتہدین کے دلائل اور اختلافات، وجہِ اعراب اور ترکیب نحوی تاویل میں وجہِ ترجیح کا بیان، معانی و بلاغتِ قرآن کا بیان، احادیث صحیحہ میں حوالہ، تفسیر القرآن بالقرآن، ربطِ آیات، مخالفینِ اسلام بالخصوص ملحدین و نصاریٰ کا کافی و شافی رد بیان کیا گیا ہے۔

اصل تفسیر سے پہلے ایک نہایت مبسوط و مفید مقدمہ لکھا گیا ہے۔ جس میں اصولِ تفسیر، جمع و ترتیبِ قرآن، علمِ تفسیر پر اصولی بحث کتب سابقہ پر نقد و تبصرہ ان کی تحریف و تبدیلی کے دلائل۔ محکم و متشابہ، احکام قرات، سبب نزول، شرح غریب، حذف و ابدال، ناسخ و منسوخ اعجاز القرآن، اسرار عبادات، مضامین و علوم قرآن، توحید و نبوت اور معاد جیسے اہم مسائل پر فاضلانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔

مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی رح دہلوی (وفات ۱۹۰۰ء) متقدمہ ہندوستان کے علمائے متاخرین میں بلند پایہ عالم گزرے ہیں۔ انکی کتاب کو اللہ تعالیٰ نے قبولیتِ عامہ اور شہرت عطا فرمائی ہے۔ مصنف ایک متبحر اور ربانی عالم ہیں۔

تفسیر المنار: علامہ سید رشید رح رضا (ولادت: ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۲ھ ۱۸ ستمبر ۱۸۶۵ء۔ وفات ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ، ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء) نے اپنے استاد و مربی مفتی محمد عبدہ رح مصری کے اُس تفسیری مواد کو جو انہوں نے

Marfat.com

سیّد جمال الدین رح افغانی کے تعلیمی و تفسیری مباحث پر قلمبند کرایا تھا، بڑی محنت اور جدّ و جہد سے بہت سے مفید اضافوں کے ساتھ اپنے رسالہ المنار میں شائع کیا۔ بعد میں یہ مُستقل تفسیر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ مکمّل نہ ہو سکا اور غالبًا بارہ پاروں کی تفسیر کے بعد منقطع ہو گیا۔

اس کتاب میں قدیم تفاسیر سے ہٹ کر قرآن پاک کو جدید زمانے کے تقاضوں اور جدید علوم و فنون کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ مستشرقین یورپ کے اٹھائے ہوئے فتنوں اور شکوک و شبہات کا مفصّل و شافی ردّ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے احساسِ کمتری کو دُور کرنے اور انہیں جھنجھوڑنے کی از حد کوشش کی گئی ہے۔ اسرائیلی روایات کا خوب ردّ کیا گیا ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن و السُنہ کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ کلامی مسائل کے بیان سے حتیٰ الوسع گریز کیا گیا ہے لیکن جہاں کہیں ایسے مسائل آتے ہیں انہیں محدثین سلف کے اصول پر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر کچھ فقہی مسائل کا بیان بھی آگیا ہے۔ ان کے بیان میں مُصنّف محدثین کے آزاد مسلک کے قائل ہیں۔

بلاغت و معانی اور صَرف و نحو کے ضروری مسائل بھی موقع بہ موقع بیان کرتے ہیں۔ بالخصوص الفاظ و محاورات قرآنی کی تشریح و اشتقاق میں نہایت قیمتی اور تحقیقی مواد پیش کرتے ہیں۔

علامہ سیّد رشید رضا اُن علماء اسلام میں سے ہیں جنہوں نے ماضی قریب میں مسلمانوں کی، معاشرتی، سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی بیداری کے لئے ان تھک کام کیا۔ وہ ایک واسطہ (مفتی محمد عبدہ مصری) سے علامہ جلیل سیّد جمال الدین رح افغانی کے شاگرد ہیں اور انکی تحریک نشاۃِ اسلام (اتحاد اسلامی) کے پُرجوش مبلغ ہیں۔

وہ قدیم و جدید علوم کا ایک حسین امتزاج ہیں۔ جدید فلسفہ و سائنس اور علم ریاضی پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ لبنان کے پہاڑی علاقے میں ان کا خاندان سیادت و نجابت میں عوامی عقیدت کا مرجع تھا۔ تکمیل عوام کے بعد انہیں سرکاری ملازمت کی پیش کش کی گئی۔ لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور ترکِ وطن کر کے قاہرہ میں پہنچ کر آزاد صحافت و تنقید کو اپنا پیشہ و شغل بنا لیا۔

علامہ سیّد رشید رح رضا تفسیر قرآن کے علاوہ سولہ[16] اور مفید کتابوں کے بھی مُصنّف ہیں۔ عالم اسلام کی بیداری میں ان کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ غیرتِ اسلامی اور شجاعت و حق گوئی ان کے خاص وصف تھے۔ عالم اسلام کی تمام اصلاحی و انقلابی تحریکیں اُن سے بہت متاثر ہوئیں

Marfat.com

تفسیر المراغی:- مؤلفہ علامہ احمد مصطفیٰ المراغی (پروفیسر علوم شرعیہ و لغت عربی دارالعلوم کالج قاہرہ) اس تفسیر میں مؤلف نے ایجاز و اختصار کے ساتھ تفسیر القرآن بالقرآن، تشریح مفردات، اسباب نزول، مضامین آیات کا خلاصہ اور تفسیری روایات کی تنقید و تمحیص کا التزام کیا ہے۔ احادیث صرف وہ لیتے ہیں جو اُن کے نزدیک درجۂ صحت کو پہنچ چکی ہوں۔ اسرائیلی روایات کو نہ صرف ترک کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان پر کس نقد و تبصرہ کر کے ان کا ردّ بھی کرتے ہیں۔

تفسیر المنار کے شائع شدہ (۱۲) اجزاء سے علامہ المراغی نے خوب خوب استفادہ کیا ہے، بلکہ تفسیر المراغی بالکل المنار کا اقتباس ہی معلوم ہوتی ہے دیگر فوائد اس پر مستزاد ہیں۔ جزء ۱۳ سے آخر قرآن تک المنار کے ماسوا دیگر مشہور و متداول اور معتبر تفاسیر ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ شروع سے تصنیف و تالیف کی جو روش اختیار کر لی تھی، آخر تک اس کی پابندی کی ہے۔

تفسیر المراغی کو پیش نظر رکھنے سے ہماری غرض ایک طرف تو یہ تھی کہ یہ تفسیر المنار کا تقریباً خلاصہ ہے اور دوسری طرف اس کے اختصار و جامعیت اور صحت نقل و اقتباس سے استفادہ پیش نظر تھا۔ چنانچہ آپ کو جا بجا اس کے حوالہ جات نظر آئیں گے۔

علامہ احمد مصطفیٰ المراغی کے متعلق افسوس ہے کہ کوئی سوانحی مواد مہیا نہیں ہو سکا۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس کی تلاش کوشش کی جائے گی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا لازم ہے کہ "علامہ مراغی" اور "شیخ مراغی" بہت سے علماء اور مشہور ادباء کہلاتے ہیں۔ اکثر کا نام محمد بن مصطفیٰ المراغی یا محمد مصطفیٰ المراغی ہے۔ مثلاً الازہر کے سابق ریکٹر بھی علامہ المراغی تھے۔ وہ محمد بن مصطفیٰ المراغی تھے اور تفسیر المراغی کے مؤلف احمد مصطفیٰ المراغی ہیں۔

فی ظلال القرآن:- مصر کے مایۂ ناز ادیب، شاعر، ماہر تعلیم اور صحافی سید قطب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ جسے مرحوم نے جیل کی تنہائیوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس تفسیر میں مرحوم نے پرانا تفسیری ڈھنگ کافی حد تک بدل ڈالا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ تفسیر نہیں ہے۔ حقیقت میں فصاحت و بلاغت اور ادب و انشاء کا شہ پارہ اور اسلامی دعوت کا ایک البتا ہوا لاوا ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں تفسیری مباحث بھی بتمام و کمال موجود ہیں۔ سید مرحوم نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے یہ تفسیر لکھ کر عالم اسلام پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔

اس کتاب میں جدید دور کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور وہ اجتماعی، معاشی

Marfat.com

سیاسی اور معاشرتی مسائل جو نئے ذہن کو پریشان کرتے ہیں۔ سید مرحوم نے ان کو موقع بہ موقع بیان کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ بالخصوص یہودی و عیسائی مستشرقین اور اشتراکی مصنفین نے اسلام پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان کے مدلل اور شافی جواب دیئے گئے ہیں۔

میرا خیال ناقص یہ ہے کہ دنیا کی مشہور زبانوں میں اس کا ترجمہ کرنا اشد ضروری ہے اور یقیناً یہ ایک عظیم اسلامی خدمت ہوگی۔

کتاب کو پڑھ کر سید مرحوم کے حیرت انگیز تبحر علمی، عجیب و غریب، حافظہ اور خداداد طرز ادا کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ جدید علوم کی شاید ہی کوئی شاخ ہوگی جس پر مرحوم کی نظر نہ ہو۔ وہ تفسیر کے صفحات میں سائنس کی مختلف شاخوں، فلسفہ قدیمہ و جدیدہ، علم الحیات اور اس کی مختلف اقسام، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ، علم السیاست، اقتصادیات، عمرانیات غرض علوم و فنون کی ہر شاخ سے استدلال کرتے اور علوم و معارف کے موتی بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔

ان کا طرز تحریر موجودہ عالم عرب کے ہر ادیب سے زیادہ مؤثر اور زور دار ہے۔ عربیت کا ذوق رکھنے والا کتاب کو دیکھ کر عش عش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ضلع اسیوط کے موشا نامی گاؤں کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہیں والدین کی شدید آرزو کے مطابق قرآن مجید بچپن میں ہی حفظ کرا دیا گیا۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں دار العلوم قاہرہ سے بی۔ اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی اور اسی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ پھر انہیں انسپکٹر مدارس مقرر کیا گیا اور جدید طریقہ تعلیم و تربیت کے مطالعہ کے لئے امریکہ بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ کئی کالجوں میں کچھ عرصہ کام کرتے رہے۔ انہوں نے مغربی مادی تہذیب کا بالکل قریب سے مطالعہ کیا۔ پھر وہ انگلستان، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ بھی گئے۔

۱۹۴۵ء میں وہ مصر کی مشہور اسلام پسند جماعت "الاخوان المسلمون" سے منسلک ہو گئے اور جماعت کے اہم ترین عہدوں پر فائز رہے۔ اب ان کی ساری ادیبانہ سرگرمیاں تحریک اسلامی کے لئے وقف ہو گئیں۔ ۱۹۵۴ء میں "اخوان المسلمون" خلاف قانون قرار دی گئی۔ اور ہزارہا لوگوں کے ساتھ سید قطب بھی گرفتار ہو گئے۔ انہیں جیل میں انتہائی صبر آزما تکالیف پہنچائی گئیں۔ مگر انہوں نے صبر و ثبات سے سب مصائب برداشت کر لئے ۱۹۶۴ء میں دس سال قید کاٹ کر وہ جیل سے رہا ہوئے۔ اس قید میں انہوں نے "فی ظلال القرآن" کی تکمیل کی۔

ایک سال بعد ۱۹۶۵ء میں وہ پھر دوبارہ حکومت مصر کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں گرفتار کئے گئے۔ یہ گرفتاری غالباً کمیونسٹوں کے ایماء پر مصر کی موجودہ "سوشلسٹ عرب"

Marfat.com

حکومت نے کی۔ جیل میں انہیں ناقابلِ بیان اور زہرہ گداز تکالیف دی گئیں۔ ان کا سارا خاندان مبتلائے تعذیب کیا گیا۔ حتیٰ کہ خواتین پر بھی تشدد کیا گیا۔ فوجی ٹریبونل کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوا جس نے ۱۹۶۶ء میں انہیں دو اور ساتھیوں سمیت سزائے موت سنائی اور سارے عالمِ اسلام بلکہ دنیا بھر کے احتجاج کے باوجود ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو انہیں پھانسی دے دی گئی۔ آخر وقت تک انہوں نے جس صبر و ثبات اور جرأت کا مظاہرہ کیا اُس نے انہیں زندۂ جاوید کر دیا۔

"فی ظلال القرآن" کے علاوہ سید مرحوم کی تقریباً دو درجن کتب اور بھی ہیں۔ جن میں العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام عالمگیر اور لازوال شہرت کی مالک ہے کئی زبانوں میں اس کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔ اردو میں اسلام کا نظامِ عدل کے نام سے چھپی ہے۔

The Glorious Koran — Marmaduke Pickthall

1. O ye who believe! Fulfil your undertakings. The beast of cattle is made lawful unto you except that which is announced unto you, game (hunting) being unlawful when ye are on the pilgrimage. Lo! Allah ordaineth that which pleaseth Him.

مضامین

(1) خوان (یعنی کھانے) کے بارے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا
(2) عبادات
(3) حرام و حلال
(4) وضو و تیمم
(5) پاک مومن اور اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح
(6) چور کا حد
(7) قسم کا کفارہ
(8) دین کی تکمیل کا اعلان
(9) شراب اور جوئے کی حرمت

Marfat.com

آیاتہا ۱۲۰ — سُوْرَةُ الْمَائِدَةِ مَدَنِيَّةٌ — رکوعاتہا ۱۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ

اے ایمان والو! پورا کرو عہدوں کو حلال ہوئے تمہارے لئے

بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ

چوپائے مویشی سوائے اُن کے جو تم کو آگے سنائے جائینگے۔ مگر حلال نہ جانو شکار کو

وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝

احرام کی حالت میں اللہ حکم کرتا ہے۔ جو چاہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ

اے ایمان والو! حلال نہ سمجھو اللہ کی نشانیوں کو اور نہ ادب والے مہینے کو اور نہ

وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاۗىِٕدَ وَلَآ اٰۗمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ

اُس جانور کو جو کعبہ کی نیاز ہو اور نہ اُس جانور کو جس کے گلے میں پٹہ ڈالکر کعبہ کو لے جائیں۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا حَلَلْتُمْ

اور نہ آنے والوں کو حرمت والے گھر کی طرف جو ڈھونڈتے ہیں فضل اپنے رب کا اور اُسکی خوشی

Marfat.com

فَاصْطَادُوا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ

اور جب تم احرام سے نکلو تو شکار کرلو اور باعث نہ ہو تم کو اس قوم کی دشمنی جو کہ تم کو روکتی تھی

عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ

حرمت والی مسجد کے اس پر کہ زیادتی کرنے لگو اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر

وَالتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر اور ڈرتے رہو

اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲

اللہ سے۔ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وجہ تسمیہ اس سورت کی آیات ۱۱۲ تا ۱۱۵ میں حضرت عیسٰی مسیح علیہ السلام کے حواریوں کا ایک مطالبہ، عیسٰی علیہ السلام کی طرف سے اُس کا جواب اور پھر عیسٰی علیہ السلام کی ایک دعا کا ذکر آیا ہے۔ ان آیات میں ایک مائدہ (خوان) یا غیبی کھانے کا ذکر ہے۔ اسی کی وجہ سے اس سورت نام اَلْمَائِدَہ ہوا سُوْرَۃُ الْعُقُوْد اور سُوْرَۃ بھی اس کے نام آئے ہیں[1]

تعداد آیات کوفی[2] قراء کے نزدیک سُوْرَۃُ الْمَائِدَہ کی ۱۲۰ آیات ہیں۔ حجازی اور شامی قراء کے نزدیک ۱۲۱ آیات اور بصریوں کے نزدیک ۱۲۳ آیات ہیں۔ اختلاف آیات کا مطلب یہ نہیں کہ الفاظ و فقرات کی کمی بیشی ہے مطلب صرف اوقاف اور فاصلوں کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک فاصلے اور وقف زیادہ ہوئے تو آیات کا نمبر بڑھ گیا اور دوسروں کے نزدیک فواصل کم ہوئے تو تعداد کم ہو گئی۔ اصل الفاظ سب کے ہاں متفق علیہ ہیں۔

زمانۂ نزول سُوْرَہ المائدہ ساری مدنی ہے۔ کیونکہ مدنی کی مشہور تعریف یہ ہے کہ قرآن کا وہ حصہ مدنی کہلاتا ہے جو ہجرت کے بعد نازل ہوا چاہے بالفعل مدینہ منورہ کے باہر مکہ معظمہ میں ہی کیوں نہ اترا ہو۔ ورنہ صحیح حدیث میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ المائدہ کی تیسری آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (۵/۳) بیس عرفہ کے دن پچھلے پہر میدانِ عرفات میں اُتری تھی[3] امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت بیان کی ہے کہ سورۂ المائدہ کا ابتدائی حصہ حجۃ الوداع میں منیٰ میں اترا تھا اور محمد بن کعب سے روایت ہے کہ سورۂ المائدہ حجۃ الوداع میں مکہ اور مدینہ کے درمیان نازل ہوئی پس اس مسلّم حقیقت کے خلاف ابن مردویہ کی بعض روایات، کہ المائدہ غدیر خم کے روز نازل ہوئی تھی یا ۱۸ ذی الحج کو حضورؐ کی حجۃ الوداع سے واپسی پر راستے میں اتری تھی، صحیح نہیں ہیں۔ [4]

مضامین و مباحث سُوْرَۂ المائدہ کا زیادہ تر حصہ یہود و نصاریٰ سے گفتگو اور اتمام حجت پر مشتمل ہے اور اس میں مشرکین و منافقین کا بھی کچھ ذکر موجود ہے اور اس کے مضامین اس سے پہلی سُوْرت النساء کے مضامین کی تکمیل و اتمام کرتے ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین[5] کی رائے تو یہ ہے کہ سُوْرہ النساء اور المائدہ میں اسی طرح

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۴۱ [2] تفسیر المنار ج ۶ ص ۱۱۶ [3] المنار ج ۶ ص ۱۱۶
[4] المراغی ج ۶ ص ۱۱۶۔

Marfat.com

کا اتحاد و تلازم پایا جاتا ہے جیسا کہ سورہ البقرہ اور آل عمران میں ہے۔ اسی لئے علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ سورت نساء میں کچھ عقود و معاملات صریحاً یا ضمناً بیان ہوئے ہیں مثلاً نکاح، حق مہر، عقد، حلف، معاہدہ و امان، وصیت، ودیعت (امانت رکھنا) وکالت، عاریت اور اجارہ وغیرہ۔ اور سورہ المائدہ کی ابتداء میں ہی عقود کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ٹھیرا کہ وہ عقود جو پچھلی سورہ میں بیان ہوئے ہیں یا یہاں بیان ہوں گے اے ایمان والو! انہیں پورا کرو!

سورۃ المائدہ میں عبادات، حلال و حرام، طہارت یعنی وضو و تیمم کے احکام مومن پاکباز عورتوں سے نکاح کا حلال ہونا، پاک باز اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی حلت، عدل و انصاف اور شہادت کے احکام، احرام کے احکام، باغیوں کے احکام، چور کی حد اور قسم کا کفارہ بیان ہوئے ہیں یہ احکام شریعت اسلامیہ کے کمالات میں سے ہیں اور ان سے پتہ چل جاتا ہے کہ دین و شریعت مکمل ہو گئے ہیں چنانچہ اکمال الدین کی آیت سورہ المائدہ کی ابتداء میں آچکی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سورۃ المائدہ میں اہل اسلام کی عباداتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے تکمیلی احکامات کے علاوہ عدل و انصاف پر ہر حال میں قائم رہنے اور اپنوں اور غیروں سے معاملہ کرتے وقت "قسط" کے تقاضے کو مدنظر رکھنے کے احکام اور اہل کتاب کو ان کی غلط کاریوں پر آخری تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ یہی تین مضامین سورہ المائدہ کے مرکزی مباحث ہیں۔

یہ قرآن کریم جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اسی لئے نازل ہوا تھا کہ آپؐ اس کے ذریعے سے ایک امت تیار کریں، ایک سلطنت قائم کریں ایک معاشرہ کی تنظیم کریں۔ لوگوں کی ضمیروں، اخلاق اور عقلوں کی تربیت فرمائیں اور ان تمام چیزوں کو ایک مضبوط مرکز سے وابستہ کریں۔ ایسا مرکز جو بکھرے ہوؤں کو اکٹھا کرے، مختلف اجزا، کو جمع کر دے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ جوڑ دے اور ان کے توسط سے خالق کائنات سے ملا دے۔

اسی لئے ہم قرآن کی بہت سی سورتوں میں وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ قانون سازی اور فرائض کے ساتھ ساتھ قصے بھی دیکھتے ہیں۔ پھر قانون سازی کی بھی دو قسمیں ہیں دکھائی دیتی ہیں (ا) وہ قانون سازی جو اجتماعی اور سیاسی تعلقات کی تنظیم کرتی ہے۔
(ب) وہ تشریع جو بعض اقسام کے کھانوں اور رسوم و اعمال کو حلال یا حرام ٹھیراتی ہے۔

---

۱ المراغی ج ۶ ص ۱۱۶ ۲ تفہیم القرآن ص ۴۳۶ (خلاصہ)
۳ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۳۵

Marfat.com

دونوں قسم کی تشریع اس میں اور قرآن میں باہم مربوط نظر آتی ہے۔ کیونکہ قرآن انسانی زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت ٹھیراتا ہے۔ اور وہ اس لئے آیا تھا تاکہ ایک بے نظیر اُمّت (قوم) پیدا کرے اور ایک ایسا معاشرہ تیار کرے۔ جو خود اس کا برپا کردہ ہو نہ کہ لباس، احوال و ظروف اور برتن وغیرہ اس کی تخلیق کریں۔

سورہ المائدہ میں انفرادی اور اجتماعی تربیت باہم مل گئی ہیں اس میں ایک طرف تو ہمیں کھانے اور نکاح کے حلال و حرام کے قوانین ملتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اندر سیاسی معاملات کے قوانین بھی نظر آتے ہیں اس میں بعض عباداتی شعائر کی تعلیم بھی ہے اور اجتماعی جرائم کی بعض حدود اور سزائیں بھی بیان کی گئی ہیں، تمثیلیں، وعظ و نصیحت اور قصّے بھی بیان کئے گئے ہیں اور عقائد کی تصحیح اور انہیں وہم و گمان اور خرافات سے پاک کر دیا گیا ہے۔

اس سورت کی ابتداء اہل ایمان کو اس خطاب سے ہوتی ہے کہ وہ عقود کا ایفاء کریں۔ عقود کئی قسم کے ہو سکتے ہیں اور ان میں معاملات، معاہدات، حدود کا قائم کرنا اور حرام چیزوں کو حرام سمجھنا وغیرہ سب داخل ہیں بعض عقود تو لفظِ عقد سے ان میں داخل ہیں اور دوسرے بعض اُس عقدِ اسلام کی وجہ سے مراد لئے جاتے ہیں۔ جو اہلِ ایمان نے اللہ اور اُس کے رسول ؐ سے باندھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں بعض اُن خدائی معاہدوں کا ذکر آئے گا جو اہلِ اسلام اور بنی اسرائیل سے باندھے گئے تھے اور کچھ قصّے آئیں گے جن سے یہ واضح ہو جائے گا۔ کہ بنی اسرائیل نے ان معاہدوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اور یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل کے احکام سے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا یہ احکام بھی ان معاہدوں میں شامل تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ رسالت اور ادائے فریضۂ نبوت کا حکم دیا ہے یہ بھی ایک عقد تھا جو اللہ تعالےٰ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھا تھا۔ بس اس کا ایفاء فرض تھا۔ پھر مسلمانوں میں سے جو مرتد ہو جائے اور خدا اور رسول ؐ سے کئے ہوئے عہد سے پھر جائے جائے اُسے تہدید و وعید سنائی گئی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم لائے گا۔ جو اُسے محبوب ہوگی اور خدا ان کا محبوب ہوگا۔ وہ مومنوں کے ساتھ نرم اور کافروں پر شدید ہوگی۔

الغرض اس سورت کا سارا سیاق و سباق عقود کی مختلف صورتوں کے گرد گھومتا ہے۔ حتیٰ کہ سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی گفتگو جو مسیح علیہ السلام کے ساتھ ہوگی وہ بھی اسی عہد و میثاق کے بارے میں ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے باندھا تھا۔

Marfat.com

اس سے پہلے ہم کوفی قراء اور دوسرے حضرات کا آیات کی تعداد میں جو اختلاف ہے، اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ اس اختلاف کی نوعیت کی ایک مثال اس وقت ہمارے سامنے ہے کہ کوفی قراء کے نزدیک تو پہلی آیت اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن دوسرے حضرات کے نزدیک پہلی آیت کا اختتام اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۵ پر ہوتا ہے جس کے آگے ہمارے ہاں کے مصاحف میں یہ نشان ۵ پڑا ہے اور مَا یُرِیْدُ پر دوسری آیت ختم ہو جاتی ہے پس تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ پر تو بالاتفاق وقف آیت ہے۔ مگر پہلا بِالْعُقُوْدِ ۵ والا وقف اختلافی ہے، اسی کی نشاندہی کے لئے یہ نشان ۵ تجویز کیا گیا ہے۔

المائدہ کی ان پہلی دو آیات میں مندرجہ ذیل احکام بیان فرمائے گئے ہیں (۱) عقود کو پورا کرنا (۲) بعض کھانوں کی تحلیل و تحریم (۳) با حرمت مہینوں کی حرمت کی نگرانی کرنا (۴) اللہ کے شعائر اور حرمات کی رعایت کرنا (۵) لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا (۶) دشمنی کے باوجود کسی پر ظلم و ستم نہ کرنا۔ زندگی، انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کے لئے کچھ ضوابط لازم ہیں اور جب تک ان کا احترام نہ کیا جائے اور نفسانی خواہشات کو ان میں دخل انداز ہونے دیا جائے، زندگی پُرامن نہیں ہو سکتی۔ عقود انہی ضوابط کا نام ہے۔ جو تعلقات کی تنظیم و ترتیب کرتے ہیں کیونکہ وہ ہر شخص کی آزادی کی حد قائم کرتے ہیں تاکہ بدنظمی اور انارکی نہ پھیلے۔ یہ ضوابط زندگی کو ایک ایسی شرکت قرار دیتے ہیں۔ جس کی کئی اطراف ہیں۔ ان ضوابط کا فائدہ یہ ہے کہ ایک طرف دوسری پر زیادتی نہ کرے۔ اور عقود اپنے وسیع معنی میں عقائد، شعائر عبادات، معاملات اور معاہدات سب پر مشتمل ہیں کیونکہ یہی سب وہ عقود ہیں جن کے ساتھ فرد کا نفس و ضمیر مربوط ہوتا ہے اور اُس کے عمل اور رویّہ کی حد بندی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ کی ابتداء میں جو عقود کے ایفاء کا حکم دیا ہے یہ گویا زندگی کے ضوابط کو قائم کرنے کا حکم ہے۔ چاہے وہ ضوابط ظاہر ہوں چاہے پوشیدہ۔ اور اسلام ان تمام عقود کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے اور ان کے پورا کرنے کو ایک فریضہ قرار دیتا ہے اور جن لوگوں نے اپنے دلوں میں ایمان کا عقد مضبوط کر لیا ہے، انہیں وہ تمام ضوابط و قیود کی پابندی کا حکم دیتا ہے جو ایمان کے عقد کے ساتھ مربوط ہیں۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے، صحیح معرفت اور تسلیم و انقیاد۔ یعنی خدا اور رسول ﷺ کے جملہ ارشادات کو صحیح و صادق

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۶ (طبع دوم) [2] فوائد القرآن ص ۱۳۶

Marfat.com

سمجھ کر تسلیم و قبول کے لئے اخلاص سے گردن جھکا دینا۔ اس تسلیمی جزء کے لحاظ سے ایمان فی الحقیقت تمام قوانین و احکام الٰہیہ کے ماننے اور جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد و اقرار ہے۔ گویا حق تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کا وہ اقرار جو "عہد الست" کے سلسلہ میں لیا گیا تھا، جس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے اُسی کی تجدید و تشریح ایمان شرعی سے ہوتی ہے۔ پھر ایمان شرعی میں جو کچھ اجمالی عہد و پیمان تھا اُسی کی تفصیل پورے قرآن و سنت میں دکھلائی گئی ہے اس صورت میں دعوئے ایمان کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ تمام احکام الٰہیہ میں خواہ اُن کا تعلق براہ راست خدا سے ہو یا بندوں سے، جسمانی تربیت سے ہو یا روحانی اصلاح سے، دنیوی مفاد سے ہو یا اُخروی فلاح سے، شخصی زندگی سے ہو یا حیات اجتماعی سے، صلح سے ہو یا جنگ سے، اس کا عہد کرتا ہے کہ ہر نہج سے اپنے مالک کا وفادار رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو عہد و پیمان اسلام، جہاد، سمع و طاعت یا دوسرے عمدہ خصال اور امورِ خیر کے متعلق صحابہ رضؓ سے بشکلِ بیعت لیتے تھے۔ وہ اسی عہدِ ایمانی کی ایک محسوس صورت تھی۔ اور چونکہ ایمان کے ضمن میں بندہ کو حق تعالیٰ کے جلال و جبروت کی صحیح معرفت اور اس کی شان انتقام اور وعدوں کی سچائی کا پورا پورا یقین بھی حاصل ہو چکا ہے۔ اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ بدعہدی اور غداری کے مہلک عواقب سے ڈر کر اپنے تمام عہدوں کو جو خدا سے یا بندوں سے یا خود اپنے نفس سے کئے ہوں، اس طرح پورا کرے کہ مالک حقیقی کی وفاداری میں فرق نہ آنے پائے اس تقریر کے موافق عقود (عہدوں) کی تفسیر میں جو مختلف چیزیں سلف سے منقول ہیں ان سب میں تطبیق ہو جاتی ہے اور آیت میں "ایمان والو" کے لفظ سے خطاب فرمانے کا لطف مزید حاصل ہوتا ہے۔

علامہ سید رشید رضا مصری (لبنانی) فرماتے ہیں کہ وفاء اور ایفاء کا معنی ہے کسی چیز کو پورا پورا بجا لانا، اس طور پر کہ اس میں کوئی نقص اور کمی نہ رہ جائے۔

قرآن کا ارشاد ہے۔ واوفوا الکیل اذا کلتم اور واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم ناپ تول میں کمی کرنے کو "اخسار" اور عہد کا ایفا، نہ کرنے کو "غدر و نقض" کہا جاتا ہے۔ عقود عقد کی جمع ہے اس کا معنیٰ ہے حلّ (کھولنا) کی ضد۔ امام راغب اصفہانی نے کہا ہے۔ کہ عقد کا معنی ہے کسی چیز کے اطراف کو جمع کرنا اور انہیں ایک دوسرے سے

لہ تفسیر المنار ج ۶ ص ۱۱۸

Marfat.com

باندھنا۔ دراصل یہ لفظ ٹھوس اجسام میں استعمال ہوتا ہے جیسے عَقْدُ الحبلِ (رسی کو گرہ دینا) عقدُ البناء (عمارت کو چُننا) استوار کرنا) پھر اسے معنوی چیزوں کے لئے استعمال کیا جانے لگا جیسے عَقْدُ البیع اور عہد وغیرہ اور اس سے عقد نکاح یا عُقدۃ النکاح بھی ہے۔

اس آیت میں عقود کی تفسیر عہود (جمع عہد) سے کی گئی ہے۔ عہد سے مراد ہر وہ چیز ہے۔ جسے حفاظت و نگرانی کے لئے تمہارے سپرد کیا گیا ہو۔ اور تم سے اُس کام کے کرنے اور اُس کام پر قائم رہنے کا مطالبہ کیا گیا ہو مثلاً عقد الیمین (قسم کو پکا کرنا) عقد النکاح (نکاح باندھنا) قرآن کہتا ہے: وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ۔ اور اسی قبیل کے عقدِ بیع) عقدِ شرکت وغیرہ ہے۔ عقد و عہد ایک ہی چیز ہے۔ اور عہد خداوندی سے مراد ہر عقیدہ اور امر و نہی ہے۔ جس کی حفاظت اور اس پر قائم رہنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ عقد عہد کی نسبت زیادہ خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ہمیں ان تمام صحیح عقود کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے جو اُس نے اپنے بندوں سے باندھا ہے اور جو عقود ہم آپس میں باندھتے ہیں روح المعانی میں امام راغب سے نقل کیا گیا ہے کہ عقود کی تین قسمیں ہیں:۔

ا۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان والا عقد

ب۔ انسان کے اپنے دل سے باندھے ہوئے عقد

ج۔ ایک انسان اور دوسروں کے درمیان جو عقد باندھے جائیں۔

پھر ان تینوں اقسام کی دو دو قسمیں ہیں:۔

ا۔ پہلی قسم وہ ہے جسے عقل نے واجب کیا ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اُس کی معرفت انسان کی فطرت و سرشت میں رکھدی ہے اور یا تو بلا تامل عقل اس تک بداہتہً پہنچ جاتی ہے۔ یا ذرا سا غور و فکر کرنے سے اُسے معلوم کر سکتی ہے اس پر قرآن کی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔ اذا اخذ ربك من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علیٰ انفسهم الستُ بربکم الایة

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جس کی طرف کتاب و سُنّت نے رہنمائی کی ہے۔ پس اس حساب سے عقود کی کل چھ قسمیں ہو گئیں ان میں سے ہر ایک یا تو ابتداءً لازم ہے یا اس وقت لازم ہوتی ہے جبکہ انسان اُسے اپنے اوپر لازم کر لے دوسری قسم کی بھی چار قسمیں ہیں:۔

ا۔ جن کا پورا کرنا واجب ہے مثلاً وہ نذریں جو عبادات کے متعلق ہیں جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت و عافیت بخشی تو ایک روزہ رکھونگا۔

Marfat.com

۲۔ جس کا پورا کرنا مستحب ہے اور چھوڑ دینا جائز ہے مثلاً کوئی آدمی کسی مباح فعل کو چھوڑنے کی قسم کھالے۔ پس وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ لیکن قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔

۳۔ جس کی وفاء کو چھوڑنا مستحب ہے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے جب کوئی شخص کسی چیز کی قسم کھالے مگر اس کے سوا کسی اور چیز کو اس سے بہتر دیکھ لے تو اُسے اُس بہتر چیز کو اختیار کر لینا چاہیئے اور قسم کا کفارہ ادا کر دینا چاہیئے۔

۴۔ جس کے ایقاء کو ترک کر دینا واجب ہے مثلاً ایک آدمی کہے کہ میرے ذمہ لازم ہے کہ فلاں شخص کو قتل کر ڈالوں۔ اس قسم کو شرعاً عقد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ انسان کے لئے فعلِ حرام کا لازم کر لینا جائز ہی نہیں ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ چھ کو چار سے ضرب دیں تو کل چوبیس قسم کے عقود بنیں گے۔ آیت کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ جن عقود کا ترک مستحب یا واجب ہے۔ ان کے علاوہ سب اس میں داخل ہیں[1]۔

اُحلّت لکم بھیمۃ الانعام شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ سورہ نساء میں گزر چکا کہ یہود کو ظلم و بدعہدی کی سزا میں بعض حلال و طیب چیزوں سے محروم کر دیا گیا تھا فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ (ف ۳۰ ع ۶) جن کی تفصیل سورۂ انعام میں ہے۔ اس اُمّتِ مرحومہ کو ابقائے عہد کی ہدایت کے ساتھ اُن چیزوں سے بھی منتفع ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ بکری اور اسی جنس کے تمام اہلی و وحشی (پالتو اور جنگلی) چوپائے مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ تمہارے لئے ہر حالت میں حلال کئے گئے۔ بجز اُن حیوانات یا حالات کے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی تمہارے جسمانی یا روحانی یا اخلاقی مصالح کے لئے مخالفت فرما دی ہے۔ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ سے مراد غالباً وہ چیزیں ہیں جو اسی رکوع کی تیسری آیت میں بیان کی گئی ہیں حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ سے ذٰلِکُمْ فِسْقٌ تک۔

بَهِیْمَۃ جانوروں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں نطق کی صفت نہیں پائی جاتی اور ان کی آوازوں میں ابہام پایا جاتا ہے۔ انعام کا معنی ہے اونٹ، گائے، بھیس اور بھیڑ بکری اور بھیمہ کی اضافت انعام کی طرف بیان کے لئے ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے "اراک کا درخت"، مطلب یہ ہوا کہ تمہارے لئے چارپائے جانور حلال کر دیئے گئے ہیں جو انعام (چارپایوں) کے مشابہ ہیں یعنی جو جنگلی

---

[1] فوائد القرآن ص ۱۳۶ [2] تفسیر المنار ج ۶ ص ۱۱۸

Marfat.com

کرتے ہیں اور ان کی کچلیاں نہیں ہیں (وہ درندے ہیں!)

اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کے حکم میں جو اجمال پایا جاتا ہے اُحِلَّتْ لَکُمْ سے اس کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ گویا ایک عام قاعدہ بیان فرمانے کے بعد کھانے کی چیزوں میں سے حلال چیزوں اور اُن کی شرائط کا ذکر شروع فرمایا گیا ہے۔ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ سے جو چیزیں مستثنیٰ کی گئی ہیں اُن کا ذکر تیسری آیت میں آرہا ہے یعنی مُردار، خون وغیرہ۔

سورۂ المائدہ کی پہلی آیت میں تحریم و تحلیل کے مجمل قواعد کلیہ بیان کیے گئے ہیں تاکہ حلال و حرام اشیا کی تفصیل سے قبل ایک عام قاعدہ بیان کر دیا جائے۔ چونکہ حج کا احرام عام زندگی کے اسباب سے آدمی کو مجرّد کر دیتا ہے اور احرام باندھنے والے کی توجہ کو اللہ اور اُس کے گھر کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس لئے اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ کے بعد غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کا ارشاد فرمایا گیا۔ احرام ہر قسم کی ظلم و زیادتی سے رُکنے کا نام ہے۔ یہاں تک کہ پرندے اور حیوان پر بھی تعدّی سے ہاتھ اٹھا لینے کا حکم دیا گیا ہے یہ ایک نفسیاتی وقفہ ہے۔ جس میں نفسِ انسانی ہر زندہ چیز کے درمیان ایک تعلق کا احساس پیدا کرتا ہے اور ہر قسم کی زیادتی سے خود بھی بچتا اور دوسروں کو بھی بچاتا ہے۔ پھر وہ معاشی ضروریات جنہوں نے پرندوں اور حیوانوں کا شکار مباح ٹھہرا دیا ہے، ان میں تخفیف کرتا ہے۔ تاکہ انسانی فطرت میں جو گوشت اور خون کی ضروریات موجود ہیں۔ وہ کم سے کم اس وقفے میں دور ہو جائیں۔

"وَاَنْتُمْ حُرُمٌ": حُرُمٌ حَرَامٌ کی جمع ہے (یعنی مُحْرِم) جو حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھ لے اور آیت میں اس سے مُراد وہ لوگ بھی ہیں۔ جو "حدّ حرم" کے اندر داخل ہوں۔ چاہے کسی نیت اور کسی کام کے لئے آئیں ان سب کے لئے شکار جائز نہیں ہے۔

احادیث میں اس حکم کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً مُحرِم کو خود تو شکار کرنے کی اجازت ہے ہی نہیں، کسی دوسرے کی رہنمائی کرنا، شکار کے جانور کی طرف اشارہ کرنا یا اُسے ڈرانا بھی ناجائز ہے بلکہ اگر کسی غیر محرم نے حدّ حرم سے باہر کسی مُحرِم کے لئے شکار کیا ہو تو وہ بھی اُس مُحرِم کے لئے حرام ہے، ہاں اگر اُس کے لئے نہیں کیا گیا تو وہ استعمال کر سکتا ہے۔

مُحرِم[۳] کو صرف خشکی کا شکار جائز نہیں۔ دریائی شکار کی اجازت ہے اور جب حالتِ احرام کی رعایت اس لئے ہے کہ اس میں شکار کرنا ممنوع ٹھہرا تو خود حرم شریف کی حُرمت کا لحاظ اس سے

---

[۱] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۷ (طبع دوم) [۲] تفسیر المراغی جلد ۶ ص ۴۳، ۴۴

[۳] فوائد القرآن ص ۱۳۶

Marfat.com

کہیں زیادہ ہونا چاہیئے۔ یعنی حرم کے شکار کا جانور محرم و غیر محرم سب کے لئے حرام ہوگا جیسا کہ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ کے عموم سے مترشح ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ: جس خدا نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ پھر کمال حکمت سے اُن میں باہم فرق مراتب رکھا۔ ہر نوع میں اُس کی استعداد کے موافق جُدا جُدا فطری خواص و قویٰ کی ودیعت کئے۔ زندگی اور موت کی مختلف صورتیں تجویز کیں۔ بلاشبہ اُسی خدا کو اپنی مخلوقات میں یہ حق حاصل ہے کہ اپنے اختیار کامل، علم محیط اور حکمتِ بالغہ کے اقتضاء سے جس چیز کو جس کسی کے لئے جن حالات میں چاہے حلال یا حرام کر دے۔

حکم[۱] سے مراد یہاں قضاء (فیصلہ کرنا) ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں حکمتوں اور مصالح کی بنا پر جنہیں وہی جانتا ہے، جس چیز کو چاہے حلال یا حرام ٹھہرا دے۔ تمہیں اس کے عقود و عہود کا ایفاء واجب ہے۔ ان سے پھرنا یا انہیں توڑنا جائز نہیں۔

یُرِیْدُ[۲] لغت میں حکم کا معنیٰ رد کرنا اور فیصلہ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اپنے علم محیط، حکمت بالغہ اور رحمت واسعہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ اُس کے احکام اور فیصلوں میں اُلٹ پھیر نہیں ہوتا، نہ صرف اندازہ، خلل اور ظلم کا وہاں تصور ہو سکتا ہے۔

یُرِیْدُ[۳] اللہ کی مشیت آزاد ہے۔ اُس کا ارادہ حاکم اور فیصلہ کن ہے وہ اپنے ہر قسم کے حکم میں منفرد ہے اُس کے ساتھ کسی اور کا ارادہ نہیں اور نہ کوئی ایسی ہستی ہے جو اُس کے بعد حکم و فیصلہ کرے۔ اس کے فیصلے اٹل ہیں جنہیں کوئی رد کرنے والا نہیں۔ پس وہ جس چیز کو چاہے حلال اور جسے چاہے حرام ٹھہرا دے۔

لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ: شعائر شعیرہ کی جمع ہے۔ شعائر اللہ سے مراد اللہ کے دین کے نشانات و علامات ہیں۔ اور اس لفظ کا استعمال مناسکِ حج میں غالب ہے۔ اَلْھَدْیَ سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں کعبۃ اللہ کے قریب ذبح کرنے کے لئے بطورِ نیاز و قربانی (نُسُکٌ) لے جایا جاتا ہے۔ اَلْقَلَآئِدَ قلادہ کی جمع ہے یعنی جس چیز کو گردن میں لٹکایا جائے۔ قربانی کے اونٹوں کی گردن میں کوئی جوتا، رسی یا درخت کی چھال وغیرہ ڈال دیتے تھے تاکہ انہیں پہچان لیا جائے اور قربانی سمجھ کر اُن سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔

---

[۱] فوائد القرآن (عثمانی) ص ۱۲۷ [۲] المراغی ج ۶ ص ۴۴ [۳] المنار ج ۶ ص ۱۲۴
[۴] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۷۶ (طبع سوم)۔
[۵] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۴۱ تفسیر المنار ج ۶ ص ۱۱۹۔

Marfat.com

آمّین کے معنے ہیں قصد کرنے والے فضلاً مِنَ اللّٰہ سے مراد تجارت میں نفع ہے اور رضوانًا کا معنی رضامندی ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں دنیوی و اخروی سزا سے بچائے لَا یَجْرِمَنَّکُمْ کا مادہ جرم ہے۔ جس کا اصل معنی ہے درخت کے پھل توڑنا اور مطلب اس کا ہے آمادہ کرنا، اُبھارنا اور کسی سے کوئی کام کروانا۔ شَنَآنُ کا معنی مطلقاً بغض ہے۔ یا ایسا بغض جس کے ساتھ مبغوض سے علیحدگی اور نفرت بھی شامل ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! اللہ کے دین کی نشانیوں اور فرائض و حدود کو اپنے لئے حلال مت کرو یعنی ان میں اپنی مرضی سے تصرف مت کرو بلکہ احکام خداوندی کے مطابق عمل کرو۔ حج اور ارضِ حرم کی حرمت میں غفلت مت کرو اور حج کے لئے آنے والوں کو مت روکو۔ باحُرمت مہینوں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرّم اور رجب کی حرمت کو مت توڑو کہ کہیں ان میں اپنے مشرک دشمنوں سے لڑنے لگو۔ اور[1] قربانی کے جانوروں سے چھیڑ چھاڑ مت کرو، انہیں غصب کرنے، ذبح کرنے، چرا لینے اور روک لینے سے بچے رہو۔ اور قربانی کے گلے میں جو پٹکے وغیرہ پڑے ہوتے ہیں۔ ان کا احترام کرو۔ خلاصۂ کلام یہ کہ قربانی کا جانور چاہے پٹے والا ہو یا نہ ہو اس سے تعرّض جائز نہیں پٹکے والے جانوروں کا بالخصوص ذکر اس لئے فرمایا گیا کہ وہ (یعنی اونٹ) بہترین اور اشرف قربانی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ خانہ خدا کی زیارت کے قصد سے آرہے ہوں ان سے چھیڑ چھاڑ اور قتال کو جائز مت جانو کیونکہ وہ تجارت میں نفع کمانے (جیسے سفرِ حج میں جائز رکھا گیا ہے) اور خدا تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کعبۃ اللہ کو جانا چاہتے ہیں۔ امام قتادہؒ کی روایت کے مطابق اس سے مراد مشرک ہیں جو تجارت کی غرض سے اور اللہ تعالیٰ کی دنیوی ناراضگی اور سزا سے بچنے کی نیت سے حج کو آیا کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں شرک و کفر کے باوجود اور بہت سی خود ساختہ رسوم کے باوجود بیت اللہ اور اُس کے حج کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور لوگ دُور دُور سے اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا :۔ یعنے جب احرام باندھا ہوا نہ ہو۔ یا حج و عمرہ وغیرہ سے فراغت پالو تو حدِّ حرم سے باہر شکار کی اجازت ہے۔ یہ ممانعت صرف ایک حالت اور وقت (یعنی احرام کی مدت) اور ایک جگہ (یعنے ارضِ حرم) سے مخصوص تھی۔ مشرکوں نے اہل اسلام کو ہجرت کے چھٹے سال (حدیبیہ کے موقع پر) عمرہ کی اجازت دینے

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۴۵، المنار ج ۶ ص ۱۲۸۔

Marfat.com

سے انکار کر دیا تھا اور انہیں حرم سے باہر روک دیا تھا۔ چنانچہ مشن محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امن پسندی اور مصالحانہ رویّے سے رک گئی تھی ورنہ بظاہر جنگ کے تمام اسباب مہیا تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حجۃ الوداع کے موقع پر مشرکوں کو روکنے اور ان سے بدلہ کے طور پر زیارت کعبہ کا حق چھین لینے کی ممانعت ان الفاظ میں فرمائی وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ الخ اور چونکہ ایک قوم کسی دوسری قوم کو باہمی تعاون و اشتراک عمل کے بغیر تعدی نہیں کر سکتی اس لئے فرمایا ہے :

وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان

بر کا معنیٰ ہے نیکی میں توسع کرنا اور تقویٰ کا معنیٰ ہے ہر دینوی و اخروی مضر چیز سے بچنا۔ اثم کا معنیٰ ہے ہر گناہ اور معصیت۔ عدوان کا معنیٰ ہے شرع اور عرف کے حدود سے تجاوز کرنا اور کسی سے معاملہ کرتے وقت عدل کی حدود سے نکل جانا۔

مسلم اور اصحاب سنن کی ایک حدیث ہے : البر حسن الخلق او الاثم ما حاك في نفسك وكرهت ان يطلع عليه الناس "نیکی خوش خلقی کا نام ہے اور برائی وہ چیز ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو لوگوں کا اس پر مطلع ہونا پسند نہ کرے" امام احمد اور دارمی نے حضرت وابصہ بن معبد جہنی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا : میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ تو حضور نے ارشاد فرمایا "کیا تم بر و اثم کے متعلق پوچھنے آئے ہو؟" میں نے عرض کیا کہ ہاں! حضور نے ارشاد فرمایا "اپنے دل سے فتویٰ پوچھو۔ بر (نیکی) وہ ہے جس پر دل و جان مطمئن ہو جائے اور گناہ (اثم) جو جی میں کھٹکے اور دل میں تردد کا باعث بنے۔ اگرچہ تمہیں لوگ بار بار فتویٰ دیں۔ (لیکن دل سے پوچھ لیا کرو!)"

قرآن پاک میں بر و تقویٰ پر باہمی تعاون کا حکم ہدایت اجتماعیہ کے ارکان میں سے ہے۔ کیونکہ یہ افراد اور جماعتوں کو نفع دینے والی چیزوں پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کا لزوم و وجوب ثابت کرتا ہے۔ یہ حکم دینوی اور انفرادی معاملات کو حاوی ہے اور تقویٰ کے اعمال میں سے ہر عمل کو واجب قرار دیتے ہیں۔ تاکہ لوگ اپنے آپ سے فاسد اور مضرات کو دور کریں۔

صدر اول کے مسلمان آج کل کی جماعت بندی اور انجمن سازی کے احتیاج کے

---

۱ المنار ج ۶ ص ۱۲۹، ۱۳۰

۲ المراغی ج ۶ ص ۴۶ المنار ج ۶ ص ۱۳۱۔

Marfat.com

بغیر ایک دوسرے سے نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عہد و میثاق نے انہیں ظاہری اور مصنوعی پابندیوں سے غنی کر رکھا تھا وہ نیک کاموں کے لئے کسی انجمن وغیرہ کے محتاج نہ تھے۔ لیکن جب انہوں نے اُس عہد کو توڑ دیا تو مصنوعی جماعت سازی کی ضرورت آپڑی تاکہ کچھ نیک ناموں کے لئے لوگوں میں سے بعض گروہوں کو جمع کیا جائے اور اب تو یہ حال ہے کہ جب تک کوئی جماعتی رابطہ موجود نہ ہو کوئی شخص دوسروں سے نیک کاموں میں تعاون کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس لئے اب تعاون کے واجب کی ادائیگی غالباً ان جماعتوں کے ربط و ضبط اور ممبری پر منحصر ہو گئی ہے۔

[1] واتقوا اللہ ط ان اللہ شدید العقاب ○ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنی مخلوق کے نظام میں جو فطری و شرعی سنتیں بٹھلا دی ہیں ان پر عمل کرنے میں خدا کا خوف کرو۔ اگر تم نے اس کی ہدایت سے منہ پھیر لیا۔ تو اُس کا سخت عذاب تمہیں دنیا و آخرت میں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم اور ہر نہی مصلحتوں پر مبنی ہے۔ ہر چیز جس کا اُس نے حکم دیا ہے، مفید ہے۔ اور ہر وہ چیز جس سے اُس نے روکا ہے وہ مضر ہے۔ اگر مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی سنن کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے۔ تو اس کا بُرا اثر عقائد و اعمال پر پڑتا ہے اور وہ گمراہی میں مبتلا ہو کر بُرے انجام سے دوچار ہو جاتا ہے الٰہی عذاب دنیوی و اخروی دونوں سزاؤں پر مشتمل ہے۔ بعض آیات میں ان دونوں کی تصریح آئی ہے اور بعض میں صرف ایک کا ذکر ہے۔ مثلاً وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القریٰ وھی ظالمۃ ط ان اخذہ الیم شدید ○

---

[1] حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی رح فرماتے ہیں کہ اس آیت میں شعائر اللہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جو حق تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لئے خاص علامات و نشانات قرار دی گئی ہیں۔ ان کی بے حرمتی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں حرم بیت اللہ شریف، جمرات، صفا و مروہ، ہدی، احرام، مساجد، کتب سماویہ وغیرہ تمام حدود و فرائض اور احکام و بیّنہ شامل ہیں۔ ان نشانیوں میں سے بعض کا ذکر اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں محرم کے بعض احکام ذکر کئے گئے تھے۔

ادب والے مہینے (الشہر الحرام) چار ہیں۔ منھا اربعۃ حرم (توبہ ع) ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ ان کی تعظیم و احترام یہ ہے کہ دوسرے مہینوں سے بڑھ کر ان میں

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ ص ۱۳۲ [2] فوائد القرآن ص ۱۳۷

Marfat.com

نیکی اور تقویٰ کو لازم پکڑنے اور شر و فساد سے بچنے کا اہتمام کیا جائے خصوصاً حاجیوں کو ستانا اور دق کرکے حج بیت اللہ سے نہ روکا جائے۔ گو یہ امور سال کے بارہ مہینوں میں واجب العمل ہیں لیکن ان محترم مہینوں میں بہت زیادہ مؤکدہ قرار دیئے گئے۔ باقی رہا دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں ہجومۂ اقدام، تو جمہور کا مذہب یہی ہے بلکہ ابن جریر رحمہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اُس کی ان مہینوں میں ممانعت نہیں رہی۔ تفصیل سورۂ توبہ میں ہے۔

ولا آمین البیت الحرام لظاہر یہ شان صرف مسلمانوں کی ہے یعنی جو مخلص مسلمان حج و عمرہ کے لئے جائیں ان کی تعظیم کرو اور ان کی راہ میں روڑے مت اٹکاؤ۔ اور جو مشرکین حج بیت اللہ کے لئے آتے تھے۔ اگر وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہوں کیونکہ وہ بھی اپنے زعم اور عقیدہ کے موافق خدا کے فضل و قرب اور خوشنودی کے طالب ہوتے تھے۔ تو کہنا پڑے گا۔ کہ یہ حکم اُس وقت سے پہلے کا ہے جبکہ انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامہم ھذا کی منادی کرائی گئی تھی۔

ولا یجرمنکم شنآن قوم جن شعائر اللہ کو معظم و محترم قرار دیا گیا ہے ۶ھ میں مشرکین مکہ نے ان سب کی اہانت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہؓ ماہ ذی قعدہ میں محض عمرہ ادا کرنے کے لئے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر مشرکین نے اس مذہبی وظیفہ کی بجا آوری سے روک دیا۔ نہ حالتِ احرام کا خیال کیا نہ کعبہ کی حرمت کا، نہ محترم مہینہ کا نہ ہدی و قلائد کا۔ مسلمان شعائر اللہ کی اس توہین اور مذہبی فرائض سے روک دیئے جانے پر اس ظالم اور وحشی قوم کے مقابلہ میں جس قدر بھی غیظ و غضب اور بغض و عداوت کا اظہار کرتے وہ حق بجانب تھے اور جوشِ انتقام سے برافروختہ ہو کر جو کارروائی بھی کر بیٹھتے وہ ممکن تھی۔ لیکن اسلام کی محبت و عداوت دونوں بھی تلی ہیں۔ قرآن کریم نے ایسے ظالم و جابر دشمن کے مقابلہ پر بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا عموماً آدمی زیادہ محبت یا زیادہ عداوت کے جوش میں حد سے گزر جاتا ہے اس لئے فرمایا کہ سخت سے سخت دشمنی بھی تمہارے لئے اس امر کا باعث نہ ہو کہ زیادتی کر بیٹھو اور عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔

ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان اگر کوئی شخص بالفرض جوشِ انتقام میں زیادتی کر بیٹھے تو اُس کے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ جماعتِ اسلام اُس کے ظلم و عدوان کی

لہ فوائد القرآن ص ۱۱۷

Marfat.com

اعانت نہ کرے۔ بلکہ سب مل کر نیکی اور پرہیزگاری کا مظاہرہ کریں اور اشخاص کی زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کو روکیں۔ آگے فرمایا کہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الخ یعنی حق پرستی، انصاف پسندی اور تمام عمدہ اخلاق کی جڑ خدا کا خوف ہے اور اگر خدا سے ڈر کر نیکی سے تعاون اور بدی سے ترکِ تعاون نہ کیا جائے تو عام عذاب کا اندیشہ ہے۔

سید قطب شہید شعائر اللہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ان سے مراد حج و عمرہ کے شعائر اور حالتِ احرام کی ممنوع چیزیں ہیں۔ ان حرمتوں کو توڑنا حرمت الٰہی کی اہانت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی تو ان شعائر کو مقرر کیا ہے اور انہیں تعظیماً یہاں شعائر اللہ کہا گیا اور یہ مقصود بھی ہے کہ کوئی ان کی حرمت کو حلال نہ جانے۔

اہل عرب اسلام سے قبل باحرمت مہینوں کا احترام کیا کرتے تھے لیکن انہیں اپنی خواہشات نفس کا اکھاڑا بنا رکھا تھا۔ مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے اور اس فعل میں کاہنوں اور بعض قبائل کے چوہدریوں کا کہا مانتے تھے۔ اسلام نے ان مہینوں کی اصل حرمت کو قائم کیا۔ نسیئ (مہینوں کو آگے پیچھے کرنا) کو حرام ٹھہرایا۔ ہاں جو لوگ ان مہینوں کو ڈھال بنا کر اسلام اور اہل اسلام کو ضرر پہنچانے سے نہ چوکتے تھے۔ ان کی زیادتیوں کے رد کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

ھدی کی حرمت توڑنے میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ اسے کعبۃ اللہ کے پاس تقرب الٰہی کے علاوہ کسی اور غرض کے لئے ذبح نہ کیا جائے اور حج میں دسویں تاریخ کو اور عمرہ میں عمرہ کے اختتام پر ہی اُسے قربان کیا جائے اور اُس کے گوشت پوست اور اون وغیرہ سے کوئی نفع نہ حاصل کیا جائے بلکہ سب کو فقراء کے حوالہ کر دیا جائے۔

حرم بیت اللہ امن و امان کا منطقہ ہے۔ اسی طرح باحرمت مہینے بھی امن و امان کا زمانہ ہے۔ حرم میں اور حالتِ احرام میں انسان، حیوان، پرندے اور درخت تک آزادی سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ حَرَمٌ اور اشہر حُرُم میں امن و سلامتی کا دَور دورہ ہوتا ہے۔ اسلام کے سائے میں قلبِ انسانی اس سلامتی کا مزا چکھ سکتا ہے۔ مسلمان اس امن و سلامتی کو عام کرنے اور کائنات پر اسے بکھیرنے کے لئے مامور ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذاتی و قومی احساسات سے بلند و بالا ہو کر دشمنوں تک کو امان دینے اور ان سے عدل و انصاف اور شفقت سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام اس قسم کے احکام دے کر اُمت مسلمہ کو قیادت و سرداری اور شہادت کے مقام بلند و رفیع پر فائز کرنا چاہتا ہے۔ غضب و کراہت اور بغض و عداوت انسانی نفوس میں ودیعت

لہ فی ظلال القرآن ص ۹۶ ج ۶ (طبع سوم)

Marfat.com

کیے گئے ہیں۔ لیکن اسلام ان حالتوں میں بھی اپنے ماننے والوں کو تعدّی اور ظلم کی اجازت نہیں دیتا بلکہ ان کی تربیّت ایسے انداز میں کرتا ہے کہ وہ نیکی اور خوفِ خدا میں تو باہم تعاون کریں مگر زمانہ جاہلیت کی عصبیتِ جاہلہ کا مظاہرہ نہ کریں۔ اسلام نے دلوں کو اللہ کے ساتھ مربوط کر دیا ہے اور اخلاق و معاملات کی قیمتوں کو پرکھنے اور ناپنے تولنے کے لئے عدل و انصاف کا پیمانہ اور حق کی میزان مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دی ہے اسی اسلامی تربیت نے عرب میں ایک جدید انسانیت کو جنم دیا۔ یہ صرف عرب کا نہیں بلکہ عالم انسانی کا ایک جدید جنم تھا۔ جس نے انسانوں کو نفرت، ظلم و طغیان اور اندھی جاہلیّت کے اندھے بہرے تعصب سے انسان کو نجات دلائی۔ عرب شاعروں کے بیان کردہ تعصب سے اس آیت کا مقابلہ کیا جائے۔ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ الخ تو جاہلیّت اور اسلام کا واضح فرق سمجھ میں آجاتا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ

حرام کیا گیا تم پر مردہ جانور اور خون اور سور کا گوشت

وَمَا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ

اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور جو مرا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ

وَالْمُتَرَدِّیَةُ وَالنَّطِیْحَةُ وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا

گرنے سے یا اونچی جگہ سے گر کر یا سینگ مارنے سے اور جس کو درندے نے کھایا ہو مگر جس کو تم نے ذبح

مَا ذَکَّیْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَاَنْ

اور حرام ہے جو ذبح کیا کسی تھان پر اور یہ کہ

تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِکُمْ فِسْقٌ اَلْیَوْمَ یَئِسَ

تم تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے یہ گناہ کا کام ہے۔ آج ناامید ہو گئے

الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ

کافر تمہارے دین سے سو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے تمہارا دین اور پورا کر دیا میں نے تم پر اپنا احسان

Marfat.com

وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي

اور پسند کیا میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین پھر جو کوئی لاچار ہو جائے

مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣﴾

بھوک میں لیکن مائل نہ ہو گناہ پر تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے

اَلْمَيْتَةُ - اس آیت سے جن چیزوں کا کھانا حرام ہوا اُن میں سے پہلا میتہ (مردار جانور ہے) جو واجب الذبح جانور ذبح کئے بغیر خود اپنی موت سے مر جائے - اُس کا خون اور حرارت عزیزیہ گوشت ہی میں بند اور جذب ہو کر رہ جاتی ہے جس کے زہریلے پن اور گندگی سے کئی قسم کے بدنی اور دینی نقصان لاحق ہوتے ہیں (ابن کثیر) شاید اسی علت پر تنبیہ فرمانے کے لئے مُردہ جانور کے لبد خون کی حرمت مذکور ہوئی - اُس کے بعد حیوانات کی ایک خاص نوع (خنزیر) کی حُرمت کا ذکر کیا - جس کی بے انتہا نجاست خوری اور بے حیائی مشہور عام ہے - شاید اسی لئے شریعت حقہ نے خون کی طرح اُسے نجس العین قرار دیا - ان تینوں چیزوں کے ذکر کے بعد جن کی ذوات میں مادّی گندگی اور خباثت پائی جاتی تھی، محرمات کی ایک اور قسم کا ذکر فرمایا یعنی وہ جانور جو اپنی ذات کے اعتبار سے حلال و طیّب ہے - مگر مالک حقیقی کے سوا کسی اور کی نیاز کے طور پر نامزد کیا گیا ہو - اُس کا کھانا بھی نیت کی خباثت اور عقیدہ کی گندگی کی بنا پر حرام ہے - کسی جاندار کی جان صرف اُسی مالک اور خالق حقیقی کے نام اور حکم پر لی جا سکتی ہے، جس کے حکم و ارادہ سے اُس پر موت و حیات، طاری ہوتی ہے یا منخنقہ وغیرہ غیر مذبوح جانور سب میتہ کے حکم میں داخل ہیں - جیسا کہ ماذبح علی النصب، ماأهل به لغير الله کے ساتھ ملحق ہے - زمانۂ جاہلیّت میں ان سب چیزوں کے کھانے کی عادت تھی، اسی لئے قدرے تفصیل کے ساتھ ان کا بیان فرمایا - خون سے مراد بہتا ہوا خون ہے جیسا کہ سورۂ انعام میں فرمایا اَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا (ع۱۸) اوپر کی آیت میں ہدی کے ادب و احترام کا ذکر تھا - یعنی وہ جانور جو تقرّب (نیاز) الی اللہ کی غرض سے خدائے واحد کی سب سے پہلی عبادت گاہ کی نیاز کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے اس کے با لمقابل اس جانور کا ذکر فرمایا جسے خدا کے سوا کسی

لہ فوائد القرآن عثمانی رح ص ۱۳۷

Marfat.com

دوسرے کے نام پر یا خانۂ خدا کے سوا کسی دوسرے مکان کی تعظیم کے لئے ذبح کیا جائے (معجم القرآن) اس دوسری صورت میں بھی فی الحقیقت منّت نذر لغیر اللہ کی ہوتی ہے گو ذبح کے وقت زبان سے "بسم اللہ، اللہ اکبر" کہا جائے۔ اس تقریر کے موافق مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا فرق واضح ہو گیا (ابن کثیر)

ابتدائے سورت میں اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ کا جو اشارہ ہے اب ان حرام چیزوں کا بیان شروع ہوتا ہے۔ ا۔ ان میں پہلی چیز المیتۃ ہے۔ عُرف عام میں اُس سے مراد طبعی موت مرا ہُوا جانور ہے۔ لیکن عرفِ شرع میں اس سے مراد وہ جانور ہے جو از خود مر جائے اور اسے کھانے کے لئے ذبح نہ کیا گیا ہو۔ اس کی حُرمت کی حکمت یہ ہے کہ:

۱۔ طبائع سلیمہ کو اس سے گھن آتی ہے۔

۲۔ اُس کے کھانے میں ذلّت ہے جو عزّت نفس اور انسانی بڑائی کے خلاف ہے۔

۳۔ اُس کے کھانے سے ضرر پیدا ہوتا ہے۔ چاہے وہ کسی بیماری سے مرا ہو یا شدّتِ ضعف سے یا جراثیم کے باعث مرا ہو جن سے اُس کے قویٰ اکھڑ گئے ہوں۔

۴۔ مسلمانوں کو اس امر کا عادی بنانا مدّ نظر ہے کہ جس جانور کی جان نکالتے ہیں ان کا قصد (کھانے کے لئے) پایا جاتا ہو، ان کے سوا اور چیزیں نہ کھائیں۔

ب۔ دوسری چیز الدم (خون، لہو) ہے جس سے مراد بہتا ہوا خون ہے۔ یعنی وہ مائع خون جو حیوانوں میں سے نکالا اور بہایا جائے۔ چاہے بعد میں وہ جم چکا ہو۔ جو خون فطرتاً جما ہوا ہو مثلاً جگر، کلیجہ اور تلی وغیرہ۔ اور جو خون عادتاً گوشت کے اندر لگا رہتا ہے وہ مسفوح نہیں ہے۔ اس کی تحریم کی علّت بھی نقصان اور گھن کا آنا ہے نقصان اس لئے کہ وہ نہایت ہی مشکل سے ہضم ہوتا ہے اور بہت سے گندے اور بدبو دار مادے جسم سے نکل کر اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ فضلے ہوتے ہیں جنہیں طبیعت بول و براز وغیرہ کی مانند باہر پھینک دیتی ہے اس میں متعدی امراض کے جراثیم بھی ہوتے ہیں۔ اور گوشت کی نسبت خون میں ان کی مقدار زیادہ تر ہوتی ہے۔ اسی لئے اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ دودھ کو پینے سے پہلے اُبال لینا چاہیئے تاکہ متعدی امراض کے جراثیم ختم ہو جائیں۔

ج۔ تیسرا سؤر کا گوشت ہے اس میں ضرر اور گندگی پائی جاتی ہے۔ جس سے سخت گھن آتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ گندگی کھاتا ہے اور وہی اس کی مرغوب غذا ہے۔ اُس کے ضرر کو

لہ تفسیر المنار ج ۶ ص ۱۲۶، ۱۲۷ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۴۷، ۵۱۔

Marfat.com

جدید طبّ نے ثابت کر دیا ہے۔ اس کی نجاست خوری سے بے پناہ نقصان ہوتا ہے۔ اس کے گوشت سے بہت سے مُضر جراثیم اور کیڑے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ مردہ چوہے بھی کھا جاتا ہے۔ جن سے کئی مہلک کیڑے اس کے جسم میں پرورش پاتے ہیں اور اس کا گوشت نہایت ہی مشکل سے ہضم ہونے والا ہے کیونکہ اس کے پٹھوں سے متصل بے پناہ چربی ہوتی ہے اس کا گوشت کھانے سے معدے میں سخت بوجھ پیدا ہوتا ہے اور ہضم کا نظام مختل ہو جاتا ہے۔ دل میں گھٹن اور بے چینی پیدا ہوتی ہے اگر قے ہو جائے تو معدہ ہلکا ہو جاتا ہے ورنہ معدے میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور اسہال کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ اگر زہریلی چیزوں کے کھانے پینے کی عادت لوگوں میں نہ ہوتی اور سگریٹ نوشی وغیرہ عام نہ ہوتی جس سے اس کے گوشت کا ضرر کچھ کم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے گوشت کا کھانا اور ہضم کرنا، بالخصوص گرم ممالک میں ناممکن ہوتا۔

د۔ چوتھی چیز مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ہے۔ اِہلال کا معنیٰ ہے آواز بلند کرنا حاجی جب لبیک پکارتا ہے تو اُسے کہتے ہیں اَهَلَّ بِالْحَجِّ۔ بچہ جب پیدائش کے وقت روتا ہے تو کہا جاتا ہے اِسْتَهَلَّ الصَّبِیُّ ما اهل لغير الله به سے مراد غیر اللہ کے نام پر یا غیر اللہ کے تقرب کے لئے نامزد ذبیحہ ہے اہل عرب اپنے بتوں کے لئے جانور نامزد کرتے اور ذبح کرتے تھے۔ اس کی تحریم کی حکمت یہ ہے کہ یہ غیر اللہ کی عبادت ہے۔ جس کا انکار واجب ہے۔ اس کے کھانے میں مشرکوں کے ساتھ مشارکت لازم آتی ہے۔ کسی نبی یا ولی کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور، جیسا کہ اہل کتاب اور بعض جاہل مسلمان بھی کرتے ہیں، مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل ہے۔

ھ۔ پانچویں حرام چیز مُنْخَنِقَہ ہے۔ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے کئی اقوال اس کی تعیین بیان کر کے انہیں اس طرح جمع کیا ہے کہ وہ جانور جو اپنی رسی ٹیکے وغیرہ سے گھٹ کر مر جائے یا کسی اور طریقے سے اس کا گلا گھٹ جائے یا گھونٹ دیا جائے اور اس کی موت واقع ہو جائے وہ منخنقہ ہے۔ یہ جانور بھی دراصل میتہ ہی ہے کیونکہ انسان کے فعل ذبح و تذکیہ سے اس کی جان نہیں نکلی۔ خصوصیت سے اس کا ذکر اس لئے فرمایا گیا کہ جاہلیت میں کچھ عرب اسے کھاتے تھے اور چونکہ اس کی موت کا ایک معروف سبب ہے اس لئے خطرہ تھا کہ بعض لوگوں پر اسکی حرمت مشتبہ ہو جائے گی۔

شریعت نے جس تذکیہ کا اعتبار کیا ہے وہ فعل ذبح ہے جو انسان کے قصد و ارادہ سے ہو اور کھانے کے لئے کیا جائے اور جانور بھی ایسا ہو جو شرعاً حلال و طیب ہے۔ اگر کوئی شخص جانور کو گلا دبا کر یا کسی اور طریقے سے سانس روک کر (یا فی الفور اس کا گلا کاٹ کر) مار ڈالے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ یہ سب مَیتہ کے حکم میں داخل ہیں!۔

Marfat.com

د۔ چھٹی حرام چیز موقوذہ ہے۔ اس کا مادہ وقذ ہے۔ جس کا معنی ہے سخت چوٹ کھانا۔ موقوذہ وہ جانور ہے۔ جسے لکڑی یا پتھر وغیرہ سے (جو دھاردار نہ ہو) قتل کر دیا جائے اور وہ ذبح کئے بغیر ہی مر جائے۔ زمانہ جاہلیت میں اسے کھایا کرتے تھے۔ لیکن اس فعل کو اور چوٹ لگ کر مرے ہوئے جانور کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس میں حیوان کی تعذیب ہے۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "بے شک اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ سو جب قتل کرنا پڑے تو اس فعل کو اچھی طرح سے سرانجام دو اور جب ذبح کرنا ہو تو اچھی طرح ذبح کرو۔ یہ کام کرنے والا چھری تیز کرے اور ذبیحہ کو راحت پہنچائے (احمد و مسلم)

چوٹ سے مرنے والا جانور بھی مردار ہے۔ کیونکہ اُسے حکم شرع کے مطابق ذبح نہیں کیا گیا۔ اس میں غلیل سے مارا ہوا جانور بھی داخل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "حذف" سے منع فرمایا ہے۔ حذف کا معنی ہے کنکری، ٹھیکری یا کوئی اور خشک چیز پھینکی جائے جس میں دھار نہ ہو۔ چاہے اُسے ہاتھ سے پھینکا جائے یا کسی غلیل وغیرہ سے۔ حضورؐ نے اسی سلسلے میں فرمایا کہ "وہ نہ آنکھ پھوڑ سکتا ہے۔ نہ دشمن کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ شکار کر سکتا ہے۔

"پس اس حدیث میں تحریم کی علت پر صراحت ہے کہ وہ جانور کی تعذیب کا باعث ہے۔ اور عام طور پر اُس سے جان نہیں نکلتی نہ وہ آلۂ قتل یا سبب قتل ہے۔ رہی شکاری بندوق جو آج کل مستعمل ہے۔ سو اُس سے شکار ہو سکتا ہے اور جس پر چلائی جائے اُسے جراحت پہنچا سکتی ہے، اس لئے علماء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے (احقر مرتب عرض کرتا ہے کہ فقہ حنفی کے اصول پر بندوق کی گولی چونکہ دھاردار ہونے کی وجہ سے جسم میں داخل نہیں ہوتی بلکہ بالمدد کے زور سے گھستی ہے۔ اس لئے اس کا مارا ہوا شکار اگر زندہ ہاتھ نہ آئے اور ذبح نہ کر لیا جائے تو حرام ہوگا۔ ہمارے ہاں کے معتمد علماء کا یہی فتویٰ ہے)

ز۔ ساتواں حرام جانور متردیہ ہے یعنی جو بلند جگہ سے نیچے گر کر ——— مثلاً پہاڑ سے گر کر یا کنوئیں میں گر کر ——— مر جائے، یہ بھی مردار کے حکم میں ہے کیونکہ اس کی جان نکالنے میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں اور نہ اُسے کھانے کی نیت سے ذبح کیا گیا ہے۔

لہ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۴۱، تفسیر حقانی ج ۴ ص ۵

Marfat.com

ح۔ آٹھواں حرام جانور نطیحہ ہے۔ نطح کا معنیٰ ہے۔ سینگ مارنا۔ اگر ایک جانور دوسرے کو سینگ سے مار ڈالے اور اُسے وقت پر ذبح نہ کر لیا جائے۔ تو وہ بھی مردار ہے۔ اس لئے حرام ہے۔

(ط) نواں جانور وہ ہے جسے کسی درندے مثلاً شیر، چیتے، بھیڑیئے وغیرہ نے مار ڈالا ہو۔ اس کی حرمت کی شرط یہ نہیں کہ درندہ اس میں سے کچھ کھا گیا ہو۔ کیونکہ اُس کا اُسے شکار کرنا اور قتل کرنا اُس کی تحریم کے لئے کافی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں درندوں کے پھاڑے ہوئے جانوروں کو کھا لیا کرتے تھے حالانکہ اکثر طبائع انسانی اس سے گریز کرتی ہیں اور لوگ ہمیشہ اُسے کھانا ذلت و خواری جانتے رہے ہیں۔

اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کا استثناء گزشتہ تمام حرمت سے نہیں ہے بلکہ صرف اُن سے ہے۔ جو ذکات اور ذبح کو قبول کر سکیں مثلاً منخنقہ، موقوذہ، متردیہ اور نطیحہ۔ اور مراد جانور، خون، خنزیر اور درندوں کا مارا ہوا شکار چونکہ فعل ذبح سے متاثر نہیں ہوتا، لہٰذا ان چیزوں سے یہ استثناء نہیں ہے (مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ) کی وہ قسم جسے غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جاتا ہے وہ بھی مستثنیٰ منہ نہیں بن سکتی۔ ہاں اگر استثناء کو منقطع مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کی بجائے جو جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو وہ حلال ہے) آیت کا معنیٰ اس صورت میں یہ ہوا کہ جس جانور کو تم نے اپنے فعل سے ذبح کر لیا۔ بشرطیکہ وہ قابل تذکیہ ہو، وہ حلال ہے۔ اور ان مذکورہ جانوروں کی ذکات کے ادراک کی صحت کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ ان میں زندگی کی رمق موجود ہو مثلاً ان کی آنکھ پھڑک رہی ہو یا وہ دم وغیرہ ہلا رہے ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب تم موقوذہ، متردیہ اور نطیحہ کو زندہ پاؤ وہ ہاتھ یا پاؤں ہلا رہے ہوں تو انہیں ذبح کر کے کھاؤ۔

ی۔ دسواں حرام جانور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ہے نُصُب واحد ہے اس کی جمع انصاب ہے اور ان سے مراد وہ پتھر ہیں جو ۳۶۰ کی تعداد میں کعبۃ اللہ کے اردگرد رکھے یا گاڑے ہوئے تھے۔ اہل جاہلیت ان پر جانور ذبح کرتے اور اسے عبادت جانتے تھے۔

مردار[1]، خون اور خنزیر کے گوشت کی حرمت کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ چیزیں پاکیزہ اور ستھری نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ خبیث اور ناپاک چیزوں کو ہی حرام قرار دیتا ہے۔ چاہے انسانی علم ان کی حکمتِ تحریم کو پا سکے یا نہ پا سکے، علمِ الٰہی میں یہ خباثت اور ناپاک

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ صـ (طبع سوم)

Marfat.com

چیزیں ہیں اور کسی نہ کسی طور پر انسانی زندگی کو نقصان پہنچاتی ہیں وحی سے بے نیاز انسانی علم ہر مفید یا ہر مضر چیز اور اُس کی حکمت کو نہیں پا سکا اور نہ پا سکے گا۔ اس باب میں اصل معیار پیغمبرؐ کی تشریح ہے

مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کو اس لئے حرام ٹھیرایا گیا کہ وہ ابتداء سے ہی ایمان کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایمان اللہ سبحانہ، کو الوہیت میں واحد اور منفرد قرار دینا اور اُس کے تقاضوں کو اس توحید پر مرتب کرتا ہے۔ ان تقاضوں میں سے پہلا یہ ہے کہ ہر نیت اور ہر عمل میں توجہ صرف اللہ کی طرف ہو اور ہر کام اور حرکت میں اُسی کا نام پکارا جائے اور ہر چیز کی ابتداء اُسی کے نام سے کی جائے۔ اس لئے جس جانور کو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا جائے اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے وہ حرام ہے۔ کیونکہ وہ ایمان کی بنیاد ہی کے خلاف ہے۔ ایمان سے یہ چیز ابتداءً صادر ہی نہیں ہو سکتی۔ پس اس لحاظ سے وہ خبیث ہے اور اُسے محسوس خباثت ——— مردار، خون اور خنزیر کا گوشت ——— کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔

منخنقہ (جو گلا گھونٹنے سے مر جائے) اور موقوذہ (جسے ڈنڈے، لکڑی یا پتھر سے مارا جائے اور وہ مر جائے) اور مُتردّیہ (جو کسی بلند جگہ یا پہاڑ سے یا کنوئیں میں گر کر مر جائے) اور نطیحہ (جسے کوئی اور جانور سینگ سے مار ڈالے) اور درندوں کا کھایا ہوا (یعنی کسی وحشی جانور کا شکار) یہ سب مردار کی انواع ہیں بشرطیکہ حالت زندگی میں انہیں ذبح نہ کر لیا گیا ہو۔ ان کی تفصیل یہاں اس لئے بیان فرمائی گئی ہے تاکہ اس شبہے کی نفی کی جائے کہ آیا ان کا کوئی مستقل حکم ہے۔ تذکیہ اور ذبح کے احکام کی تفصیل فقہ سے طلب کرنی چاہیئے۔ بعض اقوال کے مطابق جس جانور کو یک لخت مار ڈالنے والی کوئی آفت پہنچے، یا جس سے اس کی موت یقینی ہو جائے اُس جانور کو اگر ذبح بھی کر لیا جائے تو وہ مذکّاۃ (حلال) نہیں ہے۔ لیکن کچھ دوسرے اقوال کے مطابق اگر ایسے جانور کو زندہ پا لیا جائے اور شرعی طریقے سے ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہے۔

مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ: نُصُب وہ بت ہیں جو کعبہ میں تھے اور مشرک ان کے پاس جانور ذبح کرتے اور انہیں (زمانہ جاہلیت میں) ذبیحہ کے خون سے آلودہ کرتے تھے ——— بت جہاں کہیں بھی ہو اس کے لئے ایسا کرنا ناجائز ہے۔ یہ جانور بتوں پر ذبح شدہ ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔ حتیٰ کہ بالفرض اگر ان پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام بھی لیا جائے تب بھی حرام ہیں۔ کیونکہ ان میں شرک باللہ کا معنیٰ پایا جاتا ہے۔

Marfat.com

[1] وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ بعض مفسرین نے ازلام سے تقسیم کے تیر مراد لیے ہیں۔ جو زمانۂ جاہلیت میں ذبیحہ کا گوشت وغیرہ کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے۔ اور وہ قمار (جوئے) کی ایک صورت تھی۔ جیسے آج کل چٹھی ڈالنے (لاٹری) کی رسم ہے۔ لیکن حافظ عماد الدین رح ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ازلام سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس رکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر اَمَرَنِیْ رَبِّیْ (میرے پروردگار نے حکم دیا) لکھا تھا۔ کسی پر نَھَانِیْ رَبِّیْ (میرے رب نے مجھے منع کیا) تحریر تھا۔ اس طرح ہر تیر پر یوں ہی اٹکل پچو باتیں لکھ چھوڑی تھیں۔ جب کسی کام میں تذبذب ہوا۔ تو تیر نکال کر دیکھ لئے۔ اگر اَمَرَنِیْ رَبِّیْ والا تیر نکل آیا تو کام شروع کر دیا اس کے خلاف نکلا تو رک گئے۔ وعلیٰ ھٰذا القیاس۔ گویا جوئے سے یہ ایک قسم کا مشورہ اور استعانت تھی۔ چونکہ اس رسم کی بناء خالص جہل، شرک، اوہام پرستی اور افتراء علی اللہ پر تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے متعدد مواقع میں نہایت تغلیظ و تشدید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرمایا ہے۔ اس تقریر کے موافق ازلام کا ذکر نُصُب کی مناسبت سے ہوا اور مردار، خون، خنزیر وغیرہ نہایت ہی خبیث اور گندی چیزوں کی تحریم کے سلسلے میں منسلک کر کے بتلا دیا کہ اس کی معنوی اور اعتقادی نجاست و خباثت اُن چیزوں سے کم نہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں رِجْس کے اطلاق سے ظاہر ہوتا ہے۔

[2] اَلْاَزْلَامُ کا واحد زَلَم ہے۔ جو تیر کی شکل کا لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا تھا لیکن اس میں لوہے کا پھل نہیں لگاتے تھے۔ ازلام کی تین قسمیں تھیں ایک پر اَمَرَنِیْ رَبِّیْ لکھا تھا۔ دوسرے پر نَھَانِیْ رَبِّیْ لکھا تھا۔ اور تیسرا غُفْل (خالی) تھا اس پر کچھ لکھا ہوا نہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جب کوئی شخص سفر، نکاح، جنگ، بیع و شراء وغیرہ کا ارادہ کرتا تھا۔ تو ان تیروں کو ہلاتا تھا اور پھر ان میں سے ایک نکال لیتا تھا۔ اگر پہلا نکل آتا تو وہ اپنے ارادے پر روانہ ہو جاتا۔ اگر دوسرا نکلتا تو اس کام سے رک جاتا اور اگر تیسرا نکلتا تو پھر ایک مرتبہ وہی پہلا عمل کرتا۔ اسے اِسْتِقْسَام کہا جاتا تھا۔ یعنی تیروں کی معرفت قسمت کا پتہ چلانا۔ آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ تم پر پانسے کے تیروں کے ذریعے سے قسمت معلوم کرنا حرام

---

[1] فوائد القرآن ص ۱۳۸ (شیخ الاسلام عثمانی رح)
[2] تفسیر المنار ج ۶ ص ۱۴۷، المراغی ج ۶ ص ۵۱

Marfat.com

قرار دیا گیا ہے۔

اس تحریم کی حکمت یہ ہے کہ یہ ان اوہام و خرافات میں سے ہے۔ جن کی طرف سوائے ضعیف العقل احمق انسان کے کوئی توجہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسا کرنے والا جو کچھ کرتا ہے بلا دلیل و بصیرت کرتا ہے اور جو کچھ چھوڑتا ہے وہ بھی اندھا دھند ہی چھوڑتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کاہنوں، پروہتوں اور پجاریوں کے لئے ہاتھوں کا کھلونا بنا لیتا ہے۔ وہ ایسی چیزوں سے فال اور نحوست کا پتہ چلاتا ہے۔ جن میں کوئی فال اور نحوست نہیں۔ اسلام چونکہ عقل و بصیرت کا دین ہے اس لئے اس نے ان چیزوں اور اس قسم کے تمام اوہام و خرافات اور اباطیل کو باطل قرار دیا ہے اسی طرح اُس نے پرندہ اڑا کر فال لینے، کہانت، عرافت، عرافت اور جاہلیت کے دور کی تمام خرافات کو باطل ٹھیرا دیا ہے۔ اس کے ساتھ تیروں کے اس کاروبار میں اگر اَمرنی ربی اور نہانی ربی سے مراد اللہ عزوجل ہے تو یہ اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی ہے اور اگر یہاں رب سے مراد بُت ہے تو یہ جہالت اور شرک ہے نیز اس کام میں علم غیب کی طلب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص رکھا ہے۔

اہلِ اسلام میں سے بعض جاہلوں نے مشرکین جاہلیت کی سنت اختیار کر لی ہے۔ پس تم انہیں تسبیحات وغیرہ سے طلب قسمت کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہو اور وہ اس کا نام استخارہ رکھتے ہیں۔ یا اُسے فال کہتے ہیں۔ تسبیح کے کچھ دانے الگ نکال کر انہیں یکے بعد دیگرے گھماتے اور حرکت دیتے جاتے ہیں ایک پر اِفْعَلْ اور دوسرے پر لَا تَفْعَلْ کہتے جاتے ہیں۔ فیصلہ کن امر آخری دانے سے وابستہ ہوتا ہے اگر وہ اِفْعَلْ پر آجائے تو اثبات ہے ورنہ نفی۔ ظاہر ہے کہ شروع میں جس استخارے کا اذن آیا ہے یہ خرافات اس سے دور کی نسبت بھی نہیں رکھتی۔ بلکہ اس کی حُرمت کے دلائل موجود ہیں۔

بعض لوگ قرآنِ کریم سے قسمت نکالتے یا فال لیتے ہیں اور اپنے اس فعل کو دین کے رنگ میں رنگنے اور باطل کو حق کا لباس پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل کے جواز کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ لیکن رسم و رواج اور عادت نے ان بدعتوں کو مستحسن بنا ڈالا ہے۔ انہوں نے اس کے لئے "اچھی فال" کا لفظ ایجاد کیا ہے۔ اور اس باب میں ام المومنین عائشہ رضؓ کی حدیث بیان کرتے ہیں۔ کہ کَانَ یُعْجِبُہُ اَلْفَالُ الْحَسَنُ۔ حالانکہ اُن کا یہ فعل فالِ حسن نہیں۔ حدیث میں تفاؤل کا لفظ طِیَرَہ (پرندہ اڑا کر قسمت معلوم کرنا) کے مقابلے میں بطورِ ضد واقع ہوا ہے۔ اور حدیث نے اس طیرہ کو باطل ٹھیرا دیا ہے۔ الفال الحسن کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کوئی اچھا نام یا کوئی کلمۂ خیر یعنی اچھی بات وغیرہ سُنے تو اس کا شرح صدر ہو جائے۔

Marfat.com

ان بعض اسلام کے دعویداروں کا عجیب حال ہے کہ قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کرنا تو انہیں بھاتا نہیں۔ اس چیز کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ بلکہ اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور اس پر ایمان لانا اور اس کی تعظیم ان کے لئے بس اس قدر کافی ہو گئی ہے کہ کبھی ضرورت کے وقت اہل جاہلیت کی طرح قرآن سے قسمت معلوم کرنے اور اپنی اغراض کے لئے اسے استعمال کرنے کا مشئوم فعل کر لیا ہے۔ یا کبھی اس کی آیات کو کاغذ یا پیالے میں لکھ کر بیمار کو پلا دیں تاکہ اسے شفاء حاصل ہو جائے۔ یہ سب کچھ ان گمراہیوں اور خرافات میں سے ہے۔ جن کا کوئی ثبوت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالح سے نہیں ملتا۔

اس سے بھی عجیب تر امر یہ ہے کہ بعض دجالوں نے استقسام کو استخارہ کی قبیل سے گردانا ہے اور بعض اسے جائز قرعہ اندازی کی مانند قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور یہ سب کچھ گمراہی ہے۔ جس پر کوئی دلیل اور سند موجود نہیں۔ جائز استخارہ جس کا ذکر سنت میں وارد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نماز اور دعا کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی جائے اور اس سے حیرت کو دور کرنے اور جہاں دلائل میں تعارض ہے وہاں فائدہ مند چیز کی طرف راہنمائی کی التجا کی جائے اس دعا والتجا سے اگر کسی کام میں خیر واضح ہو جائے یا کسی امر کی جانب راجح ہو جائے تو اسے کر لیا جائے۔ چنانچہ صحاح میں جابر بن عبداللہ رضی سے استخارہ کا طریقہ اور دعا منقول ہے اور قرعہ اندازی بھی اس کے مشابہ ہے بلکہ اس کا معاملہ تو زیادہ واضح ہے کیونکہ قرعہ اندازی ان دو کاموں یا باتوں میں ہوتی ہے۔ جو قطعی طور پر مساوی ہوں اور فیصلہ نہ ہو سکے۔ مثلاً دو شخصوں میں کوئی چیز تقسیم کرنا۔ دونوں میں سے جو کوئی بھی پہلا یا دوسرا حصہ لے جائے۔ اس کے ساتھ ناجائز رعایت یا بے انصافی نہیں ہوتی۔ پس قرعہ اندازی ایک اچھا اور عادلانہ طریقہ ہے پس ثابت ہو گیا کہ شرعی استخارہ یا قرعہ اندازی میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کا نام لے کر استقسام کو حلال جانا جائے یا اُن کے نام کے پردے میں ناجائز کاروبار کیا جائے۔

سلہ سید قطب شہید رح فرماتے ہیں کہ ازلام ان تیروں کا نام ہے۔ جن سے زمانہ جاہلیت میں کسی کام کے اقدام یا ترک کا مشورہ کیا جاتا تھا۔ ایک قول کے مطابق وہ تین ہوتے تھے اور دوسرے کے مطابق سات۔ اسی طرح یہ تیر عرب کے مشہور جوئے اور قمار بازی میں بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ ان کے ذریعے سے اونٹوں کا گوشت تقسیم ہوتا تھا۔

(فی ظلال القرآن ج ۶ صلہ طبع سوم)

Marfat.com

جس اونٹنی پر قمار کرنا ہوتا تھا۔ ہر جوئے باز کا ایک ایک تیر ہوتا تھا۔ تیروں کو گھما کر پھیر کر ان میں سے ایک نکالتے تھے۔ جس کا تیر نکلتا اور اس پر جو حصہ لکھا ہوتا وہ اسے مل جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے تیروں سے قسمت نکالنے اور قمار بازی کرنے دونوں کو حرام قرار دیدیا ہے۔

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون ط

شیخ الاسلام علامہ عثمانی فرماتے ہیں، یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی۔ جبکہ زندگی کے ہر شعبہ اور علوم ہدایت کے ہر باب کے متعلق اصول و قواعد ایسی طرح ممہد ہو چکے تھے اور فروع و جزئیات کا بیان بھی اتنی کافی تفصیل اور جامعیت سے کیا جا چکا تھا کہ پیروانِ اسلام کے لئے قیامت تک قانون الٰہی کے سوا کوئی دوسرا قانون قابل التفات نہیں رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے ہزاروں متجاوز خدا پرست، جانباز اور سرفروش ہادیوں اور معلموں کی ایسی عظیم الشان جماعت تیار ہو چکی تھی کہ جس کو قرآنی تعلیم کا مجسم نمونہ کہا جا سکتا تھا۔ مکہ معظمہ فتح ہو چکا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کامل وفاداری کے ساتھ خدا سے عہد و پیمان پورے کر رہے تھے۔ نہایت گندی غذائیں اور مردار کھانے والی قوم مادی اور روحانی طیبات کے ذائقہ سے لذت اندوز ہو رہی تھی۔ شعائر الٰہیہ کا ادب و احترام قلوب میں راسخ ہو چکا تھا۔ ظنون و اوہام اور انصاب و ازلام کا تار و پود بکھر چکا تھا۔ شیطان جزیرۃ العرب کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مایوس کر دیا گیا تھا کہ دوبارہ وہاں اُس کی پرستش ہو سکے ان حالات میں ارشاد ہوا الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون ط یعنی آج کفار اپنی بات سے مایوس ہو گئے ہیں کہ تم کو تمہارے دین قیم سے ہٹا کر پھر انصاب و ازلام وغیرہ کی طرف لے جائیں، یا دین اسلام کو مغلوب کرنے کی توقعات باندھیں۔ یا احکام و سنیہ میں کسی تحریف و تبدیلی کی اُمید قائم رکھ سکیں۔ آج تم کو کامل و مکمل مذہب مل چکا۔ جس میں آئندہ کسی ترمیم کا امکان نہیں خدا کا انعام تم پر پورا ہو چکا، جس کے بعد تمہاری جانب سے اُس کے ضائع کر دینے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ خدا نے ابدی طور پر اسی دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کر لیا۔ اس لئے اب کسی ناسخ کے آنے کا بھی احتمال نہیں ایسے حالات میں تم کو کفار سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ البتہ اُس محسن جلیل اور منعم حقیقی کی ناراضگی سے ہمیشہ ڈرتے رہو۔ جس کے ہاتھ میں تمہاری ساری فلاح و نجاح اور کل سود و زیان ہے۔ گویا فلا تخشوھم واخشون میں اس پر

لہ فوائد القرآن ص ۱۳۸

Marfat.com

پر متنبہ فرما دیا کہ آئندہ مسلم قوم کو کفار سے اُس وقت تک کوئی اندیشہ نہیں جب تک ان میں خشیت الٰہی اور تقویٰ کی شان موجود رہے۔

[1] اس آیت میں اَلْیَوْمَ سے مراد دس ہجری کے حجۃ الوداع کا یوم عرفہ ہے اور وہ جمعہ کا دن تھا اسی دن یہ عظیم آیت اُتری۔ جس نے اُن احکام کو مقرر کیا کہ جن کے ساتھ اسلام نے زمانۂ جاہلیت کی ذلتوں اور خواریوں کے بقایا اور کفر و شرک کے ادہام و خباثت کو باطل کیا ہے۔ اس آیت نے خوشخبری دی ہے کہ مسلمان مشرکوں پر پوری طرح غالب آجائیں گے۔ اور مشرکوں کی طمع مسلمانوں کے غلبے کے بارے میں لاشی محض ہے۔ اس لئے اس کے بعد مشرکوں کی مدارات یا ان سے خوف کھانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔

امام بیہقی رحمۃ شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے الیوم یئس الذین کفروا من دینکم کی تفسیر یوں نقل کی ہے کہ اہل مکہ مایوس ہو گئے ہیں کہ اب تم ان کے دین کی طرف لوٹو گے، یعنی اب تم بت پرستی کبھی نہ کرو گے۔ پس اے مسلمانو فَلَا تَخْشَوْهُمْ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں اُن سے مت ڈرو۔ وَاخْشَوْنِ اور بتوں کی عبادت کے بارے میں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے بارے میں مجھ سے ہی ڈرو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ آج کفار و مشرکین اہل اسلام کے دین کے زوال سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اب اُن کے لئے مناسب و روا نہیں کہ وہ خدا کے سوا کسی اور سے ڈریں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے اُن پر کتنا فضل و کرم اور کس قدر عزت افزائی فرمائی ہے، اُن کے ضعف کو قوت میں، خوف کو امن و بے خوفی میں اور نفر کو غنیٰ میں بدل دیا ہے۔ اس لئے دشمنانِ اسلام کی امیدیں منقطع ہو گئی ہیں کہ تمہارے دین کو مٹا ڈالیں گے۔ یا تم اس دین سے پھر جاؤ گے۔ کیونکہ ان کی آنکھوں نے تم پر فضل خداوندی کا مشاہدہ کر لیا ہے کہ اس نے تمہارے ساتھ اپنے وعدہ کو سب ادیان پر غالب کر دیا ہے۔

[2] بعض مکی سورتوں میں (مثلاً الانعام، النحل وغیرہ) کھانے کی صرف چار چیزوں کی تحریم پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یعنی مُردار، بہتا ہوا خون، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے لئے ذبح کیا ہوا یا نامزد جانور۔ محرمات کی تفصیل کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے آخری عہد تک ملتوی رکھا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد ان حرام چیزوں کی تفصیل نازل فرمائی گئی۔ اس کی

---

[1] المراغی ج ۶ ص ۵۳، المنار ج ۶ ص ۱۴۴ [2] المنار ج ۶ ص ۱۵۳

Marfat.com

حکمت یہ تھی کہ ان خبائث کی تحریم میں تدریج مدنظر تھی۔ جیسی تدریج شراب کی حرمت میں اختیار فرمائی گئی تھی۔ تاکہ اہل عرب اپنی وحشت و بدویت کی بنا پر اسلام سے متنفر نہ ہو جائیں اور اسلام پر ایمان لائے اور اُس کے احکام کو ماننے میں حرج نہ جانیں۔ مشرکوں کو توقع تھی کہ اسلام پر ایمان لانے والے اور اُس کے احکام کو دل و جان سے بجا لانے والے کسی نہ کسی دن اس سے پھر کر کفر میں واپس آجائیں گے۔ بالخصوص ان کا خیال اس وجہ سے بھی تھا کہ سابقین اوّلین میں اکثریت فقراء کی تھی۔ محرمات کی تفصیل اسلام کی قوت و شوکت اور اہل اسلام کی غنیٰ اور مالی وسعت کے بعد نازل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ مشرک مسلمانوں کے دین سے متنفر ہونے اور اس کی تکالیف سے فرار کر جانے سے ناامید ہو چکے تھے ان کی یہ طمع بھی زائل ہو چکی تھی کہ اب وہ مسلمانوں پر غالب آجائیں گے۔ اور قوت سے ان کے دین کو مٹا دیں گے۔ اس وقت مومنین کو کفار کی خاطر مدارات اور دلجوئی کی ضرورت قطعاً نہ رہی تھی نہ انہیں اپنے یا دین کے بارے میں کوئی خطرہ باقی تھا۔ پس ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اکمالِ دین اور اتمام نعمت کی آیت ۱۰ھ میں جمعہ کے دن میدانِ عرفات میں نازل فرما دی اور اہل اسلام کو حکم دے دیا کہ مشرکوں کا خوف دلوں سے قطعاً نکال ڈالیں کیونکہ وہ بھی اب تم سے بالکل مایوس و ناامید ہو چکے ہیں۔

آیت[1] اکمالِ دین قرآن کریم کی نزول کے لحاظ سے آخری آیت ہے اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی گہری بصیرت اور قلب و اصل سے جان لیا تھا کہ اب زمین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام تھوڑے رہ گئے ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے الٰہی امانت کو ادا کر دیا ہے، رسالت کو پہنچا دیا ہے۔ اب صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ آپؐ اللہ سے ملاقی ہو جائیں۔ جدائی کے دن کے احساس کی وجہ سے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو پڑے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ اب کافر دین حق کو مٹا سکنے اور اس میں نقص و تحریف پیدا کر سکنے سے ناامید ہو گئے ہیں۔ اللہ نے اُس کے لئے کمال اور بقاء مقدر کر دی ہے۔ اگر کبھی کفار مسلمانوں پر غالب بھی آجائیں تو بھی وہ اس دین پر غالب نہ آسکیں گے یہی وہ واحد دین ہے جو محفوظ رہے گا کہنگی اور نقص و تحریف سے پاک رہے گا۔ اس کے دشمن اسے مٹانا اور بدلنا چاہیں گے مگر ناکام ہونگے بعض زمانوں میں اہل اسلام شدید جہالت میں جا پڑیں گے اور دشمنوں کی خفیہ و علانیہ تدبیریں

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۸۲ (طبع سوم)

Marfat.com

تیز سے تیز تر ہو جائیں گی۔ پھر بھی یہ دین باقی رہے گا زمین کے کسی نہ کسی خطّے میں ایک مضبوط مومن جماعت ضرور موجود رہے گی جو اس دین کو جانتی ہوگی اور اس کا دفاع کریگی۔ یہ دین کامل، محفوظ اور مفہوم باقی رہے گا۔ ہر زمانے کے پچھلے لوگ اسے آنے والوں تک صحیح صورت میں منتقل کرتے رہیں گے۔ بے شک خدا کا یہ وعدہ سچا ثابت ہوا ہے۔ کافر اس دین کا تو کبھی کچھ نہ بگاڑ سکے۔ لیکن وہ اہل اسلام کو اس سے منحرف کرنے میں ہمیشہ لگے رہے ہیں۔ ان کی پوری سعی رہی ہے کہ یہ جماعت دین سے ہٹ جائے اس پر عمل نہ کرے۔ اس کے احکام و نصوص کو اپنی زندگی کا دستور العمل نہ بنائے اور اس کے مقتضیات و تکالیف کو ترک کر دے۔ مسلمانوں کے ساتھ اللہ کا یہ وعدہ صرف اس زمانے سے ہی مخصوص نہیں تھا بلکہ وہ ایک خطابِ عام ہے۔ جو ہر زمانے اور ہر جگہ کو شامل و محیط ہے پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رضائے خداوندی کے مطابق اس دین سے راضی ہیں۔ اسے کامل و شامل اور دائمی جانتے ہیں۔ اپنی زندگی کے تمام معاملات اور شعبوں میں اسے دستور العمل بناتے ہیں۔ بس یہی لوگ درحقیقت مومن ہیں۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ط

اکمال دین کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کے اخبار و قصص میں پوری سچائی، بیان میں پوری تاثیر اور قوانین و احکام میں پورا توسط و اعتدال موجود ہے جو حقائق کتبِ سالفہ اور دوسرے ادیانِ سماویہ میں محدود و ناتمام تھے۔ ان کی تکمیل و تتمیم اس دین قیم سے کر دی گئی۔ قرآن و سنت نے حرمت و حلت وغیرہ کے متعلق تنصیصاً یا تعلیلاً جو احکام دیئے ان کا اظہار و ایضاح تو ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ لیکن اضافہ یا ترمیم کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔

اتمام نعمت (احسان پورا کرنا) کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ سب سے بڑا احسان تو یہی ہے کہ اسلام جیسا مکمل اور ابدی قانون اور خاتم الانبیاءؐ جیسا نبی ہم مسلمانوں کو مرحمت فرمایا۔ مزید برآں اطاعت و استقامت کی توفیق بخشی۔ روحانی غذاؤں اور دینوی نعمتوں کا دسترخوان ہمارے لئے بچھا دیا۔ حفاظتِ قرآن، غلبۂ اسلام اور اصلاحِ عالم کے سامان مہیا فرما دیئے۔

دین اسلام کو ہمارے لئے پسند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس عالمگیر اور مکمل دین کے بعد اب کسی اور دین کا انتظار کرنا سفاہت ہے "اسلام"، جو تسلیم و تفویض کا ہم معنی ہے،

فوائد القرآن عثمانی رح صـ ۱۳۸۔

Marfat.com

اُس کے سوا مقبولیت اور نجات کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

اس آیت الیوم اکملت لکم دینکم الخ کا نازل فرماتا بھی منجملہ نعمائے عظیمہ کے ایک نعمت ہے اسی لئے یہود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ کہ امیر المؤمنین! اگر یہ آیت ہم پر نازل کی جاتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید منایا کرتے حضرت عمر نے فرمایا مجھے معلوم ہیں کہ جس روز ہم پر یہ آیت نازل کی گئی مسلمانوں کی دو عیدیں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ آیت عظیم ۹ ذی الحجہ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرفہ کے روز جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی۔ جبکہ میدانِ عرفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زائد اتقیاء ابرار رضی اللہ عنہم کا مجمع کثیر تھا۔ اس کے بعد حضرت اکیاسی روز حضور ؐ اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔

آیت[۲] اکمالِ دین کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرائض، حدود، امر و نہی، حلال و حرام اور ان سب چیزوں کی تنزیل و تبیین کتاب و سنت کے ذریعہ سے مکمل کر دی ہے اور رہتی دنیا تک پیدا ہونے والی حاجات و ضروریات کے دلائل اصولی طور پر بیان فرما دیئے گئے ہیں۔ آج کے بعد اس میں کسی کمی بیشی کا امکان یا حاجت نہیں ہے۔ چنانچہ اس آیت کے بعد فرائض اور حرام و حلال میں سے کچھ بھی نازل نہیں ہوا۔

آیتِ اکمال دین کے مطلب میں قرآن، سنت، اجماع صحابہ رضی اور سوادِ اعظم امت کا عمل سب داخل ہیں کیونکہ ان سب کی مشروعیت پر خود کتاب و سنت کے واضح اور صریح دلائل قائم ہیں۔ اسی طرح قیاس صحیح بھی اس کے مطلب میں داخل ہے۔

اس آیت میں دین سے مراد اسلام کے عقائد، احکام اور آداب سب ہیں عبادات اور ان کے ملحقات وغیرہ تو تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور معاملات اجمالی طور پر بیان فرمائے گئے ہیں اور انہیں اُولوالامر سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔

آیت[۳] الیوم اکملت لکم..... ورضیت لکم الاسلام دینا ط یہ کلمات ہائلہ ایک ایسی آیت کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں۔ جس کا موضوع بعض ذبائح وغیرہ کی تحلیل و تحریم ہے اور ایک اسی سورت میں آئے ہیں جس کے اغراض و مقاصد ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس سے کیا پتہ چلتا ہے جو کچھ اس سے ثابت ہوتا ہے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر اردو پ ۶ ص ۴۸، ۴۹ [۲] تفسیر المنار ج ۶ ص ۱۵۶

[۳] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۸۲ و طبع سوم)

Marfat.com

اس میں سے کچھ یہ ہے کہ اللہ کی شریعت ایک کامل و مکمل کل ہے۔ جس کے اجزاء کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ عقائد و نظریات ہوں یا شعائر و عبادات حلال و حرام کے مخصوص احکام ہوں یا اجتماعی و سیاسی مسائل کے مخصوص نظریات و آداب وغیرہ ان تمام چیزوں کے مجموعے کا نام دین ہے جس کے کامل کر دینے کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اعلان فرمایا ہے اور یہی وہ نعمت و احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر پوری کر دی ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دین میں نظریات و عقائد، شعائر و عبادات، حلال و حرام کے احکام اور اجتماعی و سیاسی تنظیمات سب ضروری ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ یہ سب چیزیں مل کر مجموعی طور پر وہ راستہ تیار کرتی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس راہ کے کسی جزئیے سے نکل جانا سارے دین کے خلاف بغاوت کی مانند ہے اور دین کے خلاف بغاوت دین سے باہر نکل کر ہی ہو سکتی ہے۔

پہلے واضح کیا جا چکا ہے اللہ تعالیٰ کے اس پسندیدہ ضابطے میں سے کسی چیز کو پھینک دینا اور اس کی جگہ انسانی بناوٹ کی کسی چیز کو اختیار کرنا واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کو چھوڑنے کا ہم معنیٰ ہے اور بعض انسانوں کو الوہیت کے خصائص عطا کرنا ہے۔ اور زمین پر اللہ تعالیٰ کے اقتدار پر تعدی کرنا ہے اور الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت یعنی حاکمیت کا کسی اور میں مان کر اس کے لئے الوہیت کا دعویٰ کرنا ہے اور اس کا مطلب واضح طور پر دین کے خلاف بغاوت اور دین سے خروج ہے۔

حجۃ الوداع ۱۰ھ میں جس دن یہ آیت نازل ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کر دیا تھا۔ اس کے بعد کسی زیادتی چاہنے والے کے لئے کسی چیز کی گنجائش نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے کامل ضابطۂ زندگی دے کر اپنی سب سے بڑی نعمت مومنوں پر پوری کر دی ہے۔ اور "اسلام" ہی کو ان کے لئے بطور دین پسند کیا ہے۔ پس جو شخص اسے اپنی زندگی کا ضابطہ بنانے پر راضی نہیں گویا وہ مومنوں کے لئے اللہ کی پسندیدہ چیز کو ترک کر دیتا ہے۔

مومن اکمالِ دین کی آیت کو پڑھ کر چشم تصور میں اپنے آپ کو انبیاء و رسل اور ان کی رسالتوں کے ایک لمبے دور، نورانی قافلے کو راہِ ہدایت پر چلتا ہوا پاتا ہے۔ راستہ بڑا طویل ہے۔ لیکن نشان ہائے راہ نمایاں ہیں۔ لیکن وہ خاتم النبیینؐ سے قبل ہر پیغمبر کو صرف اپنی مخصوص قوم کی طرف مبعوث دیکھتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ آخری رسالتؐ سے قبل ہر رسالت زمانے کے ایک مخصوص مرحلہ کے لئے تھی۔ رسالت خاص تھی، اس کے مخاطب خاص لوگ تھے اور وہ ایک خاص قسم کے محدود ماحول کے لئے تھی۔ اس لئے وہ سب

Marfat.com

رسالتیں اپنے خاص ماحول کے ساتھ مخصوص تھیں۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک تھی۔ سب ایک اللہ کی طرف پکارتی تھیں۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اور وہ سب اس الٰہ واحد کی ایک ہی عبودیت کی طرف بلاتی تھیں۔ اسی کا نام دین ہے اور وہ سب معبودِ واحد سے احکام حاصل کرنے اور اُسی کی اطاعت کی طرف دعوت دیتی تھیں۔ یہی اسلام ہے مگر اُن رسالتوں کے مخصوص حالات، زمانے، جگہ اور عملی و واقعی زندگی کے لئے اُن رسالتوں نے ایک ایک "شریعت" کا اعلان فرمایا تھا۔

یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرف اپنی رسالتوں کا اختتام کرنا چاہا۔ تو سب انسانوں کے لئے ایک خاتم النبیین رسول مبعوث فرمایا۔ اس کی رسالت انسان کے لئے تھی کسی خاص انسانی جماعت، مجموعے، زمانے یا حالات کے لئے نہ تھی۔ یہ رسالت انسان کو حالات و ظروف، ماحول اور زمانوں سے بالاتر ہو کر پکارتی ہے۔ کیونکہ وہ انسانی فطرت سے خطاب کرتی ہے جس میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم اللہ تعالیٰ نے اس رسالت میں ایک ایسی شریعت کی تفصیل بیان فرمائی جو "انسان" کی زندگی کو سب اطراف سے محیط ہے وہ حیات انسانی کے لئے قواعدِ کلیہ اور بنیادی اصول مقرر کرتی ہے جو زمان و مکان کے تغیّر اور حالات کی گردش کے ساتھ بدل جانے والے نہیں۔ یہ شریعت حیاتِ انسانی کے لئے تمام ضوابط، توجیہات، تشریحات اور تنظیمات کو مشتمل ہے تاکہ انسانی زندگی برقرار رہے، بڑھے، پھلے پھولے اور نشوونما پائے۔ لیکن اس کا مرکز و محور ایک ہی رہے۔

آیتِ اکمال دین میں اللہ تعالیٰ نے اکمال عقیدہ اور اکمالِ شریعت دونوں کا اکٹھا اعلان فرمایا ہے۔ دونوں چیزوں کے مجموعے کا نام "دین" ہے کسی مومن کے لئے روا نہیں کہ اب دین میں کسی نقص کا تصوّر رکھے۔ یا کسی قصور کا خیال رکھے جو اضافے کا متدعی ہو۔ دین زمان و مکان کی پابندیوں اور تبدیلیوں سے ماوراء ہے۔ اس عقیدے کے بغیر کوئی مومن نہیں ہو سکتا۔ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا۔ اُس کی شریعت ہی ہر زمانے کے لئے ہے کیونکہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ اُس دین کی شریعت ہے جو انسان کے لئے آیا ہے۔ کسی جماعت، صدی یا مکان سے محدود نہیں ہے۔ تفصیلی احکام ہمیشہ محفوظ رہنے کے لئے آئے ہیں۔ اصول و مبادی اس لئے آئے ہیں کہ وہ انسانی حیات کے لئے مرکز محور کا کام دیں اور رہتی دنیا تک دیں۔ اللہ جو انسان کا خالق ہے اور اپنی مخلوق کو خوب جانتا ہے۔ اُسی نے اس دین کو انسان کے لئے پسند کیا ہے۔ پس جو شخص کہتا ہے کہ:

Marfat.com

"کل کی شرع اور تھی آج کی اور ہے" وہ اللہ سے بڑھ کر عالم ہونے کا مدعی ہے۔

انسان کا وجود حقیقت میں وجود ہی نہیں جب تک وہ اپنے معبود کو اس طرح نہ پہچانے جس طرح یہ دین پیش کرتا ہے۔ پھر جب تک وہ اپنی معرفت حاصل نہ کرے جس طرح یہ دین اسے کرانا چاہتا ہے۔ اور اس دنیا میں اپنی حیثیت، خود اس دنیا کی حقیقت اور اپنے مقصدِ حیات سے واقف نہ ہو جائے یہ دین اسے یہی سب باتیں بتاتا ہے۔ پھر انسان جب تک صرف ایک خدا کی عبادت کر کے غیر اللہ کی عبادت و عبودیت سے آزاد نہ ہو جائے اس کا وجود درحقیقت کچھ نہیں۔ دینِ حق نے انسان کو جو اعلیٰ و ارفع مقام دیا ہے۔ جب تک انسان اُسے پہچان نہ لے وہ حیوانیت کے درجے پر ہی رہے گا۔

یہ دین انسان کو اللہ، فرشتوں، کتابوں، رسُولوں اور آخرت کے عقیدے کا تصوّر دے کر حیوانیت کے دائرے سے نکالتا ہے کیونکہ حیوانات محسوسات کے علاوہ اور کسی چیز کو نہیں پا سکتے وہ اُسے محسوسات سے ماورا المحسوسات تک لے جاتا ہے۔ یعنی عالم الغیب والشہادہ تک، دوسرے الفاظ میں مادّے اور ماوراء مادہ کے جہان تک۔ وہ اسے محدود حیوانی حِسّ کی تنگی سے نکالتا ہے۔ پھر توحید خداوندی کا عقیدہ دے کر بندوں کی عبودیت سے نکالتا ہے، وہ اُسے آزادی، بلندی اور مساوات کا پیغام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کی توجہ صرف ایک خالق و معبود کی طرف ہونی چاہیئے۔ وہ ضابطۂ زندگی، شریعت اور نظام صرف ایک خدا سے حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایسا انسان صرف خدا پر بھروسہ کرتا اور صرف اُسی سے ڈرتا ہے۔

جو شخص جاہلیّت کی حقیقت نہ جانتا ہو اور اُس کے مصائب اور دُکھ نہ چکھ چکا ہو وہ اس دین کی صُورت میں اللہ کی جو نعمت ملی ہے اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا نہ اُس کی قدر پہچان سکتا ہے۔ ہر زمانے اور ہر مکان میں جاہلیت سے مراد زندگی کا وہ ضابطہ ہے۔ جسے اللہ نے شروع نہیں کیا۔ اس کے مصائب و تکالیف، اُس کی تباہ کاریاں ہر زمان و مکان میں بے شمار ہیں۔

اہلِ عرب جو قرآن کے پہلے مخاطب تھے وہ جاہلیّت کے مزے چکھ چکے تھے۔ وہ قرآنی آیت کے ان کلمات کی حقیقت اور گہرائیوں کو خوب جانتے تھے کیونکہ اُس کے مدلولات اُن کی زندگیوں میں مشتمل تھے۔ انہوں نے جاہلیّت کے عقائد، اجتماعی اطوار، انفرادی اور جماعتی اخلاق خوب دیکھے بھالے تھے۔ اس لئے وہ نعمتِ خداوندی کی حقیقت کی تہ تک خوب پہنچ چکے تھے۔

Marfat.com

اسلام نے انہیں جاہلیت کی پستیوں سے نکالا اور ایک واضح راستے پر چلا کر کامیابی کی بلندیوں پر چڑھا دیا تھا۔ وہ اُن بلندیوں سے اردگرد کی ساری دنیا کو انہیں پستیوں میں گرا ہوا پاتے تھے۔ جن سے وہ نجات پا چکے تھے۔ اسلام نے انہیں بت پرستی، ملائکہ پرستی، جن پرستی ستارہ پرستی اور اسلاف پرستی جیسی خرافات و اوہام سے نکالا تھا۔ تاکہ انہیں توحید کے افق پر بلند کر دے۔ توحید کی سان پر چڑھا کر انہیں کہانت، ریاست اور وہم و خرافات کے اقتدار سے نجات دلائی انہیں طبقاتی تفریقات سے نکالا۔ ذلیل عادات اور ظلم و استبداد سے بچایا۔ انہیں شاہی و ملوکیت کے چکر سے نکالا۔ بندگی و عبودیت کی بھول بھلیاں سے بچایا۔

اسلام نے انہیں اندھی تقلید، رسم و رواج، وہم و خرافات اور اجتماعی عادات و خصائل کی بدترین پستیوں سے اٹھایا۔ لڑکیوں کو زندہ گاڑنے، عورت کی توہین کرنے، شراب خوری، قمار بازی اور آزاد جنسی بے راہ روی سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ عورت کی بے قید آزادی اس کی حقارت و ذلت، قتل کے بدلے، غارتیں، قتل و نہب، ڈاکہ زنی، راہ زنی، اختلاف و شقاق، بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں بے چارگی (جیسا کہ عام الفیل میں ہوا) قبائلی چپقلش اور ان کی باہمی دائمی سر پھٹول ان لعنتوں سے اسلام نے انہیں نجات دی۔

اسلام نے انہیں ایک بلند ترین اُمّت بنا دیا جو بلندیوں سے کائنات کی پستیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پستی سے بھی واقف تھی اور اب بلندی پر فائز تھی۔ جاہلیت کو بھی جانتی تھی اور اب اسلام کی معرفت حاصل کر چکی تھی۔

اُمّت مسلمہ پر اللہ کی نعمت و احسان کا شکر واجب ہے۔ سب سے پہلے تو اُسے دین اور اُس کی خدا کے ہاں پسندیدگی کی قیمت پہچاننی لازم ہے پھر اس پر استقامت اور امکان بھر اس کے لئے جدوجہد فرض ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو تو چھوڑ سکتا ہے۔ جنہوں نے اسلام کو نہیں جانا اور اُسے بطورِ دین اختیار نہیں کیا۔ مگر جنہوں نے اسے پہچان لیا ہو اور اختیار کر کے چھوڑ دیا ہو اللہ نہیں کبھی سزا کے بغیر نہ چھوڑے گا۔ اور ہرگز مہلت نہ دے گا جب تک کہ وہ اپنی سزا کو نہ پا لیں۔

فمن اضطرّ فی مخمصۃٍ الخ یعنی حلال و حرام کا قانون تو مکمل ہو چکا، اُس میں اب کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔ البتہ مضطر جو بھوک پیاس کی شدت سے بے تاب و لاچار ہو وہ اگر حرام چیز کھا کر جان بچا لے بشرطیکہ مقدار ضرورت سے تجاوز نہ کرے اور لذّت مقصود نہ ہو (غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ) تو حق تعالیٰ اس تناولِ محرم کو اپنی بخشش اور مہربانی سے معاف فرما دے گا۔ گویا وہ چیز تو حرام ہی

Marfat.com

رہی مگر اُسے کھا پی کر جان بچانے والا خدا کے نزدیک مجرم نہ رہا۔ یہ بھی اتمام نعمت ہی کا ایک شعبہ ہے۔

[1] فَمَنِ اضْطُرَّ سے لے کر غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک یہ بات بیان کرتا ہے کہ یہ جانور جو ہم نے حرام کئے ہیں اس حالت میں حرام ہیں کہ جب اُن سے بچ کر ہلاکت میں نہ پڑ سکو۔ اور جب ایسی حالت ہو کہ جس کو اضطرار اور مخمصہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس شخص کی نیت حرام خوری کی بھی نہ ہو صرف بھوک سے جان بچانا یا دشمن سے جان بچانا مقصود ہو تو اس کے لئے ان چیزوں کی اجازت ہے۔ مگر اس کے ساتھ غفور رحیم کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہ حالتِ اجازت بھی خطرہ سے خالی نہیں۔ مگر وہ تم کو معاف کر دے گا۔

جو شخص[2] اِن حرام کردہ چیزوں میں سے کسی چیز کے استعمال پر مجبور اور بے بس ہو جائے، تو وہ ایسے اضطرار کی حالت میں انہیں کام میں لا سکتا ہے۔ "اللہ غفور" رحیم ہے وہ جانتا ہے کہ بندے نے اُس کی حد نہیں توڑی بلکہ بے بسی اور مجبوری کی حالت میں ایسا کیا ہے۔ فقہا میں اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ بھوک کے وقت جب حلال چیز میسّر نہ ہو تو حرام صرف اتنا ہی کھا سکتا ہے۔ جس سے جان بچ جائے یا پیٹ بھر سکتا ہے۔ بلکہ ساتھ بھی رکھ سکتا ہے اس کے تفصیلی بیان کی جگہ احکام کی کتابیں ہیں۔

احقر مرتب عرض کرتا ہے کہ عام حالات میں تو بموجب دلائل شرع صرف اتنا ہی کھانے کی اجازت ہے۔ جس سے جان بچ جائے۔ لیکن عین ممکن ہے کہ اختلافِ احوال و اشخاص سے اس اجازت سے کچھ وسعت پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ فقہا نے لکھا ہے کہ حرام چیز کا استعمال بعض حالات میں جائز و مباح ہے تو بعض حالات میں واجب تک ہو جاتا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس کی مثال لکھی ہے کہ ایک شخص بھوک کے مارے مرا ہی چاہتا ہے تو اس کے لئے جان بچا لینے کے لئے اس اضطراری حالت میں حرام کھا لینا واجب ہے۔ واللہ اعلم۔

[3] اضطرار کا لفظ ضرر سے نکلا ہے۔ اس کا معنیٰ ہے انسان کو کسی نقصان دہ اور مُضر چیز پہ ابھارنا اور مجبور کرنا، مخمصہ کا لفظ خمص سے نکلا ہے۔ جس کا معنیٰ ہے پیٹ کا گڑھا۔ چونکہ بھوک سے پیٹ پچک جاتا اور اس میں گڑھا پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا اسے مخمصہ

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۹۹
[2] تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۴۹
[3] المراغی ج ۶ ص ۵۵، المنار ج ۶ ص ۱۶۸

Marfat.com

کہا گیا ۔ متجانف جنف سے نکلا ہے ۔ جس کا معنیٰ ہے جھکنا ، مائل ہونا ۔ متجانف لاثم وہ شخص ہے جو گناہ کو پسند کر کے اس کی طرف جھکے آیت کا معنی یہ ہوا کہ جو شخص کسی حرام چیز کے تناول کی ضرورت میں پڑ جائے اور اس کا باعث بھوک ہو جس سے پیٹ پچک جائے ہیز اور موت کا خوف لاحق ہو جاتا ہے ۔ یا موت کے مبادی ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے ، لیکن یہ شرط ہے کہ وہ گناہ کو پسند کرنے والا نہ ہو ۔ صرف بقدرِ سدِّ رمق کھالے ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ ، امام مجاہد رح اور قتادہ رح سے روایت ہے کہ سدِّ رمق سے زیادہ کھانا حرام ہے ۔

سورۂ بقرہ کی آیت فمن اضطر غیر باغٍ ولا عادٍ فلا اثم علیہ بھی اس معنیٰ میں ہے ۔ یعنی وہ شخص مجبور ہو ، حرام کا طالب نہ ہو اور نہ قدرِ ضرورت سے تعدی و تجاوز کرے ۔ یہ شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ اباحت ضرورت کی وجہ سے ہے اور ضرورت کو صرف اُس کی مقدار پر ہی رکھا جائے گا اور یہی چیز مضطر کے لئے بھی از روئے ادب و طبیعت نفع مند ہے کیونکہ حرام میں دراصل تو ذلت و ضرر پایا جاتا ہے اور یہ شرط اُسے اس کی عادت بنا لینے کی جرأت سے روکتی ہے ۔

اشیاء میں اصل حلت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی سب چیزوں کو ہمارے نفع کے لئے مطیع بنا دیا ہے اور صرف وہی چیزیں حرام کی گئی ہیں جو مُضر تھیں ۔ حالتِ اضطرار میں اصل حلت تو نہیں لوٹتی کیونکہ وہ چیز حرام کر دی گئی ہے لیکن اس کے تناول دارتکاب کا گناہ معاف ہو جاتا ہے ۔ اس لئے آخر میں غفور رحیم فرمایا گیا ہے ۔

الیوم اکملت ..... الاسلام دیناً بطور جملہ معترضہ محرمات کے بیان کے اندر واقع ہوا ہے اور فمن اضطر ..... غفور رحیم کا تعلق محرمات کے ساتھ ہے ۔

پس جو شخص بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جائے اور اُسے اپنی زندگی کے تلف ہونے کا خدشہ ہے ۔ وہ ان محرمات میں سے کھا سکتا ہے بشرطیکہ گناہ کا ارادہ نہ ہو اور حرام کے تناول کرنے کی نیت نہ ہو ۔ دین بہت آسان ہے وہ ضروریات کے لئے ایسے احکام دیتا ہے جن میں شدت اور حرج نہ ہو لیکن اس کے ساتھ وہ تمام احکام کا تعلق نیت سے جوڑتا ہے جو ایک پوشیدہ چیز ہے ۔ اور وہ معاملات کو تقویٰ پر مبنی قرار دیتا ہے ۔ جو اللہ ہی کے سپرد ہے ۔ پس جو مضطر ہے اس کی نیت اور مقصد حرام کے ارتکاب کا نہیں ہے اور اس پر کوئی گناہ اور سزا نہیں ۔

لہ فی ظلال القرآن ج ۶ صـ۸۱ (طبع سوم)

Marfat.com

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ

تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز ان کے لیے حلال ہے کہو تم کو حلال ہیں ستھری چیزیں اور جو

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ

تم شکاری جانور شکار پر دوڑانے کہ ان کو سکھاتے ہو اس میں سے جو اللہ نے تم کو

اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ

سکھایا ہے سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے اور اللہ کا نام لو

عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۴

اس پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

[1] پچھلی آیات میں بہت سی حرام چیزوں کی فہرست دی گئی ہے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حلال چیزیں کیا کیا ہیں؟ اس کا جواب دے دیا کہ حلال کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ چند چیزوں کو چھوڑ کر جن میں کوئی دینی یا بدنی نقصان تھا۔ دنیا کی تمام ستھری اور پاکیزہ چیزیں حلال ہیں۔ اور چونکہ شکاری جانور کے شکار کرنے کے متعلق بعض لوگوں نے خصوصیت سے سوال کیا تھا۔ اس لئے اسے تفصیل سے بتا دیا گیا۔

شکاری جانور ——— کتے یا باز وغیرہ ——— سے شکار کیا ہوا جانور ان شرط سے حلال ہے۔

۱۔ شکاری جانور سدھایا ہوا ہو۔

۲۔ اُسے شکار پر چھوڑا جائے۔

۳۔ اُسے اس طریقہ سے تعلیم دی گئی ہو۔ جسے شریعت نے معتبر کر رکھا ہے یعنی کتے کو سکھایا جائے کہ شکار کو پکڑ کر کھائے نہیں۔ اور باز کو یہ تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ گو شکار کے پیچھے جا رہا ہو فوراً چلا آئے۔ اگر کتا شکار کو خود کھانے لگے یا باز بلانے سے باز نہ آئے، تو سمجھا جائے گا کہ جب وہ اس کے کہنے میں نہیں تو شکار اس کے لیے نہیں پکڑا بلکہ اپنے لیے پکڑا ہے۔ اسی کو

---

[1] فوائد القرآن ص ۱۳۸۔

Marfat.com

حضرت شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ جب اُس نے آدمی کی خو سیکھی تو گویا آدمی نے ذبح کیا۔
۴۔ چھوڑنے کے وقت اللہ کا نام لو یعنی بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر چھوڑو ان چار شرطوں کی تشریح تو نص قرآنی میں ہو گئی۔ پانچویں شرط جو امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک معتبر ہے، وہ یہ ہے کہ شکاری جانور شکار کو زخمی کر دے کہ خون بہنے لگے اس کی طرف لفظ "جوارح" اپنے مادہ جرح کے اعتبار سے مشعر ہے ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہوئی۔ تو شکاری جانور کا مارا ہوا شکار حرام ہے ہاں اگر مرا نہ ہو اور ذبح کر لیا جائے تو وہ وَمَا اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کے قاعدہ سے حلال ہوگا۔

چونکہ عموماً آدمی دنیوی لذتوں میں پڑ کر اور شکار وغیرہ مشاغل میں منہمک ہو کر خدا اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس لئے تنبیہ کی ضرورت تھی کہ خدا کو مت بھولو۔ اور یاد رکھو کہ حساب کا دن کچھ دور نہیں۔ خدا کے انعامات اور تمہاری شکر گزاری کا موازنہ اور اور عمر عزیز کے ایک ایک لمحہ کا حساب ہونے والا ہے چنانچہ آیت کے آخر میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ سے آخر تک یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

لہ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ عدی رضؓ بن حاتم بڑے شکاری تھے انہوں نے آنحضرت صلعم سے یہ مسئلہ پوچھا تھا۔ اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ نیز احادیث میں اکثر ان ہی کے سوال کے مطابق شکار کے مسائل بیان فرمائے گئے ہیں۔ تیر سے بسم اللہ پڑھ کر شکار مارنا یا کسی اور دھار دار چیز سے، اسی پر قیاس کیا گیا ہے اور اس بارہ میں احادیث صحیحہ بھی وارد ہیں۔ چنانچہ عدی رضؓ بن حاتم کی حدیث صحیحین میں ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں تیر سے بھی شکار کیا کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر دھار سے مرے اور زخم ہوا تو کھا لو اور اگر اُس کے عرض یعنی بغیر دھار کے دوسری طرف سے لگ کر اُس کے صدمہ سے مرے تو مت کھاؤ کیونکہ وہ موقوذہ ہے۔ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ علیہ جمہور مفسرین کے نزدیک اللہ کا نام اُس پر لینے سے کتا چھوڑتے وقت بسم اللہ کہنا مراد ہے جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں آئی ہے۔ **ان ارسلت کلبک وسمیت فاخذ فکل**

لہ جوارح سے مراد اس آیت میں جمہور صحابہ رضؓ، تابعین رضؒ اور آئمہ فقہ کے نزدیک سدھائے ہوئے کتے، باز، چیتے، شکرے وغیرہ سب وہ جانور ہیں جو تعلیم قبول کر سکتے ہیں۔ جانور

لہ تفسیر حقانی ج ۴ ص ۶۹ لہ ابن کثیر پ ۶ ص ۵۵،۵۱

Marfat.com

کتے وغیرہ کا شکار کرلینا ہی اس کا ذبیحہ ہے۔ ہاں اگر شکار زندہ مل گیا تو اسے ذبح کرنا واجب ہے۔ اور اسے نہیں چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھی ضروری ہے۔

[1] اہل عرب بعض خبیث چیزوں مثلاً مردار اور خون وغیرہ کو کھا جاتے تھے۔ مگر وہم و خرافات کی بنا پر بعض حلال و طیب چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے تھے جیسے بحیرہ اور سائبہ وغیرہ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ حرام چیزوں کی حرمت کے بعد حلال چیزوں کا بیان بھی فرما دیا۔

طیبات، خبیث کی ضد ہے۔ الجوارح جارحہ کی جمع ہے اس کا معنی ہے شکاری جانور مثلاً کتے، بچھو اور پرندے مکلبین تکلیب سے ہے، یعنی کتے کو تعلیم دینا اور شکار کے لئے سدھانا پھر اس کا استعمال ہر شکاری جانور اور پرندے کے لئے عام ہو گیا ہے۔

اس آیت میں طیبات سے مراد وہ پاکیزہ چیزیں ہیں جنہیں سلیم الفطرت طبائع پسند کریں اور سیر ہو کر پوری اشتہاء سے انہیں کھا سکیں۔ ایسی چیزیں مرغوب اور سہل الہضم ہوتی ہیں اور جن چیزوں کو سلیم الطبع انسان مکروہ جانیں اور اُن کا کھانا پسند نہ کریں وہ بوجہ ناپسندیدگی ہضم بھی مشکل سے ہوتی ہیں اور جزو بدن نہیں بن سکتیں گزشتہ آیت میں خبیث چیزوں کی حرمت بیان فرمائی گئی تھی۔ اس آیت میں طیبات کی حلت کا بیان ہے۔ خبیث چیزیں گنی چنی ہیں اور پر کی آیت کی بیان کردہ چیزوں کے ساتھ درندے چارپایوں اور پرندوں کو بھی مسلم، احمد اور اصحاب سنن کی صحیح روایات کے بموجب حرام کر دیا گیا ہے۔

ابن عباس رضؓ کی حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کچلیوں والے اور ہر پنجے سے شکار کرنے والے پرندے کے کھانے سے منع فرما دیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک ہر گوشت خور چوپایہ اور پرندہ حرام ہے (اسی طرح حشرات الارض کیڑے مکوڑے بھی حرام ہیں اور پانی کے جانوروں میں سے صرف مچھلی حلال ہے)

[2] آیت کے آخری حصے سے معلوم ہوا کہ سدھائے ہوئے شکاری جانوروں کے علاوہ اور جانوروں کا شکار کھانا، یا سدھائے ہوئے جانوروں کا وہ شکار جسے انہوں نے کھا لیا ہو (یعنی اپنے لئے پکڑا اور روکا ہو نہ کہ شکار کرنے والے کے لئے) اور وہ شکار یا ذبیحہ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا مثلاً غیر مسلموں نے اُسے پکڑا یا مارا ہو ان سب کا کھانا حرام ہے امسان سے اجتناب واجب ہے۔

---

[1] المراغی ج ۶ ص ۵۵، ۵۶، المنار ج ۶ ص ۱۶۹، ۱۷۶

[2] المراغی ج ۶ ص ۵۸۔

Marfat.com

اہل ایمان[1] کا یہ سوال کہ کون کون سی چیزیں حلال ہیں، اُس برگزیدہ جماعت کی نفسیاتی حالت کی تصویر کھینچ رہا ہے کہ وہ کس طرح زمانۂ جاہلیت کی رسوم و رواج سے دستبردار ہو چکے تھے۔ اور ہر چیز کو کھاتے پیتے وقت ان کے دل میں کس طرح یہ خطرہ کھٹکتا تھا کہ کہیں یہ رسم جاہلیت اور حرام نہ ہو اسلام نے عربوں کے دلوں میں جو عظیم اور گہرا انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ان کی تاریخ کا ہر دیکھنے والا اسے محسوس کر سکتا ہے۔ اسلام نے ان کے دلوں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اور جاہلیت کی تمام نشانیاں مٹا دی تھیں۔ انہیں نئے سرے سے زندگی بخشی تھی۔ اب حلت و حرمت کے متعلق ان کے احساسات بڑے نازک اور تیز ہو گئے تھے وہ ہر چیز کو اختیار کرنے سے پہلے اس تلاش میں رہتے تھے کہ اللہ کے نزدیک یہ حلال ہے یا حرام! اسی لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تھے۔ کہ کونسی چیزیں حلال ہیں۔

انہیں یہ جواب ملا کہ جو چیزیں حرام کی گئی ہیں وہ طیب اور پاکیزہ نہیں بلکہ خبیث اور گندی ہیں۔ اس کے برخلاف ہر پاکیزہ اور ستھری چیز حلال کر دی گئی ہے واقعہ بھی ہے کہ ہر حرام چیز سے فطرت سلیمہ احتراز و اباء کرتی ہے۔ کیونکہ وہ گندی اور ناپاک چیز ہوتی ہے۔ مثلاً مُردار، خُون اور سؤر کا گوشت۔ یا قلب مومن اس سے نفور ہوتا ہے۔ مثلاً غیر اللہ کے لئے نامزد یا ذبح شدہ جانور، اور بتوں کا چڑھاوا اور جوئے کے تیروں سے قسمت آزمائی کرنا وغیرہ۔

حلال و طیب چیزوں کے ذکر میں تخصیص بعد التعمیم کے طور پر سدھائے ہوئے تعلیم یافتہ شکاری جانوروں (مثلاً شکرہ، باز، شکاری کتا، چیتا اور شیر چیتے وغیرہ) کے شکار کا ذکر فرما دیا۔ لیکن اس میں یہ شرط لگا دی کہ وہ جانور تمہارے لئے شکار کریں اور شکار کے وقت اس میں سے خود نہ کھائیں ورنہ وہ سدھے ہوئے نہ شمار کئے جائیں گے اور اُن کا شکار حلال نہ ہوگا۔

مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ کے الفاظ سے اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ تمہیں جو قوت، کرامت اور اقتدار ملا ہے، یہ محض انعام الٰہی ہے۔ عطا اُسی کی ہے، خلق اُسی کی ہے علم اسی کا دیا ہوا ہے اور اُسی نے ان درندوں کو تمہارے لئے مطیع و مسخر کر دیا ہے۔ ہر چیز اُسی کی ہے، اسی کی طرف سے ہے اور اُسی کی طرف لوٹ جائیگی۔ مومن ہر لحظہ، ہر آن ہر چیز میں اللہ کا فضل و کرم اور احسان اپنے اوپر دیکھتا ہے۔ پس اسے صحیح معنیٰ میں "ربانی" ہونا چاہیئے۔

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۹۰

Marfat.com

اور اللہ نے مومنوں سے یہ بھی فرمایا ہے کہ جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت خدا کا نام لے لیا کریں۔ پھر اگر وہ اپنے دانت یا پنجے سے شکار کو مار ڈالے گا تو یہ گویا اُس کے لئے ذبح کا قائم مقام ہو جائے گا۔ جس طرح اللہ کا نام ذبح کرتے وقت لیا جانا ضروری ہے۔ اسی طرح جانور کو چھوڑتے وقت بھی ایسا کرنا ضروری ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

چونکہ مومن کی زندگی میں ہر عمل وارادے اور ہر نیت کا دارومدار تقویٰ پر ہے۔ اس لئے آیت کے آخر میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

آج حلال ہوئیں تم کو سب ستھری چیزیں۔ اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے اور

الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۚ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ

تمہارا کھانا ان کو حلال ہے اور حلال ہیں تم کو پاکدامن مسلمان عورتیں، اور پاکدامن

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اُن میں سے جن کو دی گئی کتاب تم سے پہلے

اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ

جب دو ان کو مہران کے قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو

وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ

اور نہ چھپی آشنائی کرنے کو اور جو منکر ہوا ایمان سے تو ضائع ہوئی

حَبِطَ عَمَلُهٗ ۠ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ع

محنت اس کی اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ[1] یعنی جیسے آج دین کامل تم کو دیا گیا، اسی طرح دنیا کی تمام پاکیزہ چیزیں بھی تمہارے لئے دائمی طور پر حلال کر دی گئیں۔ جو کبھی منسوخ نہ ہونگی۔

[1] فوائد القرآن ص ۱۳۸

Marfat.com

وَطَعَامُ الَّذِیْنَ الخ یہاں طعام (کھانے) سے مُراد ہے ذبیحہ۔ یعنی کوئی یہودی یا نصرانی (بشرطیکہ اسلام سے مرتد ہوکر یہودی یا نصرانی نہ بنا ہو) اگر حلال جانور ذبح کرتے وقت وقت غیر اللہ کا نام نہ لے تو اُس کا کھانا مسلمان کو حلال ہے۔ مُرتد کے احکام جداگانہ ہیں۔

وَطَعَامُکُمْ حل لَّہُمْ۔ اس مقام پر اس کا ذکر بطور مجازات و مکانات استطراداً فرمادیا۔ بعض احادیث میں جو آیا ہے لَا یَاْکُلُ طَعَامَکَ اِلَّا تَقِیٌّ (تیرا کھانا نہ کھائے مگر پرہیزگار) اُس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر پرہیزگاروں کے لئے تمہارا کھانا حرام ہے۔ جب مسلمان کے لئے کافر کتابی کے ذبیحہ کی اجازت ہوگئی تو ایک موحد مسلم کا ذبیحہ اور کھانا دوسرے مسلمان کے لئے کیوں حرام ہوگا۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ :۔ پاک دامن کی قید شاید ترغیب کے لئے ہو یعنی ایک مسلمان کو چاہیئے کہ نکاح کرتے وقت پہلی نظر عورت کی عفت اور پاکدامنی پر ڈالے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ پاکدامن کے سوا کسی اور سے نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ۔ اہل کتاب کے ایک مخصوص حکم کے ساتھ دوسرا مخصوص حکم بھی بیان فرمادیا۔ یعنی یہ کہ کتابی عورت سے نکاح کرنا شریعت میں جائز ہے۔ مُشرکہ سے اجازت نہیں۔ وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ (البقرہ ع ۲۷) مگر یہ یاد رہے کہ ہمارے زمانے کے نصاریٰ عموماً برائے نام نصاریٰ ہیں۔ ان میں بکثرت وہ ہیں جو نہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہیں، نہ مذہب کے نہ خدا کے۔ ان پر اہل کتاب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اُن کے ذبیحہ اور نساء کا حکم اہل کتاب کا سا نہ ہوگا نیز یہ ملحوظ رہے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کا معنی یہ ہے کہ اُس میں فی نفسہٖ وجہ تحریم کی نہیں۔ لیکن اگر خارجی اثرات و حالات ایسے ہوں کہ اُس حلال سے منتفع ہوتے ہیں بہت سے حرام کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ کُفر میں مبتلا ہونے کا احتمال ہے تو ایسے حلال سے انتفاع کی اجازت نہ دی جائے گی۔ موجودہ زمانہ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا بے ضرورت اختلاط کرنا، ان کی عورتوں کے جال میں پھنسنا۔ یہ چیزیں جو خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں، وہ مخفی نہیں۔ لہٰذا بے دینی اور بددینی کے اسباب و ذرائع سے اجتناب ہی کرنا چاہیئے۔

مُحْصِنِیْنَ :۔ یعنی نیت نکاح میں لانے کو۔ گویا اس طرف اشارہ ہوگیا۔ کہ نکاح بظاہر قید ہے، لیکن یہ قید اُن آزادیوں اور ہوس رانیوں سے بہتر ہے جن کی طلب میں انسان نما بہائم سلسلۂ ازدواج ہی کو معدوم کرنا چاہتے ہیں وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ: جس طرح پہلے عورت کی پاکدامنی کا ذکر کیا تھا، یہاں مرد کو پاک دامنی اور عفیف رہنے کی ہدایت فرمادی اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ (نور ع ۲)

Marfat.com

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالےٰ کی نظر میں نکاح کی غرض گو ہر عصمت کو محفوظ اور مقصدِ تزویج کو پورا کرنا ہے۔ شہوت رانی اور ہوا پرستی مقصود نہیں۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ الخ جن کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت ہوئی، اُس کا فائدہ یہ ہونا چاہیئے کہ مومن قانت کی حقانیت عورت کے دل میں گھر کر جائے۔ نہ یہ کہ کتابیات پر مفتون ہو کر الٹا اپنی متاعِ ایمانی ہی گنوا بیٹھے اور خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ کا مصداق ہو کر رہ جائے۔ چونکہ کافر عورت سے نکاح کرنے میں اس فتنہ کا قوی احتمال ہو سکتا ہے اس لئے وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ کی تہدید نہایت ہی برمحل ہے یہ میرا خیال ہے۔ باقی شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ "اہل کتاب کو دوسرے کفار سے دو حکم میں مخصوص کیا۔ یہ فقط دنیا میں اور آخرت میں ہر کافر خراب ہے اگر نیک عمل کرے تو بھی قبول نہیں۔

[1] اہل کتاب سے اس آیت میں جمہور کے نزدیک یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ مجوس اُن کے نزدیک اہل کتاب نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب بیان بخاری ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔ اس آیت میں اہل کتاب کا ہر قسم کا کھانا مراد نہیں بلکہ وہ ذبیحہ مراد ہے۔ جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا گیا ہو بلکہ اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔ اس سے پہلی آیت اس پر دلالت کرتی ہے اس ذبیحے میں گلا گھونٹی مرغی داخل نہیں اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ کا جملہ اعلان کر رہا ہے کہ جن چیزوں کو شرع نے نجس یا رجس یا خبیث قرار دیا ہے وہ مسلمانوں کو کسی حال میں بجز اضطرار کے درست نہیں کیونکہ ان میں قبح ذاتی اعتبار سے ہے جو کسی وقت میں دور نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا یہ عقل میں نہیں آسکتا کہ جس چیز کو ناپاک قرار دے کر مسلمانوں کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے۔ وہ اہلِ کتاب کے ہاتھ میں جا کر پاک اور حلال ہو جائے۔ سؤر، شراب، مردار (مُنخنِقہ وغیرہ) اگر حرام ہے تو اہل کتاب کے دسترخوان پر جا کر وہ یکایک پاک اور حلال نہیں ہو جاتا۔ ان چیزوں کو پہلی آیت میں فسق فرمایا جا چکا ہے لہٰذا ان کی حِلّت کی کوئی صورت نہیں۔

سلف سے خلف تک کسی نے بھی طعام اہل کتاب کو عام نہیں رکھا کہ اس میں سؤر اور شراب وغیرہ بھی شامل ہو جائیں۔ پس گلا گھونٹا جانور جو نصِ قرآنی سے حرام ہے،

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۱۱

Marfat.com

وہ اہل کتاب کے دسترخوان پر ہمارے لئے کبھی حلال نہیں ہو سکتا۔ مُنخنِقہ ذبائح میں داخل نہیں ہے۔ لہٰذا وہ کبھی حلال نہیں ہو سکتا۔ اہلِ کتاب کے ذبائح میں حضرت علیؓ ابن عمرؓ، عائشہ صدیقہؓ اور دیگر اصحاب کے نزدیک صرف وہ حلال ہیں۔ جو اللہ کا نام لے کر ذبح کئے گئے ہیں نہ کہ مسیح و عزیر کے نام سے بقرینہ آیت وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ اور یہی اِحتیاط ہے۔ جن لوگوں نے طعام سے عام مراد لیا ہے اُن کے ہاں بھی عام سے مراد حرام اور ناپاک چیزیں نہیں بلکہ جائز ذبائح اور حلال خوردنی ہیں۔

یہود کے ہاں قدیم سے اب تک ذبح کا دستور ہے۔ حضرت مسیحؑ اور ان کے حواری شریعت موسویہ کے پابند تھے۔ کسی روایت سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے سؤر، شراب یا گلا گھونٹی مرغی کا استعمال کیا ہو ہاں رومیوں اور دیگر اقوام میں، جو پولس کے خود تراشیدہ مذہب میں داخل ہوئی تھیں، اس کا رواج ہو تو ہو۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہؓ کرام نے برائے نام عیسائیوں کے ذبیحہ کو بھی درست نہیں مانا چہ جائیکہ ان کے ہاں کی نجس و خبیث چیزیں جن میں گلا گھونٹی مرغی بھی شامل ہو۔ حضرت علی اور دیگر صحابہ عرب کی قوموں میں سے بنی تغلب، تنوخ۔ لخم اور جذام اور عاملہ وغیرہ قبائل عرب (عیسائی) کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ یہ لوگ برائے نام عیسائی تھے پھر آج کل کے ملاحدۂ یورپ تو ہرگز عیسائی شمار نہ ہوں گے۔ فقیر کے نزدیک تو ان لوگوں کے ساتھ مل کر طیبات کا کھانا بھی خالی از فتنہ و فساد نہیں۔

جمہور کے نزدیک کتابی عورت سے اُس کے مسلمان ہوئے بغیر نکاح درست ہے۔ عورت زیردست ہوتی ہے۔ امید ہے کہ مرد کی وجہ سے اسلام میں آجائے یا کم از کم کسی اور پر اثر انداز نہ ہو۔ کافر مرد خواہ کتابی ہو یا کوئی اور اس سے مسلم عورت کا نکاح بالکل درست نہیں۔ کتابیات کے نکاح میں بھی پارسائی اور ہمیشہ کو ساتھ رکھنے کا مقصد ملحوظ ہونا شرط قرار دیا گیا ہے۔

علماء اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ اہل کتاب کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمانوں کے لئے حلال ہے کیونکہ وہ بھی غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا حرام جانتے ہیں اور ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یہ الگ بات ہے کہ خدا کے متعلق ان کے عقائد سراسر غلط ہیں۔ جنگِ خیبر کے موقع پر حضورؐ کو خیبر کے یہود نے سالم بھنی ہوئی بکری،

لہ ابن کثیر ج ۲ ص ۵۶ (ترجمہ اردو)

Marfat.com

(جو زہر آلود تھی) بطور تحفہ دی تو آپؐ نے اسے قبول فرمایا اور گوشت کو دانتوں سے توڑا تو بفرمانِ الٰہی اُسے تھوک دیا کیونکہ بکری کے شانے کے گوشت نے (جو حضورؐ کو مرغوب تھا اور اس موقع پر بھی اسے ہی تناول فرمایا تھا) باذنِ آلٰہی پکار کر کہہ دیا تھا کہ مجھے مت کھایئے میں زہر آلود ہوں۔ اس زہر کا اثر آپؐ کے سامنے کے دانتوں میں رہ گیا تھا۔ اور حضرت بشر رضؓ ابن براء بن معرور صحابی اس گوشت کے کھانے سے راہیٔ ملک بقاء ہو گئے تھے اور ان کے قصاص میں زہر ملانے والی عورت زینب نامی قتل کی گئی تھی۔

آیت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس ذبیح کو اہل کتاب غیر اللہ کے نام پر ذبح کریں یا سرے سے ذبح ہی نہ کریں۔ بلکہ مردار کے گوشت بنالیں، وہ بھی مسلمانوں کو جائز ہے۔ کیونکہ اس کی حرمت تو اوپر کی آیت میں گزر ہی چکی ہے اور اہل کتاب کی پاکباز اور عفیف عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ تاکہ غیر عفیفہ عورت باعث فساد نہ بن جائے۔ عبداللہ رضؓ ابن عمر عیسائیوں کے مشرک ہونے کی بناء پر اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف ہیں اور وہ کتابیہ کو بھی لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ کی نہی میں داخل ہونے پر اصرار فرماتے ہیں۔ لیکن جمہور کے نزدیک عام مشرکوں اور اہل کتاب میں اس مسئلہ میں (اور کئی مسائل کی مانند) فرق کیا گیا ہے۔

اہل کتاب[1] اصل میں توحید پر تھے۔ مشرکوں کی دیکھا دیکھی اور ان کے دین میں مشرکوں کے آگھسنے کی وجہ سے ان میں بھی شرک داخل ہو گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ انہیں بھی عام مشرکوں کی مانند جان کر ان کے ذبیحے اور ان کی عورتوں سے نکاح میں شدت برتی جاتی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو دوسرے مشرکوں اور کافروں سے اس باب میں مستثنیٰ فرما دیا ہے۔

غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ: مُحْصِنِين کا معنی ہے جو زنا سے عفیف ہو۔ مُسَافِح کا معنی ہے۔ علانیہ بے حیائی کرنے والا۔ مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ کا مطلب ہے پوشیدہ طور پر بدکاری کرنے والا۔ نکاح کا مقصد یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے لئے عفت و پاکیزگی کا باعث ہوں اور نیکوکاری کے قلعے (حصن) میں محفوظ و مصئون ہوں۔

[2] اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے ذبیحے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کو جس

---

[1] المراغی ج ۶ ص ۵۸، المنار ج ۶ ص ۱۷۷

[2] المنار ج ۶ ص ۱۷۹، ۱۸۰۔

Marfat.com

زمانے میں حلال ٹھیرایا تھا۔ اُس زمانے کے اہل کتاب کے اپنی کتب میں تحریف کر ڈالنے اور خدا کی کتاب کے ایک بڑے حصّے کو بھلا دینے کی صفات کو خود کتاب الٰہی نے واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ذبیحے اور عورتوں کو مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیا گیا۔ یہ قرآن کی آخری سند ہے اس کے بعد کوئی نیا حکم بھی نہیں اُترا لہٰذا اس باب میں تشدّد کرنا درست نہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی کئی آیتوں میں اہل کتاب کو شرک کرنے پر لتاڑنے کے باوجود اُن کے احکام عام مشرکوں سے الگ بیان کئے ہیں۔ لہٰذا عام مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت اہل کتاب پر حاوی نہیں بلکہ ان کا خاص حکم اس آیت میں بیان ہُوا ہے۔

علامہ[1] ابن عابدین رح الشامی الحنفی العقود الدّریہ ج ۲ صـ۲۰۰ میں فرماتے ہیں کہ کتابی کا ذبیحہ حلال ہے کیونکہ اُس کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ ذبح کرنے والا ملّت توحید پر ہو چاہے حقیقۃً جیسے مسلم اور چاہے بلحاظ دعویٰ جیسے کتابی اور اس لئے بھی وہ اللہ کی کتابوں میں سے کسی پر ایمان رکھتا ہے اور کتابیہ سے نکاح حلال ہے۔ چاہے کتابی ذمّی یہودی ہو، حربی ہو، عربی ہو یا تغلبی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً اہل کتاب کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اور اُن کے طعام سے مراد ذبیحہ ہے۔ لیکن یہ حکم اُس وقت ہے جب یہ ثابت نہ ہو جائے کہ کتابی نے غیر اللہ مثلاً مسیح یا عزیز کے نام سے ذبح نہیں کیا ورنہ وہ حرام ہوگا۔ اور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل ہوگا۔ شمس الائمہ سرخسی رح نے مبسوط میں فرمایا ہے کہ نصرانی کا ذبیحہ مُطلقاً حلال ہے چاہے وہ تثلیث کا قائل ہو یا توحید کا۔ اور بہتر یہی ہے کہ اُن کا ذبیحہ نہ کھائیں نہ ان کی عورتیں نکاح میں لائیں ہاں ضرورت کا معاملہ اور ہے۔ محقّق ابن الہمام رح کی تحقیق یہی ہے۔

جو[2] غیر مسلم اسلامی معاشرے میں (دارالسلام میں) بستے ہوں، ان کے ساتھ اسلامی جماعت کے تعامل میں بے نظیر رواداری پائی جاتی ہے۔ وہ غیر مسلم جن کے ساتھ ذمّہ اور عہد کا رابطہ ہو، بشرطیکہ وہ اہل کتاب ہوں، وہ بھی اس میں داخل ہیں اسلام صرف انہیں مذہبی آزادی دے کر ہی نہیں چھوڑ دیتا کہ پھر وہ الگ تھلگ دھتکارے ہوئے اور مظلوم بن کر زندگی گزارتے پھریں۔ بلکہ وہ ان کو اسلامی معاشرے کی مشارکت میں شامل کر لیتا ہے۔ ان کے ساتھ محبت، شفقت اور میل جول کا حکم دیتا ہے۔

---

[1] المنار ج ۴ صـ۱۹۹

[2] فی ظلال القرآن ج ۶ صـ۹۲ (طبع سوم)

Marfat.com

ان کا کھانا مسلمانوں کے لئے اور مسلمانوں کا ان کے لئے حلال ٹھہرایا ہے تاکہ باہمی میل جول، مہمانداری اور تعلقات بڑھیں اور مل جل کر کھانے پینے کے مواقع پیدا ہوں اور سارا معاشرہ محبت اور رواداری کے سائے میں پھلے پھولے۔ اسی طرح اسلام اُن کی پاک دامن آزاد عورتوں کو مسلمانوں کے لئے نکاح میں لانا حلال ٹھہراتا ہے۔ اور ان کے ذکر کو مسلمان پاک دامن عورتوں کے ذکر کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ یہ رواداری کی ایک ایسی مثال ہے جو دنیا بھر کے مذاہب و ملل میں سے صرف اہلِ اسلام کے حصے میں آئی ہے۔ ایک کیتھولک عیسائی آرتھوڈکس، پروٹسٹنٹ یا دہریہ عیسائی عورت سے نکاح نہیں کر سکتا بلکہ اُن کے نزدیک ایسا کرنے والا اپنے عقیدے سے خارج قرار پاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ صرف اسلام ہی وہ ضابطۂ حیات ہے۔ جو ایک عالمی معاشرہ قائم کر سکتا ہے۔ جس میں مسلمانوں اور دوسرے اہل کتاب مذاہب کے درمیان بیگانگی نہیں ہستی اور مختلف عقائد کے ماننے والوں میں پردے حائل نہیں رہتے۔ بشرطیکہ یہ سب لوگ اسلامی معاشرے کے جھنڈے تلے رہتے ہوں۔ معاشرتی اور معاملاتی زندگی کا تو یہ حکم ہے مگر ولاء اور نصرت کے احکام اور ہیں جو آگے آئیں گے۔

کتابی عورت کے نکاح کے حلال ہونے کی شرط بھی وہی ہے۔ جو مسلم عورت کی حِلّت کی شرط ہے یعنی حق مہر کی ادائیگی کرنا، نکاح شرعی کے مقصد سے رکھنا جس کے ذریعے سے مرد عورت کا محافظ اور نگران ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ مال کا خرچ کرنا بدکاری یا خفیہ یاری کا ذریعہ بنے۔ سفاح کا معنی ہے کہ عورت کا تعلق کسی بھی مرد سے ہو۔ مخادنت کا معنی ہے کہ عورت نکاح کے بغیر کسی خاص شخص سے پوشیدہ دوستی رکھے۔ عربی جاہلیت میں یہ دونوں چیزیں مشہور و معروف تھیں۔ جاہلیت کا معاشرہ انہیں جائز قرار دیتا تھا۔ اسلام نے معاشرے کو ان برائیوں سے پاک کر دیا اور پستیوں سے نکال کر بلندیوں پر پہنچا دیا۔

چونکہ احکام شرع دراصل ایمان سے وابستہ ہیں۔ انہیں ان کی اصل صورت میں نافذ کرنا ہی ایمان ہے۔ یا یوں کہئے کہ ایمان کی دلیل ہے۔ پس جو شخص ان سے منہ پھیرتا ہے وہ دراصل ایمان سے کفر کرتا ہے اس کی تغلیط کرتا ہے اور اس کے انکار وجود میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کا عمل نامقبول اور مردود ہے۔ حبوط کا لفظ چارپائے کے کسی غیر موافق چیز کو چر کر پھول (اپھر) جانے اور مر جانے سے لیا گیا ہے۔ عمل باطل کی حقیقت کی یہ ایک تصویر ہے۔ اول تو وہ اپھرتا اور پھولتا ہے

Marfat.com

پھر اُس کا نام و نشان بھی مٹ جاتا ہے۔ جیسے کہ چارپایہ زہریلا چارا کھا کر اپھر جاتا اور پھر موت کا شکار ہو جاتا ہے اور آخرت کا خسارہ دنیا کے خسارے سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس تہدید سے ثابت ہوا کہ دین کی تمام جزئیات باہم مربوط ہیں۔ کسی جزئی کو چھوٹنے کا مطلب دین کو چھوڑنا ہے اور اُس کے خلاف کوئی چھوٹا یا بڑا عمل مقبول نہیں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا

اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز کو تو دھو لو

وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا

اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور مل لو اپنے سر کو

بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا

اور دھو لو اپنے پاؤں ٹخنوں تک اور اگر تم کو جنابت ہو تو خوب طرح پاک ہو لو

فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے

اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ

آیا ہے جائے ضرور سے یا پاس گئے ہو عورتوں کے پھر نہ پاؤ تم

تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ

پانی تو قصد کرو مٹی پاک کا اور مل لو اپنے منہ اور

وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ

ہاتھ اُس سے اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی کرے

مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ

لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور پورا کرے

نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

اپنا احسان تم پر تاکہ تم احسان مانو

Marfat.com

امتِ محمدیہ پر یہ عظیم الشان احسانات کئے گئے۔ ان کا بیان سن کر ایک شریف اور حق شناس مومن کا دل شکر گزاری اور اظہار وفاداری کے جذبات سے لبریز ہو جائے گا، اور فطری طور پر اُس کی یہ خواہش ہو گی کہ اُس منعم حقیقی کی بارگاہ رفیع میں دست بستہ حاضر ہو کر جبینِ نیاز خم کرے۔ اور اپنی غلامانہ منت پذیری اور انتہائی عبودیت کا عملی ثبوت دے۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ جب ہمارے دربار میں حاضری کا ارادہ کرو، یعنی نماز کے لئے اٹھو، تو پاک صاف ہو کر آؤ۔ جن لذائذ دنیوی اور مرغوبات طبیعی سے متمتع ہونے کی آیتِ وضوء سے پہلی آیت میں اجازت دی گئی (یعنی طیبات اور محصنات) وہ ایک حد تک انسان کو ملکوتی صفات سے دُور اور بہیمیت سے نزدیک کرنے والی چیزیں ہیں اور کل احداث (موجباتِ وضو و غسل) اُنہی کے استعمال سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا مرغوبات نفسانی سے یکسو ہو کر جب ہماری طرف آنے کا قصد کرو تو پہلے بہیمیت کے اثرات اور "اکل و شرب" وغیرہ کے پیدا کئے ہوئے تکدرات سے پاک ہو جاؤ یہ پاکی وضوء اور غسل سے ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ وضو کرنے سے مومن کا بدن پاک صاف ہو جاتا ہے بلکہ جب وضو باقاعدہ کیا جائے تو پانی کے قطرات کے ساتھ گناہ بھی جھڑتے جاتے ہیں اذا قمتم الی الصلوٰۃ یعنی سو کر اٹھو، یا دنیا کے مشاغل چھوڑ کر نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہو، تو پہلے وضو کر لو۔ لیکن وضو کرنا ضروری اُس وقت ہے جبکہ پہلے سے باوضو نہ ہو آیت کے آخر میں ان احکام کی جو غرض و غایت ولکن یُرید لیطھرکم سے بیان فرمائی ہے، اُس سے معلوم ہو گیا۔ کہ ہاتھ، منہ وغیرہ دھونے کا وجوب اسی لئے ہے کہ حق تعالیٰ تم کو پاک کر کے اپنے دربار میں جگہ دے۔ اگر یہ پاکی پہلے سے حاصل ہے اور کوئی ناقض وضوء پیش نہیں آیا تو پاک کو پاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اُس کو ضروری قرار دینے سے امت "حرج" میں پڑتی ہے جس کی نفی ما یُرید اللہ لیجعل علیکم من حرج میں کی گئی ہے۔ ہاں مزید لطافت نورانیت اور نشاط حاصل کرنے کے لئے اگر تازہ وضوء کر لیا جائے تو مستحب ہو گا۔ شاید اسی لئے اذا قمتم الی الصلوٰۃ وجوھکم الآیۃ آلآیۃ میں سطح کلام کی ایسی رکھی ہے کہ جس سے ہر مرتبہ نماز کی طرف جانے کے وقت تازہ وضو کی ترغیب ہوتی ہے۔

وامسحوا برؤسکم یعنی تر ہاتھ سر پر پھیرلو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

لہ فوائد القرآن علامہ عثمانی رح ص ۱۲۸

Marfat.com

مدۃ العمر میں "مقدار ناصیہ" سے کم کا مسح ثابت نہیں ہوا۔ مقدار ناصیہ چوتھائی سر کے قریب ہے۔ حنفیہ اس قدر مسح کو فرض کہتے ہیں وَاَرْجُلَكُمْ اس لفظ کا عطف، مغسولات پر ہے۔ یعنی جس طرح منہ ہاتھ دھونے کا حکم ہے اس طرح پاؤں بھی ٹخنوں تک دھونے چاہئیں۔ سر کی طرح مسح کافی نہیں۔ چنانچہ اہل سنت وجماعت کا اس پر اجماع ہے اور احادیث کثیرہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر پاؤں میں موزے نہ ہوں تو دھونا فرض ہے۔ ہاں موزوں پر ان شرائط کے موافق جو کتب فقہ میں مذکور ہیں، مقیم ایک دن رات اور مسافر تین دن تک مسح کر سکتا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا :۔ یعنی جنابت سے پاک ہونے میں صرف اعضائے اربعہ کا دھونا اور مسح کافی نہیں۔ بلکہ سطح بدن کے جس حصے تک پانی تقرر کے پہنچ سکتا ہو وہاں تک پہنچانا ضروری ہے۔ اسی لئے حنفیہ غسل میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنے کو بھی ضروری کہتے ہیں وضو میں فرض نہیں سنت ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى ..... وَاَيْدِيَكُمْ مِّنْهُ۔ یعنی اگر مرض کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو، یا سفر میں بقدر کفایت نہ ملے۔ یا مثلاً کوئی قضائے حاجت کر کے آیا اور وضوء کی ضرورت ہے، یا جنابت کی وجہ سے غسل کرنا ناگزیر ہے مگر پانی کے حاصل کرنے یا استعمال کرنے پر کسی وجہ سے قادر نہیں تو ان صورتوں میں وضوء اور غسل کی بجائے تیمم کر لے۔ وضوء اور غسل دونوں کے تیمم میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ تیمم کی مشروعیت سے جو غرض ہے، وہ بہر صورت یکساں طور پر حاصل ہوتی ہے۔

لَامَسْتُمُ النِّسَآءَ : حضرت عبداللہ بن عباس، ابو موسیٰ اشعری رضؓ اور عبداللہ بن مسعود رضؓ سے اس کی تفسیر یہی منقول ہے کہ اس سے مراد عورت سے مقاربت کرنا ہے (بخاری)

فَتَيَمَّمُوْا : تیمم کا لغوی معنی قصد و ارادہ کرنا ہے اس معنی کا لحاظ کرتے ہوئے تیمم میں نیت کو فرض قرار دیا گیا ہے۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ :۔ اسی لئے جو احداث کثیر الوقوع تھے۔ ان میں سارے جسم کا دھونا ضروری نہ رکھا۔ صرف وہ اعضاء (منہ ہاتھ، پاؤں سر) جن کو اکثر متمدن ممالک کے رہنے والے عموماً کھلا رکھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اُن کا دھونا اور مسح کرنا ضروری نہ بلا یا گیا۔ تاکہ تنگی اور دقت نہ ہو ہاں حدث اکبر یعنی جنابت چونکہ کبھی کبھی پیش آتی ہے اور اُس حالت میں نفس کو مکونی خصال کی طرف

Marfat.com

ابھارنے کے لئے کسی غیر معمولی تنبیہ کی ضرورت ہے اس لئے اس کے ازالہ کرنے کے لئے تمام بدن کا دھونا فرض کیا۔ پھر مرض اور فرض اور سفر وغیرہ حالات میں کس قدر آسانی فرمادی۔ اوّل تو پانی کی جگہ مٹی کو مطہر بنادیا نیز اعضائے وضو میں سے نصف کی تخفیف اس طرح کردی کہ جہاں پہلے ہی تخفیف تھی یعنی سر کا مسح، اُسے بالکل اڑادیا اور پاؤں کو شاید اسلئے ساقط کردیا کہ وہ عموماً مٹی میں یا مٹی کے قریب رہتے ہیں۔ اور تمام اعضائے بدن کی نسبت سے گرد و غبار میں اُن کی آلودگی شدید تر ہے۔ لہٰذا اُن پر مٹی کا ہاتھ پھیرنا بیکار سا تھا۔ بس دو عضو باقی رہ گئے۔ منہ اور ہاتھ۔ اُن ہی کو ملنے سے وضو اور غسل دونوں کا تیمّم ہوجاتا ہے۔

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ۔ کیونکہ وہ خود پاک ہے۔ تو پاکی ہی کو پسند آتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ پچھلے رکوع میں جو عظیم نعمتیں بیان ہوئی ہیں ان کو سن کر بندہ کے دل میں جوش اٹھا کہ اُس منعم حقیقی کی بندگی کے لئے فوراً کھڑا ہوجائے۔ اُسے بتلادیا کہ ہماری طرف آؤ تو کس طریقہ سے پاک وصاف ہوکر آؤ۔ یہ بتلانا بھی خود ایک نعمت ہوئی۔ اور بدن کی ظاہری سطح پر پانی ڈالنے یا مٹی لگانے سے اندرونی پاکیزگی عطا فرمادینا، یہ دوسری نعمت ہوئی۔ بندہ ابھی پچھلی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکا تھا۔ قصد ہی کر رہا تھا کہ جدید انعامات نازل ہوگئے اس لئے ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یعنی ان پہلی نعمتوں کو یاد کرنے سے پہلے ان جدید نعمتوں کا جو احکام وضو وغیرہ کے ضمن میں مبذول ہوئیں۔ شکر ادا کرنا چاہیئے۔ شاید اسی لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ سے حضرت بلال رضی تحیۃ الوضوء کی نماز کا سراغ لگایا ہو۔

[1] اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ کا معنی ہے اِذَا اَرَدْتُمُ الْقِيَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ قرآن پاک میں کئی دفعہ فعل بمعنی ارادہ فعل آتا ہے جیسے فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ الخ یعنی اِذَا اَرَدْتَ قِرَاءَةَ الْقُرْاٰنِ جمہور مسلمین کے نزدیک نماز کا ارادہ کرنے والے کے لئے طہارت (وضوء یا غسل) صرف اس وقت واجب ہوتی ہے۔ جبکہ وہ بے وضوء ہو یا اُسے غسل کی حاجت ہو۔ احمد۔ مسلم اور اصحاب سُنن نے حضرت بریدہ رضی سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے وقت وضو کرتے تھے۔ لیکن فتح مکہ کے دن آپؐ نے وضو فرمایا اور موزوں پر مسح کیا اور ایک ہی وضو سے کئی نمازیں ادا فرمائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ حضورؐ! آپؐ نے ایک ایسا

---

[1] المراغی ج ۶ ص ۶۵،۶۶، المنار ج ۶ ص ۲۲۰، ۲۳۱

Marfat.com

کام کیا ہے جسے پہلے نہ کیا کرتے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا اے عمرؓ رضہ! میں نے یہ جان بوجھ کر کیا ہے بخاری اور اصحاب سنن نے عمر رضؓ بن عامر انصاری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے وضوء کرتے تھے۔ لیکن ہم جب تک وضوء نہ ٹوٹے ایک ہی وضوء سے کئی نمازیں پڑھ لیتے تھے۔

ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا عزیمت ہے اور افضل ہے لیکن واجب اُسی پر ہے جس کا پہلا وضو جاتا رہا ہو۔ آیت کا آخری حصّہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

فَاغْسِلُوْا۔ غسل کا معنیٰ ہے۔ کسی چیز پر میل وغیرہ اتارنے کے لئے پانی بہانا۔

وُجُوْہ، وجہ کی جمع ہے اور اس کی حدّ پیشانی کے اُوپر سے لے کر جبڑوں کے نیچے تک لمبائی میں اور دونوں کانوں کا درمیانی حصّہ چوڑائی میں ہے اَیْدِیْ، یَدٌ کی جمع ہے اور وضوء میں اس کی حدّ انگلیوں کے سروں سے لے کر کہنی تک ہے۔

سر کے مسح کی قلیل ترین فرض مقدار امام شافعیؒ کے نزدیک ایک بال ہے۔ امام مالکؒ احتیاطاً سارے سر کا مسح واجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن امام ابُوحنیفہؒ کے نزدیک سر کا چوتھا حصّہ ہے کیونکہ مسح ہاتھ سے ہوتا ہے اور وہ غالباً ¼ سر کو گھیر لیتا ہے اور ایک حدیث میں حضورؐ کے "ناصیہ" پر مسح کرنے کا ذکر آیا ہے اور ناصیہ کی مقدار چوتھائی سر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، صحابہ کا عمل اور ائمہ کا قول پاؤں کے دھونے کی تاکید کرتا ہے۔ مسلم میں حدیث ہے کہ حضورؐ نے کسی شخص کی ایڑی سوکھی دیکھی۔ تو فرمایا "ویل" للعقاب من النار" اسی طرح بخاری کی ایک حدیث میں بھی ایک سفر کے واقعہ میں یہی الفاظ منقول ہیں۔ اگر موزے پہنے ہوئے ہوں تو ان پر مسح کرنا غسل کا قائم مقام ہے۔ مسح علی الخفین کی احادیث لاتعداد صحابہ رضؓ سے مروی ہیں۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ ستر صحابہ رضؓ نے مجھے بتایا ہے کہ حضورؐ موزوں پر مسح فرماتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے مسح علی الخفین کو متواتر قرار دیا ہے۔

جُنُب کا لفظ واحد جمع اور مذکر و مونث سب کے لئے یکساں بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد عورت کی مقاربت ہے اور احتلام بھی اسی کے معنیٰ میں ہے۔ اس کے لئے حدیث میں اِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ کا ارشاد موجود ہے۔

دین چونکہ آسان ہے اس میں حرج اور تنگی نہیں ہے، لہٰذا مشقت یا عجز کے لئے وضوء اور غسل کی بجائے تیمّم فرض کیا گیا ہے۔ یعنی بیماریوں میں پانی کا استعمال مشقت کا باعث یا مضر ہوتا ہے۔ سفر میں بعض دفعہ پانی نہیں ملتا۔ یا وضوء اور غسل شاق ہوتا ہے۔ اور

Marfat.com

پھر یہ سفر سے ہی خاص نہیں بلکہ حضر میں بھی قضائے حاجت کے بعد کسی عذر شرعی سے اگر وضوء یا غسل نہ ہو سکے تو تیمم جائز ہے۔ عورتوں کی ملامست سے مراد جماع کا ملاپ ہے۔ اللہ تعالیٰ مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ گندگیوں، رذائل، برائیوں اور عقائد فاسدہ سے پاک کرنا چاہتا ہے تاکہ مسلمان بدن کے لحاظ سے سب سے پاکیزہ تر، دل کے لحاظ سے سب سے مزکیٰ اور صحت و تندرستی کے اعتبار سے سب لوگوں سے زیادہ صحت مند ہونے کے ساتھ ساتھ ارواح کے لحاظ سے سب لوگوں سے بلند تر ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کی تمام نعمت یہ ہے کہ وہ جسم و روح دونوں کی طہارت ہمارے لئے جمع کرتا ہے۔ نماز جو برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے روحانی طہارت کا باعث ہے اور وضوء و غسل جو نماز کا مقدمہ اور شرط ہے۔ وہ جسمانی طہارت ہے۔ اس نعمت و کرم پر شکریہ واجب ہے۔ اسی لئے آخر میں لعلکم تشکرون فرمایا ہے۔ وضوء اور غسل کی مشروعیت کی حکمت اور ان کے فوائد بہت سے ہیں۔ مثلاً:۔

ا۔ تازگی، شگفتگی، نشاط اور ہمت کا پیدا ہو جانا اور سستی اور بدنی فتور کا ازالہ۔

ب۔ نظافت و پاکیزگی جسمانی صحت کا بڑا رکن ہے اور گندگی اور میل کچیل بیماریوں کا باعث ہیں۔

ج۔ دوسرے لوگوں، بیوی بچوں، دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے نزدیک اپنے آپ کو پاک و صاف اور مہذب بنا کر پیش کرنا۔ اسی لئے جمعہ و عیدین میں غسل اور اچھے کپڑے پہننا اور خوشبو لگانا مشروع ہے۔

[1] وضوء کے چار فرائض کا ذکر خود قرآن پاک کی اس آیت میں آگیا ہے ان کے علاوہ نیت کرنا، مسواک کرنا، ہر عضو کو تین بار دھونا، داہنی طرف سے شروع کرنا، ترتیب کو ملحوظ رکھنا اور پے در پے کرنا کہ ایک عضو کے بعد دوسرا فوراً دھویا جائے نہ کہ پہلا خشک ہو جائے تو دوسرا دھوئیں۔ یہ سب چیزیں حضور علیہ السلام کے قول و فعل سے ثابت ہیں۔ لہٰذا سنت و مستحب شمار ہوتی ہیں۔

[2] امام بخاریؒ نے اس آیت تیمم کے متعلق ایک حدیث روایت کی ہے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک سفر میں میرا ہار بیداء میں گر پڑا اس

---

[1] تفسیر حقانی ج ۲ ص ۱۶۔
[2] ابن کثیر پ ۶ ص ۶۷۔

Marfat.com

وقت ہم مدینہ میں داخل ہونے ہی والے تھے۔ حضورؐ نے اپنی سواری روکی اور میری گود میں سر رکھ کر سو گئے اتنے میں والد محترم حضرت ابوبکر صدیق رضؓ میرے پاس تشریف لائے اور مجھ پر بگڑنے لگے۔ کہ تو نے ہار کھو کر لوگوں کو سفر سے روک دیا ہے اور مجھے کوسنے مارنے لگے۔ جس سے مجھے تکلیف ہوئی۔ لیکن اس خیال سے کہ حضورؐ کی نیند میں خلل اندازی نہ ہو میں ہلی جلی نہیں۔ حضورؐ جب جاگے اور صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ اور پانی کی تلاش کی گئی تو پانی نہ ملا۔ اس پر یہ پوری آیت نازل ہوئی۔ حضرت اُسید بن حضیر کہنے لگے اے آل ابوبکرؓ! اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے تمہیں بابرکت بنا دیا ہے۔ تم اُن کے لئے سراپا برکت ہو۔

[1] نماز اللہ کی ملاقات ہے، اُس کے سامنے کھڑا ہونا، اُس سے دعا کرنا اور اُس کے ساتھ سرگوشی کرنا ہے۔ پس اس کے لئے کچھ تیاری ضروری ہے وہ تیاری جسمانی طہارت ہے۔ جس کے ساتھ روحانی طہارت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ وضوء کی حکمت یہی ہے۔

حدثِ اصغر میں تو وضوء کافی ہے مگر حدثِ اکبر میں (چاہے مباشرت سے ہو یا احتلام سے) غسل ضروری ہے اور عذر کی حالت میں تیمم ان کا قائم مقام قرار دے دیا گیا ہے۔ صعیدِ طیب سے مراد زمین کی جنس کی کوئی پاک چیز ہے۔ مثلاً دُھول جو سواری کی پیٹھ پر ہو یا دیوار پر ہو۔

لقاءِ الٰہی کے لئے پاک صاف ہونا واجب ہے۔ وضو، اور غسل میں تو جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی طہارت پائی جاتی ہے۔ لیکن تیمم میں فقط روحانی طہارت ہے۔ جو عذر کی وجہ سے جسمانی کی طرف سے بھی کافی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ لوگوں کو تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا اور انہیں مشقت اور حرج سے بچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وضو، غسل اور تیمم کی حکمت تطہیر اور اتمامِ نعمت بیان فرمائی ہے۔ کیونکہ وضو اور غسل محض جسمانی پاکیزگی اور صفائی ہی نہیں ورنہ آج کل کے نام نہاد "فلاسفہ" کہ دیتے کہ ہم ہر وقت پاک وصاف رہتے ہیں۔ حمام میں جاتے ہیں۔ نہاتے اور صفائی کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں وضوء و غسل کی حاجت نہیں۔ یہ احکام تو بدوی عربوں کے لئے تھے! وضوء اور غسل دوسری طہارت ہے جو جسمانی اور روحانی طہارت کو جمع کر کے ایک بنا ڈالتی ہے۔ اور اس میں روحانی طہارت کی جانب زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ پانی نہ ملنے کی صورت میں یا بیماری وغیرہ میں تیمم جائز ہے۔

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۹۵

Marfat.com

اس سے ثابت ہوا کہ دین اسلام ایک عالمگیر ضابطہ ہے۔ جس میں ہر قسم کے حالات و واقعات کے لئے مناسب احکام موجود ہیں۔ وہ سب زمانوں، مکانوں، قوموں اور حالات کے لئے ہے۔

علاوہ ازیں تیمم کے حکم سے نماز کی اہمیت و تاکید معلوم ہوئی کہ بوقت ضرورت پانی کا استعمال تو ملتوی ہو سکتا ہے نماز نہیں۔ صلوٰۃ الخوف اور بیمار و معذور کی نماز سے یہی سبق ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کو نفس انسانی کی تربیت میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي

اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر اور عہد اُس کا جو تم سے ٹھہرایا

وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا

تھا۔ جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا اور ڈرتے رہو اللہ سے

اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات

لہ غالباً یہ وہی عہد ہے جو سورۃ البقرہ کے آخر میں مومنوں کی زبان سے نقل فرمایا ہے۔ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا (البقرہ آخری آیات) جب صحابہ رضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے تھے اُس وقت بھی یہ اقرار کرتے تھے کہ ہم اپنی استطاعت کے موافق آپؐ کی ہر بات مانیں گے۔ خواہ وہ ہمارے منشاء اور طبیعت کے موافق ہو یا خلاف۔ یہ تو عام عہد تھا۔ اس کے بعد بعض ارکانِ اسلام یا مناسب حال اہم چیزوں کے متعلق خصوصیت سے بھی عہد لیا جاتا تھا۔ گویا اس سورت کے شروع میں جو اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ فرمایا تھا، درمیان میں بہت سے احسانات کا ذکر کرکے جن کو سن کر ایفائے عہد کی مزید ترغیب ہوتی ہے۔ پھر وہی اصل سبق یاد دلایا گیا ہے۔

ایک شریف اور باحیا آدمی کی گردن اپنے محسنِ اعظم کے سامنے جھک جانی چاہیئے، مروّت و شرافت اور آئندہ مزید احسانات کی توقع اسی کی مقتضی ہے کہ بندہ اُس

لہ فوائد القرآن عثمانی صفحہ ۱۳۹۔

Marfat.com

منعم حقیقی کا بالکل تابع فرمان بن جائے خصوصاً جب کہ زبان سے اطاعت و فرمانبرداری کا پختہ عہد بھی کر چکا ہے۔ ممکن ہے حق تعالیٰ کی بے انتہاء مہربانیاں دیکھ کر بندہ مغرور ہو جائے اس کی نعمتوں کی تذکار اپنے قول و قرار کی کوئی پروا نہ کرے اس لئے فرمایا کہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ خدا سے ہمیشہ ڈرتے رہو۔ وہ ایک لمحہ میں تم سے سب نعمتیں چھین سکتا ہے۔ اور ناشکری اور بدعہدی کی سزا میں بہت سخت پکڑ سکتا ہے۔ بہرحال مروت و شرافت اور امید و بیم ہر چیز کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اُس کی مخلصانہ اطاعت اور وفاداری میں پوری مستعدی دکھلائیں۔ آگے وہ علیم بذات الصدور ہے۔ ہم جو کچھ کریں گے وہ ہمارے اخلاق یا نفاق، ریاکاری یا قلبی نیاز مندی کو خوب جانتا ہے۔ فقط زبان سے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہنے یا شکر گزاری کی رسمی اور ظاہری نمائش سے ہم اس کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

احکام الٰہی پر ثابت قدمی دو چیزوں سے ہوتی ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی کثرت جو انسان کے دل کو اپنے منعم کی طرف باندھ لاتی ہے۔ زندگی، صحت، عقل، ہدایت اور مصائب سے حفاظت سے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔

ب۔ عہد و پیمان اور قول و قرار جس کے باعث انسان احکام کی تکلیف برداشت کرتا ہے۔ آیت میں میثاق سے مراد یا تو بیعت رضوان وغیرہ کے مواقع کا عہد و پیمان ہے یا روز ازل کا میثاق الٰہی مراد ہے۔ یا انعام الٰہی اور اُس کی عبودیت کا مقتضاء ہے۔ جس پر دلائل عقلیہ قائم ہیں۔

حافظ ابن کثیر رح فرماتے ہیں کہ اس عہد و پیمان سے مراد اقرار ہے۔ جو ہر مومن حضور ؐ سے بیعت اسلام یا بیعت استقامت یا بیعت جہاد کے وقت کیا کرتا تھا۔ بعض نے اس سے مُراد روز ازل کا اقرار و میثاق بھی لیا ہے لیکن پہلا معنی زیادہ قوی ہے اور سُدّی اور ابن عباس رض سے وہی منقول ہے اور علامہ ابن جریر رح نے اسی کو مختار قرار دیا ہے۔

بندے اور اُس کے پروردگار کے درمیان دو عہد ہیں (ا) عہد ربوبیت و احسان (ب) عہد عبودیت و اطاعت اللہ تعالیٰ نے اپنا عہد پیمان (یعنی پہلا حصہ) پورا فرما دیا ہے۔ کھانے پینے اور نکاح میں جو چیزیں حلال و حرام تھیں ان کا بیان فرما دیا ہے۔ اس لئے اب وہ بندوں سے ان کے عہد (دوسرے عہد) کے ایفاء کا مطالبہ کرتا ہے۔ سے

سلہ تفسیر حقانی ج ۲ ص ۷۴ سلہ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۶۹ سلہ المراغی ج ۶ ص ۶۱

Marfat.com

بڑی بندگی اور طاعت ایمان کے بعد نماز ہے چونکہ اس کی اقامت طہارت کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا پہلی آیت میں فرائض وضو اور مسائل طہارت کو بیان فرما دیا ہے۔

ہر پیغمبر جو کسی قوم میں مبعوث ہوا اُس نے اپنی قوم سے سمع و طاعت، قبولِ دعوت اور دین میں داخل ہونے کا عہد لیا تھا۔ پیغمبر آخر الزمان بھی ہر اسلام میں داخل ہونے والے سے سمع و طاعت کا عہد لیتے تھے کہ ہر پسند و ناپسند میں خدا اور رسولؐ کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔ آسانی ہو یا تنگی، ہر حال میں اطاعت کریں گے۔

[1] جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں اور عورتوں سے "سمع و طاعت" پر بیعت لیتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے عہد کو سورۂ الممتحنہ میں بیان فرمایا ہے۔ مردوں کا عہد اس کی مانند ہوتا تھا۔ گو اُس کا ذکر علیحدہ خاص طور پر کہیں نہیں کیا گیا۔ لیکن قرآن پاک کی بہت سی آیات (مثلاً زیر تفسیر آیت) اس پر دلالت کرتی ہیں۔ اور احادیث میں اس کی تفاصیل مذکور ہیں۔ محض دعوتِ اسلام کو قبول کر کے دین میں داخل ہو جانا بھی سمع و طاعت" کا عہد شمار ہوتا ہے اور خدا و رسولؐ کا عہد جو اس امت کے پہلے طبقے سے لیا گیا تھا، عام ہے اور اس میں قیامت تک کے مسلمان ہونے والے لوگ یا جن کی نشوونما اسلام میں ہوئی ہے یا ہوگی؟ داخل ہیں۔

[2] ذات الصدور: یہ تعبیر قرآن میں ہمیں اکثر ملتی ہے اس میں گہرائی، جمال اور اشارہ پایا جاتا ہے۔

ذات الصدور: کنایہ ہے مخفی شعور اور پوشیدہ خواطر سے۔ یعنی وہ خیالات و احساسات جو دلوں کی گہرائیوں میں مدفون ہیں، باوجود پوشیدگی اور خفا کے علم الٰہی کے سامنے واضح اور کھلے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو عہد و میثاق کی پابندی اور سمع و طاعت میں ان کے تقویٰ اور قلبی احساس کے سپرد فرماتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ پوشیدہ خطرات و جذبات اور احساسات تک میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی نگرانی کرو!

اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ سے جو عہد و میثاق لیا تھا اُس میں یہ بات بھی داخل تھی کہ انسانیت میں عدل و انصاف کو رائج و قائم کیا جائے۔ ایسا مطلق عدل جس کی ترازو محبت اور بغض کے جذبات سے جھکنے نہ پائے۔ جو قرابت مصلحت پسندی یا خواہشات سے متاثر نہ ہو۔ اسی لئے اگلی آیات میں عدل و انصاف کا حکم آرہا ہے۔

---

[1] المنار ج ۶ ص ۲۷۱، ۲۷۲۔ [2] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۹۹ (طبع سوم)

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ

اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے لئے گواہی دینے

بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا

کو انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز

تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا

نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات نزدیک ہے تقویٰ سے اور

اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

ڈرتے رہو اللہ سے اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو

پچھلی[1] آیت میں عہد و پیمان کو یاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہاں بتلا دیا کہ صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ عملی رنگ میں مومنوں سے اس کا ثبوت مطلوب ہے۔ اس آیت میں اسی پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بے شمار احسانات اور اپنے عہد و اقرار کو بھلا نہیں دیا تو لازم ہے کہ اس محسنِ حقیقی کے حقوق ادا کرنے اور اپنے عہد کو سچا کر دکھانے کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہو اور جب کوئی حکم اپنے آقائے مولیٰ نعمت کی طرف سے ملے تو فوراً تعمیلِ حکم کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور خدا کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے حقوق ادا کرنے میں بھی پوری جدوجہد اور اہتمام کرو چنانچہ قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ میں حقوق اللہ کی اور شہداء بالقسط میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے۔

عدل کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدوں افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جو کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیئے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلے کو جھکا نہ سکے۔

جو چیزیں شرعاً مہلک یا کسی درجہ میں مُضر ہیں، اُن سے بچاؤ کرتے رہنے سے جو

---

[1] فوائد القرآن صـ۱۴۰

Marfat.com

ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے۔ اُس کا نام تقویٰ ہے تحصیل تقویٰ کے اسباب قریبہ و بعیدہ بہت سے ہیں۔ تمام اعمالِ حسنہ اور خصالِ خیر کو اُس کے اسباب و مُعدّات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عدل و قسط، یعنی دوست و دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملہ میں جذباتِ محبت و عداوت سے مغلوب نہ ہونا یہ خصلت حصولِ تقویٰ کے مؤثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے۔ اسی لئے هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی فرمایا۔ یعنی یہ عدل جس کا حکم دیا گیا۔ تقویٰ سے نزدیک تر ہے کہ اُس کی پابندی کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہو جاتی ہے۔

ایسا عدل و انصاف جسے کوئی دوستی یا دشمنی نہ روک سکے اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو متقی بننا سہل ہو جاتا ہے اس کے حصول کا واحد ذریعہ خدا کا ڈر اور اُس کی شانِ انتقام کا خوف ہے اور یہ خوف اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ کے مضمون کا بار بار مراقبہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کسی مومن کے دل میں یہ یقین مستحضر ہوگا کہ ہماری کوئی کھلی یا چھپی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں۔ تو اُس کا قلب خوفِ الٰہی سے لرزنے لگے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرے گا اور احکامِ الٰہیہ کے امتثال کے لئے غلامانہ تیار رہے گا پھر اس نتیجہ پر وہ ثمر ملے گا۔ جسے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ۔

[1] کسی چیز پر قوّام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس پر قائم ہونے کا پورا پورا حق ادا کیا جائے۔ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ کا معنیٰ ہے بلا محابا عدل و انصاف کی گواہی دینے والے لَا يَجْرِمَنَّكُمْ کا معنیٰ ہے تمہیں ہرگز آمادہ نہ کرے۔ شَنَآن کا معنیٰ بغض و عداوت ہے۔ خبیر وہ ذات ہے جو وقت اور ضبط کے ساتھ کسی چیز کو خوب جاننے والی ہے۔ عدل حقوق کی میزان ہے۔ کیونکہ جب کسی قوم میں کسی سبب سے ظلم وجود پیدا ہو جائے، تو لوگوں کا باہمی اعتماد زائل ہو جاتا ہے اور مفاسد پھیل جاتے ہیں۔ معاشرے کے روابط منتشر ہو جاتے ہیں۔ پس یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اُس قوم پر اپنے بعض ایسے بندوں کو مسلط کر دیتا ہے۔ جو عدل و انصاف میں ان سے بہتر ہوں۔ وہ لوگ اس قوم کو عذاب و وبال چکھاتے ہیں۔ گزشتہ و موجودہ قوموں میں اللہ تعالیٰ کی سنّت یہی ہے۔ مگر افسوس کہ لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے۔

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۶۷ المنار ج ۶ ص ۲۷۳، ۲۷۵۔

Marfat.com

اسلام نے دشمنوں سے بھی عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔ مومن عدل کو بہر حال جور و جفا اور ناجائز رعایت پر ترجیح دیتا ہے اور اُسے دل کی خواہش، محبت اور عداوت سے بالاتر رکھتا ہے۔ عدل و انصاف تقویٰ سے قریب تر اور خدا کی ناراضگی سے بعید تر ہے اور اُس کا چھوڑ دینا گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ اس سے ایسے مفاسد پیدا ہوتے ہیں جو جماعتی نظم و ضبط اور معاشرے کی بنیادوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور افراد کے تعلقات کو توڑ کر انہیں خانہ جنگی میں مبتلاء کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی سنّت یہ ہے کہ عدل کو چھوڑنے کی دنیوی سزا ذلت و رسوائی (انفرادی و اجتماعی) اور آخرت کی شرمندگی اور عذاب ہے۔

[1] ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنا اور دوستی و دشمنی سے بالاتر ہو کر تقاضائے عدل کو پورا کرنا، کہ دشمنی عدل سے ہٹا نہ سکے) یہ انفرادی و اجتماعی اخلاق کی بلند ترین چوٹی اور دشوار ترین گھاٹی ہے۔ کراہت و بغض کے شعور کے باوجود عدل پر قائم رہنا نہایت مشکل امر ہے۔ انسانی نفس صرف تقویٰ سے ہی اس بلندی پر چڑھ سکتا ہے۔ یہ بلندی کسی اور چیز سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس مقام پر اللہ کے سوا ہر کسی سے متجرد ہونا پڑتا ہے۔

دین حق کے سوا کائنات ارضی کا کوئی عقیدہ اور نظام مبغوض دشمنوں کے لئے عدل و انصاف کی کفالت نہیں کرتا۔ اسی لئے یہ آخری عالمگیر اور دائمی ضابطۂ حیات ہے۔ جو اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سب کو اپنی شفقت کے سائے میں لے لیتا ہے۔ انہیں عدل و انصاف مہیا کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو دشمنوں کے ساتھ عادلانہ اور منصفانہ برتاؤ کرنے کا حکم دیتا ہے اس میں چاہے کس قدر مشقت اور جد و جہد کرنی پڑے، بہر حال اسلام کا اہل ایمان کے لئے یہی حکم ہے۔

جب اُمت اسلامیہ دین حق پر ثابت و قائم تھی تو فی الواقع اُس نے دشمنوں سے عدل و انصاف کر کے دکھایا۔ مسلمانوں اور کفار کی روزمرّہ کی زندگی میں عدل کو ایک زندہ حقیقت بنا دیا۔ انسانیت نے یہ نظارہ نہ اس سے قبل کبھی دیکھا تھا۔ اور (انسوس) نہ اس کے بعد دیکھ سکی ہے۔ تاریخ نے اس عدل کی بے شمار واضح اور روشن مثالیں محفوظ رکھی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم محض ایک وصیت و نصیحت ہی نہ تھا۔ بلکہ اہل ایمان کی زندگیوں کا دستور العمل تھا۔ اسلامی عدل و انصاف کی بلند چوٹیوں سے جب ہم قدیم و جدید جاہلیت کی طرف جھانکتے ہیں تو الٰہی نظام حیات اور انسانی خود ساختہ دستور زندگی کا

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۹۹، ۱۰۲

Marfat.com

کھلا ہُوا فرق سامنے آجاتا ہے لوگ عقائد کو جانتے اور مان کا اعلان کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو ایک چیز ہے۔ عالمِ واقع میں اور روزمرّہ کی زندگی میں ان کا ثابت و قائم ہونا دوسری چیز ہے۔ اسلامی دعوت کی قیمت دین کے اقتدار پر قائم ہے۔ جس کا منبع اقتدارِ الٰہی ہے۔

ہر انقلاب شور مچانے والے، عدل، تطہیر، آزادی، بلندی، رواداری، محبت قربانی اور ایثار کا نام لے کر شور مچاتے ہیں۔ لیکن ان کا شور دغل انسانی ضمیروں کو نہیں جھنجھوڑتا۔ کیونکہ ان کے پیچھے الٰہی سند اور خدائی اقتدار موجود نہیں ہوتا۔ یہ چیز اہم نہیں کہ کہتا کیا ہے۔ بلکہ یہ چیز اہم ہے کہ کہنے والا کون ہے؟

لوگ ان شور مچانے والوں کی آواز پہ کان نہیں دھرتے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے۔ کہ کہنے والا ہماری مانند ایک معمولی انسان ہے۔ جس کے پاس کوئی الٰہی سند موجود نہیں ہے۔ زندگی کے لئے دین حق کے مطابق ایک نظامِ کامل کی ضرورت ہے۔ جس کے سایے میں دین اپنے احکام و وصایا کو نافذ کرے۔ سیاسی نظام بھی دین کا ایک ضروری حصہ ہے۔ دین صرف اُسی وقت قائم ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ زندگی کا پورا دستور بنے نہ کہ محراب و منبر کی چند غیر مؤثر آوازیں اور چند رسوم و شعائر جن کا عملی زندگی سے تعلق باقی نہ رہا ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ

وعدہ کیا اللہ نے ایمان والوں سے اور جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کیلئے

مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ

بخشش اور بڑا ثواب ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

جھٹلائیں ہماری آیتیں وہ ہیں دوزخ والے۔

سلہ مومنوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ نہ صرف اُن کی کوتاہیوں کو معاف کر دیں گے، جو بمقتضائے بشریت رہ جاتی ہیں۔ بلکہ عظیم الشان اجر و ثواب بھی عطا فرمائیں گے۔ پھر پہلے فریق (یعنی مومن جماعت) کے بالمقابل اُس جماعت کی سزا ذکر کر دی گئی۔ جس نے قرآن کے ان صاف و صریح حقائق کو جھٹلایا۔ یا اُن نشانات کی تکذیب کی جو سچائی کی طرف رہنمائی کرتے

سلہ فوائد القرآن شیخ الاسلام عثمانی ص۱۴۰

Marfat.com

کے لیے خدا کی طرف سے دکھلائے جاتے ہیں۔

لہ الجحیم کا معنیٰ ہے بہت بڑی آگ ۔ اس سے یہاں مراد دارالعذاب (دوزخ) ہے اور اُس کے اصحاب وہ لوگ ہیں جو اُس میں رہیں گے عَمِلُوا الصّالحاتِ سے مراد وہ اعمال ہیں جن سے بندوں کے انفرادی کام اور اجتماعی تعلقات و معاملات سنورتے ہیں، اور اُن میں سے اہم اعمال بندوں کا باہمی عدل و انصاف اور تمام احوال میں خدا تعالیٰ کا تقویٰ ہیں۔

لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ۔ مغفرت کا معنیٰ ہے ستر (پردہ) ایمان اور عملِ صالح نفسِ انسانی کے گزشتہ بُرے اعمال کے بُرے اثر کو ڈھانپ دیتے اور محو کر دیتے اس طرح نفس پر حق اور نیکی کی محبت غالب آجاتی ہے اور وہ قدس و پاکیزگی کے جہان میں پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اجرِ عظیم سے مراد ایمان اور عمل صالح پر خدا کے فضل و رحمت سے جو کئی گنا جنا ہوتی ہے، وہ ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ یہاں کفر سے مراد خدا اور اُس کے پیغمبروں سے کفر ہے۔ چاہے سب کا انکار ہو چاہے بعض کا، کفر ہونے کے لحاظ سے اس میں کوئی فرق نہیں۔ اور اللہ کی آیات کی دو قسمیں ہیں :۔

ا۔ وہ جو اُس کے رسولوں پر اُتاری گئی ہیں۔

ب۔ وہ جو انفس و آفاق میں خدا کی وحدانیت، کمال، قدرت اور ارادے پر دلالت کرنے کے لیے اُس نے قائم کر رکھی ہیں اور پیغمبروں کی صداقت کے لئے جو آیات (معجزات) بھیجے جاتے رہے ہیں۔ وہ بھی اسی قسم میں داخل سمجھئے۔

اہل کفر کے نفوس چونکہ فاسد ہو چکے ہیں اور ان کے اعمال کی برائی کا زنگ ان کے دلوں پر جم چکا ہے۔ لہٰذا وہ اندھے بہرے ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے ان کے کفر و تکذیب کے مطابق بڑی سزا مقرر ہے۔

لہ اہل ایمان جو صرف اللہ کے لئے عمل کرتے ہیں، ان کے لئے کسی جزاء کا ہونا لازم ہے تاکہ وہ انہیں قوت و شجاعت دے اور اپنے منصبِ عظیم کے حقوق کی ادائیگی پر ابھارے، نیز عہد و میثاق کی پابندی اور وفا کرنے کی ترغیب دے۔ اسی طرح ان کے مخالف فریق یعنی کافر گروہ کا انجام مومنوں سے جداگانہ ہونا ضروری ہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے ان دو آیات میں بیان فرمایا ہے۔

لہ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۶۹، ۷۰ تفسیر المنار ج ۶ ص ۲۷۵، ۲۷۶

لہ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۰۲ (طبع سوم)

Marfat.com

مومنوں کی یہ چیز دنیوی زندگی کے عیش و آرام اور ساز و سامان سے دست کشی کے بدلے میں ہے۔ کیونکہ وہ بڑی بڑی تکالیف برداشت کرتے رہے ہیں۔ وہ جزاء ایسی ہونی چاہیئے تھی۔ جس کے سامنے انسانوں کی مخالفت، عناد اور کشمکش وغیرہ حقیر نظر آئے۔ علاوہ ازیں عدلِ الٰہی کا بھی یہ تقاضا ہے کہ وہ نیکوکاروں اور اشرار کا انجام اور جزاء ایک جیسی نہ کرے۔

پس لازم تھا کہ مومنوں کے دلوں کو اس عدل اور اس جزاء کے ساتھ جوڑ دیا جاتا۔ تاکہ وہ ہر چیز سے ہٹ کر اور ہر طرف سے منہ پھیر کر اللہ کے لئے کام کریں۔ بعض قلوب کے لئے تو صرف اتنا کافی ہے کہ وہ رضاء الٰہی کا شعور حاصل کر لیں اور اس کی مٹھاس کو چکھ لیں۔ لیکن دین حق سب لوگوں کے لئے ہے وہ سب کی طبیعت کا لحاظ کرتا اور اس کے مطابق ان سے معاملہ کرتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ طبیعت انسانی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کی محتاج ہے۔ کیونکہ اس سے انسانی طبیعت راضی ہوتی ہے۔ اپنی جزاء اور انجام پر مطمئن ہوتی ہے اور شریروں کا انجام سن کر اس کا سینہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ دین میں ان مخالفوں اور شریروں سے بھی عدل کا حکم ملا ہے اور انسانی فطرت ان کو ناپسند کرتی ہے کیونکہ اُسے مخالفین کی طرف سے کئی دھوکے فریب اور اذیتیں پہنچتی ہیں پس انسانی فطرت کے اسی علم کے مطابق دین حق ایسی چیزوں کا اعلان کرتا ہے۔ جس سے اس میں شرح صدر اور کشادہ دلی پیدا ہو جائے۔ علاوہ ازیں مغفرت اور اجر عظیم خود رضاء الٰہی کی دلیل ہے اور ان میں عیش و عشرت کے لطف سے زیادہ رضاء کا لطف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اے ایمان والو! یاد رکھو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب قصد کیا

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ

لوگوں نے کہ تم پر ہاتھ چلائیں پھر روک دیئے

فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى

تم سے ان کے ہاتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ

Marfat.com

۲

اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ع ۲

پر چاہیئے بھروسہ ایمان والوں کو

لہ عمومی احسانات یاد دلانے کے بعد بعض خصوصی احسان یاد دلاتے ہیں۔ یعنی قریش مکہ اور ان کے پٹھوؤں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچانے اور اسلام کو مٹانے کے لئے کس قدر ہاتھ پاؤں مارے، مگر حق تعالیٰ کے فضل و رحمت نے ان کا کوئی داؤ نہ چلنے دیا۔ اس احسانِ عظیم کا اثر یہ ہونا چاہیئے کہ مسلمان غلبہ اور قابو حاصل کر لینے کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے محفوظ رکھیں اور جوشِ انتقام میں عدل و انصاف کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ جیسا کہ پچھلی آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ ممکن ہے کسی کو شبہ گزرے کہ ایسے معاند دشمنوں کے حق میں اس قدر رواداری کی تعلیم کہیں اصولِ سیاست کے خلاف تو نہ ہوگی۔ کیونکہ ایسا نرم برتاؤ دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف شریر اور بدباطنوں کی جرأت بڑھ جانے کا قوی احتمال ہے اس کا ازالہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وعلی اللّٰہ فلیتوکل المؤمنون سے فرما دیا۔ یعنی مومن کی سب سے بڑی سیاست تقویٰ اور توکل علی اللہ (خدا سے ڈرنا اور اُسی پر بھروسہ کرنا) ہے۔ خدا سے ڈرنے کا مطلب ہے کہ ظاہر و باطن میں اُس سے اپنا معاملہ صاف رکھو۔ اور جو عہد و اقرار کئے ہیں۔ ان میں پوری وفاداری دکھلاتے رہو۔ پھر بحمداللہ کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگلی آیت میں ایک ایسی قوم کا ذکر فرما دیا۔ جس نے خدا سے نڈر ہو کر بدعہدی اور غداری کی تھی۔ وہ کس طرح ذلیل و خوار ہوئی۔

لہ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ یہ آیت محارب نامی قبیلہ کے ایک شخص کے بارے میں اُتری تھی، جس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا تھا اور اُس کی قوم نے اس مقصد کے لئے اُسے بھیجا تھا اُس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالی ہاتھ اور اکیلے تھے۔ حاکم نے حضرت جابرؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ وہ شخص حضورؐ کے سر پر آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا تجھے کون بچائے گا؟

لہ فوائد القرآن ص ۱۴۰

لہ المراغی ج ۶ ص ۷۰، ۷۱، المنار ج ۶ ص ۲۷۶، ۲۷۸

Marfat.com

حضورؐ نے فرمایا اللہ"، ! پس اُس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پکڑ کر فرمایا: "اب تجھے کون بچائے گا ؟ اُس نے کہا کہ اچھا بدلہ لینے والا بن ! حضورؐ نے ارشاد فرمایا کیا تو اللہ کی الوہیت اور میری رسالت کی گواہی دیتا ہے اُس نے کہا کہ میں آپؐ سے معاہدہ کرتا ہوں کہ نہ آپؐ سے لڑوں گا نہ کسی لڑنے والے کا آپ کے خلاف ساتھ دوں گا۔ پس حضورؐ نے اُسے آزاد کر دیا۔ وہ اپنی قوم میں آیا اور بولا "میں بہترین انسان کے پاس سے آرہا ہوں"!

ایک روایت میں ہے کہ اُس بدو کے ہاتھ میں جو تلوار تھی وہ حضورؐ کی تھی۔ جسے آپؐ نے آرام کے وقت ایک درخت سے لٹکا دیا تھا۔ پس اُس شخص نے وہ تلوار لے لی اور اُسے ہلانے لگا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرنے لگا۔ پھر وہ اُس کے ہاتھ سے گر گئی تو حضورؐ نے پکڑ لی اور فرمایا "تجھے مجھ سے کون بچائے گا اُس نے کہا: "کوئی نہیں!" پھر حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلا لیا اور اُس شخص کو سزا دینے سے انکار فرمایا۔

ان روایات کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے جو نعمت یاد دلائی ہے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مکروہ چیز اور شر کا ہٹانا ہے۔ اس لئے کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہو جاتا تو مسلمانوں کو یہ عظیم ترین مصیبت پہنچتی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں جس انعام الٰہی کا ذکر ہے وہ قوت اسلام اور عظمت شوکت اہل اسلام ہے۔ پہلے وہ کمزور اور مغلوب تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی حالت بدل دی اور باعزت و غالب ہو گئے۔ گویا صرف ایک محاربی کا واقعہ ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ساری اسلامی تاریخ اور اُس کے واقعات یاد دلا رہا ہے۔ کیونکہ ان بزرگوں کو بچانا دین قیم کا بچانا تھا۔ وجہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو رسالت پہنچا دی اور امانت ادا کر دی۔ یہ آپؐ کے اصحابؓ ہی تھے۔ جنہوں نے اس امانت اور پیغام الٰہی کو حضورؐ سے لیا۔ اور بعد والوں تک اپنے قول و عمل سے پہنچا دیا۔

بعد والوں کے لئے اس تذکیر نعمت کا فائدہ یہ ہے کہ وہ دین حق کو قائم کریں، اُس پر عمل کریں اور بزرگوں کی سنت کے مطابق عدل اور نیکی کا نمونہ بن جائیں۔

آیت کے آخر میں تقویٰ اور توکل علی اللہ کا حکم دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

Marfat.com

اُس اللہ سے ڈرو (نہ کہ کسی اور سے) جس نے تمہارے ضعف اور دشمنوں کی قوت کے وقت تمہارے دشمنوں پر اپنی قدرت کا تمہیں مشاہدہ کرایا۔ اور صرف اُسی پر تکیہ کرو۔ اُس نے تمہیں دکھا دیا ہے کہ جو لوگ اُس کی سُنن کی مراعات کرکے اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دیتے ہیں، اور ہر مضر اور بُرے انجام والے عمل سے بچ کر رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ان پر مہربانی کرتا ہے۔ اپنے دوستوں اور حلیفوں پر بھروسہ مت کرو۔ کیونکہ دوست کبھی تعلقات سے دست کش ہو جاتے ہیں اور گھمسان کی جنگ میں ناامید ہو کر ساتھ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اور حلیف بے وفائی کرتے ہیں جیسا کہ بنو النضیر وغیرہ نے غداری کی تھی۔ لیکن اللہ پر بھروسہ کرنے والا مومن جب مایوس ہونے لگتا ہے تو اُسے یاد آجاتا ہے کہ اللہ اُس کا دوست ہے، اُسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت و بادشاہت ہے، وہ پناہ دے سکتا ہے۔ لیکن اُس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اس تذکّر سے مومن کی قوت از سرِ نو مضبوط ہو جاتی ہے اور ناامیدی بھاگ جاتی ہے۔ پس اللہ اُس کی مدد فرماتا ہے اور اُس کے دشمنوں کو ذلیل کر دیتا ہے۔ اس کی واضح مثال اُن کامل متوکلین کی جماعت کا غلبہ ہے جو سیّد المرسلینؐ کے ساتھ تھی۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اُن آیات کی تفسیر میں مفسّرین کے دو قول ہیں۔

ا۔ یہ کہ اس میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نہیں بلکہ اہل اسلام کی ابتدائی حالت کی طرف ایک عام اشارہ ہے کہ تم ضعیف و ناتواں تھے۔ اللہ نے تمہیں غلبہ بخشا۔

ب۔ ایک جنگ سے واپسی پر کفّار نے مسلمانوں کے خلاف سازش کی کہ جب یہ لوگ نماز میں مصروف ہوں تو ان پر یکبارگی ٹوٹ پڑو۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو اس کی اطلاع دے دی اور کفّار ناکام رہے۔ علیٰ ہذا القیاس بنی نضیر نے عہد شکنی کرکے حضورؐ اور آپؐ کے خصوصی اصحابؓ کے قتل کی سازش کی مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو خبردار کر دیا اور آپؐ بمعہ اصحابؓ یہودیوں کے محلہ سے اٹھ کر چلے آئے۔ اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر قریش کی اشتعال انگیزی کے باعث جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے کئی واقعات حضورؐ کی زندگی میں پیش آئے تھے۔

لہ تفسیر حقانی ج ۴ ص ۱۸، ۱۹۔

Marfat.com

ان میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

[1] حافظ ابن کثیر نے قبیلۂ محارب کے اُس بدو کا نام جس نے آپؐ کو قتل کرنے کا مذموم ارادہ کیا تھا غورث بن حارث بتایا ہے۔ نیز حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے جنگ خیبر کے بعد حضورؐ کے قتل کی جو سازش زہر خورانی سے ہوئی تھی اُسے بھی اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اور ایک اور روایت بیان کی ہے کہ کعب بن اشرف یہودی اور اُس کے ساتھیوں نے حضورؐ کو اپنے گھر بلا کر صدمہ پہنچانا چاہا تھا۔ آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اصل بات وہی ہے جو حقانی کے حوالہ سے اوپر گزر چکی ہے وَاللّٰہُ علم بالصواب۔

[2] سید قطب شہید فرماتے ہیں کہ راجح تر یہی ہے کہ اس آیت کا اشارہ اُس کافر غدار گروہ کی سازش کی طرف ہے۔ جس نے صلح حدیبیہ کے موقع پر دھوکے سے حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر لوٹ پڑنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں مسلمانوں کا قیدی بنا دیا۔

واقعہ کوئی بھی ہو۔ بہر حال اللہ تعالےٰ مسلمانوں سے یہ فرماتا ہے کہ تمہارا محافظ نگران میں ہوں اور اسی طرح وہ مسلمانوں کے دلوں کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر کے آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ دشمنوں سے عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رہ جائیں۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے دیئے ہوئے اطمینان اور راحت کے سائے میں ضبط نفس، دل داری اور اقامتِ عدل آسان ہو جاتی ہے۔ اور مسلمان اللہ سے کئے ہوئے عہد و میثاق کو توڑنے سے شرما جاتے ہیں۔

اس آیت میں "لبسط ید" اور "کف ید" کے الفاظ نے صورتِ واقعہ کی صحیح، تصویر کھینچ کر رکھ دی، اس تعبیر میں روانی، زندگی، حرکت اور تصویر کشی بہ نسبت کسی اور تعبیر کے زیادہ تر ہے اور قرآن کا تعبیر واقعات میں یہی طریقہ ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ

اور لے چکا اللہ عہد بنی اسرائیل سے اور

بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ

مقرر کئے ہم نے ان میں بارہ سردار اور کہا اللہ نے کہ میں تمہارے

مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ

ساتھ ہوں اگر تم قائم رکھو گے نماز اور دیتے رہو گے زکوٰۃ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص [2] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۰۲ (طبع سوم)

Marfat.com

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ

اور یقین لاؤ گے میرے رسولوں پر اور مدد کرو گے ان کی اور قرض

اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

دو گے اللہ کو اچھی طرح کا قرض تو البتہ دور کروں گا میں تم سے گناہ

وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

تمہارے اور داخل کرونگا تم کو باغوں میں کہ بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ

پھر جو کوئی کافر ہوا تم میں سے اس کے بعد تو بے شک گمراہ ہوا

سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ

سیدھے راستے سے سو ان کے عہد توڑنے پر ہم نے

لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ

ان پر لعنت کی اور کر دیا ہم نے ان کے دلوں کو سخت پھیرتے ہیں کلام کو

الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا

اس کے ٹھکانے سے اور بھول گئے نفع اٹھانا اس نصیحت سے جو ان کو

بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ

کی گئی تھی۔ اور ہمیشہ تو مطلع ہوتا رہتا ہے ان کی کسی دغا پر

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ

مگر تھوڑے لوگ ان میں سے سو معاف کر دو اور درگزر کرو ان سے

اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

اور اللہ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو

Marfat.com

[1] آیت ۱۲ سے پتہ چلا کہ کچھ اُمّت محمدیہؐ ہی کی خصوصیت نہیں، پہلی اُمتوں سے بھی عہد لئے جا چکے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ[۱۲] قبائل میں سے بارہ سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چن لئے تھے، جن کے نام بھی مفسرین نے تورات سے نقل کئے ہیں۔ اُن کا فرض یہ تھا کہ وہ اپنی قوم پر عہد پورا کرنے کی تاکید اور اُن کے احوال کی نگرانی رکھیں۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے جب انصار نے "لیلۃ العقبہ" میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، تو ان میں سے بھی بارہ[۱۲] نقیب نامزد ہوئے۔ ان ہی بارہ آدمیوں نے اپنی قوم کی طرف سے حضورؐ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ جابر رضؓ بن سمرہ کی ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُمّت کے متعلق جو بارہ خلفاء کی پیش گوئی فرمائی اُن کا عدد بھی نقبائے بنی اسرائیل کے عدد کے موافق ہے۔ مفسّرین نے تورات سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ "میں تیری ذرّیت میں سے بارہ سردار پیدا کروں گا"، غالباً یہ وہی بارہ ہیں۔ جن کا ذکر جابر رضؓ بن سمرہ کی حدیث میں ہے۔

اِنِّیْ مَعَکُمْ کا خطاب یا تو بارہ سرداروں کو ہے، یعنی تم اپنا فرض ادا کرو، میری حمایت اور امداد تمہارے ساتھ ہے یا سب بنی اسرائیل کو ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یعنی کسی وقت تم مجھے ہمیشہ سے دور مت سمجھو جو کچھ معاملہ تم سِرّاً یا علانیۃً کرو گے۔ وہ ہر وقت ہر جگہ میں سن رہا اور دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے جو کچھ کرو خبردار ہو کر کرو۔

آمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ: یعنی رسول موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے ہیں گے۔ ان سب کی تصدیق کرو گے اور دلی تعظیم سے پیش آؤ گے اور دشمنانِ حق کے مقابلہ میں اُن کا جان و مال سے پورا ساتھ دو گے۔

فَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا: خدا کو قرض دینے سے مراد اس کے پیغمبروں کی حمایت میں مال خرچ کرنا ہے۔ جس طرح روپیہ قرض دینے والا اس امید پر دیتا ہے کہ اُس کا روپیہ واپس مل جائے گا اور قرض لینے والا اس کے ادا کرنے کو اپنے ذمہ پر لازم کر لیتا ہے۔ اس طرح خدا کے لئے دی ہوئی چیز جو یہاں اس کے راستہ میں خرچ کی جائیگی، وہ ہرگز گم یا کم نہ ہوگی۔ حق تعالیٰ نے کسی مجبوری سے نہیں محض اپنے فضل و رحمت سے اپنے ذمہ لازم کر لیا ہے۔ کہ وہ چیز تم کو عظیم الشان نفع کی صورت میں واپس کر دے۔ اور اچھی طرح سے (قرض حسن) مراد یہ ہے کہ اخلاص سے دو اور اپنے محبوب و مرغوب اور پاک و صاف مال سے دو۔

---

[1] فوائد القرآن شیخ الاسلام عثمانی رح صـ۱۴۰، ۱۴۱۔

Marfat.com

لاکفرن عنکم الخ یعنی نیکیاں جب کثرت سے ہوں تو وہ بُرائیوں کو دبا لیتی ہیں۔ جب آدمی خُدا کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا رہے تو حق تعالیٰ اُس کی کمزوریوں کو دور کر کے اپنی خوشنودی اور قرب کے مکان میں جگہ دیتا ہے (یعنی جنّت میں)

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَالِكَ الخ یعنی ایسے صاف اور پختہ عہد و پیمان کے بعد بھی جو شخص خدا کا فادار ثابت نہ ہُوا اور عہد و خیانت پر کمر بستہ ہو گیا، تو سمجھ لو کہ اُس نے کامیابی اور نجات کا سیدھا راستہ گم کر دیا نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہلاکت کے کس گڑھے میں جا کر گرے گا۔ بنی اسرائیل سے جن باتوں پر عہد لینے کا یہاں ذکر ہے، وہ یہ ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، پیغمبروں پر ایمان لانا، اُن کی جان و مال سے مدد کرنا۔ پہلی عبادت بدنی ہے، دوسری مالی، تیسری قلبی مع لسانی، چوتھی فی الحقیقت تیسری کی اخلاقی تکمیل ہے گویا ان چیزوں کو ذکر کر کے اشارہ فرما دیا کہ جان و مال اور قلب و قالب ہر چیز سے خدا کی اطاعت اور وفاشعاری کا اظہار کرو۔ لیکن بنی اسرائیل نے چُن چُن کر ایک ایک عہد کی خلاف ورزی کی۔ کسی قول و قرار پر قائم نہ رہے۔ اس کا نتیجہ اگلی آیت میں بیان ہوا ہے۔

لَعَنّٰهُمْ: لعن کے معنی طرد و ابعاد (پرے پھینک دینا اور رد کر دینا) کے ہیں۔ یعنی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے ہم نے اپنی رحمت سے انہیں دور پھینک دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

فبما نقضهم میثاقهم کے لفظ سے ظاہر فرمایا کہ ان کے ملعون اور سنگ دل ہونے کا سبب عہد شکنی اور بے وفائی ہے۔ جو خود انہی کا فعل ہے اسباب پر مسبب (نتیجہ) کا مرتب کرنا چونکہ خدا ہی کا کام تھا اس لحاظ سے ان کو سخت دل بنانے کی نسبت اُس کی طرف کی گئی۔

یحرفون الکلم الخ یعنی خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں، کبھی اُس کے الفاظ میں کبھی معنی میں کبھی تلاوت میں۔ تحریف کی سب اقسام قرآن کریم اور کتب حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔ جس کا تدارک اعتراض آج کل بعض یورپین عیسائیوں کو بھی کرنا پڑا ہے۔

ونسوا حظا مما ذکروا به: یعنی چاہیئے تو یہ تھا کہ ان قیمتی نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتے جو مثلاً نبی آخر الزمان کی آمد اور دوسرے مہمات دینیہ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں۔ مگر اپنی غفلتوں اور شرارتوں میں پھنس کر یہ سب بھول گئے۔ بلکہ نصیحتوں کا وہ ضروری حصہ ہی گم کر دیا اور اب بھی جو نصیحتیں اور مفید باتیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سے ان کو یاد دلائی جاتی ہیں، اُن کا کوئی

Marfat.com

اثر قبول نہیں کرتے۔ حافظ ابن رجب رح حنبلی رح نے لکھا ہے کہ نقضِ عہد کے سبب سے اُن میں دو باتیں آئیں ملعونیت اور قسوتِ قلب۔ ان دونوں کا نتیجہ یہ دو چیزیں ہوئیں تحریف کلام اللہ اور عدم انتفاع بالذکر۔ یعنی لعنت کے اثر سے ان کا دماغ ممسوخ ہوگیا حتیٰ کہ نہایت بے باکی اور بد عقلی سے کتب سماویہ کی تحریف پر آمادہ ہوگئے۔ دوسری طرف جب عہد شکنی کی نحوست سے دل سخت ہوگئے تو قبول حق اور نصیحت سے متاثر ہونے کا مادہ نہ رہا۔ اس طرح عملی و علمی دونوں قسم کی قوتیں ضائع کر بیٹھے۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ: یعنی ان کی دغا بازی اور خیانت کا سلسلہ اب تک چل رہا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا۔ اسی لئے ان کی کسی نہ کسی دغا بازی اور خیانت پر ہمیشہ آپ مطلع ہوتے رہتے ہیں۔ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ سے مراد حضرت عبداللہ رض بن سلام وغیرہ ہیں جو اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ الخ یعنی جب ان کی عادت قدیم ہی یہ ہے تو ایسے لوگوں سے ہر جزئی چیز پر الجھنے اور ان کی ہر خیانت کا پردہ فاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کو چھوڑیئے اور درگذر کیجئے۔ اور ان کی برائی کا بدلہ عفو و احسان سے دیجئے۔ شاید اس سے کچھ متاثر ہوں۔ امام قتادہ رح وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ سے مگر اس کی کچھ حاجت نہیں۔ قتال کے حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت اور کسی موقع پر بھی ایسی قوم کے مقابلہ میں عفو و درگذر اور تالیف قلب سے کام نہ لیا جا سکے۔

لہ کسی قوم کا نقیب وہ شخص ہے جو ان کے احوال کو کریدے اور اُن کے معاملات کا کھوج لگائے (مادہ نقب) تعزیر کا معنی ہے تعظیم کے ساتھ کسی کی مدد کرنا۔ اقرضتم اللہ کا معنی ہے۔ واجب اور فرض نفقات سے بڑھ کر (نفلی) خرچ کرنا۔ قرض حسن سے مراد وہ قرض ہے جو دل کی صفائی اور خوشی سے دیا جائے۔ سواء السبیل کا معنی ہے وسطی یعنی سیدھا راستہ (یعنی صراطِ مستقیم) قاسیۃ کا معنی ہے روکھے ہوئے، غلیظ، جو قبول حق سے گریز کریں۔ تحریف کا معنی ہے کسی چیز کو اُس کی جگہ سے کسی دوسری طرف کو جھکا دینا خَائِنَةٌ کا معنی ہے خیانت

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا، ان کی عہد شکنی اور اُس کے نتائج بد کا ذکر ہماری عبرت و نصیحت کے لئے فرمایا ہے اس ضمن میں یہ بھی کھول دیا ہے کہ

لہ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۷۹ تفسیر المنار ج ۶ ص ۲۸۶

Marfat.com

یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے دشمن اور درپے آزار کیوں ہیں۔
بنی اسرائیل سے جو عہد و میثاق لیا گیا تھا اُس کا ذکر تورات (موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب اسفار خمسہ) کے آخر میں اب بھی موجود ہے اور بارہ نقیبوں سے مراد بارہ قبائل کے سردار ہیں۔ جو اپنے اپنے قبیلے کے ذمہ دار تھے اور جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے بیت المقدس کے حالات کا پتہ چلانے کے لئے بھیجا تھا۔ ان میں سے ہر فرقہ دو آدمی عہد و میثاق پر قائم رہے۔ باقی سب پھر گئے تھے ان کا ذکر وَقَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ الخ کی آیت میں دوسری جگہ موجود ہے۔ جن رسولوں پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا وہ عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سبھی تھے۔

عہد و پیمان کو توڑ ڈالنے سے ان کی فطرت، اسد، نفوس پلید اور دل سخت ہو گئے۔ حتیٰ کہ انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، مریمؑ اور اُس کے بیٹے عیسیٰ پر گھناؤنے الزام اور بہتان لگائے۔ پھر عیسیٰ کے قتل و صلیب کا دعویٰ کیا اور اس پر فخر کرنے لگے۔ جس طرح صحت کے اصول سے روگردانی کرنے والا امراض و اسقام کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑا مارتا ہے۔ اسی طرح نافرمانی اور بداعمالی میں مبتلا ہونے والا سنگ دل ہو کر رحمت خداوندی سے دور ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی نصیحت اُس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

تحریف یا تو الفاظ کی تقدیم و تاخیر یا کمی بیشی سے ہوتی ہے، اسے لفظی تحریف کہا جاتا ہے۔ یا الفاظ کے وہ معانی بیان کرنے سے ہوتی ہے۔ جس کے لئے وہ الفاظ بنائے نہیں گئے۔ دونوں قسم کی تحریف تورات اور ان کی دوسری کتابوں میں واقع ہو چکی ہے۔ کیونکہ اصل تورات کا نسخہ باتفاقِ مورخین گم ہو گیا تھا۔ (یعنی بخت نصر بابلی کے حملہ کے وقت) بنی اسرائیل کے پاس صرف وہی نسخہ تھا اور وہ تورات کو اس طرح زبانی یاد نہیں کرتے تھے۔ جس طرح مسلمان قرآن کو حفظ کرتے ہیں۔

موجودہ بائبل کی پہلی پانچ کتابیں جنہیں تورات کہتے ہیں اور موسیٰؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُس میں موسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی (مثلاً تورات کو لکھنا اور اس کی حفاظت کا اُن سے عہد لینا وغیرہ) بھی ہیں جو قطعاً تورات (اصلی) کا حصہ نہیں۔ بعد کا الحاقی کلام ہے۔ اس طرح موسیٰؑ کی موت کا قصہ اور یہ بات کہ اس وقت تک (یعنی موجودہ کتابوں کے لکھے جانے کے وقت تک، کوئی دوسرا موسیٰ پیدا ان میں نہیں اٹھا، یہ خود اس بات کی واضح ترین دلیل ہے کہ لکھنے والا موسیٰؑ کے کافی عرصہ بعد یہ کتاب لکھ رہا ہے علاوہ ازیں اس میں بہت سے بابلی الفاظ ہیں جو

Marfat.com

دلالت کرتے ہیں کہ یہ کتاب اسیریٔ بابل کے بعد لکھی گئی ہے۔
اسی لئے بہت سے انگریز مورخین نے ثابت کیا ہے کہ یہ تورات جو آج لوگوں کے ہاتھ میں ہے، موسیٰؑ کے صدیوں بعد عزرا کاہن نے بابل کی قید سے چھوٹنے کے بعد لکھی تھی۔

وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ: عبداللہؓ بن عباس اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے کتاب کو بھلا دیا۔ امام مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی نازل کردہ کتاب کا وہ بھول گئے۔ دونوں حضرات کی مراد یہ ہے کہ اصل کتاب کا بڑا حصہ انہوں نے گم کر دیا تھا۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ بھی کیا ہے کہ عمل ترک کر کے کتاب کو بھلا ڈالا۔

حق بات یہ ہے کہ جب بابلیوں نے ان کا ہیکل جلایا، اور بیت المقدس کو ویران کیا اور زندہ بچنے والوں کو قیدی بنا لیا، تو تورات کا اصل نسخہ گم ہو گیا تھا اور وہ سرے سے ضائع ہو گئی تھی۔ بابلیوں سے آزادی کے بعد انہوں نے زبانی یادداشتوں سے تورات کو از سر نو مرتب کیا تھا۔

اس حقیقت کا اعلان قرآن پاک کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے جو ایک اُمّی پر موسیٰؑ کے صدیوں بعد نازل ہوا تھا۔ حضورؐ نے باعلام الٰہی ان حقائق کا اظہار فرمایا اور پھر تاریخ نے اسے ثابت کر دیا۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ: یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی جونہی اسرائیل کو امان دی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپؐ ان کے مکر و فن اور دھوکے فریب سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک بے وفا اور دغاباز قوم ہے۔ جو لوگ اللہ کے عہد و پیمان کی دھجیاں بکھیر چکے ہیں اُن سے کس وفاداری اور امانت کی اُمید رکھی جا سکتی ہے؟

صرف چند خوش نصیب مثلاً عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ الخ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ہجرت کے فوراً بعد یہود سے معاہدہ کیا۔ جس کی رُو سے ان کی جان و مال، آزادی اور مذہب وغیرہ کو بالکل محفوظ کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے تینوں قبائل بنو قینقاع، بنو قریظہ اور بنو نضیر نے پے در پے عہد شکنی کی، حضورؐ کے قتل کی سازش کی۔ حضورؐ نے پھر بھی بار بار ان سے احسان و عفو کا سلوک فرمایا اگر آپؐ چاہتے تو ان کو جڑ پیڑ سے مٹا ڈالتے۔ لیکن جلاوطنی کی اجازت دے دی پھر انہوں نے خیبر میں جا کر سازشیں کیں تو حضورؐ

Marfat.com

نے ان کے قلعے فتح کر کے پھر ان پر احسان کیا اور ان کی زمینیں ان ہی کے پاس رہنے دیں۔ ہاں آخر کار وصیت فرما دی کہ انہیں جزیرۂ عرب سے جلا وطن کر دیا جائے۔ چنانچہ جناب عمر فاروق رضؓ نے اس وصیت پر عمل کیا۔

یہ آیت یہودیوں کی عہد شکنی اور سزا کے بعد نازل ہوئی ہے اس کے بعد حضورؐ نے ان کی کسی غداری یا خیانت پر کوئی سزا نہیں دی۔ صرف عرب سے نکال دینے کی وصیت پر اکتفاء فرمایا اور ظاہر ہے کہ ان کے جرائم کے مقابلہ میں یہ کوئی سزا نہیں۔

بنی اسرائیل سے جس عہد و پیمان کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اُس کا ذکر موجودہ توراۃ کے سفر عدد (گنتی) کے باب ۱۳ اور باب ۱۵ میں موجود ہے پھر عہد شکنی کی سزا میں بیماریوں اور قتل و نصب کا شکار ہونا بھی وہاں مذکور ہے موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع بن نون کی معرفت پھر یہ عہد تازہ کیا گیا اور ان کی حکومت قائم ہوئی (یشوع باب ۱) مگر بنی اسرائیل نے بُت پرستی اور بداعمالیوں سے پھر اس عہد کو توڑا جس کی سزا میں انہیں قید، غلامی، ذلت اور قتل و سلب سے دوچار ہونا پڑا۔ جیسا کہ کتاب تاریخ اور سموئیل سے معلوم ہوتا ہے[1]

حافظ ابن کثیرؒ نے بنی اسرائیل کے بارہ نقیبوں کے نام گنوانے کے بعد حضورؐ کی طرف سے مقرر کئے جانے والے انصار کے بارہ نقیبوں کے نام یہ لکھے ہیں۔ قبیلہ اوس کے تین: اسیدؓ بن حضیر، سعدؓ بن خیثمہ اور رفاعہؓ بن عبدالمنذر اور بعض روایات میں ان کی بجائے ابوالہیثمؓ بن تیہان کا نام ہے۔ اور قبیلہ خزرج کے نو سردار تھے۔ اسعدؓ بن سعید بن ربیعؓ، عبداللہؓ بن رواحہ، رافعؓ بن مالک بن عجلان، براءؓ بن معرور، عبادہؓ بن صامت، سعد بن عبادہ، عبداللہ بن عمرو بن حرام اور منذرؓ بن عمرو۔

پھر قیامت تک ہونے والے بارہ خلفاء کی احادیث و روایات پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بارہ خلفاء صالح اور نیک بخت ہوں گے اور لوگوں میں عدل کریں گے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ سب پے در پے ہوں گے۔ چار خلفائے راشدین تو یکے بعد دیگرے ہوئے۔ پھر پانچویں خلیفہ راشدؓ عمر بن عبدالعزیز ہوئے۔ بنو عباس میں سے بھی بعض اس طرح کے خلفاء ہوئے ہیں۔ قیامت سے پہلے پہلے بارہ کی تعداد پوری ہو گی انہی میں ایک امام مہدی ہوں گے۔ لیکن مہدی سے مراد اثنا عشریہ کے امام منتظر نہیں۔ کیونکہ یہ ایک

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲۱۲ [2] تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۷۔

Marfat.com

بے اصل بات ہے نہ اس حدیث سے ائمہ اثنا عشریہ مراد ہیں۔ کیونکہ احادیث صاف طور پر اس قسم کے عقاید کے خلاف موجود ہیں۔

[1] ان آیات میں قوم یہود کی جو نشانیاں بتائی گئی ہیں وہ ان کی صفاتِ لازمہ ہیں جو کبھی جدا نہیں ہوتیں۔

ا۔ ان کے چہروں پر لعنت کا اثر واضح ہے۔ جس سے اُن کی ملعون اور ہدایت سے راندی ہوئی جبلت روشن ہو جاتی ہے۔

ب۔ سنگ دلی جو ان کے خشک چہروں اور رحمت سے خالی بشروں سے ٹپکتی ہے۔ ان کے معاملات (مثلاً بے پناہ سود خوری) انسانی جذبات سے خالی ہیں۔ جن سے روکھا پن اور قسوت واضح ہے۔ خوف اور مصلحت کے وقت ریاکاری اور بزدلی سے نرم کلام کرتے ہیں اور خفیہ مکر و فریب کے وقت ظاہرداری سے نہایت شفقت اور محبت ظاہر کرتے ہیں، لیکن دلوں کی سختی اور سینوں کی خشکی ہے کہ اُبلی پڑتی ہے۔

ج۔ ان کی اصلی اور بڑی نشانی تحریف کلمات ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے خدا کی کتاب کو تبدیل کیا اور اس میں اپنی خواہشات نفس سے کمی بیشی کی۔ پھر جو آیات باقی رہ گئی تھیں ان کی تفسیر و تاویل اپنی ہوائے نفس، مصلحت اور خبیث مقاصد کے مطابق کر ڈالی۔ نیز شریعت کے احکام کو بھلایا اور مہمل بنا کر رکھ دیا۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو ان سے خالی کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے یہود مدینہ کی بدعہدیوں اور خیانتوں کا پردہ بھی چاک کیا ہے۔ جب تک یہ لوگ مدینہ میں رہے خیانت، بدعہدی، بے وفائی اور غدر و فریب ان کے خواصِ لازمہ تھے۔ پھر سارے جزیرۂ عرب میں انہوں نے مکر و فریب اور سازشوں کا جال پھیلایا اور تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے ساتھ ان کا ڈیڑھ ہزار سال سے یہی سلوک رہا ہے۔ اب بھی یہی ہے باوجودیکہ اس رانده کائنات قوم کو پناہ بھی اگر کسی نے دی تھی۔ تو وہ صرف اسلامی معاشرہ تھا۔ مسلمانوں نے ان سے ذلت کر در کیا۔ ان سے حسن سلوک سے پیش آئے اور ان پر سے ظلم و ستم کو ہٹایا مگر یہودی ہمیشہ حضورؐ کی زندگی سے لے کر اب تک سانپ، بچھو، لومڑیاں اور بھیڑیئے ہی ثابت ہوئے۔ انہوں نے ہم سے ہمیشہ

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۰۹

Marfat.com

غدر و خیانت کی، اور مکر و فریب میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اگر قدرت نہ ہونے کے باعث ظاہری تکلیف نہ دے سکے تو غصہ مکر و دغا کے جال بچھاتے رہے اور گھات میں بیٹھے موقع کے منتظر رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ہر دشمن سے صلح و صفائی اور دوستی کی۔ جونہی فرصت پائی وہ ہم پر ٹوٹ پڑے وہ نہایت سنگدل اور جفا کار نکلے۔ جو کبھی مسلمانوں پر رحم نہ کرتے تھے اور کبھی عہد و پیمان کی رعایت ملحوظ نہ رکھتے تھے۔ حضورؐ کے زمانے کے یہود کی جو تصویر قرآن نے کھینچی ہے وہ سراسر خیانت و دغابازی کے پردے کو چاک کر رہی ہے۔ ان کے افعال خائن تھے، نیت خائن تھی، زبانیں اور گفتگو میں خائن تھیں اور نگاہیں تک خائن و بدعہد تھیں۔ قرآن نے خائنۃ کا لفظ بلا صفت بیان کیا ہے تاکہ خیانت مجرد ہے، فضاؤں کو بھر دے اور اس قوم خبیث پر اپنے سائے ڈال دے۔ خیانت ہی ان کی فطرت کا جوہر ہے۔

اس اُمت کا معلم و مرشد اور راہنما قرآن ہے وہ دشمنوں کے حالات کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ ان کی جبلت و فطرت سے پردے اٹھا دیتا ہے۔ اگر یہ اُمت اپنے قرآن سے مشورہ کرتے اور اس کی توجیہات پر کان دھرے اُس کے احکام اور تشریعات کو اپنی زندگی میں نافذ کرے تو اس کے دشمن کبھی اسے ذلیل نہ کر سکیں۔ لیکن جب اُس نے اپنے پروردگار کے عہد کو توڑ دیا اور قرآن کو چھوڑ دیا تو اگرچہ وہ قرآن کو طربناک آوازوں سے پڑھتی رہے، اور اس کے تعویذات بنا کر استعمال کرے اور دعاؤں میں اُسے پڑھے، پھر بھی جو کچھ مصیبت پہنچنے والی تھی وہ پہنچ کر رہی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے عہد و پیمان، عہد شکنی اور ان پر لعنت و ذلت کا مسلط ہونا اور کتاب اللہ کی تحریف کے واقعات ہماری عبرت و نصیحت کے لئے بیان فرمائے ہیں تاکہ ہم نقض عہد سے بچیں۔ تاکہ کہیں عہد شکن قوم کا انجام بد نہ دیکھنا پڑے۔ جب اُمت مسلمہ اس تحذیر و عبرت سے غافل و بے نیاز ہو گئی اور سیدھے راستے سے منحرف ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اُس سے امامت کی قیادت چھین لی اور اُسے قافلے کی دُم بنا ڈالا۔ جب تک وہ اپنے رب کی طرف دوبارہ نہ پھرے گی، اپنے عہد و پیمان کو از سر نو استوار نہ کرے گی۔ اور اپنے عقد کا ایفا نہ کرے گی۔ اللہ کا وعدہ پورا نہ ہوگا۔ یعنی سرداری اور قیادت اور تمکین فی الارض کا وعدہ! بصورت دیگر یہ اُمت قافلے کا دُم چھلا ہی بنے رہے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ خلاف نہیں ہے۔

جب یہ آیات نازل ہوئی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو عفو و درگزر کا حکم دیا تھا۔

Marfat.com

لیکن بعد میں بحکم خداوندی حضورؐ نے یہود کو مدینہ سے اور پھر جزیرۂ عرب سے جلا وطن کر دیا تھا۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا

اور وہ جو کہتے ہیں اپنے کو نصاریٰ۔ اُن سے بھی لیا تھا ہم نے

مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠

عہد اُن کا پھر بھول گئے نفع اٹھانا اس نصیحت سے جو انکو کی گئی

فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى

پھر لگا دی ہم نے آپس میں ان کے دشمنی اور کینہ

يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ

قیامت کے دن تک اور آخر جتا دے گا ان کو اللہ

بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

جو کچھ کرتے تھے۔

[1] نصاریٰ کا لفظ یا تو "نصر" سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنیٰ مدد کرنا ہے اور یا ناصرہ کی طرف نسبت ہے۔ جو ملک شام میں اُس بستی کا نام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام رہے تھے۔ اسی لئے ان کو مسیح ناصری کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں وہ گویا اس بات کے مدعی تھے کہ ہم خدا کے سچے دین اور پیغمبروں کے حامی و ناصر اور مسیح ناصری کے متبع ہیں۔ اس زبانی دعویٰ اور لفظی تفاخر کے باوجود دین کے معاملہ میں جو رویہ تھا وہ آگے ذکر کیا گیا ہے۔

اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ۔ یعنی یہود کی طرح ان سے بھی عہد لیا گیا۔ لیکن یہ عہد شکنی اور بے وفائی میں اپنے پیشروؤں سے کچھ کم نہیں رہے۔ انہوں نے بھی ان بیش بہا

[1] فوائد القرآن عثمانی رح صلا ۱۴

Marfat.com

نصاریٰ سے جن پر نجات و فلاحِ ابدی کا مدار تھا کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ بائیبل میں نصیحتوں کا وہ حصہ ہی باقی نہ چھوڑا جو حقیقتاً مذہب کا مغز تھا۔

فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ: یعنی باہم انصاری میں یا یہود و نصاریٰ دونوں میں عداوتیں اور جھگڑے ہمیشہ کے لئے قائم ہو گئے آسمانی سبق کو ضائع کرنے اور بھلا دینے کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ہوا۔ یعنی جب وحیٔ الٰہی کی اصل روشنی ان کے پاس نہ رہی تو اوہام و ہواء کی اندھیریوں میں ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ مذہب تو نہ رہا پر مذہب کے جھگڑے باقی رہ گئے۔ بیسیوں فرقے پیدا ہو کر اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ یہی فرقہ وار تصادم آخر کار آپس کی شدید ترین عداوت و بغض پر منتہی ہوا۔ کوئی شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں میں بھی بے حد تفرّق و تشتّت اور مذہبی تصادم موجود ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے پاس وحیٔ الٰہی اور قانونِ سماوی بحمداللہ بلاکم و کاست محفوظ ہے، اس لئے اختلافات کی موجودگی میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت برابر حق و صداقت پر قائم رہی ہے اور رہے گی۔ اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ کے اختلافات یا مثلاً پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک وغیرہ فرقوں کی باہمی مخالفت میں کوئی ایک فریق بھی نہ آج تک راہ حق و صداقت پر قائم ہے اور نہ قیامت تک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ وحیٔ الٰہی کی روشنی کو جس کے بغیر کوئی انسان خدا تعالیٰ اور اس کے قوانین کی صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتا، اپنی بے اعتدالیوں سے ضائع کر چکے ہیں۔ اب جب تک وہ اس محرّف بائیبل کے دامن سے وابستہ رہیں گے محال ہے کہ قیامت تک ان کو راہ راست اور محض بے اصول اختلافات اور فرقہ وارانہ بغض و عناد کی ظلمت سے نکل کر حق کا راستہ دیکھ سکیں اور نجاتِ ابدی کی شاہراہ پر چل سکیں۔ باقی جو لوگ آج نفسِ مذہب خصوصاً مسیحیت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور جنہوں نے لفظ مسیحیت یا موجودہ بائیبل کو محض چند سیاسی ضرورتوں کی بنا پر رکھ چھوڑا ہے۔ اس آیت میں ان نصاریٰ کا کہیں ذکر نہیں۔ اور اگر مان لیا جائے کہ وہ بھی آیت کے تحت میں داخل ہیں تو ان کی باہمی عداوتیں اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں اور علانیہ محاربات بھی باخبر اصحاب پر پوشیدہ نہیں۔

الیٰ یوم القیامۃ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ رہیں گے۔ یہ اختلاف اور بغض و عناد بھی ہمیشہ رہے گا۔ یہاں قیامت کا لفظ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورات میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص تو قیامت تک بھی فلاں حرکت سے باز نہیں آئے گا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ شخص قیامت تک زندہ رہے گا اور یہ حرکت کرتا رہے گا۔

Marfat.com

بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو اس بات کو نہ چھوڑے گا۔
اسی طرح اس آیت میں اِلیٰ یوم القیامۃ کا لفظ آنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہود و نصاریٰ کا وجود قیامت تک رہے گا جیسا کہ ہمارے زمانے کے بعض مُطبلین نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا ہے۔

فَسَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ الخ یعنی آخرت میں پوری طرح اور دنیا میں بھی بعض واقعات کے ذریعہ سے ان کو اپنی کرتوت کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔

لہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہودیوں کی طرح عیسائی بھی تعلیمات خداوندی کا بہت بڑا حصہ کھو چکے ہیں۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام نے جو وعظ ارشاد فرمائے تھے اور توحید الٰہی اور عبادت کا جو حکم دیا تھا وہ کہیں لکھا ہوا نہ تھا۔ ان کی پیروی کرنے والے یا عموم عام لوگوں میں سے تھے جن میں سے بہترین لوگ حواری تھے اور وہ مچھیرے تھے اور یہود نے انہیں ہر جگہ سے نکال کر پھینک دیا تھا۔ اس لئے ان کے ہاں ایسی کوئی بارسوخ اور علم والی جماعت تیار نہ ہو سکی جو انجیل کو مدوّن کرتی اور اُسے محفوظ کر لیتی پھر بہت سے لوگ ایسے اٹھ کھڑے جو مسیحؑ کے نام پر باطل تعلیمات پھیلاتے تھے، ان میں سے بعض نے کچھ کتابیں بھی لکھ ڈالی تھیں اور ان کا نام انجیل رکھ دیا تھا یہ انجیلیں بہت سی تھیں۔ جن میں سے چار انجیلیں عیسیٰ علیہ السلام سے تین صدیاں بعد ظاہر ہوئیں، یہی وہ چار کتابیں ہیں۔ جنہیں آج کل معتبر سمجھا جاتا ہے یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ جبکہ شاہ قسطنطین نے عیسائیت اختیار کر لی۔ اور اُسے بت پرستی سے ملا کر ایک جدید مذہب ایجاد کر لیا۔ ان انجیلوں کی حیثیت آسمانی کتب کی نہیں بلکہ مسیح علیہ السلام کی نامکمل اور ناقص تاریخ کی سی ہے پھر ان میں بہت تناقض و تعارض بھی موجود ہے۔ تاریخی لحاظ سے اور ابتدائی طور پر یہ انجیلیں مجہول الاصل ہیں۔ عیسائیوں نے اپنے مذہب اور کتابوں (عہد جدید) کی بنیاد یہود کی کتابوں یعنی عہد عتیق پر رکھی تھی۔ جس کی اپنی حیثیت ہر لحاظ سے مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

الشیخ الہندی مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی مشہور و معروف کتاب "اظہار الحق" میں بائیبل کی لفظی و معنوی تحریفات کی بے شمار مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ کتاب لاجواب ہے اور اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔

لہ المراغی ج ۶ ص ۷۸، المنار ج ۶ ص ۲۸۷، ۲۸۹۔

Marfat.com

[1] انجیل یوحنا باب ۱۶ آیت ۷ باب ۱۴ میں اس عہد کا ذکر ہے جو نصاریٰ سے لیا گیا تھا۔ اس میں فارقلیط کا لفظ تھا۔ جس میں لفظی و معنوی تحریفات کے کئی دور گزر چکے ہیں۔ فارقلیط کا ترجمہ احمدؐ ہے لیکن افسوس! عیسائیوں نے اسلام دشمنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں اپنی کتاب کا تیا پانچہ کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔

[2] سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى کی تعبیر سے یہ بتا دیا ہے کہ ان لوگوں کا دین حق کے مددگار ہونے کا فقط دعویٰ ہی دعویٰ تھا۔ "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ"، ورنہ ان کی زندگی میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ الٰہی عہد کی بنیاد توحید خداوندی تھی اور عیسائیت کا اس عہد سے نقطۂ اختلاف یہی توحید ہے۔ انہوں نے اس کی بجائے تثلیث کا عقیدہ گھڑا گویا اصل سے ہی انحراف کر گئے اور یہی ان کی سب سے بڑی عہد شکنی ہے۔

اس کے باعث عیسائیوں میں خلاف و شقاق اور عداوت و بغض انتہا کو پہنچ گیا۔ جیسا کہ ان کی قدیم و جدید تاریخ سے واضح ہے ان کی آپس میں وہ خونریزیاں ہوئیں کہ دوسری قوموں کے ساتھ لڑائیوں میں بھی ان کا اتنا خون کبھی نہیں بہا۔ کبھی یہ اختلاف و شقاق عقیدہ کی بناء پر ہوا اور کبھی دینی ریاست، سیاسی اختلاف اور اقتصادی و اجتماعی مخالفت کی بنا پر ہوا۔ طویل صدیاں گزر جانے پر بھی یہ عداوتیں اور اختلافات ٹھنڈے نہیں پڑے اور یہ لڑائیاں اور زخم نہیں بجھے۔ خدا تعالیٰ سب قائلوں سے سچا ہے اس کے ارشاد کے مطابق قرب قیامت تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ

اے کتاب والو! بلاشبہ آیا ہے تمہارے پاس رسولؐ ہمارا ظاہر کرتا ہے

لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ

تم پر بہت سی چیزیں۔ جن کو تم چھپاتے تھے کتاب میں سے

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲۱

[2] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۱۲

Marfat.com

يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۭ قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

معاف کر دیتا ہے بہت چیزوں سے بے شک تمہارے پاس آئی ہے

نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ

اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی جس سے اللہ ہدایت کرتا

مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ

ہے اس کو جو تابع ہوا اس کی رضا کا سلامتی کی راہیں۔ اور ان کو نکالتا ہے

مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

اندھیروں سے روشنی میں اپنے حکم سے اور ان کو چلاتا ہے سیدھی راہ پر

کوفی قراء کے علاوہ دوسرے حضرات کے نزدیک من کثیر ۵ پر بھی آیت کا نشان ہے۔ اسی لئے یہاں اس کے بعد ۵ کا نشان بنا دیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال پہلے بھی گزر چکی ہے۔ آیات کے عدد کے اختلاف کی حقیقت اس سے واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کوفی قاریوں کے علاوہ دوسرے حضرات کے نزدیک کتاب مبین ۵ پر ۱۷ آیات ہو گئیں۔ جبکہ کوفی حضرات کے نزدیک ۱۵ ہوئیں۔

۱۵ یا اھل الکتاب کا خطاب سب یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہے کہ نبی آخر الزمانؐ جن کی آمد کی بشارت تمہاری کتابوں میں اس قدر تحریف ہو جانے پر بھی کسی نہ کسی عنوان سے موجود ہیں، تشریف لے آئے۔ جن کے منہ میں خدا نے اپنا کلام ڈالا ہے، (حسب بشارت تورات استثناء) اور جنہوں نے ان حقائق کی تکمیل کی جو حضرت مسیحؑ ناتمام چھوڑ گئے تھے (حسب بشارت انجیل یوحنا) تورات و انجیل کی جن باتوں کو تم چھپاتے تھے اور بدل بدل کر بیان کرتے تھے، ان میں کی سب ضروری باتیں اس نبی آخر الزمانؐ نے ظاہر فرما دیں اور جن باتوں کی اب چنداں ضرورت نہ تھی۔ اُن سے درگزر کیا۔

---

۱ فوائد القرآن ص ۱۴۲

Marfat.com

نورٌ وکتاب مبین : شاید نور سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب مبین سے قرآن کریم مراد ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ جو وحی آلہی کی روشنی کو ضائع کر کے اہواء و آراء کی تاریکیوں اور باہمی خلاف و شقاق کے گڑھوں میں پڑے دھکے کھا رہے ہیں۔ جن سے نکلنے کا بحالت موجودہ قیامت تک امکان نہیں اُن سے کہہ دو کہ خدا کی سب سے بڑی روشنی آگئی۔ اگر نجات ابدی کے صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہو تو اُس روشنی میں حق تعالیٰ کی رضاء کے پیچھے چل پڑو۔ سلامتی کی راہیں کھلی پاؤ گے۔ اور اندھیرے سے نکل کر اُجالے میں بے کھٹکے چل سکو گے اور جس کی رضاء کے تابع ہو کر چل رہے ہو گے۔ اُس کی دستگیری سے صراطِ مستقیم کو بے تکلف طے کر لو گے۔

کُنتُمْ تُخفُونَ مِنَ الکتاب :۔ مثلاً انہوں نے تورات کی آیت رجم کو چھپا لیا تھا۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ جس نے رجم کے مسئلہ کا انکار کیا اُس نے بے علمی سے قرآن کا انکار کیا چنانچہ اس آیت میں اسی آیت رجم کے چھپانے کا ذکر ہے۔

[1] اہل کتاب کی خفیہ سازشوں اور دسیسہ کاریوں کو ظاہر کرنا اور کتاب الٰہی کے چھپائے ہوئے حصّوں کا بیان کرنا جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے دلائل میں سے ہے اور قرآنِ مجید کے اِن معجزات میں سے ہے جو اُس کے بیانات کے ضمن میں بکھرے ہوئے ہیں۔

عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور احکام رجم زانی کا حکم تورات کے سفرِ استثناء میں اب بھی موجود ہے۔ مگر انہوں نے اس پر عمل چھوڑ دیا تھا۔ اور ان کے عالم ابنِ صوریا نے حضورؐ کی محفلِ اقدس میں اس حکم کو چھپایا تھا، لیکن آخر اُسے اس کا اعتراف کرتے ہی بنی تھی۔ تورات کے آخرت اور جزاء و سزا کے احکام کو یہود نے بالکل گم کر دیا ہے۔ اور موجودہ کتاب میں اس کا نام و نشان بھی موجود نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر آخر الزمان اُمّی ہیں۔ ان کی کتب کو نہیں جانتے۔ پھر حضورؐ نے وحیٔ آلہی سے انہیں یہ سب کچھ بتایا تو اُن کے متعصب مزاج علماء ایمان لے آئے اور انہوں نے یہود کی کارستانیاں بیان کیں اور حضورؐ کی نبوت کو واضح کیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۷۳

[2] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۷۹، ۸۱ تفسیر المنار ج ۶ ص ۳۰۳، ۳۰۶۔

Marfat.com

ہر قوم وملّت کے نفس پرست علمائے سوٗ کا طریقہ ہے کہ جو احکام ان کے خلاف پڑتے ہیں اور ان کی دنیا پرستی پر چوٹ لگاتے ہوں، انہیں چھپا جاتے ہیں یا تحریف و تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں سب کے پیشرو اور امام اہل کتاب کے علمائے سوٗ ہیں۔

آیت میں نوٗر سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے کیونکہ وہ بصیرت کے لئے وہی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو بصر (ظاہری آنکھ) کے لئے نوٗر (روشنی) کی ہے۔ جس طرح اگر آنکھوں میں بینائی کا نور نہ ہو تو دیکھی جانے والی کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی، اسی طرح اگر حضورؐ کا لایا ہوا قرآن اور اسلام نہ ہوتا تو اہل کتاب وغیرہ کے اہل بصیرت دین حق کی حقیقت کو نہ پا سکتے۔ نہ کسی کو یہ پتہ چل سکتا۔ کہ پچھلی کتابوں میں کیا تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کتنا حصّہ ضائع ہو چکا ہے اور کس قدر بھلایا جا چکا ہے اور ان کے دینی اور سیاسی سردار باقی ماندہ کتاب کو بھی اخفاء و تحریف کا اکھاڑا بنا لیتے، اور دنیا جہل و کفر کی ظلمتوں میں بھٹکتی پھرتی، اُسے کچھ نظر نہ آ سکتا۔

کتاب مبین سے مراد قرآن پاک ہے، جو فی نفسہ بھی واضح ہے اور لوگوں کو ہر ضروری چیز کی طرف واضح طور پر رہنمائی کرتا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب حق کے تین فوائد بیان فرمائے ہیں۔

ا۔ اس کتاب پر ایمان لا کر رضاء الٰہی کی راہوں کا اتباع کرنے والا دنیا و آخرت میں بدبختی اور ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے اور سلامتی کی راہوں پر گامزن ہو کر سعادت دارین پا لیتا ہے۔

ب۔ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو بت پرستی اور اوہام و خرافات سے (جن کے ذریعے پروہتوں نے تمام ادیان کو بگاڑ دیا تھا) نکالتی ہے اور توحید خالص کے نور تک پہنچا کر انہیں آزاد کر دیتی ہے۔ وہ مخلوق پر شفیق اور خالق کے آگے جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔

ج۔ یہ کتاب مقصد و غایت تک پہنچانے والے راستے کی راہنما ہے۔ اُمّت مسلمہ کے صدر اوّل کی بے نظیر کامیابی کا باعث اس پر صحیح اعتقاد اور خالص عمل تھا۔

اہل کتاب ازراہ غرور و تکبّر حضورؐ کا انکار کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہم اصلی اور عالم لوگ ہیں اس لئے ہمارا نبی خود ہمارے اندر سے ہونا چاہیئے۔ یہ اُمّیوں کا نبی ہے۔

سلہ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۱۴-۱۱۵۔

Marfat.com

ہم ان سے بڑھیا ہیں۔ ان کے نبیؐ پر کیونکر ایمان لائیں۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں فرماتا ہے کہ ساری کائنات بشمولیت اہل کتاب اس پیغمبر آخرالزمان کی مخاطب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے اُمیّوں میں آخری رسولؐ مبعوث فرمایا ہے اور انہیں آخری رسالت عطا فرمائی ہے۔ یہ رسالت سارے عالم بشریت کے لیے ہے اللہ تعالیٰ نے ان امیوں کو عالم بنا دیا ہے۔ اور اب یہ ساری دُنیا سے بڑھ کر عالم وفاضل ہیں۔ ان کا طریقہ، اعتقاد اور نظریات سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور بلند ہیں۔ اُن کا راستہ اور نہج سب سے زیادہ سیدھا ہے۔ ان کی شریعت ونظام سب سے افضل ہے۔ معاشرت و اخلاق میں وہ صالح ترین ہیں۔

رسولؐ آخرالزمان پر ایمان لانا، اُس کی مدد کرنا اور تائید کے اٹھ کھڑا ہونا اہل کتب سے کئے گئے عہد وپیمان میں داخل تھا۔ اس آیت نے یہی بتایا ہے کہ یہ وہی رسولؐ ہے جس کے اتباع وتنظیم کا تم وعدہ کر چکے ہو۔ اگر تم اس پر ایمان نہ لائے تو پہلی عہد شکنیوں پر ایک اور کا اضافہ کر دو گے۔ یہ پیغمبر تمہاری تحریف وتبدیل اور اخفاء کتاب کو ظاہر کرتا ہے۔ جو اس کے پیغمبر برحق ہونے کی علامت ہے۔

نصاریٰ نے دین کی پہلی بنیاد توحید کو چھپا لیا تھا۔ اور یہود نے بہت سے احکام شریعت پر پردے ڈال دئے تھے۔ مثلاً رجم زانی کا حکم، سُود کی حرمت کا حکم وغیرہ۔ پھر ان دونوں فریقوں نے حضورؐ کی صفت کو چھپا لیا تھا۔ حضورؐ نے ایک دائمی شریعت پیش فرمائی ہے۔ ان کی چھپائی ہوئی آیات میں سے جنہیں باقی رکھنا اور مکمل کرنا پیش نظر تھا۔ وہ آپؐ نے ظاہر فرما دیں جن کی ضرورت نہ تھی ان سے چشم پوشی کی۔ کیونکہ آپؐ کا دین و شریعت پہلی کتابوں کی ناسخ ہے۔

اسلام اور قرآن کے لئے جو نور کا لفظ بولا گیا ہے۔ اس سے گہری اور صادق تعبیر اور کوئی ممکن نہیں۔ مومن اپنی زندگی اور وجود میں اس نور کو پاتا ہے۔ یہی نور جب دل میں چمکتا ہے تو حقیقت ایمانیہ بن جاتا ہے۔ اس نور سے وہ عبادات ومعاملات انجام دیتا ہے اور ہر وقت اسے اپنے سامنے پاتا ہے وہ اس نور سے کائنات کے ذرّے ذرّے کو نورانی دیکھتا ہے اور اپنے آگے، پیچھے۔ دائیں بائیں اس کی روشنی محسوس کرتا ہے۔

لہ فی ظلال القرآن ج ۶ صـ ۱۱۴ - ۱۱۵ -

Marfat.com

پھر سُبُل السلام کی تعبیر بھی اسلام کے لئے نہایت دقیق اور صادق ترین تعبیر ہے۔ مومن اس سلامتی کو ہر طرف ہر جگہ اور ہر شئے میں پاتا ہے۔ فرد کی سلامتی، جماعت کی سلامتی، سارے جہان کی سلامتی، ضمیر، عقل اور اعضاء و جوارح کی سلامتی، گھر اور خاندان کی سلامتی، معاشرے اور اُمّت کی سلامتی، انسان اور انسانیّت کی سلامتی، زندگی میں سلامتی۔ کائنات میں سلامتی اور کائنات و زندگی کے رب کے ساتھ رہنے کی سلامتی۔ غرض ہر سلامتی اس میں موجود ہے اور یہ سلامتی صرف اسلام میں ملتی ہے۔

سلامتی کی حقیقت کو وہی پا سکتا ہے۔ جس نے قدیم و جدید جاہلیّت کی جنگوں اور خون ریزیوں کو دیکھا ہے۔ اس سلامتی کی حقیقت کی گہرائی میں وہی اتر سکتا ہے جس نے جدید و قدیم جاہلیت کے عقائد و اوہام سے پیدا ہونے والے قلق و اضطراب کو جانچا ہے۔

ان کلمات کے اولین مخاطب جاہلیّت کا مزا چکھ چکے تھے۔ لہٰذا وہ اس سلامتی کی حقیقت کو جانتے ہوئے اور اس کی قدر کو پہچانتے تھے۔ آج ہم بھی اس حقیقت کے ادراک کے شدید محتاج ہیں۔ ہمارے اردگرد جاہلیت پھیلی ہوئی ہے۔ جس نے انسانیت کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے وہ چیخ رہی اور کراہ رہی ہے۔

ہم اس سلامتی کے محتاج ہیں۔ کیونکہ ہم کئی صدیاں سلامتی کے سایے میں گزارنے کے بعد عقیدہ و عمل کی ایک ایسی جنگ میں گھر گئے ہیں جو ہماری ارواح و قلوب کو پیس رہی ہے۔ ہمارے اخلاق اور اعمالِ حیات کو فنا کر رہی ہے ہماری جماعتوں اور تنظیموں کو کھا رہی ہے۔ ہم اگر چاہیں تو جاہلیّت اور اسلام کی جنگ کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ افسوس! ہم جاہلیّت کے عذاب میں گرفتار ہیں اور اسلام ہم سے قریب ہی ہے! اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور خسارہ اور کیا ہوگا کہ ہم اسلام کو دے کر جاہلیّت اور سلامتی کو کھو کر جنگ و جدل خرید لیں؟

ہم انسانیت کو جاہلیّت کے عذاب سے خلاصی دلا سکتے ہیں بشرطیکہ پہلے ہم اپنے آپ کو اس سے نکالیں۔ اور اسلام کی چھاؤں میں آئیں۔

جاہلیّت سراسر ظلمات ہے۔ اس میں شبہات و خرافات اور اساطیر و تصوّرات کی ظلمت ہے۔ قوموں کے اضطراب کی ظلمت ہے اور نور وہی نورِ اسلام ہے جو ضمیر و عقل اور وجود و حیات کی روشنی ہے۔

اسلام صراطِ مستقیم ہے۔ جو فطرتِ انسانی کے مطابق اور اُس کے ساتھ مستقیم ہے۔ کائنات کی فطرت اور اس کے قانون کے مطابق ہے اور اللہ تک پہنچانے میں بھی مستقیم ہے جس میں کوئی کجی اور التباس نہیں۔ جو خدا خالقِ کائنات اور خالقِ انسان ہے۔

Marfat.com

وہی اس دین کا مصنّف بھی ہے اُس کی بنائی ہوئی ہر چیز میں توافق پایا جاتا ہے۔ انسان جو خود اپنی فطرت سے جاہل ہے اور نادان ہے اس کا ساختہ و پرداختہ دین کبھی فطرتِ انسانی اور فطرتِ کائنات کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام ہی حق ہے اور اس کے سوا سب کچھ باطل، خرافات اور وہم و گمان ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ

بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی ہے مسیح بیٹا

مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ

مریم کا۔ تو کہہ دے پھر کس کا بس چل سکتا ہے اللہ کے آگے اگر

اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَ

وہ چاہے کہ ہلاک کرے مسیح مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو

مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اور جتنے ہیں زمین میں سب کو اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور

وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ

اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ پیدا کرتا ہے جو چاہے

عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۷

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

لہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ الخ یعنی مسیحؑ کے علاوہ خدا اور کوئی چیز نہیں کہتے ہیں کہ عقیدہ نصاریٰ میں سے "فرقۂ یعقوبیہ" کا ہے۔ جن کے نزدیک خدا مسیحؑ کے قالب میں حلول کئے ہوئے ہے معاذ اللہ یا یوں کہا جائے کہ جب نصاریٰ حضرت مسیح کی نسبت

لہ فوائد القرآن ص۱۴۱

Marfat.com

الوہیت کے قائل ہیں اور ساتھ ہی توحید کا بھی زبان سے اقرار کرتے ہیں "یعنی خدا ایک ہی تو ہے"، تو ان دونوں دعووں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مسیح علیہ السلام کے سوا کوئی خدا نہ ہو۔ بہرحال کوئی صورت لی جائے اس عقیدہ کے کفر صریح ہونے میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے؟

احقر مولف عرض کرتا ہے کہ ممکن ہے کسی زمانے میں عیسائیوں کے مختلف داخلی عقاید ہوں۔ لیکن آج کل تقریباً سب عیسائی (بالخصوص ان کے دونوں بڑے فرقے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ) عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کئی متضاد عقائد کے قائل ہیں

ا۔ عیسیٰؑ مستقل خدا قادرِ مطلق ہے۔

ب۔ عیسیٰؑ ابن اللہ (خدا کا بیٹا) ہے۔

ج۔ عیسیٰؑ خدا کے تین اقانیم (اجزاء ارکان) میں سے ایک اقنوم ہے۔ اور یہ دونوں چرچ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کے قائل ہیں۔ گو اس عجیب و غریب بھول بھلیاں کی وضاحت آج تک کوئی نہ کر سکا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے عیسائی گمراہ فرقوں کے مختلف عقاید کو ملا جلا کر موجودہ عیسائیت کے عقاید کا ہیولیٰ تیار کیا گیا ہے۔ اعاذنا اللہ

وَلَوْ فَمَنْ يَمْلِكُ ..... جَمِيعًا: یعنی اگر فرض کرو خدائے قادر و قہار یہ چاہے کہ حضرت مسیحؑ مریمؑ اور اگلے پچھلے کل زمین پر بسنے والوں کو اکٹھا کر کے ایک دم میں ہلاک کر دے، تو تم ہی بتلاؤ کہ اُس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے؟ یعنی ازل سے ابد تک سارے انسان بھی اگر فرض کر دو مجتمع کر دیئے جائیں اور خدا ایک آن میں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو سب کی اجتماعی قوت بھی خدا کے ارادے کو تھوڑی دیر کے لئے ملتوی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مخلوقات کی قدرت جو عطائی اور محدود ہے خدا کی ذاتی اور لامحدود قدرت کے مقابلہ میں عاجز محض ہے جس کا اعتراف خود وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے رد میں یہ خطاب کیا جا رہا ہے۔ بلکہ خود مسیحؑ ابن مریمؑ بھی جن کو یہ لوگ خدا بنا رہے ہیں، اس کے معترف ہیں۔ چنانچہ مرقس کی انجیل میں حضرت مسیحؑ کا یہ مقولہ موجود ہے۔

"اے باپ ہر چیز تیری قدرت کے تحت میں ہے تو مجھ سے یہ موت کا پیالہ ٹلا دے۔ اس طرح نہیں جو میں چاہتا ہوں بلکہ اُس طرح جیسے تیرا ارادہ ہے"۔

پس جب حضرت مسیح علیہ السلام جن کو تم خدا کہتے ہو اور اُن کی والدہ ماجدہ

ل ایضاً فوائد القرآن ص ۱۴۲

Marfat.com

مریم صدیقہ : جو تمہارے زعم میں خدا کی ماں ہوئیں، وہ دونوں بھی تمام من فی الارض کے ساتھ مل کر خدا کی مشیت و ارادہ کے سامنے عاجز ٹھیرے۔ تو خود سوچ لو کہ ان کی یا اُن کی والدہ یا کسی اور مخلوق کی نسبت خدائی کا دعویٰ کرنا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہوگی۔ آیت کی اس تقریر میں ہم نے ہلاک کو موت کے معنی میں لیا ہے، مگر جمیعًا کے لفظ کی تھوڑی سی وضاحت کر دی ہے۔ جو مدلول لفظ جمیعًا کا ہم نے بیان کیا ہے وہ آئمہ عربیہ کی تصریحات کے عین موافق ہے۔ اس کے سوا یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں ہلاک کے معنے موت نہ لئے جائیں۔ جیسا کہ راغب نے لکھا ہے کہ کبھی ہلاک کے معنی ہوتے ہیں۔ کسی چیز کا مطلقاً فنا اور نیست و نابود ہو جانا مثلاً کُلُّ شَیْءٍ ھالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ یعنی خدا کی ذات کے سوا ہر چیز نابود ہونے والی ہے۔ اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر خدائے قدیر حضرت مسیح[ع] اور ان کی والدہ اور تمام مَنْ فِی الْاَرْضِ کو قطعًا نیست و نابود اور بالکلیہ فنا کر ڈالنے کا ارادہ کر لے، تو کون ہے جو اُس کے ارادہ کو روک دے گا ؎

اوست سلطاں ہر چہ خواہد آں کند　　عالمے را دود دمے ویراں کند

حضرت شاہ عبدالقادر تحریر فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالےٰ کسی جگہ نبیوں کے حق میں ایسی بات فرماتے ہیں تاکہ اُن کی اُمت بندگی کی حد سے زیادہ نہ چڑھا دے۔ اِلّا نبی اس لائق کا ہے کو ہیں" کہ اُن کے مرتبۂ عالی اور وجاہت عنداللہ کا خیال کرتے ہوئے ایسا خطاب کیا جاتا۔[1]

یخلق ما یشآء : جو چاہے اور جس طرح چاہے۔ مثلاً حضرت مسیح[ع] کو بدون باپ کے، حضرت حوا[ع] کو بدون ماں کے اور حضرت آدم علیہ السلام کی بدون ماں اور باپ کے پیدا کر دیا۔

۱۲ اس آیت میں عقیدۂ تثلیث اور الوہیت کے بطلان اور رد میں تین دلائل قائم کئے گئے ہیں۔

۱۔ فمن یملک سے جمیعًا تک میں ضمنًا حضرت مسیح علیہ السلام کی گرفتاری اور پھر قید کے واقعہ کی طرف اشارہ کر کے اُن کا محکوم و مسخر الٰہی ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ جو خدائی کے برخلاف ہے اس سے مسیح[ع] کی خدائی باطل ہوئی۔

۲۔ للہ ملک السموٰت و الارض میں غنائے ذاتی کو ظاہر کر کے بیٹا بنانے کی مزدت

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۷۲ (ترجمہ اردو)　[2] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۱۷

Marfat.com

کو رفع کیا گیا ہے۔

۳۔ بمخلوق مالیشاء میں ان کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے جو لوگوں کے دل میں ان کے لئے خدا کا بیٹا ہونے کے باطل خیال پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو رد کیا گیا ہے کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہم جس طرح چاہیں پیدا کر سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی بے مثل و لازوال حکومت اور بے حد قدرت سے نیز اُس کے خالق ہونے سے توحید پر استدلال کیا گیا ہے اور نصاریٰ کے شرک کا رد فرمایا گیا ہے۔ قدرت، حکومت اور خلق کی صفات، جس میں ہوں وہی معبود برحق ہو سکتا ہے۔ مسیح علیہ السلام بندہ محض اور عاجز مخلوق ہے۔ خدا کیسے ہو سکے گا؟ (مؤلف)

لہ موجودہ دور کے عیسائیوں کے تین بنیادی اور بڑے فرقے ہیں۔

ا۔ رومن کیتھولک (ب) آرتھوڈکس

ج۔ پروٹسٹنٹ (یعنی اصلاح عیسائیت کا علمبردار فرقہ)

یہ تیسرا فرقہ تقریباً چار صدیوں سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن بڑے بڑے عظیم، ترقی یافتہ اور مہذب ممالک مثلاً ممالک متحدہ امریکہ، انگلستان اور جرمنی میں یہی سب سے بڑا مذہب بن چکا ہے، اس مذہب نے عیسائیت کی بہت سی تقالید اور وہم و خرافات کو مٹا دیا ہے لیکن ان کی بجائے اور روایات اور تقالید قائم کر دی ہیں۔ اس سب کے باوجود عیسائیت کے مصلحین (ریفارمر) اُسے توحید خالص کی طرف نہیں پھیر سکے، جو مسیح اور دوسرے انبیاء کا دین ہے۔ یہ لوگ بھی تثلیث کے قائل ہیں اور توحید پرست کو دوسرے دو فرقوں کی مانند عیسائیت سے خارج قرار دیتے ہیں۔

اس زمانے کے تمام عیسائی کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے اور مسیح ابن مریم اللہ ہے۔ لیکن پرانے عیسائی اس عقیدے پر متفق نہ تھے۔ کیونکہ وہ تثلیث کے تین ارکان باپ، بیٹا اور روح القدس کی تفسیر اس طرح کرتے تھے کہ ان سے مراد وجود، علم اور حیات ہے اور عقیدہ خالق کی توحید کے منافی نہیں تھا جیسا کہ اب بھی یورپ اور دوسرے ممالک کے عیسائیوں میں کچھ لوگ موحد پائے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح نبی اور رسول ہے الٰہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر پوسٹ (پروٹسٹنٹ عیسائی ہے) کتاب مقدس کی تاریخ میں لکھتا ہے

لہ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۸۲، ۸۴، تفسیر المنار ج ۶ ص ۲۱۲، ۳۰۶۔

Marfat.com

کہ فطرت الٰہی تین متساوی الجواہر اقانیم (ارکان) اجزا سے عبارت ہے اور وہ یہ ہیں۔

(i) اللہ جو باپ ہے۔
(ii) اللہ جو روح القدس ہے۔
(iii) اللہ جو بیٹا ہے۔ پس خلق تو باپ پر منتہی ہوتی ہے لیکن ابن (بیٹے) کے واسطے سے۔ اور بیٹے کی طرف قربانی اور کفارہ منتہی ہوتا ہے۔ اور روح القدس کی طرف تطہیر منتہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تینوں اقانیم تمام کاموں کو باہم برابر تقسیم کرتے ہیں (معاذ اللہ)

عیسائیوں کے نزدیک اس عقیدے کی بنیاد ایک عبارت ہے جو انجیل یوحنا میں آئی ہے: "ابتدا میں کلام تھا، کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام ہی خدا تھا"، اور انہوں نے کلام (کلمہ) کی تفسیر مسیح ابن مریم سے کی ہے۔ پس اس تفسیر کی بناء پر انجیل یوحنا کے اس تیسرے فقرے کا معنیٰ یہ بنے گا کہ خدا ہی مسیح ابن مریم ہے اور لہٰذا یہی عقیدہ ہے جو قرآن نے اس آیت میں اُن کی طرف منسوب فرمایا ہے اور بلاشبہ یہ شرک وبت پرستی کا عقیدہ ہے جو انہوں نے قدیم مصریوں، برہمنوں بدھ مذہب والوں اور مشرق ومغرب کے دوسرے مشرکوں اور بت پرستوں سے اخذ کیا ہے۔

قرآن نے اس کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قد خلت من قبلہ الرسل الخ یعنی مسیح اور ان کی والدہ دیگر مخلوقات کی مانند ہلاکت اور فنا کو قبول کرنے والے ہیں۔ زندگی اور موت کا اختیار فقط اللہ کے پاس ہے کیونکہ وہ مالک الملک ہے۔ جو چاہے اپنے ارادے اور اختیار و مشیت سے کرے۔ ظاہر ہے کہ اور کسی کی یہ شان نہیں۔ لہٰذا اور کوئی معبود بھی نہیں ہو سکتا۔ مسیح یا ان کی والدہ دوسری عاجز اور فانی مخلوق کی طرح اپنے آپ سے موت و ہلاکت کو ہٹا نہیں سکتے۔ دوسروں سے کیا ہٹائیں گے؟ پس وہ خدا بھی نہیں ہو سکتے۔

اس آیت میں للہ ملک السموٰت والارض کا جملہ پہلے دعوے پر بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ یعنی مالک الملک، حاکم مطلق اور حیات و موت کا مختار سوائے خدائے واحد کے کوئی نہیں ہے تو معبود دوسرا کیسے ہو سکتا ہے؟ یخلق ما یشآء سے مسیح کی پیدائش کی کیفیت سے جو شبہ پیدا ہو سکتا تھا اُسے رد کیا گیا ہے یعنی مسیح کی بے باپ پیدائش سے تم نے استدلال کر کے کہا کہ وہ بشر اور اللہ دونوں ہے۔ کیونکہ اُس کی پیدائش عام قاعدے کے مطابق نہیں ہوئی اور اُس نے عجیب اعمال

Marfat.com

دکھائے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ ساری کائنات کا مالک و حاکم مطلق ہے۔ اپنی مشیئت سے مخلوق کو پیدا کرتا ہے وہ بعض زندوں کو ایسے مادے سے پیدا کرتا ہے جسے تذکیر و تانیث سے موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے کہ اس نے حیوانات کی تمام اقسام کے اصول (پہلے افراد) کو پیدا کیا۔ اور اسی نے آدم علیہ السلام کو بھی پیدا کیا۔ اور بعض مخلوق کو وہ فقط مؤنث سے پیدا کرتا ہے اور بعض کو مذکر مؤنث دونوں سے پیدا کرتا ہے اور بعض کو مذکر سے نکالتا ہے اس میں کسی مونث کا دخل نہیں ہوتا۔ جیسے کہ حوا کی پیدائش آدم علیہ السلام سے ہوئی) مخلوقات کی شکل و صورت اور اس کی پیدائش کا سبب اُس کے اختیار پر دلالت نہیں کرتا۔ یعنی اس میں الوہیت پیدا نہیں کر دیتا۔ نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض مخلوق دوسری مخلوق کے لئے الٰہ بن گئی ہے۔ نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا اس میں حلول کر گیا (گھس گیا) ہے مخلوق بہر حال اور بہر صورت و وصف مخلوق ہے اُسے کوئی چیز مخلوقیت سے نکال کر خالقیت میں داخل نہیں کر سکتی۔ پس مسیح علیہ السلام کی پیدائش اور اس کے معجزات و فضائل اُسے الٰہ اور رب نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ یہ خصائص خالق کی مشیئت و ارادہ سے ہیں۔ ان کی وجہ سے مخلوق ہرگز خالق نہیں بن سکتی۔

[1] عیسیٰ علیہ السلام ہر رسول کی مانند اپنے پروردگار کی طرف سے توحید خالص لے کر تشریف لائے تھے۔ خالص عبودیت کا اقرار کرنا ہر رسول کی شان رہی ہے۔ لیکن بت پرست مشرکوں کے نصرانیت میں داخل ہونے سے یہ خالص عقیدہ تحریفات کا شکار ہو گیا۔ ان لوگوں نے توحید خالص کے عقیدے کو مشرکانہ عقائد سے گڈ مڈ کر دیا اور اس کے بعد خالص توحید کو نکھارنے اور اُس میں سے شرک و بت پرستی کو نکالنے کا امکان جاتا رہا۔ عیسائیت میں یہ انحرافات یک لخت داخل نہیں ہو گئے۔ بلکہ کئی موقعوں پر آہستہ آہستہ یہ کام ہوا ہے اور ان کی مذہبی مجالس (مجامع) نے یہ تحریفات یکے بعد دیگرے دین مسیح میں داخل کی ہیں۔ یہاں تک کہ تصورات اور دیومالائی افسانوں کا ایک عجیب معجون مرکب تیار ہو گیا۔ جس میں عقلیں حیران ہیں خود ان لوگوں کی عقلیں بھی حیران و سرگرداں ہیں جو اس عقیدے کی شرح کرنے والے اور اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔

مسیح علیہ السلام کے بعد ان کے شاگردوں اور ان کے پیروؤں میں عقیدۂ توحید کچھ دیر تک زندہ و پائندہ رہا۔ بہت سی لکھی جانے والی انجیلوں میں سے ایک انجیل برناباس (برنابا) بھی ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا رسول قرار دیتی ہے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ بعض نے کہا کہ مسیح دوسرے رسولوں کی مانند ایک رسول اللہ ہے۔ دوسروں نے کہا کہ ہاں وہ رسول تو ہے۔ لیکن خدا سے اُس کا ایک خصوصی تعلق بھی ہے۔ کچھ اور بولے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے کیونکہ بغیر

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۱۱۷، ۱۲۱۔

Marfat.com

باپ کے پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ خدا کی مخلوق تھا۔ بعض اس سے بھی آگے بڑھ کر کہنے لگے کہ وہ ابن اللہ ہے لیکن مخلوق نہیں بلکہ "باپ" کی مانند قدیم ہے۔

ان اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لئے ۳۲۵ء میں نائسیہ کی مجلس منعقد ہوئی جس میں ۱۸ ہزار پادری اور اسقف جمع ہوئے۔ عیسائیت کا ایک مورخ ابن البطریق اس مجلس کے بارے میں لکھتا ہے۔ "یہ لوگ عقائد و ادیان میں مختلف تھے۔ بعض کہتے تھے کہ مسیحؑ اور ان کی والدہ خدا سے دوسرے دو معبود ہیں۔ یہ یہ یرانی فرقہ تھا جنہیں ریمتیون کہا جاتا ہے۔ بعض کا قول تھا کہ مسیحؑ کا خدا باپ کے ساتھ ایسا تعلق ہے۔ جیسے آگ کا شعلہ آگ کے شعلے سے نکلتا ہے۔ پس دوسرے کے جدا ہونے سے پہلا ناقص نہیں ہو جاتا۔ یہ سابلیوس اور اس کے گروہ کا قول تھا۔ بعض کہتے تھے کہ مسیح مریمؑ کے پیٹ میں بصورت حمل نو ماہ نہیں رہا بلکہ اس کے پیٹ سے اس طرح گزرا، جس طرح پانی پرنالے سے گزر جاتا ہے کیونکہ "کلمہ" اس کے کان میں داخل ہوا اور اسی وقت اس جگہ سے خارج ہو گیا جہاں سے بچہ نکلتا ہے۔ یہ قول الیان اور اس کے ساتھیوں کا تھا۔ ان میں سے بعض کہتے تھے کہ مسیحؑ انسان ہے۔ جو لاہوت سے پیدا ہوا ہے۔ جس طرح ہم میں سے کوئی اپنے جوہر میں مخلوق ہوتا ہے اور بیٹے کی ابتداء مریمؑ سے ہوئی تھی اور اسے برگزیدہ کیا گیا تھا تاکہ وہ انسانی جوہر کو خالص کر دے۔ نعمتِ الٰہی اس کے ساتھ تھی اور محبت و مشیت سے اس میں حلول کر گئی تھی۔ اسی لئے اس کا نام ابن اللہ رکھا گیا ہے۔ یہ لوگ کہتے تھے۔ کہ اللہ جوہر قدیم واحد ہے اور رکن (اقنوم) واحد ہے اور وہ اس کے تین نام رکھتے تھے۔ ان کا ایمان "کلمہ" اور "روح القدس" پر نہ تھا۔ یہ قول پولوس شمشاطی انطاکیہ کے بطریق اور اس کے ساتھیوں کا تھا۔ جنہیں بولیقانی کہا جاتا ہے۔ اور بعض کا قول یہ تھا کہ تین ازلی معبود ہیں۔ صالح، طالح اور ان کے درمیان میرا عدل ہے اور یہ ملعون مرقیون اور اس کے ساتھیوں کا قول تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مرقیون حواریوں کا سردار ہے اور وہ پطرس کا انکار کرتے تھے۔ اور ان میں سے بعض الوہیت مسیحؑ کے قائل تھے اور یہ پولوس اور ۳۱۸ اسقفوں کا مقالہ تھا۔

رومی شہنشاہ قسطنطین جو بت پرستی چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہوا تھا۔ اور عیسائیت کے متعلق کچھ بھی علم نہ رکھتا تھا۔ اس نے اس آخری رائے (پولوس کی رائے) کو پسند کیا اور اس رائے والوں کو دوسروں پر غالب و مسلط کر دیا۔ اور دیگر تمام عقاید و مذاہب والوں کو ڈرا دھمکایا، خاص کر جو لوگ صرف لکھنے "باپ" کی الوہیت کے قائل تھے مسیحؑ کی ناسوتیت (انسان اور مخلوق ہونا) کو مانتے تھے۔ انہیں بادشاہ نے مردود قرار دے دیا۔

تاریخ الامۃ القبطیہ کا مصنف اس مجمع نائسیہ کے فیصلے یوں لکھتا ہے۔

"جامعۂ مقدسہ اور کلیسائے رسولیہ ہر اس شخص کی بات کو حرام دیتا ہے جو کہے

Marfat.com

کہ کوئی ایسا زمانہ بھی گزرا ہے۔ جس میں ابن اللہ موجود نہ تھا اور جو کہے کہ وہ پیدائش سے قبل موجود نہ تھا۔ اور یہ کہ وہ لاشئی سے پیدا ہوا ہے۔ یا وہ جو کہے کہ بیٹا ایسے مادے یا جوہر سے موجود ہوا ہے جو خدا (باپ) کا جوہر نہیں۔ اور ہر وہ شخص جو کہے کہ وہ مخلوق ہے یا جو کہے کہ وہ تغیر کو قبول کرنے والا ہے اور اس پر گردش کائنات کا سایہ پڑتا ہے"۔

لیکن یہ مجمع اپنے فیصلوں اور تردیدوں کے باوجود آریوس کے ساتھیوں کو جو توحید کے تھے ختم نہ کر سکا۔ آریوس کا مذہب قسطنطنیہ، انطاکیہ، بابل، اسکندریہ اور مصر میں غالب آ گیا۔

پھر اس کے بعد "روح القدس" کے متعلق ایک جدید اختلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ بعضوں نے کہا وہ الٰہ ہے اور دوسرے کہنے لگے کہ وہ الٰہ نہیں پس قسطنطنیہ کا پہلا اجتماع ۳۸۱ء میں منعقد ہوا تاکہ اس اختلاف کو ختم کرے۔

ابن البطریق نے اسکندریہ کے اُستف کے مقالے کی بنا پر اس مجمع کا فیصلہ یوں نقل کیا ہے:

"اسکندریہ کے بطریک تیموثاؤس نے کہا کہ ہمارے نزدیک روح القدس روح اللہ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے اور روح اللہ اُس کی حیات کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں پس اگر ہم کہیں کہ روح القدس مخلوق ہے تو گویا ہم نے یہ کہا کہ روح اللہ مخلوق ہے اور جب ہم کہیں کہ روح اللہ مخلوق ہے تو گویا ہم نے کہا کہ اُس کی حیات مخلوق ہے اور جب ہم نے کہا کہ اُس کی حیات مخلوق ہے تو گویا ہم نے کہا کہ وہ زندہ نہیں اور جب ہم نے کہا کہ وہ زندہ نہیں تو ہم نے اُس سے کفر کیا اور جس نے اُس سے کفر کیا اس پر لعنت واجب ہے"!

یوں اس مجمع میں روح القدس کی الوہیت کا فیصلہ ہو گیا۔ جس طرح کہ نائسیہ کی مجلس میں الوہیت مسیحؑ کا فیصلہ ہوا تھا۔ پس اب ثالوث (تثلیث) باپ، بیٹے اور روح القدس سے مکمل ہو گئی۔

اس کے بعد مسیحؑ کی الٰہی طبیعت اور انسانی طبیعت کے اجتماع کے بارے میں ایک اختلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ جسے کہ وہ لاہوت اور ناسوت کہتے ہیں۔ قسطنطنیہ کے بطریک نسطور کی رائے ہے کہ مسیحؑ میں اقنوم اور طبیعت انسانی بیک وقت موجود ہیں۔ الوہیت کا اقنوم (جزو) تو باپ (خدا) کی طرف سے ہے اور اس کی طرف منسوب ہے اور انسانی طبیعت مریمؑ سے پیدا ہوئی ہے۔ پس مسیحؑ میں جو انسان ہے اُس کی والدہ مریمؑ ہے لیکن وہ اللہ کی والدہ نہیں۔

ابن البطریق نے نسطور سے نقل کیا ہے کہ مسیحؑ جو لوگوں میں ظاہر ہوا تھا اور اُن سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ یقیناً ایک انسان تھا جو اپنے متعلق کہتا تھا کہ وہ مسیحؑ ہے۔ وہ محبت کی وجہ سے

Marfat.com

ابن کے ساتھ متحد ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ ہے اور ابن اللہ ہے۔ حقیقت میں نہیں بلکہ موہبت (بخشش) کی وجہ سے۔

پھر ابن البطریق کہتا ہے کہ: نسطور کا خیال یہ تھا کہ ہمارا رب (خداوند) یسوع مسیحؑ اپنی ذات کی حد تک الٰہ نہیں تھا، بلکہ وہ انسان تھا جو برکت اور نعمت سے بھرا ہوا تھا۔ یا وہ خدا کی طرف سے مُلہَم (الہام کیا گیا) تھا پس اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اور کوئی خلافِ شرع و عقل کام نہیں کیا۔"

لیکن نسطور کی اس رائے میں روما کے اسقف اور اسکندریہ کے بطریرک نے اُس کی مخالفت کی۔ اسی طرح انطاکیہ کے اسقف بھی سب اُس کے خلاف تھے۔ پس وہ ایک چوتھی مجلس کے انعقاد پر متفق ہوئے اور ۴۳۱ء میں آفسس کا مجمع منعقد ہوا۔ ابن البطریق کے قول کے مطابق اس مجمع نے یہ قرارداد پاس کی۔

"یقیناً کنواری مریمؑ اللہ کی والدہ ہے اور بلاشبہ مسیحؑ الٰہ اور انسان ہے۔ اس میں دونوں فطرتیں موجود ہیں۔ وہ اقنوم میں اکیلا ہے" اور ان سب نے نسطور پر لعنت کی۔

پھر اسکندریہ کے کلیسا نے ایک نئی رائے نکالی۔ جس کے لئے آفسس کی دوسری مجلس قائم ہوئی اور اُس نے فیصلہ کیا کہ:۔

"بلاشبہ مسیحؑ ایک ہی فطرت (طبیعت) ہے جس میں لاہوت اور ناسوت جمع تھا!"

لیکن اس رائے کو تسلیم نہ کیا گیا اور تیز و تند اختلافات جاری رہے تو خلقیدونیہ کا مجمع ۴۵۱ء میں جمع ہوا اور اُس نے فیصلہ کیا کہ:

"بلاشبہ مسیح میں دو طبیعتیں (فطرتیں) ہیں۔ ایک نہیں۔ اور لاہوت الگ ایک طبیعت ہے اور ناسوت بذاتِ خود ایک دوسری طبیعت ہے۔ یہ دونوں مسیحؑ میں مل گئی تھیں" اور اس مجمع نے آفسس کی دوسری مجلس کو ملعون قرار دیا۔

لیکن مصر والوں نے اس مجمع کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا اور مصری مذہب مونوفیسیہ اور ملکانی مذہب ۔۔۔ جسے شہنشاہی سلطنت نے اختیار کر لیا تھا۔ میں خونریز اختلافات واقع ہوئے ان کی تفصیل آرنولڈ نے اپنی کتاب "الدعوۃ الی الاسلام" میں پیش کی ہے اور اس کے یہاں نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

مسیحؑ کی الوہیت وغیرہ کے عقیدے کے گرد جو منحرف تصورات، خونریز اختلافات اور بغض و عداوت پیدا ہوئی، یہ اُس کی ایک مجمل تصویر ہے۔ مختلف فرقوں کے درمیان یہ اختلافات اور عداوتیں اب بھی قائم ہیں۔

آخرکار آخری رسولؐ تشریف لائے۔ اُنہوں نے اس قضیہ کا برحق اور واضح فیصلہ فرمایا

Marfat.com

اور ایک فیصلہ کن بات کہہ دی۔ تاکہ اہل کتاب کے سامنے صحیح عقیدے کی حقیقت کھل کر آجائے۔
اس سورت میں عنقریب وہ آیت آرہی ہے: لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ
اس کے ساتھ آیت زیر بحث کو ملائیے: لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم
تو بات بالکل صاف ہو جائے گی۔
رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل، فطرت اور واقعات کی منطق کو اجاگر کرتے ہوئے اعلان فرمایا کہ قل فمن یملک من اللہ شیئاً ..... جمیعاً ط پس اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور مشیت و اقتدار میں اور عیسیٰ علیہ السلام انسان کی والدہ مریم کی ذاتوں میں مطلق جدائی ثابت ہو گئی۔ کیونکہ اللہ کی ذات واحد ہے، اس کی مشیت و ارادہ آزاد ہے اس کی سلطنت یگانہ ہے۔ اس کی مشیت کے رد کرنے یا اس کی سلطنت کو ہٹانے کا کسی کو یارا نہیں۔ اگر وہ عیسیٰ اور ان کی والدہ اور ساری کائنات کو فنا و نابود کر دینا چاہے تو اس کا ہاتھ کوئی پکڑ نہیں سکتا۔
وہ ہر شئی کا مالک و خالق ہے۔ اور خالق، مخلوق سے الگ تھلگ ہوتا ہے اس کے سوا ہر چیز مخلوق ہے۔ اس چیز کی وضاحت وللہ ملک السموٰت والارض ..... قدیر میں فرمائی گئی ہے۔
اس سے اسلامی عقیدے کی پختگی، وضاحت اور لباطت واضح ہو جاتی ہے اور عیسائیوں کے مذکورہ بالا انحرافات، تصورات، دیومالائی عقائد و اوہام اور مشرکانہ اور بت پرستانہ اوہام و خرافات کے ڈھیر کے سامنے اسلامی عقیدہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اس نے الوہیت اور عبودیت کی حقیقت واضح کر دی ہے، اور کسی لگی لپٹی رکھے بغیر اور کسی شبہے یا شک و ریب اور غموض و ظلمت کے بغیر پورا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ
اور کہا یہود و نصاریٰ نے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور
وَاَحِبَّآؤُهٗ ط قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ط
اس کے پیارے ہیں۔ تو کہہ پھر کیوں عذاب دیتا ہے تم کو تمہارے
بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ط يَغْفِرُ لِمَنْ
گناہوں پر نہیں! بلکہ تم بھی آدمی ہو اس کی مخلوق میں وہ بخشے جسے چاہے

Marfat.com

يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ

اور عذاب دے جسے چاہے اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے

لہ یہود و نصاریٰ اپنے آپ کو بیٹے یعنی اولاد اس لئے کہتے ہیں کہ اُن کی بائیبل میں خدا نے اسرائیل کو اپنا پہلوٹا بیٹا اور اپنے کو اس کا باپ کہا ہے ادھر نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ مانتے ہیں تو اسرائیل کی اولاد اور حضرت مسیح کی اُمت ہونے کی وجہ سے غالباً ابناء اللہ کا لفظ اپنے لئے استعمال کیا ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیٹا کہنے سے مراد یہ ہے کہ ہم خدا کے خواص اور محبوب ہونے کی وجہ سے گویا اولاد ہی جیسے ہیں۔ اس صورت میں ابناء کا حاصل وہی ہو جائے گا جو لفظ احباء کا ہے۔

چونکہ کسی مخلوق کا حقیقتاً خدا کا بیٹا ہونا بالکل محال اور واضح طور پر باطل ہے۔ اور خدا کا محبوب بن جانا ممکن تھا یحبھم ویحبونہ (المائدہ ۸ ع) اس لئے اس جملہ میں قل فلم یعذبکم بذنوبکم

اوّل محبوبیت کے دعوے کا رد کیا گیا یعنی جو قوم علانیہ لغادتوں اور شدید ترین گناہوں کی وجہ سے اس دنیا میں بھی کئی طرح کی رسوائیوں اور عذاب میں گرفتار ہو چکی۔ اور آخرت میں "جس دوام" کا عقلاً و نقلاً حق رکھتی ہے کیا ایسی عاصی و باغی قوم کی نسبت ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی ذی شعور یہ خیال کر سکتا ہے۔ کہ وہ خدا کی محبوب اور پیاری ہوگی؟ خدا سے کسی کا نسبی رشتہ نہیں اُس کا پیار اور محبت صرف اطاعت اور حسنِ عمل سے حاصل ہوتی ہے ایسے کھلے مجرموں کو جو سخت سے سخت سزا کے مستحق اور مورد بن چکے ہوں، شرمانا چاہیئے کہ وہ نحن ابناء اللہ واحبآءہ کا دعویٰ کریں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو باوجود یکہ اُن کا صلبی بیٹا تھا خدا نے فرما دیا۔ انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح ہود ع

بل انتم بشر ممن خلق : بشر اصل لغت میں کھال کی اوپر والی سطح کو کہتے ہیں۔

لہ فوائد القرآن ص ۱۴۲

Marfat.com

تھوڑی سی مناسبت سے آدمی کو "بشر" کہنے لگے شاید اس لفظ کے یہاں اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہو کہ تم کو خدا کا بیٹا اور پیارا تو درکنار، شریف اور ممتاز انسان بھی نہیں کہہ سکتے۔ صرف بشرہ اور شکل و صورت کے لحاظ سے خدا کے پیدا کئے ہوئے ایک معمولی آدمی کہلائے جا سکتے ہو۔ جن کی پیدائش بھی اُسی معتاد طریقہ سے ہوئی۔ جس طرح عام انسانوں کی ہوتی ہے۔ پھر بھلا "ابنیت" کا دعویٰ کدھر سے راہ پا سکتا ہے؟

یغفر لمن یشاء کیونکہ وہی جانتا ہے کہ کون بخشے کے لائق ہے اور کسے سزا دی جائے!

وللہ ملک السمٰوٰت والارض .... المصیر تو جسے وہ اپنی رحمت و حکمت سے معاف کرنا چاہے۔ یا عدل و انصاف سے سزا دینا چاہے، اُس میں کون مزاحم ہو سکتا ہے؟ نہ کسی مجرم کے لئے یہ گنجائش ہے کہ اُس کی قلمرو ——— آسمان و زمین ——— سے نکل بھاگے اور نہ یہ کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کہیں اور بھاگ جائے۔

[1] انجیل میں "خدا کے بیٹے" کا لفظ فرشتوں اور نیک مومنوں کے لئے بولا گیا ہے۔ جیسا کہ انجیل متی میں حضرت عیسیٰؑ کے پہاڑی کے وعظ میں آتا ہے: سلامتی پیدا کرنے والوں کو خوشخبری ہو۔ کیونکہ انہیں خدا کے بیٹے کے لفظ سے پکارا جائے گا"، اور پولوس نے رومیوں کے نام خط میں لکھا ہے:

"کیونکہ وہ سب جو خدا کے اللہ کے مطیع ہیں وہی خدا کے بیٹے ہیں"۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اُن کی کتابوں میں ابن اللہ کا لفظ "محبوب خدا" کے معنی میں آتا ہے جس سے خدا، رحمت، احسان اور تکریم کا معاملہ کرے گا لیکن عیسائیوں نے اس لفظ میں سینہ زوری کرتے ہوئے مسیحؑ کے لئے اُسے حقیقی بیٹے کے معنوں میں لے لیا۔ اور دوسرے نیکوکاروں کے حق میں مجازی معنوں میں مان لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کا رد اس طرح فرمایا ہے کہ: **قل فلم یعذبکم .. من یشآء**۔ یعنی اگر معاملہ وہی ہے جو تم کہتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا میں کیوں سزا دیتا ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو؟ کہ بت پرستوں نے تمہاری سب سے بڑی مسجد کو برباد کیا، اور پے در پے دیگرے کئی بار تمہارے شہر ویران کئے گئے، زمین سے تمہاری حکومت زائل کر دی گئی۔ باپ تو اپنے بیٹے کو یوں سزا نہیں دیا کرتا! اور نہ دوست اپنے پیارے کو یوں عذاب میں مبتلا کیا کرتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تمہارا دعویٰ غلط ہے اور تم عام آدمیوں کی مانند ہیں

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۸۴، ۸۵ تفسیر المنار ج ۶ ص ۲۱۵، ۳۱۹

Marfat.com

آدمی ہی ہو۔ اللہ تعالیٰ کسی کی ناجائز حمایت اور رعایت نہیں کیا کرتا۔ جو مستحق مغفرت ہو اُسے بخشتا ہے اور جسے وہ جانتا ہے کہ سزا کے لائق ہے اُسے عذاب دیتا ہے۔ اپنے غرور و تکبر اور اسلاف پر فخر و گھمنڈ کو چھوڑ دو کیونکہ اس کا رتی بھر فائدہ نہیں۔ صرف ایمان صحیح اور عمل صالح ہی مفید ہے جزاء اس پر ہوگی نہ کہ اسماء و القاب پر۔

وللہ ملک السموٰت والارض۔ الخ میں یہ فرمایا ہے کہ ساری مخلوق خدا کے بندے ہیں، بیٹے اور بیٹیاں نہیں۔ الیہ المصیر میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دنیوی عذابوں اور رسوائیوں کے علاوہ اُن کے باطل غرور اور جھوٹے دعوؤں پر آخرت میں بھی شدید عذاب ہوگا۔ وہاں انہیں پتہ چل جائے گا کہ وہ خدا کے بندے تھے نہ کہ بیٹے اور محبوب، جن کی ناجائز حمایت کی جاتی!

یہود کا عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کا برگزیدہ خاندان ہیں اور تمام انسانوں سے ممتاز ہیں۔ کوئی دوسرا خاندان چاہے ایمان و عمل صالح میں ان سے بہتر ہی کیوں نہ ہو، ان کا مقابلہ اور مساوات کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور یہ کہ انہیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اسرائیلی نہیں۔ افضل اپنے سے گھٹیا کا اتباع نہیں کر سکتا اور اللہ کا ان سے معاملہ بالکل اسی طرح ہوگا۔ جیسے باپ اپنے عزیز فرزندوں سے کرتا ہے۔ نصاریٰ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور کہا کہ مسیحؑ نے اپنی جان کی قربانی دے کر اُن کا کفارہ ادا کر دیا ہے اور روح کی ولادت سے وہ خدا کے بیٹے ٹھیرائے گئے ہیں۔ مسیحؑ اُس کا حقیقی بیٹا ہے اور خدا کو وہ باپ کے لقب سے پکارنے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے غرور سے شدید جہاد کیا لیکن اس سے انہوں نے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اُنہوں نے حضورؐ کی دعوت کو رد کر دیا اور آپؐ کے پیش کردہ اصول کہ خدا کی رضا اچھے عمل سے ہے۔ اسی سے تزکیۂ نفس اور اصلاح قلب ہوتی ہے، کو انہوں نے نہ مانا۔ اسی طرح حضورؐ نے نصاریٰ کی غلط تقلید اور غرور و تکبر کا بھی شدید محاسبہ مقابلہ فرمایا۔ نزول قرآن کے زمانے میں، مورخین کی شہادت کے مطابق، یہ لوگ ظلم و فساد اور لغزش میں یہود سے بھی دو قدم آگے تھے، اس کے باوجود ان کا دعویٰ تھا کہ وہ خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں اور انہیں اخروی و دنیوی اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں۔

ابن اسحاقؒ، ابن جریرؒ، ابن المنذرؒ، ابن حاتمؒ اور بیہقیؒ نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابن ابی، بحری بن عمرو اور شاس بن عدی کے پاس تشریف لے گئے اور اُن سے گفتگو فرمائی اور انہیں خدا کی طرف بلایا

Marfat.com

اور اس کی ناراضگی سے ڈرایا انہوں نے کہا اے محمدؐ! تم ہمیں کس چیز کا خوف دلاتے ہو؟ واللہ ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں! اسی طرح کا قول نصاریٰ کا بھی تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن اللہ کا لقب انجیل لوقا ۳/۳۸ میں آدم کے لئے آیا ہے۔ توراۃ کے سفر خروج، ۲۲، ۴/۲ میں یعقوبؑ کے لئے ابن اللہ اور پہلوٹھا کا لفظ آیا ہے زبور ۹/۲ میں داؤدؑ کے لئے یہی دونوں لقب آئے ہیں پیدائش ۳۱/۹ میں افرام (ابراہیم) کے لئے ابن اللہ کا لقب آیا ہے اور عہد جدید میں اس کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ مسیح کے لئے ابن اللہ اور حبیب کا لفظ آیا ہے۔ ان سے مراد خدا کا پیارا ہے اور حبیب کا لفظ ابن کی تفسیر کے لئے آیا ہے۔ یہ نصاریٰ کی ہٹ دھرمی اور دھبکا مشتی ہے کہ انہوں نے مسیح کے لئے ابن حقیقی کا لفظ تجویز کر لیا۔ حالانکہ اللہ پر یہ چیز محال ہے کیونکہ حقیقی ابن وہ ہے جو کسی کے نطفے سے پیدا ہو[1] یہود و نصاریٰ کے غرور اور عقلی فتور کے جواب میں ایک تو عملی دلیل دی گئی۔ کہ بخت نصر اور دیگر سلاطین نے تمہارا کیا کیا علیہ نہیں لگاڑا اور کیا کیا سزائیں نہیں دیں اس پر بھی تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم خدا کے بیٹے اور محبوب ہو؟ اور پھر ان کے دعویٰ ابنیت و محبوبیت کے بطلان کے لئے تین دلائل دیئے۔

(۱) بل انتم بشر الخ کہ تمہاری اور عام انسانوں کی پیدائش میں کچھ بھی فرق نہیں۔ پھر تم میں کیا فوقیت ہے؟

(۲) یغفر الخ اس کی مغفرت اور اس کا عذاب اس کے اپنے اختیار میں ہے تم بھی اس میں شامل ہو۔ پھر تمہارے اس دعوے نے کیا نتیجہ پیدا کیا ہے؟

(۳) للہ ملک السموٰت الخ کہ وہ واجب الوجود، مستغنی اور ہر ایک چیز کا مالک ہے۔ بیٹا بنانا ثمرہ احتیاج و حدوث ہے جس سے اس کی ذات اقدس بری ہے۔

[2] ان لوگوں نے ایک یہ بات بھی گھڑ کر آپس میں مشہور کر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب کی طرف وحی نازل فرمائی تھی کہ تیرا پہلوٹھا بیٹا میری اولاد میں سے ہے اس کی اولاد صرف چالیس دن تک جہنم میں رہے گی۔ اس مدت میں آگ انہیں پاک کر دے گی اور ان کی خطاؤں کو کھا جائے گی۔ پھر ایک فرشتہ منادی کرے گا کہ اسرائیل کی اولاد میں سے جو بھی فتنہ شدہ، ہوں وہ باہر نکل آئیں۔ قرآن نے ان کا جو قول اس

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲۲ [2] ابن کثیر ج ۲ ص ۷۴

Marfat.com

آیت میں نقل کیا ہے اُس کا بھی یہی مطلب ہے: وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً [1]

[1] یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کے لئے کسی نہ کسی طرح کی ابوّت (باپ ہونا) کے قائل تھے۔ اگر وہ جسمانی ابوّت نہ تھی اور روحانی ابوّت تھی۔ جو بھی ہو وہ عقیدہ توحید پر سایہ ڈالتی تھی۔ اور اُس فیصلہ کن عقیدے پر اثر انداز ہوتی تھی۔ جو الوہیت و عبودیت کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ جب تک اس حدِ فاصل کا اعتقاد نہ رکھا جائے، عقیدہ اور حیات سیدھی راہ پر نہیں پڑ سکتے۔ کیونکہ توحید کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ محبت جس کی طرف بندے عبودیت کے ساتھ متوجہ ہوں، صرف ایک ہی ہو۔ لوگوں کے لئے قانون سازی اور تحلیل و تحریم کرنے والی محبت بھی صرف ایک ہے۔ جو ان کے لئے قیمتیں، وزن و ترازو، شرائع اور قوانین وضع کرے اور نظام زندگی اور طور و اوضاع بنائے۔ خدا کی خصوصیتوں سے کسی اور کی خصوصیتیں اور صفات گڑبڑ نہ ہوں اور امتیازات مجروح نہ ہوں۔ الوہیت و عبودیت باہم مل جل نہ جائیں۔ پس یہ مسئلہ صرف عقیدے کے انحراف کا مسئلہ ہی نہیں۔ بلکہ اس انحراف پر ساری زندگی کے فساد کا مسئلہ ہے۔

یہود و نصاریٰ نے جب خدا کے بیٹے اور محبوب ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ تو اُس کے نتیجے میں کہنے لگے کہ وہ ہمارے گناہوں کے باعث ہمیں ہرگز عذاب نہ دے گا۔ اور ہم اوّل تو سرے سے آگ میں داخل ہی نہ ہوں گے۔ اگر بالفرض ہوئے بھی تو صرف چند دن کے لئے ہوں گے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ عدلِ الٰہی کما حقہٗ جاری نہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے بعض کی ناجائز رعایت کرتا ہے اور ان کو زمین میں فتنہ و فساد مچانے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اور پھر جب سزا کی باری آئے گی تو دوسرے مفسدوں کی مانند وہ انہیں سزا نہیں دے گا۔ سوچو! کہ اس قسم کے تصوّر سے وہ کونسا فساد ہے جو زندگی میں پیدا نہ ہو جائے گا؟ اور اس قسم کا انحراف زندگی میں کونسا اضطراب ہے جو پیدا نہ کر دے گا؟

یہاں اسلام عقیدے کے اس فساد پر فیصلہ کن ایسی ضرب لگاتا ہے اور زندگی کو ہر ممکن فساد سے بچانے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اللہ کے عدل کو ثابت کرتا ہے۔ ایسا عدل جس میں کسی کی کوئی ناجائز رعایت نہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اہل کتاب کے باطل دعوے کا باطل ہونا ثابت کرتا ہے۔ اور اعلان فرماتا ہے: قل فلم یعذبکم... من یشآء وہ کہتا ہے کہ عذاب و ثواب کے اللہ کے ہاں پیمانے مقرر ہیں، وہ اپنے اپنے اسباب

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۲۔

Marfat.com

سے وابستہ ہیں۔ جہاں اور جس میں بھی وہ اسباب پائے جائیں۔ وہیں عذاب و قانون ظہور کرتا ہے وہ کسی نسب و ادّعاء پر مبنی نہیں ہے۔ جب اہل کتاب بھی دوسرے مخلوق انسانوں کی مانند ہیں تو بنوّت (بیٹا ہونا) کہاں سے ثابت ہو سکتا ہے اور اُس کا عذاب و ثواب شخصی تعلقات یا دشمنوں پر مبنی نہیں ہے۔

آیت کے آخری حصّے میں اللہ کا مالک الملک ہونا ثابت فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ جب وہی مالک ہے، تو دوسرے سب مملوک ہیں۔ اور مالک و مملوک میں فرق و امتیاز مسلّم ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ

اے کتاب والو! آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا کھولتا ہے تم پر

عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ

رسولوں کے انقطاع کے بعد، کبھی تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس نہ

بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ

آیا کوئی خوشی یا ڈر سنانے والا۔ سو آچکا تمہارے پاس خوشی اور ڈر

وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾ ع ۳

سنانے والا اور اللہ سر چیز پر قادر ہے۔

لَكُمْ یعنی یہ پیغمبرؐ آخر الزمان تمہارے احکام و شرائع نہایت توضیح کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اس رکوع کی ابتداء میں بنی اسرائیل کی مختلف قسم کی شرارتوں اور حماقتوں کو بیان فرما کر فرمایا تھا کہ اب ہمارا رسولؐ تمہارے پاس آچکا جو تمہاری غلط کاریوں کو واضح کرتا ہے اور تم کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد اس پر متنبہ فرمایا کہ اب نورِ ہدایت کی طرف جانا دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرے اور مخلوق و خالق کے تعلق کے متعلق غلط عقیدے مت جماؤ۔ لقد کفر الذین سے لے کر یہاں تک اسی جزو کا بیان ہے۔

لہ فوائد القرآن ص ۱۴۲۔

Marfat.com

دوسری چیز یہ ہے کہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ، جو تمام انبیاے سابقین کے کمالات کے جامع اور شرائع الٰہیہ کے سب سے بڑے اور آخری شارح ہیں۔ اس جزء کا بیان اس آیت یا اھل الکتاب قد جاءکم رسولنا الخ میں کیا گیا ہے۔

علیٰ فترۃٍ من الرسل : حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تقریباً چھ سو برس سے انبیاء کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ ساری دنیا، الا ماشاء اللہ جہل و غفلت اور ادیان باطلہ کی تاریکیوں میں پڑی تھی۔ ہدایت کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ ظلم و عدوان اور فساد و الحاد کی گھٹا تمام آفاق پر چھا رہی تھی۔ اس وقت سارے جہان کی اصلاح کے لئے خدا نے سب سے بڑا ہادی اور بشیر و نذیر بھیجا۔ جو جاہلوں کو فلاحِ دارین کے راستے بتلائے غافلوں کو اپنے اندازِ دلنشین سے بیدار کرے اور پست ہمتوں کو بشارتیں سنا کر ابھارے۔ اس سے ساری مخلوق پر خدا کی حجت تمام ہو گئی۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔

واللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر : یعنی تم اگر اس پیغمبر کی بات نہ مانو گے تو خدا کو قدرت ہے کہ کوئی دوسری قوم کھڑی کر دے۔ جو اس کے پیغام کو پوری طرح قبول کرے گی۔ اور پیغمبر کا ساتھ دے گی۔ خدا کا کام کچھ تم پر موقوف نہیں۔

[1] حافظ علامہ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر، جو بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک، جو علی الاطلاق خاتم النبیین ہیں۔ درمیانی زمانہ فترت کا ہے اور اس میں کوئی نبی نہیں ہوا، چنانچہ بخاری شریف میں حدیث ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: میں عیسیٰ علیہ السلام سے اور لوگوں کی نسبت قریب تر ہوں۔ اس لئے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا۔

مقصود یہ ہے کہ جناب نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف لائے ہیں جبکہ نبیوں کی تعلیم مٹ چکی ہے۔ ان کی راہیں بے نشان ہو چکی ہیں۔ دنیا توحید کو بھلا چکی ہے۔ جگہ جگہ مخلوق پرستی ہو رہی ہے، سورج، چاند ستارے آگ اور بت پوجے جا رہے ہیں۔ خدا کا دین بدل چکا ہے۔ کفر کی تاریکی نورِ دین پر چھا چکی ہے۔ دنیا کا چپہ چپہ کشتی اور طغیانی سے بھر گیا ہے۔ عدل و انصاف بلکہ انسانیت فنا ہو چکی ہے۔ جہالت و غباوت کا دور دورہ ہے بجز چند نفوس کے خدا کا نام لیوا زمین پر نہیں رہا۔ پس معلوم ہوا کہ آپؐ کی جلالت و عزت خدا کے نزدیک بہت بڑی تھی۔ اور آپؐ نے جو خدائی

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۵ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

رسالت ادا کی وہ کوئی رسالت نہ تھی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آیت[1] کا مطلب یہ ہے کہ جس پیغمبر آخر الزمان کی تمہیں بشارت دی گئی تھی اور جس کا ذکر تمہاری کتابوں میں موجود ہے، وہ آچکا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کہا گیا تھا کہ: میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل سے ایک نبی مبعوث کروں گا" اور عیسیٰ علیہ السلام سے کہلوایا گیا تھا کہ: یقیناً فارقلیط (احمدؐ) آئے گا۔ جو روح حق ہے۔ وہ تمہیں سب باتیں سکھائے گا"، اور چوتھی انجیل میں ہے کہ یہودیوں کاہن اور لاوی (احبار) یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس بھیجے جنہوں نے یوحنا سے پوچھا کیا تو مسیح ہے۔ اُس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تو ایلیا ہے؟ اُس نے کہا نہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کیا تو وہ نبی ہے۔ تو اُس نے کہا کہ نہیں۔

"وہ" نبی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جنہیں وحی کے بند ہونے اور رسولوں کے مبعوث ہونے کے ایک لمبا عرصہ بعد بھیجا گیا تھا۔ آپؐ نے ہر جسمانی اور روحانی ضروری تعلیم پیش فرمائی اور اہل کتاب کی کتاب سے چھپائی ہوئی چیزیں بھی کھول کر بیان کیں۔

جب آپؐ کو بھیجا گیا تو پہلی شریعتوں میں تغییر و تحریف عام ہو چکی تھی ان پر ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ حق سے باطل اور سچ سے جھوٹ مل چکا تھا۔ اور مخلوق کے صحیح دین پر عمل کرنے اور عبادات کو ادا کرنے میں ایک واضح عذر موجود تھا۔ کیونکہ لوگ کہہ سکتے تھے کہ اے خدا! ہمیں معلوم تھا کہ تیری عبادت ضروری ہے۔ لیکن ہم تیری عبادت کیونکر کرتے؟ اس عذر کو زائل کرنے کے لئے عین مناسب وقت پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: میں جس قدرت خداوندی کا اعلان فرمایا گیا ہے اُس کے دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کی مدد فرمائی اور دُنیا میں اُن کے کلمہ کو غالب کر دیا۔ ابن اسحاق رحؒ ابن المنذر رحؒ ابن جریر بحری اور بیہقی رحؒ نے عبداللہ بن عباس رضؓ سے حدیث بیان کی ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو اسلام کی دعوت دی انہیں ترغیب دی اور انجام کار سے ڈرایا۔ یہود نے آپؐ کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تو معاذ بن جبل رضؓ، سعد بن عبادہ رضؓ اور عقبہ رضؓ بن وہب نے ان سے کہا: اے یہود! خدا کا خوف کرو۔ واللہ یقیناً جانتے ہو کہ آپؐ رسول اللہ ہیں۔ آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے تم ہمارے سامنے آپؐ کا ذکر اور صفات بیان کرتے رہے ہو اس پر رافع بن حُریملہ اور وہب بن یہودا نے کہا کہ ہم نے تم سے یہ بات کبھی نہیں کہی تھی۔ موسیٰ کے بعد اللہ نے نہ تو کوئی کتاب اتاری ہے

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۸۶، ۸۷ تفسیر المنار ج ۶ ص ۳۱۹، ۳۲۰

Marfat.com

نہ کوئی پیغمبر بشیر و نذیر بھیجا ہے اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔
لہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی حجت و معذرت قطع کر دی ہے اور انہیں انجام کے سامنے بالکل رُو در رو کھڑا کر دیا ہے اب اُن کے لئے کوئی الجھن، کوئی عذر یا عوض باقی نہیں رہا۔ جسے وہ دین حق کو قبول نہ کرنے اور توحید خالص کو اختیار نہ کرنے پر پیش کر سکیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم یاد کرو

نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ

احسان اللہ کا اپنے اوپر جب پیدا کئے تم میں نبی

وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا

اور کر دیا تم کو بادشاہ اور دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو

مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾

جہان میں

لہ موضح القرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کا وطن چھوڑ نکلے اللہ کی راہ میں اور ملک شام میں آکر ٹھیرے اور مدت تک اُن کے اولاد نہ ہوئی۔ تب اللہ تعالےٰ نے بشارت دی کہ تیری اولاد بہت پھیلاؤں گا۔ اور زمین شام ان کو دوں گا اور نبوت، دین، کتاب اور سلطنت ان میں رکھونگا۔ پھر حضرت موسیٰ کے وقت وہ وعدہ پورا کیا۔ بنی اسرائیل کو فرعون کی بیگار سے خلاص کیا اور اُس کو غرق کیا۔ اور ان کو فرمایا۔ کہ جہاد کرو عمالقہ سے مُلک شام فتح کر لو پھر ہمیشہ وہ ملک شام تمہارا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے بارہ شخص بنی اسرائیل کے بارہ قبائل پر سردار کئے تھے۔ ان کو بھیجا کہ اُس کی خبر لائیں۔ وہ خبر لائے تو ملک شام کی بہت خوبیاں بیان کیں اور وہاں جو عمالقہ مسلط تھے۔ ان کا زور و قوت بیان کیا۔ حضرت موسیٰ نے اُن کو کہا کہ تم قوم کے سامنے ملک کی خوبی بیان کرو اور دشمن کی قوت کا مت ذکر کرو۔

لہ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۲۳ لہ فوائد القرآن عثمانی رح ص ۱۴۲

Marfat.com

ان میں سے دو شخص اس حکم پر رہے باقی دس نے خلاف کیا۔ قوم نے سُنا تو نامردی کرنے لگی اور چاہا کہ پھر الٹے مصر چلے جائیں۔ اس تقصیر کی وجہ سے چالیس برس فتح میں دیر لگی اس قدر مُدت جنگلوں میں بھٹکتے پھرے جب اُس قرن کے لوگ مر چکے۔ مگر وہ دو شخص کہ وہ ہی حضرت موسیٰؑ کے بعد خلیفہ ہوئے، اُن کے ہاتھ سے فتح ہوئی۔

اذ جعل فیکم انبیآء یعنی تمہارے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیم سے لے کر آج تک کتنے نبی تم میں پیدا کیے۔ مثلاً حضرت اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ اور خود موسیٰ و ہارون علیہما السلام پھر اس کے بعد بھی ایک مدت دراز تک یہ سلسلہ اُن میں قائم رکھا۔

وجعلکم ملوکًا ۔ یعنی فرعونیوں کی ذلیل ترین غلامی سے آزادی دلا کر ان کے اموال و املاک پر قابض کیا اور اس سے پہلے تم ہی میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزائن اور سلطنت پر کیسا تسلط عطا فرمایا۔ پھر مستقبل میں بھی حضرت داؤد اور سلیمان جیسے پیغمبر اور بادشاہ پیدا کیے گویا دین اور دنیا دونوں کی اعلیٰ نعمتوں سے تم کو سرفراز کیا۔ کیونکہ دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب نبوت اور دنیوی اقبال کی آخری حد آزادی اور بادشاہت ہے یہ دونوں چیزیں مرحمت کی گئیں۔

و اٰتاکم ما لم یؤت احد من العٰلمین : یعنی اس وقت جب موسیٰ علیہ السلام یہ خطاب فرما رہے تھے، بنی اسرائیل پر تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ نوازشیں ہوئیں۔ اور اگر احدًا من العالمین کو عموم پر رکھا جائے۔ تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ امت محمدیہ کی نسبت خود قرآن کی تصریح ہے: کنتم خیر امۃ اُخرجت للناس (آل عمران ع۱۲) اور وکذٰلک جعلناکم اُمۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس (البقرہ ع۱۷)

لہ علامہ حافظ ابن کثیرؒ نے وجعلکم ملوکًا کی تفسیر میں لکھا ہے: کہ تمہیں بادشاہ بنایا یعنی خادم دیئے، بیویاں دیں، گھر بار دیا اور اُس وقت جتنے لوگ تھے اُن سب سے زیادہ نعمتیں تمہیں عطا فرمائیں۔ یہ لوگ اتنا پانے کے بعد بادشاہ کہلانے لگتے تھے۔

حضرت عبداللہ رضؓ بن عمرو رضؓ بن العاص سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا میں فقرآء مہاجرین میں سے نہیں ہوں؟ آپ نے فرمایا تیری بیوی ہے؟ اُس نے کہا ہاں! فرمایا گھر بھی ہے! کہا ہاں ہے۔ کہا پھر تو غنی ہے اُس نے کہا پھر تو میرا خادم بھی ہے۔ آپ نے فرمایا پھر تو تو بادشاہوں میں سے ہے۔ حسن بصری رحؒ فرماتے ہیں کہ سواری اور خادم

لہ تفسیر ابن کثیر پ۶ ص۷۷ (اُردو ترجمہ)

Marfat.com

بادشاہت ہے بنی اسرائیل ایسے لوگوں کو بادشاہ کہا کرتے تھے۔ امام قتادہؒ کا قول ہے کہ خادموں کا رواج سب سے پہلے بنی اسرائیل میں ہی ہوا تھا۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ جس کے پاس خادم، سواری اور بیوی ہے وہ بادشاہ ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ اُس کا جسم صحیح سالم ہو اُس کا نفس امن و امان میں ہو اور اتنا مال بھی ہو کہ دن بھر کے لئے کافی ہو تو گویا اُس کے لئے کل دنیا سمٹ کر آ گئی۔

لہ بنی اسرائیل پر حجت تمام کرنے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ثابت کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان فرمایا ہے۔ جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گزرا تھا حضرت موسیٰؑ نے انہیں فرعون اور اہل مصر کی ذلت آمیز اور سراسر غلامی سے نجات دلائی تھی اور انہیں آزادی و استقلال بخشا تھا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود وہ لوگ اُن کی نافرمانی کرتے اور ان کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ یہ واقعہ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو جائے کہ حق کا مقابلہ کرنا اُس کے سامنے اکڑنا اُن کے اخلاق میں داخل ہے۔ جو بزرگوں سے انہیں میراث میں ملا ہے اور اُن کی فطرت میں رچ گیا ہے۔ اگر وہ آپؐ کی دعوت کا انکار کرتے ہیں تو کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی اور قوموں کے اخلاق اور جماعتوں کے حالات کا مزید علم بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ: **لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید** ۝ اگر تم شکریہ ادا کرو گے تو میں اور نعمتیں دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو پھر میری سزا بھی بہت سخت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی تین نعمتوں کو ان کے سامنے کھول کر بیان فرمایا اور اُن سے شکریہ ادا کرنے کا مطالبہ فرمایا ہے۔ وہ تین قسم کی نعمتیں یہ ہیں۔

۱۔ پہلی نعمت نبوت ہے جو نہایت اعلیٰ اور عظیم القدر ہے۔ علامہ ابن جریرؒ طبری نے بیان کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ پر جانے والے ستر آدمی سب کے سب نبی ہوئے تھے اور مشہور بات یہ ہے کہ اہل کتاب کے ہاں نبوت سے مراد اسلام کی اصطلاحی نبوت ہی نہیں بلکہ بذریعہ کشف و الہام بعض آنے والے غیبی امور کا بیان بھی اس میں داخل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے سب نبی بشمول عیسیٰ مسیحؑ

لہ تفسیر الراغی ج ۶ ص ۸۸، تفسیر المنار ج ۶ ص ۳۲۱، ۳۲۴

Marfat.com

تورات پر عمل کرتے تھے۔ اور اُسی کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔

ب۔ دوسری نعمت آزادی و استقلال ہے۔ جسے یہاں بادشاہت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اپنے امور کا خود مالک ہونا اور معاملات کا آزادانہ فیصلہ کرنا یقیناً بادشاہت ہی کہلانے کے قابل ہے۔ اور اس لفظ میں اس نعمت کی جو تعظیم ہے وہ واضح ہے۔ مرفوع احادیث میں آچکا ہے کہ اُن کے ہاں بادشاہ کا لفظ اُس پر بولتے تھے جو شادی شدہ ہو اور اُس کے پاس اپنی سواری اور خادم موجود ہو اور اس میں شک نہیں کہ جسے بادشاہوں کی مانند راحت و چین مہیا ہو، خود مختار ہو، وہ بادشاہ کہلانے کا حقدار ہے عام محاورے میں بھی ایسے شخص کو بادشاہ کہا جاتا ہے۔

ج۔ تیسری نعمت یہ ہے کہ اُس زمانے کے جابر و ظالم بادشاہوں کے غلام قبائل و جماعات کے مقابلے میں بنی اسرائیل کو بہت سی نعمتیں مہیا تھیں جو کسی اور کو میسّر نہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سمندر سے راستہ بنایا، ان کے دشمن کو تباہ کیا، اس کے مال و متاع کا انہیں وارث بنایا، ان پر من و سلویٰ اتارا اور اُن پر بادلوں کا سایہ کیا۔ وغیرہ وغیرہ[1]

بنی اسرائیل کے تفصیلاً بیان کئے جانے والے قصوں میں سے ایک یہ ہے۔ اس کے تفصیلی بیان میں کچھ حکمتیں ہیں۔

۱۔ بنی اسرائیل پہلی قوم ہے۔ جس نے مدینہ اور پھر جزیرۂ عرب میں دعوتِ اسلامیہ کا مقابلہ دشمنی، مکاری اور جنگ سے کیا تھا۔ وہ پہلے دن سے ہی جماعت مسلمہ کے شدید جنگی دشمن تھے۔ یہی تھے جنہوں نے مدینہ میں نفاق اور منافقوں کو اپنی گود میں پالا تھا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُن کی مکارانہ امداد کی تھی اور یہی وہ قوم تھی جس نے مسلم جماعت میں مخالفانہ پروپیگنڈا، مکر و فریب اور خفیہ چالوں کا جال پھیلایا۔ اُنہوں نے شبہات، شکوک اور تحریفات، اسلامی عقیدے اور قیادت کے خلاف پھیلائیں۔ اور یہ سب کچھ خفیہ طور پر کرتے رہے، کبھی اپنا چہرہ سامنے نہیں ہونے دیا۔ پس ضروری تھا کہ مسلم جماعت کے سامنے انہیں ننگا کیا جائے تاکہ وہ معلوم کرلیں کہ

——— ان کے اصلی اور شدید دشمن کون ہیں؟ ان کی فطرت کیسی ہے؟ ان کے وسائل و ذرائع کیا ہیں؟ اور وہ معرکہ جس میں مسلمان اُن کے خلاف کھڑے ہیں اُس کی حقیقت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کو یہ بھی علم تھا کہ اسلامی تاریخ میں اسلام اور اہل اسلام کے سب

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۲۴، ۱۲۵۔

Marfat.com

سے بڑے دشمن یہی لوگ ثابت ہونگے۔ جیسا کہ وہ اپنے سارے زمانۂ ماضی میں بھی ہدایت الٰہی کے دشمن رہ چکے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کا معاملہ کھول کر رکھ دیا۔ اور اُن کے وسائل مسلمانوں کے سامنے ننگے کر دیئے۔

ب۔ بنی اسرائیل آخری الٰہی دین سے قبل والے آخری دین کے ماننے والے تھے۔ اسلام سے قبل انکی ایک لمبی تاریخ تھی۔ ان کے عقیدے میں انحرافات واقع ہو چکے تھے۔ وہ بار بار عہد خداوندی کو توڑ چکے تھے۔ اس عہد شکنی اور انحراف کے آثار اُن کی زندگی کا جزو بن گئے تھے اور ان کی روایات و اخلاق میں رچ بس گئے تھے۔ امتِ مسلمہ جو آخری رسالت کی وارث اور آخری دین کامل کی علم بردار تھی، ضروری تھا کہ وہ ان لوگوں کی تاریخ کو جانتی ہو۔ اس کے ادنیٰ نتیجے سے آگاہ ہو۔ راستے کے نشیب و فراز سے واقف ہو جس کے نتائج و عواقب بنی اسرائیل کی زندگی اور اخلاق میں عملی طور پہ نظر آ رہے تھے۔ ان تجربات کا حاصل ہونا اسلامی جماعت کے لئے لازم تھا۔ تاکہ اُن سے وہ فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی نفع پہنچائے شیطانی وساوس، راستے کی گھاٹیوں اور انحرافات کے نتائج سے بچ کر رہے۔

ج: بڑی طویل مدت میں بنی اسرائیل کا تجربہ بہت لمبا اور عبرتناک تھا۔ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ اُمتوں پر جب زیادہ عرصہ گزر جاتا ہے۔ تو ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگ منحرف ہو جاتے ہیں وہ یہ بھی جانتا تھا کہ امتِ مسلمہ کی مدت قیامت تک ہے۔ لہٰذا ان میں بنی اسرائیل جیسے واقعات اور فترات ضرور پیش آئیں گے سو اُس نے اس امت اور اُس کے لیڈروں کے سامنے اور دعوتِ اسلامیہ کی تجدید کرنے والوں کے سامنے اُن مصائب و مہالک کو کھول کر رکھ دیا جن سے قوموں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ اُس سے بیماری کی طبیعت کو جان سکیں اور اُس کا مناسب علاج کر سکیں۔ کیونکہ ہدایت و استقامت کے خلاف سب سے زیادہ نافرمانی کرنے والے وہ قلوب ہیں جو جان بوجھ کر انحراف کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ غافل اور کچے دل قبول دعوت کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں کیونکہ دعوتِ اسلامی انہیں از سرِ نو ہلا دیتی ہے اور ان کی جھجک اور رکاوٹ کو دور کر دیتی ہے۔ لیکن جن دلوں کو اس سے قبل پکارا جا چکا ہو اُن کے لئے دوسری پکار میں کوئی جدت نہیں ہوتی اور ان میں کوئی آمادگی اُس دعوت کے لئے نہیں پائی جاتی۔ اسی لئے وہ زیادہ جدوجہد اور طویل صبر کے محتاج ہوتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام اس قوم کو کئی جگہوں میں متعدد بار آزما چکے تھے اس لئے اُن کی تقریر سے صاف ٹپکتا ہے کہ انہیں اس گروہ کے تردد اور الٹے پاؤں پھر جانے کا شدید خطرہ تھا۔ وہ

Marfat.com

انہیں ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد اہل مصر کی غلامی سے چھڑانے اور مصر سے نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ انہیں قدم قدم پر اس قوم کی ذلت اور پست ہمتی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آزاد ہوتے ہی انہوں نے بت پرستی کا مطالبہ کر دیا تھا ان کی چالیس دن کی غیبت میں انہوں نے مختلف دھاتوں سے بنا ہوا سامری کا بچھڑا بڑے ذوق شوق سے پوجا تھا۔ ان پر بے شمار انعامات ہوئے تھے۔ مثلاً صحرا میں پانی کا ملنا، بادلوں کا سایہ، من و سلویٰ وغیرہ مگر انہوں نے پھر ساگ پات اور لہسن پیاز کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ انہیں گائے کو ذبح کرنے کے قصہ میں بھی آزما چکے تھے اور تورات پر عمل کا عہد کر کے اُسے توڑ ڈالنے میں بھی اُن کا امتحان ہو چکا تھا۔

اتنے مواقع پر آزمانے کے بعد اب موسیٰؑ ان کو لے کر ارضِ مقدس کے دہانے پر کھڑے تھے۔ یہی سرزمین جس کا وعدہ تھا اور جس کی خاطر وہ مصر سے نکلے تھے۔ اسی لئے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس تقریر میں ان بڑے بڑے انعامات کا ذکر کیا اور انہیں اس سرزمین میں داخل ہونے کو فرمایا:۔

لیکن بنی اسرائیل پھر بنی اسرائیل ہی تھے! وہ نامردی، سستی، عہد شکنی، انحراف اور وعدہ خلافی کا مجموعہ تھے۔ اس لئے انہوں نے موسیٰؑ کی بات سن کر نہ دی بلکہ الٹی حجت بازی شروع کر دی۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ

اے میری قوم! داخل ہو جاؤ اس پاک زمین جو مقرر کر دی

كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ

ہے کتاب اللہ نے تمہارے لئے اور نہ لوٹو اپنی پیٹھ کی طرف

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا

ورنہ تم نقصان میں جا پڑو گے۔ وہ بولے اے موسیٰ وہاں

قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى

ایک زبردست قوم ہے۔ اور ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے جبتک کہ وہ

يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝

وہاں سے نکل نہ جائیں پھر اگر وہ وہاں سے نکل جائینگے تو ہم ضرور داخل ہونگے

Marfat.com

کتب اللہ لکم حضرت ابراہیمؑ سے خدا کا وعدہ ہو چکا تھا کہ تیری اولاد کو یہ ملک دیا جائے گا۔ وہ وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ پس خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھوں پر پورا ہو۔

ولا ترتدوا الخ یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں بزدلی اور پست ہمتی دکھا کر غلامی کی زندگی کی طرف مت بھاگو۔

قوما جبارین : بہت قوی ہیکل، تنومند اور پُر رعب لوگ وہاں بستے ہیں۔

وانا لن ندخلها الخ:۔ یعنی مقابلہ کی ہم میں ہمت نہیں۔ ہاں بدون ہاتھ پاؤں ہلائے پکی پکائی کھالیں گے۔ آپ معجزہ کے زور سے انہیں نکال دیں!

ارض مقدسہ اس سرزمین کو اس لئے کہا گیا ہے کہ بت پرستی اور شرک سے پاک و صاف تھی کیونکہ اس میں بہت سے نبی توحید الٰہی کے داعی اٹھے تھے۔ معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ ارض مقدس عریش سے فرات تک تھی۔ بعض لوگ اس کے شمالی حصے کو سوریہ (شام) اور باقی کو فلسطین کہتے ہیں۔ اسی کا نام بلاد القدس، ارض مقدسہ یا وعدہ کی سرزمین تھا۔ کیونکہ اللہ نے ابراہیمؑ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ زمین اُن کی اولاد کو دی جائے گی۔

موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد کو اس سرزمین میں رہائش کا حق دیا جائے گا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ لوگ بلا شرکت غیرے اس سرزمین کے مالک و حاکم ہوں گے۔ کیونکہ یہ چیز تو واقعات کے خلاف ہے اور اللہ اپنے وعدوں سے کبھی نہیں پھرتا۔ پس اس وعدے سے آج کل کے یہود کا یہ استنباط کہ وہ حکومت اور اس سرزمین کی ملکیت انہیں دوبارہ ملنی ناگزیر ہے، صحیح نہیں ہے۔ یعنی اول تو وعدے کا تعلق اُس زمانے سے تھا جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے دوسرے وعدے کا تعلق صرف حق سکونت و رہائش سے تھا نہ کہ حکومت و بادشاہت کے ساتھ۔) اس وعدے کی صراحت تورات کی کتاب پیدائش میں موجود ہے کہ جب ابراہیمؑ کنعانیوں کی سرزمین پہ گزرے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے اس سرزمین کے ان کی اولاد کو دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔

لہ فوائد القرآن صـ۱۴۲ لہ المراغی ج ۶ صـ۹۰، ۹۲، المنار ج ۶ صـ۳۲۴، ۳۲۳

Marfat.com

(وعدہ ابراہیمؑ کی اولاد سے تھا چاہے اسماعیلؑ کی شاخ سے ہو یا اسحاقؑ کی ذریت سے، پس عرب نے جو اس سرزمین پر قبضہ کیا تو یہ بھی اس وعدہ میں داخل ہے) کیونکہ عرب بھی اسماعیلؑ کی وساطت سے ابراہیمؑ کی اولاد ہیں!)

جبار لغت میں لمبے تڑنگے، متکبر، مغرور اور سرکش کو کہتے ہیں جو دوسروں کو مغلوب کرے۔ لمبی کھجور کو نخلہ جبارہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا پھل آسانی سے ہاتھ نہیں آتا اور وہ دوسرے درختوں پر غالب ہوتی ہے اُس زمانے میں اس سرزمین میں بنی عناق رہتے تھے۔ جو بڑے جنگ جو، طویل قد و قامت کے اور بھاری جسم کے لوگ تھے۔ اسرائیلی روایتوں میں ان کے متعلق بہت سی خلافِ عقل و نقل باتیں آئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ موسیٰؑ نے جو بارہ جاسوس اُس سرزمین میں بھیجے تھے۔ ان سب کو ایک جبار نے پکڑ لیا اور اپنی چادر میں لپیٹ کر گٹھڑی بنالی۔ نیز ایک جبار نے ایک جاسوس کو پکڑ کر اپنی آستین میں رکھ لیا۔ وغیرہ یہ قصہ توراۃ کے چوتھے سفر میں تفصیل سے مذکور ہے اور اس میں بھی اسرائیل کی دیومالائی روایات کا انبار پایا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل ضعف و ذلت اور پستی و دنائیت کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ بار بار کے وعدوں کے باوجود ان کی کمزوری اور کم ہمتی دور نہ ہوئی وہ اپنے بدنی اور عقلی قویٰ کو استعمال کرنا نہ چاہتے تھے۔ کسی بلند نظری اور بلند ہمتی کی ان سے توقع نہ رہی تھی۔ وہ تو صرف کرامات اور معجزات پر ہی زندہ رہنا چاہتے تھے اور بلاشبہ جب کسی قوم کی پست ہمتی اور بزدلی یہاں تک پہنچ جائے وہ آزادی و استقلال کے قابل نہیں رہتی اور عزت و شرف کی زندگی سے محروم کر دی جاتی ہے۔

[1] مفسرین نے اس موقع پر اسرائیلی روایتوں سے قوم عمالیق کے متعلق، عجیب و غریب قصے بیان کئے ہیں۔ ان لوگوں میں سے ایک عوج بن عنق ابن آدمؑ بتایا جاتا ہے جس کا قد ۳۳۳ گز بیان کیا گیا ہے اور اس کے جسم کی چوڑائی تین گز بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ سب باتیں واہیات ہیں ان کے ذکر سے ہی حیا روکتی ہے اور یہ صحیح احادیث کے خلاف ہیں۔ اسرائیلی روایتیں کہتی ہیں کہ عوج بن عنق کافر اور دلدالزنا تھا۔ طوفانِ نوح کے وقت زندہ تھا۔ لیکن طوفان کا پانی، اس کے گھٹنوں تک بھی نہ پہنچا تھا۔ یہ بھی محض لغو اور جھوٹ ہے بلکہ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق کوئی کافر طوفانِ نوح سے نہیں بچا تھا۔ تعجب ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق نوحؑ کا کافر بیٹا تو بچ نہ سکے اور عوج بن عنق کافر دلدالزنا بچ جائے (استغفر اللہ)

[1] ابن کثیر پ ۶ ص ۸۷ (اردو)

Marfat.com

ط سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں کہ قالوا یا موسیٰ ان فیھا قوماً جبارین الخ کی آیت میں یہود کی جبلّت تکلف کے کسی خوبصورت اور باریک سے باریک پردے کے بغیر کھُل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس موقع پر وہ خطرے کے بالکل سامنے ہیں۔ اس لئے یہاں تکلف کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ اور اظہارِ شجاعت کا بھی سوال نہیں ہے۔ خطرہ بالکل سر پہ کھڑا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کا واضح وعدہ بھی انہیں اس سے نجات نہیں دلا سکتا، وہ چاہتے ہیں کہ سستی مدد مل جائے، خود بخود ملک فتح ہو جائے اس کی کوئی قیمت ادا کرنا اور اُس کے لئے کوئی سعی کرنا نہیں چاہتے۔ بس من و سلویٰ کی طرح مدد اوپر ہی سے نازل ہو جائے ع ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا آئے!

لیکن خدا کی مدد کوئی مخول نہیں ہے وہ یوں نہیں آیا کرتی۔ جس طرح اُسے وہ بلانا چاہتے ہیں۔ جب دل ایمان سے خالی ہوں تو مدد کیسے پہنچے اور جب اُس کے لئے کچھ نہ کیا جائے تو فتح کیونکر حاصل ہو جائے؟

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ

کہا (دو مردوں) نے جو خدا کا خوف رکھنے والوں میں سے تھے۔ کہ ان پر

اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا

خدا کی نوازش تھی۔ ان پر حملہ کرکے دروازے گھس جاؤ۔ پھر جب تم

دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۝۵ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا

اس میں گھس جاؤ گے۔ تو تم ہی غالب ہو گئے۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۲۳

اگر تم یقین رکھتے ہو

(۱) (۱۴)

۲۳ یہ دو شخص یوشعؑ بن نونؑ اور کالبؑ بن یوفنا تھے۔ جو خدا سے ڈرتے تھے۔ اس لئے عمالقہ وغیرہ کا کچھ ڈر اُن کو نہ رہا ۔

ط فی ظلال القرآن ج ۶ صـ۱۲۷۔

ط فوائد القرآن صـ۱۴۳۔

Marfat.com

ہر کہ ترسد از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

ان دو نے کہا کہ اے بنی اسرائیل ہمت کر کے شہر کے پھاٹک تک تو چلو۔ پھر خدا تم کو غالب کرے گا۔ خدا اُسی کی مدد کرتا ہے جو خود بھی اپنی مدد کرے۔ آیت سے معلوم ہوا کہ اسباب مشروعہ کو ترک کرنا توکل نہیں۔ توکل یہ ہے کہ کسی نیک مقصد کے لئے انتہائی حد درجہ جہد کرے پھر اس کا نتیجہ خدا پر چھوڑ دے۔ اپنی کوشش پر نازاں اور مغرور نہ ہو۔ باقی اسباب مشروعہ کو چھوڑ کر خالی امیدیں باندھتے رہنا توکل نہیں، بلکہ تعطل (بیکاری) ہے۔

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بھیجے ہوئے جاسوسوں کی بنی اسرائیل سے گفتگو اور بنی اسرائیل کی بزدلی اور ضد کی تفصیل موجودہ تورات کی کتاب گنتی کے چودھویں باب میں تفصیل سے مذکور ہے اس میں لکھا ہے۔ کہ دو سچے ایماندار جاسوسوں کی پوری کوشش کے باوجود بنی اسرائیل دس بزدل جاسوسوں کے بھڑے میں آگئے اور کسی قیمت پر آگے جانے کو آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ مصر سے نکلنے پر پچھتائے۔ موسیٰ علیہ السلام کو برا بھلا کہا اور واپسی کا ارادہ کر لیا۔ پھر یہ بھی مشورہ کرنے لگے کہ موسیٰ اور اُن کے مخلص ساتھیوں کو پتھروں سے مار ڈالیں اور سارا فتنہ پاک کر دیں۔

[2] حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے اس حال کو سامنے رکھ کر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کو دیکھئے کہ کس طرح جنگ بدر میں موت کے منہ میں خوشی خوشی گھس جاتے ہیں۔ کس طرح تمام جنگوں میں اپنے مقتداء کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں لڑے، اپنی اولادوں کو مرواتے اور اپنا خون بہاتے ہیں۔ سعدؓ بن معاذ انصاری نے جنگ بدر کے مشورہ میں جو تقریر کی تھی اسے پڑھیئے، سعدؓ کھڑے ہو کر کہنے لگے یا رسول اللہؐ! آپؐ کا ارادہ (شاید ہمارا (انصار) منشاء معلوم کرنے کا ہے۔ سنئے یا رسول اللہؐ! اللہ کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اگر آپؐ ہمیں سمندر کے کنارے کھڑا کر کے فرمائیں کہ اس میں کود جاؤ تو ہم بے پس و پیش کود جائیں گے آپؐ دیکھیں گے کہ ہم میں سے کوئی بھی نہ ہوگا۔ جو کنارے پر کھڑا رہ جائے۔ حضورؐ! آپؐ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں ہمیں شوق سے لے چلئے۔ آپؐ دیکھ لیں گے کہ ہم لڑائی میں صبر اور ثابت قدمی دکھانے والے لوگ ہیں۔ آپؐ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہم خدا کی ملاقات کو سچ جاننے والے لوگ ہیں۔ آپؐ اللہ کا نام لے کر اٹھئے۔ ہمیں دیکھ کر، ہماری بہادری اور استقلال کو دیکھ کر انشاء اللہ آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲۲۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۷۹

Marfat.com

مقداد بن رضؓ اسود انصاری نے تقریر کرتے ہوئے کہا: یا رسول اللہ آپؐ ہماری سننا چاہتے ہیں تو سنئے ہم موسیٰؑ کی قوم نہیں جو کہیں گے کہ جا تو اور تیرا خدا جا کر لڑو ہم یہاں بیٹھیں گے۔ بلکہ ہمارا جواب یہ ہے کہ آپؐ خدا کی مدد لے کر جہاد کے لئے چلئے۔ ہم جان و مال سے آپؐ کے ساتھ ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے ان دو سچے مومنوں یعنی یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا (یفنہ) کے متعلق فرمایا ہے کہ ان کے دل میں خوفِ خدا تھا اور خدا کا ان پر احسان تھا۔ وہ احسان کیا تھا؟ ایمان کی پختگی اور خدا کے وعدوں کا سچا یقین جو ان کی تقریر سے ظاہر ہے کہ اگر تمہارے اندر ایمان اور ثابت قدمی ہے تو یقیناً خدا کے وعدے پورے ہو کر رہیں گے۔

آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ "ان ڈر جانے والوں میں سے دو آدمی جن پر خدا کا احسان تھا، بولے الخ

یعنی باقی بنی اسرائیل تو غیر اللہ کے خوف سے کانپ رہے تھے مگر یہ دو مانتے الایمان شخص خدا کے فضل سے ثابت قدم رہے اور قوم کو جہاد پر ابھارنے لگے۔ یا یوں کہئے کہ ڈرنے والوں میں یہ بھی داخل تھے یعنی طبعی خوف تو انہیں بھی تھا۔ مگر ایمان اور شجاعت کا جذبہ اس خوف پر غالب آ چکا تھا۔

کوفی قراء کے علاوہ دوسرے حضرات کے نزدیک غالبون پر بھی آیت کا نشان ہے جیسے ہمارے ہاں کے مصاحف میں اس نشان ۵ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس قسم کا یہ تیسرا مقام ہے۔ دو پہلے گزر چکے ہیں۔

ایمان باللہ اور خوفِ خدا کی قیمت اس مقام پر کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ان دو خوفِ خدا رکھنے والوں کے دل میں اتنی شجاعت پیدا ہو گئی ہے۔ کہ جبارین کا خوف پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ وہ ان کے خوف کو ٹھکرا رہے ہیں انہیں اتنی شجاعت حاصل ہو چکی ہے کہ خطرہ سامنے ہونے پر بھی وہ نہیں لرزتے۔ وہ سختی کی گھڑی میں ایمان کی قیمت کی گواہی پیش کر رہے ہیں۔ اور جس دل میں خوفِ خدا سما جائے وہ لوگوں سے کیا ڈرے گا؟ اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں دو خوف جمع نہیں کرتا۔ یا اُس کا خوف ہو گا یا دوسروں سے ڈر ہو گا! جو اُس سے ڈرے گا وہ کسی اور سے نہیں ڈرے گا۔

---

[1] المراغی ج ۶ ص ۹۲، المنار ج ۶ ص ۳۳۴

[2] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۲۷، ۱۲۸

Marfat.com

داؤں کے علم میں اور لڑائیوں کے باب میں قاعدہ یہی ہے کہ اگر فتح چاہتے ہو تو اقدام کرو اور بے خطر گھس جاؤ! جن کے علاقے میں تم گھس پڑو گے اُن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ جتنا کہ تمہارا دل مضبوط ہوگا! اُن کی روحیں کانپ جائیں گی اور تم غالب آجاؤ گے۔ یہی اصول تھا۔ جس کا اظہار اُن دو مومن مردوں نے کیا تھا۔

ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غالبون ۝

پھر انہوں نے توکل اور ایمان کا رشتہ واضح کیا:۔

مومن کا بھروسہ فقط اللہ پر ہوتا ہے۔ یہ ایمان کی علامت اور اُس کی خاصیت ہے، ایمان کی منطق اور اس کا تقاضا ہے۔ مگر آہ! یہ بات وہ کس سے کہہ رہے ہیں؟ بنی اسرائیل سے!!!

قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا

انہوں نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز نہ اس میں داخل ہونگے کبھی بھی جب تک وہ

فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا

اس میں رہیں گے۔ سو تو جا اور تیرا رب تم دونوں لڑو۔ ہم تو

هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ

یہیں بیٹھے ہیں موسیٰ نے کہا اے میرے رب میرے

اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ

اختیار میں نہیں مگر میری جان اور میرا بھائی سو تو جدائی کر دے ہم میں اور اس

الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ

نافرمان قوم میں فرمایا بلاشبہ وہ زمین ان پر حرام

عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ

کی گئی ہے چالیس برس سرگرداں پھریں گے ملک میں

فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ ع

سو تو افسوس نہ کر نافرمان لوگوں پر

Marfat.com

لہ قالوا موسٰی ..... قاعدون : یہ اُس قوم کا مقولہ ہے جو خدا کے بیٹے اور محبوب ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ مگر یہ گستاخانہ کلمات اُن کے مستمر تمرّد طغیانی سے کچھ بھی بعید نہیں (یعنی وہ نہایت ڈھٹائی سے دھرنا مار کر بیٹھ گئے اور نہایت لاپروائی اور بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے بولے کہ لڑنا ہے تو تم لڑو اور تمہارا خدا۔ ہم سے تو یہ کام ہونے کا نہیں!)

لہ املک الا نفسی واخی : حضرت موسیٰ نے سخت دلگیر ہو کر یہ دعا فرمائی۔ چونکہ تمام قوم کی عدول حکمی اور بزدلانہ عصیان کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اس لئے دعا میں بھی اپنے اور ہارون علیہ السلام کے سوا، کہ وہ بھی نبی معصوم تھے، اور کسی کا ذکر نہیں کیا۔ یوشع اور کالب بھی دونوں نبیًا ان کے ساتھ آ گئے۔

قال فانها محرمة علیهم الخ یعنی جدائی کی دعا سنی اور ظاہری طور پہ تو قبول نہ ہوئی۔ ہاں معنوی جدائی ہو گئی کہ وہ سب تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر حیران و سرگرداں پھرتے تھے اور حضرت موسیٰ اور ہارون پیغمبرانہ اطمینان اور پورے قلبی سکون کے ساتھ اپنے منصب اصلاح و ارشاد پر قائم رہے۔ جیسے کسی بستی میں عام وبا پھیل پڑے اور ہزاروں بیماروں کے مجمع میں دو چار تندرست اور قوی القلب ہوں جو اُن کے معالجہ چارہ سازی و تفقد احوال میں مشغول رہیں۔ اگر فَافْرُقْ بَيْنَنَا کا ترجمہ "جدائی کر دے" کی جگہ "فیصلہ کر دے" ہوتا تو یہ مطلب زیادہ واضح ہو جاتا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ: یہ سب قصہ اہل کتاب کو سنایا اس پر کہ تم پیغمبر آخرالزمان کی رفاقت نہ کرو گے۔ جیسے تمہارے اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رفاقت چھوڑ دی تھی، اور جہاد سے جان چرا بیٹھے تھے تو یہ لعنت اولاد کو نصیب ہو گی۔ چنانچہ نصیب ہوئی۔

ایک لمحہ کے لئے اس سارے رکوع پر غور کیجئے اور اُمّتِ محمدیہ کے احوال کو سامنے لائیے۔ ان پر خدا کے وہ انعامات ہوئے جو نہ پہلے کسی اُمّت پر ہوئے نہ آئندہ ہوں گے۔ ان کے لئے خاتم الانبیاء سید المرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ابدی شریعت دے کر بھیجا۔ ان میں وہ علماء اور آئمہ پیدا کئے۔ جو باوجود غیر نبی ہونے کے انبیاء کے وظائف کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔ اب یہی خلفاء نبی علیہ السلام کے بعد اُمّت کے قائد بنے۔ جنہوں نے سارے جہان کو اخلاق اور

لہ فوائد القرآن ص ۱۴۱

Marfat.com

اصولِ سیاست وغیرہ کی ہدایت کی۔ اس امت کو بھی جہاد کا حکم ہوا۔ عمالقہ کے مقابلہ میں نہیں۔ روئے زمین کے تمام جبارین کے مقابلہ میں، محض سرزمین شام فتح کرنے کے لئے نہیں، بلکہ شرق و غرب میں کلمۃ اللہ بلند کرنے اور فتنہ کی جڑ کاٹنے کے لئے بنی اسرائیل سے خدا نے ارضِ مقدس کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس اُمت سے یہ فرمایا:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (النور)

بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام نے جہاد میں پیٹھ پھیرنے سے منع کیا تھا۔ تو اس اُمت کو بھی خدا نے اس طرح خطاب کیا: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (الانفال)

انجام یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے رفقاء تو عمالقہ سے ڈر کر یہاں تک گذرے کہ "اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ" جا تو اور تیرا خدا جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں! لیکن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ "خدا کی قسم اگر آپؐ سمندر کی موجوں میں کُھس جانے کا حکم دیں گے تو ہم اُس میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے علیحدہ نہیں رہے گا اُمید ہے کہ خدا آپ کو ہماری طرف سے وہ چیز دکھلائے گا۔ جس سے آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ ہم اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ ہو کر اُس کے داہنے بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرف جہاد کریں گے۔ خدا کے فضل سے ہم وہ نہیں ہیں۔ جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ"

اسی کا نتیجہ ہے کہ جتنی مدت بنی اسرائیل فتوحات سے محروم ہو کر "وادیٔ تیہ" میں بھٹکتے رہے، اُس سے کم مدت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ نے مشرق و مغرب میں ہدایت و ارشاد کا جھنڈا گاڑ دیا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ذالک لمن خشی ربہ۔

توراتؑ کی کتاب عدد (گنتی) کے باب ۱۴ میں ہے: "تب ساری جماعت چلّا کے روئی اور لوگ اس رات بھر روتے رہے۔ پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ پر گڑگڑائے کہ اے کاش ہم مصر میں مر جاتے..... خداوند کس لئے ہمیں اس زمین میں لیا ہے، الخ
تب انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ آؤ اپنا ایک سردار بنا لیں اور مصر کو پھر چلیں

لہ تفسیر حقانی جزء ۴ ص ۲۴، ۲۵۔

Marfat.com

مُوسیٰ ؑ اور ہارونؑ تمام بنی اسرائیل کے مجمع کے سامنے زمین پر اوندھے گر پڑے اور نون کے بیٹے یشوع اور یفنہ کے بیٹے کالبؔ نے، جو اُس زمانے میں اُس زمین کی جاسوسی کرنے والے لوگوں میں سے تھے، اپنے کپڑے پھاڑے اور ساری جماعت بنی اسرائیل کو کہا کہ وہ زمین جہاں ہم جاسوسی کے لئے گئے تھے، خوب زمین ہے۔ اگر ہم سے خدا راضی ہے تو ہم کو اس زمین پہ لے جائے گا۔ مگر تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ تم وہاں کے لوگوں سے ڈرو۔ وہ تو تمہاری خوراک ہیں۔ اُن کا سایہ اُن سے جا چکا ہے۔۔۔۔ تب ساری جماعت نے کہا کہ ان پہ پتھراؤ کرو۔ اُس وقت جماعت کے خیمہ میں سارے بنی اسرائیل کے سامنے خدا کا جلال نمایاں ہُوا۔ خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ یہ لوگ کب تک مجھے غصہ دلائیں گے۔ اور کب تک میری نشانیوں کا جو انہیں دکھائیں انکار کریں گے۔ میں انہیں وبا سے ماروں گا اور انہیں خارج کر دوں گا۔ ان کے بدلے تجھے اور قوم دوں گا۔ موسیٰ ؑ نے کہا کہ اگر یہ خبر مصر والے سُنیں گے تو کہیں گے کہ خدا نے بیابان میں انہیں ہلاک کر دیا۔ سو میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو اپنی رحمت سے اس اُمت کا گناہ بخش دے۔ خداوند نے فرمایا میں نے تیرے کہنے سے بخشا پر مجھے اپنی حیات کی قسم جیسا تم نے غصہ دلایا اور سنا کے کہا میں تم سے ویسا ہی کروں گا۔ تمہاری لاشیں سب کی بیس برس والے سے لے کر اوپر والے تک جنہوں نے میری شکائتیں کیں، اس بیابان میں گریں گی۔ تم بے شک اس زمین پر نہ پہنچو گے۔ جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ بجز یوشع اور کالبؔ کے اور تمہارے لڑکوں کے جن کے حق میں تم کہتے ہو کہ وہ لٹ جائیں گے۔ میں ان کو داخل کروں گا اور تمہاری لاشیں اس بیابان میں گریں گی۔ اور تمہارے لڑکے اس بیابان میں چالیس برس تک بھٹکتے رہیں گے ان دنوں کے شمار کے موافق جن میں تم اُس زمین کی جاسوسی کرتے تھے جو چالیس دن ہیں۔ دن پیچھے ایک سال ہوگا۔"

چنانچہ اس قرن کے لوگ دنتاً فونتاً دبا اور قتل سے ہلاک ہوئے۔ حتیٰ کہ اس چالیس سال کے عرصے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے ان کے بھائی ہارون علیہ السلام دو بلعم بیر دن کے اُسی پار جان بحق ہوئے جب یہ چالیس برس تمام ہوئے تو یہ سب لوگ گزر گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قائم مقام اُن کا بھانجا اور خلیفہ یوشع بن نون ہُوا تو خدا نے نئی نسل بنی اسرائیل کو یملک شام عطا کیا۔

یَتِیْهُوْنَ: کا مادہ تیہ ہے جس کا معنیٰ ہے حیرانی اور سرگردانی تیہ اُس سرزمین کو بھی کہتے ہیں۔ جس میں آدمی کو راستہ نہ ملے۔ یہ سرزمین بحیرہ قلزم سے جانب مشرق بیابان قادیہ اور عرب کا شمالی اور مغربی گوشہ دریائے یردن تک یعنی شام کے کنارے تک کئی سو کوس کا وسیع میدان ہے وہاں اُس زمانے میں کہیں کہیں پہاڑیوں اور شاداب جگہوں میں کچھ اور

Marfat.com

تو میں بھی رہتی تھیں۔ جن سے بنی اسرائیل کو جنگ و جدال کا اتفاق پڑ جاتا تھا۔ خدا کی قدرت تھی کہ شام کے ملک میں پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر دو چار منزل چل کر پھر بھول بھٹک کر وہیں آجاتے تھے[1]

[1] علامہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر ابر کا سایہ ہوتا، من و سلویٰ اترتا، ایک ٹھوس پتھریلی چٹان سے بارہ چشمے جاری ہو جاتے اور کئی دیگر معجزات بنی اسرائیل نے اس وادی تیہ میں دیکھے۔ یہیں تورات اتری اور کئی اور عظیم واقعات پیش آئے۔

[2] بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے جو بے ادبی اور گستاخی و جفاکاری کا سلوک کیا تھا یہ ان جیسے لوگوں سے بعید نہ تھا۔ کیونکہ انہوں نے بچھڑا پوجا تھا۔ نبیوں سے بدسلوکیاں کی تھیں بلکہ کئی ایک کو تو قتل بھی کر ڈالا تھا مثلاً اشعیاءؑ اور زکریا یحییٰ۔ یہ بڑے فاسد الطبع، سنگدل اور غلیظ الفطرت لوگ تھے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا میں صرف اپنا اور اپنے بھائی ہارونؑ کا نام لیا ہے کہ مجھے اپنے اور اس کے سوا کسی پر کوئی بس نہیں نہ بھروسہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یوشع اور کالب کی ثابت قدمی پر بھی اس وقت پورا بھروسہ نہ تھا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ایک آدمی بڑے لشکر میں تو صبر و جرات دکھائے لیکن کم تعداد لوگوں کے ساتھ ہو کر اس کا حوصلہ چھوٹ جائے موسیٰ کو اس سے قبل فرعون کے مقابلے میں اور دیگر کئی واقعات میں بنی اسرائیل کی بزدلی اور عہد شکنی کا خوب تجربہ ہو چکا تھا۔

فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین : یعنی ہمارے ساتھ وہ سلوک کر جس کے ہم مستحق ہیں۔ اور ان کے ساتھ وہ معاملہ فرما جس کے یہ حقدار ہیں۔ یہ معنیٰ بھی لیا جا سکتا ہے کہ عذاب نازل فرماتے وقت ہمیں ان سے جدا کر لینا۔

محرمۃ علیھم : وہ سرزمین ان پر تکلیف شرعی کے طور پر نہیں بلکہ تحریم فعلی یعنی عملی محرومی کے طور پر حرام کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس عذاب میں ارباب عقل کے لئے عبرت و بصیرت کا سامان موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو قومیں غلامی کی گود میں پلتی ہیں ان کے اخلاق و خصائل بگڑ جاتے ہیں۔ جنگ جوئی ختم ہو جاتی ہے۔ ہر ذلت و مسکنت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ذلت و خواری سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ اور جب غلامی میں ایک طویل عرصہ گزر جائے تو یہ چیزیں اس قوم کی جبلت اور فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ جب وہ اپنے اس ماحول سے باہر نکلیں تو ظلم اور غلامی کے تاریک پردے چھٹ جانے کے بعد

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۸۰ [2] المراغی ج ۶ ص ۹۳، ۹۴ المنار ج ۶ ص ۳۳۴، ۳۳۸

Marfat.com

بھی وہ ذلت وخواری کی طرف جھکتے ہیں۔ اور ذلّت کی زندگی سے مانوس ہو جانے کے باعث پھر اپنی پہلی حالت کی آرزو کرتے ہیں خیر و شر میں سے جس چیز کا بھی انسان عادی ہو جائے اس کے متعلق اُس کا یہی عمل ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ غلامی اور ذلت سے نکل جانے کے بعد جب کبھی کوئی سخت وقت آیا تو بنی اسرائیل نے مصر کو واپسی کی خواہش کی اور میدانِ عمل میں کبھی تنگی ترشی کا سامنا ہوا تو اس کی سخت کا سبب موسیٰؑ اور ان کے مخلص ساتھیوں کو ٹھیرایا۔ اللہ تعالےٰ کو علم تھا کہ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ ان سے وہ وعدہ پورا کیا جائے جو ان کے آباؤ اجداد سے کیا گیا تھا۔ لہٰذا اُس نے ان کی اس نسل کو وادیٔ تیہ میں فنا و برباد کر دیا۔ پھر ایک تازہ دم نسل اٹھی۔ جس نے نئی قیادت کے جھنڈے تلے شام کو فتح کیا۔

[1] بنی اسرائیل کے اس قول سے جو اُنہوں نے مُوسیٰ علیہ السلام نے سامنے بیان کیا تھا۔ معلوم ہو جاتا ہے کہ بزدل اور تھڑدلے انسانوں کا قاعدہ کیا ہوتا ہے؟ وہ کیونکر درپیش آنے والے خطرات سے ڈرتے ہیں اور کانپتے ہیں، گدھوں کی طرح دولتیاں جھاڑتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ بزدلی اور بے عملی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بزدل انسان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے یونہی جھجکتا اور رکتا ہے۔ زبان چلاتا ہے لیکن ہاتھ ہلانا موت کے برابر جانتا ہے۔ نیزہ اور تلوار کا کام زبان سے ہی لینا چاہتا ہے۔

اُنہوں نے فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ کہا۔ گویا وہ ان کا رب ہی نہ تھا جب تک ان پہ انعامات کی بارش کرے تب تک وہ ان کا رب ہے اور جب جہاد و قتال کا حکم دے تو پھر اس کی ربوبیت ختم ہو جاتی ہے۔

انا ھٰھنا قاعدون یعنی ہم نہ حکومت چاہتے ہیں، نہ عزت و آبرو۔ جب ان چیزوں کے لئے لڑنا پڑے تو یہ ہمیں درکار نہیں۔ نہ ہمیں خدا کے وعدے اور وعدہ کی سرزمین سے سروکار ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ لمحہ سخت نازک تھا۔ سوچئے ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟ ساری محنت پر پانی پھرتا نظر آیا۔ خدا کے سارے انعامات کا یہ نتیجہ نکلا کہ قوم اکڑ گئی اس قسم کے انحراف اور ذلالت کی مثال مشکل سے ملے گی! اتنی جدوجہد کے بعد اور اس قدر قربانیوں کے بعد آزادی ملی اور اب دشمن کے دروازے پر لشکر نے جواب دے دیا۔

موسیٰ علیہ السلام کی دلی کیفیت کا اظہار اُن کی دُعا سے خوب ہوتا ہے اس دُعا میں رنج و الم

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۲۸، ۱۴۰۔

Marfat.com

التجاء، اپنی وفاداری کا اظہار اور مومنانہ یقین کے ساتھ منحرف ہونے والوں سے جدائی کی آرزو بھی موجود ہے۔ موسیٰؑ جانتے تھے کہ ان کے پروردگار کو دونوں بھائیوں کے خلوص اور موجودہ بے بسی کا پورا علم ہے۔ پھر انہوں نے اپنے ضعف و مجبوری کے ساتھ ساتھ اسی دعا میں "کلیمانہ ایمان" کا بھی اظہار فرمایا ورست ہے مومن جو صاحب استقامت ہوتا ہے۔ وہ خدا کے سوا کسی کی طرف منہ نہیں پھیرتا۔ اپنے غم و الم اور درد کا اظہار اُسی سے کرتا ہے۔ وہ اپنے اور فاسق و فاجر طاقتوں کے درمیان کامل امتیاز مانگتا ہے۔

خدا کا عہد توڑ ڈالنے والوں کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ نسل و خون، تاریخ اور قدیم روابط اس مقام پر آکر سب ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے ربط و تعلق کی پہلی اور آخری بنیاد "دعوت الی اللہ" ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ مؤمن سے الگ ہے۔ کوئی بھی ہو!

مومن کا طریقہ اور پیغمبر کی سنت یہی ہے۔ مومن اسی نقطے پر جمع ہوتے ہیں اور اسی مقام پر دوسروں سے جُدا ہو جاتے ہیں اُن کا نقطۂ اتصال و افتراق یہی ہے، جنس، نسب، قوم، زبان اور تاریخ کسی ربط پر بھی اجتماع کا مدار نہیں۔ اجتماع کا مرکز ایمان ہے۔ فقط ایمان۔

بچے اور مخلص ایماندار نے اس درس عبرت کو یاد کر لیا تھا۔ اسی لئے غزوۂ بدر میں اصحابؓ رسولؐ نے کہا تھا کہ ہم موسیٰؑ کی قوم کی مانند یہ نہیں کہتے کہ تو اور تیرا خدا جا کر لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں "بلکہ ہم کہتے ہیں! چلئے آپؐ بھی اور آپؐ کا پروردگار بھی لڑیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہو کر دشمنوں سے قتال کریں گے!

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ ۘ إِذْ قَرَّبَا

اور سناؤ ان کو واقعی حال آدم کے دو بیٹوں کا جب دونوں نے کچھ نیاز کی

قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ

تو قبول ہوئی ایک کی اور نہ قبول ہوئی

مِنَ الْآخَرِ ۖ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ ۖ

دوسرے کی اس نے کہا میں تجھ کو مار ڈالونگا

Marfat.com

قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۲۷ لَئِنْ

اس نے کہا اللہ تو پرہیزگاروں سے ہی قبول کرتا ہے اگر تو ہاتھ چلائے

بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ

گا مجھ پر مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر

يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ

مارنے کو میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے

رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۲۸ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِيْ

جو پروردگار ہے سارے جہان کا میں چاہتا ہوں کہ تو حاصل کرے میرا

وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ

گناہ اور اپنا گناہ پھر ہو جائے تو دوزخ والوں میں اور یہی ہے سزا

جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۲۹

ظالموں کی

سلہ یعنی آدمؑ کے دو صلبی بیٹوں قابیل و ہابیل کا قصہ انہیں سناؤ۔ کیونکہ اس قصہ میں ایک بھائی کے دوسرے بھائی کی مقبولیت اور تقویٰ پر حسد کرنے اور اسی غیظ میں اس کو ناحق مار ڈالنے کا ذکر ہے۔ اور ناحق خون کرنے کے عواقب بیان کئے ہیں پچھلے رکوع میں یہ بتلایا تھا کہ بنی اسرائیل کو جب یہ حکم دیا گیا کہ ظالموں اور حرابہ دل سے قتال کرو تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ اب ہابیل و قابیل کا قصہ سنانا اس کی تمہید ہے کہ متقی اور مقبول بندے کا قتل جو شدید ترین جرائم میں سے ہے۔ اور جس سے ان لوگوں کو بے انتہا تہدید و تشدید سے منع کیا گیا تھا، اس کے لئے یہ ملعون ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ پہلے بھی کتنے نبیوں کو قتل کیا اور آج بھی خدا کے سب سے بڑے پیغمبرؐ کے خلاف از راہ بغض و حسد کیسے کیسے منصوبے گانٹھتے رہتے ہیں۔ گویا ظالموں اور شریروں سے جان چرانا اور بے گناہ

سلہ فوائد القرآن ص ۱۴۲۔

Marfat.com

معصوم بندوں کے خلاف قتل اور قید کی سازشیں کرنا اس قوم کا شیوہ رہا ہے اور اس پر نحن ابناء اللہ واحبآءہ کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ اس تقریر کے موافق ہابیل اور قابیل کا قصہ پھر اُس پر مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کی تفریع، یہ سب تمہید ہوگی اُس مضمون کی جو اس قصہ اور تفریع کے ختم پر فرمایا: انما جزآء الذین یحاربون اللہ ورسولہ الخ اذا قربا... من الاخیر! آدم علیہ السلام دستور کے موافق جو لڑکی، ہابیل کے نکاح میں دینا چاہتے تھے، قابیل اُس کا طلبگار ہوا۔ آخر دونوں نے آدم علیہ السلام کے اشارہ سے کچھ نیاز (قربانی) کی کہ جس کی قبول ہو جائے لڑکی اُسی کو دے دی جائے۔ آدم علیہ السلام کو غالباً یقین تھا کہ ہابیل ہی کی نیاز مقبول ہو گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آتش آسمانی ظاہر ہوئی اور ہابیل کی نیاز کو کھا گئی۔ یہی علامت اُس وقت خدا کے ہاں مقبولیت کی تھی۔

قال لاقتلنک من المتقین قابیل یہ دیکھ کر آتش حسد سے جلنے لگا۔ اور بجائے اس کے کہ مقبولیت کے وسائل اختیار کرتا، غیظ و غضب میں اپنے بھائی کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔ ہابیل نے کہا کہ میرا اس میں کیا قصور ہے۔ یہ تو خدائی فیصلہ ہے۔ اُس کے ہاں کسی کی زبردستی نہیں چلتی۔ بلکہ تقویٰ چلتا ہے گویا میری نیاز جو قبول کر لی گئی اُس کا سبب تقویٰ ہے۔ تو بھی اگر تقویٰ اختیار کرے تو خدا کو تجھ سے صد ہیں۔

لئن بسطت الیّ یدک ..... رب العلمین حضرت شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ناحق کسی کو مارنے لگے تو اُس کو رخصت ہے کہ ظالم کو مارے اور اگر صبر کرے تو شہادت کا درجہ ہے،، اور یہ حکم اپنے مسلمان بھائی کے مقابلہ میں ہے۔ ورنہ جہاں انتقام و مدافعت شرعی مصلحت و ضرورت ہو، وہاں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا جائز نہیں مثلاً کافروں یا باغیوں سے قتال کرنا۔ والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون الشوریٰ ع ۴ ہابیل کے قول کا مطلب یہ ہے کہ میں تجھ سے ڈر کر نہیں بلکہ خدا سے ڈر کر یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک شرعی گنجائش ہے۔ بھائی کے خون میں اپنے ہاتھ رنگین نہ کروں۔ ایوب سختیانی فرماتے ہیں امت محمدیہ میں سب سے پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کر کے دکھلایا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں (ابن کثیر) جنہوں نے اپنا گلا کٹوا دیا۔ لیکن اپنی رضا سے کسی مسلمان کی انگلی نہ کٹنے دی۔

لیعنی تو میرے قتل کا گناہ بھی اپنے دوسرے گناہوں کے ساتھ حاصل کرے ابن جریر نے مفسرین کا اجماع نقل کیا ہے کہ باءثمی کا معنیٰ یہی ہے۔ باقی جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ قیامت میں مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈالے جائیں گے، وہ مضمون بھی ایک حیثیت سے صحیح ہے۔

Marfat.com

مگر محققین کے نزدیک وہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہے۔ اب ہابیل کے کلام کا حاصل یہ ہوا کہ اگر تو نے یہی ٹھان لی ہے کہ میرے قتل کا وبال اپنے سر رکھے تو میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ کوئی مدافعت اپنی جانب سے نہ کروں، حتیٰ کہ ترکِ عزیمت کا حرف بھی مجھ پر نہ آنے پائے تیرے عمر بھر کے گناہ تجھ پر ثابت رہیں اور میرے خون کا گناہ اور چڑھے۔ اور مظلومیت کی وجہ سے میرے گناہ اتریں۔ (موضح القرآن)

لہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ یہ ثابت فرماتے ہیں کہ نام و نسب کا تفاخر حسد پیدا کرتا ہے۔ محض بزرگ زادہ ہونا کسی کام کا نہیں (جیسا کہ بنی اسرائیل اسی تفاخر میں مبتلا تھے اور حسد سے پیغمبر آخر الزمان کا انکار کرتے تھے) قابیل کو محض آدمؑ کا بیٹا ہونے سے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ بلکہ وہ حسد اور تفاخر سے قتل کا مرتکب ہوا اور ابد تک لعنتی ہوا۔ یہ قصہ موجودہ تورات کی کتاب پیدائش باب ۴ میں مذکور ہوا ہے۔ وہاں قابیل کا نام قائن لکھا ہے۔

صحیحین میں ہے کہ جب دو مسلمانوں نے تلواروں سے لڑائی کی تو قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ قاتل تو خیر۔ لیکن مقتول کیوں جہنمی ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے پر حریص تھا۔ حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص نے اُس وقت جبکہ باغیوں نے حضرت عثمانؓ ذی النورین کو گھیر رکھا تھا فرمایا کہ: "میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عنقریب فتنہ برپا ہوگا۔ اُس وقت بیٹھا رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہوگا۔ اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا (یعنی اس میں حصہ لینے والے درجہ بدرجہ خدا کے ہاں اچھے لوگ ہیں اور حصہ نہ لینے والے بہتر ہیں اور بالکل ہی حصہ نہ لینے والا بہترین ہے!) کسی نے پوچھا حضورؐ! اگر کوئی میرے گھر میں گھس آئے اور مجھے قتل کرنا چاہے تو؟ آپؐ نے فرمایا "پھر بھی تو آدمؑ کے بیٹے (ہابیل) کی طرح ہو جانا!" ایک روایت میں ہے کہ اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت زیرِ تفسیر تلاوت فرمائی تھی۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہر ناحق قتل کا ایک گناہ قاتل کو اور ایک قابیل کو ہوتا ہے کیونکہ اُسی نے زمین پر سب سے پہلے خونِ ناحق گرانا ہے۔

سہ تلاوت کا معنیٰ قرأت ہے لیکن تلاوت کا لفظ کلام الٰہی کی قرأت کے سوا تقریباً بالکل

لہ تفسیر حقانی ج ۴ صہ ۲۵، ۲۶۔
۲ تفسیر ابن کثیر پ ۶ صہ ۸۴۔
۳ تفسیر المراغی ج ۶ صہ ۹۶، ۱۰۰ تفسیر المنار ج ۶ صہ ۲۲۰، ۳۴۴۔

Marfat.com

استعمال نہیں ہوتا۔ نَبَأ کا معنیٰ ہے کوئی ایسی اہم خبر جو کسی عظیم فائدے اور نفع کی وجہ سے شاندار ہو۔
قربان وہ ذبیحہ وغیرہ ہے جو اللہ کے تقرب کے لئے دیا جائے اصل میں یہ مصدر ہے اس لئے اس میں واحد و جمع وغیرہ برابر ہے۔ لبسط الید کا معنیٰ ہے کسی کو قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھانا یا چلانا۔ البوء کا معنیٰ ہے لزوم، اعتراف اور اقرار کرنا اور التزام۔ اور پر ایک آیت گزر چکی ہے: **اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدھم عنکم الخ** جس میں یہودیوں کی سازش اور حضورؐ کو صحابہؓ کبار سمیت قتل کر دینے کا ارادہ مذکور ہے آیت زیر بحث میں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ یہود کو سنایا جا رہا ہے کہ کسی طرح حسد کی وجہ سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا اور ناکام و نامراد ہوا۔ پس یہود بھی اپنی عداوت اسلام و جہاد میں اُسی کی مانند ہیں۔ اور اسی کی طرح خائب و خاسر اور ناکام رہیں گے نیز اس سے یہ بیان کرنا بھی مدنظر ہے کہ انسانی طبائع کا تباین و اختلاف جبلی ہے اور یہ اختلاف بعض دفعہ شدید مخالفت بلکہ قتل و غارت تک پہنچا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے باغی افراد اور اقوام کے لئے جو قوانین وضع کئے ہیں وہ حکمت پر مبنی ہیں۔ اور یہود کی مخالفت محض حسد و عداوت کی بناء پر ہے کسی دینی بنیاد پر نہیں جیسے کہ قابیل کی عداوت ہابیل کے لئے بھی اسی قسم کی تھی۔

حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ قابیل زمیندار اور کاشتکار تھا۔ اُس نے نہایت ردی اور گھٹیا چیزیں بطور قربانی پیش کیں اس میں چونکہ خلوص نہ تھا۔ لہٰذا اس کی قربانی قبول نہ ہوئی۔ ہابیل بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کا مالک تھا۔ اُس نے نہایت خوشدلی اور اخلاص کے ساتھ موٹی تازی اور اچھی بکری کی قربانی پیش کی۔ جو قبول ہوئی۔

یہود کی قربانیاں تین قسم کی ہوتی ہیں۔

۱۔ محرقات۔ یعنی گناہوں کی تکفیر کے لئے گائے اور بھیڑ بکری کے نر کو جو عیب دار نہ ہو، ذبح کرتے ہیں۔

۲۔ آٹا، روغن زیتون اور لوبان کی پیش کش۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے تشکر یئے کے لئے "سلامتی کے ذبیحے"

عیسائیوں کے ہاں قربانی اُس روٹی اور شراب کا نام ہے۔ جسے کاہن برکت دیتا اور مقدس کرتا ہے۔ ان کے عقیدے میں یہ روٹی اور شراب فی الحقیقت مسیحؑ کے گوشت اور خون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں قربانی حج کا ذبیحہ یا عید الاضحیٰ وغیرہ کا ذبیحہ ہوتا ہے آیت میں ریاکاری، شہرت اور لوگوں کی تعریف کے لئے صدقہ وغیرہ دینے کی شدید مذمت بیان ہوئی ہے جس سے عبرت پکڑنا لازم ہے۔

Marfat.com

دوسری اور تیسری آیت میں جان بچانے اور دفاع کرنے کی مخالفت یا مذمت نہیں بلکہ اقدام قتل کی مذمت بیان فرمائی گئی ہے۔ اور حقوق العباد کی نزاکت واضح کی گئی ہے۔ بندے کا حق معاف نہیں ہو سکتا لہٰذا آخرت میں مظلوم کا حق ظالم سے دلوایا جائے گا۔ اُس کی نیکیاں جُرم کی مقدار کے مطابق مظلوم کو دی جائیں گی اگر نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بُرائیاں اُس پر ڈال دی جائیں گی۔

آدمؑ کے دو بیٹوں کے قصّے میں جُرم کی فطرت اور انسانی نفس میں اُس کے بواعث پر کلام فرمایا گیا ہے اور اس جُرم کی برائی اور مجرم پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اُس کا مقابلہ کرنے، اُس کے فاعل کو سزا دینے اور انسانی نفس کو اس فعل پر ابھارنے والے محرکات کا مقابلہ کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔[1]

اسلام نے جرائم کی جو سخت سزائیں مقرر فرمائی ہیں، اس قسم کے قصّوں اور ان کے عواقب و نتائج کو بیان کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان سزاؤں کی ضرورت و اہمیّت واضح ہو۔ کیونکہ انسانی جان اور زندگی پر تعدّی کرنا، نظام عام کو مختل کرنا، مال اور انفرادی ملکیت پر چڑھائی کرنا۔ یہ بڑے سخت جرائم میں انہیں اجتماعی زندگی اور معاشرے سے مٹانا ضروری ہے۔

اسلام ایک مسلم معاشرے کی بنیاد دین الٰہی پر رکھتا ہے اور معاملات اور تعلقات کو شریعتِ اسلام پر استوار کرتا ہے۔ اس لئے وہ ہر فرد اور جماعت کے لئے عدالت، کفائت، استقرار اور اطمینان کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اور ہر ظلم و جور، زیادتی اور تعدّی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں سزائیں شدید ہوتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جرم کا موقع کم سے کم رہ جاتا ہے۔

دوسری طرف اسلام مجرم کے لئے تحقیق و تفتیش اور صحیح فیصلے کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔ محض شبہے کی بنا پر سزا نہیں دیتا بلکہ شبہ پڑ جانے سے حدود بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض دنیوی حالات میں اور کل اُخروی حالات میں وہ مجرم کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلامی سزائیں صرف دارالاسلام میں نافذ ہو سکتی ہیں دارالاسلام وہ علاقہ شہر یا ملک ہے جس میں اسلامی احکام شرعی جاری ہوں۔ چاہے اس کے باشندے سارے مسلمان ہوں یا بعض غیر مسلم (ذمی یا معاہد) بھی ہوں۔ یا باشندے تو سب غیر مسلم ہوں لیکن حکام مسلمان ہوں جو اس میں احکام اسلام چلاتے ہوں (ذمی پر اُس کے پرسنل لاء کے علاوہ سب احکام اسلامی عائد ہوتے ہیں) اگر خدانخواستہ حربی کافر کسی مسلم علاقے پر غالب آگئے ہیں لیکن اس علاقے کے مسلمان اسلامی احکام نافذ کرتے اور اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کرتے ہیں تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہوگا۔

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۳۲، ۱۲۸۔

Marfat.com

اس کے بالمقابل دارالحرب ہے اور وہ علاقہ ہے جس میں اسلامی احکام نہ چلتے ہوں اور شرع اسلامی کے مطابق فیصلے نہ ہوتے ہوں۔ باشندے چاہے کوئی بھی ہوں۔ سارے غیر مسلم ہوں یا ملے جلے رہتے ہوں۔ دارالحرب ہونے کا دارومدار اسلامی احکام کے نافذ نہ ہونے پر ہے۔

دارالاسلام میں جو معاشرہ خدا کے قانون پر قائم ہو۔ اُس کی شریعت پر فیصلے کرے اُس کا اوّلین فرض یہ ہے کہ خون، مال اور نظام عام محفوظ رہے اور امن وامان کو برباد کرنے والوں، جان ومال اور آبرو پر تعدّی کرنے والوں کو شرعی سزائیں دی جائیں۔ چونکہ یہ ایک پاکیزہ، اعلیٰ و ارفع، آزاد اور عادل معاشرہ ہوتا ہے اور اس میں ہر ایک کے لئے کام اور روٹی کی ضمانت دی جاتی ہے۔ نیکیوں کے پھیلنے اور برائیوں کے مٹنے کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کے ہر باشندے کا فرض ہے کہ دوسروں کی جان ومال اور ناموس کے علاوہ دارالاسلام کی سلامتی کے لئے پورے خلوص سے کوشاں ہو۔ جو شخص نظام کو توڑے اس کے لئے سخت سے سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں اور زیادہ سے زیادہ رعایات بھی دی گئی ہیں۔

انباءُ آدمؑ کا قصہ شر وعدوان کی فطرت ایک نمونہ ہے۔ اور اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ شر وعدوان کو دبانے کے لئے شرعی نظام لازم ہے ورنہ انتشار اور بدنظمی پھیل جائے گی۔ ابوداؤد کے سوا صحاح ستہ اور مسند احمدؒ میں عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک صحیح حدیث وارد ہے۔ جس میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمها
لانہ اول من سن القتل — اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابناء آدم کا قصہ انسانی

مسئولیت کے عہد میں پیش آیا تھا اور یہ قتل عمد کا پہلا واقعہ تھا حتیٰ کہ قاتل یہ بھی نہ جانتا تھا کہ مقتول کے جسم کو کیسے چھپائے یعنی صرف پہلا قتل ہی نہیں بلکہ غالباً یہ سب سے پہلی موت بھی تھی۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ

پھر اس کو راضی کیا اس کے نفس نے اپنے بھائی کے خون پر تو اس نے اسے مار ڈالا

مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ

پھر بھیجا اللہ نے ایک کوّا جو کرید تا تھا زمین کو

فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْاَةَ

تاکہ اس کو دکھائے۔ کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی

Marfat.com

اَخِیْہِ ؕ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَکُوْنَ

کی ۔ بولا ہائے افسوس مجھ سے اتنا نہ ہو سکا

مِثْلَ ھٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَۃَ

کہ ہوں میں برابر اس کوّے کے کہ چھپاؤں میں لاش

اَخِیْ ج فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ۝۳۱ مِنْ اَجْلِ

اپنے بھائی کی ۔ پھر لگا وہ پچھتاوے اسی سبب سے

ذٰلِکَ ج کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّہٗ مَنْ

لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے

قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ

ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں

فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاھَا

تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا

فَکَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْھُمْ

ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو ۔ اور لا چکے ہیں ان

رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ بَعْدَ

کے پاس ہمارے رسول کھلے ہوئے حکم ۔ پھر بہت لوگ ان میں اس پر

ذٰلِکَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝۳۲

بھی ملک میں دست درازی کرتے ہیں ۔

وقف النبی صلی اللہ

Marfat.com

فطوعت لہ نفسہ قتل اخیہ : شاید ابتداء میں کچھ جھجک ہوگی۔ شدہ شدہ نفس امارہ نے خیال پختہ کردیا اور یہی کیفیت عموماً معاصی کے ابتدا میں ہوتی ہے۔

من الخاسرین : دنیوی خسران تو یہ کہ ایسا نیک بھائی جو قوت بازو بنتا تھا سے کھویا۔ خود یا گل ہو کر مرا۔ حدیث میں ہے کہ ظلم اور قطع رحم دو گناہ ایسے ہیں۔ جن کی سزا آخرت سے پہلے پہلے یہاں بھی ملتی ہے اور اُخروی نقصان یہ اٹھایا کہ ظلم، قطع رحم، قتل عمد اور بدامنی کا دور دورہ دنیا میں کھول دینے سے ان سب گناہوں کی سزا کا مستوجب ہوا اور آئندہ بھی اُس نوعیت کے جتنے گناہ دنیا میں کئے جائیں گے سب میں بانی ہونے کی وجہ سے اُس کی شرکت رہی۔ جیسا کہ حدیث میں صریح طور پر آچکا ہے۔

فبعث اللہ غرابًا ..... سوأۃ اخی : چونکہ اس سے پہلے کوئی بھی انسان مرا نہ تھا، اس لئے قتل کے بعد اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کو کیا کرے۔ آخر ایک کوّے کو دیکھا کہ زمین کرید رہا ہے یا دوسرے مُردہ کوّے کو مٹی ہٹا کر زمین میں چھپا رہا ہے۔ اُسے دیکھ کر کچھ عقل آئی کہ میں بھی اپنے بھائی کی لاش کو دفن کردوں اور افسوس بھی ہوا کہ میں عقل و فہم اور بھائی کی ہمدردی میں اس جانور سے بھی گیا گزرا ہوا شاید اسی لئے حق تعالےٰ نے ایک ادنیٰ جانور کے ذریعہ سے اُسے تنبیہ فرمائی کہ وہ اپنی وحشت و حماقت پر کچھ شرمائے۔ جانوروں میں کوّے کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کھلا چھوڑ دینے پر بہت شور مچاتا ہے۔

فاصبح من النٰدمین : پچھتاوہ ناصح ہے جس کے ساتھ گناہ سے معذرت، انکسار اور فکر و تدارک بھی ہو اس موقع پر اس کا پچھتانا حق تعالےٰ کے عصیان پر نہیں بلکہ اپنی بدحالی پر تھا، جو قتل کے بعد اُسے لاحق ہوئی۔

من اجل ذالک کتبنا الخ یعنی ناحق قتل میں جو دنیوی اور اُخروی خسران ہے، اور جو نتائج بد اُس پر مرتب ہوتے ہیں حتیٰ کہ خود قاتل بھی اس حرکت کے بعد لمبا اوقات پچھتاتا اور کف افسوس ملتا ہے اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل کو یہ ہدایت کی کہ الخ

(احقر مؤلف عرض کرتا ہے کہ **من النٰدمین لہ من اجل ذالک** : دونوں کے آگے جو یہ نشان ہے ۞ ۔ اسے علمائے قرأت کی اصطلاح میں معانقہ کہتے ہیں۔ ان دو جگہوں میں سے ایک جگہ ضرور ٹھہرنا چاہیئے نہ دونوں کو وصل کرے اور نہ دونوں جگہ ٹھہرے پس اگر نادمین پر ٹھہرے گا تو **من اجل ذالک کتبنا** پڑھے گا ورنہ

لہ فوائد القرآن شیخ الاسلام رح عثمانی ص ۱۴۴۔

Marfat.com

فادیین من اجل ذالك پر وقف کرے گا۔ معنیٰ دونوں صورتوں میں صحیح ہے۔ جیسا کہ حضرت الاستاذ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے تقریر میں دونوں صورتوں کو لپیٹ لیا ہے)

او فساد فی الارض ملک میں فساد کرنے کی بہت سی صورتیں ہیں مثلاً اہل حق کو دین حق سے روکے یا پیغمبروں کی اہانت کرے العیاذ باللہ مرتد ہو جائے اور اپنی دعوت سے دوسروں کو مرتد کرنے لگے یا اس کی ترغیب دے وقیس علیٰ ذالك

قتل الناس جمیعاً..... احیا الناس جمیعاً، یعنی اوّل روئے زمین پر بڑا گناہ یہی ہوا جو قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ اُس کے بعد رسم پڑ گئی۔ اسی سبب سے ہم نے تورات میں اس طرح فرمایا:

"ایک کو مارا جیسے سب کو مارا" یعنی ایک کے ناحق قتل کرنے سے دوسرے بھی اس جُرم پر دلیر ہوتے ہیں۔ تو اس حیثیت سے جو ایک شخص کو قتل کر کے بدامنی کی جڑ قائم کرتا ہے گویا وہ سب انسانوں کے قتل اور عام بدامنی کا دروازہ کھول رہا ہے۔ اور جو کسی ایک کو زندہ کرتا" یعنی کسی ظالم قاتل کے ہاتھ سے بچاتا ہے، گویا وہ اپنے عمل سے سارے انسانوں کے بچانے اور مامون کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

ربالبیّنٰت: یعنے کھُلے کھُلے اور واضح احکام۔ اور ممکن ہے کہ بیّنات سے وہ کھُلے کھُلے نشان مراد لیے جائیں جن سے کسی پیغمبر کے خدا کی طرف سے برحق ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

لمسرفون: یعنی بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ ایسے کھُلے نشان دیکھ کر اور ایسے کھلے احکام سن کر بھی اپنے ظلم و طغیانی اور دست درازیوں سے باز نہ آئے۔ معصوم نبیوں کو قتل اور آپس میں ناحق خونریزی اُن کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے۔ اور آج بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے (معاذ اللہ) قتل اور ایذا رسانی اور مسلمانوں کی تذلیل کے لیے ہر قسم کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب حکم تورات کے مطابق کیف ما اتفق ایک آدمی کا ناحق مارڈالنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اُس کا قاتل تمام دنیا کے انسانوں کا قاتل ہے۔ تو دُنیا کے سب سے زیادہ کامل و اکمل انسان، اور سب سے زیادہ مقبول و مقدس جماعت کے قتل و ایذا رسانی کے درپے ہونا اور ان سے لڑائی اور مقابلہ کے لئے کمر باندھنا خدا کے نزدیک کتنا بھاری جُرم ہوگا۔ خدا کے سفیروں سے لڑائی تو درحقیقت خدا ہی سے لڑائی ہے۔ شاید اسی لئے اگلی آیت میں ان لوگوں کی دنیوی و اُخروی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جو خدا اور پیغمبر سے لڑائی کرتے ہیں۔ یا دنیا میں طرح طرح کے فساد پھیلا کر یسعون فی الارض کے مصداق بنتے ہیں۔

Marfat.com

[1] قابیل اپنے بھائی کو قتل کرکے لاش کو اپنی پیٹھ پر لادے پھرتا تھا اس سے پہلے کسی کو دفناتے نہ دیکھا تھا جو دفناتا۔ اس لئے خدا نے کوّے بھیجے جو باہم لڑے اور ایک نے دوسرے کو پنجوں سے مار کر زمین میں دفنا دیا۔ اس پر قابیل کو سخت ندامت ہوئی کہ اے افسوس! میں تو اس کوّے کے برابر بھی نہیں ہو سکا۔ مجھے تو بھائی کو دفنانا بھی نہ آیا۔ اور کوّے نے جانور ہو کر بعد مردن دوسرے پر رحم کیا جو اس کی لاش کو نہ خاک کیا۔ میں نے اپنے بھائی کے ساتھ انسان ہو کر کیا کیا؟

من اجل ذالک سے مراد نہیں کہ قابیل کے قتل کرنے سے بنی اسرائیل پر قصاص مقرر کر دیا۔ کیونکہ اس کے قتل میں بنی اسرائیل کے لئے کچھ خصوصیت نہ تھی، بلکہ ذالک سے اشارہ مقاصد قتل کی طرف ہے کہ چونکہ قتلِ ناحق کی خرابی بہت بڑی ہے اس لئے جب تورات اور شریعت کے احکام نازل ہوئے تو بنی اسرائیل پر ہم نے قصاص مقرر کر دیا۔ جنہوں نے اس کے باوجود انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا۔

فکانما قتل الناس جمیعًا کا مطلب یہ نہیں کہ ایک شخص کے قتلِ ناحق کا گناہ بنی اسرائیل پر تمام بنی آدم کے قتل کے برابر مقرر ہو گیا تھا، یہ تو عدالت الٰہی سے بعید ہے۔ بلکہ تشبیہ صرف قتل عمد کی عظمت میں ہے کہ جس بدبخت نے اپنی خواہشِ نفسانی اور حسد سے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اس سے تمام بنی آدم کا قتل کچھ بعید نہیں ہے۔ اگر یہ موقع پاتا تو سب سے ایسا ہی سلوک کرتا۔ جس نے چوری سے باغ کا ایک پھل توڑا اس نے گویا سارا پھل توڑا۔ اور ایک کو زندہ رکھنے سے سب کو زندہ رکھنے کا اسی پر قیاس کر لیجئے۔

[2] امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو جب باغیوں نے گھیر لیا۔ تو حضرت ابوہریرہ رضؓ انکے پاس گئے اور کہا میں آپ کی طرف سے ان مخالفین سے لڑنے آیا ہوں۔ آپ دیکھ لیجئے کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت خلیفۂ مظلوم نے فرمایا: کیا تم اس بات پر آمادہ ہو کہ سب لوگوں کو قتل کر دو جن میں ایک میں بھی ہوں؟ انہوں نے کہا نہیں نہیں فرمایا شعرا ایک کو قتل کرنا ایسا برا ہے سب جیسے سب کا قتل کرنا۔ جاؤ واپس لوٹ جاؤ۔ میری یہی خواہش ہے۔ اللہ تمہیں اجر دے اور گناہ نہ دے!

[3] **فطوعت لہ نفسہ** پہلے وہ بھائی کے قتل سے ڈرتا تھا اور فطرۃً اس قتلِ بد سے اسے جھجک آتی تھی۔ مگر نفس امارہ اسے برابر ابھارتا رہا۔ تا آنکہ اس میں یہ

---

[1] تفسیر عثمانی ج ۴ ص ۲۶۔
[2] تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۸۵ [3] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۰۲۔

Marfat.com

جرأت پیدا ہوگئی۔ اور وہ یہ اقدام کر بیٹھا۔ یہ کام اُس نے نفس امارہ کی اطاعت میں کیا تھا۔ انجام میں غور و فکر اور تفکر و تدبر نہیں کیا تھا لوگوں کے اعمال کا گہرا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ پہلے پہل جب قتل کا خیال پیدا ہوتا ہے تو ضمیر ملامت کرتا ہے اور وہ رک جاتا ہے۔ حتیٰ کہ نفس امارہ اُسے فعل کی ترجیح پہ آمادہ کر لیتا ہے۔ اور وہ یہ فعل کر بیٹھتا ہے۔

انسان کو چونکہ اعمال و افعال کے کسب و اختیار کا موقع دیا گیا ہے اور یہ قتل بنی آدم علیہ السلام میں پہلا قتل تھا۔ لہٰذا قاتل نہیں جانتا تھا کہ باوجود اپنے بھائی کی لاش کے سب کے سامنے ہونے کو بُرا جاننے کے اُسے کیونکر چھپائے۔ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ انسان پہلے پہل سادہ اور قلیل المعرفت تھا۔ لیکن اس میں چونکہ استعداد اور عقل موجود تھی۔ اس لئے ہر چیز سے جانچ پرکھ کر اور تجربے سے اپنے علوم معارف کو بڑھاتا رہا۔ چنانچہ اس قاتل نے لاش کو دفنانے کا طریقہ کوّے سے سیکھا۔ اُسے زمین کو کریدتے دیکھ کر قابیل کی حیرت زائل ہوگئی اور اُس نے گڑھا کھود کر ہابیل کی لاش کو دفن کر دیا۔

جس ندامت کا اظہار اُس نے کیا تھا وہ ہر اُس شخص کو لاحق ہوتی ہے۔ جو ایک کام کر چکنے اور پھر اپنے فعل کی بُرائی اور انجام بد کا علم ہو جائے۔ یہ توبہ کی ندامت نہ تھی۔ کیونکہ وہ ندامت تو خدا کے خوف اور اس کے احکام کو توڑنے پہ حسرت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ ندامت ہے جسے حضورؐ النّدم توبۃ (بیہقی) کہتا علی بنی اسرائیل کی وضاحت دوسری جگہ یوں فرمائی ہے۔ وکتبنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس الآیۃ فساد فی الارض کی مثال ڈاکہ زنی، رہزنی اور ان حکومتوں کے خلاف مسلح بغاوت ہے جو حدود اللہ کی تنفیذ کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔

اس آیت میں وحدت انسانی کا نظریہ پیش ہوا ہے کہ فرد جماعت کی زندگی میں اور اس کے افراد کی ضرر رسانی سے بچنے میں کوشاں رہے کیونکہ ایک کی حرمت کو توڑنا سب کی حرمت کو توڑنا ہے اور ایک فرد کے حقوق کو قائم کرنا سب کے حقوق کو قائم کرنا ہے۔ قرآن وحدت اُمّت کا نظریہ بار بار پیش کرتا ہے اور پہلوں کے گناہ کو پچھلوں کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ اُس کی نظر میں ساری انسانیت واحد ہے ایک پر تعدی کرنا سب پر تعدی کرنا ہے۔ اور اس سارے قصّے میں حسد کی برائی اور اُس کے پہلی انسانی بدعملی کا باعث ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ افراد اور اقوام کو لے ڈوبتا اور ان کی ترقی کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے۔

ایک بھائی کی طرف سے تذکیر و نصیحت، پیغام امن و صلح اور بُرے عمل کے انجام سے تحذیر کے واقع ہو چکنے کے باوجود نفس شریر نے دوسرے کو اس عمل پر ابھار ہی دیا۔

سہ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۲۸، ۱۴۰۷۔

Marfat.com

آخر کار یہ جرم واقع ہو گیا اور اس حال میں واقع ہوا کہ اُس کا نفس ہر گھاٹی کو اُس کے لئے ہموار کر چکا تھا اور ہر مانع کو ہٹا چکا تھا **فطوعت لہ نفسہ** کا معنی یہی ہے۔ قاتل نے خسارہ پایا اُس کے نفس نے اُسے ہلاکت کے گھاٹ اتارا۔ ایک بدکار اور رفیق بھائی کو گم کر بیٹھا۔ دنیا برباد ہوئی کیونکہ قاتل کی زندگی کبھی خوشگوار نہیں ہوتی۔ اُس کی آخرت بھی ناکام ہو گئی۔ اور وہ گناہوں کا پشتارہ اٹھا کر اپنے پہلے اور پچھلے جرائم کی پاداش بھگتنے کے لئے کچھ ہی دیر بعد خدا کے حضور جا پہنچا۔

اُس کے جرم کی بُرائی جسی طور پر ایک بے روح لاش کی صورت میں اُس کے سامنے پیش کی گئی جس میں کچھ دیر کے بعد بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور انسانی نفوس اُسے برداشت نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالےٰ کی حکمت و مشیت نے اُسے عاجز ثابت کر دکھایا اُس نے اس سے پہلے کسی کو دفن ہوتے نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ بنی آدم میں سے یہ پہلی میّت تھی۔ پس اُسے بھائی کو لاش کو ٹھکانے لگانا سمجھ میں نہ آسکا تو اپنے فعل کے انجام اور اپنی گھٹن اور تکلیف پر نادم ہوا۔

انسانوں میں اس قسم کے نمونے موجود ہونے کی وجہ سے اور صلح پسند، بے ضرر نیکوکاروں پر ظلم و تعدی کے باعث شریعت کے قواعد نازل کئے گئے: **من اجل ذالک** چونکہ نصیحت و موعظت اور بُرے انجام سے ڈرانا بعض شر انگیزوں پر اثر نہیں کرتا، صلح پسندی اور امن جوئی تعدی کو دور نہیں کر سکتی۔ جبکہ بُرائی انسانی طبیعت کی جڑوں میں پہنچ چکی ہو۔ اس لئے ہم نے قتل عمد کو بہت بڑا گناہ قرار دیا۔ جو سب لوگوں کے قتل کے برابر ہے قتل سے بچانا، اور کسی ایک جان کی زندگی کو خطرے سے نکالنا اور اس کی زندگی کا سبب بننا سب لوگوں کو بچانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ہر جان دوسری کے برابر ہے اور ہر جان کے لئے زندگی کا حق ایک ہے جو ثابت شدہ ہے۔ پس ایک جان پر زیادتی خود حیات پر زیادتی ہے۔ جس میں سب نفوس شریک ہیں۔

یہ احکام جو بیان کئے گئے ہیں دارالاسلام کے ہیں۔ دارالحرب کا خون مباح ہے۔ اور مال بھی مباح ہے۔ جب تک کہ دارالاسلام والوں کے ساتھ اُن کا کوئی معاہدہ نہ ہو جائے۔ جس زمانے کا ذکر اس آیت میں ہے اُس وقت دارالاسلام والے بنی اسرائیل تھے، اُن کا فرض تھا کہ تورات کے احکام کو بلا کم و کاست اور بلا تحریف و تبدیل نافذ کرتے جب تک کہ آخری شریعت نہ آجاتی لیکن انہوں نے حدود شرع سے تجاوز کیا۔ حالانکہ خدا کے رسول کھلے احکام اور واضح دلائل لے کر آچکے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان کے اندر حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ قرآن اُن کے اسراف و تجاوز اور تعدی پر انہیں للکارتا ہے۔ ولقد جآءتھم ..... لمسرفون۔

Marfat.com

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

یہی سزا ہے ان کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے

وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا

اور دوڑتے ہیں زمین پر فساد کرنے کو۔ کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی پر

اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ

چڑھائے جائیں یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب

خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ

سے یا دور کر دیے جائیں اس جگہ سے یہ ان کی رسوائی ہے

خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

دنیا میں اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب

عَظِيْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ

ہے مگر جنہوں نے توبہ کی تمہارے

تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

قابو پانے سے پہلے تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع ۵/۹

مہربان ہے

لہ انما جزآء الذین : فساد کا معنی یہاں بدامنی ہے۔ اکثر مفسرین نے اس سے مراد اس جگہ رہزنی اور ڈکیتی لی ہے۔ مگر الفاظ کو عموم پر رکھا جائے تو مضمون زیادہ

لہ فوائد القرآن ص ۱۴۵۔

Marfat.com

وسیع ہو جاتا ہے۔ آیت کی جو شان نزول احادیث صحیحہ میں بیان ہوئی ہے۔ وہ بھی اسی کی مقتضی ہے کہ الفاظ کو ان کے عموم پر رکھا جائے۔ "اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنا"، یا زمین میں فساد اور بدامنی پھیلانا"، یہ دو الفاظ ایسے ہیں۔ جن میں کفار کے حملے، ارتداد کا فتنہ رہزنی و ڈکیتی، ناحق قتل و نہب، مجرمانہ سازشیں اور مخفیانہ پروپیگنڈا سب داخل ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر جرم ایسا ہے جن کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں سے جو آگے مذکور ہیں۔ کسی نہ کسی سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا ..... مِنَ الْاَرْضِ : ڈاکوؤں کے احوال چار ہو سکتے تھے۔

(ا) قتل کیا ہو مگر مال لینے کی نوبت نہ آئی ہو (ب) قتل کیا اور مال بھی لیا۔ (ج) مال چھین لیا مگر قتل نہیں کیا۔ (د) نہ مال چھین سکے نہ قتل کر سکے بلکہ قصد اور تیاری کرنے کے بعد ہی گرفتار ہو گئے چاروں حالتوں میں بالترتیب یہی چار سزائیں ہیں جو بیان ہوئیں۔ مخالف طرفوں سے ہاتھ پاؤں کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا ..... غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ : یعنی مذکورہ بالا سزائیں جو حدود اللہ اور حق اللہ کے طور پر تھیں وہ گرفتاری سے قبل توبہ کر لینے سے معاف ہو جاتی ہیں۔ حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ مثلاً کسی کا مال لیا تھا تو ضمان (بدلہ) دینا پڑے گا۔ قتل کیا تھا تو قصاص لیا جائے گا۔ ہاں ان چیزوں کے معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو حاصل ہے اور اس حد کے سوا باقی حدود (مثلاً حد زنا) حد شرب خمر) حد سرقہ اور حد قذف توبہ سے مطلق ساقط نہیں ہوتیں۔

[1] ان آیتوں کا شان نزول عرب کے ایک قبیلہ بنی عرینہ کا قصہ ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ مدینہ میں آکر مسلمان ہوئے۔ آب و ہوا موافق نہ آئی۔ تو بیمار ہو گئے (مرض استسقاء کے مریض تھے) اس لئے انہیں تبدیل آب و ہوا کے لئے ایک وادی یا چراگاہ میں بھیجا گیا جہاں سرکاری اونٹ چرا کرتے تھے۔ جب تندرست ہوئے تو نیت میں فتور آیا اور اونٹوں کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹ لے کر چلتے بنے۔ حضورؐ کو خبر ہوئی تو ان کو گرفتار کر کے لایا گیا۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر آنکھوں میں گرم سلائیں پھیر دی گئیں۔ پھر دھوپ میں ڈلوا دیا گیا۔ وہیں تڑپ تڑپ کر مر گئے اس فعل کی آئندہ ممانعت کرنے کے لئے یہ آیت اتری۔ جس میں اس قسم کے افعال کی حد مقرر کر دی گئی۔ علامہ قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ ڈاکو اور رہزن پہلے سے مسلمان ہو یا کافر اس کی یہی سزا ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

---

[1] تفسیر حقانی ج ۲ ص ۲۷

Marfat.com

[1] حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے چوری، قتل، ارتداد اور بغاوت سبھی کچھ کیا تھا اور پھر چرواہوں کی آنکھوں میں سلائیاں بھی پھیری تھیں اس لئے ان کے جرائم کے مطابق انہیں سزا دی گئی۔ گویا اس آیت میں اُس کی توثیق کی گئی ہے۔ جس روایت میں آنکھوں میں سلائیاں پھیرنے کے فعل کی خدا کے ہاں ناپسندیدگی بیان کی گئی ہے وہ ضعیف ہے اور صحیح مسلم کی اُس حدیث کے خلاف ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ اُن کی آنکھوں میں سلائیاں ان کے فعل کے قصاص میں پھیری گئی تھیں کیونکہ اُنہوں نے چرواہوں سے یہی سلوک کیا تھا۔

[2] اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعدی کو خدا اور رسولؐ کے خلاف محاربہ قرار دیا ہے اس کی وجہ ہے کہ یہ اُسی حق و عدل پر تعدی ہے۔ جسے اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمایا ہے اور جسے قائم کرنا مقاصد اسلام میں سے ہے۔ اور حفاظتِ حقوق کے اسلامی احکام کی بھی یہ خلاف ورزی ہے۔ جو لوگ احکامِ شریعت کے سامنے نہ جھکیں وہ خدا اور رسولؐ کے محارب ہوں گے۔ اور امامِ وقت کو ان سے اقامتِ عدل اور حفاظتِ حقوق کی خاطر قتال واجب ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد و قتال فرمایا تھا۔ دارالاسلام کی اجتماعی زندگی کو منتشر کرنے اور اسبابِ معاش میں خرابی و فساد پیدا کرنے والوں کو یہاں فسادی فرمایا گیا ہے۔

جمہور علماء کے نزدیک یہ آیت مسلمان ساہرتوں اور ڈاکوؤں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ صحیح احادیث میں عکل و عُرینہ والوں کا قصہ مذکور ہے جس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ محاربین میں تین شرطیں پائی جانی لازم ہیں۔ ورنہ وہ محارب نہیں ہوں گے۔

۱۔ ان کے پاس ہتھیار ہوں ورنہ وہ محارب نہیں ہیں اور ان کی سزا اور ہوگی۔

۲۔ یہ واقعہ صحراء میں ہو اگر شہروں میں ایسا کریں تو امام ابوحنیفہؒ، ثوریؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک وہ محارب نہیں ہونگے۔

۳۔ علی الاعلان آئیں اور مال چھینیں۔ اگر خفیہ طور پر لیں تو وہ چور ہونگے ڈاکو نہ کہلائیں گے۔

ان کی چار سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان کے جرائم کے مطابق سزا کا معاملہ اجتہاد پر چھوڑا گیا ہے۔ کیونکہ مفاسد بہت سے ہیں۔ جو زمان و مکان کے اختلاف سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور ان کا ضرر بھی مختلف ہو سکتا ہے مثلاً قتل، مال چھیننا، بے عزتی کرنا اور ناموس پر ہاتھ ڈالنا، کھیتوں اور جانوروں کو ہلاک کرنا۔ کبھی کبھی دو دو تین تین جرم بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ پس سزا

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۸۹۔

[2] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۰۵، ۱۰۸، تفسیر المنار ج ۶ ص ۳۵۲، ۳۶۶۔

Marfat.com

بغاوت کرتے ہیں۔ گو اللہ سے تلوار اٹھا کر نہیں لڑتے نہ حضورؐ کے وصال کے بعد آپؐ سے شخصی طور پر لڑتے ہیں۔ ان کی لڑائی جو دارالاسلام، اُمّتِ مسلمہ اور شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے اسے خدا اور رسولؐ سے لڑائی قرار دیا گیا ہے۔

اس آیت کا ایک اور مفہوم بھی ہے۔ جو پہلے مفہوم کی طرح واضح اور متعین ہے وہ یہ کہ وہ حاکم جسے خروج کرنے والوں کو یہ سزائیں دینے کا اختیار دیا گیا ہے، صرف وہ حاکم ہے جو "دارالاسلام" میں خدا کی شریعت کو قائم کرتا ہو۔ کسی اور اقتدار اور حاکم کے لئے یہ وصف نہیں مقرر کیا گیا، نہ اُسے ان سزاؤں کا اختیار دیا گیا ہے۔

یہ ہم واضح طور پر اس لئے کہتے ہیں۔ کہ ہر دور میں بعض مسلّط لوگوں کے لگے بندھے مفتی ہر زمانے میں ایسے حاکموں کے لئے فتوے دیتے رہے ہیں جو اپنی حکومت و سلطنت کی سند اللہ کی شریعت سے حاصل نہیں کرتے تھے اور نہ اسلامی احکام و قوانین کو جاری کرتے تھے نہ اپنے زیر حکومت علاقے کو "دارالاسلام" بناتے تھے۔ گو وہ اس سب کے باوجود مُسلم ہونے کے مدّعی تھے وہ مُفتی یہ کہتے رہے ہیں کہ ایسے حکام جو لوگوں کو یہ سزائیں دینے کا اختیار ہے۔ حالانکہ وہ بغاوت کرنے والے اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف محاربہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ایک ایسے اقتدار کے خلاف لڑتے تھے۔ جو خود خدا و رسولؐ کے خلاف باغی ہے ایسے اقتدار و سلطان کو خدا اور رسولؐ کے نام پر یہ سزائیں دینے کا اختیار نہیں ہے ان لوگوں کو اسلامی شریعت سے کیا واسطہ؟ یہ لوگ تو حقّ الوہیت کو غصب کرتے اور اُس کا اپنے لئے دعویٰ کرتے رہے ہیں انہیں خدا کے قانون کو استعمال کرنے اور اس کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں۔

اس آیت کی تفاصیل میں فقہا کا اختلاف ہوا ہے۔ ابو حنیفہؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کے مذاہب کے فقہا کے نزدیک یہ سزائیں اُن جرائم پر مرتب ہیں جیسا جرم ہوگا۔ ویسی سزا دی جائے گی۔ امام مالکؒ نے ان سزاؤں کی تنفیذ کی تفصیل میں کچھ اختلاف کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اختیار امام کی رائے پر مبنی ہے کہ کون سی سزا کس وقت اور کس کو دے۔

اسی طرح نفی کے معنی میں بھی اختلاف ہوا ہے کہ آیا وہ جلاوطنی ہے یا قید۔ ہمارے نزدیک جلاوطنی ہی اس کا مناسب معنیٰ ہے تاکہ باغی اپنے حلقے سے دور ہو جائے اور اس کی مرکزیت کمزور ہو جائے۔

لہ گزشتہ تفصیل سے معلوم ہوگا۔ کہ یہ دو آیتیں زمین میں فساد کرنے والے "محاربین" کی سزائیں خاص ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو دارالاسلام میں ایسے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں جو جان و مال

لہ تفسیر المنار ج ۶ ص ۲۶۶ - ۲۶۸ -

Marfat.com

جرم کے مطابق ہوگی۔ اس لئے اس کی تعیین و تفصیل نہیں کی گئی۔
ان مفسدوں کی سزائیں عام سزاؤں سے سخت رکھی گئیں اور انہیں کوئی رعایت نہ دی گئی۔
گویا ان حدود کو حقوق اللہ بنا دیا گیا ہے تاکہ امن و امان قائم رہے۔ اور جان و مال اور آبرو محفوظ رہے۔
گرفتاری سے پہلے اگر وہ توبہ کریں گے تو توبہ مخلصانہ سمجھی جائے گی۔ لیکن حقوق العباد پھر بھی ان کے ذمہ واجب ہیں۔ ہاں اللہ کا حق اس کی وجہ سے ضرور ساقط ہو جائے گا۔ امام اگر مناسب جانے تو ان توبہ کرنے والوں کی بیت المال سے مدد کر سکتا ہے۔ یا اُن کے ذمہ جو بندوں کے حق میں انہیں بیت المال سے ادا کر سکتا ہے

[1] مسلم جماعت کا دارالسلام میں امن و امان سے رہنا ضروری ہے، اور وہ نظام عام جو اس امن و امان کا سایہ معاشرے پر ڈالتا ہے اس کی صیانت و حفاظت واجب ہے۔ افراد کے امن و امان سے بھی زیادہ اس جماعتی اور دولتی امن و امان کی ضرورت ہے۔ کیونکہ افراد کا امن تو صرف اس نظام سے متحقق ہوتا ہے۔ یہ نظام لوگوں کو امن و سلامتی، خیر و برکت، اور نیکی مہیا کرتا ہے۔ پس جو شخص اس کے امن و امان کو زائل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک خبیث عنصر ہے۔ جس کا قلع قمع واجب ہے۔

یہ آیتیں جن حدود کا اظہار کر رہی ہیں۔ وہ امام مسلم کے خلاف خروج بغاوت کے جرم کی سزائیں ہیں۔ وہ امام مسلم جو شریعت الٰہی کے مطابق حکم و انصاف کرتا ہو۔ پس ایک گروہ کی صورت میں جمع ہو کر اس کے خلاف خروج و بغاوت کرنا دارالاسلام والوں کو ڈرانا اور ان کے جان و مال اور ناموس پر دست درازی ہے۔

یہ لوگ جو امام کے خلاف اٹھے ہوں چاہے مسلم ہوں یا ذمی یا معاہد و مستأمن صرف امام کے خلاف ہی خروج ہی نہیں کرتے۔ اور صرف لوگوں پر زیادتی نہیں کرتے بلکہ یقیناً وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں۔ کیونکہ اُس کی شرع سے لڑ رہے ہیں اور اُس جماعت پر زیادتی کرتے ہیں۔ جو اس شرع کو قائم کرنے اٹھی ہے اور دارالسلام جس میں خدائی شریعت نافذ ہوتی ہے۔ اُسے نقصان پہنچاتے ہیں اور زمین میں بدامنی پھیلاتے ہیں۔ اس سے بڑا فساد اور کوئی نہیں۔ کہ خدا کی شریعت، دارالاسلام اور مسلم جماعت پر چڑھائی کی جائے۔

اگرچہ یہ لوگ مسلم جماعت اور مسلم امام کے خلاف "محاربہ" کرتے ہیں پھر بھی انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑنے والا کہا گیا ہے، کیونکہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کی شریعت اور احکام سے

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ صفحہ ۱۴۲ - ۱۴۴ -

Marfat.com

اور عزت و ناموس میں خلل اندازی کریں اور اس باب میں قوت و شوکت پر انحصار رکھیں اور اپنی خوشی سے شریعت کے سامنے نہ جھکیں۔ پس حکام (ائمہ) پر واجب ہے کہ ایسے لوگوں کا مقابلہ کریں۔ اور انہیں کوشش سے ڈھونڈ نکالیں اور جب اُن پر قابو پالیں تو بیان کردہ عقوبتوں سے انہیں سزا دیں۔ اور ہر فساد کو جانچ پرکھ کر، ہر جرم کی خوب تفتیش کر کے انہیں انکے مطابق عقاب و عذاب دیں۔ اس بارے میں مصلحت عامہ اور فساد کی جڑ کاٹنے اور اس کے ذرائع کو ختم کرنیکو مدِنظر رکھیں۔ اور جو لوگ قابو میں آنے سے پہلے پہلے تائب ہو جائیں۔ انہیں اس آیت والی سزا نہ دی جائے گی۔ بلکہ اُن کا حکم عام لوگوں جیسا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیتیں خوارج کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔ اور اس باب میں انہوں نے بعض وہ روایات بھی بیان کی ہیں جو حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کے خلاف خروج کرنے والوں کا حال بتاتی ہیں۔ لیکن ان کا یہ قول کسی صورت میں بھی درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ امیرالمومنین علی رضؓ نے اپنے ساتھی صحابہؓ کے مشورے اور رائے سے خوارج کے ساتھ قتال تو کیا۔ لیکن انہیں محاربین و مفسدین کی سزائیں نہیں دیں۔ کیونکہ ان کی غرض زمین میں فساد مچانا نہ تھی، نہ وہ آبادیوں کو برباد کرنا اور امن کو زائل کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو صرف ایک تاویل کی بنا پر امام عادل کی بیعت کر چکنے کے بعد اُس کے خلاف باغی ہوئے تھے۔ ان کی تاویل یہ تھی کہ امام راہِ حق سے پھسل گیا ہے۔ اور شرع کو حاکم و فیصلہ کن بنانے کی بجائے اپنی رائے کو برت کر نافذ کر رہا ہے۔

آئمہ مسلمین نے ظالم و جابر حکام کے خلاف خروج و بغاوت کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اطاعت، التزام جماعت، صبر، برائی کو مٹانے اور ظلم و جور اور تعدی کا مقابلہ کرنے کے بارے میں جو نصوص وارد ہوئی ہیں وہ بظاہر مختلف ہیں۔ اور میں نے کوئی ایسا قول نہیں دیکھا۔ جو اس باب میں وارد ہونیوالی تمام آیات و احادیث کو جمع کر دیتا اور ہر نص کو اُس کے مناسب مقام پر رکھ دیتا۔ اور ہر حکم کے ورود کے سبب کے تقاضے کے پیش نظر اختلافِ حالات کو مدِنظر رکھتا اور الفاظ کے مفہوم کو اس طرح واضح کر دیتا۔ جس طرح زمانۂ نزولِ قرآن میں ان کا مفہوم لیا جاتا تھا۔ بعد میں جو اصطلاحات نکلیں ان پر انحصار نہ رکھتا۔

اس کی مثال لفظ "جماعت" ہے جو اُس زمانے میں اُس جماعت پر بولا جاتا تھا جو کتاب و سنت کو قائم کر کے امر اسلام کو نافذ قائم کرے۔ لیکن آگے چل کر مسلمانوں کی ہر حکومت اور ہر امارت اس لفظ کو اپنے اوپر محمول کرنے لگی۔ اگرچہ وہ خود سنت کو ڈھانے اور اُس کی عمارت کو گرانے والی ہی کیوں نہ ہو۔ اور کتاب و سنت کی بجائے بدعت کو قائم کرے،

Marfat.com

کسی امر کو مقرر کیا جائے گا۔

امام حسین رضہ مظلوم کا خروج یزید بن معاویہ رضہ کے خلاف اسی قبیل سے تھا۔ یزید امام جور و لیفی تھا اور نواصب و کرامیہ میں سے جو اس کی حمایت کرنے والے بھی انشاء اللہ مخذول ہوں گے۔ جس طرح وہ خود بامر الٰہی مخذول ہوا تھا۔ اس قسم کے لوگ جو ظالم بادشاہوں کی عبادت کو پسند کرتے تھے۔ ہمیشہ سے چلے آرہے ہیں۔ جو عدل اور دین کو قائم کرنے کے خلاف کوشش کرتے ہیں۔ اس زمانے میں غالب قوموں کی رائے یہی ہو گئی ہے کہ ظالم اور مستبد بادشاہوں کے خلاف خروج و بغاوت واجب ہے۔ والسلام علی من اتبع الھدای۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا

اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک

اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ

وسیلہ اور جہاد کرو اس کی راہ میں تاکہ تمہارا

تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

بھلا ہو

وسیلہ کی تفسیر ابن عباس رضہ، مجاہد رح، ابو وائل رح اور حسن بصری رح وغیرہ ہم اکابر سلف نے قربت سے کی ہے۔ تو وسیلہ ڈھونڈنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا قرب و وصول تلاش کرو۔ امام قتادہ رح نے کہا الی تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بما یرضیہ خدا کی نزدیکی حاصل کرو۔ اس کی فرمانبرداری اور پسندیدہ عمل کے ذریعہ سے۔ ایک شاعر نے کہا ہے: ؎

فاذا اغفل الواشفون عدنا لوصلنا وعاد التصاد فی بنیک والوسائل

اس میں وسیلہ سے یہی معنی قرب و اتصال کے مراد ہیں۔ اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ وسیلہ جنت میں ایک نہایت ہی اعلیٰ منزل ہے، جو دنیا میں سے کسی ایک بندہ کو ملے گی۔

آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اذان کے لئے بعد میرے لئے وہی مقام خدا سے طلب کرو۔ تو اس کا نام بھی وسیلہ اسی لئے رکھا گیا کہ جنت کی تمام منزلوں میں سے سب سے زیادہ عرش رحمٰن کے قریب ہے۔ اور حق تعالیٰ کے مقامات قرب میں سب سے زیادہ بلند واقع ہوا ہے۔

؎ فوائد القرآن ص ۱۲۵

Marfat.com

حدود الٰہی کو معطل کر دے اور فجور و بدکاری کو مباح کر ڈالے۔

اور اختلافِ احوال کی مثال حکومتوں کا متعدد ہونا ہے۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوگا کہ ان میں کس کی اطاعت واجب ہے اور کس کی بیعت کی وفا لازم ہے اور جب ان میں لڑائی ہو جائے تو باغی کون ہے جس کے خلاف تمام مسلمانوں کو قتال واجب ہے تاکہ وہ امر الٰہی کی طرف لوٹ آئے؟ پس یہی وجہ ہے کہ ہر قوم نصوص کتاب و سنت کے ظاہری احکام کو اپنی اہوا نفس اور خواہشات کے مطابق اپنے اوپر منطبق کرتی ہے۔

قولاً اور اعتقاداً جن مسائل پر اہل اسلام کا اجماع ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ **لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق** خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق اطاعت صرف معروف میں ہے منکر میں ہرگز نہیں۔ اور مسلم حاکم جب اسلام سے پھر جائے (مرتد اور منحرف ہو جائے) تو اس کے خلاف خروج و بغاوت واجب ہے۔ اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ حرام چیزوں مثلاً زنا اور نشہ آور اشیاء کو مباح کر لینا اور حدودِ شرع کے بالکل کرنے کو مباح جاننا اور خدا و رسول نے جن قوانین کی اجازت نہیں دی۔ انہیں رائج کرنا، کفر و ارتداد ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ جب دنیا میں کوئی عادل حکومت پائی جائے جو شرع کو قائم کرے اور دوسری حکومت جائر ہو دین شرع کو قائم و نافذ کرنے والی نہ ہو، تو ہر مسلمان پر پہلی حکومت کی مدد حسبِ استطاعت واجب ہے اس پر بھی اجماع ہے کہ جب مسلمانوں کا کوئی گروہ دوسرے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ اور اس کے خلاف طاقت اور ہتھیار استعمال کرے تو ان میں صلح کرانا واجب ہے اگر صلح نہ ہو سکے تو مسلمانوں پر باغی اور متعدی کرنے والے گروہ سے قتال واجب ہے۔ جب تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف لوٹ نہ آئے۔

اور ظالم حاکموں کی ایذاؤں پر (بشرطیکہ وہ کفر کے مرتکب نہ ہوں۔ جو صبر کے احکام وارد ہیں وہ دوسرے احکام کے معارض ہیں۔ اور ان سے مراد فتنہ پردازی سے بچنا اور مسلمانوں کے اجتماع کو پارہ پارہ کرنے سے پرہیز کرنا ہے۔ ان احکام میں سے قوی ترین یہ حدیث ہے **وان لا تنازع الامر اھلہ الا ان تروا کفراً بواحاً** امام نووی رحؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں لفظ کفر سے مراد معصیت ہے اور اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کفر سے مراد معصیت لی گئی ہے اور ظاہر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو امام اپنی امامت و حکومت میں برحق ہو، اس سے اس کی امامت کو چھیننے کے لئے لڑنا اس وقت تک واجب نہیں جب تک وہ خود یا اس کے ماتحت والی اور عامل کھلے کفر میں مبتلا نہ ہو جائیں اور ظلم و معاصی سے اس کو پھیرنا واجب ہے۔ لیکن اس کی امامت باقی رہے گی۔ اور نیکی میں اس کی اطاعت کی جائے گی۔ بدی میں نہیں۔ اور نہ اسے معزول کرنے

Marfat.com

بہرحال پہلے ارشاد فرمایا کہ ڈرتے رہو اللہ سے۔ لیکن یہ ڈر ایسا نہیں جیسے آدمی سانپ بچھو یا شیر بھیڑیئے سے ڈر کر دور بھاگتا ہے۔ بلکہ اس بات سے ڈرنا کہ کہیں اس کی رحمت اور خوشنودی سے دور نہ جا پڑو۔ اس لئے اتقوا اللہ کے بعد وابتغوا الیہ الوسیلۃ فرمایا یعنی اس کی ناخوشی اور لعنت سے ہجر سے ڈر کر قرب و وصول حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے قریب ہم اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ درمیانی راستہ قطع کر لیں جس کو چل کر اس کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔ اسی کو فرمایا **وجاھدوا فی سبیلہ** اور جہاد کرو اس کی راہ میں" یعنی اس کی راہ پر چلنے کی پوری پوری کوشش کرو **لعلکم تفلحون** تاکہ تم اس کی نزدیکی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو۔

پچھلے رکوع کے آخر میں ان لوگوں کی دنیوی و اخروی سزا بیان فرمائی ہے جو خدا اور رسولؐ سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد اور بدامنی پھیلاتے ہیں۔ اس رکوع میں مسلمانوں کو ان سزاؤں سے ڈرا کر بتلایا گیا کہ جب شقی اور بدبخت لوگ خدا اور رسولؐ سے جنگ کریں تو تم خدا اور رسولؐ کی طرف ہو کر جنگ کرو۔ وہ اگر زمین میں فساد مچاتے ہیں تو تم اپنی کوشش اور حسن سلوک سے امن اور سکون قائم کرنے کی فکر کرو۔

[1] تمام احکام الٰہی دو قسموں میں منحصر ہیں اوّل بری باتوں کا ترک کرنا۔ اور یہ سب سے مقدم ہے کیونکہ انسان جب تک بری باتوں کو ترک نہیں کرے گا اس کے لوح دل پر ضرور ایسا اثر باقی رہے گا۔ جو اسے نیکیوں سے روکے گا اور اپنی طرف کھینچے گا۔ علاوہ ازیں جب کسی تختی پر کوئی عمدہ نقش کھینچنا چاہتے ہیں تو پہلے اس کو صاف کر لیتے ہیں، پھر کچھ لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کی طرف اتقوا اللہ میں اشارہ فرمایا ہے۔

دوسری قسم اچھی چیزوں کا عمل میں لانا، عبادت، سخاوت، رحم دلی، بردباری، صبر و شکر، تسلیم و رضاء وغیرہ پر عمل کرنا ہے۔ اس کی طرف **وابتغوا الیہ الوسیلۃ** میں اشارہ فرمایا ہے۔ اسی طرح بری چیزوں (منہیات) کا ترک کرنا بھی واجب ہے مثلاً اخلاق رذیلہ، تکبر، عجب، ریاکاری وغیرہ کو ترک کر کے اچھے اخلاق و اعمال پیدا کرنا۔ یہ خدا کے قرب کا وسیلہ ہیں۔ پیغمبرؐ کی اطاعت و اتباع اور بزرگان دین کے پیچھے چلنا بھی وسیلہ ہے۔ جو انسان کو خدا کے قریب لے جاتا ہے ان چیزوں کے لئے چونکہ بڑی جد و جہد اور محنت کی ضرورت ہے اس لئے اس کے بعد **وجاھدوا فی سبیلہ** فرمایا ہے۔

[2] اوپر گزر چکا ہے کہ یہود نے حسد و عناد سے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲۸۔

[2] المراغی ج ۶ ص ۱۰۸، ۱۱۲، المنار ج ۶ ص ۲۶۹، ۲۷۸

Marfat.com

چلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے باطل دین پر ریجھے ہوئے تھے اور بزعم خویش خدا کے بیٹے اور پیارے تھے۔ یہاں اللہ تعالےٰ نے ایمان والوں کو تقوےٰ اور نیک عمل سے اپنا قرب تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔ تاکہ وہ بھی انہی فتنوں میں نہ پھنس جائیں۔ جن میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے فوز و فلاح انہی چیزوں پر موقوف ہے۔

کسی صحابی، تابعی، یا امام و عالم سلف سے یہ منقول نہیں ہے کہ وسیلہ یعنی خدا کا تقرب ایمان و عمل یا دعا وغیرہ کے علاوہ کسی غیر مشروع چیز سے بھی ہو سکتا ہے بعد کی صدیوں میں وسیلہ کا جو معنی بعض لوگوں نے بیان کیا ہے اُس کی وجہ سے عوام میں شرک اور دُعا من غیر اللہ کا تصور پیدا ہو گیا۔ توسّل کا لفظ تین معنوں میں بولا جا سکتا ہے:

۱۔ خدا کی اطاعت اور اُس کے پسندیدہ اعمال و افعال سے اُس کا تقرب و توسل حاصل کرنا۔ یہ دین کی بنیاد ہے، حتمی طور پر فرض ہے اور مقصود شرع ہے۔

۲۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپؐ کی دعا اور شفاعت سے تقرب الٰہی ڈھونڈنا۔ جیسا کہ صحابہؓ کا عمل اس پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے استسقاء کی دعا میں کہا تھا: "اے اللہ حضورؐ کی دنیوی حیات میں جب بارش نہ ہوتی تھی تو ہم آپؐ کے وسیلہ سے تیرا تقرب حاصل کرتے تھے تو تو ہمیں بارش عطا کرتا تھا۔ اب ہم تیرے پیغمبرؐ کے چچا سے توسّل کر کے تجھ سے دعا مانگتے ہیں۔ پس تو ہمیں بارش عطا کر"۔

۳۔ توسّل باللہ۔ یعنی خدا کو اُس کی ذات کی قسم دلانا۔ یہ قسم صحابہؓ سے نہ حضورؐ کی زندگی میں نہ اُس کے بعد ثابت ہے، نہ آپؐ کی قبر مبارک کے قریب نہ اُس سے دُور اور ان سے جو دعائیں ثابت ہیں اُن سے یہ توسّل ثابت نہیں ہوا۔ کسی ضعیف حدیث میں آیا ہو تو وہ حجت نہیں نہ شرع میں کسی اور کا قول و فعل حجت مانا جا سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور اُن کے اصحاب بحق انبیاءک اور بمعاقد العزّ من عرشک، بحق خلقک وغیرہ کے الفاظ سے دعا کو مکروہ جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خلق کا خالق پر کوئی حق نہیں کہ اس طرح حق جتا کر دعا کی جائے۔ کتاب و سنت نے مدار نجات و فلاح ایمان اور عمل صالح کو ٹھہرایا ہے:

وان لیس للانسان الا ما سعیٰ، وان سعیہ سوف یریٰ ثم یجزاہ الجزاء الاوفیٰ اور نجزی کل نفس بما تسعیٰ اور ھل تجزون الا ما کنتم تعملون ۝

اس سے معلوم ہوا کہ وسیلہ سے مراد خدا کا قرب اور فرمانبرداری ہے۔ جو صحیح ایمان اور عمل صالح سے حاصل ہوتی ہے

Marfat.com

ہاں سنت سے ثابت ہے کہ مومن کی دعاء دوسروں کے لئے نافع ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کے ایمان پہ بہت حریص تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء و ھو اعلم بالمھتدین** اور میت سے کچھ طلب کرنا غیر مشروع ہے۔ وہ ایک ایسے جہان میں ہے کہ ہم اُس کے احوال و معاملات کو نہیں جان سکتے۔ یہ قرآن کے صریح خلاف ہے:

فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا اور اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ اور وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا یُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِیْرٍ ۝

اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی روایت کیا جاتا ہے سب ضعیف بلکہ موضوع (جعلی ہے) اور وہ اندھے والی حدیث کہ حضورؐ نے اُسے یوں کہنا سکھایا۔ **اسعالک و اتوجہ الیک بنبیک نبی الرحمۃ** اس باب میں حجت نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اُس نے جو توسل کیا تھا۔ وہ حضورؐ کی دعا و شفاعت کا توسل تھا۔ حضورؐ نے اُس کو یہ کہنے کا حکم دیا تھا **اللھم شفعہ فی** اور حضورؐ کی دعا سے اُس کی بینائی واپس آگئی تھی۔ یہ حضورؐ کے معجزات میں سے تھا۔

امام ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ کے نزدیک مخلوقات کی قسم کھانا حرام ہے۔ صحیحین کی واضح احادیث سے اس کی ممانعت ثابت ہے اور اس پر صحابہؓ کا اجماع منقول ہے۔ اگر کوئی شخص پیغمبروں کی قسم کھائے۔ تو یہ شرعی قسم نہیں ہوگی۔ امام مالکؒ و شافعیؒ اور ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس قسم کو توڑنے کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ یہی حال قابلِ احترام مخلوق چیزوں کی قسم کا بھی ہے مثلاً عرش، کرسی، کعبہ، مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، مسجد نبویؐ، ملائکہ، صالحین ملوک مجاہدین کی تلواریں، اور انبیاء و صلحاء کی قبریں وغیرہا۔

لہ دین الٰہی لوگوں کو صرف قانون کا ہی پابند نہیں بناتا، بلکہ وہ قانون کی تلوار تو صرف اس وقت اٹھاتا ہے۔ جب ایسا ناگزیر ہو جائے۔ اس کا اولین اعتماد دل کی تربیت اور فطرت کی درستی پر ہے۔ وہ روح کی رہنمائی کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے۔ جس میں نیکی کا بیج پھلے پھولے اور بدی کا بیج مرجھا جائے۔ اس لئے کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ قرآن پاک سزا سے ڈرائے لیکن دلوں، وجدان اور ضمیروں کی طرف راستہ تلاش نہ کرے۔

لہ فی ظلال القرآن ج ۶ صـ ۱۴۶/ ۱۴۶۔

Marfat.com

وہ تقویٰ کے مشاعر کو قوی کرتا ہے اور انہیں تقرب الٰہی سے حاصل کرنے اور جہاد پر ابھارتا ہے۔ تاکہ فلاح پائیں۔ اور وہ انہیں کفر کے انجام سے ڈراتا ہے اور عاقبت میں کفار کے انجام کی تصویر کھینچ کر خوف و غیرت پیدا کر دیتا ہے۔

یہ دین کامل انسانی نفس کو ہر جانب سے گھیر لیتا ہے اور اس کی تمام اندرونی قوتوں سے خطاب کرتا ہے۔ اُس کے تمام زندہ تاروں کو چھیڑتا ہے۔ انہیں اطاعت کی طرف راغب کرتا اور معصیت سے روکتا ہے اُس کا پہلا ہدف انسانی نفس کو درست کرنا اور اُسے انحراف سے باز رکھنا ہے۔ بہت سے وسائل میں سے سزا بھی اس کا ایک وسیلہ ہے۔ سزا فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے۔ نہ یہ کوئی واحد وسیلہ ہے۔

اس لئے اُس نے یہاں پہلے آدمؑ کے بیٹوں کا قصہ بیان کیا جس میں بہت سی عبرتیں ہیں۔ پھر مخالفت کی سزا بیان کی جو دلوں کو ہلا ڈالتی ہے۔ اور پھر وہ تقویٰ کی دعوت دیتا ہے۔ اور خوف و خشیۃ الٰہی کی طرف بلاتا ہے اور اس کے ساتھ سزا کی تصویر بھی پیش کر دیتا ہے اتقوا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ خوف صرف خدا سے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہی وہ خوف ہے جو انسانی شرف و کرم کے لائق ہے۔ تلوار اور کوڑے کا خوف ایک نچلی منزل ہے۔ اور ان کی ضرورت بھی صرف اُن نفوس کو ہے جو خود پست ہوں۔ خدا کا خوف ہی وہ چیز ہے جو ظاہر و باطن میں ضمیر کے ساتھ ہوتا ہے اور ایسے حالات میں جبکہ لوگ نہ دیکھ رہے ہوں، وہی برائی سے روکتا اور بچاتا ہے۔ اور جب قانون کا ہاتھ اُس تک نہ پہنچ سکے۔ وہی دل کی گہرائیوں تک نفوذ کرتا ہے۔ تقویٰ کے بغیر اکیلا قانون کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قانون کا ہاتھ جہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اُن جگہوں اور چیزوں سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ جہاں تک اُس کی رسائی ہے وہ نفس یا معاشرہ جس کی بنیاد محض قانون پر ہے۔ اس میں کبھی بھلائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اُس کے پیچھے ایک غیبی جاسوس کی ضرورت ہے اور ایک خدائی تسلط درکار ہے۔ جس سے ضمیر میں تقویٰ پیدا ہو۔ **وابتغوا الیہ الوسیلۃ** یعنی وہ اسباب تلاش کرو جو تمہیں خدا تک پہنچا دیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے وسیلہ کا معنی حاجت بتایا۔ یعنی اپنی حاجات و ضروریات صرف اسی سے طلب کرو۔ انسان جب ایسا کرتا ہے تو الوہیت کے سامنے اپنے اصل مقام یعنی عبودیت پر قائم ہو جاتا ہے۔ یہی حالت اُس کے لئے بہترین اور فلاح کے قریب تر ہے۔ وسیلہ کے یہ دونوں مطلب۔ یعنی اسباب قرب اور حاجات۔ عبارت قرآنی سے نکل سکتے ہیں۔ دونوں میں دل کی صلاح اور ضمیر کی زندگی اور فلاح مضمر ہے۔ اسی لئے آخر میں لعلکم تفلحون فرمایا ہے۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَھُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ

جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے

جَمِیْعًا وَّ مِثْلَہٗ مَعَہٗ لِیَفْتَدُوْا بِہٖ مِنْ

سارا، اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تاکہ بدلہ میں دیں اپنے قیامت

عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَا تُقُبِّلَ مِنْھُمْ وَلَھُمْ

کے عذاب سے تو ان سے قبول نہ ہوگا۔ اور ان کے لئے دردناک

عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۳۶﴾ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا

سزا ہے وہ چاہیں گے کہ نکل جائیں گے۔ آگ سے،

مِنَ النَّارِ وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْھَا وَ

اور وہ اس سے نکلنے والے نہیں۔ اور

لَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۳۷﴾

ان کے لئے عذاب دائمی ہے

لہ پچھلی آیت میں بتلایا تھا کہ انسان خدا سے ڈرنے، اُس کا قرب حاصل کرنے اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے ہی سے فلاح و کامیابی کی امید کر سکتا ہے اس آیت میں متنبہ فرمادیا۔ کہ جن لوگوں نے خدا سے روگردانی کی وہ آخرت میں اگر روئے زمین کے سارے خزانے بلکہ اس سے زائد خرچ کر ڈالیں گے۔ اور فدیہ دے کر عذاب الٰہی سے چھوٹنا چاہیں گے، تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ غرض دل کی کامیابی تقویٰ، ابتغائے وسیلہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ رشوت اور فدیہ سے نہیں ہو سکتی۔

احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہ گار مؤمنین ایک مدت تک دوزخ

لہ فوائد القرآن ص ۱۴۶۔

Marfat.com

میں رہ کر پھر نکالے جائیں گے۔ اور حق تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ یہ آیت ان احادیث کے مخالف نہیں کیونکہ یہاں پہلی آیت کے شروع سے صرف کفار کا حال بیان کیا گیا ہے مومنین کے متعلق اس آیت میں کوئی حرف نہیں۔

ایک مرتبہ حضرت جابرؓ نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا کہ ایک قوم جہنم سے نکال کر جنت میں پہنچائی جائے گی۔ اس پر ان کے شاگرد یزید رقاشی نے پوچھا کہ پھر اس آیت قرآنی کا کیا مطلب ہے: **یریدون ان یخرجوا منھا وما ھم بخارجین** یعنی وہ جہنم سے آزاد ہونا چاہیں گے۔ لیکن ایسا نہ کر سکیں۔ تو آپ نے فرمایا اس سے پہلے ان الذین کفروا الخ پڑھو جس سے صاف ہو جاتا ہے کہ یہ کافر لوگ جو کبھی جہنم سے نہ نکلیں گے (مفسد وغیرہ) دوسری روایت میں ہے کہ یزید رقاشی کا خیال یہی تھا کہ جہنم میں سے کوئی بھی نہ نکلے گا۔ اس لئے وہ حدیث سن کر انہوں نے حضرت جابرؓ سے کہا کہ مجھے اور لوگوں پر تو افسوس نہیں۔ آپ صحابیوں پر افسوس ہے کہ آپ بھی قرآن کے خلاف کہتے ہیں۔ اس وقت مجھے غصہ آگیا تو ان کے ساتھیوں نے مجھے ڈانٹا۔ لیکن حضرت جابرؓ بہت ہی حلیم الطبع تھے انہوں نے سب کو روک دیا۔ اور مجھے سمجھایا کہ قرآن میں جن کے جہنم سے نہ نکلنے کا ذکر ہے۔ وہ کفار ہیں۔ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ میں نے کہا ہاں مجھے تو سارا قرآن یاد ہے۔ کہا پھر یہ آیت کیا قرآن میں نہیں ہے۔ **عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا** اس میں مقام محمود کا ذکر ہے۔ یہی مقام شفاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض مومنوں کو ان کی خطاؤں کی وجہ سے جہنم میں ڈالے گا۔ اور جب تک چاہے گا جہنم میں ہی رکھے گا۔ پھر جب چاہے گا انہیں اس سے آزاد کر دے گا۔ حضرت یزید رقاشی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میرا خیال درست ہو گیا۔

حضرت طلق بن حبیب کہتے ہیں۔ کہ میں منکر شفاعت تھا، یہاں تک کہ حضرت جابرؓ سے ملا۔ اور اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ تمام آیتیں پڑھ ڈالیں جن میں جہنم میں ہمیشگی کا ذکر ہے۔ تو آپ نے سن کر فرمایا۔ اے طلق! کیا تم اپنے تئیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے علم میں مجھ سے افضل جانتے ہو؟ سنو! جتنی آیتیں تم نے پڑھی ہیں وہ سب کافر و مشرک جہنمیوں کے بارے میں ہیں جو حقیقت میں اہل جہنم ہیں۔ لیکن جو لوگ جہنم سے نکالیں گے وہ مشرک نہ ہوں گے۔ گنہ گار مسلمان ہوں گے۔ گناہوں کی سزا بھگت کر جہنم سے نکال دیئے جائیں گے۔ پھر حضرت جابرؓ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

---

۱ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۲

Marfat.com

یہ دونوں بہرے ہو جائیں اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو کہ جہنم میں داخل ہونے کے بعد بھی لوگ اس سے نکالیں جائیں گے اور انہیں جہنم سے آزاد کر دیا جائے گا۔ قرآن کی یہ آیتیں جس طرح تم پڑھتے ہو ہم بھی پڑھتے ہیں۔

لہ اس آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے۔ جنہوں نے اپنے رب کی ربوبیت کا انکار کیا اور اُس کے سوا بھڑا۔ پتھر یا بُت کی پوجا کی اور توبہ سے قبل اسی حال میں مر گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ فلاح و نجات کا سبب انسان کے اندر سے ہوتا ہے نہ کہ باہر سے:

قد افلح من زکّاھا ہ وقد خاب من دسّاھا ہ

اسلام اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی یہی چیز ہے۔ نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ انکی خلاصی اور سعادت مسیح ؑ کی قربانی اور کفارے سے ہو گی چاہے ان کا اپنا حال کچھ بھی ہو۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ نجات کا دار و مدار ایمان اور تزکیہ پر ہے۔ یعنی نفس کو فضائل اور اعمالِ صالحہ سے پاک و صاف کرنے پر۔

لہ ایمانداروں کے بالمقابل قرآن کفار کا نظارہ پیش کرتا ہے جو تقویٰ اور تقربِ الٰہی سے فلاح حاصل نہیں کرتے۔ یہ نظارہ بہت مہیب اور متحرک ہے قرآن اُسے اوصاف و تقریرات میں نہیں بیان کرتا بلکہ حرکات و انفعلات میں ان کی تصویر کھینچتا ہے اور اپنے معروف طریقے کے مطابق قیامت کے نظاروں کو مشاہدہ بنا کر سامنے لے آتا ہے۔

چنانچہ بطورِ فرضِ محال انسانی خیال زیادہ سے زیادہ جو تصور کر سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کافروں کو ساری زمین کے خزانے مل جائیں۔ لیکن قرآن اس سے آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ اگر اتنا اور بھی مل جائے وہ اُسے فدیہ میں دے ڈالیں اور آگ سے نکلنا چاہیں تو ناکام ہوں گے اور ہمیشہ دائمی عذاب میں رہیں گے۔

یہ نظارہ مجسم ہے اس میں کئی مناظر اور متواتر حرکات ہیں۔ پہلا نظارہ یہ کہ ان کے پاس روئے زمین کے خزانے اور اتنے اور بھی ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ اسے فدیہ میں پیش کر رہے ہیں تاکہ عذاب سے خلاصی پالیں۔ تیسرا یہ کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام ہیں پھر ان کے دخولِ نار کا نظارہ اور اس سے نکلنے کا ارادہ کرنے کا منظر بھی ہے۔ اور پھر آخری منظر یہ ہے کہ پردہ گر جاتا ہے اور انہیں جہنم میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

لہ المراغی ج ۶ ص ۱۱۱ المنار ج ۶ ص ۱۵۹ : لہ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۲۶۔

Marfat.com

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا

اور چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ

اُن کی کمائی کی سزا میں تنبیہہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ غالب

حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ

ہے حکمت والا پھر جس نے توبہ کی اپنے ظلم کے پیچھے اور اصلاح

اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

کی تو اللہ قبول کرتا ہے اس کی توبہ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان

رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ

ہے۔ تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے واسطے ہے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ

سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی عذاب دے جس کو چاہے اور

وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

بخشے جس کو چاہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

[1] **فاقطعوا ایدیھما**: یعنی پہلی مرتبہ چوری کرے تو داہنا ہاتھ گٹے پر سے کاٹ دو۔ باقی تفاصیل کتب فقہ میں ملیں گی پچھلے رکوع میں ڈکیتی وغیرہ کی سزا بیان کی گئی تھی۔ درمیان میں مناسبات کی وجہ سے جن کو ہم بیان کر چکے ہیں۔ مومنین کو چند ضروری نصائح کی گئیں۔ اب پھر اُسی پچھلے مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یعنی وہاں ڈکیتی کی سزا بیان ہوئی تھی۔ یہاں

---

[1] فوائد القرآن ص ۱۲۶۔

Marfat.com

سورۃ المائدہ

چوری کی سزا بتلادی۔

جزآءً بما کسبا نکالا من اللہ یعنی، تو سزا چور کو دی جا رہی ہے۔ وہ مال مسروقہ کا بدلہ نہیں بلکہ اُس کے فعلِ سرقہ کی سزا ہے۔ تاکہ اُسے اور دوسرے چوروں کو تنبیہ ہو جائے۔ بلاشبہ جہاں کہیں یہ حدود جاری کی جاتی ہیں، وہاں چوری کی سزایابی کے بعد چوری کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے۔ آج کل مدعیان تہذیب" اس قسم کی حدود کو وحشیانہ سزا سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن چوری کرنا اگر ان صاحبوں کے نزدیک کوئی مہذب فعل نہیں ہے۔ تو یقیناً آپ کی مہذب سزا" اس غیر مہذب دستبرد کے استیصال میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر تھوڑی سی وحشت کا عمل کرنے سے بہت سے چور مہذب بنائے جا سکتے ہیں۔ تو حاملینِ تہذیب کو خوش ہونا چاہیئے۔ کہ ان کے "تہذیبی مشن" میں اس وحشت سے مدد مل رہی ہے۔

بعض نام نہاد مفسر قرآن بھی اس کوشش میں ہیں کہ قطع ید (ہاتھ کاٹنا) کی سزا کو چوری کی انتہائی سزا قرار دے کر اس سے ہلکی سزا دہی کا اختیار شریعت حقہ سے حاصل کر لیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ نہ تو چوری کی اس سے ہلکی سزا قرآن کریم میں کہیں موجود ہے اور نہ عہدِ نبوت یا عہدِ صحابہؓ میں اس کی کوئی نظیر پائی گئی کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے۔ کہ اتنے طویل عرصہ میں جتنے چور پکڑے گئے ہیں۔ ان میں ایک بھی ابتدائی چور نہ تھا جس پر کم از کم بیانِ جواز ہی کے طور پر "قطع ید" سے کوئی ہلکی ابتدائی سزا جاری کی جاتی؟ کسی ملحد نے پرانے زمانہ میں اس "حد سرقہ" پر یہ بھی شبہ کیا تھا۔ کہ جب شریعت نے ایک ہاتھ کی دیت پانسو دینار رکھی ہے تو اتنا قیمتی ہاتھ جس کے کٹنے پر پانسو دینار واجب ہوں، دس پانچ روپے کی چوری میں کس طرح کاٹا جا سکتا ہے؟ ایک عالم نے اُس کے جواب میں کیا خوب فرمایا تھا۔ **انها اذا کانت امینة" کانت ثمینة فلما خانت هانت** امین تھا۔ وہ قیمتی تھا جب چوری کر کے خائن ہوا تو ذلیل ہوا۔

واللہ عزیز حکیم : چونکہ وہ غالب ہے۔ اس لئے اُسے حق ہے کہ جو چاہے قانون نافذ کر دے کوئی چون وچرا نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ حکمت والا بھی ہے۔ اس لئے یہ احتمال نہیں کہ محض اپنے اختیارِ کامل سے کام لے کر کوئی قانون بے موقع نافذ کر دے۔ نیز وہ اپنے اقوال بدلنے کے اموال کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کرے۔ یہ اُس کی عزت و غلبہ کے منافی ہے اور چوروں ڈاکوؤں کو یونہی آزاد چھوڑ دے یہ اُس کی حکمت کے خلاف ہے۔

فمن تاب ..... عفو رحیم، یعنی توبہ اگر ٹھیک ٹھیک ہو جس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مالک کو چوری کا مال واپس کر دے اور اگر تلف ہو گیا ہو تو ضمان (بدلہ) دے اللہ اگر ضمان نہ دے سکے تو معاف کر دے اور اپنے فعل پر نادم ہو اور آئندہ کے لئے اس سے مجتنب رہنے کا عزم

Marfat.com

دیکھے تو اس طرح کی توبہ سے اُمید ہے کہ حق تعالیٰ اُخروی عقوبت، جس کے مقابلے میں دنیوی سزا کی کچھ حقیقت نہیں، اُس پر سے اٹھائے۔

الم تعلم ..... قدیر جب حقیقی سلطنت و حکومت اُسی کی ہے۔ تو بلاشبہ اُس کو یہ اختیار ہوگا کہ جسے مناسب جانے معاف کر دے اور جسے اپنے حکمت و عدل کے موافق سزا دینا چاہے سزا دے۔ اور نہ صرف یہ کہ اُسے معاف کرنے اور سزا دینے کے کلی اختیارات حاصل ہیں۔ بلکہ اُن اختیارات کے استعمال سے کوئی روکنے والا بھی نہیں کیونکہ ہر چیز پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے!

[1] اگرچہ قرآن مجید میں عموماً احکام میں خطاب مردوں کی طرف ہے، عورتیں تبعاً ان احکام میں داخل ہیں۔ لیکن اس آیت میں محض اس حکم کی تاکید ظاہر کرنے کی غرض سے چور مرد اور چور عورت دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سرقہ لغت میں چوری کو کہتے ہیں یعنی کسی کا مال جو حفاظت میں رکھا ہو چھپا کر لے جانا۔

یہاں تین قابل لحاظ باتیں ہیں ایک چوری کی گئی۔ آیت میں اس کی مقدار متعین نہیں ہے۔ جمہور علمائے مجتہدین نے مال کی تعیین کی ہے اور اُس کے لئے زمانۂ نزول کے محاورہ پر نگاہ رکھی ہے کہ جس چیز کو اُس زمانے میں مال سمجھا جاتا تھا اُس کی چوری پر سزا ہوگی۔ ایک آدھ کھجور، یا تبیل ساغلہ وغیرہ مال نہیں کہلاتا۔ پس اس کی مقدار امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ نے بعض احادیث اقوال اصحابؓ کے پیش نظر دس درہم قرار دی ہے۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور احمدؒ و اسحاقؒ نے تین درہم یا ربع دینار۔ امام داؤد ظاہری اور خوارج نے آیت کو مطلق رکھا اور ایک دمڑی کی چوری پر بھی اس سزا کا حکم دیا ہے۔

دوسری چیز یہ کہ جس مال کو چرایا گیا ہے وہ مالک کی حفاظت میں ہو کیونکہ راستہ میں پڑی ہوئی چیز کا اٹھا لے جانا عرف عام میں چوری نہیں کہلاتا۔ جمہور کی یہی رائے ہے۔ مگر داؤد ظاہری کا یہاں بھی اختلاف ہے وہ حفاظت کو شرط نہیں مانتے۔

تیسری بات سرقہ میں یہ ہے کہ لوگوں سے چھپا کر لے جائے کہ عادۃً لوگ اس کو دیکھیں تو پکڑ لیں۔ بالکل ظاہراً لے جانا۔ غصب اور سینہ زوری ہے چوری نہیں۔ اسی طرح گرہ کٹ اور جیب کترا بھی "چور" کی تعریف میں نہیں آتا۔ ان فعلوں کی سزا اور ہے لیکن سرقہ کی سزا نہیں۔ مسئلہ کی تفاصیل فقہ میں دیکھی جائیں۔

ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا لیکن اس کی مقدار بھی متعین نہیں فرمائی گئی۔ جمہور علماء نے حضورؐ کی سنت و حدیث سے ثابت کیا ہے کہ پہلی چوری پر داہنا ہاتھ پہنچے سے کاٹ دیا جائے گا۔

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲۹

Marfat.com

دوسری پر بایاں ہاتھ پہنچے سے اس کے بعد اگر باز نہ آئے تو اُسے قید کی سزا دی جائے گی۔ امام شافعیؒ تیسری اور چوتھی بار کے لئے پاؤں کاٹنے کی سزا دیتے ہیں۔

[1] **فاقطعوا ایدیھما** حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی قرأت جو شاذ طریقے سے ثابت ہوئی ہے اس میں اَیْمَانَھُمَا کا لفظ ہے اور ہاتھ سے جو دایاں ہاتھ مراد لیا گیا ہے وہ اس قرأت کی بناء پر نہیں بلکہ اس کے دوسرے دلائل موجود ہیں۔

چور کے ہاتھ کاٹنے کا طریقہ اسلام سے قبل بھی تھا۔ اسلام نے اسے مفصل و منظم کر دیا ہے۔ اسی طرح قساحت، دیت اور فرائض کے مسائل بھی کسی نہ کسی طور پر موجود تھے لیکن ان کی تکمیل و تنظیم کر دی گئی ہے۔

[2] فَاقْطَعُوْا کا حکم حاکموں، والیوں اور قاضیوں کو دیا گیا ہے اور ہاتھ کو گٹے (پہنچے) سے کاٹا جائے گا۔ کیونکہ سرقہ کا فعل ہتھیلی سے سرزد ہوتا ہے اور پہلے فعل پر دایاں ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ کیونکہ چیز کا لینا اور پکڑنا غالباً اُسی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور سرقہ کا فعل اقرار سے یا گواہی سے ثابت ہوتا ہے۔ اور سزا مقدم پیش ہوتے اور پکڑے جانے سے پہلے پہلے سچی توبہ سے ٹل جاتی ہے۔ لیکن صحت توبہ کے لئے مال مسروق کا اعادہ بھی شرط ہے مال موجود ہو تو بعینہٖ وہی ورنہ اُس کی قیمت مالک کو واپس کر دے۔

[3] اسلامی معاشرہ دارالاسلام میں رہنے والوں کے لئے۔ چاہے وہ کسی عقیدے اور دین پر ہوں! ۔ اطمینان بہم پہنچاتا ہے اور ہر ایک کے دل سے چوری کا خیال یا خطرہ نکال دیتا ہے۔ وہ انہیں زندگی اور کفایت کے اسباب بہم پہنچاتا ہے۔ تربیت و اصلاح کی ضمانت دیتا ہے، عدالت کی ذمہ داری لیتا ہے اور ہر انفرادی ملکیت کو حلال ذرائع سے کمانے کا انتظام کرتا ہے، ایسے معاشرے میں چوری کا خیال پیدا ہونا بہت نادر ہے کیونکہ اس کے اسباب و دواعی ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کسی سے یہ فعل سرزد ہو جائے تو اسلام کی سزا بھی شدید تر ہے۔ کیونکہ یہ انفرادی ملکیت اور اجتماعی امن و امان اور اطمینان کے خلاف تعدی ہے۔ سزا یقیناً سخت ہے لیکن شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے اور ملزم کو اپنے دفاع کا پورا حق اور پوری سہولت دی جاتی ہے۔

اسلامی نظام ایک کامل وحدت کا نام ہے اس کی جزئیات کی قدر و قیمت اور مقام انہیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۹۵۔
[2] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۱۳، ۱۱۵ تفسیر المنار ج ۶ ص ۳۷۱، ۳۸۴۔
[3] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۴۷، ۱۵۳۔

Marfat.com

اس نظام ہی کے اندر ان کے مناسب مقام پر رکھ کر متعین کیا جا سکتا ہے۔ غیر اسلامی نظام میں اسلام کی کوئی جزء لے کر بھونس دینا نہ فائدہ مند ہے نہ اُس سے وہ نظام اسلامی بن جاتا ہے کیونکہ اسلام چند منتشر اجزاء اور ٹکڑوں کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک کامل نظام حیات ہے جو زندگی کے تمام اطراف و جوانب کو محیط ہے۔

جہاں تک سرقہ اور اُس کے احکام کا تعلق ہے، اسلام سب سے پہلے ہر فرد کی آزادی اور حق ملکیت کے احترام و تقدیس کا اعلان کرتا ہے۔ زندگی کی تمام ضروریات انسان کی حفاظت کی ذمہ داری ریاست ہر فرد کا حق ہے کہ کھائے، پیئے، پہنے اور ایک گھر میں امن و امان سے رہے اُس کے لئے کام مہیا کرنا اور وسائل حیات اُسے دینا بھی حکومت اسلامیہ کے ذمہ ہے۔ اگر وہ کام نہیں کر سکتا۔ یا اُسے کام نہیں مل سکتا۔ تو سب سے پہلے اُس کے خاندان کے دوسرے افراد کا فرض ہے کہ اس کی ضروریات پوری کریں پھر اُس کے محلہ والوں کا یہی فرض ہے۔ پھر بیت المال کے ذمہ ہے کہ اُس کا حق مال زکوٰۃ میں سے اُسے دے۔ اگر وہ کافی نہ ہو۔ تو اُس کا وظیفہ مقرر کر دے اور اُس کا بوجھ مال داروں پر ڈالے، اُن سے لے کر اُسے دے دے۔ کیونکہ وہ ہر غیر حلال ذرائع سے جمع کئے ہوئے مال کی تقدیس و احترام اور ذاتی ملکیت کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اسی لئے اسلامی معاشرے میں طبقہ وارانہ حسد، بغض اور کشمکش کا امکان نہیں ہے۔ وہ نادار لوگ مال داروں پر چڑھ دوڑنے اور اُن سے مال و دولت چھین لینے کی اجازت کا روادار نہیں ہے۔ خاص طور اس لئے بھی کہ وہ انہیں محروم نہیں چھوڑتا اور ہر بنیادی ضرورت کی ذمہ داری لیتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اسلام لوگوں کے ضمیروں اور اخلاق کی تربیت کرتا ہے۔ وہ انہیں عمل کسب پر متوجہ کرتا ہے نہ کہ چوری چکاری وغیرہ پر۔ اگر کام نہ ملے اور محنت کرنے والے کو کافی نہ ہو تو اُس کی ضروریات کی ذمہ داری پاکیزہ وسائل و ذرائع سے خود اٹھاتا ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ اسلامی نظام میں کوئی شخص حاجت مند ہونے کی وجہ سے چوری نہیں کر پاتا۔ وہ ناجائز ذریعے سے مال کمانے اور جمع کرنے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ اور مال جمع کرنے کا یہ طریقہ اسلام نے حرام ٹھہرایا ہے اس سے امن و اطمینان غارت ہوتا ہے اور حلال مالوں کے مالکوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

اسلامی معاشرے میں ہر فرد کو جائز ذرائع سے روزی کمانے کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن سود، قمار، ذخیرہ اندوزی، مزدوروں کی حق تلفی کی ہرگز اجازت نہیں۔ اسلام اُس پر زکوٰۃ اور دوسرے حقوق عاید کرتا ہے اور اس کے بدلے میں اس کے مال کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔ پس سرقہ ہو یا کوئی اور آفت، وہ اس کو برداشت کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوتا

Marfat.com

چور جب اس سب کچھ کے باوجود چوری کرے گا۔ باوجودیکہ اُس کی ضروریات کا انتظام موجود ہے، جرائم کی حرمت کا اُسے علم ہے اور وہ دوسروں سے مال غصب یا سلب کرنے کا محتاج نہیں کیونکہ انہوں نے غصب وحرام سے مال جمع نہیں کئے ہوتے ۔ پس ایسا چور جو ان حالات میں بھی چوری سے باز نہیں آتا وہ غیر معذور ہے۔ اور جرم ثابت ہو جانے پر اُس کی رحمت و شفقت کا مستحق نہیں ہے۔

لیکن جب حاجت وغیرہ کا شبہ موجود ہو تو اسلام کا عام حکم یہی ہے کہ شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عام رمادہ کے قحط میں چوری کی سزا قطع ید نہیں دی تھی۔ اسی طرح جب حاطب رضؓ ابن ابی بلتعہ کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چرالی اور حضرت عمر رضؓ نے انہیں چوری کی سزا دینے کا ارادہ فرمایا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کا آقا انہیں بھوکا رکھتا ہے۔ پس حضرت عمر رضؓ نے ان پر سے حد ساقط کر دی اور ان کے آقا کو اونٹنی کی قیمت سے دُگنا تاوان بطور تادیب دینے کا حکم دیا۔

اسلامی سزاؤں کو اس پس منظر میں سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک کامل نظام کا جزو ہیں۔ وہ نظام ہر شخص کی ضروریات کا ذمہ دار ہے۔ اس میں طبقہ واریت بالکل نہیں ہے۔ اور وہ بچاؤ کے سامان سزاؤں کے اسباب سے پہلے مہیا کرتا ہے اور صرف اُن کو سزا دیتا ہے جو تعدّی کی کسی ضرورت یا تقاضے کے بغیر حد سے تجاوز کرتے ہیں۔

اس کے بعد سرقہ کی ایک خاص تعریف ہے اور سزا کی خاص شرائط ہیں۔ جن کے بغیر اس کا تحقق نہیں ہوتا۔ اور جہاں سرقہ کی تعریف صادق نہ آئے وہاں قطع ید کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ ہاں تعزیر ہو سکتی ہے جس کی مقدار حدّ سے کم ہو مثلاً کوڑے لگانا۔ محبوس کر دینا، یا بعض حالات میں فقط توبیخ و نصیحت۔ یہ قاضی اور امام کی رائے پر ہوتی ہے اور اس کا تعلق احوال و ظروف کے اختلاف سے ہوتا ہے۔۔۔۔

اور شبہ حد کو ساقط کر دیتا ہے۔ مثلاً بھوک یا حاجت کا شبہ، چرائے ہوئے مال میں شرکت کا شبہ، اعتراف کرکے مکر جانا جبکہ گواہ موجود نہ ہوں۔ اسی طرح گواہوں کا انحراف بھی شبہ ہے۔

امام ابو حنیفہ رحؒ کے نزدیک، جو چیز مباح الاصل ہو وہ اگر حفاظت میں ہو تو اُس کی چوری کی حدّ ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً پانی، شکار اور شرکت عامہ (یعنی شاملات) اسی طرح ان کے نزدیک ہر وہ چیز جو بہت جلد خراب ہو جاتی ہے۔ اُس کا چرانا بھی بوجہ شبہ حدّ کو واجب نہیں کرتا مثلاً تازہ کھانا، سبزیاں، گوشت، روٹی اور پھل وغیرہ۔ مگر ابو یوسف رحؒ کی رائے اس معاملے میں دوسرے تین اماموں کے ساتھ ہے مسائل کی تفصیل مطلوب نہیں نہ وہ ممکن ہے۔

Marfat.com

صرف یہ بتانا مدِ نظر ہے کہ اسلام سزاؤں کے معاملہ میں کتنا شفیق و رحیم ہے کہ شبہ سے حد کو ساقط کر دیتا ہے حضورؐ کا ارشاد ہے۔ ادرءوا الحدود بالشبہات حضرت عمرؓ فاروقؓ کا قول ہے کہ شبہات کی وجہ سے سزاؤں کا معطل کر دینا مجھے شہادت کی بنا پر سزائیں دینے سے زیادہ محبوب ہے۔

اور سرقہ میں قطع یدکی سزا کی علت یہ ہے کہ چور جب چوری کرنے کو سوچتا ہے۔ تو وہ صرف دوسروں کے کسب سے اپنے کسب کو بڑھانا چاہتا ہے۔ پس وہ حلال ذرائع سے کمانے کو حقیر جانتا ہے اس لئے حرام ذریعہ اختیار کر کے مال بڑھانا چاہتا ہے۔ صرف اپنے عمل کے نتیجے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کی محنت کے ثمرہ کا لالچ کرتا ہے۔ وہ اس طرح زیادہ اخراجات حاصل کرنا یا معاشرے میں اونچا ہونا چاہتا ہے یا محنت و مشقت کی تکلیف سے بچنا چاہتا ہے یا اپنے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہتا ہے پس وہ چیز جو اُسے سرقے پر ابھارتی ہے وہ کسب کی زیادتی یا ثروت کی زیادتی ہے۔ پس شریعت نے قطع یدکی سزا رکھ کر انسان کے دل کے اس لالچ یا اشتعال کا مقابلہ کیا ہے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹ دینا کسب کے نقص کو پیدا کرتا ہے کیونکہ عمل کے آلات ہاتھ پاؤں ہی ہیں اور کسب کا نقص ثروت کی کمی کا نتیجہ دیتا ہے ----------

---------- اور اس سے زیادہ اخراجات مہیا کرنے کا لالچ یا ترفع و تکبر کم ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے شخص کو شدید مشقت اور سخت جدوجہد کرنا ہوگی بہت کام کرنا پڑے گا اور اُس کا مستقبل مخدوش ہے۔

پس شریعت اسلام نے قطع ید کی سزا مقرر کر کے وہ نفسی عوامل دور کر دئے ہیں۔ جو جرم کے ارتکاب کا باعث ہوتے ہیں اور ایسے عوامل پیدا کئے ہیں جو سرقہ کے خلاف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر جرم کے ارتکاب کے عوامل غالب آجائیں تو اس سزا اور اس کی تکلیف سے وہ عوامل آئندہ دب جائیں گے اور وہ دوبارہ یہ کام نہ کرے گا۔

یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی شریعت میں سرقہ کی سزا قائم ہے اور واللہ یہ دنیا کی ابتداء سے آج تک کی بنیادوں سے بہتر ہے۔ موجودہ قوانین چوری کی سزا قید ٹھیراتے ہیں۔ لیکن یہ سزا اسے کم کرنے یا مٹانے میں ناکام رہی ہے۔ کیونکہ حبس کی سزا مجرم کے دل میں وہ نفسی عوامل پیدا نہیں کرتی جو اُسے سرقہ سے روکیں۔ اور یہ سزا صرف قید کی مدت تک ہی چور کو چوری سے روک سکتی ہے (بلکہ بعض چور تو قید خانہ میں بھی اس سے باز نہیں آتے) بلکہ باقاعدہ اس کی تربیت پاتے ہیں، جیل میں اُسے کمانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ اس کی تمام ضروریات کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ جیل سے نکل کر وہ عمل اور کسب کر سکتا ہے اور حلال یا حرام

Marfat.com

ذرائع سے اپنی ثروت پھر بڑھا سکتا ہے! وہ لوگوں کو شریف بن کر دھوکا بھی دے سکتا ہے۔ اگر وہ اس پر اعتماد کرنے لگیں۔ تو یہی اس کا مقصد ہے۔ ورنہ اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ لیکن قطع ید کی سزا چور اور کام کے درمیان حائل ہو جاتی ہے یا اُس کی قوت کسب کو بہت کم کر دیتی ہے۔ پھر وہ لوگوں کو دھوکا بھی نہیں دے سکتا نہ وہ اُس پر اعتماد کریں گے اور نہ کسی کے تعاون کی وجہ سے وہ دوبارہ اس جرم کے ارتکاب کی جرأت کر سکے گا۔ کیونکہ اُس کا کٹا ہوا ہاتھ اُس کے ماضی کا اعلان کرتا رہے گا۔ پس قید کی سزا سے تو چور کا نفع ہی نفع ہے ہاں اُسے نقصان اگر ہے تو صرف قطع ید کی سزا کی صورت میں ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ نفع کی صورت کو پسند کرے اور خسارہ سے بچے۔

اس کے بعد میں ان لوگوں پر حیران ہوں جو کہتے ہیں کہ انسانیت اور تہذیب موجودہ دور میں ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اُس کے ساتھ قطع ید کی سزا موافق نہیں۔ گویا تہذیب و انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جدید علوم اور گہرے منطق کا انکار کر دیں اور انسانی طبائع کو بھول جائیں۔ اور قوموں کے تجربات سے جان بوجھ کر جاہل بن جائیں۔ اپنی عقلوں کو لغو کر دیں اور اپنی فکر کے نتائج کو مہمل قرار دیں۔ اور اس قائل کا قول جو بلا دلیل ہے اور سوائے تہویل و تضلیل کے اُس کے پاس کچھ نہیں، اُسے تسلیم بھی کر لیں! حیرت کی بات یہ ہے کہ انسانیت اور تہذیب موجودہ دور میں مجرم کو سزا کی بجائے جزا و مکافات دینا چاہتی ہے؟ اور اُسے اپنی گمراہی پہ اڑے رہنے اور اور کھل کھیلنے پر اس کی پیٹھ ٹھونکتی ہے؟ کیا وہ چاہتی ہے کہ سب لوگ خوف و اضطراب میں زندگی گزار دیں؟ اور محنت و مشقت کریں تاکہ بیکار لوگ اور چور ان کے عمل کے نتائج کو لے اڑیں؟

اگر وہی سزا برحق ہے۔ جسے موجودہ انسانیت اور تہذیب کے ساتھ متفق کیا جائے تو قید کی سزا کو ختم کر دینا اور قطع ید کی سزا کو نافذ قائم کرنا لازم و برحق ہو چکا ہے۔ کیونکہ یہ سزا علم نفسیات کی میزان پہ پوری اترتی ہے اور قوموں کی طبائع و تجربات کے بالکل مطابق ہے اور عقول و اشیاء کے منطق کے عین موافق ہے۔ یہی وہ بنیادیں ہیں۔ جن پہ تہذیب و انسانیت قائم ہیں۔ لیکن جنس کی سزا عقل و علم اور تجربے کی بنیاد پہ قائم نہیں ہے۔ اور عقول و اشیاء کی منطق و طبیعت کے خلاف ہے۔

قطع ید کی سزا انسان کی عقلیت و نفسیت پر قائم ہے اس لئے یہ ایسی سزا ہے جو افراد کے مناسب حال ہے اور جماعت کے لئے بھی بالکل مناسب ہے کیونکہ اس سے جرائم کم ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں امن و سلامتی پیدا ہوتی ہے اور سزا جب فرد جماعت کے حسب حال ہے تو وہ بہترین اور منصفانہ سزا ہے۔ اور جو لوگ اس سزا کو سنگ دلی کہتے ہیں اُن کی دلیل لودی ہے کیونکہ عقوبت کا مادہ عقاب ہے اور عقاب (سزا) عقاب دہ ہی نہیں سکتا

Marfat.com

اگر اس میں ضعف اور ڈھیلا پن پایا جائے۔ بلکہ وہ کھیل تماشا اور ہنسی عبث ہو جاتا ہے۔ پس عقوبت میں سنگدلی کا عنصر لازم ہے تاکہ اُسے یہ نام (عقوبت) دیا جا سکے۔

وہ کون عقل کا اندھا ہوگا۔ جو اپنے آپ کو یا کسی اور کو اللہ رب العالمین، ارحم الراحمین سے بھی زیادہ رحیم و شفیق ٹھیرائے! اللہ نے مجرم کو جرم سے روکنے کے لئے یہ سزا مقرر کی ہے۔

جزآءً بما کسبا نکالاً من اللہ پس یہ فرد و جماعت دونوں پر رحمت ہے تاکہ جرم نہ ہوں اور امن و امان قائم رہے زمانہ کی تاریخ شاہد ہے کہ ابتدائی صدیوں میں یہ سزا صرف چند ہی آدمیوں کو ملی تھی۔ کیونکہ اس کے اسباب و دواعی بہت کم تھے۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھا ہے اور اصلاح کے مواقع ہر وقت موجود ہیں۔

جزاء و سزا کے قانون کا مدار اللہ کی سلطنت و اقتدار پر ہے اس میں کوئی تعدد یا تقسیم و حزبی نہیں۔ کائنات کا نظام اسی پر درست رہ سکتا ہے ورنہ فساد ہی فساد ہے۔

ولو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ ھو الذی فی السمآء اللہ و فی الارض اِلٰہ؟

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ

اے رسول غم نہ کر ان کا جو دوڑ کر کرتے ہیں

فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا

کفر میں وہ لوگ جو کہتے ہیں "ہم مسلمان ہیں"

مع بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَ

اپنے منہ سے اور ان کے دل مسلمان نہیں اور

مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ

اور وہ جو یہودی ہیں جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے

سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ لَمْ یَاْتُوْكَ ؕ یُحَرِّفُوْنَ

کے لئے وہ جاسوس ہیں دوسری جماعت کے جو تجھ تک نہیں آئے

Marfat.com

اَلْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ

بدل ڈالتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانہ نہ چھوڑ کر کہتے ہیں اگر

اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ

تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا اور اگر یہ حکم نہ

تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ

ملے تو بچتے رہنا اور جس کو اللہ نے

فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ

فتنہ میں ڈالنا چاہا تو تو اس کے لیے اللہ کے ہاں کچھ نہیں کر سکتا

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ

یہ وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ ان

يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا

دل پاک کرے۔ اور ان کو دنیا میں

خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۱۹

ذلت ہے اور ان کو آخرت میں بڑی سزا ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ

جاسوسی کرنے والے ہیں جھوٹ بولنے کے لیے اور بڑے حرام کھانے والے

جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ

ہیں سو اگر وہ تیرے پاس آویں تو فیصلہ کر دے ان میں یا منہ پھیر لے

عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ

ان سے۔ اور اگر تو منہ پھیر لے گا ان سے تو وہ تیرا کچھ نہ

Marfat.com

يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ

بگاڑ سکیں گے ۔ اور اگر تو فیصلہ کرے تو فیصلہ کر

بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

ان میں انصاف سے بیشک اللہ دوست رکھتا ہے انصاف کرنیوالوں کو

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ

اور وہ تجھ کو کس طرح منصف بنائیں گے اور ان کے پاس تورات

فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ

ہے ۔ جس میں حکم ہے اللہ کا پھر اس کے بعد یہ پھرے جاتے

ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع ۶ ۱۰

ہیں ۔ اور وہ ہرگز ماننے والوں میں نہیں ہیں ۔

لہ یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ پچھلی آیات میں ڈکیتی اور چوری وغیرہ کی حدود بیان کی گئی ہیں ۔ اب بعض ان اقوام کا حال سناتے ہیں جنہوں نے "حدود اللہ" میں تحریف کر کے اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق ٹھیرایا ۔ ان کا مفصل واقعہ بغوی رحمۃ نے یہ لکھا ہے کہ خیبر کے ایک یہودی مرد اور عورت نے جو کنوارے نہ تھے، زنا کیا ۔ باوجودیکہ تورات میں اس جرم کی سزا "رجم" (سنگسار کرنا تھی ۔ مگر ان دونوں کی بڑائی مانع تھی ۔ کہ یہ سزا جاری کی جائے آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ شخص جو "یثرب" میں ہے (یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی کتاب میں زانی کے لئے رجم کا نہیں کوڑے مارنے کا حکم ہے ۔ تو بنی قریظہ کے یہود میں سے کچھ آدمی ان کے پاس بھیجو ۔ کیونکہ وہ ان کے ہمسایہ ہیں اور اُن سے صلح کا معاہدہ بھی کر چکے ہیں ۔ وہ ان کا خیال معلوم کر لیں گے ۔ چنانچہ ایک جماعت اس کام کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کرنے کے لئے روانہ کی گئی کہ وہ "زانی محصن" کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں ۔ اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیں تو اُن پر رکھ کر قبول کر لو ۔ اور رجم کا حکم دیں تو مت مانو ۔ ان کے دریافت کرنے پر حضور نے فرمایا کہ تم میرے فیصلہ پر رضامند ہو گے ؟ انہوں نے اقرار کر لیا ۔ خدا کی طرف سے جبرئیل رجم کا حکم لے آئے ۔ مگر وہ اپنے اقرار سے پھر گئے ۔ تو حضور نے فرمایا کہ فدک کا رہنے والا ابن صوریا تم میں کیسا شخص ہے ؟

لہ فوائد القرآن ص ۱۴۶

Marfat.com

سب نے کہا کہ آج روئے زمین پر "شرائع موسویہ" کا اُس سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں۔ آپؐ نے اس کو بلوایا۔ اور نہایت ہی شدید حلف دے کر پوچھا۔ کہ تورات میں اس گناہ کی سزا کیا ہے؟ باوجودیکہ دوسرے یہود اس حکم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ جس کا پردہ حضرت عبداللہؓ بن سلام کے ذریعہ سے فاش ہو چکا تھا۔ تاہم ابن صوریاء نے جو اُن کا مسلّم معتمد تھا کسی نہ کسی وجہ سے اقرار کر لیا۔ کہ تورات میں بے شک اس جرم کی سزا رجم ہی ہے۔ بعدہٗ اُس نے سب حقیقت ظاہر کی کہ کس طرح یہود نے رجم کو اڑا کر زنا کی سزا یہ رکھ دی کہ زانی کو کوڑے لگائے جائیں اور کالا منہ کر کے اور گدھے پر سوار کر کے گشت کرایا جائے۔ الحاصل حضورؐ پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مرد و عورت پر رجم کی سزا جاری کی اور فرمایا اے اللہ! میں پہلا شخص ہوں۔ جس نے آج دنیا میں تیرے حکم کو زندہ کیا۔ بعد اس کے کہ نہ اسے مُردہ کر چکے تھے۔

من الذین قالوا امنا ... ومن الذین ھادُوا یعنی منافقین و یہود یعنی قریظہ **سماعون ... لو یأتوک** : **سمّاعون** کا معنی ہے بہت زیادہ سننے والے اور کان دھرنے والے پھر بہت زیادہ سُننا کبھی تو جاسوسی پر لے جاتا ہے اور کبھی اس کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں۔ کہ بہت زیادہ قبول کرنے والے" جیسے **سمع اللہ لمن حمدہ** میں سننے کا معنیٰ ہے قبول کرنا۔ ابن جریرؒ وغیرہ محققین نے دوسرے معنے اختیار کئے ہیں۔ **سماعون لکذب** کا معنیٰ ہے جھوٹ کو بہت زیادہ ماننے اور باطل کو قبول کرنے والے **سمّاعون لقوم** آخرین یعنی دوسری جماعت جس نے انہیں بھیجا ہے اور خود تمہارے پاس نہیں آئی۔ یہ اُن کی بات کو بہت زیادہ ماننے والے ہیں۔

یحرفون الکلم الخ یعنی خدا کے احکام میں تحریف کرتے ہیں یا کہیں کی بات کہیں کی لگا دیتے ہیں۔

یقولون ... فاحذروا :- یعنی اگر کوڑے لگانے کا حکم ملے تو قبول کرو ورنہ نہیں۔ گویا خدا کی شریعت کو اپنی ہوا (خواہش نفس) کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔

و من یرد اللہ فتنتہ ... شیئا ہدایت و ضلالت اور خیر و شر کوئی چیز بھی بدون ارادۂ خداوندی عالم وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جس کا انکار کرنا اس کے تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل ہے فرض کرو کہ ایک شخص چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ لیکن خدا کا ارادہ یہ ہے کہ چوری نہ کرے۔ اب وہ شخص اگر اپنے ارادے میں کامیاب رہا تو لازم آتا ہے کہ خدا اُس کے مقابلہ میں معاذ اللہ عاجز ہو۔ اور اگر خدا ہی کا ارادہ بندہ کے ارادے پر غالب رہتا ہے تو لازم آتا ہے کہ دنیا میں کہیں چوری وغیرہ کسی شر کا وجود نہ رہے اور اگر خدا تعالیٰ خیر و شر میں سے کسی کا ارادہ نہیں کرتا تو اس سے معاذ اللہ اُس کا تعطّل یا غفلت و سفاہت لازم

Marfat.com

لازم آتی ہے۔ تعالیٰ اللہ عن کل آثار حدوث تقدس ان تمام شقوں پر غور کرنے کے بعد چارو ناچار یہی ماننا پڑے گا۔ کہ کوئی چیز بھی اُس کے ارادۂ تخلیق کے بغیر موجود نہیں ہو سکتی۔ یہ مسئلہ نہایت مبہم اور طویل الذیل ہے۔

اولئک الذین ... قلوبھم :- اوّل منافقین اور یہود کا طرزِ عمل بیان فرمایا جس میں یہ چند اعمال بالخصوص ذکر کئے گئے: ہمیشہ جھوٹ اور باطل کی طرف جھکنا، اہلِ حق کے خلاف جاسوسی کرنا، بدباطن اور شریر جماعتوں کو مدد پہنچانا، ہدایت کی باتوں کو تحریف کر کے بدل ڈالنا، اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف کسی حق بات کو قبول نہ کرنا۔ جس قوم میں یہ خصال پائی جائیں۔ اُس کی مثال ایسے مریض کی سمجھو جو نہ دوا استعمال کرے، نہ مہلک اور مضر چیزوں سے پرہیز پر قائم رہ سکے، اطباء اور ڈاکٹروں کا مذاق اڑائے، خیرخواہی کرنے والوں کو گالیاں دے، نسخہ پھاڑ کر پھینک دے یا اپنی رائے سے اُس کے اجزاء بدل ڈالے اور یہ بھی عہد کر لے کہ جو دوا میری خواہش اور مرضی کے خلاف ہوگی، کبھی استعمال نہ کروں گا۔ ان حالات کی موجودگی میں کوئی ڈاکٹر یا طبیب خواہ اُس کا باپ ہی کیوں نہ ہو اگر معالجہ سے دست بردار ہو کر یہی ارادہ کر لے کہ ایسے مریض کو اب اُس کی بے اعتدالیوں، غلط کاریوں، ضد اور ہٹ کا خمیازہ بھگتنے دے۔ تو کیا یہ طبیب کی بے رحمی یا بے اعتنائی کا ثبوت ہوگا۔ یا خود مریض کی خودکشی سمجھی جائے گی؟ اب اگر مریض اس بیماری سے ہلاک ہو گیا تو طبیب کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ کہ اُس نے علاج نہیں کیا اور تندرست کرنا نہ چاہا۔ بلکہ بیمار خود ملزم ہے کہ اُس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو تباہ کیا اور طبیب کو موقع نہ دیا کہ وہ اُس کی صحت کو واپس لانے کی کوشش کرتا۔ ٹھیک اسی طرح یہاں یہود کی شرارت، ہوا پرستی، ضد اور ہٹ دھرمی کو بیان فرما کر یہ لفظ ارشاد ہوئے **ومن یرد اللہ فتنتہ** الخ جس کو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا اور **اولئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم** یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ خدا نے ان کی سوئے استعداد اور بدکاریوں کی وجہ سے اپنی نظرِ لطف و عنایت اُن پر سے اٹھا لی۔ جس کے بعد اُن کے راہ پر آنے اور پاکیزگی قبول کرنے کی کوئی توقع نہیں رہی آپ اُن کے غم میں اپنے آپ کو نہ گھلائیں **ولا یحزنک الذین** الخ باقی یہ شبہ کہ خدا تو اس پر بھی قادر تھا۔ کہ اُنکی سب شرارتوں اور غلط کاریوں کو جبراً روک دیتا اور مجبور کر دیتا کہ وہ کوئی ضد اور ہٹ دھرمی کر ہی نہ سکیں۔ تو بے شک میں تسلیم کرتا ہوں کہ خدا کی قدرت کے سامنے یہ چیز کچھ مشکل نہ تھی۔ **ولو شاء ربک لا من من فی الارض کلھم جمیعاً** لیکن اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر و شر کے اکتساب میں مجبور محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اختیار پر سب

Marfat.com

کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور حق تعالیٰ کی بہت سی صفات الٰہی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لئے کوئی محل نہ ملتا مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم، ذوالبطش الشدید، قائم بالقسط، مالک یوم الدین وغیرہ۔ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے سے غرض یہی ہے کہ اُس کی تمام صفاتِ کمالیہ کا مظاہرہ ہو۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو قابلِ مختار مانتا ہے۔ انجام کار اس کے سوا کوئی دوسری غرض نہیں بتلا سکتا۔ **لیبلوکم ایکم احسن عملاً** (سورہ ملک) اس سے زیادہ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ **فان جاؤک فاحکم بینھم او اعرض عنھم** (ابن عباس) مجاہدؒ اور عکرمہؒ وغیرہ اکابر سلف کا قول ہے کہ حضورؐ کو یہ اختیار ابتداء میں تھا۔ آخر میں جب اسلام کا تسلط کامل اور نفوذ ملکی ہو گیا تو ارشاد ہوا: **وان احکم بینھم بما انزل اللہ** یعنی ان کے نزاعات کا فیصلہ قانونِ شریعت کے مطابق کر دیا کرو۔ مطلب یہ کہ اعراض اور کنارہ کشی کی ضرورت نہیں۔

وان حکمت فاحکم ..... المقسطین قرآن کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر، ظالم اور بدمعاش کیوں نہ ہو، مگر اُس کے حق میں تمہارا دامن عدالت ناانصافی کے چھینٹوں سے داغدار ہونے پائے یہی وہ حقیقت ہے۔ جس کے سہارے زمین و آسمان قائم ہیں اور ان کا نظام قائم رہ سکتا ہے۔

وکیف یحکمونک ..... بالمومنین یعنی تعجب کی بات ہے کہ آپؐ کو حکم ٹھیراتے ہیں۔ اور جس تورات کو کتاب آسمانی مانتے ہیں اس کے فیصلہ پر بھی راضی نہیں۔ تو حقیقت میں اُن کا ایمان کسی پر بھی نہیں۔ نہ قرآن پر نہ تورات پر۔ اگلے رکوع میں توراۃ و انجیل کی مدح فرما کر متنبہ کیا ہے کہ کیسی عمدہ کتاب اور کیسے علوم ہدایت تھے۔ جن کی ان نالائقوں نے بے قدری کی اور انہیں ایسا ضائع کیا کہ آج اصل چیز کا پتہ لگانا بھی مشکل ہو گیا ہے آخر حق تعالیٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ سے بالکل آخر میں وہ کتاب بھیجی جو ان سب پہلی کتابوں کے مطالب اصلیہ کی محافظ اور مصدق ہے اور جس کی ابدی حفاظت کا انتظام نازل کرنے والے نے خود اپنے ذمہ لیا ہے۔

لہ علامہ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ان آیتوں میں ان لوگوں کی مذمت بیان ہوئی ہے جو اپنی رائے، قیاس اور خواہشِ نفسانی کو خدا کی شریعت پر مقدم رکھتے ہیں۔ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے نکل کر کفر کی طرف بھاگتے رہتے ہیں۔ گو یہ لوگ زبانی ایمان کے دعوے کریں لیکن ان کے دل ایمان سے خالی ہیں۔ منافقوں کی یہی حالت ہے کہ زبان کے کھرے دل کے کھوٹے ہیں۔

لہ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۹۹۔

Marfat.com

اور یہی خصلت یہودیوں کی ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے دشمن ہیں۔ جھوٹ کو مزے لے لے کر سنتے اور دل کھول کر قبول کرتے ہیں لیکن سچ سے بھاگتے اور نفرت کرتے ہیں۔ حضورؐ کی مجلس میں دوسروں کی جاسوسی کرنے آتے اور لگائی بجھائی کا کام کرتے رہتے تھے۔

یہودیوں کے عالم نے حضورؐ کی مجلس میں جب تورات پڑھی تو آگے پیچھے سے پڑھتا تھا لیکن آیت رجم پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ موجود تھے انہوں نے اس کی وہ شرارت ظاہر کی اور اس کا ہاتھ اٹھوا کر آیت رجم پڑھوائی۔ تو صاف رجم کا حکم نکل آیا اور ان یہودیوں کو بھی اقرار کرتے ہی بنی۔

دراصل تورات کو منگوانا اور ان کے عالموں کو بلوانا وغیرہ سب اُن کو الزام دینے کے لئے تھا۔ نہ اس لئے کہ وہ اسی کو ماننے کے مکلف تھے، نہیں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان واجب العمل ہے اس سے مقصد ایک تو حضورؐ کی سچائی کا اظہار تھا۔ کہ خدا کی وحی سے آپؐ نے یہ معلوم کر لیا کہ ان کی تورات میں بھی حکم رجم موجود ہے اور یہی نکلا۔ دوسرے ان کی رسوائی کہ انہیں اپنے پہلے کے انکار کے بعد اقرار کرنا پڑا اور دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ یہ لوگ فرمانِ خدا کے چھپا لینے والے ہیں اور اپنی رائے اور قیاس پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ یہ لوگ سچے دل سے حضورؐ کے پاس کچھ اس لئے نہیں آئے تھے کہ آپؐ کی حکم برداری کریں گے۔ بلکہ محض اس لئے آئے تھے۔ کہ اگر آپؐ سے بھی اپنے اجماع کے موافق پائیں گے تو اسے لیں گے ورنہ ہرگز قبول نہ کریں گے۔ اسی لئے فرمایا ہے کہ جنہیں خدا گمراہ کر دے تو انکی کسی قسم کی راستی کا کوئی بھی مختار نہیں ہے۔

پھر ان کی خباثت، بدباطنی اور سرکشی بیان ہو رہی ہے ایک طرف تو اس کتاب اللہ کو چھوڑ رکھا ہے۔ جس کی حقانیت اور اتباع کے خود بھی قائل ہیں۔ دوسری طرف اُس جانب جھک رہے ہیں جسے نہیں مانتے اور جسے جھوٹ مشہور کر رکھا ہے اور پھر اس میں بھی نیت یہ ہے کہ اگر وہاں سے ہماری خواہش کے مطابق حکم ملا تو لے لیں گے ورنہ چھوڑ دیں گے۔ اسی لئے فرمایا ہے کہ یہ آپؐ کی حکم برداری کیسے کریں گے؟ انہوں نے تو تورات کو بھی چھوڑ رکھا ہے جس میں حکم خدا ہونے کا اقرار خود انہیں بھی ہے۔ لیکن پھر بھی بے ایمانی کر کے اس سے پھر جاتے ہیں۔

[1] فَاِنْ جَآءُوْكَ الخ نخعیؒ، شعبیؒ، قتادہؒ، عطاءؒ اور ابوبکر اصمؒ کہتے ہیں کہ حضورؐ کو ان میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار تمام حکام میں اور احکام

---

[1] تفسیر حقانی ص ۳۲ ج ۴

Marfat.com

میں کفار کی نسبت باقی ہے۔ ابن عباسؓ۔ مجاہدؒ، حسن بصریؒ اور عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ حاکم اسلام کو جبکہ اُس کے پاس کفار کا جھگڑا آئے، خواہ وہ اہل ذمہ ہوں یا نہ ہوں بموجب آیت **وان احکم بینھم بما انزل اللہ** قانون آسمانی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے۔ بجز نیچریوں (ملحدوں) کے کسی کا یہ قول نہیں کہ کفار میں ان کے قانون کے مطابق حاکم اسلام فیصلہ کرے۔

یسارعون فی الحزن[1] : وہ غم جو انسان کو کسی محبوب چیز کے فوت ہو جانے سے لاحق ہو۔

الکفر وہ کفر کے اندر رہ کر اُس کی طرف جلدی کرتے ہیں۔ یہاں کفار ظرفِ کفر کے اندر داخل تھے، کُفر کے پردے اُن پر محیط تھے۔ فی کی بجائے اگر الی ہو یعنی یسارعون الیہ تو اس کا معنی ہے۔ باہر سے کسی چیز میں داخل ہونے یا اُس تک پہنچنے کے لئے تیز تیز دوڑنا۔ فتنۃ کا معنی ہوتا ہے۔ جانچنا، امتحان لینا اور حقیقت معلوم کرنا جیسا کہ سونا کٹھالی میں ڈال کر اُس کا میل کچیل اور کھوٹ دیکھا جاتا ہے اسے کہتے ہیں۔ **فتن الذھب**

سحت کا معنی ہے خبیث اور حرام کمائی جس سے عار لازم آئے اور جس کا ذکر بھی قبیح ہو جیسے کتے کی قیمت، خنزیر اور شراب کی قیمت اور رشوت۔

القسط کا معنی ہے عدل و انصاف۔

احمدؒ، مسلمؒ، ابوداؤدؒ، ابن جریرؒ اور ابن المنذرؒ نے براء بن عازبؓ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گزرتے ہوئے ایک یہودی کو دیکھا جس کا منہ کالا کیا ہوا تھا اور اسے کوڑے لگائے گئے تھے تو آپؐ نے یہودیوں کو بلا کر فرمایا: "کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی یہی سزا پاتے ہو؟ اُنہوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپؐ نے ان کے علماء میں سے ایک کو بلایا اور اس سے فرمایا: میں تجھے اس خدا کی قسم دیتا ہوں۔ جس نے موسیٰؑ پر تورات اتاری، کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی سزا اس طرح پاتے ہو؟ اس نے کہا واللہ نہیں! اور اگر آپؐ نے مجھے یہ قسم نہ دی ہوتی تو میں آپؐ کو نہ بتاتا۔ ہم اپنی کتاب میں زانی کی سزا رجم (پتھراؤ کرنا) پاتے ہیں لیکن ہمارے اشراف میں زنا کی کثرت ہو گئی تھی۔ لہٰذا جب ہم شریف آدمی کو اس جرم میں پکڑتے تھے تو اسے چھوڑ دیتے تھے۔ اور جب کمزور آدمی کو پکڑتے تھے تو اس پر حد قائم کرتے تھے۔ پھر ہم نے کہا کہ آؤ کسی ایک سزا پر جمع ہو جائیں جو شریف اور حقیر سب پر قائم کیا کریں۔ چنانچہ ہم نے رجم کی بجائے منہ کالا کرنا اور دُرّے مارنا مقرر کر دیا۔

امام احمدؒ، بخاریؒ اور مسلم نے جناب عمر رضی اللہ عنہ سے ایک یہودی عورت اور مرد

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۱۶، ۱۲۲ تفسیر المنار ج ۶ ص ۲۸۵، ۳۱۶

Marfat.com

زنا کا قصّہ روایت کیا ہے (جسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے)

اللہ تعالیٰ نے جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے بہت سے مقامات میں یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ سے خطاب کیا ہے اور یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ سے دو مقامات پر خطاب فرمایا ہے۔ ایک یہ مقام اور دوسرا آگے آرہا ہے **یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ مِنْ رَّبِّکَ** اور یہ خطاب تشریف و تعظیم کے لئے اور اہل ایمان کو ادب سکھانے کے لئے ہے تاکہ وہ حضورؐ کو آپ کے وصف سے خطاب کیا کریں۔ جیسا کہ آپؐ کے اصحاب یا رسُول اللہ کہہ کر آپ سے مخاطب ہوتے تھے۔ بعض بدوؤں نے اپنی خشونت (کھردرا پن) اور سادگی سے آپؐ کا نام لے کر (یا محمد کہہ کر) پکارا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ الحجرات میں اس سے منع فرمایا **لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا** اس کے بعد اہل ایمان نے حضورؐ کو اس طرح پکارنا ترک کر دیا۔

اس آیت میں حُزن (رنج و غم) سے نہی فرمائی گئی ہے حالانکہ وہ ایک فطری امر ہے اور اس میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں۔ لیکن نہی سے مراد لوازمِ حُزن سے ممانعت ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ جان بوجھ کر مصائب کا ذکر کرتے ہیں۔ اور ان کی شان کو بلند کرتے ہیں اور اس چیز سے رنج و غم تازہ ہوتا ہے اور صبر و تسلّی بعید ہو جاتی ہے۔

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِہٖ یعنی تورات کے کلمات کو اُس کی جگہوں میں رکھ دیئے جانے کے بعد بدل ڈالتے ہیں۔ یا تو لفظی تحریف کرتے ہیں مثلاً ایک کلمہ کی جگہ دوسرا رکھ دیا اُسے چھپا ڈالا اور لوگوں پر ظاہر نہ کیا یا کچھ تورات میں زیادتی یا کمی کر دیتے تھے۔ الخ۔ یا اس سے مراد تحریف معنوی بھی ہے یعنی لفظ کو اس کے موضوع کہ معنیٰ کے علاوہ کسی اور معنیٰ پر محمول کرنا۔

وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتْنَتَہٗ یعنی اللہ جس کے دین و ایمان کا امتحان کرنا چاہے اور امتحان اس کے کفر و ضلالت کو ظاہر کر دے تو آپؐ اس کی رشد و ہدایت کے مالک اور ذمہ دار نہیں۔ ان منافقوں اور یہود کا اللہ نے امتحان لیا اور اُس امتحان نے ان کے کفر و فساد کی مقدار کو واضح کر دیا ہے۔ پس وہ جھوٹ بولتے ہیں اور حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ تحریف کرتے ہیں اور کتاب الٰہی کے احکام کو چھپاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اپنی خواہشاتِ نفس کے اتباع میں اور اپنے رئیسوں کی رضا حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں اُن کے کفر کی طرف دوڑنے کا غم مت کر اور ایمان کی طرف آنے کی امید و طمع کو قطع کر دو ان کی ایذاء رسانی کا بھی خیال نہ کرو۔ کیونکہ انجام کار متقین کے لئے ہے اور ان لوگوں کے لئے ذلت و رسوائی ہے۔

اللہ نے ان کے دلوں کو پاک کرنا نہیں چاہا۔ کیونکہ اُس کا ارادہ نفوس بشر میں اُس کی سنتِ عادلہ کے تقاضے کے ماتحت ہوتا ہے۔ جب کوئی نفس باطل کا عادی ہو جائے

Marfat.com

اور کید و شر پر مستمر ہو جائے اور خلاف و ضرر کو مالوف جانے تو اُس کا گناہ اسے محیط ہو جاتا ہے اور اُس کی تاریکی اُس پر چھا جاتی ہے اور اُس کے سامنے نورِ حق کے لئے کوئی منفذ باقی نہیں رہتا۔ وہ دل نصیحت پانے اور غور و فکر کے قابل نہیں رہتے اور اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کو ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے۔ چونکہ یہودی رؤسا اور ان کے چیلے چانٹے اپنی قابلیت کو گم کر چکے ہیں۔ اور ان کی طبائع کفر و نفاق کے سوا کسی چیز کو قبول ہی نہیں کرتیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ارادہ ان کی تطہیر کے ساتھ متعلق نہیں ہوتا۔ ورنہ یہ چیز اُس کی سُنّت کے تقاضے کے خلاف ہوتی اور خلق میں اُس کے نظام کو تبدیل کرنے کا باعث ہوتی۔ حالانکہ اللہ کی سُنّت کبھی نہیں بدلتی۔

لھم فی الدنیا خزی الخ ۔ دنیا میں منافقوں کی ذلت ان کی پردہ دری سے ہوئی اور پیغمبرؐ کو ان کے جھوٹ اور دوسرے کرتوتوں کی اطلاع دی گئی۔ اس طرح وہ لوگ قتل کے خوف سے کانپتے رہے یہ بھی ذلت تھی۔ یہود کی تحریف ظاہر ہو گئی۔ جس سے ان کی رسوائی ہو گئی۔ حق اُن کے باطل پر غالب آگیا۔ اور اللہ کی وعید سچی ثابت ہوئی۔ اسی طرح ہر وہ شخص یا جماعت جو محض کسی پیغمبر سے انتساب کو کافی جانتی ہے اور اس کی ہدایت کا اتباع نہیں کرتی ذلیل و رسوا ہو کر رہتی ہے۔ کوئی بھی ہو!

تسمعون لکذب الخ ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ وصف کہ وہ بہت کثرت سے جھوٹ کا سماع کرتے ہیں۔ تاکید اور معنیٰ کی تقریر کے لئے دہرایا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ متکلم کو اس کا کتنا اہتمام ہے۔ اور یہ بیان کرنا مدِّنظر ہے کہ ان کا سارا معاملہ جھوٹ پر مبنی ہے جو تمام رذائل سے بُرا اور سب مفاسد سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ ذلیل قوموں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ کی پناہ لیتی ہیں۔ اور اپنے آپ کو پہنچنے والے متوقع نقصان سے اس کے ذریعے سے بچانا چاہتی ہیں۔

اسی طرح اُس قوم کے اندر رشوت بھی عام ہو چکی تھی۔ کیونکہ وہ ناجائز رعایت اور فیصلوں میں رشوت پر زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے باہمی معاملات بگڑ چکے تھے اور انہوں نے طمع کو عفت کے بدلے اختیار کر لیا تھا۔ یہود کے علماء نزولِ قرآن کے زمانے میں رشوت وغیرہ کے ذریعہ سے حرام خوری کیا کرتے تھے اور کمینگی میں مبتلا تھے۔ جس طرح کہ زوال اور پستی کے زمانے میں سب قوموں کا یہی حال ہو جاتا ہے۔

فاحکم بینھم او اعرض عنھم ۔ یہ تخییر معاہدین کے ساتھ خاص ہے اہلِ ذمہ کا حکم اور ہے۔ مسلم حکام پر واجب نہیں ہے کہ ان اجنبیوں کے درمیان فیصلے کریں۔ جو انکے علاقوں میں ہیں گویا وہ ان کے پاس مقدمہ لے کر آئیں۔ بلکہ انہیں اختیار دیا گیا ہے کہ مصلحت کے مطابق جو مناسب ہے کریں۔

Marfat.com

لیکن اہلِ ذمّہ جب ہم سے فیصلہ کرانا چاہیں تو ہم یہان میں فیصلہ کرنا لازم ہے کیونکہ جن لوگوں سے جزیہ لیا جائے۔ ان پر خرید و فروخت۔ میراث اور تمام عقود کے معاملات میں احکام اسلام جاری ہوتے ہیں۔ لیکن خمر اور خنزیر کی بیع اس سے مستثنیٰ ہے۔ انہیں اس کی تو اجازت ہوگی۔ لیکن وہ مسلمانوں کی مانند زنا سے روکے جائیں گے۔ کیونکہ وہ ان کے ہاں بھی ممنوع ہے۔ لیکن انہیں رجم نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی شرائط میں سے ایک اسلام بھی ہے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ الخ یعنی ان کا معاملہ بڑا عجیب ہے کہ تورات کو مانتے بھی ہیں۔ لیکن اس پر عمل نہیں کرنا چاہتے اور اس لئے اس کے خلاف فیصلہ لینے کی غرض سے آپؐ کے پاس آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تورات پر ان کا ایمان صحیح نہیں اور نہ وہ آپؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب آپؐ کا فیصلہ ان کی خواہشات کے خلاف ہو تو اُسے بھی نہیں مانتے۔

موجودہ تورات کی کتاب استثناء میں رجم کا حکم اور اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ جو یقیناً نزولِ قرآن کے وقت میں بھی موجود تھے۔

[1] ان آیات میں اسلامی عقیدے اور نظام زندگی کے ایک نہایت اہم اور نازک قضیے کا ذکر ہے اس سے قبل سورۂ آل عمران اور نساء میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ لیکن یہاں اسے نہایت وضاحت سے موکد طور پر بیان فرمایا گیا ہے۔ وہ قضیہ حکم و شریعت اور فیصلے کا قضیہ ہے اور اس کے پس منظر میں الوہیت، توحید اور ایمان کا معاملہ ہے۔ یہ قضیہ اپنے جوہر کے لحاظ سے اس سوال کے جواب پر موقوف ہے۔

کیا حکم و قانون اور فیصلہ خدائی میثاق و عقاد اور قوانین کے مطابق ہونا ضروری ہے، جن قوانین و عقود کا نگران آسمانی مذاہب کو یکے بعد دیگرے بنایا گیا تھا۔ اور جنہیں رسولوں پر فرض کیا گیا تھا اور ان کے جانشینوں پر ان کی ہدایت پر چلنا لازم ٹھیرایا گیا تھا؟ یا یہ سب کچھ بدلتے والی خواہشات کے تابع ہے اور ان مصلحتوں کے ماتحت ہے جو خدا کی شریعت کی کسی ثابت اصل سے ثابت نہیں؟ یا اُس عرفِ عام کے سپرد ہے۔ جس پر کسی زمانے کے لوگ یا کئی زمانوں کے لوگ متفق ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں کیا زمین میں اور لوگوں کی زندگیوں میں الوہیت، ربوبیت اور اختیار و اقتدار اللہ کا ہوگا۔ یا یہ کسی انسان کے سپرد ہے کہ وہ خدا کے اذن و حکم کے بغیر جو چاہے لوگوں کے لئے قانون وضع کرے؟

اللہ سبحانہ، فرماتا ہے کہ اللہ وہی ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور اُس نے جو قوانین

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۵۶، ۱۶۸۔

Marfat.com

لوگوں کے لئے مقرر کئے ہیں وہ اپنی الوہیت اور ان کی عبودیت کے تقاضے کے مطابق ہیں۔ اور اُس نے بندوں سے عہد لیا ہے کہ اسے مانیں اور اس پر قائم رہیں، انہی قوانین کا زمین میں چلانا اور نافذ کرنا واجب ہے اور لوگوں کو انہی سے فیصلے کرنے چاہئیں۔ پیغمبروں اور ان کے بعد والے لوگوں کا فرض ہے کہ انہی پر چلیں اور اوروں کو بھی چلائیں۔

اور اللہ سبحانہٗ فرماتا ہے کہ اس معاملے میں کوئی رد و رعایت نہیں، نہ کوئی رخصت ہے، اور اس میں کسی جانب سے کوئی انحراف ۔ چاہے چھوٹا سا ہی ہو۔ جائز نہیں۔ کسی زمانے کے لوگوں کا کسی چیز پہ متفق ہو جانا یا کسی قبیلے کا عُرف کوئی اعتبار نہیں رکھتا، اللہ کے اذن کے بغیر کوئی چھوٹی بڑی چیز جائز نہیں۔

اور اللہ سبحانہ فرماتا ہے کہ اس معاملے میں مسئلہ ایمان اور کفر کا ہے، اسلام اور جاہلیت کا ہے، شرع اور خواہشات نفسانی کا ہے اس امر میں کسی درمیانی مقام اور مصالحت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ پس مومن وہ ہیں جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکم و فیصلہ کرتے ہیں۔ اس میں کوئی تحریف و تبدیلی نہیں کرتے۔ اور کافر، ظالم اور فاسق وہ ہیں جو خدا کے احکام و کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے۔ اور حکّام کی دو ہی قسمیں ہیں۔ یا تو وہ خدا کی شریعت پر قائم ہوں گے اور پورے قانون الٰہی پر عامل ہوں گے، یہ لوگ ایماندار ہیں۔ اور یا وہ خدا کے اذن و حکم کے بغیر کسی اور شرع و قانون پر قائم ہوں گے۔ پس وہی کافر، فاسق اور ظالم ہیں اور لوگ یا تو حکّام و فقہاء سے اللہ کا حکم اور اُس کا فیصلہ قبول کر لیں گے۔ سو یہی مومن ہیں۔ ورنہ بصورت دیگر وہ مومن نہیں ہیں۔ ان دونوں راہوں میں کوئی درمیانی پگڈنڈی نہیں۔ کوئی حجت دلیل اور معذرت قابل قبول نہیں۔ اور کسی مصلحت کے لحاظ کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ رب العلمین ہی لوگوں کی مصلحتوں کو جانتا ہے اور ان کی حقیقی مصلحتوں کی تحقیق کے لئے ہی شرائع و قوانین بنانا ہے۔ اُس کے حکم و شریعت سے کوئی حکم و قانون اچھا اور بہتر نہیں۔ بندوں میں سے کسی کے لئے روا نہیں کہ یوں کہے۔

"میں اللہ کی شریعت کو پھینک دیتا ہوں اور مخلوقات کی مصلحتوں کو خدا سے زیادہ جانتا ہوں"۔ اگر کسی نے اپنی زبان یا عمل سے یہ کہا۔ تو وہ دائرۂ ایمان سے باہر نکل گیا۔

یہ آیات ہجرت کے بعد مدنی زندگی کے پہلے ہی سالوں میں اُتری تھیں جبکہ یہودی ابھی مدینہ ہی میں تھے۔ یعنی کم از کم غزوۂ احزاب سے پہلے پہلے۔ کیونکہ بنو نضیر کو جنگِ اُحد کے بعد اور بنو قینقاع کو اس سے بھی پہلے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ یہی وہ دور تھا جبکہ یہودی یوں دین الٰہی کا مقابلہ کرتے تھے۔ اور منافقین ان کی پناہ میں رہتے تھے جیسے کہ سانپ بل

Marfat.com

میں رہتا ہے اور یہ دونوں فریق مل کر کفر میں تیز روی کرتے تھے۔ گو منافق زبان سے ایمان کے مدعی تھے۔ اور ان لوگوں کا یہ فعل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے غم والم کا باعث ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ ان آیات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتا ہے اُس سے اظہار ہمدردی کرتا ہے اور ان لوگوں کی کرتوتوں کی حقارت ثابت فرماتا ہے اور مسلم جماعت کے لئے یہود منافقین کی "مسارعت فی الکفر" کی حقیقت کھول کر بیان کرتا ہے۔ اور جب وہ لوگ آپؐ کے پاس آئے کوئی مقدمہ لائیں تو آپؐ کے رویے کا تعین کرتا ہے۔ ان لوگوں نے آپؐ کے پاس آنے سے قبل جو مشورہ اور سازش کی تھی۔ اُسے بھی اللہ تعالےٰ واضح فرماتا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات قوم یہود کے ان لوگوں کے متعلق اُتری تھیں۔ جنہوں نے کچھ جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ بعض روایات میں زنا کا ذکر ہے۔ اور بعض میں چوری کا اور تورات کے مطابق یہ دونوں جرائم قابل حدّ تھے۔ لیکن ان لوگوں نے حدّ کو چھوڑ کر کسی اور چیز پر صلح کر رکھی تھی۔ کیونکہ شریف میں وہ شرفاء پر شرعی حدّ قائم کرنا نہ چاہتے تھے۔ پھر اپنے قیاس سے انہوں نے سب لوگوں کے لئے ہلکی سزا مقرر کر لی تھی۔ اور حدّ کی جگہ تعزیر مقرر کر لی تھی۔ جیسا کہ آج کل کے نام نہاد مسلمان کرتے ہیں۔ حضورؐ کے زمانے میں جب یہ جرائم ان میں واقع ہوئے تو انہوں نے حضورؐ سے اس امر میں فتویٰ طلب کرنے پر مشورہ کیا۔ کہ اگر رسولؐ انہیں حدّ سے ہلکی سزا یعنی تعزیر کا حکم دیں تو وہ اسے اختیار کر لیں گے اور خدا کے نزدیک ان کی حجت یہ ہوگی کہ پیغمبر آخر الزمان نے یہ حکم دیا تھا۔ اور اگر یہ رسولؐ بھی انہیں تورات کے احکام جیسا حکم سنائے تو وہ اسے اختیار نہ کریں گے پس اس سازش کے بعد انہوں نے کسی کو حضورؐ سے فتویٰ طلب کرنے کو بھیجا اس کا ذکر اللہ تعالےٰ نے ان آیات میں فرمایا ہے۔

ان کا اللہ اور رسولؐ کے ساتھ کھیل تماشہ، تحقیر اور سازش اپنی آخری حد تک پہنچ گئی تھی۔ ہر کتاب والے ایک لمبی مدت گزر جانے کے بعد سنگ دل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں عقیدے کی حرارت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور اُس کا شعلہ بجھ جاتا ہے۔ وہ ہر ذریعے اور وسیلے سے اس عقیدے اس کے قوانین اور تکالیف سے نکل بھاگنا چاہتے ہیں وہ اس کے لئے فتویٰ تلاش کرتے ہیں۔ تاکہ کوئی حیلہ، بہانہ اور احکام سے روگردانی کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہاتھ آجائے۔ کیا آج ان لوگوں کا بھی یہی حال نہیں ہے جو اپنے آپ کو مسلم کہتے ہیں۔ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اُن کے دل مومن نہیں۔ کیا وہ بھی دین میں حیلہ جوئی کے لئے فتوے تلاش نہیں کرتے ؟ اور دین پر عمل کرنے کو نہیں بلکہ اُس کے احکام سے بچنے کے لئے انہیں ذریعہ نہیں بناتے ؟ کیا وہ دین کو اپنی خواہشات کے مطابق کرنا نہیں چاہتے ؟ اگر

Marfat.com

اگر دین کلمۂ حق کہے تو پھر انہیں اُس کے حکم اللہ فیصلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بالکل وہی حالت ہے یقولون ان اوتیتم ھذا فخذوہ وان لم تؤتوہ فاحذروا۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کا قصہ اتنی تفصیل کے ساتھ فرما رہا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو عبرت ہو اور وہ یہودیوں جیسی عادتوں سے بچیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سماعون لکذب فرمایا ہے۔ دل جب مردہ ہو جائیں اور ارواح جب منحرف ہو جائیں تو ان کا یہی حال ہو جاتا ہے۔ منحرف ہونے والے معاشروں میں باطل اور جھوٹ کی بات بڑی محبوب اور حق و صدق کا کلمہ سخت بوجھل ہوتا ہے۔

وہ سحت کے بہت کھانے والے ہیں۔ سحت سے مراد ہر مالِ حرام ہے۔ مثلاً سود، رشوت اور ناجائز فتووں کا مول اسے سحت اس لئے کہا گیا کہ وہ برکت کو قطع کر دیتا ہے۔ منحرف معاشروں کی برکت کا زوال و انقلاع ایک روشن اور مسلمہ امر ہے۔

اس آیت میں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم شروع شروع میں تھا۔ کیونکہ اس کے بعد حکم اور فیصلہ حتمی طور پر شریعت اسلامیہ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ دارالاسلام میں سوائے قانون اسلام کے اور کوئی قانون نہیں چل سکتا۔ اور وہاں کے سب رہنے والے اس کے مطابق فیصلہ کرانے پر مامور ہیں۔ لیکن اہل کتاب کو ان کے شخصی قانون میں آزادی ہوگی۔ جو چیزیں ان کے ہاں مباح ہیں۔ وہ ان پر عمل کر سکیں گے جیسے خنزیر کا پالنا اور کھانا، خمر کا رکھنا اور پینا، لیکن وہ شراب کو مسلم کے ہاتھوں نہیں بیچ سکتے۔ اور سود چونکہ ان کے ہاں بھی حرام ہے لہٰذا یہ معاملہ ان پر حرام رہے گا۔ زنا اور چوری کی حدّ ان پر لگائی جائے گی کیونکہ اُن کے ہاں بھی یہی سزائیں تھیں۔ بغاوت اور خروج کی سزا انہیں بھی مسلمانوں کی مانند دی جائے گی۔ کیونکہ یہ دارالاسلام اور اس کے رہنے والوں کے امن کے لئے ضروری ہے۔

مسند احمد، ابوداؤد اور ابن جریر طبری کی روایات میں ہے کہ یہ آیات یہود بنی نضیر اور بنی قریظہ کے ایک دیت کے مقدمہ میں نازل ہوئی تھیں تورات میں محرف ہونے کے باوجود اس کا حکم بھی وہی تھا جس کی تصدیق کتاب اللہ نے کی ہے۔ لیکن یہودیوں نے تراپنا قومی فیصلہ قبول کیا۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مانا۔ وہ صرف خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ اور اس غرض سے حضورؐ کے پاس مقدمے لاتے تھے۔ کہ شاید یہاں کچھ رعایت ہو جائے۔ اسی لئے ارشاد فرمایا ہے: وکیف یحکمونک ..... یتولّون بعد ذالک اور یہ جو فرمایا کہ وما اولئک بالمومنین۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان اور خدا کی شریعت کو فیصلہ کن نہ ماننا دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے! اس طرح ایمان بھی ہو اور خدا کے فیصلوں

Marfat.com

پر ناراضگی بھی ہو یہ ناممکن ہے۔ ایمان کا ایسا دعویٰ جھوٹا ہے۔ ایسے لوگوں کا فنا انہیں دعویٰ ایمان کے باوجود دائرۂ ایمان سے نکال دیتا ہے۔ اسی مضمون کی ایک آیت سورۂ شعراء میں ہے

إِنَّآ أَنزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيهَا هُدًى وَّنُورٌ ج

ہم نے اتاری تورات کہ اس میں ہدایت اور روشنی تھی

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا

اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر جو کہ حکم بردار تھے اللہ کے

لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ

یہود کو اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم کیونکہ

بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ

وہ نگہبان بھٹرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اس کی خبرگیری

شُهَدَآءَ ج فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَ

پر مقرر تھے۔ سو تم نہ ڈرو لوگوں سے اور ڈرو مجھ ہی سے اور

لَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ط وَمَنْ لَّمْ

مت خریدو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور جو کوئی

يَحْكُمْ بِمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ

حکم نہ کرے اس کے موافق جو اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ہیں

Marfat.com

الْكٰفِرُوْنَ ۞ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ

کافر اور لکھ دیا ہم نے ان پر اس کتاب میں کہ جی

بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ

کے بدلے جی اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور

الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ

کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں

قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ

کا بدلہ ان کے برابر۔ پھر جس نے معاف کر دیا۔ تو وہ گناہ سے پاک ہو گیا

لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ

اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو اللہ نے اتارا ہو

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

وہی ظالم لوگ ہیں

Marfat.com

[1] **فیھا ھدیً و نورٌ** : یعنی وصول الی اللہ کے طالبین کے لئے ہدایت کا اور شبہات و مشکلات کی ظلمت میں پھنسی جلنے والوں کے لئے روشنی کا کام دیتی تھی۔

یحکم بھا النبیّون ..... الاحبارُ: یعنی تورات میں ایسا عظیم الشان دستور العمل الہٰی آئین ہدایت تھا کہ بہت سے پیغمبر، اہل اللہ اور علماء اُس کے موافق حکم دیتے اور نزاعات کے فیصلے کرتے رہے۔

بما استحفظوا ..... شھداء یعنی تورات کی حفاظت کا ان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن قرآن کریم کی طرح **وانا لہٗ لحافظون** کا وعدہ نہیں ہوا تھا۔ تو جب تک علماء احبار نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا تورات محفوظ و معمول رہی۔ آخر دنیا پرست علمائے سُو کے ہاتھوں سے تحریف ہو کر ضائع ہو گئی۔

فلا تخشوا الناس ..... ثمنا قلیلاً : یعنی دنیوی خوف و طمع کی وجہ سے آسمانی کتاب میں تحریف و تبدیلی مت کرو۔ اس کے احکام و اخبار کو مت چھپاؤ اور خدا کی تعذیب و انتقام سے ڈرتے رہو۔ تورات کی عظمت شان اور مقبولیت جتلانے کے بعد یہ خطاب یا تو اُن رؤسا و علماء یہود کو کیا گیا ہے۔ جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے۔ کیونکہ انہوں نے حکم رجم سے انکار کر دیا تھا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیوں کو چھپاتے اور ان کے معنی میں عجیب طرح کے ہیر پھیر کرتے تھے اور یا درمیان میں امت مسلمہ کو نصیحت کی ہے کہ تم دوسری قوموں کی طرح کسی سے ڈر کر یا حب مال و جاہ میں پھنس کر اپنی کتاب کو ضائع مت کر دینا۔ چنانچہ اس امت نے بحمد للہ ایک حرف بھی اپنی کتاب کا گم نہیں کیا اور آج تک اُس کو باطل پرستوں کی تغیر و تحریف سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی اور ہمیشہ رہے گی۔

ومن لم یحکم ... الکافرون: ما انزل اللہ کے موافق حکم نہ کرنے سے غالباً یہ مراد ہے کہ منصوص حکم کے وجود ہی سے انکار کر دے اور اُس کی جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کرے جیسا کہ یہود نے حکم "رجم" کے متعلق کیا تھا۔ تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اور اگر مراد یہ ہے کہ **بما انزل اللہ** کو عقیدۃً ثابت مان کر پھر فیصلہ عملاً اُس کے خلاف کرے۔ تو کافر سے مراد عملی کافر ہوگا۔ یعنی اس کی حالت عملاً

---

[1] فوائد القرآن ص۱۴۷۔

Marfat.com

کافروں جیسی ہے۔

وکتبنا علیھم فیھا ... قصاص : قصاص کا یہ حکم شریعتِ موسوی میں تھا۔ اللہ بہت سے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ جو پچھلی شرائع (قوانین) قرآن کریم یا ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل، فرمائیں، بشرطیکہ ان کی نسبت کسی جگہ حضورؐ نے کوئی انکار یا ترمیم نہ فرمائی ہو تو وہ اس اُمت کے حق میں بھی تسلیم کی جائیں گی۔ گویا بدون ردّ و انکار کے ان کو سنا تلقی بالقبول کی دلیل ہے۔

فمن تصدق بہ فھو کفارۃ لہ : یعنی جو مجروح کے قصاص کو معاف کر دیتا مجروح کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی تصریح آئی ہے اور بعض مفسرین نے اس کو جارح کے حق میں رکھا ہے یعنی اگر مجروح نے جارح کو معاف کر دیا تو اُس کا گناہ معاف ہو جائے گا لیکن پہلا معنیٰ ہی راجح ہے۔

ومن لم یحکم ... الظٰلمون : یہود نے حکم قصاص کے خلاف بھی تقابل قائم کر لیا تھا۔ ان میں بنی نضیر جو زیادہ معزز اور قوی سمجھے جاتے تھے، بنو قریظہ سے پوری دیت وصول کرتے تھے۔ اور جب ان کی دیت دینے کی باری آتی تو نصف دیت ادا کرتے تھے۔ بنی قریظہ نے اپنی کمزوری کی وجہ سے اُن سے اس طرح کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ اتفاقاً بنی قریظہ کے ہاتھ سے بنی نضیر کا ایک آدمی مارا گیا۔ اُنہوں نے دستورِ سابق کے موافق ان سے پوری دیت طلب کی۔ بنی قریظہ نے جواب دیا کہ جاؤ، وہ زمانہ گیا جب ہم نے تمہاری قوت سے مجبور ہو کر یہ ظلم منظور کر لیا تھا۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آچکے ہیں۔ ان کا در در رہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم جو دیت تم سے لیتے ہیں۔ اُس سے دگنی ادا کریں۔ اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں محال ہے کہ کوئی قوی ضعیف کو کچل سکے کیونکہ سب کو یقین تھا کہ آپؐ ہر قوی و ضعیف کے ساتھ یکساں انصاف فرماتے ہیں۔ اور اقویا کے مظالم کے مقابلہ ضعفاء کی دستگیری فرماتے ہیں انجام کار یہ معاملہ حضورؐ کی عدالت میں پیش ہوا۔ اور بنو قریظہ نے جو خیال اُس پیکرِ عدل و انصاف کی نسبت ظاہر کیا تھا، بلا کم و کاست صحیح نکلا۔ حکم و قصاص کے بعد

ومن لم یحکم بما انزل اللہ ۔ فرمانے سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ رجم کی طرح قصاص کے حکم شرعی سے صریحاً انکار نہیں کیا تھا، بلکہ آپس کی مفاہمت سے خلاف حکمِ شرعی ایک دستور قائم کر لیا تھا۔ تو قانونِ عدل کی یہ اعتقادی نہیں صرف عملی مخالفت ہوئی اسی لئے یہاں کافروں کی بجائے ظالمون فرمایا۔ یعنی یہ ظلم صریح ہے کہ قوی سے کم اور ضعیف سے زیادہ دیت لی جائے۔

Marfat.com

الربانیون: ربّ کی طرف منسوب ہیں لفظی معنی ہے "رب والے" احبار کا واحد حبر ہے اس کا معنی عالم ہے۔

ان آیات کا مضمون یہ ہے کہ کسی دین کی طرف منسوب ہونا مفید نہیں جب تک کے اس سے ہدایت نہ پائی جائے اور اُس کے احکام کو قائم نہ کیا جائے اور اہلِ کتاب نے اپنی خواہشات نفس کو اپنی دینی ہدایت پر ترجیح دی تھی اسی وجہ سے نور قرآن انہیں نظر نہ آیا اور وہ اس کی ہدایت کو اپنا نہ سکے۔

اللہ تعالےٰ نے تورات کے لئے ھُدیً اور نور کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اسی ہدایت سے بنی اسرائیل مصر والوں کی بت پرستی اور گمراہی سے نکلے تھے۔ اور اسی نور کے ساتھ انہوں نے اپنی مذہبی اور سیاسی آزادی و استقلال کی راہ دیکھی تھی۔

للذین ھادوا کا مطلب یہ ہے کہ تورات کی شریعت اُن کے ساتھ خاص تھی، عام نہ تھی اور داؤدؑ، سلیمانؑ اور عیسیٰ سب کے لئے یہی شریعت تھی۔

الربانیون والاحبار: ربانی کی جمع ربانیون ہے، ربانی کا معنی ہے دانا عالم جو لوگوں کی سیاست، ان کے معاملات کی تدبیر اور ان کی مصلحتوں کو قائم کرنے کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو۔ کا معنی ہے ایسا عالم جو کسی چیز کو مضبوط کرے یا مضبوطی سے تھامے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر ربانی اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر حبر کا لفظ بولا گیا ہے۔ یعنی وہ اس امت کے ربانی اور حبر ہیں۔

ثمن قلیل سے مراد دنیوی نفع ہے۔ جسے حاصل کرنے یا باقی رکھنے کے لئے وہ دینِ حق سے روگردانی کر چکے تھے۔ مثلاً رشوت، جاہ وجلال اور وہ فانی لذائذ جو انہیں کتاب اللہ کی آیات سے ہدایت پانے سے روکتے تھے۔

الکافرون: چونکہ وہ حق کو چھپاتے تھے۔ حالانکہ اُس کا اظہار و تبیین اُن پر واجب تھی۔ اس لئے انہیں کافر فرمایا۔ جس کا معنی ہے "چھپانے والا"، اگر دل وجان سے چھپائے تو حقیقی اور اصطلاحی کافر ہے۔ اور اگر زبان سے اقرار کرنے کے باوجود اس کے خلاف حکم کرے۔ تو وہ تارک یعنی عملی کافر ہے۔

وکتبنا علیھم فیھا تورات کی کتاب خروج کے باب ۲۱ میں اور سفر کے باب ۲۴ میں یہ احکام مفصل موجود ہیں۔

ھم الظلمون: قصاص کا قاعدہ عدل و مساوات اور انسانی انصاف پر مبنی ہے۔

لہ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۲۲، ۱۲۸ تفسیر المنار ج ۶ ص ۲۱۷، ۲۱۸۔

Marfat.com

اس لئے جو اس کے خلاف حکم دیتا ہے وہ ظالم ہے کیونکہ اس طرح کرنا صرف اُس وقت ممکن ہے جبکہ مقدمہ کے دو فریقوں میں سے ایک کی رعایت کی جائے اور دوسرے کا حق مارا جائے۔

لہ بنی اسرائیل میں ربانی لوگ بمنزلہ مجتہدین ہوتے تھے اور احبار بمنزلہ عام علماء ہ

یحکم اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیر شرعی نظام کی منصفی وغیرہ وہ ملازمتیں جن میں خلافِ قرآن حکم دیا جاتا ہے وہ ممنوع و حرام ہیں بلکہ جو قرآن کے مقابلے میں تعزیراتِ ہند وغیرہ کو دل سے پسند کرکے اس کے مطابق حکم دے گا اور فیصلے کرے گا وہ اس آیت کے بموجب کافر ہو جائے گا۔

فیہا ھدیً ونور وغیرہ آیات جو قرآن میں توراۃ کی تعریف میں آئی ہیں اُن سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج کل جو کتاب یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہے وہی اصلی توراۃ ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ مگر یہ سب دعوے کا ہے۔ بائبل کی کتابوں کا محرف و مبدل ہونا عقلاً و نقلاً ثابت ہے اور خود یہودی و عیسائی اہلِ علم کو اس کا اعتراف ہے۔ ان آیات میں توراۃ سے مراد مجازاً یہ مجموعہ ہے۔ جس میں اصلی توراۃ کے بھی کچھ مضامین موجود ہیں۔ پس کل کا نام جزء پر بولا گیا ہے۔ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر ثابت ہے کہ اصلی توراۃ انٹوکس اور بخت نصر وغیرہ کے حملوں کے حوادث میں گم ہو گئی تھی۔ یہ مجموعہ تاریخ و مسائل بعد میں مشائخ یہود نے جمع کئے ہیں۔ اس مجموعے میں سینکڑوں وہ مضامین بھی ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد درج کئے گئے ہیں مثلاً توراۃ کی کتاب استثناء کا آخری باب جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موت اور قبر کے مفقود ہونے کا حال درج ہے۔

تمام اہل اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی موجودہ کتابیں جعلی ہیں اور بعد میں تصنیف ہوئی ہیں اصلی کتابیں ضائع ہو چکی ہیں۔ موجودہ کتابوں کے مضامین میں ملاوٹ پائی جاتی ہے اور اصلی و نقلی ہر قسم کے مضامین موجود ہیں۔

بائبل کی کتاب سلاطین اوّل باب ۸ میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جب وہ صندوق کھولا۔ جس میں مطابق کتاب استثناء باب ۱۰ حضرت موسیٰؑ نے توراۃ رکھی تھی، تو پتھر کی دو تختیوں کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا۔ یہ تختیاں موسیٰؑ کوہِ طور سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے درمیان کسی نامعلوم زمانے میں اصلی توراۃ ضائع ہو گئی تھی۔

لہ تفسیر حقانی ج ۲ ص ۳۳

Marfat.com

پھر اسرائیلی بادشاہ بت پرست اور بدکار ہونے لگے۔ انہوں نے ہیکل کو جلایا اور تبرکات کو لوٹ کر تذر آتش کر دیا۔ سلیمانؑ کے تقریباً ۴۰ برس بعد یوسیاہ بن آمعون کے عہد میں ایک شخص خلقیاہ کاہن نے دعویٰ کیا کہ اسے توریت کا نسخہ دیا ہوا مل گیا ہے۔ اس کتاب کو تورات سمجھنے لگے مگر یہ بھی بخت نصر کی دوسری چڑھائی میں بالکل نیست و نابود ہو گیا۔ پھر جب بنی اسرائیل ۷۰ برس کی اسیری کے بعد شام واپس آئے تو ان کے پاس تورات تو کجا کوئی مذہبی کتاب بھی موجود نہ تھی۔ بلکہ وہ سرے سے اپنی زبان بھی بھول چکے تھے۔ اور کلدانی زبانی بولتے تھے کہتے ہیں کہ اس کے بعد عزراء کاہن (عزیرؑ) نے ازسرِ نو تورات کا نسخہ اپنی زبانی یادداشت سے مرتب کیا۔ لیکن یہ ایک بے سند اور غیر ثابت شدہ بات ہے۔ بلکہ خود عزیرؑ کی کتاب نہیں بلکہ بقول محققین کسی سمعون صادق نامی شخص کی کتاب ہے جو تقریباً تین سو برس قبل مسیح گزرا ہے۔

اگر عزرا کاہن والا قصہ مان لیا جائے تو بھی بات ختم نہیں ہوتی بلکہ ۱۷۱ سال قبل مسیحؑ میں سوریا کے بادشاہ آکس یعنی انٹوکس نامی نے ۳½ سال تک یروشلم اور ہیکل کو ایسا تباہ و برباد کیا اور نیست و نابود کیا کہ کچھ بھی نہ چھوڑا اور ساری دینی کتابوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ جیسا کہ مقابیس کی پہلی کتاب کے پہلے باب میں اس کا اقرار موجود ہے۔

اس کے بعد مسیح سے ۱۶۵ برس پیشتر یہودی مقابیس نے پھر ہیکل کی تعمیر کی اور سن سنا کر ایک مجموعہ کتب مرتب کیا جس کا نام تورات رکھا گیا۔

۶۳ء میں رومی بادشاہ طیطس نے بیت المقدس پر چڑھائی کر دی اور شہر، ہیکل اور تورات وغیرہ سب کو جلا ڈالا۔ اور یہ نقلی تورات نابود ہو گئی اس واقعہ کے ۶۵ برس بعد ایک بت پرست آذرین قیصر نے پھر یروشلم پر ایک دفعہ چڑھائی کی اور اُسے پہلے سے زیادہ تباہ برباد کرا کے بقول شخصے شہر اور ہیکل پر گدھوں کے ہل چلوا دیئے۔ اس کے بعد کسی زمانے میں قصص و احکام کا ایک مجموعہ مشائخ یہود نے جمع کر کے اس کا نام تورات رکھا۔ جس میں قصداً یا سہواً بے شمار تحریفات رکھیں۔ مولانا رحمت اللہؒ نے اپنی کتاب لاجواب اظہار الحق ج ص۱۴۲ میں فرمایا ہے کہ: اصل تورات اور اصلی انجیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ہی گم ہو چکی تھی۔ موجودہ کتابیں تاریخ کی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن میں صحیح اور غلط ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ مولانا موصوفؒ نے اس کے بعد اپنے اس بیان کی تائید میں کئی صفحے کتاب و سنت کے دلائل سے پُر کئے ہیں۔

~~OT الخ~~ النفس بالنفس الخ۔ امام ابو حنیفہؒ اور اکثر اہل علم کے نزدیک مقتول مسلم یا غیر مسلم ذمی، آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان سب کے بدلے میں

Marfat.com

قاتل پر قصاص کا حکم جاری ہوگا۔ کیونکہ جان کے بدلے جان فرمایا گیا ہے اور جان ان سب کی برابر ہے۔
فمن تصدق ! اگر مقتول کے وارث یا مجروح قصاص معاف کر دے تو قاتل یا جارح سے قصاص تو نہیں لیا جائے گا۔ لیکن امنِ عام میں خلل اندازی کے باعث تہدیدًا اور تعزیرًا حاکم وقت کو کوئی سزا جو حد سے کم ہو، دینے کا اختیار ہے۔ اہل تحقیق کا یہی مذہب ہے۔

؎ علامہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ کہ گو شانِ نزول کے لحاظ سے یہ آیات اہل کتاب کے متعلق ہیں لیکن جو لوگ اللہ کی شریعت اور اس کی اتاری ہوئی وحی کے خلاف فیصلے کریں۔ اس آیت کا حکم ان سب کو شامل ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں اتری۔ مگر اس اُمت کا بھی یہی حکم ہے۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رشوت حرام ہے۔ اور رشوت ستانی کے بعد کسی شرعی مسئلہ کے خلاف فتویٰ دینا کفر ہے۔ مسندی فرماتے ہیں کہ جس نے وحی آلٰہی کے خلاف عمداً حکم و فتویٰ دیا اور جاننے کے باوجود اس کے خلاف کیا وہ کافر ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جس نے فرمان خداوندی کا انکار کیا وہ تو کافر ہے لیکن جس نے انکار نہیں کیا۔ پھر اس کے خلاف حکم دیا وہ ظالم و فاسق ہے۔ خواہ اہل کتاب ہو خواہ کوئی اور علامہ شعبیؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے جس نے کتاب اللہ کے خلاف فتویٰ دیا وہ کافر ہے۔ یہودیوں میں جس نے ایسا کام کیا وہ ظالم ہے اور عیسائیوں میں ایسا کرنے والا فاسق ہے۔

؎ شہید راہ حق سید قطبؒ فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات سے واضح ہوتا ہے۔ کہ تمام آسمانی دین اور شرائع احکام وحی (ما انزل اللہ) کے مطابق فیصلہ کرنے کے حتمی و قطعی امر ہونے پر متفق ہیں۔ اور کہ ساری زندگی کو آلٰہی شریعت پر قائم کیا جائے یہی چیز ایمان اور کفر کی راہوں کو جدا کرنے والی ہے اسلام اور جاہلیت میں یہی فرق ہے اور شرع اور ہوائے نفس میں یہی امتیاز ہے۔ چنانچہ ان آیات میں تورات پر ایمان رکھنے والوں کے متعلق فرمایا ہے کہ ان میں تورات پر ایمان رکھنے والوں کے متعلق فرمایا ہے کہ انہیں تورات کے مطابق حکم و فیصلے کرنے کا قطعی حکم دیا گیا تھا۔ انجیل والوں کو بھی اس کے مطابق چلنے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کا حکم ملا تھا۔ اور سب سے آخر میں کتاب کامل کے ماننے والوں کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے اور وحی آلٰہی کے علاوہ ہر چیز کو جاہلیت فرمایا گیا ہے **افحکم الجاھلیۃ یبغون** ؟

ایمان و کفر کے درمیان حدِ فاصل یہی ہے اور اس میں حاکم و محکوم کا بھی کوئی فرق نہیں۔ دارومدار سارا انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے پر ہے۔

اس معاملے میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ راستے صرف دو ہیں :۔

؎ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۲، ۱۰۳ ؎ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۵۷، ۱۶۲ (طبع سوم)

Marfat.com

۱۔ خدا تعالیٰ کی الوہیت و ربوبیت اور انسان پر اس کے اقتدارِ کامل کا بلا شرکت غیرے اقرار کرنا۔
۲۔ اس اقرار کو پھینک دینا۔ پہلی چیز ایمان ہے اور دوسری کفر۔ درمیانی راہ کوئی نہیں۔
ایک طرف اسلام ہے اور دوسری طرف جاہلیت۔

سارے قرآن میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ: اللہ ہی خالق ہے، جس نے کائنات اور انسان کو پیدا کیا ہے اور اُس کے لئے کائنات کو مسخر کر دیا ہے۔ خلق میں وہ یگانہ ہے کسی قلیل یا کثیر چیز میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

اللہ ہی مالک ہے۔ کیونکہ وہی خالق ہے۔ خلق کی مانند ملک میں بھی اُس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔
اللہ ہی رزاق ہے اس کے سوا کوئی کسی کام و بیش چیز میں رازق نہیں ہے۔
اللہ تعالیٰ ہی صاحب اقتدار ہے جو کائنات اور انسان میں تصرف کرنے والا ہے۔ اس کے خالق، مالک اور رازق ہونے کا تقاضا یہی ہے۔ کہ سلطان (اقتدار) اُسی کا ہے۔ اُسی میں وہ قدرت پائی جاتی ہے جس کے بغیر خلق، رزق اور نفع و ضرر نہیں ہو سکتا۔ عالم وجود میں وہی اکیلا صاحب سلطنت ہے۔

ایمان اس چیز کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ان خصائص کا اقرار کیا جائے یعنی الوہیت، ملک اور سلطنت، وہ ان میں یگانہ ہے کوئی اس کا شریک نہیں اسلام کا معنیٰ ہے، ان خصائص کے تقاضوں کے آگے جھک جانا اور اطاعت کرنا، یعنی الوہیت، ربوبیت اور اقتدار میں سارے عالم وجود میں اللہ تعالیٰ کو اکیلا و یگانہ جاننا۔ انسانی زندگی ضمناً اس کے اندر آجاتی ہے۔
اسی طرح اسلام نام ہے خدا کی سلطنت، جو اُس کی قدرت اور شریعت میں ممثل ہے، کا اعتراف کرنا۔ پس اللہ کی شریعت و قانون کے آگے جھکنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز سے پہلے اُس کے الٰہ، رب، مقتدرِ مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا اعتراف کیا جائے اور اس شریعت کے سامنے نہ جھکنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز سے قبل اُس کی ان خصوصیتوں کا انکار کر دیا جائے، زندگی کی جزئیات میں سے کسی جزئی میں کسی اور کا حکم مانا جائے۔ یہ اعتراف اور عدم اعتراف چاہے زبان سے ہو چاہے عمل سے ہو برابر ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ یہ اسلام اور جاہلیت یا ایمان و کفر کا سوال ہے۔ اسی لئے ان آیات میں ما انزل اللہ پر فیصلہ نہ کرنے والے کو کافر، ظالم اور فاسق فرمایا گیا ہے۔

اسی مسئلے کی دوسری چیز یہ ہے کہ حتمی اور قطعی طور پر انفصلیت لوگوں کے تمام قوانین پر صرف الٰہی شریعت و قانون کو حاصل ہے آگے آنے والی ایک آیت میں اسی انفصلیت کا اعلان کیا گیا ہے: **ومن احسن من اللہ حکماً لقوم یوقنون ؟**

Marfat.com

اس افضلیت کا مطلق اعتراف بھی ایمان وکفر کے معاملے سے متعلق ہے۔ اگر انفرادی و اجتماعی معاملات میں ایک شخص قانون الٰہی کی اس افضلیت کا قائل ہے تو مؤمن ہے ورنہ کافر ہے، جو شخص کسی انسانی قانون کے قانونِ خداوندی سے افضل بلکہ مماثل ہونے کا بھی مدعی ہے۔ اگر وہ اس کے بعد دعویٰ ایمان بھی رکھتا ہے تو اس کا دعویٰ گویا یہ ہے کہ لوگوں کے حالات کو کوئی اور خدا سے زیادہ جانتا ہے اور ان کے باہمی معاملات میں کسی اور کا فیصلہ زیادہ بہتر ہے۔ یا اُس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دُنیا کے آنے والے جدید حالات کا علم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُس نے ایک شریعت مقرر کردی۔ یا علم تو تھا لیکن مستقبل کے حالات کے لئے اُس نے کوئی حکم نہیں دیا۔ اس قسم کے دعوے اور خیالات کے ساتھ ایمان و اسلام کا دعویٰ زیب نہیں دیتا۔

قانونِ الٰہی کی اس افضلیت کے چند مظاہر ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ قانون الٰہی ایک ایسا ضابطہ تیار کرتا ہے جو انسانی زندگی کو شامل و کامل ہے۔ وہ زندگی کے تمام احوال و جوانب اور اشکال و صُور کو محیط ہے۔

۲۔ یہ ضابطہ کائناتِ انسانی کے علمِ مطلق پر قائم ہے، اس کی تمام حاجات و ضروریات کی کفالت کرتا ہے اور یہ کائنات جس میں انسان رہتا ہے۔ اس کے علمِ کامل پر قائم ہے وہ قوانین فطرت جو انسان اور کائنات پر حاکم ہیں۔ ان کے صحیح علم پر مبنی ہے اسی لئے وہ زندگی کے کسی گوشے کو نہیں چھوڑتا۔ اس میں انسانی فطرت اور کائنات کی فطرت میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ بلکہ توازن اور اعتدال اور توافق و تناسق پایا جاتا ہے۔ کوئی انسانی ضابطہ ایسے توازن و اعتدال کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ بلکہ انسانی قوانین سے تصادم و انتشار اور بدامنی پھیلتی ہے۔

۳۔ یہ ضابطہ عدلِ مطلق پر قائم ہے کیونکہ:۔

ا۔ اللہ تعالےٰ ہی صحیح طور پر جانتا ہے کہ عدلِ مطلق کیسے اور کن چیزوں سے قائم ہوتا ہے۔

ب۔ اللہ تعالےٰ سب کا رب ہے وہی سب کے درمیان صحیح عدل قائم کرسکتا ہے، اُسی کی شریعت، خود غرضی، غرض پرستی، میلان اور ضعف سے پاک ہے اسی طرح جہل و قصور اور افراط و تفریط سے بھی مبرا ہے۔ کوئی انسانی ضابطہ، قانون خواہشات، میلانات ضعف، خود غرضی اور جہل و قصور سے پاک نہیں ہوسکتا قانون ساز چاہے کوئی فرد ہو یا طبقہ، اُمت ہو یا انسانی جماعت میں سے کوئی جماعت۔

۴۔ یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جو نظام کائنات کے ساتھ موافقت رکھتا ہے کیونکہ اس ضابطے

Marfat.com

کابنانے والا خود اس کائنات کا مالک و خالق ہے۔ وہ کائنات کا بھی خالق ہے اور انسان کا بھی۔ پس اُس کا بنایا ہوا ضابطہ نظام کائنات کا ہی ایک حصّہ ہے۔ جس طرح کہ خود انسان بھی اسی کائنات کا حصّہ ہے۔ انسان کو کائنات کے عناصر پر تسلط بخشا گیا ہے۔ تاکہ وہ اپنے خالق کے حکم سے ان میں تصرف کرے اور اُس کی ہدایت پر چلے، ان عناصر کی معرفت حاصل کرے۔ اور ان کے حاکم قوانین کو پہچانے۔ اس ضابطے کی وجہ سے انسان کی حرکت میں اور اس کائنات کی حرکت میں جس میں وہ رہتا ہے، ایک تناسب و توافق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی پر حکم کرنے والا قانون الٰہی بھی اس کائنات کا ہی ایک حصّہ بن جاتا ہے۔ انسان اُس کے مطابق چلتا ہے۔ صرف اپنے نفس کی خواہش ہی پر نہیں چلتا۔ اور نہ بنی نوع انسان کے بنائے ہوئے ضوابط پر۔

۵۔ صرف یہی وہ نظام حیات ہے۔ جس میں انسان کو انسان کی غلامی اور بندگی سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ اسلامی ضابطے کے علاوہ ہر نظام زندگی میں انسان انسان کی بندگی کرتا ہے۔ صرف یہی ایک نظام ہے۔ جس میں بندگی کو اللہ وحدہٗ کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت حاکمیت ہے۔ جو شخص انسانوں کے کسی مجموعے کے لئے شرع و قانون بناتا ہے وہ ان میں الٰہ کا مقام حاصل کرتا ہے اور اسکی خصوصیتوں کو اپناتا ہے وہ اس کے بندے ہوتے ہیں نہ کہ اللہ کے۔ اُس کے دین میں ہیں نہ کہ اللہ کے دین میں۔ اور اسلام جب یہ کہتا ہے کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے تو وہ انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف ایک خدا کی بندگی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور انسانی آزادی کا اعلان کرتا ہے بلکہ وہ انسان کی "پیدائشی آزادی" کا اعلان کرتا ہے۔ کیونکہ انسان جب پیدا ہوتا اور عالم وجود میں آتا ہے تو اس کی گردن اپنے جیسے انسانوں کے حکم سے آزاد ہوتی ہے۔ اور وہ رب العالمین کے سامنے اس معاملے میں باقی سب انسانوں کے برابر ہوتا ہے۔

اور جاہلیت کسی تاریخی حقیقت کا نام نہیں۔ بلکہ وہ ایک ایسی حالت ہے کہ جب کسی نظام یا وضع میں اس کے اسباب و اجزاء پائے جائیں تو وہ آ دھمکتی ہے اور بنیادی لحاظ سے جاہلیت اس چیز کا نام ہے کہ حکم و قانون میں انسانی اصول کی پیروی کی جائے اور خدائی قانون شریعت کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔ چاہے یہ کسی فرد کی خواہشات ہوں یا کسی زمانے کے تمام لوگوں کی۔ یہ سب کی سب اہوا کہلاتی ہیں۔ جب تک کہ خدائی قانون کی طرف رجوع نہ کریں۔

Marfat.com

ان اقسام جاہلیت میں فقط نام اور عبارت کا فرق ہے۔ حقیقت سب کی ایک ہے۔
ایک فرد کسی جماعت کے لئے قانون سازی کرے تو وہ بھی جاہلیت ہے کیونکہ اُس کی ہوائے نفس اور رائے ہی قانون ہوگی۔ ایک طبقہ دوسرے طبقات کے لئے قانون بنائے۔ تو وہ بھی جاہلیت ہے۔ کیونکہ یہاں اس ایک طبقے کی مصلحتیں قانون ہیں۔ یا بالفاظِ دیگر پارلیمنٹ کی اکثریت کی رائے قانون ہے۔

تمام طبقات کے نمائندے اور ساری جماعتوں کے منتخب افراد اپنے لئے مل کر قانون بنائیں تو یہ بھی جاہلیت ہے۔ کیونکہ یہاں انسانی خواہشات اور جہالت قانون بن گئی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر قوم کی رائے قانون بن گئی ہے صرف الفاظ و عبارات ہی کا فرق ہے۔

انام کا ایک مجموعہ ساری کائناتِ انسانی کے لئے قانون وضع کرے تو وہ بھی جاہلیت ہے۔ کیونکہ ان کے قومی مقاصد قانون بن گئے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر حکومتوں کے نمائندوں کے مجمعے کی رائے قانون بن گئی ہے۔

اور اگر افراد جماعت کا خالق، قوموں اور امتوں کا خالق سب کے لئے قانون بنائے تو وہ اللہ کی شریعت ہے جس میں کسی ایک کو کسی دوسرے پر ترجیح یا جانب داری حاصل نہیں ہے نہ کسی فرد کو، نہ کسی جماعت کو اور نہ کسی سلطنت کو۔ نہ کسی ایک زمانے کے لوگوں کو۔ کیونکہ وہ سب کا رب ہے۔ اس کے سامنے سب برابر ہیں۔ وہ سب کی حقیقت اور سب کی مصلحت کو جانتا ہے۔ اس کے سلوک میں افراط و تفریط نہیں ہے۔

غیر اللہ کے قانون میں دوسرے لوگ اُسی قانون ساز کے بندے ہوتے ہیں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں سب آزاد اور مساوی ہوتے ہیں۔ ان کی پیشانیاں ایک اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتیں۔ اور وہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔

پس ما انزل اللہ کے بغیر حکم و فیصلہ شرو فساد ہے اور اس کا نتیجہ ایمان سے کفر کی طرف خروج ہے۔

[1] ولو اتبع الحق اھوآءھم لفسدت السمٰوٰت والارض ومن فیھن الآیۃ
[2] انا انزلنا التوراۃ .... [3] ھم الظٰلمون: پہلی آیات میں ان لوگوں کے متعلق اللہ کا حکم اور فیصلہ مذکور ہوا جو اپنی زندگی میں خدائی قانون کے فیصلے کو

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۶۶، ۱-۱۔

Marfat.com

قبول نہیں کرتے۔ ان آیات میں اللہ تعالےٰ کا فیصلہ ان لوگوں کے خلاف آرہا ہے جو وحی الٰہی کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے۔۔۔۔ یہ حکم سب ادیان و شرائع میں، جو خدا کی طرف سے آئے موجود رہا ہے۔ سب سے پہلے اُس نے تورات کا ذکر فرمایا ہے۔

"دین" اس لئے آتا رہا ہے کہ عملی زندگی کا غالب بنے اور انسانی زندگی کی عبادت و تنظیم کرے۔ اُس کا رُخ متعین کرے اور اُسے محفوظ و مصئون بنائے۔ کوئی دین صرف ضمیر کا عقیدہ بننے کو نہیں آیا تھا۔ نہ وہ صرف چند عبادتی رسوم و شعائر و مسجد و محراب میں جاری کرنے آیا تھا۔ ان دونوں چیزوں کی انسانی زندگی میں ضرورت مسلم ہے۔ لیکن صرف یہ دو تو انسانی زندگی کی قیادت و تنظیم اور توجیہہ و صیانت نہیں کر سکتیں جب تک کہ ان کی بنیادوں پر ایک نہایت حیات، نظام زندگی اور ساری زندگی کو عملاً محیط قانون نہ قائم ہو۔ لوگ اس کے سامنے جوابدہ ہوں اور اس کی مخالفت پر سزا کے مستوجب قرار پائیں۔

انسانی زندگی صرف اس صورت میں مستقیم ہو سکتی ہے کہ وہ عقیدہ، عبادت کے قوانین اور رسوم و شرائع صرف ایک ہی مصدر سے حاصل کرے۔ جس کا اقتدار ان کے قلوب و ضمائر پر ہو اور ان کی حرکات و سکنات پر بھی ہو۔ لوگوں کو اس دنیا میں بھی اس کے قوانین کے مطابق جزا و سزا ملے اور آخرت میں بھی۔ لیکن جب اقتدار تقسیم ہو جاتا ہے اور قانون بنانے کے مصادر کئی بن جاتے ہیں۔ لیکن ضمیر و شعور میں تو اقتدار و سلطنت اللہ کی ہوتی ہے اور نظام و قانون میں کسی اور کی۔ آخرت کی جزاء و سزا کا اختیار تو اللہ کے لئے تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن دنیا کی سزاؤں کا اختیار اور دوں کو دے دیا جاتا ہے۔ اُس وقت انسانی نفس دو مختلف اقتداروں اور سلطنتوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اس کے دو الگ الگ رُخ بن جاتے ہیں اور وہ نظام و طرز زندگی قرار پاتے ہیں۔ اسی وقت انسانی زندگی اُس فساد و انتشار کا شکار ہوتی ہے۔ جس کا ذکر قرآن کی کئی آیات میں کیا گیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ... وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۔ ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

یہی وجہ ہے کہ خدا کی طرف سے آنے والا دین ہمیشہ نظام زندگی بننے کے لئے آتا رہا ہے، چاہے وہ کسی ایک انسانی آبادی کے لئے آیا ہو یا قوموں میں سے کسی ایک قوم کیلئے آیا ہے یا تمام زمانوں میں تمام عالم انسانیت کے لئے آیا ہے۔ وہ جب آیا تو اُس کے پاس زندگی کا ایک تصور دینے والا ایک صحیح عقیدہ اور عملی زندگی کے لئے ایک معین قانون و شرع

Marfat.com

تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ عبادات کے طریقے بھی تھے تاکہ وہ دلوں کو اللہ سے جوڑ دے۔
یہی تین جوانب اللہ کے دین کا مرکز و مدار تھے۔

قرآن پاک میں اس کے کئی دلائل و شواہد موجود ہیں کہ جس انسانی آبادی میں بھی اس کے احوال کے مناسب دین آیا۔ اُس میں یہ تین مرکزی چیزیں ان حالات کے موافق کامل طور پہ موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تین بڑے مذاہب میں اپنے اپنے وقت میں یہی چیز پائی گئی ہے۔ یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام ہیں۔

چنانچہ تورات کے متعلق فرمایا ہے۔ کہ اس میں بنی اسرائیل کے لئے رہنمائی اور خدا کی طرف ان کے راستے کو روشن کرنے کی صفت موجود تھی۔ اس میں عقیدۂ توحید، عبادت کے طریقے اور قانون بھی موجود تھا۔ پیغمبر جو "مسلم" تھے۔ **النبیون الذین اسلموا** وہ اُس کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔ وہ مسلم تھے یعنی انہوں نے اپنی جانوں کو خدا کے سپرد کر رکھا تھا۔ ان میں سب کچھ اللہ ہی کا تھا۔ الوہیت کی خصوصیتوں میں انہیں کوئی اختیار و اقتدار اور دعویٰ و مشیت نہ تھی، اسلام کا یہی حقیقی معنیٰ ہے۔

فلا تخشو الناس ..... الکافرون: یہ خطاب امت مسلمہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وحی الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کا ہر زمانے اور ہر قوم میں مقابلہ کیا جائے گا۔ بعض لوگ ایسے ضرور ہوا کریں گے جن کے دل رضا، قبول اور اندرونی آمادگی سے کبھی وحی کے احکام اور فیصلوں کو قبول نہ کریں گے۔ بڑے لوگوں، سرکشوں اور موروثی سلطنت والوں کا مقابلہ اسے پیش آئے گا۔ کیونکہ خدا کے نازل کردہ احکام اُن سے الوہیت کی وہ چادر چھین لیتے ہیں۔ جس کا انہیں زعم ہے اور الوہیت کو خدا کے ساتھ خاص کر دیتے ہیں۔ کیونکہ احکام وحی اُن سے حاکمیت، تشریع اور فیصلے کا حق چھین لیتے ہیں جو وہ اپنی مرضی سے اللہ کے اذن کے بغیر کریں گے۔ اللہ کو معلوم تھا کہ مادی مصلحتوں والے لوگ اس کی شریعت کا مقابلہ کریں گے۔ جن کے مصالح ٹوٹے کھسوٹے، ظلم اور مال حرام پر قائم ہیں۔ اُسے معلوم تھا کہ خواہشات و ہوا والوں اور ناجائز ذرائع سے مال کمانے والوں کا فتنہ ان کے سامنے آئے گا۔ کیونکہ دین الٰہی انہیں ان چیزوں سے پاک ہونے کا حکم دے گا۔ اور نہ ماننے کی صورت میں سزا کا مستوجب گردانے گا۔ غرض ان تمام لوگوں کا مقابلہ اس سے ہونے والا تھا۔ جو نیکی اور عدل و صلاح کی سیادت و بلندی پر رضامند نہ ہوں گے۔

یہ مقابلہ و مصادمہ حتمی اور اٹل تھا۔ اس لئے وہ لوگ جو کتاب کی نگرانی اور نگہبانی پہ مامور ہیں۔ انہیں حکم دیا گیا کہ اس فتنہ کا مقابلہ کریں۔ اس کے سامنے ڈٹ جائیں اور نفس و مال میں

Marfat.com

اس کی تکالیف کو برداشت کریں۔ خدا کے احکام کو نافذ کرنے میں کوئی خوف حائل نہ ہو۔ چاہے وہ انا پرستوں کا خوف ہو جو احکام الٰہی کے سامنے جھکنے سے انکار کرتے ہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں خدا کی الوہیت کے صرف اُسی کے ساتھ خاص ہونے کے اقرار کو پرزے پھینک دیتے ہیں چاہے وہ ان عادی مجرموں کا خوف ہو جن کی لوٹ کھسوٹ کے درمیان خدا کی شریعت حائل ہوگی۔ اور یا اُن گمراہ کن، منحرف اور ملحد طبقے کا خوف ہو جو خدا کی شریعت کے احکام کو بوجھل جانتے ہیں اور اس پر شور و غل مچاتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ کو یہ بھی معلوم تھا کہ کتاب کے بعض نگران اور نگہبان دنیوی زندگی کے لالچ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ وہ ارباب اقتدار کو، مال داروں کو، اور ہوا پرستوں کو پائیں گے کہ وہ حکم خداوندی کو نہیں چاہتے۔ تو ان سب کے خوشامدی بن جائیں گے اور دنیوی زندگی کے سازو سامان کا لالچ کریں گے۔ ہر زمانے میں "دین دار پیشہ وروں" کا یہی حال رہا ہے۔ علماء بنی اسرائیل میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس لئے خدا نے انہیں پکار کر فرمایا **ولا تشتروا بآیاتی ثمناً قلیلاً** ثمن قلیل سے مراد غیر الٰہی نظام کے ساتھ خاموشی یا تحریف یا جان بوجھ کر فتووں سے سلوک کرنا ہے۔ ہر قیمت فی الحقیقت قلیل ہے۔ چاہے کتنی زیادہ ہو۔ پھر صرف چند وظائف و انعامات، تنخواہوں، القاب اور معمولی مصلحتوں کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے؟ کہ ان کے بدلے دین کو فروخت کیا جائے۔ اور یقینی طور پر جہنم خرید لی جائے۔

امانت دار کی خیانت سے بڑھ کر کوئی بُری چیز نہیں ہو سکتی۔ نگران کی کوتاہی سے زیادہ کوئی کوتاہی مذموم نہیں۔ نگہبانی کی سازش ناقابل معافی ہے۔ اور وہ لوگ جو دینداری کا عنوان اختیار کریں اور پھر خیانت، کوتاہی اور سازش میں مبتلا ہوں۔ ما انزل اللہ کے مطابق حکم کرنے سے خاموش رہیں۔ کلمات الٰہی کی تحریف کریں اور خود غرض لوگوں کی خواہشات کو کتاب اللہ کے مقابلے میں تبدیل کریں۔ انہی سے فرمایا گیا ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون: من کے لفظ میں تعمیم ہے اسی طرح جواب شرط بھی عام ہے۔ جو ہر زمانے، مکان، طبقے، قوم اور اُمت کو شامل ہے۔ اور اس حتمی، اٹل اور تلوار کی مانند تیز حکم کی علت وہی ہے، جو ہم نے اوپر بیان کی کہ ما انزل اللہ کے خلاف حکم و فیصلہ کرنے والا خدا کی الوہیت اور قانونی حاکمیت کو چھوڑتا ہے۔ اور حق الوہیت کا دعویٰ اپنے لئے کرتا ہے۔ اگر کفر یہ نہیں تو اور کس چیز کا نام ہوگا اور اسی لئے ایمان و اسلام کا زبانی دعویٰ کس کام کا ہے؟

تیلے بہانے اور تاویل سے اس قطعی حکم کو ٹالنا تحریف کلمات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

Marfat.com

وکتبنا علیھم فیھا ..... والجروح قصاص:

اور تورات کے ان احکام کو اسلامی شرع میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ احکام رہتی دنیا تک مسلمانوں کے قانون کا جزو بن گئے ہیں۔ ان احکام پر عمل فقط دارالسلام میں ہو سکتا ہے کیونکہ دوسری جگہوں میں اسلامی اقتدار موجود نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ دارالسلام قائم کریں اور ان احکام کو وہاں نافذ جاری کریں۔ اسلامی شریعت نے ان پر ایک اضافہ فرمایا ہے کہ **فمن تصدق بہ فھو کفارۃ لہ** تورات میں قصاص حتمی تھا۔ اس میں کوئی استثناء اور رعایت نہ تھی۔ مگر آخری شریعت نے یہ گنجائش رکھی ہے۔

قصاص کے متعلق خدا کی شریعت کا پہلا اصول یہ ہے کہ وہ خونی سزا میں مساوات کی قائل ہے۔ آلہٰی قانون کے سوا کوئی دوسرا قانون انسانی جانوں کے درمیان مساوات کا قائل نہیں نہ وہ مرتبہ و مقام، طبقہ، نسب خون اور جنس کے درمیان صحیح قصاص کا قائل ہے۔ خدائی قانون میں نام و نسب اور عنصر و طبقے کا کوئی امتیاز نہیں۔ حاکم و محکوم اس کے سامنے سب برابر ہیں۔ سب ایک جان سے پیدا کئے گئے ہیں۔

خدائی شریعت کا یہ قانون انسان کے پیدائشی حق آزادی و مساوات کا اعلان ہے۔ سب کا مقدمہ ایک ہی شریعت سے ہوگا۔ قصاص ایک ہی بنیاد پر قائم ہے، اور ایک ہی قیمت رکھتا ہے قانونی نظریات کے لحاظ سے جدید انسانی شرائع اس قانون کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کی عملی تطبیق سے ابھی تک دور ہیں۔

یہود اس اصولِ مساوات سے منحرف ہو گئے تھے نہ صرف دوسروں سے سلوک کرتے وقت بلکہ خود اپنے اندر بھی انہوں نے اس اصول کو بھلا دیا تھا۔ جیسا کہ بنی نضیر اور بنی قریظہ کا قصہ اوپر گزرا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خدا کی شریعتِ مساوات کی طرف واپس لوٹایا اور ان کے ذلیل شدہ لوگوں کی پیشانیوں کو ارباب عزت کی پیشانیوں کے برابر کر دیا۔

اس عظیم اصول پر اگر قصاص لیا جائے تو صرف انسان کا پیدائشی حق ہی ثابت و قائم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بڑھ کر ایک کی دوسرے پر تعدی کا راستہ بھی بند ہوتا ہے۔ اس قصاص کے پیش نظر قتل یا زخمی کرنے والا اقدام جرم سے قبل کئی مرتبہ سوچے گا کہ اس کا انجام صحیح قصاص ہوگا جس میں نام و نسب، طبقہ و جنس اور مرتبہ و مقام حائل نہیں ہوں گے۔ اس کے برخلاف اگر اُسے معلوم ہے کہ جرم کی سزا صرف قید ہے۔ طویل ہے یا کم۔ تو وہ کبھی اپنے دل میں وہ خوف نہیں پا سکتا۔ جو پہلی صورت میں پاتا ہے۔

Marfat.com

قصاص ایک فطری قانون بھی ہے۔ جس سے دلوں کے بغض و حسد اور زخم مندمل ہوتے ہیں۔ بدلہ اور انتقام کی روح سکون پاتی ہے اور جرائم کم ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے شریعت موسوی پر جو عفو کا اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی بالکل فطرتی ہے۔ اس سے بلند اخلاقی اور قدرت کے باوجود معافی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

قتل کے معاملے میں خون کا ولی قصاص اور دیت دونوں کو معاف کر سکتا ہے۔ یا قصاص کی بجائے دیت کو قبول کر سکتا ہے۔ یہ تو ولی کا حق ہے۔ لیکن حاکم وقت کو پھر بھی مصلحتاً تعزیر کا اختیار باقی رہے گا تاکہ امن عامہ قائم رہے۔ عفو کا قانون اقامت عدل اور اجتماعی امن و امان کے لئے ایک انتہائی قدم ہے۔ لیکن بعض دفعہ معاف کرنے والے کے دل میں اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ کھٹک رہ جاتی ہے۔ جیسے فمن تصدق بہ فہو کفارۃ لہ فرما کر دور فرمایا گیا ہے۔ آخر میں ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الظالمون فرمایا گیا ہے یہ بھی عام ہے اس میں کسی کی تخصیص نہیں نہ کوئی استثناء ہے اور ایسے شخص کو جو کافر فرمایا گیا تھا۔ یہاں ظالم کے لفظ نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ یہ فعل کفر کے علاوہ ظلم ہے۔ اپنے آپ پر، جماعت انسانی پر اور عدل و انصاف پر بھی ظلم ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا

اور بھیجا ہم نے انہی کے قدموں پر عیسیٰ، مریم کے بیٹے کو تصدیق

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ

کرنے والا تورات کی جو آگے تھی۔ اور اس کو ہم نے انجیل دی

فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اور تصدیق کرتی تھی اپنے سے اگلی

مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾

کتاب تورات کی اور راہ بتلانیوالی اور نصیحت تھی ڈرنے والوں کو

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ

اور چاہیئے کہ حکم کریں انجیل والے موافق اس کے جو اتارا اللہ نے اس میں

Marfat.com

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

اور جو کوئی حکم نہ کرے موافق اس کے جو اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ہیں نافرمان

سلہ پہلی آیت کے ابتدائی جملے سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے سے پہلے پیغمبروں کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اور خود اپنی زبانی تورات کی تصدیق فرماتے تھے اور جو کتاب (انجیل) ان کو دی گئی تھی وہ بھی تورات کی تصدیق کرتی تھی انجیل کی حیثیت بھی نور و حدیث ہوتے ہوئے۔ تورات کی شرح تھی، احکام و شرائع کے اعتبار سے دونوں میں بہت ہی قلیل فرق تھا۔ جیسا کہ **ولاُحِلَّ لکم بعض الذی حُرِّم علیکم** میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ فرق تورات کی تصدیق کے منافی نہیں۔ جیسے آج ہم قرآن کو مانتے اور صرف اسی کے احکام کو تسلیم کرنے کے باوجود بحمداللہ تمام کتب سماویہ کے من عنداللہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ .... الْفٰسِقُوْنَ یا تو عیسائی جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے ان کو یہ حکم دیا گیا تھا، اسی کو یہاں نقل فرما رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت، جو عیسائی مخاطب تھے ان سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اتارا اس کے موافق ٹھیک ٹھیک حکم کریں یعنی ان پیش گوئیوں کو چھپانے یا لغو اور مہمل تاویلات سے بدلنے کی کوشش نہ کریں جو انجیل میں پیغمبر آخر الزمان یعنی مقدس فارقلیط کی نسبت حضرت مسیحؑ کی زبانی کی گئی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی سخت نافرمانی ہوگی کہ جس ہادیٔ جلیلؐ اور مصلح عظیمؐ کے متعلق حضرت مسیحؑ یہ فرمائیں کہ جب وہ روح حق آوے گی تو تمہیں سچائی کی ساری راہیں بتائے گی۔ اسی کی تکذیب پر کمربستہ ہو کر اپنے لئے ابدی خسران قبول کرے۔ کیا مقدس مسیحؑ اور اس کے پروردگار کی نافرمانی کے یہی معنی ہیں!

سلہ اس مقام پر اہل کتاب کہتے ہیں کہ گو تورات حوادث کا شکار ہو کر گم ہو چکی تھی مگر مسیحؑ نے اس کی شہادت دی تو گم شدہ تورات مل گئی تھی لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت مسیحؑ نے موجودہ تورات کو ہاتھ میں لے کر فرمایا تھا کہ یہ وہی اصلی تورات ہے جو موسیٰ پر نازل ہوئی تھی اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ کسی موقع پر تورات کی بعض آیات سے استدلال کرنا یا اسے من جانب اللہ کہنا اور اس کی مدح فرمانا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تورات کا موجودہ نسخہ بلا کم و کاست درست ہے اور یہی موسیٰؑ پر اترا تھا۔ مثلاً آج ہم موسیٰؑ کی تصدیق کریں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ موسیٰ علیہ السلام

سلہ فوائد القرآن شیخ الاسلام صـ۱۴۸ سلہ فوائد القرآن صـ۱۴۹ سلہ تفسیر حقانی

Marfat.com

اس وقت بھی شام میں موجود ہیں۔ کسی چیز کی تصدیق سے اس کا وجود خارجی یا اس کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔

اسی طرح اہل اسلام کا ایمان اس انجیل پر ہے۔ جو عیسیٰؑ پر نازل کی گئی تھی۔ اور وہ ایک ہی کتاب تھی۔ موجودہ چار کتابیں جو انجیل کے نام سے چار شخصوں متی۔ مرقس۔ لوقا اور یوحنا کی لکھی ہوئی حضرت عیسیٰ کی تاریخیں ہیں۔ جو عیسیٰؑ کے دربردہ بھی نہیں لکھی گئیں۔ بلکہ ان کے کافی عرصہ بعد عالم وجود میں آئی تھیں یہ وہ انجیل نہیں تھیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ پر نازل کی تھی۔ مختلف عیسائی فرقوں میں سو سے زیادہ انجیلیں رائج ہیں۔ جو اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ ہر شخص اپنی تصنیف کو انجیل کہہ دیتا تھا ان انجیلوں کے ردوقبول میں عیسائیوں میں باہم بہت اختلاف رہا ہے خود ان میں بھی باہم اختلاف موجود ہے۔ جس کا اعتراف عیسائی علماء کو بھی ہے۔

پس جب یہ حال ہے تو علماء اسلام موجودہ انجیل کو کس طرح اصلی انجیل مان سکتے ہیں؟ اللہ تواریخ وغیرہ کے خطوط تو فقط خطوط ہیں۔ ان کی حیثیت آسمانی کتب کی ہرگز نہیں۔

ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ میں یہی فرمایا گیا ہے کہ جو حکم اللہ نے انجیل میں اتارے تھے ان کے مطابق فیصلہ کریں نہ کہ خود ساختہ کتابوں کو خدا کی طرف منسوب کردیں۔ **الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندہ فی التوراۃ والانجیل الخ**

اس آیت سے اوپر کے مضمون کی مزید وضاحت بھی ہوتی ہے کہ ایک تو موجودہ تورات و انجیل اصلی نہیں بلکہ وضعی و جعلی ہیں دوسرے اصلی کتابوں میں حضورؐ کا نام صاف لکھا ہوا ہے۔ جس میں اہل کتاب نے تحریف و تبدیل کا کلہاڑا چلایا اور آہستہ آہستہ اہل کتابوں کو بالکل گم کر دیا۔ نیز خدا کی ان نازل کردہ آیات پر فیصلہ نہ کرنا اور حضورؐ کی نبوت کا اعتراف نہ کرنا فسق فرمایا ہے[1]

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیاء بنی اسرائیل کے طریقہ کے متبع اور ان کی شریعت پر قائم تھے۔ ان کی شریعت تورات تھی ان عیسائیوں نے اپنی انجیلوں میں عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں تورات میں کمی کرنے نہیں آیا بلکہ اسے پورا کرنے آیا ہوں" یعنی انہوں نے بحکم خداوندی تورات پر بعض احکام کا اضافہ کیا تھا اور بعض مواعظ بڑھائے تھے لیکن عیسائیوں نے پولس نامی شخص کا اتباع کرکے انجیل کو منسوخ کردیا اور اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۰۶
[2] المراغی ج ۶ ص ۱۲۶، ۱۲۸، المنار ج ۶ ص ۴۰۱، ۴۰۲۔

Marfat.com

ان آیات سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ انجیل میں احکام بھی موجود تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مستقل شریعت تھی اور انھیں اس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا چاہے وہ احکام کم ہوں یا زیادہ اور وہ صرف تورات پر ہی عمل کرتے پر مامور نہ تھے۔ بخاری کی ایک حدیث پر شہادت دیتی ہے۔

انی اھل التوراۃ التوراۃ فعملوا بھا واھل الانجیل الانجیل فعملوا بہ

علامہ شہرستانی نے الملل والنحل میں کہا ہے کہ تمام بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر عمل کرنے پر مامور تھے اور تورات کے ساتھ انجیل میں نازل شدہ احکام پر عمل کرنے کے بھی مکلف تھے انجیل میں احکام اور عدل و حرام کے قوانین تو نہیں لیکن رموز و امثال اور مواعظ ہیں ان کے ماسوا جس قدر احکام و قوانین ہیں انھیں تورات پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

لہ علامہ سید رشید رضا (صاحب تفسیر المنار) ان آیات کی تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ ان آیات میں مَا اَنْزَلَ اللّٰہ کے مطابق حکم و فیصلہ نہ کرنے والوں کو کافر، ظالم اور فاسق فرمایا گیا ہے۔ یہ الفاظ قرآن میں ایک ہی حقیقت پر بولے جاتے ہیں والکافرون ھم الظالمون ھم الفاسقون مگر علمائے اصول نے قانونی زبان میں کفر، ظلم اور فسق میں امتیاز کیا ہے کفر کا لفظ تو خروج عن الملت پر بھی بولا جاتا ہے مگر ظلم و فسق کے الفاظ کا یہ حال نہیں ہے۔

اس کے باوجود کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن نے اس لفظ کا اطلاق بعض دفعہ ایسی چیزوں پر بھی کیا ہے جو کفر مخرج عن الملت کی تعریف میں نہیں آتا۔

اور جن لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آیات بنی اسرائیل پہ نازل ہوئی تھیں ان کی غرض یہ ہے کہ ان میں بنی اسرائیل کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں یہ مطلب نہیں کہ اُن کی کتاب میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے دو پہلی آیتیں یہود کے متعلق اور منیری نصاریٰ کے بارے میں اتری تھیں۔ لیکن ان کی عبارت اور حکم عام ہے۔ اور ان کے ساتھ مخصوص ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ ان آیات میں غور و فکر اور تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں کفر کا لفظ اور دوسری آیت میں ظلم و فسق کا لفظ نہایت مناسب ہے۔ یہ الفاظ اصلی لغت اور علماء اصول کی اصطلاح کے عنوان اترے ہیں۔

پہلی آیت میں وہ کلام تشریح میں ہو رہا ہے اور ایسی کتاب کے نازل کرنے کا ذکر ہے جس میں ہدایت اور نور تھا اور نبی حکماء اور علماء اسے حفظ کرنے اور عمل کے پابند تھے۔ آخر میں فرمایا کہ جو شخص اس کے مطابق حکم کرنے سے منہ پھیرتا ہے، اُس کا اُس پر یقین ہی نہیں۔ اور وہ اُس کی ہدایت و نور سے روگرداں ہے اور دوسری چیزوں کو اس پر ترجیح دیتا ہے۔ پس یہ شخص واقعی کافر ہی ہو سکتا ہے اور اس میں عاصی داخل نہیں ہو سکتا۔

لہ المنار ج ۶ ص ۴۰۳ - ۴۰۶

Marfat.com

دوسری آیت میں کلام اصل کتاب میں نہیں ۔ بلکہ قصاص میں ہے اور جو شخص اس کے مطابق حکم و فیصلہ نہ کرے وہ ظالم ہے یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے۔

تیسری آیت میں انجیل کے مواعظ و نصائح کا بیان ہے کیونکہ وہ انہی پر مشتمل ہے۔ یہاں تورات کی شریعت کا ذکر نہیں اور جو لوگ ان مواعظ و نصائح سے منہ پھیرتے ہیں وہ واقعی فاسق اور نافرمان ہیں۔

بہت سے مسلمانوں نے پہلے لوگوں کی طرح شرائع اور احکام ایجاد کر لئے ہیں اور ما انزل اللہ کے مطابق حکم کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جو شخص حدود شرع کو قبیح جان کر ترک کرتا ہے اس کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں اور جو شخص کسی اور علت سے ترک کرتا ہے وہ ظالم ہے بشرطیکہ اس میں کسی کا حق ضائع ہو اور عدل و مساوات کا ترک لازم آئے ورنہ وہ بھی فاسق ہے یہ آخری لفظ سب سے زیادہ عام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی تاکہ وہ زندگی کا دستور العمل اور فیصلوں کا قانون بنے **انجیل فی ذاتہ** قانون سازی کو مشتمل نہ تھی ہاں اس نے تورات کی شریعت میں کچھ ہلکی سی تبدیلیاں کی تھیں اور ان کے علاوہ باقی احکام میں تورات کی شریعت پر اعتماد کرتی تھی۔ اھل الانجیل کے لفظ سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور انجیل کے احکام و شرائع اہل انجیل کے لئے تھے۔ وہ رسالت محدود و مخصوص تھی۔ تمام انسانوں کیلئے عام نہ تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی تمام رسالتیں اور شرائع محدود مخصوص تھیں ہاں آخری دین کامل و مکمل تھا اور آخری رسالت کامل اور دائمی تھی۔

اسلام کے آنے سے پہلے تورات و انجیل والوں کا فرض تھا کہ اپنی اپنی کتاب کو قائم کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں اسلام نے ایک آخری اور کامل دین و شریعت پیش کیا ہے اب یہ سب لوگ اسی پر ایمان و عمل پر مامور ہیں۔ جیسا کہ اہل اسلام کا بھی یہی فرض ہے کہ اس قانون الٰہی کو قائم کریں۔

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا

اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی اور تصدیق کرنے والی

لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا

سابقہ کتابوں کی اور ان کے مضامین پر نگہبان

Marfat.com

عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

سو تو حکم کر ان میں موافق اس کے جو اتارا اللہ نے اور

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ

مت چل ان کی خوشی پر چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا

الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ

ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور

مِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً

راہ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک دین پر کر دیتا

وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ

لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے۔ اپنے دیئے ہوئے

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا

حکموں میں سو تم دوڑ کر لو خوبیاں اللہ کے پاس تم سب کو پہنچنا ہے

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ﴿۴۸﴾ وَاَنِ

پھر جتاوے گا جس بات میں تم کو اختلاف تھا۔ اور یہ فرمایا کہ

احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ

حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اور مت چل

اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ

ان کی خوشی پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکا نہ دیں

عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا

کسی ایسے حکم سے جو اللہ نے اتارا تجھ پر پھر اگر نہ مانیں

Marfat.com

أَفَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ

تو جان لے کہ اللہ نے یہی چاہا ہے کہ پہنچا دے ان کو کچھ

ذُنُوبِهِمْ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿٤٩﴾

سزا ان کے گناہوں کی اور لوگوں میں بہت ہیں نافرمان

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ

اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا اور اللہ سے بہتر کون ہے

اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٥٠﴾

حکم کرنے والا - یقین کرنے والوں کے واسطے؟

ومهيمنا عليه . مہیمن کے کئی معنی بیان کئے - امین، غالب، حاکم - محافظ اور نگہبان۔ اور ہر معنی کے اعتبار سے قرآن کریم کا کتب سابقہ پر مہیمن ہونا ثابت ہے خدا کی جو امانت تورات و انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں ودیعت کی گئی تھی وہ مع شئی زائد قرآن میں محفوظ ہے جس میں کوئی خیانت نہیں ہوئی۔ اور جو بعض فروعی چیزیں ان کتابوں میں اس زمانہ یا ان مخصوص مخاطبین کے حسب حال تھیں، انہیں قرآن نے منسوخ کر دیا اور جو حقائق ناتمام تھیں انہیں مکمل کر دیا - اور جو حصہ اس وقت کے اعتبار سے غیر اہم تھا اسے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

فاحكم بينهم بما انزل الله، یہود میں باہم کچھ نزاع ہو گئی تھی - ایک فریق جس میں انکے بڑے بڑے علماء اور مقتداء شامل تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور مفصل نزاع کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ عموماً قوم یہود ہمارے اختیار و اقتدار میں ہے آپ اگر فیصلہ ہمارے حق میں کر دیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے اور ہمارے اسلام لانے سے جمہور یہود اسلام قبول کر لیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشوتی اسلام کو منظور نہ کیا اور ان کی خواہشات کی پیروی سے صاف انکار فرما دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ابن کثیر)

ولا تتبع اهواءهم ... الحق، اور ان آیات کی جو شان نزول ہم لکھ چکے ہیں اس سے صاف عیاں ہے کہ آیت کا نزول بعد اس کے ہوا کہ آپ ان کی خوشی اور خواہش پر چلنے سے انکار فرما چکے

لہ فوائد القرآن ص ۱۲۱

Marfat.com

تھے تو یہ آیات آپؐ کی استقامت کی تصویب اور آئندہ بھی ایسی ہی شان عصمت پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کے لئے نازل ہوئیں جو لوگ اس قسم کی آیات کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان عصمت کے خلاف تصور کرتے ہیں وہ نہایت ہی قاصر الفہم ہیں۔

اوّل تو کسی چیز سے منع کرنا اس کی دلیل نہیں کہ جس کو منع کیا جا رہا ہے وہ اس ممنوع چیز کا ارتکاب کرنا چاہتا تھا دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی معصومیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی معصیت ان سے صادر نہیں ہو سکتی کسی کام کو یہ سمجھتے ہوئے کہ خدا کو ناپسند ہے وہ ہرگز اختیار نہیں کرتے۔ اور اگر اتفاقاً کسی وقت بھول چوک یا رائے و اختیار کی غلطی سے راجح و افضل کی جگہ مرجوح و مفضول کو اختیار کر لیں یا غیر مرضی کو مرضی سمجھ کر عمل کر گزریں جس کو اصطلاح میں زلّت کہتے ہیں تو اس طرح کے واقعات مسئلہ عصمت کے منافی نہیں جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور بعض دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات شاہد ہیں اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد

ولاتتبع اھواءھم اور فاحذرھم یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک

اور اسی طرح کی دوسری آیات کا مطلب سمجھنے میں کوئی خلجان نہیں رہتا۔ کیونکہ ان میں صرف اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ آپؐ ان ملعونوں کی ملمع سازی اور سخن طرازی سے قطعاً متاثر نہ ہوں اور کوئی ایسی رائے قائم نہ فرمائیں جس میں بلا قصد ان کی خواہشات کے اتباع کی صورت پیدا ہو جائے مثلاً اسی قصہ میں جو ان آیات کی شان نزول ہے۔ یہود نے کیسی عیارانہ اور پر فریب صورت حضورؐ کے سامنے پیش کی تھی کہ اگر آپؐ ان کے حسب منشا فیصلہ کر دیں تو سب یہود مسلمان ہو جائیں گے وہ جانتے تھے کہ اسلام سے بڑھ کر کوئی چیز آپؐ کے نزدیک محبوب اور عزیز نہیں۔ ایسے موقع پر امکان تھا کہ بڑے سے بڑا مستقیم الانسان بھی یہ رائے قائم کرے کہ ان کی ایک چھوٹی سی خواہش قبول کر لینے میں جبکہ اتنی عظیم الشان دینی منفعت کی توقع ہو، کیا مضائقہ ہے۔ اس طرح کے خطرناک اور مزلۃ الاقدام موقع پر قرآن کریم پیغمبر علیہ السلام کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو بھول کر بھی کوئی ایسی رائے قائم نہ کر لیجئے جو آپؐ کی شان رفیع کے مناسب نہ ہو۔ حضورؐ کا کمال تقویٰ اور انتہائی فہم و تدبر نزول آیت سے پہلے ہی ان ملاعین کے مکر و فریب کو رد کر چکا تھا۔ لیکن فرض کیجئے کہ اگر ایسا نہ ہو چکا ہوتا۔ تب بھی آیت کا مفہوم جیسا کہ ہم تقریر کر چکے ہیں، حضورؐ کی شان عصمت کے اصلاً مخالف نہیں۔

شرعۃً ومنہاجا: یعنی خدا نے ہر امت کا آئین اور طریق کار اس کے احوال و استعداد کے مطابق جدا گانہ رکھا ہے اور باوجودیکہ تمام انبیاء اور ملل سماویہ اصول دین اور مقاصد

Marfat.com

ملیۃ: جن پر نجاتِ اخروی کا دار و مدار ہے، میں باہم متحد اور ایک دوسرے کے مصدق رہے ہیں۔ پھر بھی جزئیات و فروع کے لحاظ سے ہر امت کو ان کے احوال اور مخصوص استعداد و ماحول کے موافق خاص خاص احکام و ہدایات دی گئیں۔ اس آیت میں اس فروعی اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو سب انبیاء علیہم السلام کو آپس میں علاتی بھائی فرمایا ہے۔ جن کا باپ ایک ہو اور مائیں مختلف ہوں۔ اُس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اصول سب کے ایک ہیں اور فروع میں اختلاف ہے۔ اور چونکہ بچہ کی تولید میں باپ فاعل اور مُفیض اور ماں قابل اور محل انفاعۃ بنتی ہے اس سے نہایت لطیف اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ شرائع سماویہ کا اختلاف مخاطبین کی قابلیت و استعداد پر مبنی ہے۔ ورنہ مبداء فیاض میں کوئی اختلاف و تعدد نہیں۔ سب شرائع و ادیان سماویہ کا سرچشمہ ایک ہی ذات اور اس کا علم ازلی ہے۔

لیبلوکم فی ما اٰتاکم ... یعنی کون تم میں سے خدا کی حاکمیت مطلقہ، علم محیط اور حکمتِ بالغہ پر یقین کر کے ہر نئے حکم کو حق و صواب سمجھ کر بطوع و رغبت قبول کرتا ہے اور ایک وفادار غلام کی طرح ہر جدید حکم کے سامنے گردن جھکانے کے لئے تیار رہتا ہے۔

فاستبقوا الخیرات : یعنی شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر خواہ مخواہ کی قیل و قال اور کج بحثوں میں پڑ کر وقت نہ گنواؤ۔ وصول الی اللہ کا ارادہ کرنے والوں کو عملی زندگی میں اپنی دوڑ دھوپ جاری رکھنی چاہیئے۔ اور جو عقائد، اخلاق و اعمال کی خوبیاں شریعت سماویہ پیش کر رہی ہیں۔ ان کے لئے چستی دکھلانی چاہیئے۔

الی اللہ مرجعکم ... تختلفون : یعنی انجام کا خیال کر کے خیرات کی تحصیل میں مستعدی دکھاؤ۔ اختلافات کی سب حقیقت وہاں جا کر کھل جائے گی۔

وان احکم بینھم بما انزل اللہ الیک یعنی آپس کے اختلافات میں دینا چاہیے۔ کتنی دست و گریباں ہو آپ کو یہی حکم ہے۔ کہ انزل اللہ کے مطابق حکم دیتے رہیں۔ اور کسی کے کہنے سننے کی کوئی پروا نہ کریں۔

فان تولوا ... ذنوبھم پوری سزا تو قیامت میں ملے گی لیکن کچھ تھوڑی سی سزا یہاں دے کر بھی مجرم کو دوسرے دیکھنے والوں کے لئے عبرت اور انہیں ایک گونہ تنبیہ کی جاتی ہے۔

وان کثیرا منھم لفاسقون یعنی آپ ان لوگوں کے اعراض و انحراف سے زیادہ ملول نہ ہوں۔ دنیا میں فرمانبردار بندے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین (یوسف)

یعنی جو لوگ شہنشاہیت، رحمت کاملہ اور علم محیط

Marfat.com

پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا میں کسی کا حکم خدا کے سامنے لائق انصاف نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا یہ لوگ احکام الٰہیہ کی روشنی آجانے کے بعد ظلمون داہماء اور کفر و جاہلیت کے اندھیرے ہی کی طرف جانا پسند کرتے ہیں۔

؎ ان آیات کا خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تورات کی بربادی کے بعد اللہ تعالیٰ نے انجیل نازل کی تھی۔ اس طرح اب انجیل کے ناپید ہو جانے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے دین میں افراط و تفریط ہو جانے کے سبب سے قرآن مجید نازل کیا گیا ہے۔ جس میں پہلی کتابوں کے سب عمدہ مضامین موجود ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان کا مہیمن یعنی محافظ ہے۔ قرآن میں ان مضامین کے آجانے سے وہ تحریف و تبدیلی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔

؎ عبداللہ بن عباس رضؓ نے فرمایا ہے کہ آیت ان احکم بینھم بما انزل اللہ کے نزول سے پہلے یہی حکم تھا کہ آپؐ اگر چاہیں تو اہل کتاب میں فیصلے کریں۔ چاہیں تو نہ کریں۔ مگر اس آیت نے حکم دیا کہ وحی الٰہی کے مطابق ان میں فیصلے کرنے ضروری ہیں۔

جو لوگ حکم خداوندی سے ہٹ کر اپنی رائے اور خواہش نفسانی سے بلا دلیل شرعی احکام گھڑ لیں انہیں ان آیات میں حکم جاہلیت کا پابند فرمایا گیا ہے جیسے کہ اہل جاہلیت و ضلالت اپنی رائے سے اور مطابق مرضی احکام سے جاری کر لیا کرتے تھے۔ اور جیسے کہ تاتاری ملکی معاملات میں چنگیز خانی احکام کی پیروی کرتے تھے۔ جنہیں الیاسق نے گھڑا تھا۔ وہ بہت سے مجموعی احکام کے دفاتر تھے۔ جو مختلف شریعتوں اور مذہبوں سے چھانٹے گئے تھے۔ یہودیت، نصرانیت اور اسلام وغیرہ بہت سے مذاہب کے احکام کا وہ مجموعہ تھا۔ اور اس میں بہت سے احکام وہ بھی تھے جو محض اپنی رائے، عقل اور دقت نظر سے ایجاد کر لئے تھے۔ یہی مجموعہ چنگیز خان کی اولاد میں قابل عمل ٹھیرا اور اسے کتاب و سنت پر فوقیت دی گئی۔ درحقیقت ایسا کرنے والے کافر ہیں اور ان سے جہاد واجب ہے۔ یہاں تک کہ وہ حکم خدا اور رسولؐ کی طرف لوٹ آئیں۔

؎ احقر مؤلف عرض کرتا ہے کہ اس مجموعہ قوانین کا نام الیاسہ چنگیز خانی تھا۔ تو وہ کالفظ نالفظ تورات ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ گویا جس طرح اللہ کی تورات تھی۔ اسی طرح ان کا الیاسہ

؎ تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲
؎ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۰۷ تا ۱۰۹ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

یہ اُس باغی و طاغی کی نوازات تھی!

[1] مھیمن کا معنی ہے قائم و متولی امین اور محافظ و نگران۔ شرعہ اور شریعہ کا معنی ہے مہر وغیرہ میں پانی بہنے کی جگہ یا راستہ۔ چونکہ شریعت کے احکام کو چلایا اور جاری کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ شریعہ کہلائی۔ منہاج کا معنی ہے راستہ، طریقہ اور سنت۔ ابتلا کا معنی ہے جانچنا اور فَاسْتَبِقُوا کا معنی ہے جلدی کرو، ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو۔ اور تیز روی اختیار کرو۔

قرآن پہلی کتابوں پر مھیمن ہے کہ اُس نے اُن کی اصل حقیقت واضح کی کہ ان کتابوں کے مخاطب ان کا بہت بڑا حصہ بھلا چکے تھے اور باقی کو تحریف و تاویل کا نشانہ بنا چکے تھے۔ اور ان پر عمل کرنے سے گریز کرتے تھے۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ سے معلوم ہو گیا کہ اسلامی شریعت پہلی شریعتوں کی ناسخ ہے۔ اور اب یہی قابل عمل ہے نہ کوئی اور شریعت و منہاج۔

شریعت و منہاج کے سب لوگوں کے لئے الگ الگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عملی قوانین تو اجتماعی حالات اور انسانی طبائع کے اختلاف کی وجہ سے ان کی مختلف قابلیتوں کی بنا پر الگ الگ رہے ہیں لیکن اصول دین میں سب پیغمبر متفق تھے اور دین کا اصل الاصول توحید خالص ہے اور اُسی کے سامنے جھکنا اور سرافگندہ ہونا۔ امام قتادہ رح نے آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ دین ایک ہے اور شریعتیں مختلف رہی ہیں پس شریعت ان عملی احکام کا نام ہے۔ جن میں سے ہر پچھلا اپنے سے پہلے کو منسوخ کرتا ہے اور دین اُن ثابت شدہ اصول کا نام ہے جو پیغمبروں کے الگ الگ ہونے سے نہیں بدلا۔ اور آج کل کے عرف میں بھی شریعت کا لفظ قوانین پر بولا جاتا ہے۔ جن کے ذریعے سے مقدمات و تنازعات کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسری مخلوقات کی انواع کی مانند ایک ہی قابلیت و استعداد پر نہیں رکھا۔ بلکہ زمان و مکان اور احوال کے اختلافات سے لوگوں کی استعداد اور قابلیت اطوار مختلف ہوتے رہے ہیں۔ شرائع کے مختلف ہونے کا راز بھی ہے۔ مشیت الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ انسان کو ایک ایسی نوع بنائے جو عقل، فکر اور فہم و علم کی استعداد رکھتی ہو اور مسلسل سے زندگی کے اطوار میں ترقی کرے۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی سنت ارتقاء کی پابند ہے

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۲۸ ۔ ۱۲۴ تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۱۰، ۴۲۶

Marfat.com

لہٰذا اُس کے لئے تمام اطوار و حالات میں ایک ہی شریعت کافی نہ تھی انسان جب عالم طفولیت میں تھا تو شرائع و قوانین الٰہی میں بھی مادہ غالب تھا۔ پھر جب اُس پر غیز کا دور آیا تو عواطف اور نفسانی وجدان و احساس غالب آگیا۔ پھر رُشد اور کمال عقل کے دور میں شرائع و سنن کو محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے ذریعے سے ختم کر دیا گیا۔ اور فکری اجتہاد کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اور قضاء و سیاست اور اصول اجتماع میں ارباب علم اور اصحاب رائے کے مشورے پر معاملات کا مدار رکھ دیا گیا۔

سابقہ شرائع کو اگر گہری نظر سے جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہودی شریعت شدت پر مبنی تھی اور اس میں رائے اور اجتہاد کو دخل نہ تھا۔ کیونکہ وہ ایک ایسی قوم کے لئے اتری تھی جو غلامی و ذلت کی عادی ہو چکی تھی۔ پس اس کا مدار شدت پر رکھا گیا۔

نصرانی شریعت کو دیکھو کہ وہ اپنے ماننے والوں کو مسلط اور غالب حکام کے سامنے جھک جانے اور ان کی بات مان کا حکم دیتی ہے۔ تاکہ وہ ہر ذلت و خواری کو قبول کر لیں اور اپنی توجہ صرف روحانی امور اور نفسانی تربیت کی طرف لگائے رکھیں۔

مگر اسلامی دیانت و شرع آزادی اور عقل کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور روح اور جسم دونوں کے تقاضوں کی جامع ہے۔ یہ چیز صرف اُس امت کے لائق تھی۔ جو عقلی رشد اور ارتقائے فکری کے بلوغ کو پہنچ چکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خالص دنیوی احکام اس میں کم ہیں اور انہیں ارباب اجتہاد کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس میں اتنی لچک رکھی گئی ہے۔ کہ وہ ہر زمان و مکان کے لئے یکساں قابل عمل ہے۔ اُس کا مدار خدا اور رسُولؐ کی اطاعت کے ماتحت اجتہاد اور اولوالعلم کی اطاعت پر رکھا ہے یہی باعث ہے کہ ہمارے فقہا عظام نے اجتہادی احکام میں زمان و مکان کے اختلاف سے خود مختلف احکام دیئے۔ امام شافعیؒ جب عراق میں تھے تو انہوں نے وہاں فقہی احکام و قوانین کی جو بنیاد رکھی اُس کا نام "مذہب قدیم" ہے اور جب وہ مصر میں وارد ہوئے تو بہت سی آراء و احکام کو بدل دیا اسے "مذہب جدید" کہا جاتا ہے۔

حکم الجاھلیۃ یبغون بنو نضیر اور بنو قریظہ کے جھگڑے میں جب مقدمہ حضورؐ کی عدالت میں پیش ہوا تو بعض یہودیوں نے حضورؐ سے مطالبہ کیا تھا کہ آپؐ زمانہ جاہلیت کے رسم و رواج کے مطابق فیصلہ فرمائیں اس کے رد میں یہ فرمایا گیا ہے۔

ومن احسن الخ جاہلیت کے اتفاقی قوانین میں ظلم و ستم اور بے انصافی ہے اس کے برخلاف اسلام کے حکم میں عدل و انصاف اور حق رسی موجود ہے اس کے باوجود اگر یہودی اسی جاہلیت کے رواج کو پسند کرتے ہیں تو یہ چیز حیرت ناک ہے۔

Marfat.com

[1] ان آیات میں یہ عبرت بھی موجود ہے کہ اس زمانے میں بعض ملحد مسلمان اپنے دین و اخلاق کے فساد میں ان لوگوں سے بھی بڑھ چکے ہیں۔ جن کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں وہ حکم الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے فیصلوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں خدا کی شریعت سے یہ بہتر ہے کہ انسان کو قانون سازی میں آزاد اور مستقل مانا جائے۔ لیکن وہ خود نہ تو اصول شرع کو جانتے ہیں اور نہ دین کے قواعد کا انہیں کچھ علم ہے۔

[2] ان آیات میں آخری رسالت اور آخری شریعت پر کلام کیا گیا ہے اسی رسالت نے دین اسلام کو آخری اور کامل صورت میں پیش کیا تاکہ وہ ساری انسانیت کا دین و شریعت بنے اور حیات انسانی کے مختلف شعبے رہتی دنیا تک اُس سے ہدایت پائیں۔ زندگی اپنے اعتقادی تصور میں اور اجتماعی نظام میں انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اس کی رہنمائی میں نشوونما پائے یہ شریعت عمل کے لئے آئی ہے۔ نہ کہ محض درس و تدریس اور قرأت و تلاوت کی غرض سے۔ وہ اس لئے آئی ہے کہ پوری احتیاط سے اس کے تمام اجزاء کو لیا جائے گا۔ اور کوئی چیز بھی اس میں سے نہ چھوڑی جائے اگر اُسے کل کے طور پر لیا جائے گا۔ تو اُسے ایمان و اسلام کہیں گے۔ ورنہ زندگی کے جس حصے میں جتنا اُسے ترک کیا جائے گا۔ اتنی ہی "جاہلیت" شمار ہو گی۔ اگر کوئی آدمی اسے "رواداری" کہہ کر ترک کرنا چاہے گا۔ تو اس کا قول مردود ہو گا۔ کیونکہ اللہ اگر چاہتا تو سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اُس کے قوانین پر عمل کیا اور کرایا جائے۔

ان آیات کو پڑھ کر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ کوئی مسلمان احوال و ظروف کے اختلاف کا بہانہ بنا کر خدا کی شرع کو ترک کر سکتا ہے! اور اگر وہ ترک کر دے تو پھر مسلمان کیسے کہلا سکتا ہے؟ اسلام کا جواء گردنوں سے نکال پھینکنے کے بعد کسی شخص یا جماعت کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ "مسلم" ہونے کا دعویٰ کریں؟ شریعت الٰہی کو پھینک دینا بالفاظ دیگر الوہیت کو پھینک دینا ہے۔

آخری رسالت کی کتاب ہر حیثیت سے برحق ہے، اللہ کے دین کی آخری شکل ہے اور شرع و قانون کے لئے آخری مرجع و مصدر ہے۔ پس واجب ہے کہ ہر اختلاف کو اس کی طرف لوٹایا جائے چاہے وہ اعتقادی اختلاف ہو یا عملی۔ خود مسلمانوں کے اندر ہو یا مسلم و غیر مسلم کا اختلاف

---

[1] المنار ج ۶ ص ۴۲۲

[2] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۸۸-۱۸۵۔

Marfat.com

آس کی سند کے بغیر کسی کی رائے اور اجتہاد کی کوئی بھی حیثیت نہیں **فاحکم بینھم** کا خطاب اوّلاً تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن انہیں سے مخصوص نہیں بلکہ عام ہے۔ اور چونکہ کوئی جدید رسول اور شریعت، اب آنے والی نہیں لہٰذا یہ خطاب اب رہتی دنیا تک کے لئے ہے۔ دین کامل ہو چکا، خدا کی نعمت پوری ہو چکی اب کسی نئی وحی و شریعت کا نہ انتظار ہے نہ ضرورت۔

اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس دین و شریعت کے احکام سے نکل بھاگنے کے لئے کئی بہانے بنائے جائیں گے۔ اس لئے اس نے اپنے پیغمبرؐ کو مکرّر سہ کرّر لوگوں کی خواہشات نفس کی پیروی سے منع فرمایا اور ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے کرنے کا حکم دیا۔ سب سے بڑا بہانہ مختلف لوگوں اور ملتوں کے درمیان اتحاد و یگانگت کا بہانہ ہے یہیں سے رواداری نکلتی ہے اور پھر خدا کی شریعت سے روگردانی کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس لئے اللہ نے اس حیلے کی جڑ یہ کہہ کر کاٹ دی کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو اختلاف سرے سے ہوتا ہی نہ۔ اور سب لوگ ایک ہی طریقے پر ہوتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ انسانوں کو حق و باطل کے اختیار و ترک کی آزادی دی ہے اور اسی میں ان کی آزمائش ہے اس طرح اللہ تعالیٰ نے شیطان کے داخل ہونے کے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ بالخصوص "تالیف قلوب" اور "تساہل و رواداری" کا بہانہ جو بظاہر بڑا دلفریب اور خوبصورت نظر آتا ہے۔ خدا کی شریعت کی قیمت اس سے بہت زیادہ ہے کہ اس قسم کے حیلے بہانوں سے اس کا تجزیہ کیا جائے اور کسی شخص یا جماعت یا قوم کو راضی کرنے کے لئے اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے حصے سے بھی دست برداری اختیار کی جائے! لوگوں کی استعدادیں مختلف ہیں، مشرب و مذہب الگ الگ ہیں۔ راستے اور پگڈنڈیاں جدا جدا ہیں۔ ان سب کو کون راضی کر سکتا ہے؟ پس اصول کو کسی مصلحت سے ترک نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ایک فضول کوشش اور غلط جنون ہے کہ سب لوگوں کو یا بعض کو راضی کرنے کے لئے خدا کے قانون میں تبدیل و تحریف کا کلہاڑا چلایا جائے۔ اس کا نتیجہ سوائے **فساد فی الارض** کے کچھ نہ ہوگا۔ اور یہ محض صراطِ مستقیم سے انحراف کی ایک شکل ہے۔ اس سے عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے کیونکہ اس سے انسان کی انسان کے لئے بندگی کا راستہ کھلے گا۔ جب دوسرے کو رب بنانے کی **راہ ہموار** ہوگی۔ یہی سب سے بڑا فساد اور سب سے بڑا شر ہے۔ محض ایک فرضی مصلحت کے لئے اتنا خطرناک اقدام نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی طبیعتوں اور رجحانات و میلانات میں اختلاف کا پایا جانا فطرتی ہے۔ سب کو ایک دین و شریعت پر کون جمع کر سکتا ہے؟ یہ خدائی مصلحت ہے کہ اس نے دین و شریعت کے ردّ و قبول کا اختیار انسانوں کو دیا ہے۔ دین میں جبر نہیں اور نہ یہ نام ہے "مساہلت و رواداری" ہی ہے۔

Marfat.com

ان آیتوں میں اس "رواداری" کا نام فتنہ رکھا ہے: واحذرھم ان یفتنوک الخ۔ واقعی یہ ایک عظیم و مہیب اور دقیق و شدید فتنہ ہے۔ پھر مخالفین کے اسلام کو قبول نہ کرنے پر حضورؐ کو جب رنج و الم لاحق ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہ کہہ کر تسلی دیتا ہے: فان تولوا فاعلم انما یرید اللہ ان یصیبھم ببعض ذنوبھم الخ یعنی ان کے اعراض سے خود انہی کا نقصان ہے۔ آپ کو کوئی ضرر نہ ہوگا۔ انہی کی دنیا و آخرت برباد ہوگی۔ انہی میں شر و فساد پھیلے گا اور انہی کو غلط نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔

افحکم الجاھلیۃ الخ سے فیصلہ فرمادیا کہ فیصلے دو ہی ہیں یا اللہ کا یا جاہلیت کا۔ اللہ کے حکم و فیصلے کے سوا سب جاہلیت ہے۔ درمیانی راستہ معدوم ہے یا اِدھر یا اُدھر۔ یا اللہ کا حکم و شریعت یا غیر اللہ کا فیصلہ و قانون ہے، اس آیت نے جاہلیت کو واضح کردیا کہ اس سے مراد انسان کا انسان کے لئے حکم و فیصلہ جاہلیت ہے۔ یہی غیر اللہ کی بندگی ہے۔ یہی اللہ کی بندگی سے خروج اور اس کی الوہیت سے رفض و انکار ہے اس نص کی رو سے جاہلیت کسی زمانے کا کوئی مخصوص حصہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک وضع و طور ہے۔ جو کل بھی پائی گئی تھی۔ اور آج بھی پائی جاتی ہے۔ بلکہ مستقبل میں بھی اس کا وجود ہوگا۔ اسلام کے خلاف جو کچھ ہے وہ جاہلیت ہے۔ تہذیب و تمدن کے چمکیلے نام اور علوم و فنون کی روشنی اسے جاہلیت ہونے سے نکال نہیں سکتی۔

ومن احسن من اللہ حکما الخ کیونکر اللہ ہی خالق ہے، ارحم الراحمین ہے مخلوق کی مصلحتوں کا عالم ہے۔ اس نے آخری رسول بھیجا، آخری شریعت بھیجی، آخری کتاب اتاری۔ تو وہ اس وقت اس بات سے معاذ اللہ جاہل نہ تھا کہ جدید حالات پیش آئیں گے، نئی نئی ضروریات پیدا ہوں گی۔ اور نئے نئے احوال و ظروف پیش آئیں گے۔

غیر مسلم جو چاہے کہے لیکن ایک مدعی اسلام یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ اب کچھ نئے تقاضے پیش آگئے ہیں اور خدا کی شریعت کی بجائے کسی اور کی شریعت پر عمل کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ اگر کوئی ایسا کہہ دے تو وہ اسلام پر باقی نہیں رہے گا۔ نہ اس میں اسلام کا شائبہ باقی رہے گا۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَ

اے ایمان والو مت بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست

Marfat.com

النَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ

وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے

یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا

کے اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہی میں ہے اللہ راہ نہیں

یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ فَتَرَی الَّذِیْنَ

دیتا ظالم لوگوں کو اب تو دیکھے گا ان کو

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ

جن کے دل میں بیماری ہے۔ دوڑ کر ملتے ہیں ان میں

یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَی

کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش زمانہ کی سو قریب ہے

اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ

کہ اللہ جلد ظاہر فرمائے فتح یا کوئی حکم اپنے پاس سے

فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ ۝

تو لگیں اپنے جی کی چھپی بات پر پچھتانے

Marfat.com

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ

اور کہتے ہیں مسلمان کیا یہ وہی لوگ ہیں جو

اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ

قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید سے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

برباد ہوگئے ان کے عمل پھر رہ گئے نقصان میں۔

اولیاء: ولی کی جمع ہے۔ ولی دوست کو بھی کہتے ہیں۔ قریب کو بھی، ناصر اور مددگار کو بھی۔ غرض یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ بلکہ تمام کفار سے۔ جیسا کہ سورۂ نساء میں تصریح کی گئی ہے، مسلمان دوستانہ تعلقات قائم نہ کریں۔ اس موقع پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ موالات، مروت و حسنِ سلوک، مصالحت، رواداری اور عدل و انصاف یہ سب چیزیں الگ الگ ہیں۔ اہل اسلام اگر مصلحت سمجھیں تو ہر کافر سے صلح اور عہد و پیمان مشروع طریقہ پر کر سکتے ہیں۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (انفال ع) عدل و انصاف کا حکم جیسا کہ گزشتہ آیات سے معلوم ہو چکا مسلم و کافر ہر فرد بشر کے حق میں ہے۔ مروت اور حسنِ سلوک یا "رواداری" کا برتاؤ ان کفار کے ساتھ ہو سکتا ہے جو جماعتِ اسلام کے مقابلہ میں دشمنی اور فساد کا مظاہرہ نہ کریں جیسا کہ سورۂ ممتحنہ میں تصریح کی گئی ہے باقی موالات یعنی دوستانہ اعتماد اور برادرانہ مناصرت و معاونت، تو کسی مسلمان کو حق نہیں کہ یہ تعلق کسی غیر مسلم سے قائم کرے۔ البتہ صوری موالات جو اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کے تحت میں داخل ہو اور عام تعاون جس کا اسلام اور مسلمانوں کی پوزیشن پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے اس کی اجازت ہے۔ بعض خلفائے راشدین سے جو اس بارہ میں غیر معمولی تشدید و تضییق منقول ہے اس کو محض سدِ ذرائع اور مزید احتیاط پر مبنی سمجھنا چاہیئے۔[1]

[1] فوائد القرآن شیخ الاسلام ص ۱۵۰

Marfat.com

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ : یعنی مذہبی فرقہ بندی اور اندرونی بغض و عداوت کے باوجود وہ باہم ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ یہودی یہودی کا نصرانی نصرانی کا دوست بن سکتا ہے اور جماعتِ اسلام کے مقابلہ میں سب کفار ایک دوسرے کے دوست اور معاون جاتے ہیں۔ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ —

فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ : یعنی وہ ان ہی کے زمرہ میں داخل ہے۔ یہ آیتیں رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے باب میں نازل ہوئی تھیں۔ یہود سے اُس کا بہت دوستانہ تھا۔ اُس کا گمان یہ تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑی اور معاذ اللہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت مغلوب ہو گئی تو یہود سے ہماری دوستی کام آئیگی۔ اسی واقعہ کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے تو فی الحقیقت یہود کے ساتھ منافقین کی موالات کا اصلی منشا یہ تھا کہ یہود جماعتِ اسلام کے مدِمقابل اور مذہب اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہود و نصاریٰ یا کسی اور جماعت کفار کے ساتھ اس نیت اور اس حیثیت سے موالات کرے کہ وہ دشمنِ اسلام ہے، اُس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ منافقین میں کچھ لوگ اور بھی تھے جنہوں نے جنگِ اُحد میں لڑائی کا پانسہ بدلا ہوا دیکھ کر کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب فلاں فلاں یہودی یا نصرانی سے دوستانہ گانٹھیں گے اور ضرورت پیش آنے پر ان کا مذہب اختیار کر لیں گے۔ اس قماش کے لوگوں کے متعلق بھی وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کا ظاہری مدلول علانیہ صادق ہے۔ رہے وہ مسلمان جو اس قسم کی نیت اور منشاء سے خالی ہو کر یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کریں، چونکہ ان کی نسبت بھی قوی خطرہ رہتا ہے کہ وہ کفار کی حد سے زیادہ ہم نشینی اور اقتدار سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں، یا کم از کم شعائرِ کفر اور رسوم شرکیہ سے کارہ اور نفور نہ ہوں۔ اس اعتبار سے فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کا اطلاق اُن کے حق میں بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ حدیث اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ نے اس مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ : یعنی جو لوگ کہ جو دشمنانِ اسلام سے موالات کر کے خود اپنی جان پر اور مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور جماعتِ اسلام کے مقہور و مغلوب ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ ایسی بدبخت اور دغاباز قوم کی نسبت یہ اُمید

Marfat.com

نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی راہِ ہدایت پر آئیں گے۔
فَتَرَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ . . . . دَآئِرَةٌ! یہ وہی لوگ ہیں، جن کے دلوں میں شک اور نفاق کی بیماری ہے۔ جن کو خدا کے وعدوں پر اعتماد تھا اور نہ مسلمانوں کی حقانیت پر یقین اسی لئے دوڑ دوڑ کر کافروں کی آغوش میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کے موہوم غلبہ کے وقت ثمراتِ فتح سے متمتع ہوسکیں۔ اور ان کے زعم میں جو گردشیں اور آفات پر آنے والی تھیں، وہ ان سے محفوظ رہیں۔
نَخْشٰٓی اَنْ یُّصِیْبَنَا دَآئِرَةٌ جب پیغمبر علیہ السلام اور مخلص مسلمانوں کے سامنے یہود سے دوستی رکھنے کی معذرت میں کہتے تھے "گردشِ زمانہ" کا یہ مطلب ظاہر کرتے کہ یہود ہمارے ساہوکار ہیں۔ ہم ان سے قرض و دام لیتے ہیں۔ اگر کوئی مصیبت قحط وغیرہ کی پڑی تو وہ ہمارے تعلقات کی وجہ سے آڑے وقت میں کام آئیں گے۔ انہی خیالات کا جواب اب آگے دیا گیا ہے۔
فَعَسَی اللّٰهُ . . . . نٰدِمِیْنَ: وہ وقت نزدیک ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فیصلہ کن فتوحات اور غلبہ عطا فرمائے اور مکہ معظمہ میں بھی جو تمام عرب کا مسلّمہ مرکز ہے حضورؐ کو فاتحانہ داخل کرے یا اس کے علاوہ اپنی قدرت اور حکم سے کچھ اور امور بروئے کار لائے جنہیں دیکھ کر ان منافقین کی ساری باطل توقعات کا خاتمہ ہوجائے۔ اور انہیں منکشف ہوجائے کہ دشمنانِ اسلام کی موالات کا نتیجہ دنیوی ذلت و رسوائی اور اُخروی عذاب الیم کے سوا کچھ نہیں جب فضیحت و خسران کے یہ نتائج سامنے آجائیں گے تو اس وقت بجز پچھتانے اور کفِ افسوس ملنے کے کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسلام کے عام غلبہ اور فتح مکّہ وغیرہ کو دیکھ کر تمام اعدائے اسلام کے حوصلے پست ہوگئے۔ بہت سے یہود مارے گئے، بہت سے جلاوطن ہوئے اور منافقین کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مسلمانوں کے سامنے صریح طور پر جھوٹے ثابت ہوئے۔ موالاتِ یہود میں جو کوششیں کی تھیں وہ اکارت گئیں اور خسرانِ دنیوی اور ہلاکتِ ابدی کا طوق گلے میں پڑا۔ اگلی آیت میں اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے۔
ایک[1] روایت میں آیا ہے کہ یہ آیتیں عبداللہ بن اُبی بن سلول (رئیس المنافقین) کے بارے میں اتری تھیں۔ حضرت عبادہؓ بن صامت نے (جو یہودیوں

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۱

Marfat.com

کے حلیف تھے، حضورؐ سے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ بہت سے یہودیوں سے میری دوستی ہے مگر اب میں ان سب کی دوستیاں توڑتا ہوں۔ مجھے اللہ اور رسولؐ کی دوستی کافی ہے۔ اس پر اُس منافق نے کہا کہ میں آگا پیچھا سوچنے کا عادی ہوں مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ جانے کس وقت کیسا موقع آ پڑے۔ حضورؐ نے فرمایا اے عبداللہ! تو عبادہؓ کی نسبت بہت ہی گھاٹے میں رہا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

ان آیات میں ولایت سے مراد مومنوں کے خلاف باہمی مدد اور عہد و پیمان کی دوستی ہے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان علت کا شکار ہے، صحیح نہیں۔ دائرۃ سے مراد گردش زمانہ ہے۔ جو مصائب و حادثات سے آدمی کو گھیر لیتی ہے۔ جس طرح دائرۃ اپنے اندر کی چیزوں کو گھیر لیتا ہے۔ الفتح سے مراد یہاں فیصلہ ہے۔ جو ملک فتح ہونے یا کسی اور طرح سے ہوتا ہے۔ حبطِ اعمال سے مراد یہاں یہ ہے کہ منافقانہ طور پر جو اعمال وہ بتکلف کرتے تھے۔ مثلاً نماز روزہ اور حج و جہاد وغیرہ وہ سب ضائع اور باطل ہو گئے ہیں انہیں ان کا کوئی اجر نہ ملے گا۔

حضورؐ جب مدینہ میں وارد ہوئے تو آپؐ کے ساتھ معاملہ کرنے والے کفار کی تین قسمیں تھیں:۔

(۱) جن سے آپؐ نے عہد و پیمان کیا کہ نہ تو وہ آپؐ سے لڑیں گے نہ کسی دشمن کی مدد کریں گے۔ اور نہ اُس سے دلی دوستی رکھیں گے۔ انہیں حضورؐ نے اُن کے کافر ہونے کے باوجود جان و مال اور ناموس کی حفاظت کا یقین دلایا۔

(۲) وہ کافر جو آپؐ سے لڑے اور کھلم کھلا آپؐ سے دشمنی کا اظہار کیا۔

(۳) تیسری قسم وہ تھی جنہوں نے نہ آپؐ سے معاہدہ کیا نہ دشمنی کی۔ بلکہ اس انتظار میں رہے کہ آپؐ کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اور کفار کا مآلِ کار کیا ہوتا ہے۔ اس قسم کے کفار میں سے بعض تو وہ تھے۔ جو دل سے آپؐ کے غلبے اور کامیابی کے متمنی تھے۔ لیکن بعض وہ تھے جو بظاہر آپؐ کے ساتھ ہو گئے مگر بباطن کفار کے ساتھ رہے۔ تاکہ دونوں فریقوں سے امن میں رہیں۔ یہی لوگ منافق تھے۔ حضورؐ نے ان تینوں فریقوں کے حسبِ حال ان سے بحکم الٰہی معاملہ فرمایا۔ یہود مدینہ نے معاہدہ امن کیا تھا۔ اور دستاویز پر دستخط بھی کئے تھے۔

لہ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۳۱، ۱۳۲ المنار ج ۶ ص ۴۲۲، ۴۲۴

Marfat.com

مدینہ کے گرد یہودیوں کے تین گروہ بستے تھے۔

(ا) بنو قینقاع

(ب) بنو نضیر

(ج) بنو قریظہ

پہلے فریق (بنو قینقاع) نے جنگِ بدر کے بعد آپؐ سے جنگ کی اور کھلم کھلا حسد و عداوت کا اظہار بغاوت کی صورت میں کیا۔ پھر اس سے چھ ماہ بعد دوسرے فریق (بنو نضیر) نے بھی معاہدہ توڑ ڈالا۔

اب تیسرا فریق رہ گیا تھا یعنی بنو قریظہ۔ یہ عداوتِ اسلام و عداوتِ رسولؐ میں سب سے زیادہ شدید یہودی تھے۔ چنانچہ جب آپؐ ۵ھ کو غزوۂ خندق (الاحزاب) میں مصروف تھے۔ تو انہوں نے بھی معاہدہ توڑ ڈالا۔

حضورؐ نے ان سب سے لڑائی کی اور باذنِ الٰہی کامیاب ہوئے۔

ان کے علاوہ عرب اور روم کے عیسائی بھی یہود کی مانند آپؐ کے کھلے دشمن تھے۔

پس ان آیت میں ان کی موالات اور اسلام و اہل اسلام کے خلاف ان کی مدد کو حرام فرما دیا گیا ہے۔ اور منافقین کی حجت و دلیل کو قطع کر دیا گیا ہے۔ ہر زمانے کے منافقوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ کہ اپنے بچاؤ اور ذاتی و دنیوی فوائد کے لئے دین و ملت اور وطن کو بیچ ڈالتے ہیں۔ بعض کمزور حکومتوں کے وزراء گردشِ زمانہ سے محفوظ رہنے کے لئے طاقتور سلطنتوں سے اندرونی سازباز کر لیتے ہیں۔ اس طرح سے مضبوط حکومتوں کا عمل دخل کمزور حکومتوں میں غالب و ثابت ہو جاتا ہے۔

مؤلف عرض کرتا ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اس صورتِ حال کی تصویر یوں کھینچی ہے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ ملت، ننگِ دین، ننگِ وطن

ملتے را ہر کجا غارتگرے است — اصلِ او از صادقے یا جعفرے ست

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ او امرٍ الخ فتح سے مراد یا تو فتح مکہ ہے جو اسلام کے غلبے اور قوت کا نشان تھا۔ اور اس کے ذریعے سے حضورؐ سے کئے گئے وعدے پورے ہوتے تھے، یا حجاز میں یہودیوں کے گڑھ مثلاً خیبر وغیرہ کی فتح مراد ہے۔

Marfat.com

امر سے مراد یا یہودیوں پر ٹوٹ پڑنے کا حکم ہے جیسا کہ انہیں جلاوطن کیا گیا اور ان کے تلعوں اور گڑھیوں سے نکال دیا گیا تھا۔ یا اُن پر لشکروں سواروں اور پیادوں کی چڑھائی ہے جیسا کہ بنو قریظہ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یا ان کے دلوں میں رعب ڈال دینا مراد ہے۔ جس سے کہ وہ خود بخود مطیع ہو جائیں جیسا کہ یہود بنو نضیر کے ساتھ ہوا تھا۔ اور یا پھر امر سے یہود و نصاریٰ پر جزیہ لگانے کا حکم مراد ہے۔

ان دو آیتوں میں غیبی خبریں دی گئی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ رسولؐ سے نبھایا، کافروں کو ذلیل کیا اور منافقوں کو رسوا کر دیا۔

یہ آیتیں صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ انکے نزول کے وقت مدینہ میں یہودیوں کی کافی شان و شوکت تھی اور منافق گردشِ زمانہ سے ڈر کر ان سے سازباز رکھتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورہ ساری کی ساری الفتح کے بعد صلح حدیبیہ (۶ھ) ہی میں نازل نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس کے بعض حصے (مثلاً زیر تفسیر آیات) اس سے قبل نازل ہو چکی تھیں۔ بنو قریظہ کو جنگِ خندق کے سال جلاوطن کیا گیا تھا۔ پس کم از کم اس وقت ان آیتوں کا نزول ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان میں فتح اور اَمْرٌ مِنْ عِنْدِ اللّٰہ کا وعدہ موجود ہے۔ بنو قینقاع جنگ بدر کے بعد اور بنو نضیر کے جنگ اُحد کے بعد جلاوطن کئے جانے سے کچھ قبل یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں۔

قرآن کریم مسلم فرد کی تربیت اس طور کرتا ہے کہ اس کی دلی دوستی (موالات) صرف اللہ و رسولؐ، اپنے عقیدے اور مسلم جماعت کے ساتھ ہی خاص ہو جائے اور جس صف میں وہ کھڑا ہے اُس کے مخالف و دشمن صفوں کے درمیان پورا امتیاز و فصل رہے۔ وہ ایک ہی جماعت "حزب اللہ" کا رکن ہے۔ پس اس کا اخلاص و مودّت اور موالات اسی جماعت اور اس کے لئے ہے۔

پھر وہ فردِ مسلم کو بتاتا ہے کہ تیرے دشمنوں کی دشمنی کا باعث محض تیرا عقیدہ ہے مسلم اور اس کے دشمنوں کے درمیان یہی حدِ فاصل ہے۔ دشمن صرف اس کے دین و عقیدہ کی وجہ سے اس کے دشمن ہیں کسی اور چیز یا غرض کی وجہ سے نہیں۔

یہ دونوں چیزیں شرائط ایمان کی تحقیق میں، مسلمان کی شخصی تربیت میں اور مسلم جماعت کی تنظیم میں نہایت اہم ہیں۔ ان کے بغیر ایمان و اسلام کوئی چیز نہیں۔

ان آیات میں یہود و نصاریٰ کی جس موالات (ولاء، ولایت) سے روکا گیا

سلہ فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۱۸۷، ۲۰۳

Marfat.com

مسلمانوں کو نکالنے اور وہاں یہود کو بسانے والے کون تھے ؟ حبشہ، سومالی لینڈ، اری ٹیریا اور الجزائر سے مسلمانوں کو بھگانے اور نکالنے والا کون تھے ؟ مسلمانوں کے خلاف الحاد، مادیت اور بت پرستی سے اتحاد و یگانگت کی پینگیں بڑھانے والا کون تھا ؟ یوگوسلاویہ، چین، ترکستان اور ہندو پاکستان میں مسلمانوں کے خلاف دوسرے غیر [illegible] سے اتحاد کرنے والا کون ہے ؟

یہود و نصاریٰ اسلام اور الحاد و کمیونزم میں سے ہمیشہ مؤخر الذکر کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ اب بھی دے رہے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا یا سمجھنا سخت بیوقوفی ہے کہ کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو ان لوگوں سے تعاون کرنا چاہیئے۔

قرآن کا [illegible] کسی زمانے یا مکان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے اور ہر ملک اور ہر جگہ کے لئے ہے اور قیامت تک رہے گا۔ آیت کے نزول کے وقت مسلم جماعت اور یہود کے درمیان پوری جدائی اور کامل امتیاز نہیں ہوا تھا۔ ان میں ولاء، حلف، اقتصاد اور باہمی تعاون کے علاوہ ہمسائگی اور صحبت کے تعلقات بھی موجود تھے اس صورت حال سے یہود فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ہر وقت سازشوں کے جال پھیلائے رکھتے تھے۔ ان آیات میں مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی موالات اور اخلاص کو صرف اسلام، اللہ و رسولؐ اور مسلم جماعت کے ساتھ خاص کر لیں اور اپنے اور ہر اس شخص یا جماعت کے درمیان جو اسلام کی طرف منسوب نہیں، کامل امتیاز اور فاصلہ کر لیں ان آیات نے اخلاق و سماحت اور رواداری سے منع نہیں کیا کیونکہ وہ تو ہمیشہ ایک مسلم کی صفت ہوتی ہے۔ بلکہ ولاء سے منع فرمایا ہے جو ایک مسلم کے دل میں صرف خدا اور رسولؐ اور ایمانداروں کے لئے ہوتی ہے۔ کئی صدیاں گزر چکی ہیں اور اس ارشاد کی عملی صداقت واضح ہو چکی ہے کہ بعضھم اولیاء بعض" یہود و نصاریٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مدینہ میں باہمی موالات کا ثبوت دیا۔ اور پھر زمین کے چپے چپے اور گوشے گوشے میں ایسا ہی کرتے رہے۔ تاریخ میں کبھی ایک مرتبہ بھی یہ قاعدہ نہیں ٹوٹا، یہ تعصب ہمیشہ اہل کتاب میں موجود رہا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ: تم میں سے جو ان سے دلی دوستی رکھے گا وہ انہی میں سے ہوگا" ایسا شخص اپنے اوپر اللہ اور رسولؐ پر اور مسلم جماعت پر ظلم کرنے والا ہوگا جو ایسے شدید دشمنوں سے موالات رکھے۔ اسی لئے فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ ایسے شخص کا ایمان و اسلام کہاں

Marfat.com

باقی رہے گا۔

مسلمان کا مقصدِ وجود ہی اقامتِ دینِ الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ جب تک کہ وہ اپنی ساری طاقت اسی مقصد کی سربلندی کے لئے نہ لگا دے اور جب وہ ایسا کرے گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دین کے شدید ترین دشمنوں سے موالات رکھے۔ یہ تو عملی طور پر بھی ناممکن ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔

جو لوگ رواداری اور ادیان کو باہم قریب کرنے کے نام سے اسلام و کفر کے اس امتیاز کو مٹانا چاہتے ہیں۔ وہ نہ تو دین کا معنیٰ سمجھتے ہیں نہ رواداری کا مفہوم جانتے ہیں۔ دین تو صرف ایک ہی ہے اور وہ آخری دین ہے۔ اس لئے ادیان کا یا انہیں باہم قریب لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور تسامح یا رواداری صرف شخصی معاملات میں ہوتی ہے۔ نہ تو اعتقاد میں ہوتی ہے نہ نظام اجتماعی میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ دینِ اسلام کے سوا کسی سے راضی نہیں، کسی کو قبول نہیں کرتا، پھر ادیان کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟

حضورؐ کے زمانے میں نصاریٰ اگرچہ یہود کی مانند مسلمانوں کے لئے شدید العداوت نہ تھے۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ پھر بھی اس آیت میں یہود و نصاریٰ دونوں کا ذکر ہے، دونوں سے موالات حرام قرار دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود ایک دائمی حکم، دائمی علاقہ اور تعلقات و معاہدات پیش کر رہی ہے۔ جو مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ بلکہ سبھی غیر مسلموں میں ہونے ضروری ہیں۔ اور ایک قاعدہ و ضابطہ بیان کر رہی ہے کہ مسلم کی ولاء و حلف مسلم کے سوا کسی کے ساتھ نہیں اور مسلم کی ولاء اللہ و رسولؐ اور جماعتِ مسلمین کے لئے خاص ہے۔ اس معاملے میں سب غیر مسلم برابر ہیں۔ اگرچہ بعض حالات و واقعات میں ان کا سلوک ہم سے کچھ مختلف ہو۔

اور تاریخ نے تو ثابت کر دیا ہے کہ نصاریٰ کی دشمنی ہمارے ساتھ یہود کی دشمنی سے کم نہیں رہی۔ ساری اسلامی تاریخ میں اس سے صرف دو واقعات مستثنیٰ ہیں۔ ایک تو عرب کے نصاریٰ اور دوسرے مصر کے نصاریٰ کے واقعات۔ ان کے علاوہ عیسائیت نے اسلام کو مٹانے، مسلمانوں کو مارنے، اسلام و اہل اسلام کے خلاف مکر و کفر کے جال بچھانے، مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد کرنے اور دنیا کے کونے کونے میں انہیں ذلیل و خوار کرنے کی کوششوں میں کبھی کمی نہیں کی۔ ان کے اس رویے نے اس آیت کی صداقت کو روزِ روشن کی

Marfat.com

ہے اُس سے مراد اُن کے دین کا اتباع نہیں۔ کیونکہ یہ بات بہت بعید ہے کہ مسلمانوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہو جو یہود و نصاریٰ کے دین کا اتباع کرنے کی طرف میلان رکھتا ہو۔ اس سے مراد تناصر و تحالف ہے قبل از اسلام یہ چیز اہل مدینہ اور یہود میں قائم تھی۔ بعد از ہجرت یہود سے معاہدۂ امن ہوا۔ علاوہ ازیں بعض تعلقات بامصالح کی بنا پر بھی کچھ لوگوں کا گمان تھا کہ شاید غیر مسلموں سے دلی تعاون اور تحالف و تناصر بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی خیال کا یہاں ردّ فرمایا ہے۔

ایک اور آیت میں ان مسلمانوں کے متعلق جو ابھی تک ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہیں آئے تھے، فرمایا ہے: مَا لَكُمْ مِّن وَّلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوا۔ پس یہاں بھی ظاہر ہے کہ ولایت دینی مراد نہیں کیونکہ وہ تو ہر حال میں مسلمانوں میں قائم رہتی ہے پس یہاں بھی ولایت سے مراد تناصر و تعاون ہے۔ کیونکہ یہی چیز دارالاسلام کے مسلمانوں اور دیگر مسلمانوں کے درمیان قائم نہیں ہو سکتی۔

اہلِ کتاب کے ساتھ رواداری اور چیز ہے اور موالات دوسری چیز ہے۔ پہلی چیز کی اجازت ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں حکم بھی ہے۔ مگر دوسری چیز کی کسی حالت میں اجازت نہیں۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ۔ "یہ سب ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے ہیں"۔ یہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلم جماعت کی دشمنی اور اس کے خلاف جنگ میں یہ سب لوگ ایک ہیں۔ ان کا مسلم سے جھگڑا ہے کہ وہ اپنا دین ترک کر دے۔ وہ اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف جنگ و جدل پر مصر ہیں۔ ہم چاہیں کچھ کریں، کتنی رواداری اور مؤدت کا اظہار کریں۔ اپنا سب کچھ دے ڈالیں وہ تب بھی ——— جب تک ہم مسلم ہیں ہماری دشمنی نہیں چھوڑیں گے اس سے بڑی سادگی بلکہ حماقت اور کوئی نہیں کہ ہم کسی قیمت پر کسی حالت میں بھی یہ سمجھیں کہ اہلِ کتاب سے ہمارا کچھ مشترک ہے۔ یا ہم ان کے ساتھ تعاون کر کے کسی اور غیر مسلم جماعت سے لڑ سکتے ہیں! ہرگز نہیں!

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ مادیت و الحاد سے لڑنے کے لئے ہم اہلِ کتاب کے ہاتھوں میں ہاتھ دے سکتے ہیں ان کی سادگی بلکہ حماقت پر رونا آتا ہے۔ ایسے لوگ قرآن کی تعلیمات اور تاریخی حقائق سے جاہل ہیں اہلِ کتاب نے ہمیشہ اسلام کے مقابلے میں کفر و شرک کا ساتھ دیا ہے۔ صلیبی جنگوں کے واقعات کو کون مسلمان بھول سکتا ہے؟ اندلس میں انہوں نے کیا کیا کچھ نہیں کیا؟ فلسطین سے

Marfat.com

طرح ثابت کر دیا ہے۔

اسلامی تصور و عقیدے کی رُو سے ہر مذہب "دین" نہیں ہے بلکہ دین صرف ایک ہے اور وہ اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ اور وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔ اہل کتاب کا وجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہ معنی نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اُن کے محرّف و مبدّل دین کو قبول کر لیتا ہے۔ یا انہیں کسی دین الٰہی پر سمجھتا ہے آخری رسولؐ کی بعثت سے قبل تو ضرور ایسا ہو گا۔ مگر اس کے بعد نہیں۔ اب اسلام کے سوا کوئی دین نہیں، قرآن کے سوا کوئی آسمانی ضابطہ و کتاب نہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی رسول نہیں!

دین صرف اسلام ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ لادین ہے پس ہم ایک لادین کی مخالفت میں دوسرے لادین سے مصالحت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ یہود و نصاریٰ کا لادین محرّف و مبدّل ہے اس میں اور کسی اور لادین میں کوئی فرق نہیں۔

مسلمانوں کو بعض معاملات میں اہلِ کتاب سے دوسرے کفار کی نسبت امتیازی سلوک کا حکم ملا ہے مثلاً ان کی عفیف و پاک باز عورتوں سے نکاح کرنا — گو اس میں اختلاف ہے کہ موجودہ اہلِ کتاب، اہلِ کتاب ہیں یا نہیں ہے — اور ان کا ذبیحہ کھا لینا۔ لیکن اس کا مطلب موالات و تناصر نہیں ہے نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد انکا دین قابلِ قبول ہے یا دین الٰہی ہے۔

پس اشتراکیت و الحاد کے مقابلے میں ہم اہل کتاب کے ساتھ کبھی متحدہ محاذ نہیں بنا سکتے۔ یہ چیز نہ صرف عقیدہ اسلامیہ کے خلاف ہے بلکہ عملی طور پر بھی ناقابلِ عمل ہے اور تاریخ کے شواہد و دلائل کے صریحاً خلاف ہے۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کو اسلام کی دعوت دیں۔ پس اگر ان کا دین درست تھا۔ تو اس دعوت کا مطلب کیا ہے۔ اس دعوت میں اسلام نے اہلِ کتاب اور کسی اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں رکھا اس طرح موالات میں بھی ان میں اور کسی اور میں فرق نہیں رکھا گیا۔

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ

اے ایمان والو جو کوئی تم میں پھرے گا

عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ

اپنے دین سے تو عنقریب اللہ لائے گا ایسی قوم کہ اللہ ان کو چاہتا ہے

وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ

اور وہ اس کو چاہتے ہیں۔ نرم دل ہیں مومنوں پر زبردست ہیں

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

دوستوں پر لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ

اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے یہ فضل ہے اللہ کا

يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۵۴

دے گا جس کو چاہے۔ اور اللہ کشائش والا ہے۔ خبردار ہے

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہی ہے اور اس کا رسولؐ اور ایمان والے

Marfat.com

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ

ہیں جو کہ قائم ہیں نماز پر اور دیتے ہیں زکوٰۃ

وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ

اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں اور جو کوئی دوست رکھے اللہ کو اور اسکے

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۵۸

رسولؐ کو اور ایمان والوں کو تو اللہ کی جماعت ہی سب پر غالب ہے

۵۶ اس آیت میں اسلام کی ابدی بقاء اور حفاظت کے متعلق عظیم الشان پیشینگوئی کی گئی ہے۔ پچھلی آیات میں کفار کی موالات سے منع کیا گیا تھا ممکن تھا کوئی شخص یا قوم موالاتِ کفار کی بدولت صریحاً اسلام سے پھر جائے جیسا کہ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ میں تنبیہ کی گئی ہے قرآن کریم نے نہایت قوت اور صفائی سے آگاہ کر دیا۔ کہ ایسے لوگ اسلام سے پھر کر کچھ اپنا ہی نقصان کریں گے، اسلام کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ حق تعالےٰ مرتدین کے بدلے میں یا اُن کے مقابلہ پر ایسی قوم لے آئے گا جن کو خدا کا عشق ہو اور خدا اُن سے محبت کرے۔ وہ مسلمانوں پر شفیق اور مہربان اور دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں غالب اور زبردست ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی بحول اللہ و قوتہٖ ہر قرن میں پوری ہوتی رہی۔ ارتداد کا سب سے بڑا فتنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ کے عہد میں پھیلا۔ کئی طرح کے مرتدین اسلام کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ مگر صدیق اکبرؓ کی ایمانی جرأت اور اعلیٰ تدبر اور مخلص مسلمانوں کی سرفروشانہ اور عاشقانہ خدمتِ اسلام نے اس آگ کو بجھا دیا اور سارے عرب کو متحد کر کے از سرِ نو اخلاص و ایمان کے راستے پر گامزن کر دیا۔ آج کل بھی ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ کہ جب کبھی چند جاہل اور طامع افراد اسلام کے حلقے سے نکلتے ہیں تو اُن سے زیادہ اور اُن سے بہتر تعلیم یافتہ اور محقق غیر

Marfat.com

مسلموں کو اسلام فطری کشش سے اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور مرتدین کی سرکوبی کے لئے ایسے وفادار اور جان نثار مسلمانوں کو کھڑا کر دیتا ہے۔ کہ جنہیں خدا کے راستے میں کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کی پرواہ نہیں ہوتی۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ . . . . عَلِيْمٌ : انسان کی بڑی سعادت اور اس پر خدا کا بڑا فضل یہ ہے کہ وہ فتنہ کے وقت خود جادۂ حق پر ثابت قدم رہ کر دوسروں کو ہلاکت سے بچانے کی فکر کرے۔ خدا جن بندوں کو چاہے اس سعادتِ کبریٰ اور فضلِ عظیم سے حصہ وافر عطا فرماتا ہے۔ اس کا فضل غیر محدود ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ کونسا بندہ اس کا اہل اور مستحق ہے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ . . . . رَاكِعُوْنَ : یہود و نصاریٰ کی موالات و رفاقت سے منع کر دیا گیا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ پھر کس کی رفاقت اور موالات اور کس سے تعلقاتِ محبت و وداد ہونے چاہئیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اُن کا رفیق اصلی خدا اور رسولؐ اور مخلص مومنوں کے سوا اور نہیں ہو سکتا۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ . . . . هُمُ الْغَالِبُوْنَ : کفار کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت تعداد کو دیکھتے ہوئے ممکن تھا کہ کوئی ضعیف القلب اور ظاہر بین مسلمان اس تردد میں پڑ جاتا کہ تمام دنیا سے موالات منقطع کرنے اور چند مسلمانوں کی رفاقت پر اکتفا کر لینے کے بعد غالب ہونا تو درکنار کفار کے حملوں سے اپنی زندگی اور بقا کی حفاظت بھی دشوار ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لئے فرما دیا کہ مسلمانوں کی قلت اور ظاہری بے سروسامانی پر مت نظر کرو، جس طرف خدا اور رسولؐ اور سچے وفادار مسلمان ہوں گے وہی پلہ بھاری ہوگا۔ یہ آیتیں خصوصیت سے حضرت عبادہؓ بن صامت کی منقبت میں نازل ہوئیں ہیں۔ یہود بنی قینقاع سے ان کے بہت زیادہ دوستانہ تعلقات تھے۔ مگر خدا اور رسولؐ کی موالات اور مومنین کی رفاقت کے سامنے انہوں نے اپنے سب تعلقات ختم کر دیئے۔

صاحب[1] کشاف نے لکھا ہے کہ مرتدوں کے گیارہ گروہ تھے جن میں سے تین آنحضرتؐ کے روبرو ہوئے تھے۔

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۴۲

Marfat.com

۱- بنو مدیج جن کا سردار ذوالخمار اسود عنسی ساحر تھا۔ اُس نے اطراف یمن قبضہ کر کے آنحضرتؐ کے عمّال کو نکال دیا تھا۔ آنحضرتؐ نے معاذ بن جبلؓ اور یمن کے سرداروں کو لکھا۔ آخر یہ شخص فیروزؓ دیلمی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس قتل کی خبر حضورؐ نے اسی دن دیدی تھی۔ گو وہاں سے خبر دو ماہ میں آسکتی تھی (اسود عنسی مدعیٔ نبوت بھی تھا)

۲- بنو حنیفہ مسیلمہ کذّاب کی قوم ملکِ یمامہ میں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔

۳- بنو اسد، طلیحہ بن خویلد کی قوم، اس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور شکست کھا کر شام میں بھاگ گیا تھا۔ اور آخر میں اسلام قبول کر کے سچی توبہ کر لی تھی۔

اور سات قومیں حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہد میں مرتد ہوئی تھیں۔

(۱) عیینہ بن حصن کی قوم بنو فزارہ (۲) قرہ بن سلمہ قشیری کی قوم بنی غطفان۔

(۳) مجاعۃ بن عبد یالیل کی قوم بنی سلیم (۴) مالک بن نویرہ کی قوم بنی یربوع

(۵)- بنو تمیم کے کچھ لوگ جو ایک مدّعیہ نبوت سجاح بنت منذر پر ایمان لے آئے تھے۔ اس جھوٹی نبیہ کا نکاح جھوٹے نبی مسیلمہ بن کذّاب سے ہوا تھا۔

(۶) اشعث بن قیس کی قوم بنی کندہ۔ (۷) حطم بن زید کی قوم بنو بکر بن وائل بحرین میں۔

اور جناب عمر فاروقؓ کے عہد میں ایک نومسلم عیسائی جبلہ بن ایہم مرتد ہو کر روم بھاگ گیا تھا۔ اس نے ایک مسلمان کو بلا وجہ طمانچہ مارا تھا۔ اور قصاص کے خوف سے مرتد ہو کر چلا گیا تھا۔

ان مرتدوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ اپنی جس ممدوح قوم کو لایا تھا اور جس کے ایمان و خلوص کی شہادت دیتا ہے وہ مہاجرین و انصار صحابہ تھے جن کے سردار جناب ابوبکرؓ صدیق تھے۔

ان آیات میں اس پیشینگوئی کی صداقت اور صحابہؓ کی بزرگی و فضیلت کے ساتھ ساتھ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی خلافت کے برحق ہونے کی دلیل موجود ہے۔

خواجہ[1] حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ خلافتِ صدیقیؓ میں جو لوگ اسلام سے پھر گئے تھے۔ ان کا حکم اس آیت میں ہے اور آیت اِنّما ولیکم اللہ الخ حضرت عبادہؓ بن صامت کے حق میں تھی جبکہ انہوں نے کھلے لفظوں میں یہود کی دوستی توڑ دی تھی۔

ابن[2] جریر طبریؒ کی روایت کے مطابق یہ قوم جس سے اللہ محبت کرتا تھا اور وہ اس سے عشق رکھتے تھے، جناب ابوبکرؓ اور ان کے ساتھی ہیں جنہوں نے مرتدین سے قتال کیا تھا۔ امام قتادہؒ اور ضحاکؒ کا قول یہی ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۱۲ [2] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۴۰ تفسیر المنار ج ۶ ص ۳۴۲، ۳۴۳

Marfat.com

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مہاجرین وانصار کو ساتھ لے کر تمام مرتدین سے جہاد و قتال کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اہلِ اسلام کو اپنے وعدہ کے مطابق غالب وسرفراز فرمایا۔
اللہ تعالیٰ نے ان مومنوں کو چھ صفات سے موصوف فرمایا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ انہیں محبوب رکھتا ہے۔

(۲) وہ اللہ تعالیٰ سے محبت وعشق رکھتے ہیں۔ اس محبت کا ذکر کتاب وسنّت کی بے شمار نصوص میں موجود ہے۔

(۳) وہ مومنوں پر نرم دل اور شفیق ورحیم ہیں۔

(۴) کافروں پر بڑے سخت ہیں: اشداء علی الکفار رحماء بینھم الآیۃ۔

(۵) وہ خدا کے راستے میں جہاد کرتے ہیں ــــ اپنا مال اور جان راہ حق میں پیش کر دیتے ہیں۔

(۶) کسی کی ملامت والزام کی انہیں پرواہ نہیں۔ بس ایک ایمان ہے جس کا سودا ان کے سر میں سمایا ہوا ہے۔

یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ : رکوع بمعنی خضوع استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ اوامر الٰہیہ کو ادا کرتے ہیں اور دل کی خوشی، عاجزی اور خوشدلی سے زکوٰۃ دیتے ہیں اس میں ریاء وشہرت اور کسی اور کا خوف مدِ نظر نہیں ہوتا۔

[1] اللہ تعالیٰ نے مومن جماعت کو اس لئے چنا ہے کہ اپنے دین کو دنیا میں قائم کرنے کا انہیں آلہ وذریعہ بنائے۔ انسانوں کی زندگی میں اپنے اقتدار کو ان کے ذریعے سے غالب کرے۔ ان کے اوضاع واطوار اور تنظیمات میں اپنے دین کو غالب کرے۔ ان کے مقدمات وقضایا میں اپنا حکم وفیصلہ ان کے ذریعے سے نافذ کرے اور زمین میں اس ضابطے کے ذریعے سے خیر و صلاح اور طہارت ونماز کو قائم کرے۔ اس کام کے لئے جن لوگوں کو چنا جائے۔ واقعی ان پر اللہ کا عظیم فضل واحسان ہے!

اسلامی عقیدہ بندے اور رب کے درمیان محبت کے رابطے اور مودّت وعشق کے رشتے قائم کرتا ہے قرآن کی بہت سی آیات اس پر گواہ ہیں: ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سیجعل لھم الرحمٰن ودًّا۔ اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَدُوْدٌ۔ ھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ ــ ان آیات سے ثابت ہوا کہ اسلامی عقیدہ کا جوہر وحقیقت اور اصلی عنصر یہی محبت ہے اور بندے اور خدا کے درمیان رحمت وشفقت

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۱۶، ۲۱۲

Marfat.com

اور محبت و مودّت کے علاوہ اس عقیدے میں عدل، تنزیہ اور تجریدیہ بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جس نے اس میں توازن پیدا کر کے اسے تجسیم و تثلیث اور ابنیّت و کفارہ کے چکر سے نجات دیدی ہے۔

یہ سچے مومن دوسرے اہلِ ایمان کے لئے رحیم و شفیق ہیں: اَذِلّۃ کے لفظ میں ذلت و خواری کا مفہوم نہیں بلکہ اخوت و اختلاط کا معنیٰ ملحوظ ہے۔ اسی طرح اَعِزّۃ کے لفظ سے غرور و تکبّر نہیں ثابت ہوتا، بلکہ یہ عزت اور خودداری عقیدے کے لئے ہے اور یہ علو و بلندی اصول کی خاطر ہے نہ کہ نفس و ذلت کے لئے۔

پھر ان مومنوں کی تعریف میں فرمایا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے۔ اپنے نفوس، قوم و وطن اور جنس و نوع کے لئے نہیں محض اللہ کے لئے جہاد کریں گے تاکہ اس کا دین غالب ہو۔ اس کا اقتدار قائم و ثابت ہو۔ اس کی شریعت نافذ ہو اور اس میں ان کی نفسانیت کا کوئی بھی حصّہ نہیں۔

پھر فرمایا ہے کہ وہ کسی کی ملامت و الزام کی پرواہ نہ کریں گے جس نے اللہ سے محبت کی اسے کسی کی ملامت و الزام کا کیا ڈر؟ محبت بے خوف ہوتی ہے غیر منقسم ہوتی ہے اور جرأت و صداقت پیدا کرتی ہے پھر جسے اللہ کی محبت مل جائے وہ کسی سے کیا ڈرے گا اور کوئی اس کا کیا بگاڑے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ

اے ایمان والو مت بناؤ ان لوگوں کو جو ٹھیراتے

اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ

ہیں۔ تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل وہ لوگ

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ

جو کتاب دیئے گئے تم سے پہلے اور نہ کافروں کو اپنا

Marfat.com

اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

دوست اور ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ

اور جب تم پکارتے ہو نماز کے لئے تو وہ ٹھہراتے ہیں اس کو

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ

ہنسی اور کھیل یہ اس لئے کہ وہ لوگ بے عقل ہیں

لہ اس پہلی آیت میں کفار سے مراد مشرکین ہیں جیسا کہ عطف سے ظاہر ہے۔ پچھلی آیات میں مسلمانوں کو موالاتِ کفار سے منع فرمایا تھا۔ اس آیت میں ایک خاص موثر عنوان سے اسی مخالفت کی تاکید کی گئی اور موالات سے نفرت دلائی گئی ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں کوئی چیز اپنے مذہب سے زیادہ معظم و محترم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اسے بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے مذہب پر تضحیک و استہزاء کرتے ہیں، طعن و تشنیع ان کا شیوہ ہے اور شعائر اللہ یعنی اذان وغیرہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو ان میں خاموش ہیں وہ بھی ان افعال شنیعہ کو دیکھ کر اظہارِ نفرت نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ کفار کی ان احمقانہ اور کمینہ حرکات پر مطلع ہو کر کوئی مردِ مسلم جس کے دل میں خشیۂ الٰہی اور غیرتِ ایمانی کا ذرا سا شائبہ ہو کیا ایسی قوم سے موالات اور دوستانہ راہ و رسم پیدا کرنے یا قائم رکھنے کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا کرے گا؟ اگر ان کے کفر و عناد اور عداوت اسلام سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو دینِ قیم کے ساتھ ان کا یہ تمسخر و استہزاء ہی علاوہ دوسرے اسباب کے ایک مستقل سبب ترکِ موالات کا ہے۔

جب تم اذان کہتے ہو تو یہ اس سے جلتے ہیں اور ٹھٹھہ کرتے ہیں جو ان کی کمال حماقت اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ کلماتِ اذان میں خداوند قدوس کی ہی عظمت و کبریاء کا اظہار، توحید کا اعلان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء سابقین اور کتب سماویہ کے مصدق ہیں۔ ان کی رسالت کا اقرار، نماز جو تمام اوضاع عبودیت کو جامع اور غایت درجہ کی بندگی پر دال ہے اس کی طرف دعوت فلاح دارین اور اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لئے

لہ فوائد القرآن عثمانیؒ صـ۱۵۱

Marfat.com

بلا وا ان چیزوں کے علاوہ کیا ہوتا ہے؟ پھر ان میں کونسی چیز ہے جو ہنسی اڑانے کے قابل ہو؟ ایسی نیکی اور حق وصداقت کی آواز پر مسخرا پن کرنا صرف اسی شخص کا کام ہے جس کا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو اور جسے نیک و بد کی قطعاً تمیز باقی نہ رہے بعض روایات میں ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی جب اذان میں اشہد ان محمداً رسول اللہ سنتا تو کہتا قد حرق الکاذب (جھوٹا جل گیا یا جل جائے) اس کی نیت جو کچھ ہو مگر یہ بات اس کے بالکل حسب حال تھی۔ کیونکہ وہ خبیث جھوٹا تھا اور اسلام کا عروج وشیوع دیکھ کر آتش حسد میں جلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ایک شب میں کوئی چھوکری آگ لے کر اس کے گھر میں آئی وہ اور اس کے اہل و عیال سو رہے تھے۔ ذرا سی چنگاری نادانستہ اس لڑکی کے ہاتھ سے گر گئی جس سے سارا گھر مع سونے والوں کے جل گیا اور اس طرح خدا نے دکھلا دیا کہ چھوٹے لوگ دوزخ کی آگ سے پہلے دنیا کی آگ میں کس طرح جل جاتے ہیں۔ اذان کے ساتھ استہزاء کرنے کا ایک اور واقعہ صحیح روایت میں منقول ہے وہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد آپؐ حنین سے واپس آ رہے تھے راستہ میں حضرت بلالؓ نے اذان کہی چند نو عمر لڑکے جن میں ابو محذورہؓ بھی تھے اذان کی ہنسی اور نقل کرنے لگے۔ آپؐ نے سب کو پکڑ کر بلوایا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ابو محذورہؓ کے دل میں خدا نے اسلام ڈال دیا اور حضورؐ نے ان کو مکہ کا موذن مقرر فرمایا۔ اس طرح خدا کی قدرت نقل سے اصل بن گئی۔

۱؎ امام زہری فرماتے ہیں کہ اذان کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ پھر یہی آیت تلاوت کی۔ مؤلف عرض کرتا ہے کہ امام زہریؒ کا اشارہ اس لفظ کی طرف تھا وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ۔ اسی طرح سورہ جمعہ میں ہے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ الخ قرآن کے ان الفاظ میں ندائے صلوٰۃ کا ذکر تو ہے لیکن اس کے الفاظ نہ یہاں نہ کہیں اور بتائے گئے ہیں۔ اس کا بیان حضورؐ نے فرمایا ہے جو شارح ومفسر ومبیّن کتاب الٰہی تھے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو کما حقہٗ سمجھنے کے لئے ہم حضورؐ کی تشریح وتفسیر کے محتاج ہیں۔ سنّت وحدیث کا انکار کرنے والوں کے لئے یہ مقام عبرت وموعظت ہے۔

۲؎ ان دشمنوں کے دین کو کھیل تماشہ اور تمسخر بنانے کی ایک مثال خود قرآن نے بیان فرمائی ہے کہ وہ محض ظاہری طور پر اسلام کا اظہار کرتے۔ پھر کچھ دیر کے بعد کلماتِ کفر زبان سے نکالتے اور خلافِ شرع باتیں زبان پر لاتے تھے۔ تلعب بالدین کے علاوہ اس سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ دوسرے نومسلموں کے دلوں میں بھی اسلام کے متعلق شکوک

۱؎ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۱۴ ۲؎ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۴۶

Marfat.com

شبہات پیدا ہو جائیں اور دین اور اہل اسلام کو نقصان پہنچے۔

۳ے زمانۂ نزولِ قرآن میں استہزاء اور تلعب بالدین زیادہ تر مشرک اور یہود کرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد کے ادوار میں نصاریٰ بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ انہوں نے مسلمانوں اور اسلام کی عداوت و دشمنی اور اس کے خلاف جنگ و جدال میں پوری قوت صرف کر دی ہے۔ یہ لوگ خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے مسلمانوں سے لڑ رہے ہیں۔ اس دور میں رومی سلطنت کا ٹکراؤ مسلمانوں سے ہوا۔ پھر صلیبی جنگیں آئیں۔ اور انہوں نے شرمناک دشمنی کے کمینے مظاہرے کئے۔ پھر "مسئلہ شرقیہ" سامنے آیا جو تمام صلیبی طاقتوں کی طرف سے خلافت کے خلاف ایک کھلی سازش تھی۔ پھر استعمار اور امپیریلزم کا زمانہ آیا جس کی پالیسیوں میں صلیبیت چھپی ہوئی تھی اور کبھی کبھی زبان سے بھی ظاہر ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو دنیا بھر میں عیسائی بنانے کا پروگرام شروع ہوا جس نے مغربی امپیریلزم کے ظلم و ستم کی راہیں ہموار کیں۔ اس کے بعد دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف جنگوں اور لڑائیوں کا ایک سلسلہ جاری ہوا جو اب تک جاری ہے۔

احقر مؤلف عرض کرتا ہے کہ صاحبِ ظلال مرحوم جون ۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ سے پہلے ہی شہید ہو چکے تھے۔ ورنہ آج وہ خون کے آنسو روتے اس جنگ نے "یہودی عیسائی پیکٹ" اور اسلام کے خلاف ساری دشمن طاقتوں کو ننگا کر دیا ہے۔ کاش! کہ مسلمان اور اور بالخصوص عرب مسلمان اس صورتِ حال سے عبرت حاصل کریں۔

عیسائیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کا مذاق اڑانے کے لئے اس قدر لٹریچر تیار کیا ہے جو ایک مسلمان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ وہ ہر چند ہفتوں کے بعد کسی نہ کسی ملک یا گوشے سے پیغمبر اسلامؐ کی فرضی تصویریں شائع کرتے ہیں۔ حضورؐ پر گندگی اچھالتے ہیں۔ اسلامی شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اسلامی عقائد و اعمال کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ حضورؐ کو گالیاں دیتے ہیں۔ آپؐ پر غلیظ الزامات اور بہتان لگاتے ہیں۔ نام نہاد مستشرقین کی جماعت نے اسلام کا چہرہ بگاڑنے کی وہ وہ سعیٔ مذموم کی ہے کہ جس کا تصور کر کے ایک مومن کا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔ یہ تو سب کچھ زبان و قلم اور عمل سے ہوتا ہے جو ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف لاوے ابل رہے ہیں۔ ان کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ الْاٰيٰتِ۔

پھر اس حمام میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ دیگر دشمنانِ اسلام بھی بالکل ننگے ہیں۔ اور کچھ عرصے سے اسلام کے خلاف تلعب و استہزاء کرنے والی ایک جدید طاقت ابھری ہے

۳ے فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۱۳

Marfat.com

جو آجکل پورے اہتمام و انتظام سے اسلامی عقائد و اعمال کے قلعوں پر حملہ آور ہے! یہ جدید طاقت کمیونزم کی طاقت ہے جس کے لٹریچر میں وہ سب کچھ بھی ہے۔ جو یہود و نصاریٰ نے لکھا ہے اور اس کے سوا کئی نئی اور زائد چیزیں بھی ہیں۔ سچ ہے الکفر ملۃ واحدۃ

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ

تو کہ اے کتاب والو کیا ضد ہے تم کو ہم سے

اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ

مگر یہی کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو نازل ہوا ہم پر

مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ قُلْ

اور جو نازل ہو چکا پہلے۔ اور یہی کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں تو کہ

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ

میں تم کو بتلاؤں ان میں کس کی بری جزاء ہے اللہ کے

اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَ

ہاں؟ وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب

جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ

نازل کیا۔ اور ان میں سے بعضوں کو بندر کر دیا اور بعضوں کو سور

الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ

اور جنہوں نے بندگی کی شیطان کی۔ وہی لوگ بدتر ہیں درجہ میں اور بہت

Marfat.com

سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا

بہکے ہوتے ہیں۔ سیدھی راہ سے اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے

وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ

ہیں۔ ہم ایمان لائے اور حالت یہ ہے کہ کافر ہی آئے تھے اور کافر ہی گئے

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَتَرٰى كَثِيْرًا

اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہوئے تھے اور تو دیکھے گا بہتوں کو

مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

ان میں سے کہ دوڑتے ہیں گناہ پر اور ظلم

وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٢﴾

اور حرام کھانے پر بہت برے کام ہیں جو کر رہے ہیں

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ

کیوں نہیں منع کرتے ان کو درویش اور علماء گناہ کی

قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ

بات کہنے سے اور حرام کھانے سے بہت ہی

مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾

برے عمل ہیں جو کر رہے ہیں۔

لہ قل یٰاھل الکتاب ... فاسقون: کسی کام پر طعن کرنا یا ہنسی اڑانا دو وجہ سے ہو سکتا ہے۔ یا تو وہ کام ہی قابل استہزاء ہو، یا کام کرنے والے کی حالت قابلِ تمسخر ہو۔ پچھلی آیت میں بتلا دیا گیا کہ اذان کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس پر بجز پرلے درجے کے احمق اور خفیف العقل کے کوئی شخص طعن یا استہزاء کر سکے۔ اس آیت میں اذان دینے

Marfat.com

والوں کے مقدس حالات پر بعنوان سوال متنبہ کیا گیا ہے کہ استہزاء کرنے والے جو خیر سے اہل کتاب اور عالم شرائع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔
وہ ذرا سوچ کر انصاف سے بتائیں کہ مسلمانوں سے اُن کو اتنی ضد کیوں ہے اور کیا ایسی برائی وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں جو اُن کے زعم میں لائق استہزاء ہو۔ بجز اس کے کہ ہم اس خدائے وحدہٗ لاشریک پر اس کی اتاری ہوئی تمام کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے بالمقابل استہزاء کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ نہ خدا اور نہ خدا کی سچی اور صحیح توحید پر قائم ہیں نہ تمام انبیاء و رسل کی تصدیق و تکریم کرتے ہیں۔ اب تم ہی انصاف سے کہو کہ انتہا درجے کے نافرمان کو خدا کے فرمانبردار بندوں پر آوازے کسنے اور طعن و تشنیع کرنے کہاں تک حق حاصل ہے

لہ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ . . . . سَوَاءَ السَّبِيْلِ ۔ یعنی اگر ایمان باللہ پر مستقیم ہونا اور ہر اس چیز کی جو کسی زمانے میں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہو سچے دل سے تصدیق کرنا ہی تمہارے زعم میں مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑی برائی ہے اور اسی وجہ سے تم ان کو موردِ طعن و ملامت بناتے ہو۔ تو آؤ کہ میں تم کو ایک ایسی قوم کا پتہ بتلاؤں جو اپنی شرارت اور گندگی کی وجہ سے بدترین خلائق ہے۔ جن پر خدا کی لعنت اور غضب کا اثر آج بھی نمایاں طور پر آشکارا ہے جس کے بہت سے افراد اپنی مکاری اور بے حیائی اور حرصِ دنیا کی سزا میں بندر اور سؤر بنائے جا چکے ہیں اور جس نے خدا کی بندگی سے نکل کر شیطان کی غلامی اختیار کر لی۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بدترین خلائق اور گم کردہ راقوم ہی اصلی معنیٰ میں تمہارے طعن و استہزاء کی مستحق ہو سکتی ہے اور وہ خود تم ہی ہو۔

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ . . . . يَكْتُمُوْنَ ۔ یہاں اُن ہی استہزاء کرنے والوں کے بعض مخصوص افراد کا بیان ہے جو غائبانہ تو دین اسلام پر طعن و تشنیع کرتے اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مخلص مسلمانوں سے ملتے تو از راہ نفاق اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے۔ حالانکہ شروع سے آخر تک ایک منٹ کے لئے بھی انہیں اسلام سے تعلق نہیں ہوا نہ پیغمبر علیہ السلام کے ربانی وعظ و تذکیر کا کوئی اثر انہوں نے قبول کیا گیا محض لفظ ایمان و اسلام زبان سے بول کر وہ خدا کو معاذ اللہ دھوکہ دے سکتے ہیں۔ اگر اس عالم الغیب والشہادہ کی نسبت جو ہر قسم کے ضمائر و سرائر پر مطلع ہے۔ اُن کا گمان یہ ہو کہ محض لفظی ایمان سے اُسے خوش کر لیں گے۔ تو اس سے بڑھ کر کوئی حرکت

لہ فوائد القرآن ص ۱۵۱

Marfat.com

قابلِ استہزاء و تمسخر ہو سکتی ہے ؟ گویا اس آیت سے یہود و نصاریٰ کے ان مضحکہ خیز افعال و حرکات کا بیان شروع ہوا ہے جن پر متنبہ کئے جانے کے بعد مسلمانوں کا استہزاء کرنے کے بجائے انہیں خود اپنا استہزاء کرنا چاہیئے۔ اگلی آیات میں بھی اس کی تتمیم و تکمیل ہے۔

فِی الاثم والعدوان : غالباً اثم سے مراد لازمی اور عدوان سے متعدی گناہ ہیں۔ یعنی ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ بہت شوق اور رغبت سے ہر قسم کے گناہوں کی طرف جھپٹتے ہیں۔ خواہ ان کا اثر اپنی ذات تک محدود ہو یا دوسروں تک پہنچے جن کی اخلاقی حالت ایسی زبوں ہو اور حرام خوری ان کا شیوہ ٹھہر گئی ہو۔ ان کی برائی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ یہ اُن کے عوام کا حال تھا، آگے اُن کے خواص کا بیان کیا گیا ہے۔

لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ . . . . یَصْنَعُوْنَ : جب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا کرتا ہے۔ تو اس کے عوام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور اُن کے خواص یعنی درویش اور علماء گونگے شیطان بن جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا حال یہی ہوا کہ لوگ عموماً دنیوی لذات و شہوات میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کے قوانین و احکام کو بھلا بیٹھے اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے۔ انہوں نے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فریضہ ترک کر دیا۔ کیونکہ دنیا کی حرص اور اتباع شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے۔ مخلوق کا خوف یا دنیا کا لالچ حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہوتا تھا۔ اسی سکوت و مداہنت سے پہلی قومیں تباہ ہوئیں۔ اسی لئے اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کو قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص میں بہت ہی سخت تاکید و تہدید کی گئی ہے کہ کسی وقت اور کسی شخص کے مقابلہ میں اس فرض "امر بالمعروف" کے ادا کرنے سے تغافل نہ برتیں۔

خدا کی لعنت، صورتوں کا بندر اور سور کی شکل میں تبدیل کیا جانا اور بت پرستی اور شیطان کی پوجا یہ تینوں باتیں یہود میں پائی جاتی تھیں اور وہ خود بھی اس کا اقرار کرتے تھے کہ ان میں ایسے لوگ واقعی گزرے ہیں۔ اس لئے تعریفاً اُن کو یہ عیب یاد دلائے۔ صورت کی تبدیلی داؤد علیہ السلام کے عہد میں سبت کا حکم توڑنے پر ہوئی تھی انہیں طاعون کے مرض میں مبتلاء کر کے ایسا سُجا اور پھلا دیا تھا کہ ان کی صورتیں بندروں اور خنزیر جیسی نظر آتی تھیں۔ شرک و بت پرستی ان لوگوں میں کئی بار واقع ہو چکی تھی۔ مثلاً بخت نصر کے حملے سے قبل اور اس کے بعد بھی۔

حضورؐ سے سوال ہوا تھا۔ کہ کیا یہ بندر اور سور جو پائے جاتے ہیں وہی ہیں جن پر عذاب ہوا تھا؟ تو فرمایا جس قوم پر خدا کا عذاب اس طرح نازل ہوتا ہے ان کی نسل ہی نہیں ہوتی۔

سلہ تفسیر حقانی ج ۴ ص ۴۴۲ ۔ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۱۶

Marfat.com

بندر اور سؤر ان سے پہلے بھی موجود تھے۔

نقمت کا معنیٰ ہے انکار کرنا اور قول یا فعل سے عیب لگانا۔ مثوبۃ کا معنیٰ ہے جزاء و ثواب۔ طاغوت طغیانی سے نکلا ہے جس کا معنی ہے۔ حدود شرع سے تجاوز۔ ہر وہ شخص یا طاقت طاغوت ہے جس کی اطاعت خدا کی معصیت میں کی جائے۔ سحت کا معنی ہے حرام چیزوں میں سے نہایت گھٹیا چیز۔

اکثرکم فاسقون :۔ سے معلوم ہوا کہ اکثریت کا حال یہی تھا۔ گو کچھ لوگ اصولِ دین، توحید اور حق و عدل پر قائم تھے اور وہ یہی تھے جو فوراً اسلام کی طرف بڑھے تھے۔ اور پیغمبر برحق کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ یہود پر لعنتِ خداوندی کا ذکر بہت سی آیات میں موجود ہے۔ اور جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ واقعی ان کی شکلیں مسخ ہو کر بندروں اور خنزیروں جیسی ہو گئی تھیں۔ مگر امام مجاہدؒ فرماتے تھے کہ ان کے دل مسخ ہو گئے تھے صورتیں نہیں اور یہ ایک تمثیل ہے جیسے کہ فرمایا کمثل الحمار یحمل اسفاراً

اس جملہ میں اس امر کی تاکید ہے کہ یہ منافق آپؐ کی مجلس سے نکلتے وقت بھی ویسے ہی تھے جیسے کہ داخل ہوتے وقت اور یہ جملہ عام قواعد معروفہ کے خلاف اس لئے آیا ہے کہ جو شخص حضورؐ کی مجلس میں آپؐ کے اصحابؓ کی مجلس میں آتا تھا اور ان کے اچھے اخلاق دیکھتا تھا۔ وہ اپنے عقیدے سے بالعموم تائب ہو جاتا تھا اور اسلام اس کے دل میں گھر کر جاتا تھا، ہاں جو شخص ہٹ دھرم ہوتا تھا۔ اسے نصیحت و وعظ کچھ فائدہ نہ دیتے تھے۔ کئی لوگ حضورؐ کے قتل کی نیت سے آئے اور مسلمان ہو گئے تھے۔ لیکن یہ یہودی منافق بدنیتی اور فطری بگاڑ کی وجہ سے اس قاعدے سے مستثنیٰ رہے۔

یَصْنَعُوْن : کسی عامل کو صانع تب کہتے ہیں، جب کہ وہ اپنے عمل پر پکا ہو جائے اور اسے پیشہ بنا لے۔ یہیں سے صناعت کا لفظ ہے۔ بمعنی پیشہ۔ پس یہ لوگ پیشہ ور حرام خور اور پیشہ ور جھوٹے تھے ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآن میں اس آیت سے بڑھ کر شدید تو بیخ کسی آیت میں نہیں۔ یعنی یہ آیت علماء پر حجت ہے جب کہ وہ ہدایت و ارشاد میں کمی کریں اور اپنے فرائض کو چھوڑ دیں۔

لہ ھل تنقمون منا الخ میں سوال استنکاری کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے کیونکہ اُن سے ان کے ان اعمال کو بعید جاننا اور اُس پر انکار کرنا مدِنظر تھا۔ نیز مسلمانوں کو یہ جتانا منظور تھا کہ ایسی قوم سے ہرگز موالات نہ کریں جس کا یہ حال ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی آجتک اہلِ کتاب

لہ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۴۸، ۱۵۱ لہ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۲۳/۲۱۴

Marfat.com

کی مسلمانوں سے دشمنی کا باعث صرف ان کا اسلام و ایمان ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے ان کی یہ عداوت اور دشمنی کم نہیں ہوئی۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے دین و ایمان سے پھر جائیں، وہ فاسق ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو بھی ان کے عقیدے اور دین سے ہٹا کر اپنے جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی اس دشمنی کے سبب کا سب بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اچھے مسلمانوں اور دین پر قائم ہونے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ولن ترضی عنک الیھود ولا النصاریٰ حتّٰی تتبع ملتھم۔ وہ نام نہاد مسلمان جو رواداری کے نام پر "مہذب" لوگوں سے تعلقات موالات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ان آیات سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے۔

اہلِ کتاب مسلمانوں کو دھوکے فریب اور حیلے بہانے سے اس حقیقت سے دور لے جانا چاہتے ہیں جو ان آیات میں اور قرآن پاک کے متعدد مقامات پر واضح اور کھلے لفظوں میں بیان کی گئی ہے جب تک مسلمان اس حقیقتِ قاہرہ سے آشنا رہے "صلیبی استعمار" اور "صلیبی روح" ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ جب عیسائیوں نے صلیبی جنگوں میں شکست کھائی اور اس طرح اس کے بعد جب انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ و تبشیر کے مذموم مقاصد میں ناکامی کا منہ دیکھا تو دھوکے فریب اور سازشوں پر اتر آئے۔ اور یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ دین اور دینی جنگوں کا قصہ نپٹ چکا ہے، یہ واقعات اس وقت کی یادگار ہیں جب سب قومیں تاریکی اور تاریک خیالی کا شکار تھیں۔ اب روشنی اور تہذیب و علوم کا زمانہ ہے۔ اس لئے پرانی باتوں کو یاد رکھنے اور گڑے مُردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔ آج کی لڑائی اور مقابلہ محض مادّی ہے نہ ذرائع پیداوار، تجارت و صناعت اور جدید منڈیوں کا مقابلہ ہے اس لئے مسلمانوں کو دین اور دینی لڑائیوں کی بات چھوڑ دینی چاہیئے۔

مسلمانوں کے اوطان کو نوآبادیاں بنا کر اہل کتاب انہیں یہ افیم دے کر سلا دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ اپنی لوٹ کھسوٹ، بغض و عداوت اور اسلام دشمنی کا مظاہرہ ایک اور رنگ میں کریں۔ ان کا ہدف پہلے دن سے آج تک ایک ہی رہا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان مسلمان کیوں ہیں!

اسلامی ممالک میں اہل کتاب کے ایجنٹ ——— نام نہاد مسلم و غیر مسلم۔ اسی ہدف کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کو نامسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ حتّٰی کہ وہ کہتے ہیں کہ صلیبی جنگیں عقیدے اور دین پر نہیں بلکہ "قومیت" کے سوال پر لڑی گئی تھیں۔

کچھ اور فریب خوردہ احمق مسلمان ہیں جو اہلِ کتاب کے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر "الحاد" اور "کمیونزم" کے خلاف عیسائیوں اور یہودیوں سے مل کر متحدہ محاذ بنانا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ صلیبیوں کی اولاد ہمیشہ اسلام کے مقابلے میں الحاد و دہریت اور لامذہبیت

Marfat.com

کمیونزم کا کھلا یا چھپا سانحہ دیتی رہی ہے اور آج بھی دے رہی ہے۔ انھیں فکر کمیونزم کا نہیں اسلام کا ہے۔ دشمنی الحاد و دہریت سے نہیں دینِ حق سے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں۔ الحاد و دہریت ایک عارضی دشمنی ہے اور اسلام اُن کا مستقل اور قائم رہنے والا دشمن ہے۔ علاوہ ازیں عیسائی مسلمانوں کو الحاد و دہریت سے لڑوا کر ایک دشمن کو دوسرے سے مروانا یا دونوں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ دونوں مساوی دشمن ہیں۔ ان میں سے کسی سے مصالحت یا موالات کا سوال خارج از بحث ہے۔

یہ فریب خوردہ احمق لوگ اسلام کی رواداری اور اہل کتاب کے ساتھ حسن معاملہ کو آڑ بنا کر مسلمانوں کو ان کے واضح احکام سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ تناصر اور موالات ایک مسلمان دین کے لئے اور اس کی اقامت کے لئے کر سکتا ہے اور کسی غرض سے نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو اہل کتاب کو سب سے زیادہ ناپسند ہے کیونکہ وہ دین کو ہی مٹانا چاہتے ہیں۔ وہ فاسق اور دین سے منحرف ہیں لہٰذا مسلمانوں کو بھی ایسا ہی بنانا چاہتے ہیں۔ خود کبڑے ہیں۔ اور اپنا کبڑا پن درست ہو جانے پر اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ مسلمان بھی کبڑے ہو جائیں۔

طاغوت سے مراد ہر وہ اقتدار ہے جس کی سند الٰہی اقتدار سے نہ ملی ہو، ہر وہ حکم ہے۔ جو اللہ کی شریعت پر قائم نہ ہو اور ہر وہ تجاوز ہے جو حق سے پرے جا چکا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت و حاکمیت سے تجاوز سب سے بڑا تجاوز اور عظیم ترین عدوان ہے۔ اہل کتاب نے اپنے احبار و رہبان کی "عبادت" نہیں کی تھی۔ بلکہ ان کی خود ساختہ شرع کو اختیار کر لیا تھا۔ اور شرعِ الٰہی کو ترک کر دیا تھا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے شرک اور "اتخاذِ ارباب من دون اللہ" فرمایا ہے۔ پس ہر ایسے اقتدار کا متبع جو خدا کے اقتدار کا باغی ہو یا اس پر مبنی نہ ہو، طاغوت کا پجاری ہے۔ عبادت صرف رکوع و سجود ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں اتباع و اطاعت بھی داخل ہے اور اہلِ کتاب کا شرک یہی دوسری قسم کا تھا کہ انہوں نے غیر اللہ کی غیر مشروط اطاعت و اتباع کیا تھا۔

یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ : کا مطلب یہ ہے کہ گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کا یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ جب قوموں میں فساد اور شر پھیل جائے اور خیر برائے نام رہ جائے تو ہر شخص برائی اور بدکاری میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے اس کی عملی تصویر آپ بگڑے ہوئے معاشروں کو ہر وقت دیکھ سکتے ہیں! جن میں سے ہر فرد برائی اور

Marfat.com

بے حیائی میں دوسروں سے سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ یہود کا معاشرہ اُس وقت اسی قسم کا فاسد اور گندا معاشرہ تھا جس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

ایک بہتر اور زندہ معاشرے میں نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے منع کرنے والے اور ان کی بات کو سُن کر ماننے والے موجود ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُمّتِ مسلمہ کی یہی تعریف فرمائی ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔

جب یہ بھلائی قوم سے نکل جائے، نیکی کا حکم دینے والی زبانیں گنگ ہو جائیں، بُرائی سے روکنے والے ہاتھ شل ہو جائیں۔ تو اس کا حال وہی ہو جاتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے یہاں یہودیوں کے بیان میں ذکر فرمایا ہے کہ ان کے عالم اور درویش، مولوی اور پیر انہیں کذب و فریب اور حرام خوری سے نہیں روکتے! حالانکہ کسی معاشرے کی خیر و صلاح اور شر و فساد اسی پر موقوف ہے۔ جب یہ چیز نہ رہی تو سمجھو معاشرہ جہنّم میں گر گیا۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ

اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا۔ انہی کے ہاتھ

اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ

بند ہو گئے ہیں۔ اور لعنت ہے ان پر اس قول کے باعث بلکہ

مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ

اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ خرچ کرتا ہے جس طرح چاہے اور ان میں

كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ

بہتوں کو بڑھے گی اس کلام کی وجہ سے جو تجھ پر اترا۔ تیرے

Marfat.com

مِّن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ

رب کی طرف سے شرارت اور انکار اور ہم نے ڈال رکھی ہے ان میں دشمنی

وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا

اور بیر قیامت کے دن تک جب کبھی آگ سلگاتے

لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي

ہیں۔ لڑائی کے لئے اللہ اس کو بجھا دیتا ہے اور دوڑتے ہیں زمین میں

الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾

فساد کرتے ہوئے اور اللہ پسند نہیں کرتا فسادیوں کو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اہلِ کتاب کے قلوب، ان کی شرارت کفر و طغیان، بدکاری، حرام خوری وغیرہ کی ممارست سے اس قدر مسخ ہو گئے تھے کہ بارگاہِ ربوبیت میں گستاخی کرنے سے بھی ان کو باک نہ ہوتا تھا۔ خداوند قدوس کا رتبہ ان کے ہاں ایک معمولی انسان کی حیثیت سے زیادہ نہ رہا تھا۔ حق تعالیٰ کی جناب میں بے تکلف ایسے واہی تباہی کلمات بک دیتے تھے جنہیں سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ کبھی کہتے اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی"۔ کبھی یہ الفاظ منہ سے نکالتے: يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ "خدا کا ہاتھ بند ہو گیا۔ اس سے مراد یا تو وہی ہو گی جو اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ سے تھی۔ کہ خدا معاذ اللہ تنگ دست ہو گیا ہے۔ اس کے خزانے میں کچھ نہیں رہا اور یَا غُلَّ يَدَ کنایہ بخل و امساک سے ہو یعنی تنگدست تو نہیں۔ مگر آج کل بخل کرنے لگا ہے۔ (العیاذ باللہ) بہرحال کوئی معنی ہو، اس کلمۂ کفر کا منشاء یہ تھا کہ جب تمرد و طغیان کی پاداش میں حق تعالیٰ نے ان ملحونوں پر ذلت، نکبت، ضیق عیش، بدحالی اور تنگ میدانی مسلط فرمائی تو بجائے اس کے کہ اپنی سیہ کاریوں اور شامتِ اعمال پر متنبہ اور نادم ہوتے، اُلٹے

[1] فوائد القرآن ص ۱۵۲-۱۵۳

Marfat.com

حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخی و بے ادبی کرنے لگے۔ شاید یہ خیال ہوا ہوگا کہ ہم تو پیغمبروں کی اولاد اور خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے تھے۔ پھر یہ کیا معاملہ ہونے لگا۔ کہ آج بنی اسمٰعیل تو دنیا میں پھیلتے جا رہے ہیں۔ زمینی فتوحات اور آسمانی برکات اُن پر کشادہ کر دی گئی ہیں مگر ہم بنی اسرائیل کہ خدا ہمارا اور ہم اس کے تھے، اس طرح ذلیل و مغلوب اور تنگ حال ہو کر در بدر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ہم تو وہی اسرائیل کی اولاد اور "خدا کے بیٹے اور پیارے" آج بھی ہیں جو پہلے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا کی ہم اولاد اور محبوب تھے۔ (معاذ اللہ) اُسی کے خزانہ میں کمی آگئی، یا آج کل بخل و امساک نے اُس کا ہاتھ تنگ کر دیا ہے۔ احمق اتنا نہ سمجھتے تھے کہ حق تعالیٰ کے خزائن تو لامحدود اور اُس کے کمالات غیر متبدل اور غیر متناہی ہیں۔ اگر معاذ اللہ اُس کے خزانہ میں کچھ نہ رہتا یا مخلوق کی تربیت و اعانت سے ہاتھ کھینچ لیتا تو دنیا کا نظام کیونکر قائم رہ سکتا تھا۔ اور جو روز افزوں عروج و فروغ پیغمبر علیہ السلام اور ان کے رفقاء کا تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ یہ کس کے خزانے اور دست کرم کا رہین منت ہے؟ لہٰذا تم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا کا ہاتھ بند نہیں ہوا۔ البتہ گستاخیوں اور شرارتوں کی نحوست سے خدا کی جو لعنت و پھٹکار تم پر پڑی ہے۔ اُس نے تمہارے حق میں زمین باوجود وسعت کے تنگ کر دی ہے اور آئندہ اور زیادہ تنگ ہونے والی ہے۔ اپنی تنگ حالی کو خدا کی تنگ دستی سے منسوب کرنا تمہاری انتہائی سفاہت ہے۔

مؤلف عرض کرتا ہے کہ یہود کی سنگدلی، شرارت اور خباثتِ نفس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے موجودہ بائیبل کا مطالعہ کافی ہے۔ جس میں اللہ کے برگزیدہ معصوم پیغمبروں میں سے کسی پر شرک و بت پرستی کا الزام لگایا گیا ہے۔ مثلاً ہارونؑ و سلیمانؑ کسی پر شراب خوری اور زنا کاری کا بہتان گھڑا گیا ہے مثلاً نوحؑ - داؤدؑ - اور لوطؑ اور کسی سے خدا کو انسانی شکل میں کشتی لڑتے دکھایا گیا ہے مثلاً یعقوب علیہ السلام ایسی بدطینت اور بدمعاش قوم اسلام اور پیغمبر اسلام کی عداوت و دشمنی میں جو کچھ کر گزرے کم ہے۔

غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ : اگرچہ ترجمہ وہ ہے جو ہم نے کیا ہے تو معاملہ واضح ہے کہ اپنی طمع اور کنجوسی کا اُلٹا الزام اللہ پر لگاتے ہیں اور اگر ترجمہ یوں کریں کہ "انہی کے ہاتھ بند ہو جائیں" تو بہ بددعا کے رنگ میں پیشینگوئی یا اُن کی حالت واقعی کی خبر دی گئی ہے۔ چنانچہ واقعہ میں بخل اور نامرادی نے اُن کے ہاتھ بند کر دیئے تھے۔

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ : حق تعالےٰ کے لئے جہاں پاؤں آنکھ، پنڈلی وغیرہ ذکر کی گئی ہیں۔ ان سے بھول کر بھی یہ وہم نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ معاذ اللہ مخلوق کی طرح جسم اور اعضائے جسمانی رکھتا ہے۔ پس جس طرح خدا کی ذات اور وجودِ حیات، علم وغیرہ تمام

Marfat.com

صفات کی کوئی نظیر اور مثال اور کیفیت اس کے سوا بیان نہیں ہو سکتی۔

؎ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم — وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
منزل تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر — ما ہم چنیں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

اسی طرح ان نعوت وصفات کو خیال کرو۔ خلاصہ یہ کہ جیسے خدا کی ذات بے چون و چراو بے چگون ہے، اس کے سمع وبصر، ید وغیرہ نعوت وصفات کے معانی بھی اس کی ذات اور شانِ اقدس کے لائق اور ہمارے کیف وکم اور تعبیر و بیان کے احاطہ سے بالکل وراء الوراء ہیں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (الشوریٰ) حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اس آیت پر جو فائدہ (نوٹ) لکھا ہے اس میں دو ہاتھوں سے مراد مہر اور قہر کا ہاتھ لیا ہے۔ یعنی آج کل خدا کی مہر کا ہاتھ اُمّتِ محمّدیہ پر اور قہر کا بنی اسرائیل پر کھلا ہوا ہے۔ جیسا کہ اگلی آیتوں میں ارشاد فرمایا۔

يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ: یعنی اس کو وہی خوب جانتا ہے کہ کس وقت، کس پر اور کیسے خرچ کیا جائے کبھی ایک وفادار کو امتحان یا اصلاحِ احوال کی غرض سے تنگی اور عُسرت میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی اس کی وفاداری کے صلہ میں اخروی نعمتوں سے پہلے دنیوی برکات کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل ایک مجرم ومتمرّد پر کبھی آخرت کی سزا سے پہلے تنگ حالی، ضیق عیش اور مصائب وآفاتِ دنیوی کی سزا بھیجتا ہے اور کسی وقت دنیوی ساز وسامان کو فراخ کر کے مزید مُہلت دیتا ہے کہ یا خدا کے احسانات سے متاثر ہو کر اپنے فسق وفجور پر کچھ شرمائے اور یا اپنی شقاوت کا پیمانہ پوری طرح لبریز کر کے انتہائی سزا کا مستحق ہو۔ ان مختلف احوال اغراض اور متنوع حکمتوں کی موجودگی میں کسی شخص کے مقبول و مردود ہونے کا فیصلہ خدا کی اطلاع یا خارجی قرائن واحوال کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک چور کا ہاتھ کاٹا جائے یا ڈاکٹر کسی مریض کا ہاتھ کاٹے دونوں کی نسبت ہم احوالِ خارجیہ اور قرائن سے سمجھ لیتے ہیں کہ ایک بطور سزا اور دوسرا ازراہ شفقت و علاج کاٹا گیا ہے۔

وَلَيَزِيْدَنَّ... طُغْيَانًا وَّكُفْرًا: ان کی گستاخی کا جواب دیا جا چکا ہے۔ لیکن قرآن کے ایسے حکیمانہ جواب سے ان معاندین اور سفہاء کو تسکین نہیں ہوگی۔ بلکہ کلام الٰہی کو سُن کر شرارت وانکار میں اور زیادہ ترقی کریں گے۔ اگر غذائے صالح ایک بیمار کے معدہ میں پہنچ کر اس کے مرض کو زیادہ کر دیتی ہے تو اس میں غذا کا قصور نہیں ہے کے مزاج کی خرابی ہے۔

Marfat.com

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ . . . . اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ = اگرچہ قریب میں خاص یہود کا مقولہ نقل کیا تھا لیکن اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمْ سے مراد غالباً وہ اور ان کے بھائی بند سب ہیں۔ یعنی یہ یہود و نصاریٰ سب کا حال بیان فرمایا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے اسی سورہ میں گزر چکا ہے اور اگلی آیت میں بھی سب اہل کتاب کو خطاب فرمایا ہے۔ مطلب یہ کہ جوں جوں ان کی شرارت اور انکار کو ترقی ہوگی اسی قدر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور منصوبے گانٹھیں گے اور لڑائی کی آگ سلگانے کے لئے تیار ہوں گے ان کی آپس میں پھوٹ پڑ چکی ہے جو مٹ نہیں سکتی۔ اس سبب سے اسلامی برادری کے خلاف ان کی جنگی تیاریاں کامیاب نہیں ہوتیں۔

كُلَّمَا اَوْقَدُوْا . . . . الْمُفْسِدِيْنَ : اس سے معلوم ہوا کہ اہل اسلام میں جب تک باہمی محبت اور اخوت مستحکم رہے گی اور رشد و اصلاح کے طریق پر گامزن ہو کر فتنہ و فساد سے مجتنب رہیں گے جیسا کہ یہ اہتمام صحابہؓ کرام میں تھا اس وقت تک اہل کتاب کی سب کوششیں ان کے مقابلہ میں بے کار ثابت ہوں گی۔

مؤلف عرض کرتا ہے کہ جب بھی مسلمان مرکز ثقل سے یعنی اسلام سے ہٹ گئے اور ان میں اخوت و مودت اسلامی کمزور پڑ گئی غیروں نے بالخصوص یہود و نصاریٰ نے اس سے فائدہ اٹھا کر خوب خوب بدلے لئے اور تعداد کی کثرت، مال و دولت اور متاع دنیوی کی فراوانی کے باوجود مسلمانوں نے مار کھائی اور بہت سے واقعات کے علاوہ گزشتہ سال کی عرب اسرائیل جنگ بھی اس حقیقت پر گواہ ہے۔ عرب جب مسلم تھے تو ساری دنیا ان کے زیر نگیں تھی۔ جب صرف عرب رہ گئے اور ان میں بھی سوشلسٹ عرب اور غیر سوشلسٹ عرب کی تفریق ہو گئی۔ تو نتیجہ وہی ہوا جو سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور دشمنانِ اسلام سے ہمیں بچائے۔ آمین۔ ایسے مواقع پر ہم پر جو کچھ گزرتی ہے یہ عبرت و موعظت کے لئے گزرتی ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ خرابی کہاں ہے اور کس قدر ہے۔ اور اسے دور کرنے کی فکر و اہتمام کریں ـــ خدا کے وعدے سچے ہیں اگر ہم مومن ہوں گے تو ہم ہی غالب ہوں گے

جب[1] یہ آیت نازل ہوئی مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا تو گستاخ و بے ادب یہودیوں نے اس کا مطلب نہ سمجھ کر دیا جان کر از روئے شرارت و خیانت) کہا کہ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ "معلوم ہوتا ہے کہ آج کل اللہ کا ہاتھ تنگ ہے اسی لئے قرض مانگتا ہے" یا

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۴۵

Marfat.com

آنحضرتؐ اور صحابہؓ کا فقر و فاقہ اور ابتدائی تنگدستی دیکھ کر تمسخر کے طور پر سے کہہ دیا ہو تو بعید نہیں۔ یا اس لئے کہ اپنی سلطنت اور شان و شوکت کے زوال کا خیال آگیا تھا اس لئے یہ کہا۔

یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ سے مراد ان خبیثوں کی یہ تھی کہ اللہ تعالےٰ (معاذ اللہ) بخیل ہو گیا ہے۔ جیسا کہ یہ لفظ قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ بُخل ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ الخ

ضحاص نامی یہودی نے یہ کہا تھا کہ ایک روایت کے مطابق شماس بن قیس نے کہا تھا۔

از روئے لغت یَد کے کئی معنی ہیں:۔

(ا) عضوِ بدن (ب) انعام و احسان

(ج) قدرت جیسے قرآن ہے اُولی الایدی والابصار یعنی قدرت و عقل والے۔

(د) ملکیت۔ فِیْ یَدِ فُلَانٍ کا معنیٰ ہے اُس کی ملک میں، قرآن میں ہے اَلَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ۔

حرب کا لفظ سِلم کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے پس قتل و غارت نہ بھی ہو تو بدامنی، لوٹ مار، فتنے ابھارنا اور قتل و غارت پر اکسانا بھی اس میں داخل ہے۔

یہود کی تاریخ اور مذہبی کتابیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حرام خوری، مال و زر کی پوجا اور ہر جائز و ناجائز ذریعے سے اُسے حاصل کرنے کی تڑپ ان کی قومی صفات بن چکی تھیں۔ ان کی بدترین صفت اللہ کے خلاف جرأت اور اس پر جھوٹے الزامات و بہتان لگانا ہے۔ یہ قول جو قرآن نے نقل کیا ہے۔ اگر سب نے نہ کہا ہو۔ مگر ان سب کی فطرت ایک ہی جیسی تھی۔ ویسے بھی ہر زمانہ میں اقوام کے افراد کی باتیں ان اقوام کی طرف منسوب ہوتی ہیں کیونکہ اُمت اور قوم شخصِ واحد کی مانند ہوتی ہے اور قرآن کا قاعدہ تو یہ ہے کہ صدیوں پہلے کسی قوم کے افراد نے جو کچھ کیا ہو وہ اسے پچھلوں کی طرف بھی منسوب کرتا ہے۔ یہود کے اس قول کے صدور پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم نے اپنے زمانے میں بعض مسلمانوں کو اللہ کا شکوہ کرتے ہوئے اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے سُنا ہے۔

غُلَّتْ اَیْدِیْہِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا: یہود ہمیشہ سے سب قوموں سے زیادہ بخیل رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی شخص ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کو تیار نہیں ہوتا جب تک اُس سے کچھ نفع ملنے کی امید نہ ہو۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ یہودی دنیا میں قیدی بنائے جائیں گے اور ان کی مشکیں کسی جائیں گی۔ اور آخرت میں جہنم کے طوق و سلاسل انہیں پہنائے جائیں گے۔ اور لعنت کے متعلق فرمایا کہ دنیا میں ان پر

Marfat.com

جزیہ لگایا گیا۔ اور آخرت میں آگ ان کے لیئے تیار ہے۔

ان کے قول کے جواب میں بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مصلحت سے بعض بندوں پر رزق میں کمی کرنا خدائی جُود وسخا کے خلاف نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا نظام جن اصولوں پر قائم کیا ہے اس میں ایسا ہونا ناگزیر ہے۔

وَلَیَزِیْدَنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ الخ حضورؐ نے باوجود اُمّی ہونے کے جب یہودیوں کی تاریخی غلطیاں اور ان کے سلف کے صحیح حالات بیان کئے تو یہ آپؐ کی نبوت کی کھلی دلیل تھی۔ اب بجائے اس کے کہ ان کے دلوں میں حضورؐ کی نبوت اور اسلام کی صداقت جاگزین ہوتی، اُلٹے وہ سرکشی اور شر و فساد میں بڑھ گئے اور حسد و عداوت کی وجہ سے ایمان سے محروم ہو گئے۔

وَاَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الخ: یعنی یہود و نصاریٰ کی باہمی عداوت کبھی منقطع نہ ہوگی۔ روس اور جرمنی میں اب یہ پورے شباب پر ہے اور انگلستان اور فرانس میں کچھ کم ہے۔ باوجودیکہ یہودی ساہوکار ہیں اور عیسائی سلطنتوں کے مالی معاملات انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ پھر بھی عام عیسائی ان کی مالی، سیاسی اور دیگر اجتماعی برتری کے باوجود یہود کو شدید نفرت سے دیکھتے ہیں۔ فرانس وغیرہ میں یہود کے خلاف بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جرمنی نے اُن کی جڑیں اکھاڑ دی ہیں۔ اور دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جرمنی کے علاوہ اور کئی ممالک نے یہود کو اپنے ہاں سے نکال باہر کیا ہے۔ یہ قوم ان کے نزدیک دنیا کی بدترین قوم ہے۔ عیسائیوں میں باہمی عداوت بھی وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ بڑی سلطنتیں عموماً برسرِپیکار رہتی ہیں۔ یہ پچھلی جنگ عالمگیر اس کے صدق کی عظیم ترین دلیل ہے۔

کُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا۔۔۔۔ یعنی جب کبھی یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مخلص مومنوں سے مکر و فریب اور ان کے خلاف سازش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل کرتا ہے۔ یا تو ناکام ہوتے ہیں اور ارادہ کامیاب نہیں ہوتا۔ یا اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ اور ایمانداروں کی مدد فرماتا ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ یہودیوں نے اسلام اور حضورؐ کے خلاف مشرکوں کو ابھارا۔ پھر روم والوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور ان کے دشمنوں کو پناہ دی یا ان کی مدد کی اور اس کا سبب محض حسد و تعصب تھا۔ اور ان کے رؤسا کو اور احبار و رہبان کو خوف تھا کہ اسلام ان کے علمی و عملی امتیازات کو مٹا دیگا۔ پس ان کی عداوت سیاسی و قومی تھی۔ اس میں دینی روح موجود نہ تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب یہودیوں نے مسلمانوں کا عدل و انصاف دیکھا تو شام و اندلس میں ان کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں نے ان

Marfat.com

کے خلاف ہونے والے ظلم وستم اور بے انصافی کو مٹایا۔

اسی طرح عیسائیوں کی دشمنی بھی مسلمانوں کے ساتھ سیاسی تھی مسلمانوں نے شام ومصر سے رومی اقتدار کو ختم کیا تھا۔ اور مقامی آبادی کے عیسائی اُن کے عدل وانصاف کو دیکھ کر اپنے ہمراہیوں کے خلاف مسلمانوں کے حامی تھے اور ان کا ساتھ دیتے رہے۔ لیکن آگے چل کر مذہبی جنون کو بھڑکایا گیا اور یہود ونصاریٰ اسلام کے خلاف بڑی شدت وتعصب کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

آیت کُلَّمَا اَوْقَدُوْا الخ عام نہیں ہے۔ بلکہ حضورؐ کے زمانے کے حالات بیان کر رہی ہے اور اُس وقت جو صورتِ احوال تھی اسے ظاہر کرتی ہے گو بعض نے اسے عام قرار دیا ہے۔

یہود کے "قول اثم" کی بدترین مثال ان کا یہ قول ہے جو اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے۔ اگر وہ بخل کا استعمال کرتے تو اتنا شدید نہ ہوتا مگر ان کی سنگدلی اور غلاظتِ احساس نے اس کی بجائے ایک نہایت گستاخانہ کلمہ ان سے استعمال کرایا۔

یہود کی جماعتوں اور فرقوں میں ہمیشہ سے عداوت قائم رہی ہے آج جو وہ اہل اسلام کے خلاف کامیاب ہوتے نظر آرہے ہیں یہ ایک عارضی وقفہ ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے سے اس قوم کو دنیا بھر میں نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے کئی ممالک سے ان کو جلاوطن کیا جاچکا ہے (اور اب عیسائیوں نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لینے کے لئے اور یہود کی مالی مدد کا بدلہ چکانے کے لئے ..... انہیں عین عرب ممالک کے قلب میں ایک وطن مہیا کر دیا ہے اور مال ودولت اور ہتھیاروں اور تمام ذرائع ووسائل سے ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ مگر وہ وقت انشاء اللہ دور نہیں کہ حالات ایک دفعہ پھر پلٹا کھائیں گے۔ لیکن وقت کی کنجی مسلم جماعت کے ہاتھ میں ہے کب وہ اس قابل بنتی ہے کہ اللہ کا وعدہ ان کے ساتھ پورا ہو! آہ! آج وہ مسلم جماعتیں کہاں ہیں۔ جن کے ہاتھوں اللہ کے وعدے پورے ہوئے۔

جس دن مسلم قوم اسلام کی طرف پلٹ گئی۔ اور اسے اپنی زندگی کا عملی ضابطہ بنالیا اُسی دن اللہ کی بدترین مخلوق یہود کے خلاف خدا کا وعدہ پورا ہوگا۔ یہود کو یہ حقیقت معلوم ہے اسی لئے وہ مسلم جماعت میں مکر وفریب اور سازش کا جال پھیلائے ہوئے ہے۔ اور جو کچھ اُن کے ہاتھ میں مکر وفن اور کذب وزور کے ہتھیار موجود ہیں سب کو ان کے خلاف بیک وقت آزمارہے ہیں۔ اور دنیا کے چپے چپے پر اسلامی طاقتوں کے خلاف سب کچھ

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۲۴ ، ۲۲۵

Marfat.com

میدانِ جنگ میں جھونک رہے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے نہیں بلکہ اپنے ایجنٹوں کے ہاتھوں سے اہلِ حق کو شدید چوٹیں لگا رہے ہیں لیکن اللہ اپنے امر پر غالب ہے اور اس کا وعدہ برحق ہے جو وقت پر پورا ہو کر رہے گا۔ یہود کے شر کو بند کرنے اور ختم کرنے کے لئے اللہ ایسے بندے اٹھائے گا جن کے ہاتھ پر اس کے وعدے پورے ہوں گے کیونکہ اللہ شر و فساد کو پسند نہیں کرتا۔

احقر مؤلف عرض کرتا ہے کہ سید قطب شہیدؒ جب قید خانے میں یہ سطور لکھ رہے تھے اُس وقت غالباً انہیں اندازہ بھی نہ ہوگا کہ عنقریب حالات کیا رُخ اختیار کریں گے۔ وہ مرحوم تو پھانسی کے تختے پر جھول کر زندۂ جاوید ہو گئے۔ لیکن پچھلے سال یہود و نصاریٰ کے گٹھ جوڑ نے عرب دنیا اور عالم اسلام کو جو زخم لگائے ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ انہیں مندمل کرنے کے لئے کوئی عماد الدینؒ زنگی، کوئی نور الدین زنگیؒ یا صلاح الدینؒ ایوبی کب اُٹھے گا؟

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم ان سے

عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾

ان کی برائیاں دور کرتے اور ان کو داخل کرتے جنت کے باغوں میں

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ

اور اگر وہ قائم رکھتے تورات اور انجیل کو

وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ

اور اس کو جو نازل ہوا ان پر ان کے رب کی طرف سے تو کھاتے

فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ

اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے ان میں کچھ

اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

لوگ سیدھی راہ پر ہیں اور ان میں بہت سے بُرے کام کر رہے ہیں

Marfat.com

آیت نمبر ۶۵ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے شدید جرائم کے باوجود اور اتنی سخت شرارتوں کے باوصف اگر اب بھی اہلِ کتاب اپنے رویّہ سے تائب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو دروازہ توبہ کا بند نہیں ہوا۔ حق تعالیٰ کمال فضل و رحمت سے ان کو اُخروی اور دنیوی نعمتوں سے سرفراز فرما دیتا۔ اس کی رحمت بڑے سے بڑے مجرم کو بھی جب وہ شرمسار اور معترف ہو کر آئے مایوس نہیں کرتی۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ سے مراد قرآن مجید ہے جو تورات و انجیل کے بعد اہلِ کتاب کی تنبیہ و ہدایت کے لئے نازل ہوا۔ اگر وہ اسے قائم کرتے تو یہ نتیجہ نکلتا۔ کیونکہ اس کی تسلیم کے بدون تورات و انجیل کی بھی صحیح معنی میں اقامت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ تورات و انجیل اور جملہ کتب سماویہ کی اقامت کا مطلب ہی اب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم اور پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم جو کتب سماویہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق بھیجے گئے ہیں ان کو قبول کیا جائے گویا اقامت تورات و انجیل کا حوالہ دے کر آگاہ فرما دیا کہ اگر قران کو انہوں نے قبول نہ کیا تو اس کے معنی یہی ہیں کہ یہ لوگ اپنی کتابوں سے بھی مُنکر ہو گئے۔

لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ: یعنی تمام ارضی و سماوی برکات سے انہیں متمتّع کیا جاتا۔ اور ذلت، بدحالی اور ضیق عیش کی جو سزا ان کے عصیان و تمرّد پر دی گئی تھی اٹھالی جاتی۔

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ یہ وہ معدود افراد ہیں جنہوں نے فطری سعادت سے توسط و اعتدال کی راہ اختیار کی اور حق کی آواز پر لبیک کہا۔ مثلاً عبداللہؓ بن سلام اور شاہ حبشہؓ نجاشی وغیرہما۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں کہ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی ان کتابوں کو بلا تحریف و تبدیل اور بلا تفسیر و تاویل صحیح طور پر مانیں وہ انہیں اسی قرآن و اسلام کی ہدایت کریں گی۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتلاتے ہیں۔

۱؎ فوائد القرآن ص ۱۵۳
۲؎ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۱۸ (ترجمہ اردو)

Marfat.com

ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ قریب ہے علم اٹھا لیا جائے۔ یہ سن کر حضرت زیادؓ بن لبید نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ علم اُٹھ جائے۔ ہم نے قرآن سیکھا اور اپنی اولادوں کو سکھلایا اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا!) تو آپؐ نے فرمایا افسوس! میں اہلِ مدینہ میں سے تم کو زیادہ سمجھدار (لیکن یہ بات تم نے علم وفہم کی نہیں کی) تم نہیں دیکھتے کہ یہود ونصاریٰ کے ہاتھوں میں بھی تورات وانجیل (کسی نہ کسی رنگ میں) موجود ہے، لیکن کس کام کی؟ جبکہ انہوں نے احکامِ خداوندی چھوڑ دیئے۔

یہ کلام وَلَوْ اَنَّهُمْ اقاموا التوراۃ والانجیل الخ بالذات تو اُس زمانے کے لوگوں سے ہے جنہوں نے تورات وانجیل کی موجودگی میں ان پر عمل نہ کیا اور تبعاً آنحضرتؐ کے عہد کے یہود ونصاریٰ سے ہے جیسا کہ اوّل سورۃ البقرہ میں وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ وغیرہ میں ان کے پہلوں کی نعمتوں کا ان پر ہونا بیان فرمایا ہے اور اگر خصوصاً آنحضرتؐ کے عہد کے یہود ونصاریٰ سے خطاب ہو تو تورات وانجیل سے مراد ان کے احکام ہیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ تورات وانجیل کو قائم کرنے سے مراد ان کتابوں کے احکام وحدود کا قائم کرنا ہے اور آنحضرتؐ کے زمانہ میں گو توریت وانجیل اصلی موجود نہ تھیں۔ مگر ان کے بہت سے احکام وحدود تو اس فرضی تورات وانجیل میں بھی موجود تھے۔ اسی لئے وہ اس پر عمل نہ کرنے سے موردِ الزام ٹھہرے۔

ان آیات[1] میں ایمان کے ساتھ تقویٰ کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ مجرد ایمان باعثِ فوز وفلاح نہیں جب تک اس کے ساتھ تقویٰ وعمل صالح کا وزن بھی موجود نہ ہو۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ہے کہ ایمان عمود ہے اور تقویٰ طنابیں ہیں۔ محض عمود سے خیمہ نہیں تن سکتا۔ اس کے لئے طنابیں بھی ضروری ہیں۔

آسمانی فیض اور زمینی برکتوں سے مراد بارش اور اُس کی برکتیں اور زمین اور اُس کی نباتات ہیں۔

منهم امة مقتصدة سے معلوم ہوا کہ کوئی اُمت بھی اعتدال پسندوں سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن امت کے صلاح وارتقاء کے دور میں وہ زیادہ ہوتے ہیں اور فساد وزوال کے زمانے میں کمتر ہوتے ہیں۔ قومیں اپنے اشرار کے کثیر معاصی سے ہلاک ہوتی ہیں اور اس

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۵۶، ۱۵۷، تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۶۰، ۴۶۳

Marfat.com

وقت ان کے اخیار کم ہوتے ہیں جو نیک اعمال کریں۔ یہی اعتدال پسند لوگ ہر زمانے میں نیکی میں سبقت کرنے والے اور صلاح و اصلاح کی طرف بھاگنے والے ہوتے ہیں۔ اس آیت کی عبرت کا خلاصہ یہی ہے کہ دین میں اصل ضرورت اس کے احکام پر چلنے اور اس کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے کی ہے۔ اور یہی چیز اُس وقت اہلِ کتاب میں مفقود تھی۔ افسوس! آج اکثر اہلِ اسلام کا حال بھی یہی ہو گیا ہے۔

اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگوں کے قصد و اعتدال پر قائم ہونے کی شہادت قرآن پاک کی دوسری آیات میں بھی موجود ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝

اور وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ الآیۃ۔

ان آیات میں ایک عظیم ایمانی قاعدہ بیان ہوا ہے وہ یہ کہ زمین میں دینِ الٰہی کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مومنوں کی حیات میں اس دنیوی زندگی دونوں کے اعتبار سے صلاح و فلاح اور فوز و کامرانی پیدا ہو اس معاملے میں دین و دنیا یا دنیا و آخرت میں کوئی افتراق نہیں، کیونکہ دنیا و آخرت کے لئے یہی ایک ضابطہ ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ دین، دارین کی فوز و فلاح کا باعث ہے۔

اس وقت سارا عالمِ انسانیت ایک تباہی پر کھڑا ہے، ایک خطرناک جنگ کا خوف ہر وقت انسانوں پر مسلط ہے۔ یہ خوف شعوری ہو یا غیر شعوری، بہت ہی خطرناک بیماریوں مثلاً سکتہ، رگوں کا پھٹ جانا اور خودکشی کا باعث ہے یہ بیماریاں آج سے پہلے کبھی اتنی زیادہ نہ تھیں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلامی ضابطۂ حیات میں تین چیزوں کی اصولی اہمیت ہے۔

ا۔ ایمان ب۔ تقویٰ

ج۔ لوگوں کی عملی زندگی میں دین کو قائم کرنا۔

انہی تین چیزوں پر اللہ نے اہلِ کتاب کی فوز و فلاح کا دار و مدار رکھا ہے۔ اور یہی مدار دنیا کی ہر جماعت کے لئے ہے۔ اسی سے فردوسِ ارضی اور فردوسِ آخرت حاصل ہوتا ہے۔ کائنات کا امن و امان اور انسانیت کا روحانی و مادی اطمینان و سکون انہی میں مضمر ہے۔ ان کے اختیار میں خود انسان کا فائدہ ہے اللہ غنی اور بے نیاز ہے۔ اس نے انسانوں کو صلاح و فلاح کے لئے راستہ بتا دیا ہے۔ اگر وہ اس پر چلیں تو دنیا و آخرت میں کامران ورنہ دونوں میں ناکام و نامراد ہوں گے۔ تورات و انجیل کی اقامت کے ساتھ ساتھ قرآن کی اقامت کا ذکر بتا رہا

لہ فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۲۵، ۲۳۴

Marfat.com

ہے کہ اگر کل اہلِ کتاب کی صلاح و فلاح تورات و انجیل پر بلا تحریف و تبدیل عمل کرنے میں تھی تو آج سارے انسانوں کی ـــ مسلمانوں سمیت ـــ فلاح و کامرانی قرآن کو قائم کرنے میں ہے۔ مسلمان آج اپنے ممالک میں جس حالت میں زندگی گزار رہے ہیں یہ بھوک، بیماری، ظلم و استبداد اور ذلت و تکلیف کی زندگی ہے۔ اس کا حل ان آیات میں موجود ہے کاش کوئی سمجھے!

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

اے رسول پہنچا دے جو تجھ پر اترا تیرے

مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ

رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا

رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

پیغام اور اللہ تجھ کو بچائے گا لوگوں سے بے شک

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اللہ راستہ نہیں دکھلاتا قوم کفار کو

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰى

کہہ دے اے کتاب والو تم کسی راہ پر نہیں جب تک

تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو تم پر اترا

مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ

تمہارے رب کی طرف سے اور ان میں بہتوں کو بڑھے گی۔ اس کلام سے جو

Marfat.com

مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ج

تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور کفر

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ اِنَّ

سو تو افسوس نہ کر اس قوم کفار پر بیشک

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ

جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور فرقہ صابی

وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ

اور نصاریٰ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر

عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور عمل کرے نیک نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے

پچھلی آیات میں اہل کتاب کی شرارت، کفر اور سیہ کاریوں کا ذکر کرکے تورات، انجیل، قرآن اور سب کتب سماویہ کی اقامت کی ترغیب دی گئی تھی۔ آئندہ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا سے اہل کتاب کے مجمع میں اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ اس "اقامت" کے بدون تمہاری مذہبی زندگی بالکل صفر اور لائے محض ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الخ میں اسی دوٹوک اعلان کے لئے حضورؐ کو تیار کیا گیا ہے۔ یعنی آپؐ جو کچھ پروردگار کی طرف سے اتارا جائے، خصوصاً اس طرح کے فیصلہ کن اعلانات آپؐ بے خوف و خطر اور بلا تامل پہنچاتے رہیے۔ اگر بفرضِ محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپؐ سے کوتاہی ہو گئی تو بحیثیت رسولؐ (خدائی پیامبر) ہونے کے رسالت (پیغام رسانی) کا جو منصب آپؐ کے سپرد کیا گیا ہے، سمجھا جائے گا کہ آپؐ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا۔ بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فریضۂ تبلیغ کی انجام دہی بیش از بیش ثابت قدم رکھنے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی

لہ۔ فوائد القرآن علامہ عثمانی ص ۱۵۳

Marfat.com

مؤثر عنوان نہ ہو سکتا تھا۔ آپؐ نے بائیس سال تک جس بے نظیر اولوالعزمی، جاں فشانی، مسلسل جدوجہد اور صبر و استقلال سے فرضِ رسالت کو ادا کیا وہ اس کی واضح دلیل تھی کہ آپؐ کو دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر اپنے فرض منصبی (رسالت و ابلاغ) کی اہمیت کا احساس ہے۔ حضورؐ کے اس احساسِ قومی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفۂ تبلیغ میں مزید استحکام و تثبیتؐ کی تاکید کے موقع پر مؤثر ترین عنوان یہی ہو سکتا تھا کہ حضورؐ کو یٰاَیُّھا الرسول سے خطاب کر کے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بفرضِ محال تبلیغ میں ادنیٰ سی کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپؐ اپنے فرضِ منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ آپؐ کی تمام تر کوششوں اور قربانیوں کا مقصدِ وحید ہی یہ تھا کہ آپؐ کے سامنے فرضِ رسالت کی ادائیگی میں اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل فرمائیں۔ لہٰذا یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی آپؐ ذرا سی کوتاہی کریں۔ عموماً یہ تجربہ ہوا ہے کہ فریضۂ تبلیغ ادا کرنے میں انسان چند وجوہ سے قاصر رہتا ہے۔ یا تو اسے فرض کی اہمیت کا کافی احساس اور شغف نہ ہو۔ یا لوگوں کی عام مخالفت سے شدید نقصان پہنچنے کا کم از کم بعض فوائد کے فوت ہونے کا خوف ہو یا مخاطبین کے عام تمرد و طغیان کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ پچھلی اور اگلی آیات میں اہل کتاب کے متعلق بتلایا گیا ہے۔ تبلیغ کے مثمر و منتج ہونے سے مایوسی ہو۔ پہلی وجہ کا جواب یٰاَیُّھا الرسول سے فما بلغت رسالتہ تک، دوسری کا واللہ یعصمک من الناس میں اور تیسری کا ان اللہ لا یھدی القوم الکفرین میں دیدیا گیا۔ یعنی تم اپنا فرض ادا کئے جاؤ۔ خدا تعالیٰ آپؐ کی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنے والا ہے اور وہ تمام روئے زمین کے دشمنوں کو بھی آپؐ کے مقابلہ پر کامیابی کی راہ نہ دکھائے گا۔ باقی ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی قوم جس نے کفر و انکار ہی پر کمر باندھ لی ہے اگر وہ راستہ پر نہ آئی تو غم نہ کرو اور نہ مایوس ہو کر اپنے فرض کو چھوڑو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت ربانی اور آئین آسمانی کے موافق اُمت کو ہر چھوٹی بڑی چیز کی تبلیغ کی۔ نوعِ انسانی کے عوام و خواص میں سے جو چیز جس طبقہ کے لائق اور جس کی استعداد کے مطابق تھی۔ آپؐ نے بلا کم و کاست اور بے خوف و خطر پہنچا کر خدا کی حجت بندوں پر تمام کر دی اور وفات سے دو ڈھائی مہینے پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں چالیس ہزار سے زائد خادمانِ اسلام اور عاشقانِ تبلیغ کا اجتماع تھا۔ آپؐ نے علی رؤس الاشہاد اعلان فرما دیا کہ "اے اللہ گواہ رہ کہ میں تیری امانت پہنچا چکا"

مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ سے مراد قرآن مجید ہے جو کل کتبِ سماویہ کا مہیمن

Marfat.com

ہے۔ آیت کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

فلا تاس علی القوم الکافرین : یعنی اس غم و افسوس میں پڑ کر تنگ نہ ہوں اپنا فرض امن و اطمینان سے ادا فرماتے رہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ ۔ ۔ ۔ لَا یَحْزَنُوْنَ : جو قوم "مسلمان" کہلاتی ہے یا یہود و نصاریٰ یا صابی (یا اور کچھ) تمثیلاً چند مشہور مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے) کوئی شخص ان ناموں کی بدولت یا نسل، رنگ، پیشہ، وطن وغیرہ احوال و خصائص کے لحاظ سے حقیقی فلاح اور دائمی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کامیاب اور مامون و مصؤن ہونے کا ایک اور صرف ایک معیار ہے یعنی ایمان و عمل صالح جس قوم کو اپنے مقرب الٰہی یا کامیاب ہونے کا دعویٰ ہو وہ اس کسوٹی پر اپنے آپ کو کس کر دیکھ لے اگر اس میں کھری اتری تو بلا خوف و خطر مصلح اور کامیاب ہے۔ ورنہ ہر وقت اپنے آپ کو خدا کے غضب و قہر کے نیچے سمجھے۔ پچھلی آیات میں خاص اہل کتاب کو تبلیغ تھی۔ اس آیت میں تمام اقوام و ملل کے سامنے بلا رُو رعایت ایسا عجیب و غریب، معقول اور منصفانہ قانون پیش کیا گیا جس کے بعد سلیم الفطرت انسان کو اسلام کی صداقت اور ہمہ گیری میں شُبہ نہیں رہ سکتا۔

ایک شخص جب تک خدا یعنی اُس کے وجود، وحدانیت، صفاتِ کمالیہ نشانہائے قدرت، تمام احکام و قوانین، کل نائبین و سفراء پر اور روزِ جزاء پر ایمان نہ لائے اور نیکی اختیار نہ کرے، کیا عقلِ سلیم قبول کر سکتی ہے کہ وہ نعیمِ دائم، رضائے حق اور سرور ابدی سے ہمکنار ہوگا؟ ایمان باللہ کے تحت میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ فرض کرو ایک شخص روشن دلائل نبوت کی موجودگی میں کسی پیغمبر کی توہین کرتا ہے اور اس کو دعوئ نبوت میں جھوٹا کہنا بھی اُس کی توہین ہے، تو کیا کسی کے سفیر کی توہین اور اُس کے صاف و صریح اسناد سفارت کی تکذیب اس کی حکومت کی توہین نہیں؟ اسی طرح سمجھ لو کہ جو شخص کسی ایک سچے پیغمبر کی تکذیب کرتا ہے اور اس کو قبول نہیں کرتا۔ وہ فی الحقیقت خدا کے اُن صاف و صریح نشانات و دلائل کو جھٹلا رہا ہے جو اُس نے تصدیق نبوت کے لئے اتارے تھے۔ فانھم لا یکذبونک ولکن الظالمین بایات اللہ یجحدون (انعام ع۴) کیا اللہ کی آیات اور صریح و علانیہ نشانات کو جھٹلانے کے بعد بھی ایمان باللہ کا دعویٰ رہ سکے گا؟ قرآن کریم نے جن تفصیلات کی طرف ایمان باللہ اور عمل صالح کے اجمالی عنوان سے یہاں اشارہ فرمایا ہے، دوسرے مواضع میں وہ شرح و بسط سے مذکور ہیں۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ صابئین عراق میں ایک فرقہ تھا۔

Marfat.com

جس کے مذہبی اصول کے لئے حکمائے اشراقیین اور فلاسفۂ طبیعین کے اصول سے ماخوذ تھے۔ یہ لوگ روحانیت کے متعلق نہایت غلو رکھتے۔ بلکہ روحانیت کی پرستش کرتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ ارواح مجردہ اور مدبرات فلکیہ وغیرہ استعانت و استمداد سے ہی ہم رب الارباب تک (یعنی بڑے معبود تک) پہنچ سکتے ہیں لہٰذا سخت ریاضتوں اور کسر شہوات سے روح میں تجرد اور صفائی پیدا کر کے "عالم روحانیات" کے ساتھ ہم کو اپنا رشتہ پیدا کرنا چاہیئے۔ پھر ان کی خوشنودی اور دستگیری سے خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اتباع انبیاء کی ضرورت نہیں۔ کواکب کی تدبیر کرنے والی روحوں اور دیگر روحانی چیزوں کو خوش کرنے کے لئے یہ لوگ ہیکل بناتے تھے اور انہی ارواح کے لئے نماز، روزہ اور قربانی وغیرہ کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ یہ جماعت صابئین، عرب کے حنفاء کے مقابلہ میں تھی، جن کا سب سے بڑا حملہ نبوت اور اس کے خواص ولوازم پر ہوتا تھا۔ حضرت ابراہیم حنیف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے وقت نمرود کی قوم صابئی العقیدہ تھی جس کے رد و ابطال میں خدائے تعالیٰ کے دوست (خلیل اللہ) نے قربانی اور جانبازی کا حق ادا کر دیا۔

یہاں[1] ایمان اور اعمال صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں ان لوگوں ـــ مثلاً یہود ـــ کے اس زعم باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف اپنے ہی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں ایمان عمل صالح پر نہیں بلکہ خاص گروہ بندی، نام و نسب اور نسل و خون پر نجات کا مدار تھا۔ اس خیال خام میں مبتلا تھے کہ ان کے گروہ سے اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص رشتہ ہے، جو دوسرے انسانوں سے نہیں۔ لہٰذا نجات کے لئے ان کے گروہ سے منسلک ہونا ضرور ہے۔ ان کے گروہ کا ہر شخص باوجود بے ایمان اور بے عمل ہونے کے بخشا جائے نجات ان کے گروہ کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ اور اس گروہ سے باہر والے تمام انس جہنم کا ایندھن ہیں اس کے رد میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں نجات کا دار و مدار ان گروہ بندیوں پر نہیں بلکہ ایمان و عمل پر ہے۔ جو بھی یہ چیز لے کر خدا کے حضور حاضر ہو اس کے لئے بخشش ہو گی۔ خدا کے ہاں فیصلہ صفات پر ہو گا "ذوات" پر نہیں اور نہ امر و شماری کے رجسٹروں پر۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۵۲

Marfat.com

چونکہ[1] یہود و نصاریٰ کا گمان تھا کہ نجات صرف ان کے لئے ہے۔ اُن کے علاوہ اور کسی کو نہ ہوگی۔ اور اب تک دونوں فریقوں کا گمان ہے یہ گمان باطل تھا اور اس کا رد کرنا منصبِ خاتم النبوّت کا فرض تھا۔ اگر یوں ابطال کرتے کہ تمہارا گمان غلط ہے تو چنداں مؤثر نہ ہوتا اور وہ یہ طعن کرتے کہ یہ اچھا نبی ہے جو ہمیں حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا اتباع کرنے سے روکتا ہے۔ اس لئے ایک قاعدہ کلیّہ بیان فرما دیا گیا جس کے تسلیم کئے بغیر کسی عقلمند کو چارہ نہیں جس سے خود بخود ان کے دعویٰ باطلہ کا ابطال ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ فلاحِ دارین ایمان و عملِ صالح پر منحصر ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ نجات اور بزرگی کا دارو مدار قوتِ نظری و عملی کی تکمیل و اصلاح پر ہے نام و نسبت پر نہیں۔

[2] صحیح بخاری میں ہے کہ ام المومنین عائشہ سلام اللہ علیہا نے فرمایا: "جو تجھ سے کہے کہ حضورؐ نے خدا کے نازل کردہ کسی حکم کو چھپا لیا تو جان لو کہ وہ جھوٹا ہے۔ اللہ نے اپنے نبیؐ کو یہ حکم دیا ہے یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ الخ

ابن عباسؓ سے کسی نے کہا کہ لوگوں میں چرچا ہو رہا ہے کہ تمہیں کچھ باتیں حضورؐ نے ایسی بتائی ہیں۔ جو اور لوگوں سے چھپائی تھیں۔ تو آپ نے یہی آیت پڑھی اور فرمایا خدا کی قسم ہمیں حضورؐ نے کسی ایسی مخصوص چیز کا وارث نہیں بنایا (ابن ابی حاتم)

بخاری میں ہے کہ کسی شخص نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تمہارے پاس قرآن کے علاوہ کوئی اور وحی بھی ہے؟ آپ نے فرمایا اُس خدا کی قسم جس نے دانے اگائے اور جانوروں کو پیدا کیا ہے کہ ہمارے پاس قرآن کے سوا کچھ نہیں سوائے اس فہم کے جو خدا کسی کو دیدے اور سوائے اس کے جو اس صحیفے میں ہے۔ اس نے پوچھا صحیفے میں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا دیت کے احکام ہیں۔ قیدیوں کو چھوڑ دینے اور قصاص کے احکام ہیں۔

بخاری میں امام زہریؒ کا ایک قول ہے کہ خدا کی طرف سے رسالت بھیجی گئی، پیغمبرؐ نے ان کی تبلیغ فرمائی اور ہمارے ذمہ اُسے قبول کرنا اور فرمانبرداری ہے۔ آپؐ نے خدا کی سب باتیں برسرِ عام پہنچا دیں۔ اور آخری حج میں اُمّت کے پہلے اور بہترین طبقے کو اس تبلیغ پر گواہ ٹھہرا لیا تھا۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے آپؐ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے پہلے آپؐ صحابہؓ کا پہرہ لگوایا کرتے تھے۔ جب یہ آیت اتری تو آپؐ نے خیمے سے سر نکال کر پہریداروں سے فرمایا جاؤ اب خدا نے میری حفاظت کا وعدہ فرما لیا ہے اور میں مکمل طور پر اس کی

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۴۸ [2] تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۱۹، ۱۲۰

Marfat.com

پناہ میں ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ نے مکہ میں دشمنوں کے خوفناک گھیرے میں قدم قدم پر آپؐ کی حفاظت فرمائی اور ان کی تمام سازشیں آپؐ کے خلاف ناکام کر دیں۔ پھر مدینہ میں یہود، مشرکین اور منافقین نے مل کر آپؐ کے خلاف سارا زور لگایا۔ قتل کی سازشیں کیں۔ کھانے میں زہر ملایا، جادو ٹونے کئے۔ اور ہر ناجائز حربہ آپؐ کے خلاف اختیار کیا۔ مگر اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو بچایا۔ اور جب تک آپؐ نے حقِ رسالت کو ادا کر کے اللہ کے کام کو پورا نہ کیا آپؐ دنیا سے رخصت نہ ہوئے۔

اگر[1] یہ واضح حکم نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کسی حکم کی تبلیغ میں اپنے اجتہاد سے مصلحتاً تاخیر کرتے کہ جب تک لوگوں کی استعداد اس کے قبول کے لئے نہ ہو اُسے ملتوی کیا جائے۔ یا یہ خیال آپؐ کے دل میں گزرتا کہ لوگ بعض احکام کی تبلیغ پر آپؐ کو ایذا دیں گے اور قبول نہ کریں گے اس آیت نے صاف کر دیا کہ تبلیغ حتمی امر ہے۔ جسے کسی حال میں موخر کرنا جائز نہیں ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ بعض موضوع روایات کا سہارا لے کر کچھ لوگوں نے جو کچھ کہا ہے۔ کہ قرآن کے علاوہ وحی کی دوسری اقسام میں سے بعض کو چھپانا یا بعض لوگوں کو نہ بتانا جائز ہے، یہ بالکل واہی اور باطل قول ہے۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضورؐ نے دین کے تمام احکام اور قرآن کے تمام حصوں کی تبلیغ کما حقہٗ فرما دی تھی۔ اور علم دین کو پہنچانے میں کسی کوئی خصوصیت نہ دی تھی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دینی علم میں ایک کو دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ ہاں یہ امتیاز فہم قرآن سے ہوتا ہے۔ جس کا ذریعہ سنت اور آثارِ صحابہ و تابعین کا علم ہے۔ اسی طرح یہ امتیاز عربی زبان کے مفردات اور طرزِ بیان کے علم میں ہو سکتا ہے۔ اور کائنات کے علم میں انسانی احوال و خصائص کے علم میں اور مخلوق میں خدا کی سنن کے علم کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

عصمت کا لفظ عصام سے نکلا ہے جس کا معنیٰ ہے وہ چمڑے کی دوڑی جس سے مشک کا منہ باندھا جاتا ہے اور پانی کو اس میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ اور الناس سے مراد یہاں کفار و یہود ہیں۔ کیونکہ تبلیغِ وحی اُن کے کفر و شرک، ضلالت و فسادِ عقاید اور بدعملیوں کے بیان پر مشتمل تھی، اور اس سے وہ مشتعل ہوتے اور آپؐ کی ایذا، و قتل پر کمربستہ ہوتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی تسلی کے لئے خود حفاظت کا ذمہ لے لیا۔

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۵۹، ۱۶۲، تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۶۳، ۴۷۹

Marfat.com

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ آیت مکّی ہے اور اسے مدنی سورت میں اہلِ کتاب کو تبلیغِ احکام کے ضمن میں اس لئے بیان فرمایا گیا ہے کہ آپؐ یہودِ مدینہ کی ایذا و سازش کا نشانہ بھی بنے رہتے تھے۔ فلا تاس : اُس کا معنیٰ حُزن ہے اور اس کی حقیقت ہے کہ گزشتہ چیز پر غم کرنا۔ پس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے کفر و طغیان اور ایذا و مخالفت کا غم نہ فرمائیں۔ کیونکہ اس کا ضرر انہیں کو پہنچے گا۔ آپؐ کو یا اہلِ ایمان کو نہیں۔

اُن آیات میں جن چیزوں کے اعلان و تبلیغ کا حکم ہے وہ سارے احکامِ دین اور جمیع ما انزل الیہ ہے اس میں سے کچھ بھی باقی رکھنے یا ملتوی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان میں سے یہ چیزیں بھی تھیں کہ اہلِ کتاب جب تک ساری تورات و انجیل اور قرآن کو قائم نہ کریں مومن نہیں، پھر یہود کا کفر اور نقضِ عہد اور قتلِ انبیاء بھی تھا، اور نصاریٰ کا کفر و شرک اور مسیحؑ بن مریم کو خدا یا ابن اللہ کہنا بھی تھا۔ پھر یہ اعلان بھی کہ مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو شرک کے انجام سے ڈرایا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مشرکوں پر جنّت حرام کر دی ہے۔ نیز بنی اسرائیل پر داؤدؑ اور عیسیٰؑ بن مریم کی زبان سے ان کے معاصی اور تعدی کی وجہ سے لعنت کی گئی تھی۔ یہ سب باتیں آئندہ آیات میں آرہی ہیں۔

کلمۂ حق کو کسی صورت میں چھپانا روا نہیں۔ بلکہ اُسے مکمل طور پر پیش کرنا واجب ہے۔ کوئی چاہے جو کچھ کہے اور دشمن خواہ کچھ کریں کلمۂ حق کی فطرت کسی مصلحت یا مراعات کی پابند نہیں۔ اسے برسرِ عام اور اعلانیہ کہا جائے گا۔ تاکہ لوگوں کے ضمائر و قلوب تک پہنچ جائے۔ جب کلمۂ حق کو اس طرح پیش کیا جائے تو ہدایت کے قابل دل ذرّاً اس کے لئے کھُل جاتے ہیں جب اسے مبہم یا غیر واضح طور پر کہا جائے تو جن دلوں میں ایمان کی استعداد نہیں وہ ہرگز نرم نہیں ہوتے۔ بعض دفعہ داعی کے دل میں خیال آتا ہے کہ ان لوگوں کے قلوب کو بھی واکیا جائے اور خدشہ ہوتا ہے کہ کچھ مداہنت یا تبلیغ میں نرمی نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس آیت میں یہ عنوان اختیار فرمایا گیا یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ الخ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خشونت اور سختی کا رویّہ اختیار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکمت اور اچھی نصیحت سے تبلیغ کرنے کا حکم دیا ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ طریقِ تبلیغ میں نرمی اور حکمت و موعظت ہو۔ لیکن اصل کلمۂ حق کو بیان کئے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ ان دونوں چیزوں میں کوئی تعارض نہیں۔

لہ فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۲۳۶، ۲۴۴

Marfat.com

لستم علیٰ شیئٍ : آپؐ کو اس بات کا مکلّف کیا گیا کہ علی الاعلان اہلِ کتاب سے فرما دیں کہ دعویٰ ایمان و عمل اور خدا کے بیٹے اور پیارے ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی دین نہیں رکھتے۔ دین صرف ایمان و عمل اور اقامتِ دین و احکام دین کا نام ہے، محض چند رسوم پر عمل کرنے سے آدمی دیندار نہیں ہو جاتا۔ جب اہل کتاب کو یہ خطاب فرمایا گیا۔ تو اس وقت وہ لوگ یہودیت و نصرانیت کی صفات سے موصوف تھے۔ اپنی کتابوں کو پڑھتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ پکّے مومن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ دین زبان سے چند کلمات ادا کرنا، کتاب کو تلاوت کرنا اور اس کی ترتیل کا نام نہیں بلکہ دین ایک ضابطۂ زندگی ہے جو عقیدے، عبادات اور معاملات پر مشتمل ہے۔ چونکہ اہلِ کتاب ان چیزوں سے خالی تھے لہٰذا فرمایا گیا کہ انہیں کہہ دیجئے تم کسی دین پر یا خیر پر نہیں۔ تورات و انجیل اور ما اُنزل الیھم کے قائم کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ اللہ کے دین میں داخل ہوں جسے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ان سے ہر پیغمبر کا ساتھ دینے، اس کی مدد کرنے اور اس کے اکرام و اعزاز کا حکم دیا تھا اور حضورؐ کا ذکر ان کی کتب میں موجود تھا اور ان سے عہد لیا گیا تھا کہ آپؐ پر ایمان لا کر آپؐ کی مدد کریں گے۔

اس آیت کے مضمون کی موجودگی میں اہل کتاب سے موالات یا ان سے مل کر الحاد و کمیونزم کے خلاف متحدہ محاذ" بنانے کا سوال خارج از بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے پہلے ان سے دین اسلام میں داخل ہونے اور اس پر کاربند ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ بصورتِ دیگر ان کے مزعومہ دین کو لاشیئ قرار دیتا ہے۔

اللہ کا دین کسی جھنڈے، علامت یا وراثت کا نام نہیں۔ وہ تو ایک حقیقت ہے جو ضمیر اور زندگی میں ایک جیسی طاری ہوتی ہے۔ پس مسلمانوں کو پہلے اپنے اوپر اس حقیقت کاملہ کو پورے طور پر طاری کرنا واجب ہے اور پھر اہلِ کتاب کو اس کی دعوت دینا فرض ہے۔

آج ہم میں سے بعض لوگ جب اہلِ کتاب کی کثرتِ تعداد اور مادّی قوت کو دیکھتے ہیں۔ پھر دوسرے کفّار و ملحدین کی قوت و شوکت کا ملاحظہ کرتے ہیں اور پھر اپنی صفوں میں کچھ منافق اور متذبذب لوگوں کو دیکھتے ہیں تو ان کا حوصلہ چھوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ راہِ حق یہ نہیں۔ جاہلیت بہرحال جاہلیت ہے چاہے ساری دنیا پر چھا جائے اور اسلام بہرحال اسلام ہے چاہے اُس کے ماننے والے کمزور ہوں۔ ایک مسلمان کو ضلالت کی

Marfat.com

کثرت اور باطل کی ضخامت ڈرا نہیں سکتی نہ بے حوصلہ کر سکتی ہے۔ باطل ریت کا ایک بلند ٹیلہ ہے لیکن بہرحال ہے باطل۔ جب پہلی دفعہ حق کا جاہلیت سے مقابلہ ہوا تھا تو اس وقت باطل آج سے بھی زیادہ طاقتور تھا۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَا

بے شک ہم نے لیا تھا پختہ عہد بنی اسرائیل سے اور بھیجتے تھے

اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ ۙ

ان کی طرف پیغمبر جب کبھی لایا ان کے پاس کوئی پیغمبر

بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا ۠ وَ

وہ حکم جو اچھا نہ لگا ان کے جی کو تو بہتوں کو جھٹلایا اور بہتوں کو

فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ

قتل کر ڈالتے تھے اور انہوں نے گمان کیا کہ کچھ خرابی

فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

نہ ہوگی۔ پس وہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔ پھر توبہ قبول کی اللہ نے

ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ

ان کی پھر اندھے اور بہرے ہو گئے ان میں سے بہت اور اللہ خوب

بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۷۱

دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

Marfat.com

ان[1] آیتوں میں بنی اسرائیل کے عہد و پیمان لینے اور ان کی عہد شکنی کا ذکر کیا ہے تاکہ بتہ چل جائے کہ پچھلی آیت میں جو فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں قبولیت کا معیار ایمان و عمل صالح ہے۔ یہود اس عہد پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔

بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمُ غلام کی وفاداری کا امتحان اس میں ہے کہ جس بات کو دل نہ چاہے اُسے آقا کے حکم سے کر گزرے اور اپنی رائے یا خواہش کو آقا کی مرضی کے تابع بنا دے۔ ورنہ صرف ان چیزوں کا مان لینا جو مرضی اور خواہش کے موافق ہوں، یہ کونسا کمال ہے۔

وحسبوا ان لا تکون ..... کثیر منھم = یہود نے پختہ عہد و پیمان توڑ کر خدا سے غداری کی۔ اس کے پیغمبروں میں سے بعض کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر ڈالا۔ یہ فتوان کے ایمان باللہ اور عمل صالح کا حال تھا۔ قیامت پر ایمان کا اس سے اندازہ کر لو کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کر کے بالکل بے فکر ہو بیٹھے، گویا ان حرکات کا کوئی خمیازہ بھگتنا نہ پڑے گا۔ اور ظلم و بغاوت کے نتائج کبھی سامنے نہ آئیں گے۔ یہ خیال کر کے خدائی نشانات اور احکام الٰہی کی طرف سے بالکل اندھے اور بہرے ہو گئے۔ اور جو ناکردنی کام تھے وہ کئے حتیٰ کہ بعض نبیوں کو قتل اور بعض کو قید کیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط فرمایا۔ پھر ایک مدت دراز کے بعد بعض ملوکِ فارس نے بخت نصر کی قید ذلت و رسوائی سے چھڑا کر بابل سے واپس بیت المقدس کو بھیجا۔ اس وقت ان لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح احوال کی طرف متوجہ ہوئے۔ خدا نے توبہ قبول کی لیکن کچھ زمانے کے بعد پھر وہی شرارتیں سوجھیں۔ اور بالکل اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریاؑ و یحییٰؑ کے قتل کی جرأت کی اور عیسیٰؑ کے قتل پر کمر باندھی اور اللہ تعالیٰ آن کے اعمال کو خوب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ امتِ محمدیہ کے ہاتھوں انہیں سزا دلوائی۔ واللہ بصیر بما یعملون۔

احقر مؤلف عرض کرتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دو مرتبہ فساد مچانے اور اودھم برپا کرنے اور کیفر کردار کو پہنچنے کا ذکر فرمایا ہے۔ زیرِ تفسیر آیات میں بھی دو مرتبہ ان کے اندھے بہرے ہو کر احکام دین کو پسِ پشت ڈالنے اور مجرمانہ افعال کا ذکر ہے جن کا کچھ ذکر اوپر حضرت الاستاذ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ کے قلم

---

[1] فوائد القرآن ص ۱۵۴

Marfat.com

سے گزرا ہے۔

ان آیات میں فتنہ کے لفظ سے مراد بڑے بڑے شدید امور کے ذریعے سے امتحان میں ڈالا جانا ہے۔ مثلاً طاقتور قوموں کا ان پر مسلط ہو جانا اور ان کا قتل و غارت، تباہی و بربادی اور غلامی میں مبتلا کیا جانا اہل کتاب نے اپنے دلوں میں یہ گمانِ باطل پال لیا تھا کہ وہ نبیوں کی اولاد بلکہ خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں لہٰذا اُن کے فساد اور بگاڑ سے اُن پر کوئی آفت نہیں آئے گی اور نہ ان کا کوئی کچھ بگاڑ سکے گا۔ چنانچہ وہ آیاتِ الٰہی کے دیکھنے سے اندھے اور مواعظِ حق کے سننے سے بہرے ہو گئے۔ اور دین کی ہدایت سے پھر گئے۔ جس کے نتیجے میں بابل والوں نے بخت نصر کی زیرِ قیادت ان پر ناقابلِ بیان مظالم توڑے حتیٰ کہ مسجد بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان کے مال و اسباب لوٹ لئے اور انہیں عورتوں اور بچوں سمیت قیدی بنا کر عراق لے گیا۔ وہاں انہوں نے توبہ آہ و زاری کی اور اللہ تعالیٰ نے پھر ان کی پکار سُنی اور ان کی شان و شوکت عود کر آئی۔ فارسی بادشاہ سائرس نے انہیں قید سے نکالا اور مسجد بیت المقدس کی از سرِ نو مرمت و تعمیر کی۔

لیکن کچھ عرصہ بعد ان کی اندرونی خباثت و معصیت بھی لوٹ آئی اور دوبارہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔ چنانچہ بعض پیغمبروں کو قتل کیا اور بعض کی تکذیب کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر پہلے اہل فارس کو اور پھر رومیوں کو مسلط فرمایا جنہوں نے ان کی حکومت اور آزادی کو ختم کر دیا۔ کثیر منتہم کے لفظ نے بتایا کہ یہ سب لوگ اندھے بہرے نہیں ہوئے تھے بلکہ ان میں کچھ نیکوکار اور فرمانبردار بھی موجود رہے۔ مگر اجتماعی اور قومی معاملات میں اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ غالب اور اکثر کو دیکھتا ہے، اور جب گناہوں اور نافرمانیوں کی کثرت ہو جائے تو اکثریت کے ساتھ اقلیت بھی پس جاتی ہے:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً الآیۃ۔

ان آیات میں ایک طرف تو یہ حقیقت بیان فرمانا مدِ نظر ہے کہ بنی اسرائیل کا اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف بغض و عداوت اور اللہ کے رسولؐ سے اعراض ان کی تاریخ کا

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۶۴، ۱۶۵، تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۸۰، ۴۸۲

[2] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۳۴۵

Marfat.com

کوئی پہلا ہی واقعہ نہیں ہے۔ وہ پہلے پیغمبروں سے بھی یہی سلوک کر چکے ہیں۔ اور ان کی سرکشی و بغاوت بہت پرانی ہے۔ وہ ہمیشہ سے داعیانِ حق کے خلاف یہی کچھ کرتے آئے ہیں۔

اور دوسری طرف اہلِ اسلام کو بنی اسرائیل کا قصہ سنا کر یہ عبرت دلانا مدِ نظر ہے کہ کہیں وہ بھی یہود کی مانند راہِ حق سے منحرف نہ ہو جائیں کہیں ایک طویل عرصہ کے بعد ان کے دل بھی سخت نہ ہو جائیں، ہوا نفس ان پر بھی غلبہ نہ پالے اور وہ داعیانِ حق کے قتل و تکذیب پر کمر نہ باندھ لیں۔

آہ! کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ان سطور کے لکھنے والا بھی داعیٔ حق و صداقت ہونے کے جرم کی پاداش میں ظلم و استبداد کا شکار ہوا اور راہِ حق میں اُسے پھانسی دیدی گئی۔ (مؤلف)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ

بیشک کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ وہی مسیح ہے مریم

مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا

کا بیٹا اور مسیح نے کہا ہے کہ اے بنی اسرائیل

اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ

بندگی کرو اللہ کی جو میرا اور تمہارا رب ہے بیشک جس نے شریک ٹھہرایا

فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ

اللہ کا سو حرام کر دی اللہ نے اس پر جنت اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۭ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ

اور کوئی نہیں ظالموں کی مدد کرنے والا بیشک کافر ہوئے وہ جنہوں

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ

نے کہا کہ اللہ تین میں سے ایک ہے حالانکہ کوئی معبود

Marfat.com

إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ

نہیں سوائے ایک ہی معبود کے اور اگر وہ باز نہ آئے اس

لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٣﴾

بات سے جو کہتے ہیں تو یقیناً پہنچے گا ان میں سے کفر پر قائم رہنے والوں

أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ وَاللَّهُ

کو عذاب دردناک۔ وہ کیوں نہیں توبہ کرتے اللہ سے اور اس سے گناہ بخشواتے؟

غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٧٤﴾ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا

اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان نہیں مسیح مریم کا بیٹا مگر ایک

رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ وَأُمُّهُ

رسول گزر چکے ہیں اس سے پہلے بہت پیغمبر اور اس

صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انظُرْ كَيْفَ

کی ماں ولی ہے وہ دونوں کھانا کھاتے تھے دیکھ ہم کیسے

نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٧٥﴾

واضح کرتے ہیں ان کے لئے دلیلیں پھر دیکھ وہ کہاں الٹے جا رہے ہیں

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ

تو کہہ دے کیا تم بندگی کرتے ہو اللہ کے سوا اس کی

لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٧٦﴾

جو مالک نہیں تمہارے نقصان کا اور نہ نفع کا؟ اور اللہ وہی ہے سننے والا جاننے والا

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ

کہہ دو کہ اے کتاب والو مت مبالغہ کرو اپنے دین میں

Marfat.com

غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا
ناحق اور مت پیچھے چلو ایک قوم کی خواہشوں کے جو گمراہ ہوئے اس سے پہلے
مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ
اور گمراہ کیا بہتوں کو اور بھٹک گئے
سَوَآءِ السَّبِيْلِ ع ۱۰ ۱۱ ۱۴

سید علی رہ سے

لہ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ . . . . مِنْ اَنْصَارٍ : یہود کے بعد اب نصاریٰ کے ایمان باللہ کی کیفیت بیان کی جاتی ہے کہ وہ کہاں تک حقانیت کے اس معیار پر پورے اترے۔ اُن کے خدا پر ایمان کا یہ حال ہے کہ عقل کے خلاف فطرتِ سلیمہ کے خلاف اور خود حضرت مسیحؑ کی تصریحات و احکام کے خلاف مسیحؑ ابن مریم کو خدا بنا ڈالا" ایک ہیں تین" اور "تین میں ایک" کی بھول بھلیاں تو محض برائے نام ہے حقیقتہً سارا زور صرف حضرت مسیحؑ کی الوہیت کو ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے۔ حالانکہ خود حضرت مسیحؑ خدا کی ربوبیت اور دوسروں کی مانند اپنے بندہ ہونے کا اعلانیہ اعتراف فرما رہے ہیں۔ اور جس برائی میں ان کی اُمت مبتلا ہونے والی تھی اُس کی بُرائی کس زور شور سے بیان کر رہے ہیں۔ پھر بھی ان دل کے اندھوں کو عبرت حاصل نہیں ہوتی۔

مؤلف عرض کرتا ہے کہ موجودہ محرّف اور خود ساختہ انجیلوں میں بھی حضرت مسیحؑ کی بندگی اور عاجزی اور بار بار مسیحؑ کے ابن آدم ہونے کا اعتراف موجود ہے اور کہیں بھی صراحتہً حضرت مسیحؑ سے اپنے خدا ہونے کا اعلان موجود نہیں ہے۔ پھر بھی نصاریٰ کو ضد ہے کہ وہ چاہے لاکھ بار اپنی بندگی و عاجزی کا اعلان و اعتراف کرے۔ مگر پھر بھی وہ ہے۔ خدا یا خدا کا اکلوتا بیٹا! معاذ اللہ۔

لقد کفر الذین قالو . . . ثلاثۃ : عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ، روح القدسؑ اللہ اللہ یا مسیحؑ، مریم اور اللہ یہ تینوں خدا ہیں۔ العیاذ باللہ۔ ان میں ایک حصّہ دار اللہ ہوا۔ پھر وہ تینوں ایک ہے اور ایک تین ہیں۔ نصاریٰ کا عام عقیدہ یہی ہے اور اس خلافِ

لہ فوائد القرآن ص ۱۵۵، ۱۵۶

Marfat.com

عقل و بداہت عقیدہ کو گول مول اور پیچ دار عبارتوں سے ادا کرتے ہیں اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ تو اس کو ایک ماوراء العقل حقیقت قرار دیتے ہیں سچ ہے کہ ؎

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

افلا یتوبون . . . غفور رحیم : یہ اسی غفور رحیم کی شان ہے کہ ایسے ایسے باغی اور گستاخ مجرم بھی جب شرمندہ ہو کر اصلاح کا عزم کر کے حاضر ہوں تو ایک منٹ میں عمر بھر کے جرائم معاف فرما دیتا ہے۔

ما المسیح ابن مریم الا رسول الخ یعنی مسیح بھی اس مقدس و معصوم جماعت کے ایک فرد ہیں۔ جنہیں رسولوں کی جماعت کہا جاتا ہے۔ پھر انہیں خدا بنا لینا تمہاری سفاہت ہے۔

و امہ صدیقہ : جمہور امت کی تحقیق یہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آئی۔ یہ منصب مردوں کے لئے مخصوص ہے وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم من اھل القریٰ (یوسف ع ۱۲) حضرت مریم بتول بھی ایک ولی بی بی تھیں نبی نہیں۔

کانا یاکلان الطعام . . . یؤفکون = ذرا غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہے وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے۔ زمین، ہوا، پانی، سورج، حیوانات حتیٰ کہ میلے اور کھاد سے بھی اسے استغناء نہیں ہو سکتا۔ غلہ کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے۔ پھر کھانے سے جو اثرات و نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے؟ احتیاج و افتقار کے اس طویل الذیل سلسلے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم الوہیت مسیح و مریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں۔ کہ مسیح اور مریم اکل و شرب کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے جو مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے۔ اور جو اکل و شرب سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی چیز سے مستغنی نہیں ہوتا۔ پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنی بقاء میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ خدا کیونکر بن سکتی ہے۔ یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی کھانا پینا الوہیت کے منافی ہے اگرچہ نہ کھانا الوہیت کی دلیل نہیں ورنہ سارے فرشتے خدا بن جائیں۔ معاذ اللہ

قل اتعبدون . . . السمیع العلیم : جب مسیح کو خدا کہا تو لازم ہے کہ

معبود بھی کہو۔ مگر معبود بننا صرف اسی ذات سے خاص مختص ہے جو ہر قسم کے نفع و ضرر کا مالک اور پورا با اختیار ہو کیونکہ عبادت انتہائی تذلل کا نام ہے اور انتہائی تذلل، اس کے

Marfat.com

سامنے اختیار کر سکتے ہیں جو انتہائی عزت اور غلبہ رکھنے والا، ہر آن سب کی سننے والا اور سب کے احوال کا پوری طرح جاننے والا ہو۔ اس میں تثلیث کے عقیدۂ شرکیہ کے ساتھ تمام مشرکین کا رد ہو گیا۔

لاتغلوا فی دینکم :۔ عقیدہ کا مبالغہ یہ ہے کہ ایک مولود بشر کو خدا بنا دیا۔ اور میں غلو وہ ہے جسے رہبانیت کہتے ہیں ورھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبتھا علیھم (الحدید ع) یہود کی جو قبائح بیان کی جا چکی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا پرستی میں غرق ہونے کی وجہ سے دین اور دینداری کی ان کے یہاں کوئی عظمت و وقعت نہ تھی حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی اہانت و قتل وغیرہ اس قوم کا شیوہ تھا۔ برخلاف اس کے نصاریٰ نے تعظیم انبیاء میں اس قدر غلو کیا کہ ان میں سے بعض کو خدا بنا ڈالا خدا کا بیٹا کہنے لگے اور ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی۔

ضلوا عن سواء السبیل :۔ یعنی اصلی انجیل وغیرہ آسمانی کتب میں اس عقیدہ شرکیہ کا کہیں پتہ تک نہ تھا۔ بعد میں یونانی بت پرستوں کی تقلید میں پولوس نے ایجاد کیا ہے، اور نہ اسی پر چل پڑے ہیں اور پھر اسی پر جمے رہے ہیں۔ ایسی اندھی تقلید سے نجات کی توقع رکھنا عبث ہے اور کسی عاقل کو زیبا نہیں۔

حافظ عمادالدین ابن کثیر نے امہ صدیقہ کا معنیٰ لکھا ہے کہ عیسیٰ کی والدہ مومنہ اور سچائی والی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ نبیہ نہ تھیں۔ یہ مقام وصف تھا تو ان کا جو بہترین وصف تھا وہ بیان کر دیا۔ اگر نبی ہوتیں تو اس کا بہترین موقعہ یہی تھا اور اس وصف کا بیان کرنا یہاں نہایت ضروری تھا۔

لاتغلوا فی دینکم :۔ یعنی اتباع حق کی حدوں سے مت بڑھو جس کی توقیر کرنے کا جتنا حکم ہے اتنی ہی اس کی توقیر کرو۔ انسانوں کو جنہیں خدا نے نبوت دی۔ نبوت کے درجے سے خدائی کے درجے تک نہ پہنچاؤ جیسے کہ تم جناب مسیح کے بارے میں غلطی کر رہے ہو اور اس کی کوئی وجہ نہیں۔ بجز اس کے کہ تم اپنے پیروں، مرشدوں، استادوں اور اماموں کے پیچھے لگ گئے ہو۔ وہ خود ہی گمراہ ہیں بلکہ گمراہ کن ہیں۔ استقامت اور عدل کے راستے چھوڑے ہوئے انہیں زمانہ گزر گیا۔ ضلالت اور گمراہیوں میں مبتلا ہوئے عرصہ ہو گیا۔

انجیل مرقس باب ۱۲ میں حضرت مسیح کا ایک قول درج ہے کہ سب حکموں سے اول یہ ہے

تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۲۴ تفسیر حقانی ج ۴ ص

Marfat.com

کہا ہے اسرائیل سن وہ خداوند جو ہمارا خدا ہے ایک ہی خداوند ہے اور تو اپنے خداوند کو دل و جان اور عقل و قوت سے پیار کر۔ اس کے علاوہ انجیلوں سے حضرت مسیحؑ کا عبادت کرنا اور روزہ رکھنا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ خدا ہوتے تو عبادت کس طرح کرتے؟ اور کس کی کرتے؟

مسیحؑ میں اور رسولوں کی نسبت کوئی بات زائد نہ تھی۔ معجزے دوسرے پیغمبروں نے بھی دکھائے۔ رہا بلا باپ پیدا ہونا تو آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ کتاب سلاطین اول باب ۱۷ میں حضرت الیاسؑ کا مردہ زندہ کرنا مذکور ہے۔ پس یہ بھی خدائی کی دلیل نہ ہوئی۔ اور موجودہ بائبل کی کتابوں میں خدا کے بیٹے کا اطلاق بہت سوں پر ہوا ہے۔ اس سے بھی مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہ نکلی۔ کتاب پیدائش باب ۵ میں نصوح کا آسمانوں پر اٹھایا جانا اور سلاطین باب ۲ میں حضرت الیاسؑ کا رفعِ آسمانی مذکور ہوا ہے پس یہ بھی خدائی کی دلیل نہ رہی۔

لہ انجیل یوحنا میں ہے کہ "یہی ابدی زندگی ہے کہ وہ تجھے پہچانیں کہ تو ہی اکیلا حقیقی خدا ہے اور یسوع مسیحؑ کو پہچانیں جسے تو نے بھیجا ہے" اس سے ثابت ہوا کہ دراصل مسیحؑ کا دین توحیدِ محض پر مبنی ہے۔ اور یہی خدا کا دین ہے۔ جو اس نے تمام انبیاء کی معرفت بھیجا تھا۔

انہ من یشرک باللہ الخ یعنی خدا کا شریک کسی کو بھی ٹھہرائے، فرشتہ ہو، انسان ہو، ستارہ ہو یا کوئی پتھر وغیرہ ہو، جو بھی ان میں سے کسی کو خدا کا شریک و ہمسر یا متحد مانے یا اسے نفع یا ضرر کے لئے پکارے یا اسے خدا کے قرب کا ذریعہ مان کر درمیان میں رکھے اور اسے سفارشی مانے کہ وہ اللہ کی مرضی میں دخیل ہے جو بھی ایسا کرے۔ وہ مشرک ہے اور اس پر جنت حرام ہے۔

عیسائیوں نے تثلیث کا عقیدہ پرانے زمانے کے بت پرست مشرکوں سے اخذ کیا تھا۔ پہلے پہل ان میں تین فرقے تھے۔ ایک کا عقیدہ تھا کہ خدا کا عقیدہ تھا کہ خدا تین میں سے ایک ہے۔ دوسرے کا عقیدہ تھا کہ خدا مسیحؑ بن مریم ہے اور تیسرا مسیحؑ کو ابن اللہ کہتا تھا خدا نہیں۔

پچھلے عیسائیوں نے ان تمام عقائد کو ملا جلا دیا ہے۔ اور اب عام عیسائیوں کا عقیدہ یہی ہے کہ مسیحؑ خدا ہے، ابن اللہ بھی ہے اور تین میں ایک اور ایک میں تین بھی ہے۔

ان آیات میں یہ دلیلِ توحید بھی دی گئی ہے کہ مسیحؑ صرف رسول تھا۔ اور اس کی ماں پاکباز مومن عورت تھی۔ ان دونوں کی جنسی اور نوعی حقیقت دوسرے افرادِ انسانی سے مختلف نہ تھی۔ انہیں بھی کھانے پینے کی حاجت تھی اور اس کے نتائج مثلاً فضلات وغیرہ کے خارج ہونے کی بھی احتیاج تھی۔ یہ بالکل سفاہت ہے کہ انسان اپنے آپ کو حقیر جان کر اپنے

لہ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۶۵، ۱۶۸، تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۸۲، ۴۸۹

Marfat.com

جیسے دوسرے انسانوں کو خدا اور معبود مان لے۔

عیسیٰؑ اپنے نفع و ضرر کا مختار نہ تھا ورنہ یہودیوں کی ایذاء اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچا لیتا۔ بلکہ اپنے حواریوں کو باوجود شدید محبت کے وہ یہودیوں کے مکر و فریب اور ایذاء رسانی سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ پس وہ خدا کیونکر ہو سکتا ہے۔

غلو کا معنیٰ ہے افراط اور حد سے تجاوز سواء السبیل سے مراد اسلام ہے جو یہود کی تفریط اور عیسائیوں کی افراط سے پاک ہے یہود نے مسیحؑ کی دشمنی میں ان پر بڑے بڑے گھناؤنے الزام اور بہتان لگائے تھے اور ان کے درپے آزار رہے تھے۔ ان کے بالمقابل عیسائیوں نے مسیحؑ کو خدا بنا ڈالا تھا۔ اور حدود شرع سے تجاوز کر گئے تھے یہ دونوں فریق حدِ اعتدال سے نکل گئے تھے، اسلام دونوں کی اصلاح کرتا ہے۔

[1] نوفل بن نعمت اللہ بن جرجس عیسائی اپنی کتاب "فتنہ سلیمان" میں لکھتے ہیں کہ نصاریٰ کا عقیدہ مختلف کلیساؤں کی نسبت سے مختلف نہیں ہے بلکہ وہ اصل دستور ہے جسے ناؤسیہ کی مجلس نے بیان کیا تھا کہ ایک خدا پر ایمان لانا واجب ہے۔ جو یسوع مسیح ہے، اکلوتا بیٹا ہے اور کائنات سے پہلے "مولود" ہوا تھا۔ وہ برحق خدا برحق خدا سے ہے۔ مولود ہے مگر غیر مخلوق، جوہر میں باپ کے مساوی ہے۔ ہر چیز اسی سے پیدا ہوئی۔ وہ انسانوں کی وجہ سے اور ہمارے گناہوں کے باعث آسمان سے اترا اور روح القدس سے جسم میں آیا اور مریمؑ کنواری سے پیدا ہوا اور ہمارے لئے پیلاطوس یہودی کے عہد میں صلیب پر لٹکایا گیا۔ اس نے دکھ جھیلا اور قبر میں گیا۔ اور کتابوں کے مطابق تیسرے دن مُردوں میں سے جی اٹھا، آسمان پر چڑھ گیا اور رب کے داہنے ہاتھ جا بیٹھا۔ اور پھر وہ مُردوں اور زندوں کی جزا و سزا کے لئے آئے گا۔ اس کی حکومت کو فنا نہیں اور روح القدس پر ایمان لانا بھی واجب ہے جو رب ہے، زندہ کرنے والا ہے اور باپ سے پھوٹتا ہے، وہ بیٹے کے ساتھ ہے اسے سجدہ کرتا ہے اور نبیوں کے ساتھ بولتا ہے۔

ڈاکٹر لوسٹ "کتاب مقدس کی تاریخ" میں لکھتے ہیں کہ:۔

اللہ کی طبیعت تین مساوی اقانیم (ارکانِ اجزاء) سے عبارت ہے، اللہ باپ، اللہ بیٹا اور اللہ روح القدس۔ پس خلق ابن کے واسطہ سے باپ تک منتہی ہوتی ہے اور روح القدس تک پاک کرنا منتہی ہوتا ہے۔

چونکہ یہ "ایک تین" اور "تین ایک" کا قضیہ عقل کے صریحاً خلاف تھا لہٰذا عیسائی عالموں

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۲ ص ۲۴۶۔ ۲۵۱

Marfat.com

نے اس چیز کو بھانپ کر اُسے عقل سے ماوراء قرار دیا اور اس میں عقل و فکر دوڑانا ناجائز ٹھہرایا۔ پادری "پیٹر" نے رسالہ "اصول و فروع" میں لکھا ہے کہ ہم نے اپنی عقل کے موافق اس عقیدے کو جو سمجھا ہے وہ یہی ہے اور اُمید ہے کہ آئندہ زمانے میں جب زمین و آسمان کے پردے اُٹھ جائیں گے تو اس عقیدے کو زیادہ وضاحت سے سمجھ سکیں گے۔ موجودہ وقت میں جو کچھ ہم نے سمجھا ہے۔ لبس اسی قدر کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان تمام عقائد اور مقولوں کو کفر و شرک قرار دیا ہے اور ان آیات میں ان کا ردّ کیا ہے اور مسیحؑ اور ان کی والدہ کی بشریت و احتیاج پر ان کے کھانے پینے کو بطور دلیل پیش فرمایا ہے کیونکہ جو اپنی زندگی کو بچانے کے لیے کھانے کا محتاج ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ خدا تو بذاتہٖ زندہ اور قائم ہے، اُسے کوئی حاجت لائق نہیں ہوتی۔ قرآن کی یہ دلیل نہایت ہی بصیرت افروز اور عقلی و علمی ہے۔

اَنّٰی یُؤْفَکُوْن کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ مسیحؑ کی بشری زندگی اُس کو خدا بنانے والوں اور "لاہوت و ناسوت" کے چکّر میں پڑنے والوں کے لئے سخت پریشانی اور مصیبت کا باعث بنی۔

مالا یملک: یہاں من کی بجائے ما کا لفظ اس لئے رکھا گیا ہے کہ تمام باطل معبود اس میں داخل ہو جائیں اور عیسیٰؑ، روح القدسؑ اور مریمؑ کے علاوہ بھی جس قدر مخلوق کو جس کسی نے بھی معبود و الٰہ بنایا ہے وہ اس میں آجائے۔

اور اپنی ذاتِ اقدس کے لئے سمیع و علیم کی صفات بیان فرمائیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری مخلوقات عاجز ہے کسی کے نفع و ضرر کی مالک نہیں مگر اللہ سمیع و علیم ہے۔ اس لئے نافع و ضار ہے اور یہ خصوصیت صرف معبودِ واحد میں ہے۔

ان آیات میں تین حقائق بیان ہوئے ہیں:-

۱۔ اہلِ اسلام کو اہلِ کتاب کے سامنے توحیدِ خالص پیش کرنے اور ان کے گندے عقائد کی تصحیح کے لئے پوری جدوجہد کرنا واجب ہے۔

۲۔ الوہیت مسیحؑ یا تثلیث کے قائل کافر ہیں۔ کسی مسلمان کا کام نہیں کہ انہیں کسی طرح بھی دین پر جانے۔ یہ اقوال سراسر باطل ہیں۔

۳۔ مومن و کافر کے درمیان موالات و محبّت کا سوال کسی طرح بھی پیدا نہیں ہوتا۔ پس وحدتِ ادیان کا عقیدہ باطل ہے اور اسی طرح الحاد کے خلاف "متحدہ محاذ" کا تصوّر بھی سراسر غلط اور محض دھوکا ہے۔

Marfat.com

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى

ملعون ہوئے کافر بنی اسرائیل میں کے

لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ

داؤدؑ کی زبان پر اور عیسیٰؑ مریم کے بیٹے کی زبان پر

بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا

یہ اس لئے کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے گزر گئے تھے۔ آپس میں منع نہ کرتے

يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا

تھے۔ اس برائی سے جس کو کر رہے تھے۔ کیا ہی برا کام ہے

كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۷۹ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ

جو کرتے تھے تو دیکھتا ہے ان میں سے بہت کو کہ

يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا

دوستی کرتے ہیں کافروں سے کیا ہی برا

قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ

سامان بھیجا انہوں نے اپنے لئے وہ یہ کہ اللہ ناراض ہوگیا ان

عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۸۰

سے اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ

اور اگر وہ یقین رکھتے اللہ پر اور نبی پر اور جو

Marfat.com

اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ

اس پر اتر تو وہ انہیں دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾

بہت سے لوگ نافرمان ہیں۔

لہٰذا تو تمام آسمانی کتابوں میں کافروں پر لعنت کی گئی ہے، لیکن بنی اسرائیل کے کافروں پر جب وہ نافرمانی اور سرکشی میں حد سے گزر گئے کہ نہ مجرم کسی طرح ارتکابِ جرائم سے باز آتا تھا نہ غیر مجرم اُسے روکتا تھا۔ بلکہ سب شیر و شکر ہو کر آپس میں ہم پیالہ و ہم نوالہ بنے ہوئے تھے۔ منکرات و فواحش کا ارتکاب کرنے والوں پر کسی طرح کے انقباض تکدّر اور ترشروئی کا اظہار بھی نہ ہوتا تھا، تب خدا نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی زبان سے اُن پر لعنت فرمائی۔ جیسے گناہوں پر ان کی جسارت حد سے گزر چکی تھی۔ یہ لعنت بھی جو ایسے جلیل القدر انبیاء کے توسط سے کی گئی غیر معمولی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی۔ غالباً اسی لعنت کے نتیجہ میں اُن میں سے بہت سے افراد ظاہراً و باطناً بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے اور باطنی مسخ کا دائرہ تو اس قدر وسیع ہوا کہ ان میں کے بہت سے لوگ آج بھی مسلمانوں کو چھوڑ کر جو خدا کی کتبِ سماویہ اور تمام انبیاء کی تصدیق و تعظیم کرتے ہیں۔ مشرکین مکہ سے جو خالص بت پرست ہیں مسلمانوں کے خلاف دوستی گانٹھتے ہیں۔ اگر ان اہل کتاب کو خدا پر اور وحیٔ الٰہی پر واقعی اعتقاد ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ اُس قوم کی ضد میں جو مکمل طور پر ان تمام چیزوں کو مانتے ہیں، بت پرستوں سے ساز باز کرتے یہ بیحسی بدمذاقی اور خدا پرستوں سے بھاگ کر بت پرستوں سے دوستی کرنا اُسی لعنت اور پھٹکار کا اثر ہے جس نے انہیں خدا کی رحمتِ عظیمہ سے دور پھینک دیا ہے۔

پچھلی آیات میں اُن کی گزشتہ کفریات و جرائم کو بیان کر کے دین میں غلو کرنے اور گمراہوں کی کورانہ تقلید کرنے سے منع فرمایا تھا تاکہ اب اپنی ان ملعون حرکات سے تائب ہو کر حق و صداقت کے راستہ پر چلنے کی کوشش کریں اس رکوع میں ان کی موجودہ حالت پر متنبہ کرتے ہوئے بتلایا کہ جو لعنت داؤدؑ اور مسیح علیہ السلام کی زبانی ہوئی تھی۔ اُس کے آثار آجتک موجود ہیں۔ اہل اللہ اور عارفین سے نفرت و عداوت اور جاہل مشرکوں

لہٰذا فوائد القرآن ص۱۵۶

Marfat.com

سے محبت یہ کھلی دلیل اس کی ہے کہ ان کے قلوب خدا کی لعنت کے اثر سے بالکل مسخ ہو چکے ہیں۔ اگر اب بھی انہوں نے اپنی حالت کو نہ سنبھالا اور حق کی طرف رجوع نہ کیا تو ایسی شدید لعنت کے مورد بنیں گے جو خدائے تعالےٰ سید الانبیاء خاتم المرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان پر لعنت بھیجے گا۔

احقر مؤلف عرض کرتا ہے کہ صحاح میں حضورؐ کی زبان مبارک سے لعن اللہ الیھود والنصاریٰ کے الفاظ کئی جگہ منقول ہیں بالخصوص وفات شریف سے کچھ عرصہ قبل حضورؐ نے قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانے کے تاکیدی حکم کے سلسلے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ اور حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی اوپر درج کردہ عبارت میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ان میں کے بہت سے افراد ظاہراً و باطناً بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے۔" شاید موجودہ زمانے کے "اہل کتاب" کی ان دو نجس جانوروں سے بے پناہ محبت اور ان سے خصوصی تعلق میں اس مسخ کا بھی کچھ اثر پایا جاتا ہو واللہ اعلم

کانوا لا یتناھون الخ اس لفظ یتناھون کے دو معنی ہو سکتے ہیں: (۱) نہیں رکتے تھے (کما فی روح المعانی) (۲) نہیں روکتے تھے (کما ھو المشھور) جب بدی کسی قوم میں پھیلے اور کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہ ہو تو عذاب عام کا اندیشہ ہے (جیسا کہ صحیح احادیث میں آچکا ہے!)

یتولون الذین کفروا: کافروں سے مراد مشرکین ہیں اور ان کا مصداق یہود مدینہ تھے۔ جنہوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر اور سازش کر کے مسلمانوں سے لڑائی کی ٹھانی تھی۔

مؤلف عرض کرتا ہے کہ اسلام کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کافروں، مشرکوں اور بت پرستوں سے گٹھ جوڑ کئے رکھا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک و ہند جنگ میں بھی یہ حقیقت عالم آشکارا ہو چکی ہے۔ اور ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ نے تو دوپہر کے سورج کی مانند یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف سارا کفر "ملت واحدہ" ہے کاش ہم اب بھی عبرت حاصل کریں۔

لبئس ما قدمت لھم انفسھم: یعنی مرنے سے پیشتر آخرت کے لئے جو ذخیرۂ اعمال یہ لوگ بھیج رہے ہیں وہ ایسا ہے جو ان کو غضب الٰہی اور عذاب ابدی کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

لو کانوا یؤمنون باللہ والنبی الخ النبی سے مراد بعض مفسرین نے حضرت

Marfat.com

موسیٰؑ کو اور بعض نے جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر ان یہود کو واقعی یقین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور تعلیمات پر ہوتا تو نبیؐ آخرالزمان کے مقابلہ میں جن کی بشارت خود موسیٰ علیہ السلام نے دی ہے، مشرکین سے دوستی نہ کرتے۔ بایں کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مخلصانہ ایمان لے آتے تو ایسی کمینہ حرکت ان سے سرزد نہ ہوتی کہ دشمنانِ اسلام سے ساز باز کریں اس دوسری تقدیر پر آیت یہود منافقین کے حق میں ہوگی۔

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ : خدا کی اور خود اپنے تسلیم کردہ پیغمبر کی نافرمانی کرتے کرتے یہ حالت ہوگئی کہ اب موحدین پر مشرکوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ افسوس! کہ آجکل ہم بہت سے نام نہاد مسلمانوں کی حالت بھی یہی پاتے ہیں کہ مسلمان اور کفار کے مقابلہ کے وقت کافروں کو دوست بناتے اور انہی کی حمایت و وکالت کرتے ہیں ع

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

لہ مولانا عبدالحق حقانی فرماتے ہیں کہ جمہور مفسرین کے نزدیک بنی اسرائیل کے سرکشوں پر داؤد علیہ السلام کی زبان سے لعنت کرنے سے مراد اصحاب السبت پر لعنت کرنا ہے۔ جنہوں نے ہفتہ کے روز ایلیہ کے قریب سمندر کے کنارے داؤد علیہ السلام کے زمانے میں خلافِ شرع شکار کیا۔

(قرآن میں ہے کما لعنا اصحٰب السبت) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ان یہود پر لعنت ہوئی جو مائدہ کا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔

لایتناھون کا معنیٰ ایک تو یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو منع کرتے تھے۔ اور نہ خود رکتے تھے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جس برے کام میں پڑتے اُسے آخری حد تک پہنچا کر ہی دم لیتے تھے اس میں کوئی کمی نہ کرتے تھے۔ گویا محاورے کی زبان میں "برائی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے"۔

مسند احمد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل میں پہلے پہل جب گناہ گاریاں شروع ہوئیں تو ان کے علماء نے انہیں روکا لیکن جب دیکھا کہ باز نہیں آتے تو انہوں نے ان سے تعلق نہ چھوڑا بلکہ انہی کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے دل ایک دوسرے سے بھڑا دیئے اور سب کو ایک جیسا کر دیا۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ان پر لعنت کی کیونکہ وہ نافرمان اور ظالم تھے۔ حدیث کے بیان کے وقت حضورؐ تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ لیکن اب ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا نہیں نہیں۔ خدا کی قسم تم لوگوں کو ضرور ہی خلافِ شرع باتوں سے روکو اور شریعت کی پابندی پر لاؤ۔

لہ تفسیر حقانی ج ۴ ص ۵۱ سہ تفسیر ابن کثیر پ ۶ ص ۱۲۶ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

ابوداؤد وغیرہ میں اس حدیث کے آخر میں ہے کہ اگر تم ایسا نہ کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے دل بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بھڑا دے گا۔ یعنی سب ایک جیسے ہو جاؤ گے اور تم پر بھی اپنی پھٹکار نازل فرمائے گا۔ جیسا کہ ان پر نازل فرمائی۔ مسند احمد اور ترمذی میں حدیث ہے کہ یا تو تم بھلائی کا حکم اور برائی سے منع کروگے۔ یا اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے کوئی عذاب بھیج دے گا۔ پھر تم اس سے دعائیں بھی کروگے۔ تو وہ قبول نہ فرمائے گا۔ اور بہت سی صحیح احادیث میں اسی مضمون کو مختلف الفاظ اور عنوانوں سے بیان فرمایا گیا۔ ابن ماجہ میں ہے کہ حضورؐ نے خطبے میں ارشاد فرمایا: خبردار! کسی شخص کو لوگوں کی ہیبت حق بات کہنے سے روک نہ دے۔" ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ افضل جہاد ظالم حاکم کے روبرو کلمۂ حق کہنا ہے۔

[1] برائی سے روکنا دین کی حفاظت کا باعث ہے اور آداب و فضائل کے پنپنے کا ذریعہ ہے۔ جب بدمعاش اور غنڈہ عناصر اپنے فسق و فجور کا برسرِ عام اظہار و اعلان شروع کر دیں اور عوام انہیں دیکھیں تو انہی کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور برائی کی قباحت ان کے دلوں سے زائل ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان کی عادت بن جاتی ہے۔ پھر دین کا تسلط ان کے دلوں سے جاتا رہتا ہے اور اس کے احکام و نواہی کو پسِ پشت پھینک دیتے ہیں۔ خطیب بغدادیؒ نے ابوسلمہ سے ان کے باپ کی سند سے حدیث روایت کی ہے کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ میری امت کے کچھ لوگ اپنی قبروں سے بندروں اور خنزیروں کی صورت میں اٹھیں گے۔ کیونکہ انہوں نے گنہگاروں کے ساتھ مداہنت کی تھی اور طاقت رکھتے ہوئے بھی انہیں باز رکھنے سے رُکے ہوئے تھے۔

[2] ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر و معصیت اور لعنت میں بنی اسرائیل کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اور جو پیغمبر اُن کی ہدایت اور بچاؤ کے لئے بھیجے گئے تھے۔ انہوں نے ہی آخرکار ان پر لعنت اور پھٹکار برسائی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا سُن لی تھی اور اپنا غضب اور لعنت بنی اسرائیل پر لکھ دی تھی۔ اور یہ "بنی اسرائیل کے کافر" وہی تھے۔ جنہوں نے ان کی کتابوں میں ادل بدل کیا تھا اور شریعتِ خداوندی کو حاکم اور فیصلہ کن نہیں بنایا تھا۔ قرآن کے متعدد مقامات پر ــــ اس سورت میں اور دوسری جگہ ــــ یہ مضمون موجود ہے۔

آیات سے معلوم ہوا کہ منفیت اور عدوان انفرادی اور اجتماعی طور پر بنی اسرائیل

---

[1] تفسیر المراغی ج ۶ ص ۱۷۱، ۱۷۳، تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۸۹، ۴۹۲

[2] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۲۵۲ - ۲۶۲

Marfat.com

میں گھر گئے تھے اور اُن کا وطیرہ بن چکے تھے۔

برائی اور تعدّی اچھے اور بُرے دونوں قسم کے معاشروں میں ہوتی ہے کیونکہ زمین پر کوئی معاشرہ شر و فساد سے بالکل ہی خالی نہیں ہوتا لیکن ایک صالح معاشرہ کا مزاج اور طبیعت برائی اور شر کو برداشت نہیں کرتے۔ ایسے معاشرے میں برائی کرنا نیکی کی نسبت مشکل تر ہوتا ہے۔ کیونکہ ساری جماعت اور معاشرہ اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اسے پنپنے کا موقع نہیں دیتے۔ ایسے معاشرے میں شر و فساد سُکڑ جاتے ہیں اور اس کے اسباب کم سے کم رہ جاتے ہیں۔ معاشرہ مرکزی لحاظ سے مضبوط رہتا ہے اور اس میں انتشار پھیل نہیں سکتا۔ برائیاں صرف چند افراد یا گروہوں تک محدود رہتی ہیں اور معاشرہ انہیں دھکیلتا اور رگیدتا رہتا ہے۔ پس بے حیائی نہیں پھیل سکتی۔

اسلامی نظام مسلم معاشرے سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اُس کی مرکزیت زندہ و پائندہ اور مضبوط رہے اور ظلم و عدوان کے خلاف ہر وقت تیار رہے۔ اگر کوئی دراڑ نظر آئے اُسے فوراً پُر کر دے تاکہ برائی عام نہ ہو پائے۔ یہ فریضہ سب سے زیادہ علماء و مشائخ اور دین کی دعوت دینے والوں پر عائد ہوتا ہے کہ جس امانت کا انہیں نگران بنایا گیا ہے اُسے ادا کرتے رہیں۔ اور شر و فساد اور ظلم و تعدّی کے خلاف چوکس رہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں۔ چاہے برائی مسلّط شدہ حکام کی طرف سے آئے، چاہے مالداروں کی طرف سے، چاہے شریر انسانوں کی طرف سے ہو اور چاہے ہوا پرست عوام کی طرف سے۔ اس امانت کی ادائیگی اگر صحیح طور پر نہ ہو تو عذابِ عام کا اندیشہ قوی ہے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی صرف نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کر دینے سے ہی ادا نہیں ہو جاتی بلکہ اصرار و تشدید مطلوب ہے، طاقت کا استعمال مقصود ہے اور مقاطعہ بھی حسبِ ضرورت واجب ہے۔

اسلامی معاشرہ میں یہ چیز ہرگز قابلِ برداشت نہیں کہ برائی کو دیکھ کر کوئی شخص کہہ دے "مجھے کیا"؟ کیونکہ یہ چیز غیرتِ حق کے خلاف ہے۔ رُوحِ خیر و صلاح کے خلاف ہے۔ اجتماعی عدل اور تقاضائے حقوق العباد کے خلاف ہے" امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ایک اسلامی معاشرے میں انفرادی کوشش کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کوشش تو عوام کے شور و غل میں ضائع ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ ایک اجتماعی عمل اور جماعتی فریضہ ہے۔ جس کی پشت پر ساری اُمّت کی اخلاقی اور دینی حِس کا بوجھ ہوتا ہے۔ فسق و فجور اور معصیت اسلامی معاشرے میں شخصی اور انفرادی معاملات نہیں ہوتے۔ جیسا کہ آجکل بعض "روشن خیال" لوگوں

Marfat.com

کی رائے ہے۔

اس سلسلے میں پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک متفق علیہ معیار و میزان پر متفق ہو۔ جزئیات میں نیکی پھیلانے اور برائی کو روکنے کا کام اُس وقت تک بیکار ہے، جب تک یہ بنیاد ثابت و قائم نہ ہو۔ یہ معیار اور ترازو "سلطان الٰہی" (اقتدار اسلام) ہے۔ جب یہ مسلّم ہو جائے تو فروعات کا معاملہ آسان ہو جاتا ہے ورنہ ایک آدمی ایک برائی کو برائی کہے گا، تو دس اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے اور کہیں گے کہ یہ "منکر" نہیں ہے۔ پس جب تک اسلامی معاشرہ اپنی اصل بنیاد پر قائم نہ ہو، فروع میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، بیکار ہے

بطور مثال جس معاشرے کی بنیاد "سود خوری" پر رکھی گئی ہو اس میں لوگوں کو حرام خوری سے روکنا ایک مذاق سے کم نہیں۔ جس سوسائٹی کی معیشت کی بنیاد ہی حرام پر ہو وہاں فروعی چیزوں کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اور ایسے میں افراد حرام خوری سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ اسی طرح جس معاشرے میں زنا کو قانونی طور پر برائی نہ سمجھا جاتا ہو اور صرف اس کی بعض صورتوں کے خلاف (مثلاً زنا بالجبر) پر ہی قانون سازی کی گئی ہو ایسی سوسائٹی کو زنا سے کیونکر بچایا جا سکتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جس معاشرے میں شراب بنانا اور بیچنا جائز ہو اس میں نشہ آور اشیاء سے لوگوں کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔

پس اصل سوال شاخوں کا نہیں، جڑ کا ہے، فروع کا نہیں اصل کا ہے۔ پہلے ایک اصول پر معاشرے کی بنیاد رکھیئے۔ اس کے بعد حکمت سے اس کے مطابق عمل درآمد کیجئے۔ جس معاشرے کی بنیاد حق و ہدایت اور خیر پر نہ ہو وہاں نیکیاں پھیل نہیں سکتیں نہ برائیاں مٹ سکتی ہیں۔ اور آخر کار وہی حالت ہو جاتی ہے، جس میں بنی اسرائیل لعنت کے مستحق ہوئے تھے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی کافروں سے موالات کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ بات جس طرح کل حق تھی اسی طرح آج بھی ثابت ہے۔ اور اسی طرح اہل کتاب کے دوسرے فریق (نصاریٰ) پر بھی ثابت ہے۔ دنیا کا چپہ چپہ اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر گواہ ہے۔ اسرائیل کی سلطنت کا قیام فلسطین میں نصاریٰ، کمیونسٹ اور دیگر کفار کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ سے عمل میں آیا ہے۔ عیسائی آج دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف کمیونسٹوں کے خلاف اتحاد کر رہے ہیں۔

Marfat.com

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے :-

۱- سب اہلِ کتاب (باستثنائے چند جو حضورؐ پر ایمان لے آئے تھے یا اب لائیں گے) خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ حضورؐ پر ایمان نہیں لائے۔ اس حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا ہے :-

لوکانوا یومنون باللّٰہ والنبی وما انزل الیہ ما اتخذوھم اولیآء

۲- سب اہلِ کتاب کو دینِ الٰہی میں داخل ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ جب تک وہ ایسا نہ کریں اپنی "خاص صفات" سے خالی نہیں ہو سکتے۔

۳- مسلمانوں اور اہلِ کتاب میں کوئی تناصر و موالات نہیں ہے۔ ہاں معاشرتی معاملات میں ان سے اچھے سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اگر وہ ہماری حفاظت میں ہوں تو ان کے دین و ایمان اور عزت و ناموس کی حفاظت ہمارا فرض ہے لیکن موالات اور چیز کا نام ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ

تو ضرور پائے گا۔ سب لوگوں سے زیادہ دشمن مسلمانوں کا یہودیوں کو اور

الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ

مشرکوں کو اور تو پائے گا سب سے قریب محبت میں مسلمانوں کے

قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ

ان لوگوں کو جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لئے کہ ان میں عالم ہیں اور درویش ہیں اور جو

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى

تکبر نہیں کرتے اور جب سنتے ہیں جو اترا رسولؐ پر تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو کہ

الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ

ابلتی ہیں آنسوؤں سے۔ اس وجہ سے کہ انہوں نے

الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ

پہچان لیا حق کو کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہم ایمان

Marfat.com

رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا

لائے سو تو لکھ لے ہم کو گواہی دینے والوں کے ساتھ اور

لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ

ہمیں کیا ہوا کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اس پر جو آیا ہمارے پاس حق

وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہم امید رکھیں کہ ہمیں داخل کرے ہمارا رب نیک بختوں کے ساتھ

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

سو ان کو ثواب دیا اللہ نے ان کے کہنے پر ایسے باغ جاری ہیں ان

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ

کے نیچے نہریں وہ رہا کریں گے انہیں میں اور یہ بدلہ ہے نیکو

جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

کاروں کا اور جو لوگ کافر ہوئے اور جھوٹ

بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾

بتائیں ہماری آیتیں وہی ہیں دوزخ والے۔

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ یہود کا مشرکین کے ساتھ دوستی کرنا محض اسلام اور مسلمانوں کے بغض و عداوت کی وجہ سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن اقوام سے سابقہ پڑتا تھا۔ ان میں یہ دونوں قومیں یہود اور مشرکین علی الترتیب اسلام اور مسلمانوں کی شدید ترین دشمن تھیں۔ مشرکین مکہ کی ایذا رسانیاں تو اظہر من الشمس ہیں۔ لیکن یہود نے بھی کوئی کمینہ سے کمینہ حرکت اٹھا کر نہیں رکھی۔ حضورؐ کو بے خبری میں پتھر

لہ تفسیر المراغی ج ۶ ص

Marfat.com

کی چٹان گرا کر شہید کرنا چاہا۔ کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی۔ جادو اور ٹوٹکے کرائے۔ غرض غضب پر غضب اور لعنت پر لعنت حاصل کرتے رہے۔ اس کے بالمقابل نصاریٰ باوجودیکہ وہ بھی کفر میں مبتلا تھے، اسلام سے جلتے تھے مسلمانوں کا عروج اُن کو ایک نظر نہ بھاتا تھا۔ تاہم ان میں قبول حق کی استعداد ان دونوں گروہوں سے زیادہ تھی۔ اُن کے دل اسلام اور مسلمانوں سے محبت کرنے کی طرف نسبتاً زیادہ مائل ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اُس وقت تک عیسائیوں میں علم دین کا چرچا دوسری قوموں کی نسبت زیادہ تھا۔ اپنے طریقہ کے موافق ترکِ دنیا اور زاہدانہ زندگی اختیار کرنیوالے ان میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ نرم دلی اور تواضع اُن کی خاص صفت تھی۔ جس قوم میں یہ خصال بکثرت پائی جائیں، اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ اُس میں قبول حق اور سلامت روی کا مادہ دوسری اقوام سے زیادہ ہو۔ کیونکہ قبولِ حق سے عموماً تین چیزیں مانع ہوتی ہیں۔ جہل، حُبِ دنیا یا حسد و تکبر وغیرہ۔ نصاریٰ میں عالموں کا وجود جہل کو، راہبوں کی کثرت حُبِ دنیا کو، نرم دلی اور تواضع کی صفت کبر و نخوت وغیرہ کو کم کرتی تھی۔

چنانچہ قیصر روم، مقوقسِ مصر اور نجاشی شاہِ حبشہ نے جو برتاؤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ رسالت کے ساتھ کیا وہ اس کا شاہد ہے کہ اس وقت نصاریٰ میں قبولِ حق اور مودتِ مسلمین کی صلاحیت موجود تھی اور نسبتاً دوسری قوموں سے زائد تھی۔ مشرکین مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر جب ایک جماعت صحابہؓ نے حبشہ کو ہجرت کی اور مشرکوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا۔ اور شاہ نجاشیؒ کے دربار تک اپنا پروپیگنڈا نہ چھوڑا تو بادشاہ نے ایک روز مسلمانوں کو بلا کر کچھ سوالات کئے، اور حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت بھی اُن کا عقیدہ دریافت کیا۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی آیات پڑھیں۔ اور اپنا عقیدہ صاف صاف بیان کیا۔ بادشاہ بے انتہا متاثر ہوا اور اقرار کیا۔ کہ جو کچھ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کی نسبت فرمایا ہے وہ بلاکم و کاست صحیح ہے۔ اس نے کتب سابقہ کی بشارات کے مطابق حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخر الزماں تسلیم کیا۔ یہ قصہ طویل ہے۔

انجام کار ہجرت کے کئی سال بعد ایک وفد جو ستر نومسلم عیسائیوں پر مشتمل تھا، نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں روانہ کیا۔ یہ لوگ جب مدینہ پہنچے۔ اور قرآنِ پاک کے سماع سے لذت اندوز ہوئے تو کلام الٰہی سُن کر وقفِ گریہ و بکا ہو گئے آنکھوں سے آنسو اور زبان پر ربنا آمنا الخ یہ کلمات جاری تھے۔ ان آیات میں اسی جماعت کا حال بیان فرمایا ہے۔ قیامت تک کے لئے کوئی خبر نہیں دی گئی کہ ہمیشہ عیسائیوں اور

Marfat.com

یہود و مشرکین وغیرہ کے تعلقات کی نوعیت اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہی رہے گی۔
آج کل جو لوگ عیسائی کہلاتے ہیں۔ ان میں کتنے قسیس اور راہب اور متواضع و منکسر المزاج ہیں۔ اور کتنے ہیں جن کی آنکھوں سے کلام الٰہی سن کر آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ جب اقربھم مودۃ کی علت ہی جو ذالک بان منھم قسیسین ورھبانا الخ سے بیان کی گئی ہے موجود نہیں تو معلول یعنی قرب مودت کیوں موجود ہوگا؟ بہرحال جو اوصاف عہد نبوی کے عیسائیوں اور یہود و مشرکین کے بیان ہوئے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں جس مقدار میں موجود ہوں گے، اسی نسبت سے اسلام اور مسلمانوں کی محبت و عداوت کو خیال کر لیا جائے۔

جمہور[1] مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیات عام عیسائیوں کے متعلق نہیں بلکہ نجاشی اور اس کے متبعین مخلص کے حق میں ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے عطاؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیات ان نصاریٰ کے لئے ہیں جن میں یہ صفات پائی جائیں:۔

ا۔ ان میں عالم اور درویش پائے جائیں۔
ب۔ وہ متکبر نہ ہوں بلکہ منکسر المزاج ہوں۔
ج۔ قرآن سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں۔ اور حق کی پہچان کر لیں۔
د۔ وہ اپنے ایمان کا اعلان کر دیں: رَبَّنَا اٰمَنَّا الخ
ھ۔ "جماعتِ صالحین" میں داخل ہونے کے آرزومند ہوں۔

یہی صفات شاہِ نجاشی اور ان کے مومن ساتھیوں میں پائی جاتی تھیں جن کی بنا پر ان کی مدح و ثنا فرمائی گئی ہے۔ یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ عام عیسائیوں، بالکل آج کے نام نہاد عیسائیوں میں یہ صفات مفقود ہیں لہٰذا ان آیات کو ان پر چسپاں کرنے کی کوشش کرنا۔ فریب دہی یا فریب خوردگی اور خام خیال ہے۔

صلیبی لڑائیوں میں عیسائیوں کی دشمنی کھل کر سامنے آچکی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے کبھی ان پر سبقت نہ کی تھی۔ مگر انہوں نے بیت المقدس جیسے شہر میں ان کا قتلِ عام کیا۔ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور بیماروں کو بھی نہ چھوڑا۔ مجاہد اسلام صلاح الدین ایوبیؒ نے جب ۹۰ برس کے عیسائی قبضہ کے بعد دوبارہ اس شہر پر قبضہ کیا۔ تو عفوِ عام کا اعلان کیا اور مجرموں کو بھی رہائی دیدی۔ اس سے بڑھ کر مظالم سپین میں مسلمانوں پر توڑے گئے۔ اعلانِ

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۵۳، تفسیر ابن کثیر پ ۷ ص ۱۳۸

Marfat.com

عام کے ذریعے سے مسلمانوں کو مرتد ہو جانے کا حکم دیا گیا جنہوں نے ایسا نہ کیا انہیں تلوار، بھوک پیاس اور آگ سے قتل اور تباہ کیا گیا۔ ان کی آبادیاں جلا دی گئیں۔ عورتوں کو بے عزت کیا گیا۔ بچوں کو والدین کے روبرو ذبح کیا گیا۔ مقابر و مساجد کو ڈھا دیا گیا۔ اور باقی مسلمانوں کو بے دریغ جلا وطن کر کے سپین کو مسلمانوں کے وجود تک سے خالی کر دیا گیا۔

عیسائیوں کے مسلمانوں پر مظالم کی داستان بڑی طویل ہے۔ مراکش، الجزائر، ٹیونس، افریقہ کے تمام ممالک، ہندو پاکستان غرض دنیا کے ہر گوشے میں انہوں نے مسلمانوں کو قتل و نہب، اور حرب و ضرب کا نشانہ بنایا، ان کی حکومتیں برباد کیں اور ان پر زبردستی عیسائیت کو ٹھونسنے کی ہر مذموم کوشش کی۔ تاریخ کے صفحات اس کے گواہ ہیں۔

آہ! جس شاہِ نجاشیؓ کی یہاں مدح ہو رہی ہے آج اسی کے ملک حبشہ کے بادشاہ ہیل سلاسی کے مسلمانوں پر مظالم سے زمین کا چپہ چپہ لالہ زار بنا ہوا ہے۔ مغرب کی تمام قدیم و جدید عیسائی سلطنتوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ناپاک گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ اسرائیل کی سلطنت دراصل عیسائیت کے بغض و عداوت کے پیٹ سے پیدا ہونے والا ناجائز بچہ ہے جو آج دنیا کے مسلمانوں کے لئے باعثِ مصیبت بن چکا ہے (مؤلف)

رہی یہود و مشرکین کی عداوت، تو وہ اظہر من الشمس ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ابن مردویہ سے ایک نقل روایت کی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا جب کبھی کوئی یہودی کسی مسلمان کو اکیلا دیکھتا ہے تو اس کے دل میں از راہِ بغض و عداوت اس مسلمان کے قتل کا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے۔[1]

علامہ احمد مصطفےٰ المراغی مرحوم فرماتے ہیں کہ آیت لتجدن اشد الناس الخ میں ناس سے مراد حجاز کے یہودی، عرب کے مشرک اور حبشہ کے نصاریٰ ہیں، اور وہ بھی حضورؐ کے زمانے میں، اور خود ان آیات میں اس کی دلیل موجود ہے کہ یہود و نصاریٰ کا مقابلہ کر کے ایمان لانے والے نصاریٰ کی صفات اور مدح بیان فرمائی گئی ہے۔

حضورؐ کو سب سے زیادہ تکلیف مکہ کے مشرکوں اور حجاز و مدینہ کے یہودیوں سے پہنچی تھی۔ ان دونوں گروہوں میں بعض چیزیں مشترک تھیں مثلاً تکبر، سرکشی، بغاوت، مادہ پرستی کا غلبہ، خشک دلی اور سنگ دلی، رحمت و شفقت کا برائے نام ہونا، نسلی تعصب، قومی حمیت وغیرہ، لیکن عرب کے مشرک جاہلیت کے باوجود یہود کی نسبت ذرا نرم تھے۔ ان میں سخاوت و ایثار، آزادیٔ رائے اور استقلال فکر پایا جاتا تھا۔ اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے یہود کا ذکر پہلے اور مشرکوں کا بعد میں فرمایا ہے۔ بلادِ مقدسہ، شام اور اندلس میں جب مسلمانوں

---

[1] تفسیر المراغی ج ۷، ص ۳، تفسیر المنار ج ۷ ص ۲، ۱۷

Marfat.com

نے یہود کو اپنی فطری نرم دلی اور عدالت کے باعث نصاریٰ کے ظلم و ستم سے چھڑایا اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے تو اس مصلحت سے کچھ دیر ظاہری طور پر اس سنگدل قوم نے بظاہر مسلمانوں کی طرف سے اپنے میلان کو ظاہر کیا۔ مگر یہ محض وقت کی مصلحت تھی۔

مؤلف عرض کرتا ہے کہ گو یہود میں سے بعض خوش قسمت افراد مثلاً عبداللہ بن سلام ایمان لے آئے تھے اور ان کی مدح و توصیف اللہ تعالیٰ نے بار بار فرمائی ہے لیکن یہود کا عام وطیرہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہی رہا۔ ان کے مقابلہ میں حبشہ کے نصاریٰ نے مسلمان مہاجرین کی آؤ بھگت کی، حضورؐ کی دعوتِ اسلام کا جواب ہرقل شاہِ روم اور مقوقش شاہ مصر نے نہایت ادب سے دیا۔ اور شاہِ نجاشیؓ تو کچھ ساتھیوں سمیت اسلام بھی لے آیا تھا۔ حضورؐ کی زندگی کا یہ واحد واقعہ تھا کہ آپؐ نے شاہِ نجاشی کی نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھی تھی۔ شام روم اور شاہِ مصر کو بھی محض حکومت کا لالچ اور مخالفت و بغاوت کا خوف اسلام سے روکے رہا۔ ورنہ اندر سے وہ حضورؐ کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔

پس حضورؐ کے زمانہ کے ان تین گروہوں میں سے مسلمانوں کے قریب ترین نصاریٰ کا گروہ تھا۔ اور عداوت میں شدید ترین یہود کا طائفہ اور عمومی طور پر بھی اگر یہود و نصاریٰ کا باہم مقابلہ کیا جائے۔ تو ان دونوں میں سے پہلا گروہ عداوتِ اسلام میں دوسرے کی نسبت زیادہ شدید رہا ہے۔ یہودی شریعت نے ان کے دل سخت کر دیئے ہیں۔ اور صرف نسل پرستی اور تعصب کے پتلے ہیں۔ ان کے مقابلے میں عیسائی مذہب کی تعلیم نرمی تواضع اور تذلل و فروتنی پر مبنی ہے۔

ان نومسلم حضرات کا یہ قول کہ فاکتبنا مع الشھدین ظاہر کرتا ہے کہ وہ اُمتِ محمدؐیہ میں داخل ہو کر فخر محسوس کرتے تھے کیونکہ یہ اُمت "شھداء علی الناس" ہے۔ نیز انہوں نے یہ شہادت دی تھی کہ یہ پیغمبرؐ ہمارے نوشتوں اور کتابوں کی گواہی کے عین مطابق مبعوث ہوا ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔

وما جاءنا من الحق سے انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ پچھلی کتابوں کی بشارات کے مطابق فارقلیط اور روح حق ظاہر ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان پر ایمان لانا ہمارا فرضِ اولین ہے۔

ان ایمان لے آنیوالے نصاریٰ کے مقابلے میں وہ لوگ جو حضورؐ پر ایمان نہ لائے اور کفر و تکذیب کی راہ اختیار کر لی۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ میں بیان فرمایا ہے۔ اس سے اُس خاص مبارک گروہ اور عام کافر و مکذب عیسائیوں میں فرق بھی واضح ہو گیا اور یہ بھی پتہ چل گیا۔ کہ یہ آیات صرف اس مومن اور پاک گروہ کے

Marfat.com

حق میں اتری ہیں جنہوں نے حضورؐ کی آواز پر فوراً لبیک کہا تھا۔ اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

عربی زبان میں گو وَ صرف عطف و جمع کے لئے آتی ہے لیکن اس آیت میں الیھود والذین اشرکوا فرما کر ان دو فریق کی شدید عداوت ظاہر کرنے کے علاوہ یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ان دو دشمن اور شدید العداوت گروہوں میں سے بھی یہود زیادہ شدید ہیں۔ اور تاریخ اسلام نے عملاً اس کی تائید کر دی ہے۔ یہود نے پہلے دن سے آج تک کبھی اسلام اور مسلمانوں کے وجود کو برداشت نہیں کیا۔ عہد شکنی، سازش بغاوت، غلط پروپیگنڈا اور دجل و فریب کے ہتھکنڈوں سے ہمیشہ اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو دکھ دینے کے درپے رہے۔ یہی تھے جنہوں نے مشرکین کو دریدہ اکسا کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا کیا اور جنگِ اُحد سے لے کر حضورؐ کے وصال تک ہر جنگ میں ان کا ہاتھ رہا ہے۔

جب اسلام ان پر اپنی قوتِ حق سے غالب آگیا تو یہ مسلمانوں کے اندر گھس کر فرقہ پرستی کا سبق سکھانے لگے۔ کتاب اللہ کے سوا کوئی کتاب ایسی نہ چھوڑی جس میں کوئی نہ کوئی دسیسہ کاری اور شرارت نہ کی ہو۔ انہوں نے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار و تشتت پیدا کیا۔ فتنے اٹھائے اور دنیا کے کونے کونے میں دشمنانِ اسلام کو ابھار کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا کرتے رہے۔ وہ زمین کے چپے چپے پر مسلمانوں کے خلاف سازش اور مکر و فریب کے جال بچھاتے رہے۔ آج حال یہ ہو گیا ہے کہ اس آخری دور میں وہ خود اسلام کے خلاف کھلم کھلا معرکہ آرا ہو چکے ہیں اور عیسائیت اور بت پرستی سے میدانِ معرکہ میں پوری مدد حاصل کر رہے ہیں۔ وہ نام نہاد مسلمانوں کو بلکہ "ہیروز" کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں ان کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور اب صلیبی لڑائی نے "صلیبی صیہونی" جنگ کا جامہ پہن لیا ہے۔

اسلام کے خلاف حضورؐ کے زمانے میں قریش، یہود اور جزیرہ کے دوسرے قبائل کو ایک مرکز پر لانے والا یہودی تھا۔

پھر خلافتِ راشدہ میں پہلا فتنہ برپا کرنے والا، عوام کو بھڑکانے والا، مختلف گروہوں کو جمع کرنے والا اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈے کا جال

لے فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۶، ۱۹

Marfat.com

پھیلانے والا یہودی تھا۔ اس واقعہ ہائلہ کے بعد دیگر تمام حوادث و فتن میں یہودی ہاتھ کام کر رہا تھا۔

حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک میں کذب وجعل سازی کی رہنمائی کرنے والا یہودی تھا۔ تاریخی روایات میں غلط باتیں ملانے والا یہودی تھا۔

پھر آخری خلافت کے دور میں قومی نعرے ایجاد کرنے والا، اور وہ انقلابات برپا کرنے والا جس کے نتیجہ میں سلطان عبدالحمید خان کے زمانے میں شریعت کا قانون معزول ہوا اور اس کی جگہ "دستور" نے لی اور ترکی "ہیرو" اتاترک کے ہاتھوں خلافت کو معزول کرایا گیا۔ اس سب کے پیچھے یہودی ہاتھ کارفرما تھا۔

اس کے بعد بھی دنیا کے تمام گوشوں میں اسلامی لشکروں کے خلاف ہر جگہ اعلان ہوا۔ اس کے پیچھے یہودی تھا۔

مادی الحاد یعنی کمیونزم کے پیچھے یہودی تھا (کارل مارکس یہودی تھا) اور حیوانی جنسیہ کی تحریک کے پیچھے یہودی تھا۔ ہر مقدس جگہ، ہر مقدس حکم کو ڈھانے اور گرانے اور ہر ضابطے کو پامال کرنے کے لئے یہودی ہاتھ کام کر رہا تھا۔

یہود نے اسلام کے خلاف جو جنگ چھیڑی تھی وہ مدت کے لحاظ سے زیادہ طویل اور میدانِ جنگ کے لحاظ سے زیادہ وسیع تھی بہ نسبت اس جنگ کے جو شرک و بت پرستی نے اسلام پر مسلط کی۔ مشرکین عرب کا معرکہ زیادہ سے زیادہ بیس سال تک رہا۔ اسی طرح عہد اوّل میں فارس والوں کے معرکے کا حال بھی تھا۔ جدید دور میں ہندی بت پرستی کا معرکہ اسلام کے خلاف نہایت شدید ہے لیکن وہ بھی عالمی صیہونیت کے معرکہ کی گہرائی و گیرائی تک نہیں پہنچتا۔ کمیونزم یہودی معرکے کا محض ایک جزو ہے یہود کے معرکہ کی مثال اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صلیبی معرکہ ہے۔

ان آیات نے جن نصاریٰ کا ذکر کیا ہے ان کی صفات بتا رہی ہیں کہ وہ سچے عیسائی تھے اور حق کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپک پڑتے تھے۔ ان کی فروتنی و انکساری قرآن سن کر رونا اور آنسو بہانا، ایمان بالرسول کا اظہار و اعلان اور رحمت خداوندی میں داخل ہونے کی تڑپ یہ سب چیزیں ثابت کر رہی ہیں کہ یہ ایک خاص گروہ تھا۔ جس میں یہ صفات موجود تھیں۔ یہ آیات عام عیسائیوں کے حق میں نہیں ہیں۔

یہ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ نے جنت عطا فرمائی اور محسنین کی جزاء کا حقدار بنایا تھا۔ اور آخر میں نصاریٰ کہلانے والوں میں سے جن میں کفر و تکذیب پائی جائے۔ انہیں اللہ نے

Marfat.com

اصحاب جحیم فرمایا ہے۔ اسلام کا انکار کرنے والے یہود ہوں یا نصاریٰ یا مشرک، اللہ تعالیٰ نے ایک ہی صف میں رکھا ہے کہا ہے۔

لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتّٰی تاتیھم البیّنۃ ان الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین فی نار جھنم خالدین اولٰئک ھم شر البریہ ٥

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علیٰ لسان داؤد وعیسیٰ بن مریم

ان آیات و دلائل سے ثابت ہوگیا کہ ہر عیسائی لتجدن اقربھم مودۃ الخ کے حکم میں داخل نہیں ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو کھول دیا ہے اور اس میں کوئی خفاء وغموض نہیں رکھا۔

تفسیر و حدیث اور سیر کی روایات میں بھی ان مخصوص نصاریٰ کی تخصیص و تحدید موجود ہے۔ امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اس حکم کو نجاشیؓ اور ان کے ساتھیوں سے مخصوص ثابت کیا ہے۔

اسی طرح امام بیہقی اور ابو داؤد کی روایات میں بھی موجود ہے کہ حبشہ کے نصاریٰ تھے، جو ایمان لے آئے تھے اور قرآن سن کر روئے تھے۔

اس امر کی دلیل کہ یہ آیات ایک خاص گروہ کے متعلق تھیں یہ بھی ہے کہ اسی صورۃ میں یہ حکم گزر چکا ہے کہ:

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیآء بعضھم اولیآء بعض ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظّٰلمین ٥

قل یا اھل الکتاب لستم علیٰ شیء حتّٰی تقیموا التورٰۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم ولیزیدن کثیرًا منھم ما انزل الیک من ربک طغیانًا وکفرا فلا تاس علی القوم الفٰسقین

اسی طرح سورۃ البقرہ میں آچکا ہے کہ ولن ترضیٰ عنک الیھود ولا النصاریٰ حتّٰی تتبع ملتھم قل ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ، ولئن اتبعت اھوآءھم بعد الذی جاءک من العلم مالک من اللہ من ولیّ ولا نصیر ٥

یہود کی مانند نصاریٰ کی دشمنی بھی ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے صلیبی نصرانیوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف واقعہ یرموک سے لے کر اب تک عداوت کا جھنڈا

Marfat.com

بلند کر رکھا ہے استثنائی واقعات اور افراد و جماعات کو چھوڑ کر عام نصاریٰ کا سلوک یرموک کی شکست سے لے کر آج تک دشمنی اور عداوت پر مبنی رہا ہے۔

مشہور صلیبی جنگوں میں صدیوں تک نصاریٰ نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پورا زور صرف کیا پھر سپین میں مسلمانوں کو جڑ سے مٹا دینے کی تحریک میں جو کچھ ہوا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ پھر استعمار اور تبلیغِ عیسائیت کے لشکر اسلام اور ممالک اسلامیہ پر حملہ آور ہوئے۔

صلیبی دشمن اور صیہونی دشمن اسلام کے خلاف حلیف بن چکے ہیں گو آپس میں ان کی دشمنیاں ہیں لیکن الٰہی ارشاد بعضھم اولیاء بعض کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہ سب ایک ہیں۔ انہوں نے خلافت کی قبا پارہ پارہ کی۔ پھر دینِ اسلام کی دھجیاں بکھیر دینے کا عزم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے انہوں نے سیاست سے اسلام کو نکلوایا۔ اب وہ نماز کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔

جب کبھی انہیں موقع ملے وہ اسلام کے خلاف بت پرستی اور شرک کی حمایت کرتے ہیں۔ پاکستان و ہند کا کشمیر پر جھگڑا اور صلیبیوں کا اس بارے میں جو موقف ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

وہ ساری اسلامی دنیا میں احیاءِ اسلام کی تحریکوں کو مٹانے کے درپے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں میں سے یہ کام کریں۔ ان بزدلوں کو یہ صلیبی شجاعت و حریت کے پتلے اور "ہیرو" ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے گرد ڈھول پیٹتے ہیں اور انہیں مشتعل کر کے اسلامی طاقتوں کے خلاف لڑواتے ہیں۔ چودہ سو سال کی تاریخ کا یہ خلاصہ ہے پس کسی کو کسی کے دجل و فریب اور ملمع سازی میں نہ آنا چاہیئے۔ حقائق سامنے ہیں۔ قرآن سامنے ہے۔ ضرورت عبرت حاصل کرنے والوں اور دل کے کان کھول کر سننے والوں کی ہے۔

ذکریٰ لمن کان لہٗ قلب او القی السمع وھو شھید ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ

اے ایمان والو! مت حرام ٹھہراؤ وہ لذیذ چیزیں جو

اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا

اللہ نے تمہارے لئے حلال کر دیں اور حد سے نہ بڑھو بیشک

يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ

اللہ پسند نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کو اور کھاؤ اللہ کے دیئے میں سے جو

Marfat.com

(۸۸) حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ

حلال پاکیزہ ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو

آٹھویں رکوع سے سورت میں ایفائے عہد کی تاکید کے ساتھ حلال و حرام کا مضمون شروع ہوا تھا۔ اسی ضمن میں خاص خاص مناسبات سے مفید مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بات میں سے بات نکلتی رہی۔ اب ان تمام مضامین کو تمام کر کے اس پارہ کے پہلے رکوع سے پھر اصل موضوعِ بحث کی طرف عود کیا گیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس اوپر والے رکوع میں جو مضمون گزرا اس کے ساتھ بھی یہ مضمون پوری طرح مربوط ہے۔ کیونکہ پچھلے رکوع میں یہود و نصاریٰ کی جو خرابیاں کی گئیں سمجھنے والوں کے نزدیک ان کا خلاصہ دو چیزیں تھیں ایک تو یہود کا لذاتِ دنیا و شہوات اور حرام خوری میں انہماک جو دین میں تفریط ہے۔ اور دوسرے نصاریٰ کا دین میں غلو اور افراط جو آخر میں رہبانیت پر منتج ہوا۔ بلاشبہ "رہبانیت" جیسے دینداری یا روحانیت کا ہیضہ کہنا چاہیئے۔ نیت اور منشائے اصلی کے اعتبار سے فی الجملہ محمود ہو سکتی تھی۔ اسی لئے ذالک بان منھم قسیسین ورھبانا کو ایک لحاظ سے معرضِ مدح میں پیش کیا گیا۔ لیکن چونکہ اس طرح کا تجرد و ترکِ دنیا اس مقصدِ عظیم اور قانونِ قدرت کے راستہ میں حائل تھا۔ جو فاطرِ عالم نے دنیا کی پیدائش میں ملحوظ رکھا ہے اس لئے وہ عالمگیر مذہب جو ابدی طور پر تمام بنی نوعِ انسان کی فلاح دارین اور اصلاح معاش و معاد کا ذمہ دار ہو کر آیا ہے، ضروری تھا کہ اسی طرح کے مبتدعانہ طریق عبادت پر سختی سے نکتہ چینی کرے۔

کوئی آسمانی کتاب آج تک اتنی جامع، معتدل اور فطری تعلیم انسانی ترقیات کے ہر شعبہ میں پیش نہیں کر سکتی۔ جو قرآن کریم نے ان دو آیتوں میں پیش کی ہے۔ ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو صاف طور پر اس سے روک دیا کہ وہ کسی لذیذ حلال و طیب چیز کو اپنے اوپر عقیدتاً یا عملاً حرام ٹھہرالیں۔ نہ صرف یہی بلکہ ان کو خدا کی پیدا کی ہوئی حلال طیب نعمتوں سے متمتع ہونے کی ترغیب دی ہے مگر سلبی اور ایجابی دو شرطوں کے ساتھ (۱) اعتداء نہ کریں (حد سے نہ بڑھیں) (۲) اور تقویٰ اختیار کریں۔ یعنی خدا سے ڈرتے رہیں۔ اعتداء کے دو مطلب ہو سکتے ہیں حلال چیزوں سے حرام کا سا معاملہ کرنے لگیں۔ اور نصاریٰ کی طرح رہبانیت میں مبتلا ہو جائیں یا لذائذ و طیبات سے فائدہ اٹھانے میں حدِ اعتدال سے گزر جائیں۔ حتیٰ کہ لذائذ و شہوات میں مبتلا ہو کر یہود کی طرف حیاتِ دنیا ہی کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیں۔ الغرض غلو و جفا اور افراط و تفریط

Marfat.com

کے درمیان حدِ اعتدال و توسط کو قائم رکھیں۔ نہ تو لذائذِ دنیا میں غرق ہونے کی اجازت ہے اور نہ ازراہ رہبانیت مباحات وطیبات کو چھوڑنے کی ——— ازراہ رہبانیت کی قید ہم نے اسلئے لگائی کہ بعض اوقات بدنی یا نفسی علاج کی غرض سے کسی مباح سے عارضی طور پر پرہیز کرنا مخالفت میں داخل نہیں، نیز مسلمان تقویٰ کے مامور ہیں جس کے معنی ہیں خدا سے ڈر کر ممنوعات سے پرہیز کرنا۔ اور تجربہ سے معلوم ہے کہ بعض مباحات کا استعمال بعض دفعہ کسی حرام یا ممنوع کے ارتکاب کی طرف لے جاتا ہے ایسے مباحات کو عہد و قسم یا تقرب کے طور پر نہیں بلکہ بطریق احتیاط اگر کوئی شخص باوجود اعتقادِ اباحت ترک کر دے۔ تو یہ رہبانیت نہیں بلکہ ورع و تقویٰ میں شامل ہے۔ حدیث میں ہے۔

لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتیٰ یدع مالا بأس بہ حذراً ممّا بہ بأس۔ (ترمذی)

الحاصل اعتداء اور اختیارِ تقویٰ کی قید کو ملحوظ رکھ کر ہر قسم کی طیبات سے مومن مستفید ہو سکتا ہے اور زندگی کے ہر میدان میں ترقیات کے دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

حلال[1] پاکیزہ اور لذیذ چیزوں کو ترک کر کے بیٹھنا اور نکاح وغیرہ مستلذات کو اپنے اوپر حرام کر لینا خدا کے نزدیک کوئی عمدہ چیز نہیں۔ خدا تعالیٰ کو بندے کی اچھی حالت اور اس کے کھانے پینے سے کوئی چڑ نہیں ہے، اور نہ اس کا یہ مقصد ہے کہ اس کو اپنی نعمتوں سے محروم رکھے۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ لذاتِ جسمانیہ میں مبتلا رہنا مبتدی کو معارفِ عقلیہ سے باز رکھتا ہے۔ اس لئے پہلی امتوں میں یہ ریاضت اور نفس کشی مروج ہوئی تھی۔ شریعتِ محمدیہ میں تقرب الٰہی کا ذریعہ نماز، روزہ اور دعاؤں کو قرار دیا گیا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ[2] نے ابن عباسؓ، عائشہ صدیقہؓ، عبداللہؓ بن مسعود امام مجاہد اور حضرت عکرمہؒ سے کئی روایات بیان کی ہیں۔ کہ بعض صحابہؓ نے لذاتِ دنیا کو ترک کر دینے بیویوں سے الگ ہو جانے بلکہ خصی تک ہو جانے کی حضورؐ سے اجازت مانگی تھی لیکن حضورؐ نے شدت سے منع فرما دیا۔ اور فرمایا کہ میں عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، اہل و عیال کے حقوق بھی پورا کرتا ہوں۔ یہی میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقے سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

اس[3] آیت کا معنی بھی قرآن پاک کی ایک دوسری آیت کی مانند ہے۔ وکلوا واشربوا ولا تسرفوا الآیۃ اور اعتداء سے جو منع فرمایا گیا ہے۔ تو یہ دونوں باتوں کو شامل ہے

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۵۵ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۶۶۳، ص ۳ تفسیر المراغی ج ۶ ص ۹، ۱۳، تفسیر المنار ج ۷، ص ۱۷، ۳۲۔

Marfat.com

ایک تو خود اس چیز میں اسراف جسے استعمال کیا جارہا ہے اور دوسرے اس کی جنس کے سوا اور خبیث چیزوں کی طرف تجاوز کرنا۔ آیت کی نہی دونوں کو شامل ہے۔ اللہ تعالےٰ اسے ناپسند فرماتا ہے چاہے یہ تعدّی قصدِ عبادت سے ہی ہو اور اس کی طیبات کو جو اس نے حلال کی ہیں اپنے نفس پر حرام کرکے ہی ہو پھر اس کی دو صورتیں ہیں یا تو قسم یا نذر وغیرہ کے التزام سے نہ ہو یا التزاماً ایسا کیا جائے اور یہ دونوں امور ناجائز ہیں۔ اور یہ التزام کبھی تو ریاضت و تہذیب نفس کے لئے ہوتا ہے کہ اُسے طیّبات سے محروم کر دیا جائے اور کبھی غضب و ناراضگی سے ہوتا ہے مثلاً ایک شخص بیوی یا بچے سے ناراض ہو کر قسم کھالے کہ فلاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ یہ سب صورتیں شرع نے ناجائز ٹھہرائی ہیں۔

طیّبات سے اور زینت کو حرام ٹھہرانا اور اپنی جان کو عذاب دینا قدماء یہود اور یونانیوں سے چلا آتا تھا۔ نصاریٰ نے اس معاملے میں زیادہ شدت اختیار کر لی تھی۔ اور کتب کی تعلیم کے بغیر ہی زہد و عبادت اور رہبانیت کی کئی صورتیں ایجاد کر لی تھیں اسلام نے ان سب صورتوں سے منع فرما دیا اور روح کے ساتھ جسم کے تقاضے بھی ملحوظ رکھے۔ کیونکہ وہ دنیا و آخرت دونوں کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے۔ اس نے بتایا کہ روح اور بدن دونوں میں عدل واجب ہے

اللہ چاہتا ہے کہ بندے اس کی پاک نعمتوں کو استعمال کریں اور شکریہ ادا کریں۔

کلوا من طیبات ما رزقنٰکم واشکروا للّٰہ الآیۃ

حلال کے ساتھ یہاں بھی طیّب کی شرط لگائی ہے۔ یعنی ایک تو یہ کہ وہ چیزیں فی نفسہا حرام نہ ہوں مثلاً مردار، خون اور لحم خنزیر نہ ہوں۔ پھر کسب و تناول کے لحاظ سے حلال ہوں۔ یعنی کمائی کا ذریعہ جائز ہو پس سود، رشوت چوری وغیرہ کا مال نہ ہو، نیز وہ چیزیں لذیذ ہوں اور ذاتی طور پر گندی، بدبودار اور ناصاف نہ ہو یا ان پر کوئی اس قسم کا حادثہ نہ طاری ہو گیا ہو؟ جس کے باعث وہ فاسد ہو گئی ہوں یا زیادہ دیر پڑے رہنے سے خراب ہو کر سڑ گئی ہوں۔

تحریم و تحلیل کا تعلق قانون سازی سے ہے اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کسی اور کو روا نہیں کہ اس منصب کا ادعا کرے۔ تحریم و تحلیل کرنے والا گویا الٰہ بننا چاہتا ہے اور ربوبیت کا مدعی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ ان سے کسی شخص نے کہا فلاں آدمی فالودہ نہیں کھاتا کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اس کا شکریہ ادا نہ کر سکے گا۔

Marfat.com

آپ نے فرمایا کیا وہ ٹھنڈا پانی پیتا ہے ؟ جواب ملا کہ ہاں۔ فرمایا وہ شخص نادان ہے ٹھنڈے پانی میں اللہ کی جو نعمت ہے وہ فالودہ سے بڑی اور زیادہ ہے۔

آخر میں تقویٰ کا حکم دیتا ہے کہ قرآن کی ہدایت طیبات میں فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ وہ یہ کہ اعتدال اور التزام حلال کے ساتھ پاکیزہ چیزوں سے تمتع کیا جائے اس نے ہر چیز کی مانند یہاں بھی اعتدال کا حکم ہے۔

حضورؐ کی سیرت میں یہ چیز معروف ہے کہ آپؐ جو ملتا کھا لیتے تھے۔ کبھی تو بہترین کھانا کھاتے۔ مثلاً جانوروں، پرندوں یا مرغوں کا گوشت اور کبھی موٹا جھوٹا کھاتے مثلاً جَو کی روٹی نمک کے ساتھ یا سرکہ اور روغن زیتون کے ساتھ۔ کبھی بھوکے رہتے اور کبھی سیر ہو جاتے۔ آپؐ کی سیرت ہر مالدار اور تنگ دست کے لئے نمونہ ہے اسی لئے ہر قسم کے حالات اور نمونے پیش فرمائے ہیں۔ اور حضورؐ کو جتنا فکر پینے کا ہوتا تھا اتنا کھانے کا نہیں اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث بھی ہے کہ آپؐ کو ٹھنڈا میٹھا پانی بہت پسند تھا" میٹھا" سے مراد خالص پانی بھی ہو سکتا ہے اور شہد، کھجور یا کشمش ملا ہوا[1]

لہ یہ اور ان سے اگلی آیتیں ایک مرکزی مضمون کے گرد گھومتی ہیں۔ اور وہ ہے قانون سازی۔ اسلام اسے اللہ کا حق قرار دیتا ہے اور اس کا تعلق براہِ راست الوہیت سے جوڑتا ہے۔ تشریع اور تحلیل و تحریم صرف اسی کا حق ہے۔ امر و نہی اُسی کی ہے۔ دنیوی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے انفرادی و اجتماعی مسائل اس حکم میں داخل ہیں کوئی مستثنیٰ نہیں۔ قانون سازی کے حق کا مدعی دوسرے الفاظ میں الوہیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور یہ خدا کے حق میں دخل اندازی اور اس پر دست درازی و تعدی ہے۔ آگے آنے والی بہت سی آیات میں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان اوامر و نواہی کا ماننا اور حق تشریع کو خدا کے لئے خاص کرنا عین تقاضائے ایمان ہے اور اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ کفر ہے جس نے کلمۂ اسلام پڑھا اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ کر الوہیت کو صرف اللہ ہی کے لئے خاص کر دیا۔ اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قانون سازی اور تحلیل و تحریم کو صرف خدا کے لئے خاص کر دے۔ اور نہ خود اس حق میں دست درازی کرے اور نہ کسی اور کو کرنے دے۔ ان آیات کے شانِ نزول میں جو احادیث مروی ہیں۔ وہ اس امر کی وضاحت کرتی ہیں۔ چنانچہ صحیحین، ابن جریرؒ طبری اور ترمذی وغیرہ کی روایات اس پر شاہدِ عدل ہیں۔ کہ جن لوگوں نے از خود اپنے آپ پر

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۲۲

Marfat.com

بعض طیبات کو حرام کرلیا تھا۔ یا البسا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حضورؐ نے انہیں بڑی سختی سے ان امور سے منع فرمایا تھا، اور بتا دیا تھا کہ راہِ اعتدال پر قائم رہنا ہی تقاضائے ایمان ہے آیت میں "انتم بہ مومنون" سے بھی یہی ثابت فرمانا مدِ نظر ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ

نہیں پکڑتا تمہیں اللہ تمہاری لغو قسموں پر

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ

لیکن پکڑتا ہے تم کو اس پر جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ

سو اس کا کفارہ کھانا دینا ہے۔ دس محتاجوں کو اوسط درجہ کا

مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ

کھانا جو دیتے ہو تم اپنے گھر والوں کو یا دس محتاجوں کو کپڑا

تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

پہنا دینا یا ایک گردن آزاد کرنا۔ پھر جس کو یہ میسّر نہ ہو تو

ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ

روزے رکھے تین دن کے یہ ہے کفارہ تمہاری قسموں کا جب

اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ

قسم کھا بیٹھو اور حفاظت رکھو اپنی قسموں کی اسی طرح

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۸۹

کھول کر بتاتا ہے اللہ تمہیں اپنی آیتیں تاکہ تم شکرگزار بن جاؤ۔

Marfat.com

لغو[1] (بیہودہ) قسم سے مراد یہ ہے کہ منہ سے صرف اور عادت کے موافق بے ساختہ اور ناخواستہ قسم نکل جائے اور دل کو خبر تک نہ ہو۔ اس قسم کا نہ کفارہ ہے نہ اس میں گناہ ہے لیکن اگر کوئی بالقصد قسم کے الفاظ مثلاً واللہ وغیرہ کہے اور اس سے تاکید کلام مقصود ہو قسم مقصود ہو تو اس پر ضرور کفارہ لازم ہوگا۔

اوپر[2] کی آیات میں تحریم طیبات سے منع فرمایا ہے اور اس کی ایک قسم "یمین" بھی ہے۔ اس لئے یہاں اب یمین کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین الخ یہ کفارہ قسم توڑنے کے بعد دیا جائے گا۔ کھانا دینے میں اختیار ہے۔ خواہ دس مساکین کو گھر بٹھا کر کھانا کھلا دے۔ یا صدقہ فطر کے برابر ہر مسکین کو غلہ یا اس کی قیمت ادا کر دے۔ اوکسوتھم: اس قدر کپڑا پہنا دے جس سے بدن کا اکثر حصہ ڈھک جائے۔ مثلاً کرتہ اور پاجامہ یا لنگی اور چادر۔ اور غلام آزاد کرنے میں یہاں مومن کی شرط نہیں لگائی گئی۔ عام غلام ہے۔

ثلاثۃ ایام: یعنی متواتر تین روزے رکھے۔ اور میسّر نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ شخص صاحب نصاب نہ ہو (روح المعانی) یعنی صاحب نصاب کے لئے مساکین کا کھانا اور کپڑا ہی واجب ہے اور کے لئے نہیں۔

واحفظوا ایمانکم: یعنی بے ضرورت بات بات پر قسم نہ کھاؤ۔ کیونکہ یہ عادت بھلی نہیں۔ اور اگر قسم کھالو تو اسے پورا کرو۔ اور اگر کسی وجہ سے توڑ دو تو کفارہ ادا کرو۔ یہ سب چیزیں حفاظتِ یمین ہیں۔

لعلکم تشکرون: اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ تم نے طیبات سے گریز کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس گریز سے منع فرمایا۔ اور کسی نے غلطی سے طیبات کو اپنے اوپر حرام ہی کر لیا تو اس کو قسم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس سے حلال ہونے کا طریقہ بھی بتلا دیا گیا ہے۔

---

[1] فوائد القرآن ص۱۴۴

[2] فوائد القرآن ص۱۵۷

Marfat.com

"یمین لغو" یہ ہے کہ آدمی بلا قصد لا واللہ اور بلی واللہ کہہ دے۔ عقد کا لفظ حل (کھولنا) کے مقابلے میں ہے۔ تعقید اس کی تاکید اور مبالغہ ہے۔ عقدِ یمین سے مراد اسے قصداً مؤکد کرنا ہے۔ کفارہ کا لفظ کفر سے نکلا ہے جس کا معنیٰ ہے چھپانا اور ڈھانپنا۔ اصطلاحِ شرع میں اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو بعض گناہوں کو چھپا دیتے اور مٹا دیتے ہیں۔ اور دنیا و آخرت میں ان اعمال کا اثر محو کر دیتے ہیں۔

ابن جریر طبریؒ نے روایت کی ہے کہ جب اوپر کی آیت یٰایھا الذین آمنوا لا تحرموا الخ اتری۔ تو کچھ لوگوں نے حضورؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم نے جو قسمیں کھا کر ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ اب ان کا کیا بنے گا؟ تو اللہ تعالےٰ نے یہ آیت لا یؤاخذکم اللہ الخ نازل فرمائی۔

کھانے میں اوسط کی شرط لگائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کفارہ دینے والے کے ہاں عام طور پر جو کھانا پکتا ہے جس میں نہ تو تکلف ہو (مثلاً مہمان وغیرہ کی آمد پر جو ہوتا ہے) اور نہ کنجوسی ہو، وہ کھانا کھلائے۔ امام ابوحنیفہ نے ایک مسکین کو دس دن تک کھانا کھلانا بھی جائز قرار دیا ہے۔

لباس میں زمان و مکان اور علاقوں کا اختلاف بھی معتبر ہے۔ پس یہ معاملہ بھی قسم کھانے والے کے علاقے، حالات اور موسم وغیرہ کے پیشِ نظر ہونا چاہیئے۔

قسم کے چند مسائل یاد رکھنے کے قابل ہیں:۔

ا۔ غیر اللہ کی قسم بالکل جائز نہیں، صحیح احادیث میں اس سے وضاحت کے ساتھ منع فرمایا ہے اور اس میں پیغمبرؐ، کعبہ اور شعائر اللہ، صالحین کے نام وغیرہ سب داخل ہیں۔

ب۔ جب کوئی مصلحت موجود ہو تو قسم کو توڑنا اور کفارہ ادا کر دینا چاہیئے۔ حدیث میں ایسا ہی آیا ہے۔

ج۔ محلوف علیہ (جس بات پر قسم کھائی جائے۔ اس کے لحاظ سے قسم کی کئی اقسام ہیں۔

(ا) فعل واجب یا ترکِ حرام پر قسم کھانا۔ ایسی قسم کا توڑنا ناجائز ہے اور گناہ ہوگا۔

(ب) ترکِ واجب یا فعل حرام پر قسم کھانا۔ یہ معصیت ہے اور اس میں حنث (قسم توڑنا) واجب ہے۔ کفارہ میں اختلاف ہے (حنفیہ کے ہاں کفارہ دینا ہوگا۔

(ج) کسی مستحب کے کرنے یا مکروہ کے ترک کرنے کی قسم کھانا) یہ طاعت ہے۔

لہ تفسیر المراغی ج ۷ ص ۱۴، ۱۹، تفسیر المنار ج ۷ ص ۳۳، ۴۸

Marfat.com

لہٰذا قسم پورا کرنا باعثِ اجر اور توڑنا مکروہ ہے۔

(د) قسم کی تین اقسام ہیں:-

(۱) وہ جو اہلِ اسلام کی قسم ہی نہیں۔ جیسے مخلوقات کی قسم کھانا، کعبۃ اللہ، ملائکہ، مشائخ و ملوک کی قسم کھانا یہ قسم حرام ہے اور منعقد نہیں ہوتی۔ اس میں کفارہ نہیں۔ لیکن ایسی قسم کھانے سے منع فرمایا گیا ہے۔

(۲) اللہ کے نام کی قسم (یعنی کسی آئندہ چیز پر) مثلاً خدا کی قسم میں ایسا کروں گا۔ یہ قسم منعقد ہے اور اسے توڑنے کا کفارہ آئے گا۔

(۳) ایسی قسمیں جن میں خدا کا نام تو نہ آئے مگر وہ حلف باللہ کے معنیٰ میں ہوں مثلاً "اگر ایسا کروں گا تو مجھ پر ایک ماہ کا روزہ ہے" یا حج بیت اللہ ہے" یا فلاں چیز مجھ پر حرام ہے، یا اگر ایسا کروں تو میری بیوی کو طلاق ہے، یا فلاں فلاں چیز صدقہ ہے ان تمام صورتوں میں قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا کافی ہے لیکن پہلی روئے والی صورت حنفیہ کے نزدیک نذر ہے اور اس پر ایفاء لازم ہے، ہاں اگر قسم توڑ دے تو کفارہ لازم ہے)

ھ۔ قسم کا معاملہ عرفِ عام پر مبنی ہے مثلاً گوشت سے مراد مچھلی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ عرفِ عام میں جو اس سے مراد لیا جاتا ہے وہی ہوگا۔ اور جس قسم سے کسی کی حق تلفی، خیانت یا دھوکا مدِ نظر ہو (مثلاً جان بوجھ کر کسی گذشتہ بات پر جھوٹی قسم کھانا) اسے "یمین غموس" کہتے ہیں۔ اس کا کفارہ کوئی عتق یا صدقہ یا روزہ نہیں بلکہ ادائے حق واجب ہے اور توبہ لازم۔

آجکل[1] کے لوگوں کے ذہن میں حلال و حرام کے الفاظ نہایت محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ ان سے مراد محض ذبیحہ، کھانا پینا، لباس یا نکاح وغیرہ ہی چیزیں لیتے ہیں۔ حالانکہ اصولی طور پر اسلام نے — جو ایک ضابطہ حیات ہے اور زندگی کے تمام حصوں پر حاوی ہے — ان لفظوں کو بڑے وسیع معنوں میں بولا ہے۔ اصل میں ان کا تعلق الوہیت سے ہے یعنی فیصلہ کن بات یہ ہے کہ قانون سازی محض معبود و الٰہ کا حق ہے۔ پس حلال و حرام کے سلسلے میں زندگی کے بڑے بڑے اور اصولی معاملات میں دوسرے قوانین کی طرف دیکھنا اور ان سے احکام و رہنمائی حاصل کرنا ہی وہ اصل چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اور اس قسم کی دیگر سینکڑوں آیات میں بیان فرمایا ہے۔

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۲۷، ۲۸

Marfat.com

پورا سیاسی نظام، پوری اجتماعی زندگی کا نقشہ اور پوری حکومت وسلطنت کے معاملات میں یہی ضابطہ کار فرما ہے اگر کوئی صرف چند فروع میں اسلام کی تحلیل وتحریم کو لے کر ان بڑے بڑے امور میں اسلام کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ "مسلم" نہیں ہے۔

رہے ان آیات میں حلف و یمین اور قسم کے احکام، سو وہ بالکل واضح ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ

اے ایمان والو! یقیناً شراب اور جوا

وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ

اور بت اور پانسے کے تیر سب گندے

الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۹۰

شیطانی کام ہیں سو تم بچو ان سے تاکہ فلاح پاؤ

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَ

دشمنی اور بیر شراب اور جوئے کے ذریعہ سے

يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ

اور روکے تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے سو کیا اب

اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا

بھی تم باز آؤ گے؟ اور حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو

الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا

رسولؐ کا اور بچتے رہو پھر اگر تم پھر جاؤ گے تو جان لو

Marfat.com

إِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ

کہ ہمارے رسول کا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے کھول کر نہیں ہے

عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ

ان پر لوگوں پر جنہوں نے ایمان قبول کیا اور نیک کام کیے کوئی

فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا

گناہ اس میں جو کچھ وہ پہلے کھا چکے جب کہ آئندہ کو ڈر گئے اور ایمان

الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوا وَّآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوا وَ

لائے اور نیک عمل کئے پھر ڈرتے رہے اور یقین کیا پھر ڈرتے

ع ۱۲ ۲ أَحْسَنُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۳﴾

رہے اور نیکی کی اور اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنیوالوں کو

انما الخمر والمیسر الخ اس آیت سے پہلے بھی شراب (خمر) کی حرمت کے بارے میں آیات نازل ہو چکی تھیں لیکن صاف صاف اور واضح حرمت کا حکم اس آیت میں اترا۔ پہلے یہ آیت نازل ہوئی

یسئلونک عن الخمر والمیسر ط قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما (البقرہ ع ۲۴) گو اس سے نہایت واضح اشارہ حرمتِ خمر کی طرف کیا جا رہا تھا۔ مگر چونکہ صاف طور پر چھوڑنے کا حکم نہ تھا اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سن کر کہا: اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شافیاً۔ اس کے بعد دوسری آیت آئی یٰایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ الآیۃ (نساء ع ۶) مگر اس میں تحریم خمر کی تصریح نہ تھی۔ گو نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہوئی اور یہ اس بات کا قرینہ تھا کہ غالباً یہ چیز عنقریب کلیتہً حرام ہونے والی ہے۔ مگر چونکہ عرب میں شراب کا رواج انتہا کو پہنچ چکا

سلہ فوائد القرآن ص ۱۸۵

Marfat.com

تھا، اور اس کا دفعتہً چھڑا دینا مخاطبین کے لحاظ سے سہل نہ تھا۔ اس لئے نہایت حکیمانہ تدریج سے پہلے قلوب میں اس کی نفرت بٹھائی گئی اور آہستہ آہستہ حکم تحریم سے مانوس کیا گیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس دوسری آیت کو سن کر بھی وہی لفظ کہے اللھم بیّن لنا بیانا شافیا۔ آخرکار مائدہ کی یہ آیتیں نازل ہوئیں جو اس وقت سامنے ہیں۔ یعنی یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ سے لے کر فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ تک جن میں صاف صاف بت پرستی کی مانند اس گندی چیز سے بھی اجتناب کی ہدایت تھی۔ چنانچہ جناب عمرؓ فھل انتم منتھون کو سنتے ہی چلا اٹھے انتھینا، انتھینا۔ لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے، خم خالی برباد کر دیئے، مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب پانی کی طرح بہتی پھرتی تھی۔ سارا عرب اس گندی شراب کو چھوڑ کر معرفتِ ربانی اور محبت و اطاعتِ نبویؐ کی پاکیزہ شراب سے مخمور ہو گیا۔ اور اُم الخبائث کے مقابلہ میں حضورؐ کا یہ جہاد ایسا کامیاب ہوا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ جس چیز کو قرآن کریم نے اتنا عرصہ پہلے اتنی شدت سے روکا تھا۔ آج سب سے بڑے شراب خور ملک امریکہ وغیرہ اس کی خرابیوں اور نقصانات کو محسوس کر کے اس کے مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ (گو عقیدہ کے خلوص اور خوفِ آخرت کے فقدان کے باعث ناکام ثابت ہو رہے ہیں)

انصاب اور ازلام پر مناسب گفتگو اسی سورت کے شروع میں گزر چکی ہے۔

رجس من عمل الشیطان الخ شراب پی کر جب عقل جاتی ہے۔ تو بعض اوقات شرابی پاگل ہو کر آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ نشہ اترنے کے بعد بھی بعض دفعہ لڑائی کا اثر باقی رہتا ہے اور باہمی عداوتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہی حال بلکہ کچھ بڑھ کر جوئے کا ہے۔ اس میں ہار جیت پر سخت جھگڑے اور فساد برپا ہوتے ہیں۔ جس سے شیطان کو اودھم مچانے کا خوب موقع ملتا ہے۔ یہ تو ظاہری خرابی ہوئی اور باطنی نقصان یہ ہے کہ ان چیزوں میں مشغول ہو کر انسان خدا کی یاد اور عبادت الٰہی سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل مشاہدہ و تجربہ ہے۔ شطرنج کھیلنے والوں ہی کو دیکھ لو۔ نماز تو کیا۔ کھانے پینے اور گھر بار کی خبر نہیں رہتی جب یہ چیزیں اس قدر ظاہری اور باطنی نقصانات پر مشتمل ہیں، تو ایک مسلمان کیا یہ سب کچھ سن کر بھی باز نہ آئے گا۔

انما یرید الشیطٰن الخ واطیعوا اللہ الخ اگر کسی چیز کے منافع و مضار کا احاطہ نہ کر سکو تو تب بھی خدا و رسولؐ کے احکام کا امتثال کرو اور قانون کی خلاف ورزی سے بچتے رہو۔ اگر نہ بچو گے تو ہمارے پیغمبر اسلام تم کو قانون اور احکام الٰہی کھول

Marfat.com

کر پہنچا چکے۔ خلاف ورزی کا نتیجہ تم خود سوچ لو کہ کیا ہوگا؟

لیس علی الذین آمنو۔ ۔ ۔ المحسنین! نہایت صحیح اور قوی حدیث میں ہے کہ جب تحریم خمر کی آیات نازل ہوئیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ان مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے حکم تحریم آنے سے پہلے شراب پی اور اسی حالت میں انتقال کر گئے؟ مثلاً بعض صحابہؓ جو جنگ احد میں شراب پی کر شریک ہوئے اور اسی حالت میں شہید ہو گئے کہ پیٹ میں شراب موجود تھی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ عموم الفاظ اور دوسری روایات کو دیکھتے ہوئے ان آیات کا مطلب یہ ہے۔ کہ زندہ ہوں یا مردہ جو لوگ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں ان کے لئے کسی مباح چیز کے وقت اباحت کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ لوگ عام احوال میں تقویٰ اور ایمان کی خصال سے متصف ہوں پھر ان خصال میں برابر ترقی کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ تقویٰ کے درجات طے کرتے کرتے مرتبۂ احسان تک جا پہنچے ہوں جو ایک مومن کے لئے روحانی ترقیات کا آخری اور انتہائی مقام ہے جہاں پہنچ کر حق تعالیٰ اپنے بندے سے خصوصی محبت کرتا ہے۔ جیسے کہ حدیث جبرئیلؑ میں فرمایا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت یوں کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے! کیونکہ اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے پس جو پاکباز صحابہؓ ایمان پر تقویٰ میں عمر گزار کر اور نسبت احسان کو حاصل کر کے خدا کی راہ میں شہید ہو چکے ان کی نسبت اس طرح کے خلجان اور توہمات پیدا کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ ایک ایسی چیز کا استعمال کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے ہیں جو اس وقت حرام نہیں تھی مگر بعد کو حرام ہوئی

محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ (یعنی مضار دینی سے مجتنب ہونے) کے کئی درجے ہیں اور ایمان و یقین کے مراتب بھی بلحاظ قوت و ضعف متفاوت ہیں۔ تجربہ اور نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر و فکر عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے، اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت و جلال کے تصور سے قلب مامور اور ایمان و یقین مضبوط و مستحکم ہوتا رہتا ہے مراتب سیر الی اللہ کی اسی ترقی و عروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا۔ اور "سلوک" کے آخری مقام "احسان" اور ثمرہ پر بھی تنبیہ فرما دی۔

اور جن حضرات صحابہؓ کے متعلق سوال کیا گیا تھا، اس کا جواب ایک عام و تام ضابطہ بیان فرما کر ایسے عنوان سے دے دیا گیا جس میں ان مرحومین کی فضیلت و منقبت کی طرف

Marfat.com

اشارہ ہو گیا۔ ذخیرۂ احادیثِ صحیحہ میں دو مواقع ایسے ہیں جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی قسم کا سوال کیا ہے ایک موقع تو یہی تحریم خمر کے متعلق ہے اور دوسرا تحویلِ قبلہ کے موقع پر سوال کیا گیا تھا۔ کہ یارسول اللہ جو لوگ حکم تحویل سے پہلے وفات پا گئے اور ایک نماز بھی کعبہ کی طرف نہیں پڑھی، ان کی نمازوں کا کیا حال ہوگا ؟ اس پر آیت وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ان اللہ بالناس لرؤف رحیم ۵ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مسئلے ایسے تھے جن میں صاف صاف اور دو ٹوک حکم نازل ہونے سے پہلے نہایت ہی واضح آثار و قرائن ایسے موجود تھے جن کو دیکھ کر صحابہؓ انتظار کر رہے تھے اور ہر وقت صریح حکم آنے کے منتظر تھے۔

خمر کے متعلق تو ہم ابھی چند صفحے پہلے ایسی روایات نقل کر چکے ہیں جن سے ہمارے اس دعوے کا کافی سے زیادہ ثبوت ملتا ہے اور تحویل قبلہ کے باب میں قرآن کریم کی یہ آیت قد نریٰ تقلب وجهك فی السماء فلنولینّك قبلة ترضاها جو سیفول کی ابتداء میں ہے خبر دے رہی ہے کہ نبی کریمؐ ہر وقت منتظر تھے کہ کب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے واضح حالات صحابہؓ پر مخفی نہیں رہ سکتے تھے اس لئے تحویل قبلہ کا حکم جب ایک آدمی نے کسی محلہ کی مسجد میں جا کر سنا یا تو سارے نمازی محض خبر واحد کو سُن کر بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھر گئے حالانکہ بیت المقدس کا استقبال قطعی طور پر انہیں معلوم تھا اور خبرِ واحد جو ظنی ہو وہ قطعی کے لئے ناسخ نہیں ہو سکتی تھی اسی لئے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ خبرِ واحد محفوف بالقرائن" (قرینوں سے گھری ہوئی) ہونے کی وجہ سے قطعی سمجھی گئی۔ پس جو قرائن و آثار حتمی طور پر خبر دے رہے تھے۔ کہ تحریم خمر یا تحویل قبلہ کا حکم امروز و فردا میں پہنچنے ہی والا ہے۔ گویا وہ ایک طرح سے صحابہؓ کو نزولِ حکم سے پہلے مرضیٔ الٰہی پر فی الجملہ مطلع کر رہے تھے۔ اس لئے ان دو مسئلوں پر نزول حکم سے پہلے کی حالت کے متعلق سوال کرنا محل استبعاد نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً خمر کی نسبت جس کی ممانعت کے نہایت واضح اشارات ان آیتوں سے پہلے آنے والی آیات میں موجود تھے۔

[1] علامہ جار اللہ زمخشریؒ نے کشاف میں لکھا ہے کہ ان آیات میں شراب کی حرمت کو چند در چند وجوہ سے مؤکد کر دیا گیا ہے۔ اوّل جملہ کو انّما کے ساتھ شروع فرمایا۔ دوم

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ صـ ۵۲

Marfat.com

اس کو بت پرستی کے ساتھ ملا دیا۔ سوم اس کو رجس یعنی ناپاک فرمایا چہارم اسے عمل شیطانی فرمایا جو کہ تمام خرابیوں کا سرچشمہ ہے۔ پنجم اس سے اجتناب کا واضح حکم دیا۔ ششم فلاح کو اس کے اجتناب سے مشروط فرما دیا۔ ہفتم اس کی علت تحریم یعنی عداوت و بغض ہونے کا باعث ہونا اور نماز و عبادت سے غافل کرنا بیان فرمائی۔ یعنی یہ چیز معاش اور معاد دونوں کے لئے مضر ہے۔

امام مجاہدؒ اور طاؤسؒ سے روایت ہے کہ ہر وہ چیز جس میں قمار کا لگاؤ ہو وہ جوا ہے (میسر ہے) حتیٰ کہ بچوں کا شرطیں لگا کر مٹکے یا کوڑیاں کھیلنا بھی جوا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے متعدد صحیح احادیث سے ثابت کیا ہے کہ شراب کی بیع و شراء بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح اس کا استعمال کرنا اور ہر نشہ آور چیز کی حرمت بھی اسی طرح ہے جس طرح شراب کی حرمت۔

عبداللہؓ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے شراب کے دس متعلقات پر لعنت فرمائی ہے۔ خود شراب پر لعنت، پینے والے پر لعنت، پلانے والے پر لعنت، بیچنے والے پر لعنت، خریدنے والے پر لعنت، اس کے کشید کرنے والے پر لعنت، شراب بنا کر تیار کرنے والے پر لعنت، شراب اٹھا کر لے جانے والے پر لعنت، جس کے لئے لے جا رہا ہو اس پر لعنت، اور شراب کی قیمت کھانے والے پر بھی لعنت۔

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ عقل پر پردہ ڈالنے والی ہر پینے کی چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ حضرت عثمانؓ ذوالنورین سے مروی ہے کہ شراب سے بہت بچتے رہو کیونکہ وہ ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

الخمر ہر پینے کی نشہ آور چیز کا نام ہے۔ المیسر لغت میں پانسے کے تیروں سے قمار بازی ہے۔ پھر ہر طرح کے جوئے کے لئے یہ لفظ شرع میں استعمال ہونے لگا۔ الانصاب وہ پتھر (گھڑے ہوئے یا ان گھڑے) جن کے پاس وہ لوگ قربانیاں کرتے تھے اور ان کی عبادت و احترام کرتے تھے الازلام وہ تیر جنہیں فال یا نحوست لینے کے لئے پانسے کے طور پر پھینکتے تھے اور وہ لکڑی کے پتلے ٹکڑے ہوتے تھے۔

الرجس ہر وہ چیز جس میں سے مادی یا معنوی لحاظ سے نفرت یا گھن آئے۔ رجس

۱؎ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۹۰ (اردو ترجمہ)
۲؎ المراغی ج ۷ ص ۲۰، تفسیر المنار ج ۷ ص ۹۴، ۹۹

Marfat.com

کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً عقلی، طبعی یا شرعی مثلاً شراب وجوا۔ اور بعض چیزوں میں ہر طرح سے گھن آتی ہے مثلاً مردار، کیونکہ عقلاً، طبعاً اور شرعاً وہ قابلِ نفرت ہے۔ عداوت کا معنیٰ ہے حق سے تجاوز کر کے کسی کو اذیت دینا۔ طعم ہر کھانے پینے کی چیز کے لئے آتا ہے۔ مثلاً فاذا طعمتم فانتشروا الایۃ اس میں بمعنیٰ اکل ہے اور ومن لم یطعمہ فانہ منی اس آیت میں پینے کے لئے آیا ہے۔

اسلام برائی کو روکنے سے پہلے اس کا منبع اور منفذ بند کرتا ہے زمانۂ جاہلیت میں بہت سی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں ان میں سے ایک ایک پر زور لگانے کی بجائے اسلام نے اوّلاً توحید و رسالت اور اخلاص کا عقیدہ مضبوط کیا۔ حضورؐ نے تیرہ سال مسلسل اس کے لئے جدوجہد کی۔ جب یہ عقیدہ چند قدسی نفس انسانوں میں پوری طرح رچ بس گیا تو پھر ایک فطری تدریج کے ساتھ خباثت اور محرکات کی تفصیل آہستہ آہستہ بیان کی گئی۔ ہر حکم سے پہلے لوگ اس کو ماننے اور عمل کے لئے مستعد تھے۔ چنانچہ انہیں باز رکھنے یا روکنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی ورنہ شراب، جوا اور بت پرستی اہلِ عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اگر عقیدہ و اخلاص مضبوط نہ کر لیا جاتا تو ان چیزوں کو ترک کر دینا بظاہر نہایت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

جب پہلی گرہ یعنی شرک و کفر کی گرہ کھل گئی تو گویا ساری گرہیں کھل گئیں حضورؐ نے اس سے پہلے جہاد میں جب کامیابی پائی تو راستہ صاف ہو گیا۔ اور ہر خباثت اور رذالت کے خلاف الگ الگ نئے سرے سے جہاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ پس مناسب وقت پر احکام آتے رہے اور اہلِ ایمان انہیں دل و جان سے تسلیم کرتے چلے گئے۔ ان میں عقیدے کا خلوص اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ شراب کی حرمت کا حکم آنے پر مٹکے توڑ ڈالے، صراحیاں پھینک دیں۔ پیالے اور جام پھوڑ دیئے اور شراب مدینہ کی گلیوں میں سیلاب کے پانی کی مانند بہا دی۔

حرمت شراب کا حکم ہجرت کے تیسرے سال جنگِ اُحد کے بعد آیا تھا۔ لوگ صدق دل سے اسے قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ بس ایک منادی کرنے والے نے مدینہ کی گلیوں میں پکار کر کہہ دیا کہ اے لوگو! شراب حرام ہو چکی ہے۔ بس پھر کیا تھا جس کے ہاتھ میں جام تھا اس نے اسے توڑ ڈالا۔ جس کے منہ میں گھونٹ تھا اس نے اسے باہر پھینک دیا، مشکیں پھاڑ دی گئیں اور مٹکے اور صراحیاں توڑ دی

لہ فی ظلال القرآن ص ۲۹، ۳۸

Marfat.com

گئیں۔ اب حالت یہ تھی کہ گویا کبھی نشہ یا شراب یہاں تھی نہیں۔

قرآن پاک نے صرف ایک قانونی حکم سنانے پر ہی اکتفا نہیں فرمائی بلکہ شراب اور جوئے کی واضح اور ظاہر و باہر مضرتوں کو بھی علی الاعلان بیان فرما کر حکمت اور رحمت کا حق ادا کیا ہے۔ وہ یہ کہ شیطان ان کے ذریعے سے عداوت و بغض پیدا کرتا ہے۔ یہ حقیقت تجربے سے ثابت ہے کہ شراب عقل کو زائل کرتی اور فتنہ و فساد اور لڑائیاں برپا کرتی ہے۔ جوا شراب کا دوست اور ساتھی ہے۔ اس سے مادہ پرستی، خود غرضی، مال و دولت کی محبت، مفت خوری، کام چوری، محنت و مشقت اور کسب حلال سے جی چرانا، خسارے اور نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ ہار جیت سے حسد و بغض، دشمنی، قہر و غضب اور کینہ و عداوت پیدا ہوتے ہیں۔ جیتنے والا بچھو اور سانپ بن جاتا ہے اور ہارنے والا زخمی سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے، کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میرا مال دوسرا شخص بلا کسی قیمت و معاوضے کے ہتھیا کر لے گیا ہے۔ ان چیزوں سے معاشرے میں فساد و انتشار پھیلتا ہے۔

رہی یہ بات کہ دونوں خبیث چیزیں ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہیں سو اس پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی حاجت نہیں یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور اسلامی احکام و نواہی میں اصل چیز ایمان و عقیدے کے بعد اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے اسی لئے ان آیات میں اس پر زور دیا گیا ہے اور واحذروا سے مخالفت اور نافرمانی کے دروازے بند کرنا مدِ نظر ہے۔ یعنی مخالفتِ احکام سے بچو صحیح احادیث و آثار سے ثابت ہے کہ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور اسلام جو اپنے ماننے والوں میں دائمی ہوشیاری، بیداری، شجاعت، عزیمت، ارادے کی پختگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ پس وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ لوگ زندگی اور اس کی حقیقتوں سے بھاگنے کے لئے نشہ کی پناہ لیں اور اوہام و خرافات میں زندگی بسر کریں۔

جمہور فقہاء کے نزدیک شراب فی ذاتہٖ حرام ہے یعنی صرف اس کا پینا ہی حرام نہیں بلکہ ہر استعمال حرام ہے۔ اور وہ دوسری جنسی نجاستوں کی مانند نجس ہے۔

یا تقویٰ کا ذکر بار بار تکرار آیا ہے۔ ایک دفعہ ایمان و عمل صالح کے ساتھ دوسری دفعہ پھر ایمان کے ساتھ اور تیسری احسان کے ساتھ میری نگاہ سے اس سلسلے میں جو بہترین تفسیر گزری ہے وہ ابن جریر طبری کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ پہلا تقویٰ قبول و تصدیق و عمل کا ہے دوسرا تصدیق پر ثابت قدم رہنے کا اور تیسرا احسان و تقرب بالنوافل کا تقویٰ ہے۔

Marfat.com

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان جب عقیدہ اور عمل کا خلوص پیدا کر چکے ہیں۔ اور ان کا تقویٰ وقت کے ساتھ ساتھ ارتقائی منازل اختیار کرتا رہا ہے احکام شرع کا جو مقصد تھا یعنی اطاعت و فرماں برداری وہ ان میں آچکی ہے تو شراب کی حرمت سے پہلے کے استعمال پر ہرگز گرفت نہیں ہوگی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ

اے ایمان والو ضرور تم کو آزمائے گا اللہ ایک بات

مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ

سے اس شکار میں کہ جس پر پہنچتے ہیں تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى

تاکہ ظاہر کر دے اللہ کہ کون اسی سے ڈرتا ہے بن دیکھے پھر جس نے زیادتی کی اسکے

بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۹۴

بعد تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ

اے ایمان والو نہ مارو شکار

وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا

جبکہ تم احرام میں ہو اور جو کوئی اسے مارے تم میں سے جان بوجھکر

فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ

تو اس کا بدلہ ہے اس مارے ہوئے کے برابر مویشی میں سے جو تجویز

بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ

کریں دو معتبر آدمی تم میں سے اس طرح کہ وہ جانور بھیجا جائے کعبہ

Marfat.com

الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ

تک پہنچایا جائے یا اس پر کفارہ ہے چند محتاجوں کو کھلانا یا اس کے

عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ

برابر روزے تاکہ وہ چکھے سزا

اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ

اپنے کام کی، معاف کر دیا اللہ نے جو کچھ ہو چکا اور جو کوئی پھر کرے گا

فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۹۵

تو اس سے بدلے گا اللہ اور اللہ زبردست بدلہ لینے والا ہے

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا

حلال ہوا تمہارے لئے شکار دریا کا اور دریا کا کھانا تمہارے

لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ

فائدہ کے لئے اور سب مسافروں کے لئے اور حرام ہوا تم پر شکار

الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ

جنگل کا جب تک تم احرام میں رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو

اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۹۶

جس کے پاس تم جمع کئے جاؤ گے

پچھلے[1] رکوع میں تحریم طیبات اور اعتداء سے منع فرما کر بعض چیزوں سے اجتناب کا حکم دیا تھا جو دائمی طور پر حرام ہیں اس رکوع میں بعض ایسی چیزوں کے ارتکاب

---

[1] فوائد القرآن ص ۱۵۹

Marfat.com

سے منع کیا گیا ہے۔ جن کی حرمت دائمی نہیں بلکہ بعض احوال و اوضاع سے مخصوص ہیں یعنی بحالتِ احرام شکار کرنا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مطیع و فرماں بردار بندوں کا یہ امتحان ہے کہ وہ حالتِ احرام میں جب کہ شکار اُن کے سامنے ہو۔ اور بسہولت اُس کے مارنے یا پکڑنے پر بھی قادر ہوں، کون ہے جو بن دیکھے خدا سے ڈر کر اس کے حکم کا امتثال کرتا اور اعتداء (احکام خداوندی سے تجاوز کرنے) کی خدائی سزا سے خوف کھاتا ہے۔" اصحاب سبت کا قصہ سورۃ البقرہ میں مذکور ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ نے خاص شنبہ کے دن مچھلی کے شکار سے منع فرمایا تھا مگر انہوں نے مکاری اور حیلہ بازی سے اس حکم کی مخالفت کی اور حد سے تجاوز کر گئے۔ خدا نے ان پر نہایت رسوا کن عذاب نازل فرمایا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے اُمتِ محمدیہ کا تھوڑا سا امتحان اس مسئلہ میں لیا کہ حالتِ احرام میں شکار نہ کریں۔

حدیبیہ کے موقع پر جب کہ یہ حکم بھیجا گیا تو شکار اس قدر قریب اور کثیر تھا کہ بعضوں نے نیزوں سے مار سکتے تھے۔ مگر اصحاب رسول اللہ نے ثابت کر دکھایا کہ خدا کے امتحان میں اُن کے برابر دنیا کی کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکی۔

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ : اس لفظ سے اللہ تعالیٰ کے علم کے حدوث (قدیم نہ ہونے) کا وہم گزرتا ہے۔ لیکن یہ وہم غلط ہے۔ یہاں اس سے مراد کسی معلوم چیز کا معلوم ہونا نہیں بلکہ لوگوں کو جو چیزیں بالواسطہ معلوم نہیں ہو سکتیں۔ ان کا اظہار ہے۔ اور قرآنی محاورے میں یہ لفظ امتحان و اختبار کے معنیٰ میں بھی بولا جاتا ہے۔

وَاَنْتُمْ حُرُمٌ : اس کے کچھ احکام سورۃ مائدہ کی ابتداء میں بیان کئے جا چکے ہیں۔

متعمداً : جان کر مارنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا مجرم ہونا بھی معلوم ہو اور یہ چیز بھی مستحضر ہو کہ حالتِ احرام میں شکار جائز نہیں یہاں صرف متعمداً کا حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ کہ اس کے فعل کی جزاء یہ ہے اور خدا جو انتقام لے گا وہ الگ رہا۔ جیسا کہ ومن عاد فینتقم اللہ منہ سے تنبیہ فرمائی۔ اور اگر بھول کر شکار کیا تو جزاء تو یہی رہے گی یعنی ہدی یا طعام یا صیام، البتہ خدا اس سے انتقامی سزا اٹھا لے گا۔

فجزاء مثل ما قتل الخ حنفیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر احرام میں شکار پکڑا تو فرض ہے کہ چھوڑ دے۔ اگر مار دیا تو دو تجربہ کار صاحبِ بصیرت معتبر آدمیوں سے اس جانور کی قیمت لگوائے اسی قدر قیمت کے مویشی میں سے ایک جانور لے کر (مثلاً بکری، گائے، اونٹ وغیرہ) کعبہ کے نزدیک یعنی حدودِ حرم میں پہنچا کر ذبح کرے اور

Marfat.com

خود اس میں سے نہ کھائے۔ یا اُسی قدر قیمت کا غلہ لے کر محتاجوں کو فی محتاج صدقۂ فطر کی مقدار تقسیم کر دے یا جس قدر محتاجوں کو پہنچتا اتنے روزے رکھ لے۔

عفا اللہ عما سلف: یعنی نزولِ حکم سے پہلے یا اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں کسی نے اگر یہ حرکت کی تھی تو اُس سے اب خدا تعالیٰ تعرض نہیں کرتا۔ حالانکہ اسلام سے پہلے بھی عرب حالتِ احرام میں شکار کو نہایت بُرا جانتے تھے۔ اس لئے اس پر مواخذہ بے جا نہ تھا کہ جو چیز تمہارے زعم کے مطابق جرائم میں داخل تھی اُس کا ارتکاب کیوں کیا تھا۔

عزیز ذوانتقام: وہ عزیز ہے۔ اس لئے کوئی مجرم اُس کے قبضہ قدرت سے بھاگ نہیں سکتا۔ اور وہ سزا دینے والا ہے۔ یعنی بہ تقاضائے عدل و حکمت جو جرائم سزا دینے کے قابل ہیں خدا اُن سے درگزر کرنے والا نہیں۔

احل لکم صید البحر . . . تحشرون: حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے فرمایا ہے "احرام میں دریا کا شکار یعنی مچھلی حلال ہے اور دریا کا کھانا یعنی جو مچھلی پانی سے جدا ہو گئی اور مر گئی۔ اس نے پکڑی نہیں تھی وہ بھی حلال ہے۔ فرمایا یہ تمہارے فائدہ کو رخصت دی، پھر کوئی نہ سمجھے کہ حج کے طفیل سے حلال ہے اس لئے فرمایا کہ اور سب مسافروں کے فائدہ کو۔ مچھلی اگرچہ تالاب میں ہو وہ بھی شکارِ دریا ہے۔ یہ حکم شکار کا معلوم ہوا۔ احرام کے اندر۔ اور احرام میں قصد ہے مکہ کا۔ اُس شہر مکہ اور گرد و پیش میں ہمیشہ شکار مارنا حرام ہے بلکہ شکار کو ڈرانا اور بھگانا بھی۔

امام[1] ابوحنیفہ وغیرہ علماء کے نزدیک محاورۂ عرب میں صید یعنی شکار وحشی جانور کو کہتے ہیں۔ خواہ کھانے میں آتا ہو یا نہ آتا ہو اس تقدیر پر بھیڑیا اور گیدڑ وغیرہ کے شکار کی بھی حرم میں ممانعت ہے اور ان کے مارنے والے پر تاوان آئے گا۔ ہاں سانپ، بچھو، چیل، کوّا اور دیوانہ کتا جن کو حدیث میں پانچ فواسق، فسادی اور مضر جانور، فرمایا گیا ہے وہ بموجب حدیث اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور اُن کے قتل کی حل و حرم میں اجازت دی گئی ہے۔

بری اور بحری جانوروں میں فرق یہ ہے کہ بحری تو وہ جانور ہیں جو پانی میں پیدا ہوں اور وہیں زندہ رہ سکتے ہوں اور جو خشکی میں پیدا ہوتے اور پانی میں رہتے ہیں یا کبھی خشکی میں اور کبھی پانی میں رہتے ہیں وہ سب بری جانور ہیں مثلاً مینڈک، سرطان، گوہ اور مگلا وغیرہ۔

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۵۷

Marfat.com

جمہور[1] سلف وخلف اس پر متفق ہیں کہ مجرم نے جب شکار کو قتل کر دیا تو اس پر فدیہ دینا واجب ہے اور پہلی، دوسری یا تیسری خطاء میں کوئی فرق نہیں۔ خواہ کتنی ہی دفعہ ہو اور فعل خطا اور فعل عمد حکم سزا میں برابر ہیں۔

ابتلاء[2] کا معنیٰ ہے امتحان واختبار تنالہ ایدیکم ورماحکم: اس سے مراد شکار کی کثرت اور پکڑنے کی آسانی ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تنالہ ایدیکم سے مراد چھوٹے جانور ہیں یا وحشی جانوروں کے بچے جنہیں ہاتھوں سے پکڑا جا سکتا ہے۔ اور رماحکم سے مراد وہ شکار ہے جو بڑا ہو ہاتھ سے نہ پکڑا جا سکے۔ عدل کا معنیٰ ہے برابر جو عقل سے برابر معلوم ہو اور عدل ع کے کسرہ سے وہ مساوی اور برابر چیز ہے جو محسوس ہو سکے۔ وبال اصل میں وبل سے ہے۔ یعنی بہت بارش (وابل بھی کہتے ہیں) طعام وبیل کا معنیٰ ہے ثقیل کھانا۔ جس امر سے ضرر کا خوف ہے اسے وبال کہتے ہیں۔ البحر سے مراد یہاں ماء کثیر ہے چاہے کہیں ہو اور جس میں مچھلیاں پائی جائیں۔

[3] لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب: ایک مسلم کے ضمیر میں ایمان ویقین اور اسلامی عقیدے کی بنیاد یہی "بن دیکھے خدا سے ڈرنا ہے اسی عقیدے پر ایمانیات، رویے اور دین کا دارومدار ہے۔ اور یہی خلافۃ فی الارض کی بنیاد بھی ہے۔

لوگ اللہ کو دیکھ نہیں سکتے لیکن جب ایمان ہو تو اسے اپنے دلوں میں موجود پاتے ہیں۔ وہ ان کی نسبت "غائب" ہے۔ لیکن مومن کا دل اسے پہچانتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے۔

ع :- اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل!

ایمان باللہ کی حقیقت یہی ہے کہ اسے بن دیکھے ماننا اور اس کی مخالفت سے خوف رکھا جائے۔ اسے محسوس طور پر دیکھنے یا مشاہدہ کرنے کی حاجت نہ رہے۔ اس غیب کا شعور "شہادت" کہلاتا ہے جس کی ایک مومن بن دیکھے شہادت دیتا ہے۔ جوں جوں یہ شعور پختہ ہوگا۔ آدمی حیوانیت سے نکل کر اپنے اصل مقام تک ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس شعور کا فقدان "مادیت" ہے جسے دوسرے لفظوں میں "حیوانیت" بھی کہا جا سکتا ہے اور حیوان شعور سے خالی ہے۔ یا اگر ایک درجہ میں اس میں شعور ہے تو بالکل دھندلا سا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۷ ص ۲ [2] المراغی ج ۷، ص ۳ تفسیر المنار ج ۷، ص ۱۱۲
[3] فی ظلال القرآن ج ۷، ص ۴

Marfat.com

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ

اللہ نے کر دیا کعبہ کو جو کہ بزرگی والا گھر ہے قیام کا باعث، لوگوں

وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ط

کے لئے اور بزرگی والے مہینوں کو اور قربانی کو اور پٹہ ڈالے جانوروں کو

ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي

یہ اس لئے کہ تم جان لو کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ

اور جو کچھ زمین میں ہے اور بے شک اللہ ہر چیز

شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۹۷ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

سے واقف ہے - جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت

الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۹۸ مَا

ہے اور بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے - رسول کے

عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا

ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا اور اللہ کو معلوم ہے

تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۹۹ قُلْ لَّا يَسْتَوِي

جو کچھ تم ظاہر میں کرتے ہو اور جو کچھ چھپا کر کرتے ہو - تو کہہ دے کہ برابر نہیں

الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ

ناپاک اور پاک اگرچہ تجھ کو بھلی لگے ناپاک کی

Marfat.com

الْخَبِيثُ ج فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ

کثرت سوڈرتے رہو اللہ سے اے عقل مندو

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۱۰۰ ع ۱۳ ع ۲

تاکہ تمہاری نجات ہو۔

کعبہ شریف دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے لوگوں کے قیام کا باعث ہے۔ حج و عمرہ تو وہ عبادات ہیں جن کا ادا کرنا براہِ راست کعبہ ہی سے متعلق ہے لیکن نماز کے لئے استقبال قبلہ شرط ہے اس طرح کعبہ لوگوں کی عبادات کے قیام کا باعث ہے پھر حج وغیرہ کے موقع پر تمام بلاد اسلامیہ سے لاکھوں مسلمان جب وہاں جمع ہوتے ہیں تو بے شمار تجارتی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور روحانی فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا نے اس جگہ کو "حرم امن" بنا دیا ہے، اس لئے انسانوں بلکہ حیوانوں تک کو وہاں رہ کر امن نصیب ہوتا ہے۔ عہد جاہلیت میں جبکہ ظلم اور خونریزی اور فتنہ و فساد محض معمولی بات تھی ایک آدمی اپنے باپ کے قاتل سے بھی حرم شریف میں تعرض نہ کرتا تھا۔ مادی حیثیت سے آدمی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اس وادی غیر ذی زرع میں اتنی افراط سے سامان خورد و نوش اور نفیس قسم کے پھل اور میوے کہاں سے کھنچے چلے آتے ہیں؟ یہ سب حیثیات قیاماً للناس میں معتبر ہو سکتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علم الٰہی میں پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کہ نوع انسان کے لئے یہاں سے عالمگیر اور ابدی ہدایت کا چشمہ پھوٹے گا اور مصلح اعظم سید کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد و مسکن مبارک بننے کا شرف بھی سارے جہاں میں اسی خاک پاک کو حاصل ہوگا (یعنی یہ مقام مرکز کائنات بنے گا) ان سب وجوہ سے کعبہ کو قیاماً للناس کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ کعبہ تمام زمین کے انسانوں کے حق میں اصلاح اخلاق، تکمیل روحانیت اور علوم ہدایت کا مرکزی نقطہ ہے۔ اور کسی چیز کا قیام اپنے مرکز کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ محققین کے نزدیک قیاماً للناس کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ شریف کا مبارک وجود کل عالم کی بقاء اور قیام کا باعث ہے دنیا کی آبادی اسی وقت تک ہے جب تک خانۂ کعبہ اور اس کا احترام کرنے والی مخلوق دنیا میں موجود ہے جس وقت خدا کا

لہ فوائد القرآن ص ۱۶۰

Marfat.com

ارادہ یہ ہوگا کہ کارخانۂ عالم کو ختم کیا جائے تو سب کاموں سے پہلے اسی مبارک مکان کو جسے بیت اللہ شریف کہتے ہیں اٹھا لیا جائے گا۔ جیسا کہ بنانے کے وقت بھی زمین پر سب سے پہلا مکان یہی بنایا گیا تھا۔ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ الخ

بخاری کی حدیث میں ہے کہ ایک سیاہ فام حبشی جسے ذوالسویقیتین کے لقب سے یاد فرمایا ہے، عمارت کعبہ کا ایک ایک پتھر اکھیڑ کر ڈال دے گا۔

جب تک خدا کو اس دنیا کا نظام قائم رکھنا منظور ہے کوئی طاقتور سے طاقتور قوم بھی جس کا مقصد کعبہ کو ہدم کرنا ہو۔ اپنے اس ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اصحاب فیل کا قصہ تو ہر شخص نے سنا ہے۔ لیکن ان کے بعد بھی ہر زمانہ میں کتنی قوموں اور شخصیتوں نے ایسے منصوبے باندھے ہیں اور باندھتے رہتے ہیں۔ یہ محض خدائی حفاظت اور اسلام کی صداقت کا عظیم الشان نشان ہے کہ باوجود سامان و اسباب ظاہرہ کے فقدان کے آج تک کوئی شخص اس ابلیسانہ مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور نہ ہو سکے گا۔ اور جب عمارت کعبہ کے گرا دینے میں قدرت کی طرف سے مزاحمت نہ رہے گی تو سمجھ لو کہ عالم کی ویرانی کا حکم آپہنچا۔ دنیا کی حکومتیں اپنے دارالسلطنت اور قصرِ شاہی کے لئے لاکھوں سپاہی کٹوا دیتی ہیں اگر کبھی خود ہی قصر شاہی کو کسی مصلحت سے ترمیم یا تبدیل کرنا چاہیں تو معمولی مزدوروں سے اسے گروا کر بدل دینے کا کام لیا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے امام بخاریؒ نے باب جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس میں ذوالسویقتین کی حدیث درج کر کے قیاماً للناس کے اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہم نقل کر چکے ہیں (حضرت الاستاذ شیخ الہندؒ نے درس بخاری میں اس پر تنبیہ فرمائی تھی!) بہرحال آیت زیر بحث میں احکام محرم بیان فرمانے کے بعد کعبہ شریف کی عظمت و حرمت بیان کرنا مقصود ہے پھر کعبہ اور احرام کی مناسبت سے شہر حرام، ہدی، اور قلائد کا بھی ذکر فرما دیا، جیسا کہ اسی سورت کی ابتداء میں بھی ان دونوں مضمونوں کو جمع فرما دیا۔ واللہ اعلم

ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا . . . . عَلِيْمٌ یعنی کعبہ وغیرہ کے قیاماً للناس بنانے میں جن مصالح دینی و دنیوی کی رعایت فرمائی اور ان پر بالکل خلافِ قیاس جو عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی وہ اس کی دلیل ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی چیز حق تعالیٰ کے غیر محدود علم کے احاطہ سے باہر نہیں ہو سکتی۔

Marfat.com

اِعْلَمُوْا . . . . رَحِیْمٌ : جو احکام حالتِ احرام یا احترامِ کعبہ وغیرہ کے متعلق دیئے گئے، اگر ان کی عمداً خلاف ورزی کرو گے تو سمجھ لو کہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے۔ اور اگر بھول چوک سے کچھ تقصیر ہو جائے پھر کفارہ وغیرہ سے اس کی تلافی کر لو۔ کیونکہ وہ غفور رحیم بھی ہے۔

مَا عَلَی الرَّسُوْلِ . . . . تَکْتُمُوْنَ : پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدا کا قانون اور پیام پہنچا کر اپنا فرض ادا کر دیا اور خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو چکی۔ اب ظاہر و باطن میں جیسا عمل کرو گے وہ سب خدا کے سامنے ہے۔ حساب و جزاء کے وقت ذرّہ ذرّہ تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ . . . . تُفْلِحُوْنَ : اس رکوع سے پہلے رکوع میں فرمایا تھا کہ طیّبات کو حرام مت ٹھہراؤ بلکہ اُن سے اعتدال کے ساتھ تمتّع کرو۔ اس مضمون کی تکمیل کے بعد خمر وغیرہ چند ناپاک چیزوں کی حرمت بیان فرمائی۔ اُسی سلسلے میں محرم کے شکار کو حرام کیا یعنی جس طرح خمر اور میسر وغیرہ خبیث چیزیں ہیں اسی طرح محرم کے شکار کو سمجھو۔ محرم کی مناسبت سے چند ضمنی چیزوں کو بیان فرمانے کے بعد اب متنبّہ فرماتے ہیں کہ طیّب اور خبیث یکساں نہیں ہو سکتے۔ تھوڑی چیز اگر طیّب و حلال ہو وہ بہت سی خبیث و حرام چیز سے بہتر ہے۔ عقلمند کو چاہیئے کہ ہمیشہ طیّب و حلال کو اختیار کرے، گندی اور خراب چیزوں کی طرف خواہ وہ دیکھنے میں کتنی ہی زیادہ ہوں۔ اور بھلی لگیں، نظر نہ اٹھائے۔

[1] ثعلبہ بن حاطب انصاری نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ دُعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بہت سا مال عطا فرمائے۔ تو حضرت نے ارشاد فرمایا تھوڑا مال جس کا تم شکر ادا کرو، وہ اس کثیر سے بہتر ہے جس کا شکر ادا نہ کرو۔

[2] الکعبۃ لغت میں مکعب یعنی مربّع گھر کو کہتے ہیں قیاما للناس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے منافع و مصالح کے قیام کا وہ باعث ہے۔ "وادٍ غیر ذی زرع" کے رہنے والے اسی گھر کے باعث رزق پاتے ہیں اور اسی وجہ سے وہاں کائنات کے گوشے گوشے سے ہر چیز کھنچی آتی ہے۔ یہ دعاء ابراہیمیؑ کی قبولیت کی علامت ہے اور کعبہ کو دینی مرکز ٹھہرایا گیا ہے اور وہاں کے رہنے والوں کی عزت و احترام اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۷ ص ۲۷ (اردو ترجمہ) [2] المراغی ج ۷ ص ۳۴، ۳۷، تفسیر المنار ج ۷ ص ۱۱۶، ۱۲۴

Marfat.com

اور اس جگہ کو بے نظیر طور پر پُرامن بنا دیا گیا ہے۔

اسی طرح شہر حرام بھی امن و امان کا باعث ہے، خوف زائل ہو جاتا ہے اور اس میں سفر و تجارت کی آسانی ہو جاتی ہے۔ انہی دنوں میں وہ سال بھر کی روزی جمع کر لیتے ہیں۔ اگر اس مہینہ کا احترام نہ ہوتا تو وہ لوگ فنا ہو جاتے۔

اسی طرح ہدی میں بھی لوگوں کے لئے سبب قیام ہے کیونکہ وہ فقراء کی معیشت کا ذریعہ ہے اور قلائد بھی قیام کا باعث ہیں۔ اگر کوئی شخص با حرمت مہینے کے علاوہ بھی ہدی کے گلے میں قلادہ ڈال کر چل پڑے تو اسے کوئی نہ چھیڑے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و رحمت اور علم وسیع کا نتیجہ ہے کہ دنیا کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جہاں کامل امن و امان ہے۔ قدیم و جدید تہذیبیں اور اقوام ایسا کوئی مقام بنانے سے عاجز رہے ہیں جہاں سال کے ایک معین عرصہ میں پورا امن و امان ہو۔

ان آیات میں شدید العقاب کا لفظ غفور رحیم سے مقدم کیا گیا ہے۔ کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عقاب کی انتہا مغفرت و رحمت ہوتی ہے کیونکہ بموجب حدیث قدسی اللہ کی رحمت اس کے عقب پر سبقت لے جا چکی ہے۔

احقر مؤلف عرض کرتا ہے کہ ان آیات میں کعبۃ اللہ اور اس کے متعلقہ شعائر و عبادات کو قیاماً للناس فرمانے کا مطلب ان کی مرکزی و بین الاقوامی حیثیت کو بیان فرمانا ہے اسلام کی بین الاقوامی حیثیت اور اس کا نسل، رنگ و خون، وطن بلکہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہونا جتنا کعبۃ اللہ میں حج کے موقع پر ہوتا ہے اتنا کسی اور عبادت میں نہیں ہوتا۔ تمام اطراف عالم سے ہر قوم و نسل کے لوگ وہاں ایک ہی لباس میں ایک ہی حیثیت سے ایک جیسے اعمال کرتے ہوئے جمع ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک آفاقی و کائناتی دین ہے۔ حج باحرمت مہینے یعنی ذوالحجہ میں ادا ہوتا ہے اور اسی موقع پر "ہدی" اور گلے میں ٹپکے پڑے ہوئے جانور بھی معبود واحد کی نیاز کے لئے پیش ہوتے ہیں۔ اس لئے کعبہ کے ساتھ ان سب کا ذکر فرما دیا گیا ہے۔ حضرت الاستاذ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اس مضمون کی طرف واضح اشارات اپنے فوائد میں فرمائے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ہم نے فوائد سے نقل کیا ہے۔ ان کی باقی تقریر بے نظیر ہزار ہا تفسیری و حدیثی مضامین کا نچوڑ ہے۔ بار بار پڑھیئے اور لطف اٹھائیے۔

سید قطب شہید[1] فرماتے ہیں کہ اوپر کی گزری ہوئی آیات میں بیان کردہ حرمتوں

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۴۳، ۴۸

Marfat.com

کا تعلق امن و سلامتی، اور اطمینانِ قلب کے مرکز بیت اللہ سے براہِ راست ہے۔ یہ حرمتیں انسان، پرند و چرند، شجر و حجر اور پھر حشرات الارض تک کو شامل ہیں۔ اور محرم کے لئے حالتِ احرام میں حدِ حرم کے اندر بہت سی حلال چیزوں سے بھی پرہیز واجب کر دیا گیا ہے۔

کعبہ کی حرمت و تقدیس کو اسلام نے تو کامل صورت میں قائم کیا ہی ہے۔ مگر جاہلیت میں بھی کعبہ اور اس کا ماحول امن و سلامتی اور اطمینان اور بے خوفی کا مرکز تھا۔ اس گھر کو یہ مزیت و فضیلت اور مرکزیت ابراہیمؑ کے زمانہ سے رہی ہے۔ حضورؐ نے حرم کے درخت کاٹنے، گھاس کھودنے، وحشی جانوروں کو ڈرانے گری پڑی چیز تک کو اٹھانے سے منع فرما دیا تھا۔ گم شدہ چیز صرف اس کے لئے اٹھانا جائز ٹھیرایا گیا جو اس کی تعریف و اعلان کرے۔

حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث صحیح کی بناء پر مدینہ منورہ بھی "حرم" ہے۔

پس یہ دونوں اسلام کے مرکزی و مقدس شہر مکان و زمان دونوں کے لحاظ سے امن و امان اور بے خوفی و اطمینان کا گھر ہیں۔ ضمیر انسانی کی آزادی کا گھر ہیں۔ رواداری اور محبت کا مرکز ہیں۔ انسانی مساوات کا گھر ہیں۔ یہ جگہیں نفسِ انسانی کی تربیت و تہذیب کا مرکز ہیں۔ تاکہ وہ دوسروں سے محبت، شفقت اور رواداری کا برتاؤ کرنا سیکھے۔ ظلم و ستم اور انتشار و بدامنی کی ماری ہوئی انسانیت کے سامنے سلامتی اور امن کا پیغام پیش کرے۔ کعبہ اور اس کے ماحول میں عشق و محبت کی وارفتگیوں اور انس و دل دادگی کی سرشاریوں کی پیاس بجھانے کا سامان بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اسلام ایک عجیب کامل دین ہے جو انسان کی ہر فطری ضرورت اور ہر جائز تمنا کا صحیح جواب پیش کرتا ہے۔

خبیث و طیب کا مقابلہ ایک تو حرام و حلال کی تصویر کشی کے لئے کیا گیا ہے اور دوسرے اس امت کو چونکہ "شھداء علی الناس" کا منصب دیکر مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ لہٰذا میدانِ کارزار میں اتار کر اس سے فرمایا گیا ہے کہ باطل کی کثرت سے مت ڈر۔ خبیث و طیب مساوی نہیں ہوا کرتے۔ باطل چاہے کثیر مقدار میں ہو اور حق چاہے قلیل و ضعیف نظر آئے۔ مگر تصادم کے وقت حق ہی کا پلہ بھاری رہے گا۔ کامیابی کا مدار کثرت و قلت پر نہیں حق و باطل پر ہے۔ باطل پھولا ہوا، سوجا ہوا اور کتنا ہی کثیر و مہیب کیوں نہ ہو۔ حق بہرحال حق ہے۔ حق کے سیلاب کے آگے باطل کی جھاگ اور خس و خاشاک ٹھہر نہیں سکتے۔ حق کی اصل طاقت اس کے حق ہونے میں ہے۔ اس لئے اس کے لئے کثرت و قلت ثانوی چیز ہے۔

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ

اے ایمان والو! مت پوچھو ایسی باتیں کہ اگر تم پر کھول دی

تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا

جائیں تو تم کو بری لگیں اور اگر پوچھو گے یہ باتیں

حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ

ایسے وقت میں جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ

اللہ نے ان سے درگزر کی ہے اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے ایسی باتیں پوچھ

قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

چکی ہے ایک قوم تم سے پہلے پھر ہو گئے ان سے منکر

پچھلے دو رکوع کا حاصل احکام دینیہ میں غلو اور تساہل سے روکنا تھا، یعنی جو طیبات خدا نے حلال کی ہیں۔ ان کو اپنے اوپر حرام مت ٹھہراؤ۔ اور جو چیزیں خبیث اور حرام ہیں، خواہ دائمی طور پر خواہ خاص احوال و اوقات میں ان سے پوری طرح اجتناب کرو۔ اب ان آیات میں تنبیہ فرمادی ہے کہ جو چیزیں شارع نے صراحۃً بیان نہیں فرمائیں ان کے متعلق فضول اور دور از کار سوالات مت کیا کرو۔ جس طرح تحلیل و تحریم کے سلسلے میں شارع کا بیان موجب ہدایت و بصیرت ہے، اس کا سکوت بھی، ذریعۂ رحمت و سہولت ہے۔ خدا نے جس چیز کو کمال حکمت و عدل سے حلال یا حرام کر دیا وہ حلال یا حرام ہو گئی، اور جس سے سکوت کیا اس میں گنجائش و توسیع رہی۔ مجتہدین کو اجتہاد کا موقع ملا۔ عمل کرنے والے اس کے فعل و ترک میں آزاد رہے۔ اب اگر ایسی چیزوں کے متعلق خواہ مخواہ کھود کرید اور بحث و جدال کا دروازہ کھولا جائے گا۔ بحالیکہ قرآن شریف نازل ہو رہا ہے اور تشریع (قانون سازی) کا باب مفتوح ہے۔ تو بہت ممکن ہے کہ سوالات کے جواب میں ایسے بعض احکام نازل ہو جائیں۔ جن کے بعد تمہاری یہ آزادی اور گنجائش

Marfat.com

اجتہاد باقی نہ رہے۔ پھر یہ سخت شرم کی بات ہوگی۔ کہ جو چیز خود مانگ کر لی ہے اُس کو نبھا نہ سکیں۔

سُنّتہ اللہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس چیز کے متعلق بہ کثرت سوال اور کھود کرید کی جائے اور خواہ مخواہ متفوق و احتمالات نکالے جائیں تو ادھر سے تشدید (سختی) بڑھتی جاتی ہے۔ کیونکہ اس طرح کے سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ گویا سائلین کو اپنے نفس پر بھروسہ ہے۔ اور جو حکم بھی ملے گا اُسے اٹھانے کے لئے بہمہ وجوہ تیار ہیں۔ اور اس قسم کا دعویٰ جو بندہ کے ضعف و افتقار کے مناسب نہیں مستحق بنا دیتا ہے کہ ادھر سے حکم میں کچھ سختی ہو اور جتنا یہ اپنے آپ کو قابل ظاہر کرتا ہے۔ اُسی کے مطابق امتحان بھی سخت ہو۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ذبح بقرہ والے قصے میں ایسا ہی ہوا۔

حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے۔ ایک شخص بول اٹھا کہ یا رسول اللہ ہر سال؟ فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا۔ پھر تم ادا نہ کر سکتے۔ جس چیز میں میں تم کو آزاد چھوڑ دوں تم بھی مجھ کو چھوڑ دو۔ ایک حدیث میں فرمایا:۔ کہ مسلمانوں میں وہ شخص بڑا مجرم ہے جس کے سوالات کی بدولت ایسی چیز حرام کی گئی جو حرام نہ تھی۔

بہرحال یہ آیت احکام شرعیہ کے باب میں اس طرح کے دور از کار اور بے ضرورت سوالات کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ باقی بعض احادیث میں جو یہ مذکور ہے کہ کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جزئی واقعات کے بارے میں لغو سوال کرتے تھے۔ ان کو روکا گیا۔ وہ ہماری تقریر کے مخالف نہیں ہم لاتسئلوعن اشیاء میں اشیاء کو عام رکھتے ہیں جو واقعات و احکام دونوں کو شامل ہے اور تسؤکم بھی جو بُرا لگنے کے معنیٰ میں ہے۔ اگر تعمیم رکھی جائے حاصل یہ ہوگا۔ کہ نہ احکام کے باب میں فضول سوالات کیا کرو اور نہ واقعات کے سلسلہ میں۔ کیونکہ ممکن ہے جو جواب آئے وہ تمہیں ناگوار ہو۔ مثلاً کوئی سخت حکم آیا۔ کوئی قید بڑھ گئی، یا ایسے واقعہ کا اظہار ہوا جس سے تمہاری فضیحت ہوئی، یا بیہودہ سوالات پر ڈانٹ پلائی گئی۔ یہ سب احتمالات تسؤکم کے تحت میں داخل ہیں باقی ضروری بات پوچھنے یا وہ شبہ جو کسی دلیل سے پیدا ہوا ہو اس کے رفع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

عَفَا اللّٰہُ عَنْھَا: کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن اشیاء سے درگزر کی۔ یعنی جب خدا نے ان کے متعلق کوئی حکم نہ دیا تو سائل ان کے بارہ میں آزاد ہے۔ خدا ایسی

Marfat.com

چیزوں پر گرفت نہ کرے گا۔ چنانچہ اسی سے بعض علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اشیاء میں اصل چیز اباحت ہے اور یا عفاء اللہ عنھا کا مطلب یہ ہے کہ ان فضول سوالات سے جو پہلے کئے جا چکے اللہ نے درگزر کی، آئندہ احتیاط رکھو قد سئالھا قوم الخ حدیث صحیح میں ہے کہ پہلی قومیں کثرتِ سوال اور انبیاء سے اختلاف کرنے کی بدولت ہلاک ہوئیں۔[1]

اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے کہ رسولؐ کا وظیفہ تبلیغ ہے۔ جب اس نے اپنا فریضہ ادا کر دیا تو اس کے ذمہ امت کی طرف سے کچھ اور باقی نہ رہا۔ اب امت کا فریضہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا فرض حکم سن کر اطاعت کرنا اور دل سے ماننا ہے۔ مومنوں کو زیادہ سوال نہ کرنے چاہئیں تاکہ خود بھی مشقت میں نہ پڑیں اور دوسروں کو بھی تکلیف میں نہ ڈال دیں۔

احادیث میں آتا ہے کہ بعض لوگ کبھی امتحان کی غرض سے اور کبھی ازراہِ مذاق نہایت فضول سوال کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک نے سوال کیا تھا کہ میرا باپ کون تھا؟ اور ایک بولا تھا کہ میری گم شدہ اونٹنی کہاں ہے؟ اس پر یہ آیات اتریں۔

احمدؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور ابن جریرؒ وغیرہ نے روایت کی ہے کہ انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے ایک بڑا موثر اور عجیب خطبہ دیا۔ جیسا میں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں اگر تم کو اس کا علم ہو جائے تو کم ہنسو اور زیادہ رویا کرو۔

اس پر آپؐ کے اصحاب نے اپنے چہروں کو کپڑوں سے ڈھانپ لیا اور رونے لگے۔ ان کے رونے اور تیز سانس لینے کی آوازیں نکلنے لگیں۔ تو ایک شخص کہنے لگا میرا باپ کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ فلاں تیرا باپ ہے۔ اس پر یہ آیات اتریں۔

ابن جریرؒ کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ حضورؐ نے منبر پر بیٹھ کر یہ بھی فرمایا تھا کہ آج تم مجھ سے جو پوچھو گے۔ میں اس کا واضح جواب دوں گا۔ ایک آدمی جسے تہمت کے طور پر اس کے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا جاتا تھا وہ کہنے لگا۔ اے اللہ کے نبیؐ! میرا باپ کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے۔ پھر حضرت عمرؓ اٹھے اور کہا کہ ہم اللہ پر راضی ہیں کہ وہ ہمارا ربّ ہے اسلام پر راضی ہیں کہ وہ ہمارا دین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر راضی ہیں کہ وہ ہمارے رسولؐ ہیں۔ میں فتنوں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

---

[1] تفسیر المراغی ج ۷، ص۳۹، ۴۲، تفسیر المنار ج ۷ ص۱۲۵، ۲۰۲۔

Marfat.com

وان تسئلوا عنھا حین ینزل القرآن تبدلکم

یعنی جب قرآن میں کوئی حکم اُتر آیا ہو تو اس میں کوئی خفا یا غموض نظر آئے تو اس کے متعلق سوال جائز ہے۔ اس کے بغیر خواہ مخواہ نئے نئے سوال بلا وجہ پیدا کرنا جائز نہیں۔

عفا اللہ عنھا: جن چیزوں سے خاموشی اختیار فرما کر اللہ نے تمہیں ان کا مکلف بنانے سے معافی دے دی ہے تم بھی ان کے متعلق سوال مت کرو۔ یا معنی یہ ہے کہ نہی سے پہلے جو سوال کئے جا چکے۔ ان کی معافی ہے آئندہ ایسا مت کرنا (یا عفو بمعنی اجازت ہے کہ نزول قرآن کے وقت جب کوئی واقعی ضروری بات پوچھی جائے تو اس کی اجازت دیدی گئی ہے!)

حدیث میں قیل وقال اور کثرتِ سوال سے منع فرمایا گیا ہے۔ یہی مضمون اس آیت کا بھی ہے۔ زیادہ سوال کرنے والے عمل کے میدان کے مرد نہیں ہوا کرتے اور عمل کے دنی زیادہ سوال نہیں کیا کرتے۔

سلہ قرآن صرف چند عقائد پیش کرنے اور چند احکام دینے کے لئے ہی نہیں اتارا گیا تھا۔ بلکہ اس کی غرض یہ بھی تھی ایک اُمت کی تربیت فرمائے۔ ایک معاشرہ پروان چڑھائے۔ اور افراد کو عقلی و اخلاقی بنیادوں پر تیار کرے۔ اس لئے وہ یہاں انہیں سوال کا ادب بتا رہا ہے۔ اور یہ بحث کی حدود کیا ہیں؟ اور معرفت حاصل کرنے کا ڈھنگ کیا ہونا چاہیئے۔ جب اللہ خود احکام نازل فرمانے کا ذمہ دار ہے تو بندوں کا فرض ہے کہ اس کی تفصیل و اجمال اسی پر چھوڑ دیں اور بعید از کار احتمالات اور فروض کے ذریعہ سے اپنے اوپر سختی نہ کرالیں۔

واقعی ضرورت کے وقت سوال جائز ہے۔ لیکن وہ غیبی امور جو طاقتِ بشر سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق تفصیلات کا پوچھنا جائز نہیں۔ احکام شرعیہ کو حسبِ ضرورت سوال و طلب سے واضح کرنا جائز ہے اور فرضی واقعات بنا کر سوالات گھڑنا بھی جائز نہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق مسند دارمی میں ہے کہ انہوں نے جو واقعات یا مسائل پیش نہیں آئے تھے، ان کے بارے میں سوال کرنے والے پر لعنت فرمائی۔ زید بن ثابتؓ انصاری سے ــــ جو علم فرائض و میراث میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو فرماتے کہ کیا ایسا پیش آیا ہے؟ اگر واقعی کوئی پیش آیا ہوتا تو جواب دیتے ورنہ فرماتے اسے چھوڑ دو جب پیش آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ اسی قسم کی ایک روایت عمار بن یاسرؓ

سلہ فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۵۴

Marfat.com

کے متعلق بھی موجود ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں سے زیادہ بہتر لوگ نہیں دیکھے۔ انہوں نے حضورؐ سے عمر بھر میں صرف ۱۳ سوال کئے جن کا ذکر قرآن میں آچکا ہے۔ مثلاً یسئالونک عن الشھر الحرام قتال فیہ، اور یسئالونک عن المحیض: وہ صرف مفید سوال ہی کرتے تھے بے فائدہ اور دور از کار باتیں نہ پوچھتے تھے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا

نہیں مقرر کیا اللہ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ

وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وصیلہ اور نہ حامی و لیکن کافر

يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ

باندھتے ہیں اللہ پر بہتان اور ان میں اکثر

لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا

کو عقل نہیں اور جب کہا گیا انہیں

اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا

آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے اتارا اور آؤ رسول کی طرف کہنے

مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ

لگے کافی ہے ہمیں وہ جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو بھلا کیا

لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝

اگر ہوں ان کے باپ دادا نہ جانتے کچھ اور نہ راہ جانتے تھے تب بھی ایسا ہی کریں گے

Marfat.com

لے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم و شعائر تھے مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے۔ ممکن ہے ان میں سے ہر ایک لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہے ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ بحیرہ جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے۔ کوئی اپنے کام نہ لاتا تھا۔ سائبہ جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانے کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ جو اونٹنی مسلسل مادہ بچے جنے درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ حامی نر اونٹ جو ایک خاص عدد مادہ سے جفتی کر چکا ہو۔ اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیزیں شعائر شرک ہی سے تھیں۔ جس جانور کے گوشت یا دودھ یا سواری وغیرہ سے منتفع ہونے کو حق تعالیٰ نے جائز رکھا۔ اس کی حلت و حرمت پر اپنی طرف سے قیود لگانا گویا اپنے لئے منصب تشریع تجویز کرنا ہے اور بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ ان مشرکانہ رسوم کو حق تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اس کا جواب دیا گیا، کہ اللہ نے ہرگز یہ رسوم مقرر نہیں کیں۔ ان کے بڑوں نے خدا پر بہتان باندھا اور اکثر بے عقل عوام نے اسے قبول کیا۔ الغرض یہاں تنبیہ کی گئی کہ جس طرح فضول و بیکار سوالات کر کے احکام شرعیہ میں تنگی اور سختی کرانا جرم ہے اس سے کہیں بڑھ کر یہ جرم ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی آراء و اہواء سے حلال و حرام تجویز کر لئے جائیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ ... لَا يَهْتَدُوْنَ: جاہلوں کی سب سے بڑی حجت یہی ہوتی ہے کہ جو کام باپ دادا سے ہوتا آیا ہے اس کے خلاف کیسے کریں۔ ان کو بتلایا گیا کہ اگر تمہارے اسلاف بے عقلی یا بے راہ روی سے قعر ہلاکت میں جا گرے ہوں۔ تو پھر بھی تم ان ہی کی راہ پر چلو گے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں: "باپ کا حال معلوم ہو کہ حق کا تابع اور صاحب علم تھا۔ تو اس کی راہ پکڑے نہیں تو عبث ہے یعنی کیف ما اتفق کسی کی کورانہ تقلید جائز نہیں۔

لے عرب میں ملت ابراہیمیہ کا متغیر کرنے والا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً

لے فوائد القرآن ص ۱۶۱

لے تفسیر حقانی ج ۴ ص ۶

Marfat.com

تین سو برس پیشتر ایک شخص عمرو بن لحی مکہ کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ اس بیوقوف نے سینکڑوں چیزیں از خود حرام اور بہت سی حلال کر دیں۔ مکہ میں بت اسی نے قائم کئے تھے۔ چونکہ ایسی بدرسمی یہ بدنصیب امراء و سلاطین ایجاد کیا کرتے ہیں اور عام لوگ تو بے تحقیق ان کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان میں رنڈی نچانا، ساچق، باجا گاجا، شادی غمی کی رسوم سب امراء و سلاطین کی ایجاد ہیں۔ منجملہ اور خرافات کے اس نے بحیرہ وغیرہ مقرر کئے تھے اور عوام اندھا دھند پیچھے چل پڑے تھے۔

[1] ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عمرو بن لحی کو دوزخ میں پیٹ کے بل گھسٹتے دیکھا ہے۔ اس نے سب سے پہلے جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑنے کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔

[2] ان آیات سے یہ عبرت حاصل ہوتی ہے کہ جو شخص کوئی کھانا وغیرہ از خود حرام قرار دے کر دین میں بدعت ایجاد کرے "یا سید بدوی وغیرہ کے لئے بچھڑا چھوڑے۔ یا کوئی ایسا ورد وظیفہ نکالے۔ جسے وہ دین کے شعائر کی مانند ٹھہرائے، یا اس کی مانند کوئی اور عبادت نکالے جو دین سے ثابت نہیں۔ اور یہ خیال کرے کہ ان چیزوں سے وہ اللہ کا تقرب حاصل کرے گا۔ تو وہ عمرو بن لحی خزاعی کی مانند ہے۔ کیونکہ اللہ کی عبادت صرف اس طریقے سے ہو سکتی ہے۔ جو خود اس نے اپنے رسولؐ کے ذریعے سے یا اس کی زبان سے بتا دیا ہے۔ کوئی عبادت اور تحریم و تحلیل نصِّ شرعی کے بغیر ہو نہیں سکتی۔ کسی کا یہ اختیار نہیں کہ رائے یا قیاس سے دین میں کوئی کمی بیشی کر دے

[3] قلبِ انسانی کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ اپنی اصل اسلامی فطرت پر باقی ہو گا۔ اپنے معبود کو صحیح طور پر پہچانے گا اور اسی کو رب و الٰہ بنائے گا۔ اسی کی عبودیت کا اعتراف کرے گا اور اسی کی تشریع و قانون سازی پر قانع رہے گا اور دوسروں کی ربوبیت و الوہیت کو پرے پھینک دے گا۔ اس کی عبادت و تقرب اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر کرے گا اور یا پھر جاہلیت و بت پرستی کے انحراف میں گم

---

[1] تفسیر ابن کثیر پ ۷ ص ۲۷ (اردو ترجمہ)
[2] المراغی ج ۷ ص ۴۴، تفسیر المنار ج ۷ ص ۲۱۰
[3] فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۵۴، ۵۹

Marfat.com

ہوکر بے راہ روی کی بھول بھلیاں میں کھوجائے گا۔ وہ قسم قسم کی قربانیاں معبود کو راضی کرنے کے لئے خود ایجاد کرے گا یا کسی اور سے اخذ کرے گا۔ عبادات کے کئی طریقے از خود نکال لے گا یا اپنے جیسوں سے لے لیگا۔

اسلام نے انسان کو حریتِ عمل اور آزادی رائے کا سبق دیا ہے۔ وہ اسے پروہتوں، پادریوں اور پجاریوں کے چکر سے نکال دیتا ہے۔ صرف ایک معبود کو اسی کی ہدایت کے مطابق پوجنے کا حکم دیتا ہے۔ بت پرستی کے اوہام اور جاہلیت کے خرافات سے آزاد کر دیتا ہے۔ خواہ وہ عقیدے سے متعلق ہوں یا عمل و عبادات سے یا زندگی کے اجتماعی معاملات سے۔

اہلِ جاہلیت چند خود ساختہ شرائط کے ماتحت کچھ جانوروں کو چھوڑ دیتے اور انہیں مقدس قرار دیتے تھے۔ اس کا منشاء محض عقل و ضمیر کے نوبہ نو تاریک اوہام و خرافات تھے۔ عجیب و غریب خود ساختہ رسوم و رواج تھے جن میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ ان کا استغناء عقل صحیح یا فطرت کی آواز نہ تھا۔ محض تاریک خیالی اور وہم پرستی تھی۔ نہ کوئی ترازو تھی نہ منطق۔ یہ تو پرانی جاہلیت کا حال تھا۔ مگر ہر جدید جاہلیت بھی اسی قسم کی فطرت رکھتی ہے۔ وہ انسان کے آزاد ضمیر کو رسم و رواج کے بندھنوں میں مقید کر دیتی ہے۔

جاہلیت کسی زمانے یا وقت کا نام نہیں بلکہ وہ ایک وضع اور حالت ہے جو بار بار دہرائی جاتی ہے اور مختلف شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ خود ساختہ اوہام و خرافات غیر اللہ کے بنائے ہوئے قانون جہاں اور جب بھی مانے جائیں گے۔ وہ جاہلیت کہلائیں گے۔ الوہیت و ربوبیت کو اگر اللہ کے لئے خاص کر لیا جائے۔ مخلصین لہ الدین حنفاء تو یہ حالت وضع اسلام کی ہے۔ لیکن اگر قانون ساز اپنے نفس و ہوا کو یا کسی اور کو بنا لیا جائے — چاہے وہ "اور" کوئی بھی ہو! —— تو یہ وضع و حالت "جاہلیت" کی ہے۔

اسلام میں بشر کی عبودیت صرف ایک خدا کے لئے ہے۔ انسان کی نیت و عمل، عبادت و اطاعت اگر ایک خدا کے لئے ہے تو وہ "اسلام" ہے۔ لیکن اگر انسان انسان کی عبودیت میں مبتلا ہے یا کسی اور مخلوق کی عبودیت میں مگن ہے تو بس یہ جاہلیت ہے اس میں قدیم و جدید کا کوئی فرق نہیں۔

آج اسلام سے چودہ سو برس بعد بھی انسانی نفس و ضمیر جاہلیت کی بھول بھلیاں میں سرگرداں ہے۔ وہ کئی ارباب و الٰہ کو مان رہا ہے۔ بہت سوں کے سامنے

Marfat.com

سربسجود ہے۔ بہت سوں کو قانون ساز اور شارع بنا رہا ہے اس کی آزادی و کرامت اور عظمت و رفعت خاک میں مل چکی ہے۔ خود اسلامی ممالک اور مسلم معاشروں میں بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ وحامی کا چکر اپنے اور بزرگوں کے لئے کچھ مظاہر و رسوم بدل گئے ہیں۔ ذہنیت وہی جاہلانہ ہے۔ اشکال و صور کا اختلاف ہے۔ حقیقت وہی قبل از اسلام والی موجود ہے۔

مشرکین عرب سرے سے دین ابراہیمی کے منکر نہ تھے بلکہ اس کے بظاہر قائل و مدعی تھے۔ وہ سرے سے خدا کے منکر بھی نہ تھے بلکہ اس کی قدرت و وجود اور کائنات میں تصرف کے قائل تھے۔ لیکن وہ اپنے لئے خود قانون بناتے تھے اور انہیں خدا کی طرف سے قرار دے لیتے تھے۔ یفترون علی اللہ الکذب الآیۃ

اللہ کی شرع و قانون وہ ہے جو اس نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسولؐ کے ذریعے سے بیان کر دی ہے۔ اس میں کوئی ابہام و غموض نہیں۔ نہ اس میں یہ گنجائش ہے کہ اس میں کوئی ترمیم و اضافہ کیا جائے۔ اتباع کے قابل اور اطاعت کے لائق صرف اللہ کی شرع ہے۔ جو لوگ اس پر چلتے ہیں۔ ہم ان کا احترام کریں گے۔ لیکن معبود نہ بنائیں گے۔ باپ دادوں کا اتباع جبکہ وہ یقیناً ہدایت پر ہوں تو معقول ہو سکتا ہے لیکن ما انزل اللہ کو ترک کرنا اور کسی اور کے پیچھے ہو لینا کسی طرح روا نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ

اے ایمان والو! تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا

لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ

تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو گمراہ ہوا جبکہ تم راہ پر ہو

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا

اللہ ہی کی طرف تم سب کی واپسی ہوگی پھر وہ جتلا دے گا تم کو

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

جو کچھ تم کرتے تھے۔

Marfat.com

لہ اگر فہمائش و نصیحت کے باوجود کفار راہِ راست پر نہیں آتے اور رسوم شرکیہ اور آباؤ اجداد کی اندھی تقلید سے منہ نہیں پھیرتے تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم زیادہ اس غم میں مت پڑو کسی کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ بشرطیکہ تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو۔ سیدھی راہ یہ ہے کہ آدمی ایمان و تقویٰ اختیار کرے۔ خود برائی سے رکے اور دوسروں کو روکنے کی امکان بھر کوشش کرے۔ پھر بھی اگر لوگ برائی سے نہ رکیں تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اس آیت سے یہ سمجھ لینا کہ جب ایک شخص اپنا نماز روزہ ٹھیک کر لے تو "امر بالمعروف" چھوڑ دینے سے اُسے کوئی مضرت نہیں ہوتی، سخت غلطی ہے لفظ اہتداء "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" وغیرہ تمام وظائفِ ہدایت شامل ہے۔

اس آیت میں گو روئے سخن بظاہر مسلمانوں کی طرف ہے لیکن اُن کفار کو بھی متنبہ کرنا منظور ہے جو باپ دادا کی اندھی تقلید پر اڑے ہوئے ہیں۔ یعنی اگر تمہارے باپ دادا راہِ حق سے بھٹک گئے تو ان کی تقلید میں جان بوجھ کر اپنے آپ کو کیوں ہلاک کرتے ہو؟ انہیں چھوڑ کر تم اپنی عاقبت کی فکر کرو۔ اور نفع و نقصان کو سمجھو۔ باپ دادا اگر گمراہ ہوں اور اولاد اُن کے خلاف راہِ حق پر چلنے لگے تو آباؤ اجداد کی یہ مخالفت اولاد کو قطعاً مضر نہیں ـــــ یہ خیالات محض جہالت کے ہیں کہ کسی حال میں بھی آدمی باپ دادا کے طریقہ سے قدم باہر نہ رکھے۔ رکھے گا تو ناک کٹ جائے گی۔ عقلمند کو چاہیئے کہ انجام کا خیال کرے۔ سب اگلے پچھلے جب خدا کے حضور پیش ہونگے ہر ایک کو اپنا انجام اور عمل نظر آجائے گا۔

لہ خلیفۂ رسولؐ جناب ابوبکر صدیقؓ نے خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو۔ لیکن اس کے مفہوم پر اسے رہتے نہیں دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اگر کوئی گناہ کی بات دیکھے۔ اور پھر اسے غیرت نہ آئے اور نہ حق کے لئے غصہ آئے۔ تو کیا عجب خدا دونوں کو عذاب میں گھسیٹ لے۔ اے لوگو! جھوٹ سے بچو کیونکہ وہ انسان کو ایمان سے ہٹا دیتا ہے۔

لہ یہ جہال اگر تمہارا کہنا نہیں مانتے تو تم کچھ پروانہ کرو۔ تم اپنی فکر کرو کسی کا گمراہ ہونا تمہارے لئے کچھ مضر نہیں جو کرے گا سو بھرے گا۔ مگر ہاں حتی المقدور وعظ و نصیحت میں کمی نہ کرو۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وعظ و نصیحت ہی کو ترک کر دو۔

لہ فوائد القرآن ص ۱۶۱ لہ تفسیر ابن کثیر پ ۷ ص ۲۹ لہ تفسیر حقانی ج ۴ ص ۶۲

Marfat.com

[1] اللہ تعالیٰ نے پہلے تو مشرکوں کا جہل وعناد بیان فرمایا اور ان کے طغیان و فساد پر نکیر فرمائی۔ اور فرمایا کہ انہیں کوئی نصیحت و وعظ مفید نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ اپنی جہالت پر اصرار کرتے رہیں گے اور گمراہی میں گردن اٹھائے چلتے رہیں گے۔ پھر ان آیات میں اہلِ ایمان کو حکم دیا کہ علم نافع اور عمل صالح سے اپنے نفوس کی اصلاح کی فکر کریں۔ اور ظاہر کر دیا کہ جب انہوں نے اپنی اصلاح کر لی۔ اور واجبات علم و عمل اور تعلیم وارشاد ادا کر دیئے تو اس کے بعد کسی گمراہ کی گمراہی کسی جاہل کی جہالت ان کے لئے مضر نہیں ہے۔

سلف صالحین کے سب بیان کرنے والے اس پر متفق ہیں کہ مومن اس وقت ہدایت یافتہ نہیں ہوتا جب صرف اپنی اصلاح کرنا چاہے اور دوسروں کی اصلاح سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ سے غافل ہو جائے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس میں کوئی رعایت نہیں لیکن جب تجربہ سے ثابت ہو جائے کہ لوگوں کا بگاڑ آخری حد تک پہنچ گیا ہے اور وعظ وارشاد کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تو اس وقت یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے لیکن یہ نتیجہ محض وہم وگمان سے نہیں بلکہ دلائل شرع سے برآمد ہوگا اور تجربہ اس کی علامت ہوگی۔

[2] اس آیت کا مضمون یہ ہے کہ مسلمان ایک غیر منفصل وحدت ہیں جن کا آپس میں اخوت اسلامی کا مضبوط رشتہ ہے۔ لیکن وہ دوسروں سے جدا ہیں۔ اس لئے انہیں اپنا تزکیہ نفس کرنا لازم ہے۔ اپنے ضمیروں کو پاک کرنا اور اپنی جماعت سے منسلک رہنا ضروری ہے۔ جب تم ہدایت یافتہ ہو تو غیروں کی ضلالت سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکے گا۔

امتِ مسلمہ کے بنیادی اصولوں اور اس کے دوسری جماعتوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کو واضح کرتی ہے۔ امتِ مسلمہ حزب اللہ ہے اور ان کے خلاف دوسری جماعتیں حزب الشیطان ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان کوئی موالات اور باہمی ضمانت وذمہ داری قائم نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کے عقیدے میں اشتراک نہیں لہٰذا جزاء وسزا میں باہمی ذمہ داری کا کوئی سوال نہیں۔

امتِ مسلمہ پر باہم اشتراک وتناصر اور تضامن لازم ہے۔ سب ایک دوسرے سے خیر خواہی اور نصیحت وارشاد پر کاربند ہوں گے۔ جب یہ امت ہدایت ربانی پر

---

[1] المراغی ج ۷، ص ۴۵، ۴۶۔ تفسیر المنار ج ۷، ص ۲۱۰، ۲۱۵
[2] فی ظلال القرآن ج ۷، ص ۵۹، ۶۱

Marfat.com

کار بند ہو جائے تو دوسروں کی گمراہی انہیں کوئی ضرر نہیں دے سکتی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُمّتِ مسلمہ دعوت و شہادت حق کے منصب سے دستبردار ہو جائے گی۔ کیونکہ ہدایت ہی تو اس کا نظام و قانون اور دین و شریعت ہے۔ جب وہ ایک سرزمین میں اپنا نظام حق قائم کر چکے تو اس کا فرض ہے کہ سب لوگوں کو اس ہدایت کی دعوت دے اور ان کی ہدایت و رہنمائی کی پوری جدوجہد کرے۔ دنیا میں قوام بن کر رہے اور لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرے اور انہیں اس جاہلیت کی طرف واپس نہ جانے دے جس سے انہیں وہ ایک مرتبہ نکال چکی ہے۔

لیکن اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب دوسرے اس کی بات نہ مانیں اور راہِ حق کو قبول نہ کریں تو پھر خدا کے ہاں اس اُمّت کو صرف اس بات کی باز پرس ہو گی کہ اُس نے اپنے فرائض ادا کر دیئے تھے یا نہیں۔ دوسروں کی گمراہی ان کے لئے وہاں ضرر نہ ہو گی۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپس میں اور پھر ساری زمین میں "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" پر بھی اُس کا محاسبہ نہیں ہو گا۔ پہلا "معروف" یہ ہے کہ خدائی اقتدار و سلطنت اور اس کی شریعت پر اعتماد کیا جائے۔ یہی منکر ہے۔ جاہلیت کا حکم ہی طاغوت کا حکم ہے اور "طاغوت" ہر وہ سلطان و اقتدار ہے جو اللہ کے سلطان و حکم پر قائم نہ ہو۔

اس آیت کا معنیٰ بعض لوگوں نے پہلے بھی غلط سمجھا اور خطرہ ہے کہ اب بھی کچھ لوگ اس کا غلط مطلب لیں گے۔ یہ آیت نہ فرد سے اور نہ مسلم جماعت اور اسلامی معاشرے سے شر کا مقابلہ اور ضلال و طغیان کا مٹانا ساقط کرتی ہے۔ اسی غلط فہمی کو خلیفۂ رسولؐ امیر المومنین ابوبکر صدیقؓ نے برسرِ عام دور فرمایا تھا۔

ہرگز نہیں، واللہ یہ دین جہد و جہاد کے بغیر ہرگز قائم نہیں ہو سکتا۔ اور عمل و مشقت کے بغیر کبھی درست نہیں رہ سکتا۔ پس ایسے لوگوں کا ہونا ناگزیر ہے جو دوسروں کو اس کی طرف پھیرتے رہیں اور ضروری ہے کہ ایک اہلِ حق جماعت لوگوں کو انسانوں کی عبادت سے خدا کی عبادت و الوہیت کی طرف ہر وقت دعوت دیتی رہے۔ الٰہی اقتدار کو قائم کرنے میں لگی رہے اور اللہ کے غصب شدہ حقوق — جن کو ظالموں اور ڈاکوؤں نے چھین رکھا ہے — ان سے واپس لے کر دین و الوہیت اور حاکمیت کو خالص اللہ کے لئے قائم کرنے کی بے پناہ جدوجہد کرتی رہے۔ جب گمراہ صرف افراد ہوں تو انہیں اچھے وعظ و نصیحت سے سمجھائیں، اور ارشاد و ہدایت سے راہ پر لائیں۔ لیکن جب خدا کی راہ سے ہٹانے

Marfat.com

والی قوت باغی ہو چکی ہو تو ان کا فرض ہے کہ طاقت پیدا کریں اور ان کے خلاف قوت کا استعمال کریں۔

اس سب کچھ کے بعد اہلِ ایمان کی ذمہ داری پوری ہوگی اور گمراہوں کی گمراہی سے انہیں باز پرس کا خوف نہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ

اے ایمان والو گواہ تمہارے درمیان جبکہ

اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ

پہنچے کسی کو تم میں موت وصیت کے وقت

اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِ

دو شخص معتبر ہونے چاہئیں تم میں سے یا دو شاہد اور ہوں

كُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ

تمہارے سوا اگر تم نے سفر کیا ہو ملک میں پھر

فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ

پہنچے تم کو مصیبت موت کی تو کھڑا کرو ان دونوں کو

بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ

نماز کے بعد وہ دونوں قسم کھائیں اللہ کی اگر تم کو شبہ

لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ

پڑے۔ وہ کہیں کہ ہم نہیں لیتے قسم کے بدلے مال اگرچہ کسی کو ہم سے قرابت بھی ہو

وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ

اور ہم نہیں چھپاتے اللہ کی گواہی نہیں تو ہم بے شک

Marfat.com

الْاٰخِرٰنِ ۚ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ

گنہ گار ہیں پھر اگر خبر ہو جائے کہ وہ دونوں حق بات دبا

اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا

گئے تو دو گواہ اور کھڑے ہوں ان کی جگہ

مِنَ الَّذِيْنَ اسْتُحِقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ

ان میں سے کہ جن کا حق دبا ہے جو میت کے سب سے زیادہ قریب ہوں

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا

پھر قسم کھائیں اللہ کی کہ ہماری گواہی تحقیقی ہے پہلوں کی گواہی سے

وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۱۰۷

اور ہم نے زیادتی نہیں کی نہیں تو ہم بے شک ظالموں میں سے ہیں

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى

اس میں امید ہے کہ ادا کریں شہادت کو ٹھیک طرح

وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ

پر یا ڈریں کہ الٹی پڑے گی ہماری قسم ان کی

اَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۗ وَاللّٰهُ

قسم کے بعد اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سن رکھو اور

لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۱۰۸

اللہ نہیں راہ دیتا نافرمان لوگوں کو

۱۴ ع ۴

یہاں وصی بنانے کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ بہتر ہے کہ دو وصی ہوں۔ اگر دونوں معتبر

لہ فوائد الفرقان

Marfat.com

نہ ہوں تب بھی وصی بنا سکتا ہے۔ گواہ سے مراد یہاں وصی ہے۔ اس کے اقرار و اظہار کو کو گواہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور منکم سے مراد ہے کہ وصی مسلمانوں میں سے ہوں۔ من غیرکم سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلم ہوں۔ من بعد الصلوٰۃ سے مراد نماز عصر کے بعد کا وقت ہے۔ کیونکہ وہ اجتماع اور قبول کا وقت ہے۔ شاید ڈر کر جھوٹی قسم نہ کھائیں یا کسی نماز کے بعد۔ یا وصی جس مذہب کا ہو اُن کی نماز کے بعد کا وقت مراد ہے۔

اِنَّا اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ : یعنی جب خدا کے پاس سب کو جانا ہے تو جانے سے پہلے سب کام ٹھیک کر لو۔ انہی میں سے ایک ضروری کام ضروری امور کی وصیت اور اس کے متعلقات ہیں۔ ان آیات میں وصیت کا بہترین طریقہ تلقین فرمایا ہے۔ یعنی مسلمان اگر مرتے وقت کسی کو اپنا مال وغیرہ حوالے کرے تو بہتر ہے کہ دو معتبر مسلمانوں کو گواہ کرے۔ مسلمان نہ ملیں۔ جیسا کہ سفر وغیرہ میں اتفاق ہو جاتا ہے تو دو کافروں کو وصی بنائے۔ پھر اگر وارثوں کو شبہ پڑ جائے کہ ان شخصوں نے کچھ مال چھپا لیا ہے اور وارث دعویٰ کر دیں مگر دعویٰ کے ساتھ شاہد موجود نہ ہوں تو وہ دونوں شخص قسم کھائیں کہ ہم نے نہیں چھپایا اور ہم کسی طمع یا قرابت کی وجہ سے جھوٹ نہیں کہہ سکتے اگر کہیں تو گنہ گار ہیں۔

فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا : دو اور شخص اٹھ کھڑے ہوں اور قسم کھائیں۔ ایک ہو تب بھی مضائقہ نہیں۔

مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ ..... الظّٰلِمِیْنَ = اگر قرائن و آثار سے اوصیاء کی قسم کا جھوٹ ہونا معلوم ہو اور وہ بذریعہ شہادت شرعی اپنی سچائی ثابت نہ کر سکیں تو میت کے وارثوں کو قسم دی جائے کہ ان کو اوصیاء کی قسم کی واقعیت کا کوئی علم نہیں اور یہ کہ ان کی گواہی اوصیاء کی گواہی سے زیادہ قبول کی حقدار ہے۔

ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک شخص بُدَیل نامی جو مسلمان تھا۔ دو شخصوں عمیم و عدی کے ساتھ جو اس وقت عیسائی تھے۔ بغرضِ تجارت ملک شام کی طرف گیا۔ شام پہنچ کر بُدَیل بیمار پڑ گیا۔ اُس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی۔ مرض جب زیادہ بڑھا تو اُس نے نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ کل سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا۔ انہوں نے سب سامان لا کر وارثوں کے حوالے کر دیا۔ مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش و نگار تھے۔ اس میں سے نکال لیا۔ وارثوں کو فہرست اسباب میں سے مل گئی۔ انہوں نے اوصیاء سے پوچھا کہ میت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا۔ کہ معالجہ وغیرہ میں کچھ خرچ ہوا ہو؟ ان دونوں کا جواب نفی میں تھا۔ آخر معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت

Marfat.com

میں پیش ہوا۔ چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے۔ اس لئے ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی۔ کہ ہم نے میت کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی۔ نہ کوئی اس کی چیز چھپائی۔ آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ ہم نے یہ میت سے خرید لیا تھا۔ چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے۔ اس لئے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے۔

میت کے وارثوں نے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مرافعہ کیا۔ اب پہلی صورت کے برعکس اوصیاء خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے۔ شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے وارثوں میں دو شخصوں نے جو میت سے قریب تر تھے قسم کھائی کہ پیالہ میت کی ملک تھا اور یہ دونوں نصرانی اپنی قسم میں جھوٹے ہیں۔ چنانچہ جس قیمت پر انہوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔

ذالک ادنیٰ ۔ ۔ ۔ بعد ایمانھم : یعنی وارثوں کو شبہ پڑے تو قسم دینے کا حکم رکھا۔ اس لئے کہ قسم سے ڈر کر اول ہی جھوٹ ظاہر نہ کریں۔ پھر اگر ان کی بات جھوٹ نکلے تو وارث قسم کھائیں۔ یہ بھی اسی واسطے کہ وہ قسم میں دغا نہ کریں جانیں کہ آخر ہماری قسم الٹی پڑے گی۔ (موضح القرآن)

لا یھدی القوم الفاسقین : خدا کی نافرمانی کرنے والا انجام کار رسوا اور ذلیل ہی ہوتا ہے۔ حقیقی کامیابی کا چہرہ نہیں دیکھتا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے علامہ ابن جریر طبری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول اور اس واقعہ کی تفصیلات خود ان دو اوصیاء میں سے ایک یعنی تمیم داریؓ نے اس واقعہ کے بعد جب وہ اسلام لے آئے تھے اور صحابہ کی جماعت میں شامل تھے بیان فرمائی تھیں۔ یہ بھی فرمایا ہے۔ کہ وصیت کے تفصیلی احکام اترآنے کے بعد بھی اس آیت کا حکم حتمی ہے اور بقولِ بعض جو یہ آیت منسوخ ہے۔ وہ قول درست نہیں ہے۔ ابو موسیٰؓ اشعری نے اپنے زمانۂ امارتِ کوفہ میں اس کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا۔

۲؎ بارہا ہمیں یہ کہہ کر فریب دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دین اسلام اور اس کے احکام خاص معین وقت اور خاص حالت کے لئے تھے۔ اب زمانہ بہت ترقی پذیر ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان احکام و قوانین کی ضرورت نہیں مثلاً وصیت کا یہ حکم۔

۱؎ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۳، ۳۴ ۲؎ فی ظلال القرآن ج ۷ ص ۶۳، ۶۴

Marfat.com

جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے آج کل اگر کوئی آدمی قریب المرگ ہو — سفر میں یا حضر میں — تو اس کے لئے کسی وصی بنانے کی ضرورت نہیں۔ اگر سمجھی بھی جائے تو اس کے لئے جو طریقہ بیان کیا گیا ہے اس کی بجائے اثبات واحراء اور کتابت وغیرہ اور انہیں بنکوں میں محفوظ کردینے کی سہولتیں موجود ہیں۔ لہٰذا یہ حکم آج کل کے معاشروں کے لئے نہیں ہے۔

مگر یہ کہنا صرف دھوکا دہی نہیں فریب بھی ہے۔ شریعت اسلامیہ کے بعض قوانین زمانے کی ترقی کے ساتھ اپنی فاعلیت اور فائدہ کھو نہیں چکے۔ آج بھی ان کی ضرورت ہے۔ اسلام ساری انسانیت کا دین ہے۔ دنیا کے تمام اطراف وجوانب کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ آج بھی انسانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت اسی قسم کے حالات سے دوچار ہے۔ ان میں بدویت ودیہاتیت موجود ہے یا اس کے عناصر موجود ہیں۔ لہٰذا آج بھی وہ ان احکام واجراآت کی اسی طرح محتاج ہے جس طرح آج سے پہلے تھی اور وہ اس دین میں اپنی تمام ضروریات کو ہر قسم کے پیش آمدہ حالات وواقعات کے لئے موجود پاتی ہے۔ یہ دین اور اس کی شریعت سفر وحضر، شہر ودیہات اور صحرا وجنگل سب کے لئے ہے۔ کیونکہ وہ ساری بشریت کا دین ہے

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ

جس دن اللہ جمع کرے گا سب پیغمبروں کو پھر کہے گا تمہیں کیا جواب ملا تھا

قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۱۰۶

وہ کہیں گے ہم کو خبر نہیں تو ہی ہے چھپی باتوں کا جاننے والا

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ

جب کہے گا۔ اللہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ یاد کر میرا احسان جو تجھ پر

نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ

ہوا اور تیری ماں پر ہوا۔ جب مدد کی

اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي

میں نے تیری پاک روح سے تو کلام کرتا تھا لوگوں سے

Marfat.com

الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ

گود میں اور بڑی عمر میں اور جب سکھائی میں نے تجھ کو کتاب اور تہ

وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيْلَ ۚ وَإِذْ

کی باتیں اور تورات اور انجیل اور جب

تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِيْ

تو بناتا تھا۔ گارے سے پرندے کی صورت میرے حکم سے

فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِيْ وَتُبْرِئُ

پھر پھونک مارتا تھا اس میں تو وہ ہو جاتا اڑنیوالا میرے حکم سے اور اچھا

الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِيْ ۚ وَإِذْ تُخْرِجُ

کرتا تھا مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب نکال کھڑا

الْمَوْتٰى بِإِذْنِيْ ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ

کرتا تھا مردے میرے حکم سے اور جب روکا میں نے بنی اسرائیل

عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ

کو تجھ سے۔ جب تو لے کر آیا نشانیاں ان کے پاس تو کہنے لگے

كَفَرُوْا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۱۰

کافر ان میں سے اور کچھ نہیں یہ تو صریح جادو ہے۔

حل ماذا اجبتم = یہ سوال محشر میں امتوں کے سامنے پیغمبروں سے کیا جائے گا کہ دنیا میں تم جب ان کے پاس پیغام حق لے کر گئے تو انہوں نے کیا جواب دیا اور کہاں تک دعوت الٰہی کی اجابت کی۔ گزشتہ رکوع میں بتلایا تھا کہ خدا کے پاس جانے سے پہلے بذریعہ وصیت وغیرہ یہاں کا انتظام ٹھیک کر لو۔ اب متنبہ فرماتے ہیں کہ وہاں کی جوابدہی کے لئے تیار رہو۔ ۱۲ فوائد القرآن

Marfat.com

لَا عِلْمَ لَنَا : محشر کے ہولناک دن میں جب خدائے قہار کی شانِ جلالی کا انتہائی ظہور ہوگا۔ اکابر و اعاظم کے بھی ہوش بجا نہ رہیں گے اولوالعزم انبیاءؑ کی زبان پر نفسی نفسی ہوگا۔ اس وقت انتہائی خوف و خشیت سے حق تعالیٰ کے سوال کا جواب لَا عِلْمَ لَنَا (ہمیں کچھ خبر نہیں) کے سوا نہ دے سکیں گے۔ پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں سب کی طرف خدا کی نظرِ لطف و رحمت ہوگی۔ تب کچھ عرض کرنے کی جرأت کریں گے۔ امام حسن بصریؒ اور مجاہد وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ لیکن ابن عباسؓ کے نزدیک لَا عِلْمَ لَنَا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا تیرے علمِ کامل و محیط کے سامنے ہمارا علم کچھ بھی نہیں۔ گویا یہ لفظ "تادّب مع اللہ" کے طور پر کہیں گے۔ ابن جُریج کے نزدیک لَا عِلْمَ لَنَا سے یہ مراد ہے۔ کہ ہم کو معلوم نہیں ہمارے پیچھے انہوں نے کیا کچھ کیا۔ ہم صرف ان ہی افعال و احوال پر مطلع ہو سکتے ہیں۔ جو ہمارے سامنے ظاہری طور پر پیش آئے تھے۔ بواطن و سرائر کا علم علّام الغیوب ہی کو ہے۔ آئندہ رکوع میں عیسیٰ علیہ السلام کا جو جواب نقل فرمایا ہے کہ وکنت علیہم شہیدا الخ اس سے آخری معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے کہ جب حوض پر بعض لوگوں کی نسبت حضورؐ فرمائیں گے ھٰؤلاء اصحابی تو جواب ملے گا لاتدری ما احدثوا بعدک یعنی آپؐ کو خبر نہیں کہ آپؐ کے پیچھے انہوں نے کیا حرکات کیں۔ (حضرت صدیق اکبرؓ کے دورِ خلافت میں واقعہ ارتداد کی طرف اشارہ ہے۔ کچھ لوگ جنہیں حضورؐ جانتے ہوں گے کہ انہوں نے اسلام قبول کیا تھا اور بیعت کی تھی مگر آپؐ کے وصال کے بعد وہ مُرتد ہو گئے تھے۔ یہ سوال و جواب ان کے بارے میں ہوگا۔ واللہ اعلم)

اذقال اللہ : غالباً یہ سارا رکوع آنے والے رکوع کی تمہید ہے۔ احسانات یاد دلا کر وہ سوال ہوگا جو آئندہ رکوع میں ہے۔

نعمتی علیک وعلیٰ والدتک : اوّل تو اولاد پر احسان کرنا من وجہ ماں پر احسان ہے دوسرے ظالم لوگ جو تہمت حضرت مریم صدیقہ پر لگاتے تھے، حق تعالیٰ نے حضرت علیہ السلام کو ان کی براءت و نزاہت کے لیے برہانِ مُبین بنا دیا۔ اور تولد مسیحؑ سے پہلے اور بعد میں عجیب و غریب نشانات حضرت مریمؑ کو دکھلائے جو ان کی تقویت و تسکین کا باعث ہوئے یہ احسانات بلاواسطہ اُن پر تھے۔

تکلم الناس فی المھد ..... تخرج الموتیٰ باذنی : گود میں جو کلام کیا تھا اُس کا نام سورہ مریم میں ہے۔ انی عبداللہ آتانی الکتاب الخ تعجب ہے کہ عیسائیوں نے تکلم فی المھد کا کچھ ذکر نہیں کیا البتہ یہ لکھا ہے کہ بارہ برس کی عمر میں یہود

Marfat.com

کے سامنے انہوں نے ایسی حکیمانہ دلائل و براہین بیان فرمائیں کہ تمام علمأ عاجز و مبہوت رہ گئے اور سامنے عش عش کرنے لگے۔ یوں تو روح القدس سے حسب مراتب، سب انبیاء علیہم السلام بلکہ بعض مومنین کی بھی تائید ہوتی ہے (جنگ بدر و اُحد وغیرہ کے واقعات گواہ ہیں) لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جن کا وجود ہی جبرئیلؑ کی پھونک سے ہوا کوئی خاص قسم کی فطری مناسبت اور تاکید حال ہے جسے تفصیل انبیأ کے بیان میں ذکر کیا گیا۔ تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض منھم من کلم اللہ ورفع بعضھم درجات وآتینا عیسیٰ بن مریم البینات وایدناہ بروح القدس (البقرہ رکوع)

روح القدس کی مثال عام ارواح میں ایسی سمجھو جیسے عالم مادیات میں قوتِ کہربائیہ (بجلی کا خزانہ) جس وقت اس خزانہ کا مدبر معین اصول کے موافق کرنٹ چھوڑتا اور جن اشیاء میں بجلی کا اثر پہنچاتا ہے اُن کا کنکشن درست کر دیتا ہے تو فوراً خاموش اور ساکن مشینیں بڑے زور سے گھومنے لگتی ہیں۔ اگر کسی مریض پر بجلی کا عمل کیا گیا تو شل ہو جانے والے اعضأ اور بے حس ہو جانے والے اعصاب میں بجلی پہنچنے سے بے حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے بیمار کے حلقوم میں جس کی زبان بند ہو گئی ہو، بجلی کی قوت پہنچانے سے قوتِ گویائی واپس آ گئی ہے حتیٰ کہ بعض عالی ڈاکٹروں نے دعویٰ کر دیا کہ ہر قسم کی بیماری کا علاج بجلی کے پہنچانے سے کیا جا سکتا ہے (دائرۃ المعارف فرید وجدی) جب اس معمولی مادی قوتِ کہربائیہ کا حال یہ ہے تو اندازہ کر لو کہ عالم ارواح کی کہربائیہ میں جس کا خزانہ روح القدس ہے کیا کچھ طاقت ہو گی۔ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کا تعلق روح القدس سے کسی ایسی خاص نوعیت اور اصول کے ماتحت رکھا ہے جس کا اثر کھلے ہوئے غلبۂ وحیت) تجرد اور مخصوص آثارِ حیات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان کا روح اللہ سے ملقب ہونا، بچپن، جوانی اور کہولت میں یکساں کلام کرنا) خدا کے حکم سے افاضۂ حیات کے قابل کالبد خاکی تیار کر لینا، اس میں باذن اللہ روح حیات پھونکنا۔ بابوس العلاج مریضوں کی حیات کو باذن اللہ بغیر توسطِ اسباب عادیہ کے کارآمد اور بے عیب بنا دینا، حتیٰ کہ مُردہ لاشہ میں باذن اللہ دوبارہ روح حیات کو دوبارہ واپس کرنا۔ بنی اسرائیل کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا کر آپ کا آسمان پر اٹھا لیا جانا۔ اور آپ کی حیات طیبہ پر اس قدر طول عمر کا کوئی اثر نہ ہونا، وغیرہ وغیرہ یہ سب آثار اُسی تعلقِ خصوصی سے پیدا ہوئے ہیں جو رب العزت نے کسی مخصوص نوعیت و اصول سے آپ کے اور روح القدس کے مابین قائم فرمایا ہے۔

Marfat.com

ہر پیغمبر کے ساتھ کچھ امتیازی معاملات خدا تعالیٰ کے ہوتے ہیں ان کے علل و اسرار کا احاطہ اُسی علام الغیوب کو ہے ان ہی امتیازات کو علماء کی اصطلاح میں "فضائل جزئیہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں ایسی چیزوں سے کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ الوہیت ثابت ہو واذ تخلق من الطین میں خلق کا لفظ محض صوری اور حسّی لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ خالقِ حقیقی "احسن الخالقین" کے سوا کوئی کوتی نہیں۔ اسی لیے باذنی کا اعادہ کیا گیا۔ اور آل عمران میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے باذن اللہ کی تکرار کرائی گئی بہرحال جو خوارق ان آیات میں اور ان سے پہلے آلِ عمران میں حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب ہوئے ہیں ان کا انکار یا تحریف صرف اُس ملحد کا کام ہو سکتا ہے جو آیات اللہ کو اپنی عقلِ شخصی کے تابع کرنا چاہیے۔ باقی جو لوگ قانونِ قدرت کا نام لیکر معجزات و خوارق کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا جواب دینے کی یہاں گنجائش نہیں۔

واذ کففت بنی اسرائیل الخ وہ معجزات اور فوق العادت تصرفات کو جادو کہنے لگے اور انجام کار حضرت مسیحؑ کے قتل کے درپے ہوئے۔ حق تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے حضرت مسیحؑ کو آسمان پر اٹھا لیا۔ اس طرح یہود کو اُن کے ناپاک مقصد میں کامیاب ہونے سے روک دیا گیا۔

[1] مولانا عبدالحق حقانیؒ فرماتے ہیں کہ لَا عِلْمَ لَنَا کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا! امرِ واقعی اور دل کی بات تو تُو ہی جانتا ہے اور ظاہری قیل و قال کا جو ہمیں علم ہے وہ تیرے علم کے آگے بمنزلۂ لاشئ ہے۔ پس اس آیت میں اور جئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شھیدا میں کوئی تعارض نہیں

وکھلا: یعنی قریب قیامت آکر آخیر عمر میں پھر کلام کریں گے ورنہ گود میں کلام کرنا تو واقعی خرقِ عادت اور احسانِ الٰہی ہے لیکن بڑی عمر میں سب لوگ کلام کرتے ہی ہیں۔ پس یہ کلام اس لحاظ سے خصوصیت کا حامل ٹھہرا کہ اتنی مدت کے بعد پھر دنیا میں آکر کلام کرنے لگیں گے۔

[2] علامہ احمد مصطفیٰ المراغی ماذا اجبتم کے سوال کو پیغمبروں کی اُمتوں کی توبیخ اور کافروں پر اتمام حجت کے لئے قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ سوال کی غرض جواب کی نوع معدوم کرنا ہے۔ یعنی ان لوگوں نے تمہاری دعوت کا جواب کیونکر دیا اثبات و اقرار

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۶۴ [2] تفسیر المراغی ج ۷ ص ۵۴، ۵۷ / تفسیر المنار ج ۷ ص ۲۴۱، ۲۶۰

Marfat.com

بانفی وانکار اور استکبار میں ؟ اور سوال اسی قسم کا ہے جیسے فرمایا واذا المؤودۃ سئلت د بای ذنب قتلت ٥ کہ یہاں بھی سوال کا اصل رُخ اس فعلِ بد کے کرنے والوں کی طرف ہے اور غرض اس سے توبیخ وانکار ہے۔

میدانِ قیامت میں کئی حاضریاں ہوں گی۔ بعض میں پیغمبران اپنی قوموں پر گواہی دیں گے۔ بعض میں اللہ تعالےٰ امتوں سے سوال کرے گا۔ جیسے کہ تحقیق کرنے کے لئے قاضی کبھی فریقِ مقدمہ سے اور کبھی گواہوں سے سوال کرتا ہے۔ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْھِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ٥

مسیحؑ کے سوال وجواب کا ذکر یہاں کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ عیسائیوں کو ان کے قبیح عقائد پر تنبیہ کی جائے۔ دوسری آمتوں کا طعن تو نبیوں پر تھا لیکن ان کا طعن براہِ راست خدا تک جا پہنچا ہے کیونکہ انہوں نے اس کی ایسی صفات بیان کی ہیں جو اس کے لائق نہیں مثلاً بیٹا بنانا، اور اس سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ مریمؑ بتول جو خدا کے بیٹے کی ماں ہے خدا کی بیوی ٹھہرے۔

باذنی کا لفظ جو بار بار دہرایا گیا ہے اس سے یہ بتانا مدِ نظر ہے۔ کہ مسیحؑ کو یہ قوت ہمیشہ کے لئے نہیں دی گئی تھی کہ جب چاہتے یہ معجزات دکھا دیتے۔ نہیں بلکہ دیگر معجزات کی مانند یہ چیز بھی محض خدا کے اذن وحکم پر مبنی تھی۔ جب وہ چاہتا ایسا ہو جاتا۔

ان آیات کا مقصد بھی حقیقتِ الوہیت وحقیقتِ عبودیت کا اظہار ہے یہ اظہار ایک عظیم رسول کی زبان سے میدانِ محشر کی بھری کچہری میں سب اگلوں پچھلوں کے سامنے ہوگا اور اس رسول کی زبان سے ہوگا جسے خدا، ابن اللہ یا خدا کا شریک ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ سرِ عام کہے گا کہ میں نے اپنی قوم سے اپنے آپ کو یا اپنی ماں کو خدا بنانے کے متعلق نہیں کہا تھا یہ ان کا بہتان ہے، جو مجھ پر اور میری ماں پر لگایا گیا۔

اللہ تعالےٰ نے اس آنے والے واقعہ کی تصویر کھینچ کر اسے ہمارے اذہان بلکہ تصور کی آنکھوں کے سامنے لا رکھا ہے۔ گویا ہم میدانِ قیامت میں کھڑے ہیں۔ ہر پیغمبر اپنی اُمت کے ساتھ آرہا ہے۔ حتیٰ کہ آخری پیغمبرؐ بھی تشریف لا چکے۔ اللہ کی کچہری قائم ہے۔ اور وہ ان سے سوال کر رہا ہے۔ سوال کی اہمیت، ماحول کا رُعب، اللہ کے جلال کی ہیبت یہ سب چیزیں ہم دیکھ رہے ہیں۔

بشر ہونے کی حد تک پیغمبر بھی بشر ہیں۔ وہ صرف اسی قدر جانتے ہیں جو اللہ نے انہیں بتایا۔ نیت، وارادہ اور باطن کا علم صرف اللہ کو ہے نیز جتنا وہ جانتے ہیں۔

لہ فی ظلال القرآن ج ۷، ص ۶۶، ۶۸

Marfat.com

وہ بھی علم الٰہی کے بالمقابل بمنزلۂ لاشئ ہے اس لئے وہ ادباً کہہ دیتے ہیں۔
لَا عِلْمَ لَنَا ۔

اب یہ سوال عیسیٰؑ کی طرف متوجہ ہے۔ جسے خدا بنایا گیا اور جس کی ذات وصفات کے گرد دیو مالائی اوہام وخرافات کا جال پھیلایا گیا۔ اُسے خدا کا بیٹا، خدا، اور خدائی کے تیسرے حصّے کا مالک کہا گیا۔ اُس سے سوال کرنا ضروری تھا کہ توحیدِ الوہیّت و ربوبیّت اور انسان کی عبودیّت کا کھلا اور کامل اظہار ہو سکے!

اب صورتِ احوال یہ ہے کہ اُسے پُوجنے والے، خدا بنانے والے اور اوہام و خرافات میں اس کی عظیم شخصیّت کو گم کرنے والے سامنے کھڑے ہیں۔ اور وہ واضح طور پر اپنی عبودیت کا اقرار۔ خدا کی الوہیّت کا اعتراف اور اپنی رسالت کا اقرار کرنے کے علاوہ ان پُوجنے والوں کے فعل کو رد کر رہا ہے۔

Marfat.com

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ

اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ مجھ پر

وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور میرے رسول پر تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

ہیں جب کہا حواریوں نے اے عیسٰے مریم کے بیٹے

هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً

کیا تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے ہم پر خوان بھرا ہوا

مِّنَ السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

آسمان سے ؟ بولا ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ

بولے ہم چاہتے ہیں کہ کھائیں اس میں سے اور مطمئن ہو جائیں

قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ

ہمارے دل اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچ کہا اور رہیں

عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

ہم اس پر گواہ

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ

مریم کے بیٹے عیسٰی نے کہا اے اللہ اے ہمارے رب اتار

Marfat.com

عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ

ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے کہ وہ دن

لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ

عید رہے ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لئے اور نشانی ہو تیری طرف سے

وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور روزی دے ہم کو اور تو ہی ہے سب سے بہتر روزی دینے والا

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ

کہا اللہ نے میں بے شک اسے اتاروں گا تم پر پھر جو کوئی

يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ

تم میں اس کے بعد ناشکری کرے گا تو میں اس کو سزا دوں گا

اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۵

جو اور کسی کو نہ دوں گا جہان بھر میں۔

لہ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ "کر سکتا ہے" اس لئے کہا کہ آپ کی رعایت اور دعا سے ہمارے لئے بطور خرق عادت" نہ معلوم ایسا کرے نہ کرے۔

مَائِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ یعنی آسمان سے بے محنت و مشقت روزی پہنچ جایا کرے، یہ ضروری نہیں کہ وہ خوان جنت ہی کا ہو۔

لہ فوائد القرآن ص ۱۶۳

Marfat.com

قَالَ اتَّقُوا اللّٰہَ الخ یعنی ایماندار بندہ کو لائق نہیں کہ ایسی غیر معمولی فرمائشیں کرکے خدا کو آزمائے۔ خواہ اس کی طرف سے کتنی ہی مہربانی کا اظہار ہو، روزی انہی ذرائع سے طلب کرنی چاہیئے۔ جو قدرت نے اس کی تحصیل کے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔ بندہ جب خدا سے ڈر کر تقویٰ اختیار کرے اور اسی پر ایمان و اعتماد رکھے تو حق تعالےٰ ایسی جگہ سے اس کو رزق بہم پہنچائے گا۔ جہاں سے وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ سورۂ طلاق کی ایک آیت کا بالکل یہی مضمون ہے۔

قَالُوا نُرِیْدُ اَنْ نَّاْکُلَ ..... اللّٰہِ حَقِّ یعنی ہم آزمانے کو نہیں مانگتے۔ بلکہ برکت کی امید پر مانگتے ہیں۔ کہ غیب سے بے محنت روزی ملتی رہے تاکہ اطمینانِ قلب اور دل جمعی سے عبادت میں لگے رہیں۔ اور آپ نے جو غیبی خبریں جنت کی نعمتوں وغیرہ کی متعلق دی ہیں ایک چھوٹا سا نمونہ دیکھ کر ان کا بھی یقین کامل ہو جائے۔ اور ایک عینی شاہد کے طور پر ہم اس کی گواہی دیں جس سے یہ معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے وعدہ فرمایا تھا۔ کہ تم خدا کے لئے تیس دن کے روزے رکھ کر جو کچھ طلب کروگے وہ دیا جائے گا۔ حواریوں نے روزے رکھ لئے اور مائدہ طلب کیا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا سے یہی مراد ہے وَاللّٰہُ اعلم

تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰیَۃً مِّنْکَ : یعنی وہ دن جس میں مائدہ آسمانی نازل ہو ہمارے اگلے پچھلے لوگوں کے حق میں عید ہو جائے۔ کہ ہمیشہ ہماری قوم اس کو بطور یادگار تہوار منایا کرے۔ اس تقریر کے موافق نکون لنا عیداً کا اطلاق ایسا ہوا کہ آیۂ الیوم اکملت لکم دینکم کے متعلق بخاری میں یہود کا قول نقل کیا ہے کہ تم ایک آیت پڑھتے ہو۔ اگر ہم پر وہ اترتی تو ہم اسے عید منایا کرتے" جس طرح آیت کو عید بنانے کا مطلب اس کے یوم نزول کو عید بناتا ہے (جیسا کہ دوسری روایات میں صراحت سے آیا ہے) اس پر مائدہ کے عید ہونے کو بھی قیاس کر لو۔ کہتے ہیں کہ وہ خوان اتوار کو اترا جو نصاریٰ کے یہاں ہفتہ کی عید ہے جیسے مسلمانوں کے یہاں جمعہ اور آیۃ منک کا مطلب ہے کہ تیری قدرت اور نبوت کی نشانی بن جائے گی۔

وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ : یعنی بدون تعب و کسب کے روزی عطا فرمایئے۔ آپ کے ہاں کیا کمی ہے۔ اور آپ کے نزدیک کیا مشکل ہے۔

قَالَ اللّٰہُ ..... الْعٰلَمِیْنَ : جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہوگی تو اس کی شکر گزاری کی تاکید بھی معمولی سے بہت بڑھ کر ہونی چاہیئے اور ناشکری پر عذاب بھی

Marfat.com

غیر معمولی اور نرالا آئے گا۔ موضح القرآن میں ہے" بعضے کہتے ہیں وہ خوان اترا چالیس روز تک پھر بعضوں نے ناشکری کی۔

یعنی حکم ہوا کہ مریض اور فقیر کھاویں، محفوظ اور بھلے چنگے بھی کھانے لگے۔ پھر قریب اسی آدمی کے بندر اور سور ہو گئے۔ یہ عذاب پہلے یہود کو ہوا تھا۔ پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ خوان نہیں اترا۔ یہ تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے اور نہ مانگا" لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کا کلام الٰہی میں نقل کرنا بے حکمت نہیں۔ شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی امت میں آسودگی مال ہمیشہ رہی اور جو کوئی اس میں ناشکری کرے یعنی اطمینانِ قلب سے عبادت میں نہ لگے بلکہ گناہ میں خرچ کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے۔ اس میں مسلمانوں کے لئے عبرت ہے کہ اپنا مدعا "خرق عادت" کی راہ سے نہ چاہے پھر اس کی شکر گزاری بہت مشکل ہے۔ اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں کی جاتی۔

[1] قرآن پاک میں حضرت عیسیٰؑ اور حواریوں کی گفتگو تو مذکور ہے لیکن یہ کہیں نہیں آیا کہ فی الواقع کوئی مائدہ اترا بھی تھا۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کہیں ثبوت ملتا ہے۔ کچھ مؤرخین اور بعض عیسائیوں کی روایات موجود ہیں اور ناشکری پر عذاب کا ذکر بھی آیا ہے۔ لیکن معتبر دلائل شرعیہ سے ثابت نہیں ہوتا کہ مائدہ واقعی نازل ہوا تھا۔ اسی لئے حضرت حسن بصریؒ اور مجاہدؒ کا قول ہے کہ جب ناشکری پر شدید عذاب آنے کی دھمکی سنی تو پھر لوگوں نے درخواست نہ کی اس لئے مائدہ نازل نہ ہوا۔ ورنہ اگر نازل ہوا ہوتا تو نصاریٰ اس دن کو دھوم دھام سے بطور عید منایا کرتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور قرآن سے بھی صرف دعا کرنا ثابت ہے۔

[2] وَاِذْ اَوْحَیْتُ (نح وحی کا مطلب لغت میں پوشیدہ نیز اشارہ کرنا ہے اور سرعت و پوشیدگی سے کسی چیز کی اطلاع و اعلام دینا۔ اور یہاں اس سے مراد الہام ہے جو اللہ تعالیٰ نے زندوں کے دلوں میں ڈالنا ہے۔ قرآن میں ہے: وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (تیرے رب نے شہد کی مکھی کو فطری الہام کیا) وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى (اور ہم نے موسیٰؑ کی ماں کے دل میں ڈال دیا) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حواریوں کے دل میں عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا اور ان کا مددگار بن جانا ڈال دیا تھا۔

---

[1] تفسیر حقانی ج ۴ ص ۶۵ [2] المراغی ج ۷ ص ۵۷ المنار ج ۷ ص ۲۴۲

Marfat.com

اس آیت میں چونکہ حواریوں کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا اگلی پانچ آیتوں میں اس کی مناسبت سے ایک اور واقعہ جس کا تعلق حواریوں سے تھا، بیان فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد اصل مضمون کی طرف رجوع ہوگا یعنی عیسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کی گفتگو میدانِ قیامت میں۔

ھَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ : کوئی مومن کامل اپنے ظاہر پر رکھیں تو اس سے قدرتِ الٰہی کی نفی ہوتی ہے اور کسی مومن کا یہ قول نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یا تو یوں کہا جائے گا کہ یہ سوال شک کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ رویدِ قدرتِ الٰہی کا نظارہ دیکھ کر مزید اطمینانِ قلب کے لئے تھا۔ جیسا کہ ابراہیمؑ نے باوجود جلیل القدر رسول ہونے کے احیاءِ موتیٰ کی کیفیت کو سامنے دیکھنے کی دعا مانگی تھی۔ تاکہ مزید اطمینان اور پختگی ہو جائے۔

یا استطاعت سے مراد ہے۔ ایسی استطاعت جو قدرتِ الٰہیہ کے موافق ہو۔ ان کی غرض یہ تھی کہ کیا یہ چیز حکمتِ الٰہی کے منافی ہے کہ ہم پر مائدہ نازل فرمائے۔ کیونکہ جو چیز حکمتِ الٰہی کے ——— خلاف ہو وہ باوجود قدرت و استطاعت کے واقع نہیں ہوتی۔ مثلاً نیکوکار کو اس کی نیکی پر ثواب کی بجائے عذاب دینا اور ظالم کو اس کے ظلم پر نیک جزا دینا یعنی ثواب دینا یا اس لفظ کا معنیٰ یہ لیا جائے گا کہ ھل یستطیع ربک کیا اے عیسیٰؑ آپ اپنے پروردگار سے یہ سوال کر سکتے ہیں؟

عیسائیوں کی کتابوں میں حضرت عیسیٰؑ اور حواریوں کی گفتگو کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن قرآن کی ان آیات کو دیکھ کر انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ایک معجزے کو اس کے مصداق ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ یوحنا کی انجیل میں ہے کہ عیدِ فصح کے دن پانچ روٹیوں اور دو مچھلیوں سے حضرت عیسیٰؑ نے ہزاروں آدمیوں کو کھانا کھلایا تھا۔

حضورؐ کے ایسے معجزات متعدد مواقع پر صحیح احادیث و سیر سے ثابت ہیں۔ مثلاً جنگِ تبوک میں ایک چلّو پانی میں آپ کا ہاتھ رکھنا اور پانچوں انگلیوں سے چشموں کا پھوٹنا حتیٰ کہ سارے لشکر کا سیر ہو جانا جانوروں کا پانی پی لینا اور برتن وغیرہ بھر لیا جانا ثابت ہے۔ جنگِ خندق میں حضرت جابرؓ کے گھر بالکل تھوڑے سے آٹے اور ایک چھوٹے سے بکرے کے گوشت سے سارے لشکر بلکہ سارے اہلِ مدینہ کا سیر ہو کر کھانا اور پھر اتنا ہی کھانا بچ جانا، جتنا کہ شروع میں تھا، ثابت ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مثالیں سیرت و حدیث سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حضورؐ کے یہ معجزات خرقِ عادت کا مطالبہ کئے بغیر سرزد ہوئے تھے۔ اور یہ صحابہؓ کی فضیلت و کمالِ ایمان کی دلیل ہے کہ انہوں نے کبھی اس قسم کی بات از خود طلب نہیں کی۔ (مؤلف)

Marfat.com

۔[1] علامہ حافظ ابن کثیرؒ نے اذ اوحیت الی الحواریین کی تفسیر میں الہام کے علاوہ ایک یہ معنی بھی بیان فرمایا ہے کہ اے عیسیٰؑ میں نے تیرے واسطے سے ان پر وحی (حکم) بھیجی کہ سچے ایماندار بن جاؤ اور میرے رسول کی مدد کرو۔

محقق علماء کے نزدیک اس آیت میں وحی کے لفظ کا یہی معنی ہے کہ یا تو اس سے مراد الہام ہے یا وحی بواسطۂ پیغمبر۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے وحی سے مراد نبوت لے کر حواریوں کی نبوت ثابت کی ہے۔ ان کا قول مرجوح ہے۔ واللہ اعلم (مؤلف)

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ان آیات میں جو مائدہ کا ذکر آیا ہے اسی کی بنا پر اس سورت کا نام المائدہ رکھا گیا ہے۔ اور بعض آئمہ کا قول ہے کہ موجودہ انجیل میں یہ قصہ مذکور نہیں۔ عیسائیوں نے قرآن کی اطلاع سے اس پر واقفیت حاصل کی ہے (اور پھر انجیل کے کئی واقعات کو اس پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے) آخر

حافظ ابن کثیرؒ نے نزول مائدہ پر مؤرخین کی کئی روایات بیان کر کے ہیں لکھا ہے کہ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ مائدہ اترا ہی نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اس بات کو صرف بطور مثال وعبرت بیان فرمایا ہے اور یہ کہ جب ان لوگوں کو عذاب کی دھمکی دی گئی تو وہ اس مطالبہ سے دستبردار ہو گئے تھے اور یہ کہنے لگے کہ نہیں ہمیں مائدہ نہیں چاہیئے۔ مجاہد اور حسنؒ تک اس قول کی سندیں نہایت صحیح ہیں اور سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ نصاریٰ اس مائدہ سے واقف ہی نہیں اور ان کی کتاب موجودہ انجیل میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے اگر مائدہ اترا ہوتا تو انجیل میں اس کا ذکر آتا۔

سید[2] قطب شہیدؒ فرماتے ہیں کہ حواریوں کی عیسیٰؑ علیہ السلام سے یہ گفتگو جو ان آیات میں مذکور ہے، قوم عیسیٰؑ کی طبیعت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ لوگ قوم مسیحؑ میں سے برگزیدہ تھے۔ لیکن ان میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بہت بڑا فرق ہے۔

ایک طرف تو حواری ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا الہام کیا تھا وہ ایمان لائے اور عیسیٰؑ کو اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔ لیکن اس کے باوجود کہ وہ عیسیٰؑ کے بہت سے معجزات دیکھ چکے تھے۔ اطمینانِ قلب اور رسول کی صداقت پر ایک نیا معجزہ طلب کرتے ہیں۔ دوسری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کبھی نیا معجزہ طلب نہیں کیا۔ ان کے دل ایمان لا چکے تھے اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۶۲ [2] فی ظلال القرآن ج ۷، ص ۶۹، ۷۲

Marfat.com

ایمان کی بشاشت ان کے دلوں میں رچ گئی تھی۔ انہوں نے جب ایک مرتبہ رسُول کا صدق دیکھ لیا تو تصدیق کے لئے کوئی اور برہان نہیں مانگا۔ ان کے لئے ایک ہی عظیم ترین معجزہ کافی تھا۔ اور وہ تھا قرآن!

مائدہ کا قصہ جس طرح قرآن میں مذکور ہے۔ عیسائیوں کی کتب میں اس کا نام ونشان تک نہیں۔ موجودہ انجیلیں جو عیسیٰ علیہ السلام کے کافی عرصہ بعد لکھی گئی تھیں۔ ان میں اس کا کوئی ذکر ونشان موجود نہیں ہے۔ یہ انجیلیں حضرت عیسیٰؑ کی بعض روایات ہیں۔ جو بعض بزرگانِ نصاریٰ کو پہنچی تھیں۔ ان کے ذریعے سے انہوں نے حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی زندگی کے نامکمل سے واقعات بیان کئے ہیں یہ انجیلیں کبھی حضرت عیسیٰؑ پر نہیں اتری تھیں۔ حواریوں نے اس قصے میں حضرت عیسیٰؑ کی اصل حیثیت بیان کی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ عیسیٰؑ رب نہیں رب اور ہے اور عیسیٰؑ "مربوب" ہے۔ اسی لئے کہا کہ کیا تیرا رب ہم پر ایک مائدہ نہ اتار سکے گا؟ وہ اسے مریم کا بیٹا کہتے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ "ابن اللہ" نہیں ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ معجزات اور خوارق عیسیٰؑ خود نہیں دکھا سکتے بلکہ ان کا رب ہی دکھا سکتا ہے۔

اکثر سلف کے نزدیک مائدہ اترا تھا گو امام حسنؒ اور مجاہدؒ سے صحیح روایت موجود ہے کہ وہ نہیں اترا کچھ بھی ہو اس آیت سے اللہ کی ایک سنت معلوم ہوئی کہ معجزہ طلب کرنے کے بعد بھی جو ایمان نہ لائے وہ ہلاک کر دیا جاتا ہے اور سخت عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان آیات سے دونوں احتمال نکلتے ہیں کہ مائدہ کی تکذیب کرنے والوں کو دنیوی عذاب ہوا تھا یا آخرت میں شدید سزا ملے گی۔

Marfat.com

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ

اور جب کہے گا۔ اللہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کیا تو نے

قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ

کہا تھا لوگوں سے کہ ٹھہراؤ مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود

دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ

سوا اللہ کے ؟ وہ کہے گا تو پاک ہے مجھ کو روا نہیں کہ کہوں

اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ

ایسی بات کہ جس کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تو

عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا

ضرور جانتا ہوگا۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا

فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

جو تیرے جی میں ہے بے شک تو ہی ہے جاننے والا چھپی باتوں کا

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ مگر جو تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم عبادت کرو

اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا

اللہ کی جو میرا اور تمہارا رب ہے اور میں ان سے خبردار تھا جب

مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ

تک میں ان میں رہا پھر جب تو مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی تھا

Marfat.com

الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾

ان کی خبر رکھنے والا اور تو ہر چیز سے خبردار ہے

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ

اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو انہیں معاف

لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾ قَالَ اللَّهُ

کردے تو بے شک تو ہی زبردست دانا ہے۔ فرمایا اللہ نے

هَٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ

یہ وہ دن ہے کہ کام آئے گا سچوں کے ان کا سچ ان کے

جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ

لئے ہیں باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ رہا کریں گے انہی

فِيهَا أَبَدًا ۖ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ

میں ہمیشہ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے یہی

الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١٩﴾ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

بڑی کامیابی ہے اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی

وَمَا فِيهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٢٠﴾ ع ۱۶/۵/۶

جو کچھ ان میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

Marfat.com

[1] پچھلا رکوع حقیقت میں اس رکوع کی تمہید تھی۔ پچھلے رکوع میں یوم یجمع اللہ الرسل الخ فرما کر آگاہ فرمایا تھا کہ قیامت کے دن تمام مرسلین سے اُن کی اُمتوں کے روبرو علیٰ رؤوس الاشہاد سوال وجواب ہوں گے۔ پھر ان میں سے خاص مسیح علیہ السلام کا ذکر فرمایا جن کو کروڑوں آدمیوں نے خدائی کا درجہ دے رکھا ہے کہ ان سے بالخصوص اس عقیدۂ باطلہ کی نسبت دریافت کیا جائے گا۔ لیکن اول وہ عظیم الشان احسانات اور ممتاز انعامات یاد دلائیں گے اور جو ان پر اور ان کی والدۂ ماجدہ پر فائز ہوئے اس کے بعد ارشاد ہوگا انت قلت للناس اتخذونی الخ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود مانو؟ حضرت مسیح علیہ السلام اس سوال پر کانپ اٹھیں گے۔ اور وہ جواب عرض کریں گے جو آگے آتا ہے۔ آخر میں ارشاد ہوگا۔ ھذا ینفع الصّٰدقین صدقھم الخ ہذا کا اشارہ اسی یوم کی طرف ہے جو یوم یجمع اللہ الرسل میں مذکور تھا۔ بہرحال یہ سب واقعہ روزِ قیامت کا ہے جسے متیقن الوقوع (یقینی) ہونے کی وجہ سے قرآن وحدیث میں بصیغۂ ماضی (قال) تعبیر فرمایا ہے۔

قال سبحانک ..... علام الغیوب: یعنی میں ایسی گندی بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ الوہیت وغیرہ میں کسی کو اس کا شریک کیا جائے، اور جس کو آپ پیغمبری کا منصب جلیل عطا فرمائیں اس کی یہ شان نہیں کہ کوئی ناحق بات منہ سے نکالے۔ پس آپ کی سبّوحیت اور میری عصمت دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ میں ایسی ناپاک بات نہیں کہہ سکتا۔ اور سب دلائل کو چھوڑ کر آخری بات یہ ہے کہ آپ کے علم محیط سے کوئی چیز باہر نہیں ہو سکتی اگر فی الواقع میں ایسا کہتا تو آپ کے علم میں ضرور موجود ہوتا۔ آپ خود جانتے ہیں کہ میں نے خفیہ یا علانیہ کوئی ایسا حرف منہ سے نہیں نکالا۔ بلکہ میرے دل میں اس طرح کے گندے خیالات کا خطور بھی نہیں ہوا۔ آپ سے میرے یا کسی اور کے دل کے چھپے ہوئے ہوا حبس وخواطر بھی پوشیدہ نہیں۔

ما قلت لھم ..... ربی وربکم: میں نے آپ کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ اپنی الوہیت کی تعلیم تو کیسے دے سکتا تھا۔ اس کے بالمقابل میں نے اُن کو صرف تیری بندگی کی طرف بلایا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا سب کا رب (پروردگار) وہی ایک خدا ہے جو تنہا عبادت کے لائق ہے۔ چنانچہ آج بھی بائبل میں صریح عبارات اس مضمون کی بکثرت موجود ہیں۔

---

[1] فوائد القرآن صـ۱۶۴

Marfat.com

وکنت علیہم شہیدا.... شہید: بر صرف یہ کہ میں نے مخلوق کو تیری توحید اور عبودیت کی طرف دعوت دی۔ بلکہ جب تک میں ان کے اندر قیام پذیر رہا۔ برابر ان کے احوال کی نگرانی اور خبر گیری کرتا رہا کہ کوئی عقیدہ یا بے موقع خیال قائم نہ کر لیں۔ البتہ ان میں قیام کرنے کی جو مدت آپ کے علم میں مقدر تھی۔ جب وہ پوری کر کے آپ نے مجھ کو ان میں سے اٹھا لیا۔ (توفی کے مادہ اور مادمت فیہم کے مقابلہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے) تو پھر صرف آپ ہی ان کے احوال کے نگران اور خبردار ہو سکتے ہیں۔ میں اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و ممات۔ یا رفع الی السماء کی بحث کا موقع سورۂ آلِ عمران وغیرہ میں ہے۔ یہاں صرف استطراداً یہ لفظ توفی آگیا ہے۔ مترجم محقق حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے یہاں فلما توفیتنی کا ترجمہ تو نے مجھ کو اٹھا لیا" سے کیا۔ یہ باعتبار محاورات موت رفع الی السماء دونوں پر صادق آسکتا ہے گویا انہوں نے متنبہ کر دیا کہ نہ لفظ توفی کے لئے موت لازم ہے۔ اور نہ خاص توفی بصورتِ موت کو آیت زیر بحث سے کوئی تعلق یا دخل ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگوں کی نسبت قیامت کے دن میں اسی طرح کہوں گا جس طرح بندۂ صالح (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا وکنت علیہم شہیدا مادمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم ۔ اس قسم کی تشبیہات سے یہ نکالنا کہ حضورؐ کی اور حضرت مسیحؑ کی توفی بھی بہمہ وجوہ یکساں اور ہم رنگ ہونی چاہیئے، عربیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ مشرکین مکہ ایک درخت (ذات انواط) پر ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے لئے بھی ذات انواط مقرر فرما دیجئے جیسے ان کے یہاں ہے آپ نے فرمایا،

ھذا کما قال قوم موسیٰ اجعل لنا الٰھا کما لھم آلھۃ (یہ تو ایسا ہوا جیسے موسیٰؑ کی قوم نے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے بھی ایسا معبود تجویز کر دو جیسا ان بت پرستوں کا ہے۔ کیا کوئی مسلمان اس تشبیہ کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ صحابہؓ نے معاذ اللہ بت پرستی کی درخواست کی تھی؟ اس طرح کی تشبیہات سے نصوص محکمہ اور اجماعِ امت کے مخالف عقائد پر تمسک کرنا صرف اسی جماعت کا حصہ ہو سکتا ہے۔ جن کی نسبت یہ ارشاد ہوا کہ ان کے دلوں میں کجی ہے۔ اور وہ متشابہات کے پیچھے فتنہ اور تاویل تلاش کرنے کے لئے پڑ جاتے ہیں۔

Marfat.com

ان تعذبھم.... العزیز الحکیم یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بے جا سختی نہیں کر سکتے۔ اس لئے اگر ان کو سزا دیں گے تو عدل و حکمت پر مبنی ہوگی اور فرض کیجئے معاف کر بھی دیں تو یہ معافی بھی از راہِ عجز و سفہ نہ ہوگی۔ چونکہ آپ عزیز (زبردست اور غالب) ہیں اس لئے کوئی آپ کے قبضۂ قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا۔ کہ آپ اس پر قابو نہ پا سکیں اور چونکہ حکیم (حکمت والا، دانا) ہیں۔ اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو بے موقع چھوڑ دیں۔ بہر حال جو فیصلہ ان مجرموں کے حق میں آپ کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا۔ جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور استدعائے رحم وغیرہ نہیں ہوگی اس لئے حضرت مسیح نے عزیز حکیم کی جگہ غفور رحیم وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا۔ برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا۔ فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفور رحیم ۝

(اے پروردگار! جو میرے تابع ہو گیا وہ تو میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو پھر تو غفور رحیم ہے) یعنی ابھی موقع موجود ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ ان کو توبہ کی اور رجوع الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف فرما دے۔

قال اللہ ھذا یوم.... صدقھم: جو لوگ اعتقاداً اور قولاً سچے ہیں (جیسے مسیح) ان کی سچائی کا پھل آج ملے گا

ذالک الفوز العظیم: بڑی کامیابی حق تعالیٰ کی رضا ہے اور جنت بھی اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ محل رضائے الٰہی ہے۔

وھو علی کل شیئ قدیر: یعنی وہ ہر وفادار اور مجرم کے ساتھ وہی معاملہ کریگا جو اس شہنشاہِ مطلق کی عظمت و جلال کے مناسب ہے۔

[1] علامہ احمد مصطفیٰ المراغی حضرت مسیح سے سوالِ الٰہی "أأنت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من دون اللہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ کے سوا (یا اللہ سے ورے ورے) کسی کو الٰہ بنا لینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا اس غیر کی عبادت کی جائے۔ چاہے خالصتاً اس غیر ہی کی عبادت ہو چاہے اللہ اور اس میں غیر کی شراکت کی جائے اور اس غیر سے دعا کرنا یا اس طرف متوجہ ہونا کہ وہ اللہ کی دعا و عبادت کا وسیلہ بنے، بھی شرک اور اتخاذ الھین من دون اللہ ہے۔ اور یہ عبادت

[1] تفسیر المراغی ج ۔ صد ۶۲، ۶۷

Marfat.com

مشرق و مغرب کے کنیسوں میں نصاریٰ کے ہاں رائج تھی. پھر فرقہ پروٹسٹنٹ نے مریم کی عبادت سے انکار کر دیا (گویا مسیحؑ کی عبادت کو برقرار رکھا).
اور اس عبادت کی کئی صورتیں ہیں:-
(i) معبود کے لئے نماز جس میں دعا اور اُس کی ثناء ہو.
(ii) اُس سے استغاثہ کیا جائے اور اسے شفیع و واسطہ بننے کو کہا جائے.
(iii) روزہ جیسا کہ نصاریٰ میں مریمؑ کنواری کے نام کا روزہ رائج ہے.
(iv) مندرجہ بالا تمام صورتوں میں معبود کے ذکر کے وقت خضوع و خشوع ہوتا ہے. اِس کی تصویروں اور مجسّموں سے استعانت ہوتی ہے. اور اُسے غیبی طاقتوں کے حاصل ہونے کا اعتقاد ہوتا ہے. نیز یہ کہ وہ نفع و ضرر کا مالک ہے. دنیا یا آخرت یا دونوں میں کام بنایا یا بگاڑ سکتا ہے. مریمؑ کے متعلق نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ از خود یا اپنے بیٹے کے واسطے ایسا کرتی ہے. اور وہ اسے "معبود کی ماں" کہتے ہیں. (معبود کے لئے ان کے ہاں اردو زبان میں خداوند کا لفظ عام ہے)
اسی صورت میں حضرت مسیحؑ کا قول گزر چکا ہے. جو انہیں نصاریٰ کے شرک سے بری الذمہ قرار دیتا ہے:

قال المسیح یا بنی اسرائیل اعبد واللہ ربی و ربکم انہ من یشرک باللہ فقد حرم علیہ الجنۃ الایۃ)

اور یوحنا کی انجیل میں ہے کہ "یہی ابدی زندگی ہے کہ وہ تجھے پہچانیں تو اکیلا حقیقی ہی معبود ہے اور یسوع مسیح کو پہچانیں.
صحیح احادیث میں صراحت سے مضمون آچکا ہے کہ جو شخص شرک میں مبتلا ہوگا اُسے حضور کی شفاعت نہیں پہنچے گی. حضرت عیسیٰؑ کا جو قول قرآن نے یہاں نقل کیا ہے اِس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے.
آخری آیت سے واضح طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ ملک و قدرت صرف اللہ کے پاس ہے.
قرآن نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

من ذا الذی یشفع عندہٗ الا باذنہٖ ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ ورضی لہٗ قولا

اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اِن معصوم پیغمبروں کو جو مقامِ شفاعت دیا ہے وہ اسی کی دین اور فضل ہے.
سیّد قطب شہیدؒ اِن آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مقام الوہیّت کا حقدار صرف اللہ. کسی بندے کو روا نہیں کہ اِس کا مدّعی ہو. اور پیغمبر تو اِس سے بالکل بالاتر اور بری ہیں کہ اِس قسم کی بات منہ سے نکالیں. اس لیے عیسیٰؑ جواب میں سبحانک سے بات شروع

Marfat.com

کریں گے. جو کلمۂ تسبیح و تعزیہ ہے. اور مایکون لی ان اقول مالیس لی بحق کہہ کر اپنی مکمل برأت کریں گے.

کہ یہ بات میرے لئے روا نہ تھی. نہ یہ بات میری شان کے لائق تھی. پھر وہ اپنی عبودیت کاملہ اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت مطلقہ کا برسبیلِ عام اعلان کرینگے. یہی اعلان وہ دنیا میں بھی کر چکے ہیں "ان اعبدوا اللہ ربی و ربکم". اور پھر آخر میں ان تعذبھم الخ سے وہ معاملے کو خدا کے سپرد مطلقاً کر دیں گے. کہ ایک عاجز اور مخلص بندے کی یہی شان ہے.

اِس سورت کا اختتام اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و ملوکیت کے اعلان پر کرنا نہایت مناسب تھا. کیونکہ اس سورت میں "دین" کی حقیقت کو کھولا گیا ہے. اور سارے مضامین ایک ہی حقیقت کے گرد گھومتے ہیں. یعنی الوہیت، توحید اور حکم بما انزل اللہ اسی لئے سورت کو ایفا عقود کے حکم سے شروع فرما کر اعلانِ بادشاہتِ خداوندی پر ختم فرما دیا گیا.

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

Marfat.com

سُوْرَۃُ الْمَائِدَہ کے مضامین و احکام کا مختصر خلاصہ

(۱)

۱- کمالِ دین کا اعلان۔

۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومِ بعثت کا اعلان اور آپ کے ذریعے سے آخری شریعت کی مکمل تبلیغ و تلقین۔

۳- اہلِ ایمان کی انفرادی و اجتماعی صلاح و فلاح کا مدار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ہے۔ اور اس بات پر کہ وہ عقود و عہود الٰہی کا ایفاء کریں۔

۴۔ حرام اور حلال کھانوں کی تفصیل۔

۵۔ خمر و میسر یعنی شراب اور جوئے کی حرمت کا بیان۔

۶۔ عدل و انصاف کی شہادت کا وجوب اور خدائی احکام کے مطابق لوگوں میں فیصلے کرنے کا حتمی حکم۔

۷۔ آخرت کی جزاء اور اللہ وعدہٗ کے سپرد ہے اور اس کے ہاں صرف صدق ہی کام آئیگا۔

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون و سلام علی المرسلین
والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی المرسلین
خاتم النبیین محمد و آلہ و ازواجہ و اصحابہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین ٥

Marfat.com

ایم اے علومِ اسلامیّہ پرچہ پہلا ۱۹۷۷ء

کل پانچ سوالوں کے جواب لکھیے۔ جن میں سے ایک حصّہ اوّل سے۔ ایک حصّہ دوم سے اور تین حصّہ سوم میں سے ہوں۔ تمام سوالوں کے نمبر برابر ہیں۔

حصّہ اوّل

۱۔ برصغیر کے تفسیری ادب میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور عبدالحق حقانی دہلوی کی تفسیری خدمات پر تبصرہ کریں۔

۲۔ مشہور مفسرین صحابہؓ اور ان کے نامور تلامذہ کی تفسیری خدمات کا جائزہ لیں۔

حصّہ دوم

۳۔ الفوزالکبیر کے پہلے باب کا خلاصہ تحریر کیجیے۔ نیز اس باب کی افادیت اور نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی چار پر الفوزالکبیر کی روشنی میں نوٹ لکھیے۔

ا۔ فنون تفسیر۔ ب۔ غریب القرآن۔ ج۔ اعجازالقرآن۔ د۔ مقطعات۔ ہ۔ قرآن کا صوتی حسن وجمال۔ و۔ اسباب نزول

حصّہ سوم

۵۔ سورہ النساء اور المائدہ میں بیان کردہ کفاروں کا وضاحت سے ذکر کیجیے۔

۶۔ اسلامی حدود کی اہمیت وافادیت پر مختصر مضمون لکھیے۔

۷۔ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق سورہ النساء کے احکام کی وضاحت کیجیے۔

۸۔ کلالہ سے متعلق احکام تفصیل و وضاحت کے ساتھ قلم بند کریں۔

۹۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی چار کی اصل قرآنی کی نشاندہی کیجیے۔

ا۔ نقض وضو۔ ب۔ ممانعت نکاح صغیر۔ ج۔ زبیح شرعی۔ د۔ خون بہا۔ ہ۔ عصبات و۔ ختم نبوت

۱۰۔ مندرجہ ذیل میں سے کوئی سی دو آیات کی تفسیر کیجیے۔

ا۔ وطعام الذین اوتوا الکتاب حِل لکم

۲۔ علیکم انفسکم لا یضرکم من ضلّ اذا اھتدیتم

۳۔ فما استمتعتم بہٖ منھن فاتوھن اُجورھن فریضۃً

Marfat.com

ایم۔اے علوم اسلامیہ پرچہ پہلا سنہ ۱۹۷۸ء

پہلے اور دوسرے حصّے میں سے ایک ایک سوال کا اور تیسرے حصّے میں سے تین سوالوں کا جواب مطلوب ہے۔ تمام سوالوں کے نمبر برابر ہیں

حصہ اول

۱۔ تفسیر ماثور اور بالرائی کے رد و قبول پر اختلاف آراء کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
۲۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی چار پر تشریحی نوٹ لکھیے۔
خازن۔ بیضاوی۔ طبرسی۔ روح المعانی۔ المنار۔ احکام القرآن (جصاص) طنطاوی۔

حصہ دوم

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زندگی اور علوم بینیہ کی خدمات پر مفصل تبصرہ کیجیے۔ اور الفوز الکبیر پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
۴۔ الفوز الکبیر کتنے ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر ایک باب کے اہم مباحث کا خلاصہ پیش کیجیے

حصہ سوم

۵۔ نماز کے متعلق سورۃ نساء اور سورہ معایدۃ کے جملہ احکام مناسب ترتیب اور اختصار کے ساتھ قلم بند کیجیے۔
۶۔ سورۂ مائدہ کے اہم فقہی مسائل کے عنوانات متعین کیجیے۔
۷۔ تحریم خمر کے بارے میں متجددین کا نقطہ نظر، اس کے محرکات اور ان کے دلائل کا بالتفصیل تنقیدی جائزہ لیجیے (خیال رہے کہ تحریم خمر کے مراحل کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں)
۸۔ ماں، بیٹی۔ بیوی اور بہن کو وراثت ملنے کے مختلف صورتیں قرآنی آیات کے حوالے سے بیان کیجیے۔
۹۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی چار مسائل کی اصل قرآنی کی نشاندہی کیجیے۔
نکاح بر نکاح کی حرمت، جواز متعہ، کلالہ۔ کفارہ یمین۔ عصبات۔ وصیت۔
۱۰۔ مندرجہ ذیل میں سے کوئی سی دو آیات کی مختصر مگر جامع تفسیر کیجیے۔
ا۔ ولی ولاتاکلوا اموالھم الی انہ کان حوبا کبیرا
ب۔ ان اللہ یامرکم ان تؤدو الامٰنٰت الی اھلھا

Marfat.com

ج. لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح بن مریم

د. فلا وربّک لا یومنون حتّی یحکموک فیما شجر بینھم
ثم لا یجدوا فی انفسکم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

ایم اے علوم اسلامیہ پرچہ پہلا ۱۹۷۸ء

پہلے اور دوسرے حصے سے ایک ایک سوال کا اور تیسرے حصے سے تین سوالوں کا جواب مطلوب ہے تمام سوالوں کے نمبر برابر ہیں۔

حصہ اوّل

۱۔ تابعین اور تبع تابعین کی گراں قدر تفسیری خدمات پر روشنی ڈالیے۔
۲۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی چار پر مختصر تشریحی نوٹ لکھیے۔
طبری۔ کشاف رازی۔ قرطبی۔ قاسمی۔ احکام القرآن۔ (ابن العربی) ابن کثیر۔ سیوطی۔

حصہ دوم

۳۔ الفوز الکبیر کے تیسرے باب کا خلاصہ تحریر کیجیے اور اس کی افادیت اور جامعیت پر روشنی ڈالیے۔
۴۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی چار پر الفوز الکبیر کی روشنی میں نوٹ لکھیے۔
محکمات، ناسخ و منسوخ، وجوہ خفائے نظم قرآن۔ تذکیر بایام اللہ۔ فن توجیہ، مجاز عقلی

حصہ سوم

۵۔ سورہ نساء اور سورہ مائدہ کے مشترکہ موضوعات کی نشاندہی کیجیے اور حضرت مسیحؑ سے متعلق یہود و نصاریٰ کے جن غلط عقائد کا ابطال کیا گیا ہے۔ اس پر روشنی ڈالیے۔
۶۔ سورۂ نساء کی روشنی میں یتامیٰ کے حقوق تفصیل اور وضاحت کے ساتھ قلم بند کیجیے۔
۷۔ سورہ مائدہ کی روشنی میں مندرجہ ذیل میں سے چار پر مختصر نوٹ لکھیے۔
وضو و تیمم۔ عدل و انصاف۔ احرام۔ عقیدہ تثلیث۔ خمر و میسر۔ حد سرقہ۔
۸۔ تحدید ازدواج کے بارے میں متجددین کا نقطہ نظر، اس کے محرکات اور ان کے اعتراضات و دلائل کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

Marfat.com

۹۔ ایک میت نے چالیس ہزار روپے ترکہ نقد چھوڑا۔ اس میں سے چار ہزار روپے تجہیز و تکفین اور میت کے قرضے چکانے میں صرف ہوئے۔ باقی رقم اس کے پانچ وارثوں ا۔ ب۔ ج۔ د۔ ر اور ہ میں اس طرح تقسیم ہوئی کہ و کو نو ہزار، ب اور ج میں سے ہر ایک کو چھ ہزار، ر کو دس ہزار اور ہ کو پانچ ہزار ملا۔ بتائیے میت مرد ہے یا عورت؟ اور ہر ایک وارث اس اس کا رشتے میں کیا لگتا ہے اپنے جواب کو آیات کے حوالے سے مدلل کیجیے۔

۱۰۔ مندرجہ ذیل آیات میں سے کوئی سی دو آیتوں کی مختصر تفسیر کیجیے۔

ا۔ وآتوا الیتٰمی اموالھم ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب۔
ب۔ ان تجتنبوا کبٰئر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیاٰتکم
ج۔ یاایھا الذین آمنوا لاتقتلوا الصید وانتم حرم
د۔ قل لایستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث

Marfat.com

Marfat.com